ایک ھی زمین کے بیٹے

سورج مکھی کا پھول کئی زمینوں پر اُگتا ہے اور بہت جلد بڑھتا ہے۔ ہم ملک کے کسی بھی حصے میں رہیں ایک ہی دھرتی کے بیٹے ہوں گے۔ جس قدر جلد ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں، اُسی قدر جلد ہم ترقی کرینگے۔

ہم مشترکہ دھرتی کے بیٹے ہیں، ہم بھارت ماں کے بچے ہیں۔ آیئے ہم ساتھ بڑھیں اور اسطرح ہم جلد ترقی کرینگے۔

ڈائرکٹر آف پبلسٹی حکومت مہاراشٹر بمبئی
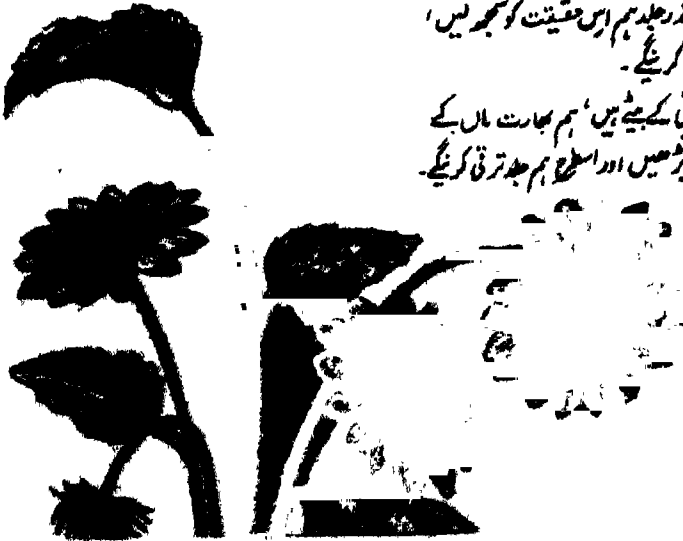
یہ ہے زمانے کی ریت
اِسے
اپنایئے .....
اور حسن و دلربائی کا
اپنا شاندار جہان
پیدا کیجئے ..... اس کیلئے
استعمال کیجئے
AFGHAN SNOW
افغان اسنو
سنگار کا سامان

گجرات
کی سیاحت کیجئے
اپنی تعطیلات کو دلچسپ بنانے کیلئے
ایک مکمل اور پُرسکون تعطیل کے لئے —
ایسی تعطیل کیلئے جو مختلف ہے گجرات آئیے
رنگ برنگے ملبوسات۔ لوک ناچ کھڑے ہوئے
مقبل مندر۔ جھیلوں میں کشتی رانی —
شیر اپنی فطری جبلتوں کے ساتھ۔ مشہور
پٹولہ ساڑیاں — یہ سب آپ
گجرات میں پائیے۔
اپنی زندگی کی یادوں میں مزید اضافے
کیلئے
گجرات کی سیاحت کیجئے
NAME
ADDRESS
THE DIRECTORATE
OF INFORMATION

مقالات

ادب و تنقید ـــــ

تاریخ و تحقیق ـــــ

جرم و سزا ـــــ

نظمیں

افسانے

غزلیں

طنز و مزاح

مکتوبات

جرعات

شاعر کے پچھلے پینتیس سالہ دَورِ اشاعت میں ایسی شدید تاخیر کبھی واقع نہیں ہوئی تھی جیسی اس بار ہوئی اور دسمبر ۶۴ء کے بعد "شاعر" کا کوئی شمارہ شائع نہ ہوسکا۔ اس سلسلے میں ہمارا اظہارِ معذرت اور اسبابِ تاخیر کا ذکر بھی قارئین کے انتظار اور اُن کی شکایات کا ازالہ نہیں کرسکتا۔ ہاں ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ ہمارے اخبارات و رسائل ایک بحرانی دَور سے گذر رہے ہیں۔ خصوصاً اُردو کے ادبی رسائل کے لئے جو دشواریاں ہیں، وہ دوسروں کے لئے نہیں ہیں۔ ادبی رسائل کو پڑھنے والا طبقہ بہت سکڑ اور سمٹ چکا ہے۔ اُن رسائل کی بات جانے دیجئے جو دو چار سو چھپتے ہیں اور جن کی آمدنی کے ذرائع کچھ اور ہیں۔ ذکر اُن کا ہے جو دو ہزار سے چار ہزار تک چھپتے ہیں اور اپنے اصول اور اشاعت کے بل بوتے پر زندہ ہیں۔ پچھلے چند ماہ میں بڑھتے ہوئے اخراجات میں مزید ۲۵ فی صدی کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اخباری کاغذ پر زبردست ڈیوٹی لگادی گئی ہے۔ اب تو اپنے پسندیدہ ادبی رسائل کو زندہ رکھنے کی یہی صورت ہے کہ جس طرح بھی ہو اُن کی زیادہ سے زیادہ امداد کی جائے۔

سالنامہ ۶۵ء حاضر ہے۔ یہ اربابِ ذوق و نظر کے لئے ایک گلدستۂ صد رنگ ہے۔ اس کا کوئی طویل سے طویل اور مختصر سے مختصر باب بھی کمزور نہیں ہے۔ کچھ فن پارے تو شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ مقالات کا باب بالیقین خاصے کی چیز ہے۔ شاعر کی کسی بھی پچھلی خصوصی اشاعت میں یہ باب اتنا طویل اور بھرپور نہ تھا۔ یہ پورے ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اچھے مقالات زیادہ تعداد میں پیش کرنا ہمیشہ شاعر کا ایک امتیاز رہا ہے۔ افسانوی حصہ بھی بیحد وزنی ہے۔ سب ہی افسانہ نگار صرف ہیں اور سب ہی افسانے کسی بلند مقصد کو لئے ہوئے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی مشاہیر شعرا کے فکر و فن کا نقشِ جمیل ہیں۔ اُردو شاعری خوبصورت ہی نہیں ہوتی بلکہ معنی آفریں اور اپنے دَور کی نمائندہ بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان کی شاعری ابتک اس معیار کی حامل نہیں ہوسکی ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔

بالکل غیر اختیاری طور پر مقالات کے باب کے طویل ہوجانے کی وجہ سے ہمیں کئی قلمکاروں سے سخت شرمندگی ہے۔ ہم "شاعر" کے دیرینہ ڈرامہ نگار اظہار اثر سے اُن کے ڈرامے، عوض سعید اور نجمہ صبیح سے اُن کے افسانوں اور علی جواد زیدی سے اُن کے اہم علمی مقالے کے شائع نہ ہونے پر معذرت خواہ ہیں۔ اس کا بھی بڑا افسوس ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک خاص اور بیحد طویل نظم بھی سالنامہ میں شریک نہ ہوسکی۔ حالانکہ ان تمام تخلیقات کی کتابت ہو چکی تھی۔ ان کے علاوہ بھی سالنامہ کے لئے کئی اچھے افسانے اور مقالے آئے، نظمیں اور غزلیں موصول ہوئیں۔ انہیں آئندہ شمارہ کی زینت بنایا جارہا ہے۔ مشہور افسانہ نگار رام لال کا افسانہ بھی بہت بعد میں موصول ہوا۔

حسبِ اعلان سالنامہ ۶۵ء، جنوری اور فروری دو مہینے ہی کی اشاعتوں پر مشتمل ہے۔ سالنامہ کے بعد "شاعر" کا جو عام شمارہ جلد شائع ہورہا ہے وہ بھی مارچ اور اپریل کا مشترک شمارہ ہوگا۔ مئی سے پھر الگ الگ ہر مہینے شمارے شائع ہوں گے۔ جس طرح ہوتے تھے۔ مسلسل دو دو مشترک اشاعتوں کے نکالنے کا کوئی جواز تو نہیں ہے اور اصولاً بھی یہ بات نامناسب ہے۔ لیکن مجبوری و معذوری کو کیا کیا جائے۔ ایسا کئے بغیر تاخیرِ اشاعت کا جھول دُور نہیں ہوسکتا۔ حادثاتی طور پر "شاعر" جس تاخیر و تعویق کا شکار رہا، اُس سے مستقل خریدار اور ایجنٹ بد دل نہ ہوں۔ یہ گیا وقت نہیں ہے جو ہاتھ نہ آسکے۔ "شاعر" کی زندگی اُردو زبان و ادب کے لئے ایک جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ اسے شائع ہوتے ہی رہنا ہے۔ آئندہ شمارے ہمارے نئے عزائم کی جھلک پیش کریں گے۔

ہم تو خون اپنا چراغوں میں جلاتے جائیں
اس سے کیا صبح کی تنویر ملے یا نہ ملے!

اِدارہ

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

شاعری دورِ انقلاب میں

خطبۂ صدارت مشاعرہ فتحپور سیکری ۔ منعقدہ ۲۰ رجون ۱۹۴۲ء

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم مشاعروں میں خطبہ خوانی کے موجد و مخترع تھے۔ خاموش صدارتوں کے خلاف اُنہوں نے سخت احتجاجی آوازیں بلند کیں، حتیٰ کہ بعض مشاعروں سے واک آؤٹ بھی کیا۔ اُن کے کچھ معاصر اساتذہ کو یہ بات بہت ناگوار تھی۔ لیکن مرحوم نے کبھی اِس کی پروا نہیں کی اور اِس بات پر مسلسل زور دیتے رہے کہ صدرِ مشاعرہ کو زبان و ادب و شعر کے کسی نہ کسی گوشہ پر ضرور اظہارِ خیال کرنا چاہیئے۔ خود اُنہوں نے جن مشاعروں کی صدارت فرمائی۔ اُن میں بتقاضائے وقت و ماحول نہایت مفید اور معرکۃ الآرا خطبے ارشاد فرمائے۔ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بحیثیت صدر اُنہوں نے کسی مشاعرہ میں خطبہ نہ پڑھا ہو۔ یہ خطبات جن کی تعداد کسی طرح پچاس ساٹھ سے کم نہیں ہے، اُردو ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ حالیؔ کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے بعد کسی نے منضبط طور پر سیماب کے علاوہ اصلاحِ حال کی ایسی کوشش نہیں کی۔ اِن خطبات میں سے صرف ۴ خطبے "کلیمِ عجم" کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔

ذیل کا خطبۂ صدارت اب سے تینتیس ۳۳ سال پہلے ۱۹۴۲ء میں فتحپور سیکری کے مشاعرہ میں مرحوم نے پڑھا تھا۔ ادبی اجتہادات کے علاوہ، زبان و ادب و شعر کے ارتقاء و اصلاح کی اُنہوں نے زندگی بھر سعیِ بلیغ کی۔ ابھی مورخِ ادب نے اُن کاوشوں کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ ادب کے جدید تقاضوں کو عام کرنے اور نئی نسلوں کے اذہان کو اُن کی طرف لانے میں سیماب کا زبردست حصہ ہے۔

۳۳ سال پہلے اِس خطبے میں جدید نظم کی جو بشارت دی گئی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔ اِس خطبۂ صدارت میں آج کے دور کے لئے بھی بہت سے کام کے اشارے ہیں۔ ایک مفکر ادیب و شاعر کی نظر اپنے دور سے بہت آگے ہوتی ہے۔

علامہ سیماب کے تمام خطبات کو ایک تاریخی ترتیب اور موضوعات کی تشریح کے ساتھ مرتب کیا جا رہا ہے۔ اُن کے چند گم شدہ خطبات کی بھی تلاش ہو رہی ہے۔ (ادارہ)

ادب و تنقید

گرامی شعراء و سامعین

میں "بزم سوسائٹی" اور عمائدینِ فتحپور سیکری کی عزت افزائی کا سپاس گذار ہوں کہ اس مشاعرے کی صدارت مجھے تفویض فرمائی گئی۔ ایک ایسی مبارک و [illegible] منصب مجھے تقدم کرنے کے لئے کافی ہے [illegible] ہمیشہ وجہِ نازش رہا ہے۔ باوجودیکہ میں [illegible] نہیں ہوں جو مجھے اس بارگاہ اور

مقدس بارگاہ کے ماحول میں میرا یہ اتیان [illegible] جہاں سر اپنا نیاز مندی کرتا ہوں [illegible] سے اپنی اُسی نیاز مندی کے احساس سے [illegible]

اس سرزمین سے ہے جس کی خاک پر سیکڑوں بادشاہ اور شہزادے [illegible] مصروفِ خرام رہے ہیں، جہاں اکبرؔ، جہانگیرؔ اور شاہجہاںؔ جیسے پُرجلال و جبروت شہنشاہوں کے سرِ عقیدت [illegible] نے جھکا دیئے ہیں، جس کی فضائے جمیل میں جلیل القدر ادباء اور شعراء کی تصویریں اب بھی چلتی پھرتی نظر

آتی ہیں، جہاں کی آب و ہوا نے ابو الفضل اور فیضی کے دماغوں کی پرورش کی ہے، اور جہاں کی فضاؤں نے ہزاروں حیات آفریں نغمے سُنے ہیں، جن کی گونج سازِ ماضی میں ہنوز باقی ہے۔

حضرات:۔ اِس دورِ انقلاب میں، جبکہ کرۂ زمین کا ۳/۴ حصّہ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے اور انسانی خون پانی کی طرح خاک پر بہہ رہا ہے، مشرقی روایات کے مطابق ہندوستان میں مشاعروں کا انعقاد اِس ملک کے رہنے والوں کی وضعداری اور معاشرت دوستی کا ایک کھلا ہوا اور مستقل ثبوت ہے۔ اسی دنیا میں، ہماری نظروں سے دُور، جنگ کی ہولناکیوں نے جو قیامت اٹھا رکھی ہے۔ اس کی شورش، ہل من مزید کی پکار، آہ و بُکا اور کراہ کے ساتھ ساتھ زمین کے بعض گوشوں سے نغمہ و شعر کے ساتھ "واہ واہ سبحان اللہ" کی صداؤں کا بلند ہونا اِس کلیّہ کو اور بھی مستحکم کر دیتا ہے کہ تضاد اور اختلاف ہی کا نام دُنیا ہے۔ "اے ذوق اِس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے"

یہ دُنیا اتنی وسیع و عریض ہے کہ یہاں کی مخلوق ایک حال اور ایک عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ یہاں بیک وقت عیش و نشاط کی شہنائیاں بھی بجتی ہیں اور غم و الم میں ڈوبی ہوئی آوازیں بھی بلند ہوتی ہیں۔ مگر ان میں باہم تصادم نہیں ہوتا۔

خس خانوں میں برفاب کے ساتھ سکون کا سانس لینے والوں کو، تپتے ہوئے بیابانوں میں بھوک اور پیاس کی تکلیف سے تڑپنے والوں کی مصیبت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ایک حصّۂ زمین کو اگر بہار رنگ و بُو سے شاداب کرتی ہے تو دوسرے حصّۂ زمین میں خزاں کے سموم آفریں جھونکوں سے شرارستان تیار ہوتے ہیں۔ مگر پھولوں سے کھیلنے والے آگ میں جلنے والوں کے حال سے بے خبر رہتے ہیں۔

لیکن دُنیا کا یہ اختلافِ حال شاعر کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ دُنیا کا ہر فرد ایک دوسرے کے حال سے بے خبر سہی، مگر شاعر — (میری مُراد حقیقی شاعر سے ہے) — تمام کائنات کے درد اور خوشی سے متاثر ہوتا ہے۔ اُس کا ہمہ گیر تخیل اقصائے عالم کا کوئی گوشہ بغیر چھانے نہیں چھوڑتا اور اُس کے دل کا فطری درد مشرق میں بیٹھ کر مغرب کے مصائب سے اور جنوب میں بیٹھ کر شمال کے حوادث سے یکساں اثر گیر ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ایک حقیقی شاعر کی نگاہ کبھی اپنے ماحول میں محدود نہیں ہوتی۔

شاعر کو (UNIVERSAL) یعنی آفاقی خیالات کا حامل ہونا چاہیئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک یہ آفاقیت "ادبِ اُردو" میں فی نفسہٖ موجود نہ تھی۔ اور یہ نظریہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ادب کا مقصد و منشا ادب ہی کی تکمیل و ترصیع تک محدود ہے۔ یعنی "ادب صرف برائے ادب" ہے۔

اِس نظریے کے ماتحت متقدمین و متاخرین کے کلام دیکھ جائیے۔ سرسری مطالعہ کے بعد معلوم ہو جائے کہ "ادب برائے ادب" کا نظریہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ملک گیر تھا۔ ادب کی آراستگی و تہذیب کے لئے صنائع بدائع، تشبیہ و استعارہ، کنایہ و مجاز اور ایسی ہی دوسری صنعتوں سے برابر کام لیا جا رہا تھا۔ بے شک صنائع و بدائع کے استعمال نے ادب اُردو کو سنوارنے میں بڑی خوبصورتی سے کام لیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ شعر میں صنعت یا بنوٹ بھی پیدا ہو گئی۔ نفسیاتی تحلیل متقدمین سے لے کر آتش و ناسخ تک شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

لیکن بیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہو گئی۔ یہ تبدیلی تقاضائے وقت کے مناسب حال تھی۔ اب نظریہ یوں بدل گیا کہ "ادب برائے زندگی" ہے۔ ادب سے زندگی کا تعلق ہمیشہ رہا ہے لیکن ادب میں ہر جہتی زندگی کی ترجمانی ہمیشہ نہیں ہوئی۔ ادب کو زندگی کے ہر شعبے کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ لیکن شعرا نے زندگی کے صرف جمالیاتی اور جنسی پہلو پر زیادہ غور کیا اور دوسرے شعبوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

"ادب برائے زندگی" کے نئے نظریہ نے حساس اور صاحبِ نظر شعرا میں بصیرت کی ایک نئی روشنی پیدا کر دی۔ اُن کا تنگنائے خیال وسیع ہو گیا اور اُنھیں اپنی شاعری کا ماحول غیر محدود نظر آنے لگا۔ پہلے "اُردو شاعری" غزل اور تغزل تک محدود تھی۔ اب اس میں بلند خیالات اور نئے افکار کے لئے گنجائش نکل آئی۔ قلعوں اور ایوانوں کی ہنستی ہوئی شاندار زندگی سے لیکر، جھونپڑوں اور ویرانوں کی خاموش و متردد زندگی تک ادب کی نگاہ پہنچنے لگی۔ کسانوں، مزدوروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے جذبات شاعر کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ سرمایہ داری اور شخصیت کے خلاف شاعر کا قلم جنگ آزما تھا۔ جو شاعر تغزل کے پردے میں صرف عورتوں سے محوِ گفتگو تھا۔ اب آزادی کے ساتھ بادشاہوں اور کجکلاہوں سے ہم کلام ہونے لگا۔ جو ذہن فرضی یا لفظی حسن و محبت کے کھلونوں سے کھیل رہے تھے وہ حقیقی محبت و خلوص کی اہمیت محسوس کرنے لگے۔ محبت کا عنوان جو صرف نفسانی اور شہوانی

افسانوں کو دیا جاتا تھا۔ اب بین الاقوامی اور بین الملی ربط و ضبط اور عالمگیر اتحاد کے ضابطوں پر چیاں ہونے لگا۔ علامت و کہنگی میں موضوعات کو صدیوں سے قلمی شعبدہ بازوں کی طرح بار بار فریب نظر بناکر اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ اُن کی جگہ زندگی کی نئی قدروں اور حیاتِ انسانی کے نئے زاویوں نے لے لی یعنی اب ادب کی وسعتیں براہِ راست آفاقی زندگی کی تمام پہنائیوں اور گہرائیوں کو چھونے لگیں۔ سطحیت اُس کے غلبے سے خود بخود دبتی اور مغلوب ہوتی چلی گئی اور بالآخر "اُردو شاعری" بھی دوسری زبانوں کی مقبول شاعری کی طرح بنی نوعِ آدم کے لئے مفید تسلیم کرلی گئی۔

شاعر ہر ملک اور ہر زمانے میں پیغمبر کی طرح اپنے ملک اور قوم کی ہر گونہ اصلاح کے لئے موجود رہا ہے۔ اور ہر ملک اور ہر زمانے میں کسی موجود العہد شاعر کو وقت نے آواز دی ہے اور شاعر نے وقت کی آواز سُن کر اُس کے تقاضوں اور مطالبوں سے دُنیا والوں کو آگاہ کیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چار سو تراسی (۴۸۳) برس پہلے سدارتھ گوتم بُدھ نے ایک عرفانی اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے بھکشوؤں کے لئے ایک منظوم نظامِ تعلیم مرتب کیا۔ اُن کے یہ منظوم اشلوک آج بھی ہندوستان، تبت، چین اور جاپان میں قابلِ تنظیم و تبلیغ سمجھے جاتے ہیں۔ آج تک اُن کا باقاعدہ پاٹھ ہوتا ہے۔ اور اُن کی تعلیم ماضی کی طرح مستقبلِ عالم کے لئے آج بھی مُفید اور شایانِ عمل سمجھی جاتی ہے۔ اِسی طرح آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے جنگِ مہابھارت کے موقع پر سری کرشن نے ارجن کو آمادۂ جنگ کرنے کے لئے جو الہامی نظم کہی تھی وہ "بھگوت گیتا" کے نام سے آج تک مشہور ہے اور ایک مقدس کتاب کی طرح اُس کی پرستش ہوتی ہے۔ اس نظم نے مہابھارت کی جنگ کو فیصلہ کُن جنگ بنا دیا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں روسو اور والٹیر کے افکار نے فرانس میں آگ لگا دی۔ اِن فلسفی ادیبوں کی آتش بیانیوں نے نوجوانوں کو جوش دلاکر آمادۂ انقلاب کر دیا۔ روسو نے "میثاقِ ملی" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اِس میں لکھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا تھا۔ لیکن اُسے ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔" یہی کتاب انقلابِ فرانس کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔

نصرتی ایک ترکی شاعر نے جنگِ انگورہ کے عالمِ جمود میں جزر و مد کا ایک طوفانِ عظیم پیدا کر دیا۔ غازیانِ اسلام کے تیور بدل دیئے اور اُن کی رگِ حمیت میں آگ کے سمندر موجزن کر دیئے۔ انگورہ کے دارالخلافہ بننے کی تاریخ کے ساتھ آج بھی نصرتی کا نام زندہ ہے۔

جب احمد شاہ کجکلاہ بادشاہِ ایران کی عیش پسندیوں اور عشرت کوشیوں نے ایران کی سیاسی عظمت کو گرانا چاہا اور رعیت حکومت کی غفلت سے تباہ ہونے لگی تو وقت نے ایرانی شعراء کو آواز دی۔ ایرانی شاعر اُٹھا اور اُس نے اپنی گرم نوائی سے حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا۔

ہندوستان میں بھی ڈاکٹر سر اقبال اور اُن کے بعض معاصرین نے قومیت، وطنیت اور جمہوریت کی توضیح کرتے ہوئے شخصیت اور سرمایہ داری کی پھولی ہوئی برفانی رگوں کو اس طرح جھنجھوڑا کہ ملک میں جذبۂ قومیت گرما گیا اور جمود میں ایک قسم کی تحریک پیدا ہو گئی۔

تاریخِ عالم میں ایسے متعدد ادبا اور شعراء کا نام زندہ ہے، جو کسی نہ کسی قسم کے انقلاب کا باعث ہوئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوتی ہے کہ آج بھی میرے ملک میں ایسے آتش نفس شعراء موجود ہیں، جن کے افکار سے انقلاب کی بُو آتی ہے اور جن کے انفاس سے انقلاب کی چنگاریاں اُڑتی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ایسے شعراء صرف اُنگلیوں پہ گننے جانے کے قابل ہیں۔

میری گزارش کا مقصد و مفہوم یہ ہے کہ شاعر کا وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہونا ہی اُس کا فرضِ منصبی ہے، ادب و شعر سے تاریخیں بنتی ہیں۔ شعراء کے کلام میں جو تلمیحی کنائے ہوتے ہیں۔ وہ نظر انداز نہیں کئے جاتے۔ شاعر کے اشارۂ قلم سے داستانیں مرتب ہوتی ہیں۔ مؤرخ اُس کے مختصر خیالات و رموز کو تنقید و تحقیق کی روشنی میں پھیلاتا ہے۔ اُس کے اشعار کے پس منظر سے حقائق و معارف کے جلوے اُبھارتا ہے اور پھر تاریخ کے صفحات پر شرح و بسط کے ساتھ الفاظ کی صورت میں بکھیر دیتا ہے۔

آج بھی جو انقلاب ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اُسے دعوت دینے یا روک دینے کی قوت ہم میں موجود ہے۔ وقت آج بھی ہندوستانی شاعر کو آواز دے رہا ہے کہ وہ اُٹھے اور آنے والے انقلاب سے اپنے ملک کو آگاہ کر دے۔ یہ آواز ہر حقیقی اور غیر حقیقی شاعر کے کانوں تک مسلسل پہنچ رہی ہے۔

اب یہ بات شاعر کی فطری استعداد اور قوتِ شعور پر منحصر ہے کہ وہ اِس آواز سے متاثر ہو کر اُس کے اثرات کا پَرتو عوام الناس کے دلوں اور دماغوں

پڑھانے یا سماعت انداز کرنے۔

جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، لیکن سب کچھ ہو چکنے کے بعد، جب دورِ انقلاب کے جائزے کے ساتھ ہندوستانی شعراء کا محاکمہ بھی پرکھا جائے گا اُس وقت صرف اُسی شاعر کو شرفِ قبولیت و شہرت عطا ہو گا، جو زمانۂ انقلاب میں وقت کا، ملک کا، اور اقتضائے فطرت کا ساتھ دے گا۔ باقی شعراء (جن سے مجھے ہمدردی ہے) غیر شاعر مخلوق کی طرح نذرِ انقلاب ہو جائیں گے اور عہدِ جدید میں کوئی اُن کا نام لینا بھی پسند نہ کرے گا۔

اب ہر شاعر اپنی اپنی جگہ سوچے کہ اُسے خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا ہے، یا مٹتی ہوئی دنیا کو سنبھالنا اور باقیاتِ انقلاب کے ساتھ دنیا میں باقی رہنا ہے۔ شاعر کی زندگی اُس کے کلام کی زندگی سے عبارت ہے، ورنہ باقی رہنا تو صرف ایک ذاتِ باری کو شایاں ہے ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

اُردو شاعری کے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ شاعر کی آواز وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہو۔ اس دور میں تغزّلِ محض یا تفریحی شاعری مطلقاً قابلِ ترک ہے۔ تغزّل دورِ عیش و نشاط کی پیداوار ہے، یہ شعراء کے دماغوں کی خلاؤں میں علیٰ حالہٖ محفوظ رہ سکتا ہے۔ عہدِ جدید بھی اگر پُر سکون اور عشرت نما ثابت ہوا تو خیالی رنگ رلیاں منانے اور جنسی جذبات سے کھیلنے کا موقع پھر مل جائے گا۔ لیکن اس پُر شور زمانے میں جبکہ عیش کی محفلیں ویران ہو چکی ہیں۔ خواب آور گیتوں اور غفلت آفریں نغموں کے چھیڑنے کا وقت نہیں رہا۔ "غزل" کا عنوان "رجز" سے بدل دینے کی ضرورت ہے۔ تغزّل کی جگہ تخیّل، تاثر، تدبّر اور تفکّر کی ضرورت ہے خلوت میں بیٹھ کر پھولوں کی خیالی سیجیں سجانے سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہمارے راستوں میں جو واقعی کانٹے بچھے ہوئے ہیں اُنھیں سمیٹ دیا جائے۔

موضوعِ فکر اخلاقی و اصلاحی ہو۔ رکیک خیالات، فرسودہ موضوعات، جنسی تعلقات کے شرمناک اور عُریاں مظاہرے، فرضی وحشت و جنون اور صدیوں کے پُرانے قصے، بازاری زبان میں موزوں کر کے مشاعروں کی چھینٹیں اڑانے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے زیرِ اثر ماحول کو اصلاح و تہذیب کے پیغام دئے جائیں۔ وقت کی نزاکتیں بیان کی جائیں۔ انسان اور فطرت کے رشتے کو مضبوط کیا جائے۔ مادّیت نے حقیقت کے چہرے پر جو موٹے موٹے کثیف پردے ڈال دئے ہیں انھیں چاک کیا جائے اور اسلاف کے نقوشِ قدم کو بار بار رَوندنے سے باز آ کر آئندہ نسلوں کے لئے نئے نقوشِ راہ بنائے جائیں۔

کتنے نادان اور سادہ لوح ہیں میرے دوست جو ایک ہی پُرانے راستے میں ایک ہی جگہ پر برسوں سے اُچھل کود رہے ہیں، برسوں سے ایک ہی غلط راستے کی خاک اُڑا رہے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف سو میل فی منٹ کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں، اُن کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اسی راستے میں اُن کے بہت سے ہم خیال و ہم رنگ معاصرین اپنی اُڑائی ہوئی خاک میں مل کر خود بھی خاک ہو چکے ہیں اور آج تاریخِ ادب اپنے صفحات پر انھیں ایک اِنچ جگہ دینے کو تیار نہیں۔

قدیم الایّام غزل کی ملکیت، وہی لاکھوں مرتبہ کی سُنی سُنائی پُرانی دقیانوسی داستانیں ہیں، اُن کو بار بار دہرانے سے بہتر یہ ہے کہ اتحاد، وطن، اصلاحِ اعمال، تدبیرِ منزل، ارتقائے انسانیت، پیغامِ عمل، درسِ خود شناسی، اقتضائے وقت اور ضروریاتِ زندگی کے نئے موضوعات سے اُن کی تجدید کی جائے۔ آدمی کو انسان اور انسان کو فرشتہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ سیاست کی خطرناک دست درازیوں کو محبّت کے نازک اور لطیف ہاتھوں سے روکا جائے اور دنیا کو امن و سکون کی اُس منزل تک پہونچانے میں مدد دی جائے، جس کے لئے وہ صدیوں سے بھٹک رہی ہے۔

اس دُنیا میں رہنے والوں کی تمام مُرادیں، تمام خواہشات، تمام مقاصد، اور تمام اغراض کی تکمیل کے ذرائع اِسی دُنیا میں موجود ہیں۔ صرف اُنھیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام عوام کا نہیں بلکہ مفکّر شعراء کا ہے کہ وہ غور و فکر اور توجہ سے اُن اسباب کو ڈھونڈ نکالیں۔ اور اپنے اپنے ماحول میں اپنی آواز کے ذریعے تقسیم کر دیں۔

وہی اشعار جو مشاعروں میں سماعت سے ٹکرا کر فوراً مر جاتے ہیں، اگر اصلاحی اور اخلاقی قوتوں کے حامل ہوں تو سماعت سے گذر کر دل میں اور دل سے گذر کر ذہن و دماغ میں زندگی کا نیا شعور پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسا شعور جو انسان کی اینٹھی ہوئی اور سکڑی ہوئی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا کر اس کے مفلوج قوائے عمل میں حرکت پیدا کر دے۔ انسانی قوائے عمل کی حرکت ہی اِن اندھیروں کو عبور کر سکتی ہے جنھوں نے سورج کی تابانی اور چاند کی روشنی میں بھی

افسانوں کا دھاپا رکھتا ہے۔

دُنیا حقیقت کبریٰ تک پہونچنے کے لئے ایک گذرگاہ ہے۔ یہاں ہر متنفس ایک مسافر ہے۔ سب اپنی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر کسی کو اپنی منزل کا علم ہے اور کسی کو نہیں۔ شاعری کی منزل اُس کا نصب العین ہے۔ نصب العین کا تعین گویا منزل کا تعین ہے۔ مگر اس دَور کے بیشتر یعنی اسی فی صدی شعرا کا خصوصاً شعرائے متغزل کا کوئی نصب العین نہیں۔ اگر کہا جائے کہ غزل محض سے زبان کا تحفظ مقصود ہے۔ تو زبان، غزل میں اب سے بہت پہلے محفوظ ہو چکی ہے اُردو زبان کا کوئی لہجہ، کوئی اسلوب اور کوئی محاورہ ایسا باقی نہیں رہا جو نظم نہ ہو چکا ہو۔ غزل میں اگر گنجائش ہے تو جدید خیالات کی اور جدید خیالات کا دروازہ غزل گو شعرا پر بند ہو چکا ہے۔

شاعری فی نفسہ بہت کہن سال ہے۔ اس پر لاتعداد صدیاں گذر چکی ہیں۔ دُنیا اور شاعری دونوں ہم عمر ہیں۔ انسانی مُدرکات، احساسات اور جذبات وہی ہیں جو آدم اوّل میں فطرتاً ودیعت ہوئے تھے۔ ترقی تک خیال آرائی کرنے کے بعد اب وہ ایسا کون سا نیا خیال ہے جسے اُردو غزل پیش کر سکتی ہے۔ عرب اور عجم کے شعرانے کوئی ایسا خیال نہیں چھوڑا جو نظم نہ ہو گیا ہو۔ انسانی زندگی اور تصویرِ فطرت کا کوئی رُخ باقی نہیں رہا جسے شاعر کے ذہن و قلم نے چھو نہ لیا ہو۔

اب اگر کوئی نیا خیال پیدا ہو سکتا ہے تو صرف گرد و پیش کے نئے حالات سے، دُنیا کے روزانہ بدل جانے والے واقعات سے، انسانی حیات کی گوناگوں تبدیلیوں سے، اور کلیاتِ زندگی کے نئے زاویہ ہائے نگاہ پر غور کرنے سے۔ تو اس کے لئے تنگنائے غزل میں وسعت نہیں۔ مرزا غالب کبر آبادی نے آج سے ۷۶ برس پہلے اس کمی کو محسوس کیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب کو تو ظرفِ غزل صرف "بقدرِ شوق" تنگ نظر آتا تھا۔ مگر نیا تجربہ یہ ہے کہ غزل کا ظرف "بقدرِ خیال" بھی کشادہ نہیں۔

ڈاکٹر سر اقبال مرحوم نے لندن کے ایک جلسے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "اُردو زبان میرے پیغام کی متحمل نہیں ہو سکتی"۔ تا بہ غزل چہ رسد؟

غزل کی تنگنائی ثابت ہو جانے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو شاعری میں اور کونسی صنفِ کلام ایسی ہے جس میں جزئیات و کلیاتِ زندگی کی ترجمانی بہ آسانی و بہ آزادی ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری دُنیائے ادب میں اجتہاد و ایجاد کا قحط ہے۔ شاعری کے قاعدوں اور موضوعات میں ہم عربی اور فارسی شاعری کے عروض و قافیہ اور چونکہ کوئی نئی صنف ایجاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اُردو شاعری کے سرمایۂ موجودہ ہی کی طرف نگاہِ تجسس ڈالنی پڑتی ہے۔

غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جدید الاسلوب نظموں کے رواج نے ہمارے جدید رجحانات کی ترجمانی کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے اور ایسی نظموں کے ذریعے اپنے خیالات دُنیا کے سامنے آزادی سے پیش کر سکتے ہیں۔ نظم نویسی کا یہ دَور ایک کامیاب دَور ہے۔ اس کے بعد بھی جو ارتقائی دور آنے والا ہے وہ مختصر نظموں ہی کا دَور ہوگا جن میں بجائے تفصیل و ترتیل کے، خیال و موضوع کی رشح، ایجاز و اختصار کے ساتھ پیدا کی جائے گی اور میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اُردو شاعری کا یہ دَور ہر دَور سے زیادہ کامیاب ہوگا۔

اس قدر عرض کرنے کے بعد اب میں پھر اپنے مقصدِ اصلی کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور بہ آوازِ بلند اپنے دَور کے تمام شعرا سے خطاب کرتا ہوں کہ وہ موجودہ عہد کے انقلاب کے مطالبوں سے آگاہ ہوں۔ وقت کی آواز پر توجہ کریں۔ اور اپنی ذہنی دلچسپی و قوتوں سے اس انقلاب کا مقابلہ کریں جو انگلینڈ، فرانس، جرمنی، رشیا، یونان، جاپان، چین اور بہت ہی پُرسکون فضاؤں کو تاراج و برباد کر کے ہندوستان کی طرف آنے کے لئے پَر تول رہا ہے۔ اپنے ملک اور قوم کی تمام قوتوں کو للکار کر جگائیں، اُنھیں انقلاب سے بچنے کی تدبیریں بتائیں۔ انھیں زندگی کی شاہراہوں میں پُرامن طریقوں سے گذرنے کے طریقے سکھائیں، اور اپنے الہامی نغموں سے ایسی فضا پیدا کر دیں کہ انھیں سُن کر ایک مرتبہ انقلاب بھی اپنی جگہ پر جھوم جائے۔

زندگی اور زندگی شناسی کا ثبوت دینے کا یہی وقت ہے۔ اگر ہمارے شعرا اس وقت بھی قدیم الخیالی اور تقلید کے اندھیروں میں پڑے رہے تو یاد رکھیں کہ ان پر زندگی کا سورج پھر کبھی طلوع نہ ہوگا۔

سیّد احتشام حسین

اُردو کے صُوفی شُعرا[1]

صوفیانہ تصورات اور خیالات کا شاعری سے — جو دل کی واردات ہے — اتنا گہرا تعلق ہے کہ دُنیا کی ہر زبان میں اس کی جھلک مل جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی یہ خیالات ہر جگہ تقریباً یکساں شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی اپنے ملک کی مذہبی، تہذیبی اور فلسفیانہ روایات اور تعلیمات کے مطابق زندگی اور ادب میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مذہبی شعور میں ابتدا ہی سے صوفیانہ اور مابعد الطبیعاتی خیالات ملنے لگتے ہیں۔ لیکن بُدھ مت کے اثرات سے اِن خیالات میں خاصی تبدیلیاں ہوئیں، جنھیں سِدھوں، سنتوں اور ناتھ پنتھیوں کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بُدھ متوں کا زاہدانہ انداز عملی طور سے ہندو سادھوؤں اور بھگتوں کے اعمال پر اثر انداز ہوا۔ اِس کے بعد جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ صُوفی معتقدات کے وہ خیالات اپنے ساتھ لائے، جن میں اسلامی، زرتشتی، بُدھی اور نو افلاطونی تصوّرات کی آمیزش ہو چکی تھی اور فارسی شاعری تک میں اُن کو جگہ مل چکی تھی۔ اِن صوفیانہ آثار کی بُنیاد تو یقیناً اسلامی عقائد اور افکار پر تھی لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے بہت سے مسلمان علما اور فقہا اُن کی سخت تنقید کرتے تھے اور اُن کی اشاعت کرنے والوں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ اسلام کی غلط تصویر پیش کر رہے ہیں کیونکہ اُن میں مختلف تصوّرات کی آمیزش ہے۔

بہرحال جب صُوفی علما اور شعرا ہندوستان میں آئے اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تو یہاں کے بھگتوں اور مفکّروں نے راہِ سلوک اور انسان دوستی میں اپنے سے بہت قریب پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اِنھیں لوگوں نے اُس وقت ہندو اور مسلم عوام کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی، جب حکومت اور اقتدار و اختیار کے لئے دونوں جانب تلواریں چمک رہی تھیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اُن میں سے زیادہ تر صوفی فقرا، جو شاعر اور ادیب بھی تھے، اُسی سچائی کی جستجو کر رہے تھے جو محدود دائرۂ تنگ مذہبی افکار کی بندشیں توڑ کر انسان کے محبت بھرے دل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہندو بھگتی کے خیالات پر مسلمان صوفیانہ خیالات کا اور صوفیانہ خیالات پر بھگتی کا اثر کن کن شکلوں میں پڑا، یہ عالمانہ تحقیق کا موضوع ہے لیکن جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ ایک قسم کا فکری لین دین ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان صُوفی مفکّر نِرگُن اور سرگُن کی بات کرنے لگے تھے اور ہندو بھگت ذات پات کی تفریق اور مذہبی تنگ نظری کا مذاق اُڑانے لگے تھے۔ یہ ماحول تھا، جس میں اُردو کا ارتقا ہو رہا تھا۔ عوام تک پہنچنے کے لئے صوفیوں نے اسی ملی جلی بول چال کی بھاشا سے کام لیا۔ اِسی لئے اُس وقت کے جتنے ادبی یا شعری نمونے ملتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر صوفیوں ہی کی تخلیقات ہیں۔ بابا فرید شکر گنج، بو علی قلندر پانی پتی، امیر خسرو، یحییٰ منیری، بندہ نواز گیسو دراز، شیخ بہاء الدین باجن، عبدالقدوس گنگوہی، بہاء الدین برناوی، شاہ ہاشم حسنی وغیرہ سب کے سب تیرہویں سے پندرہویں صدی تک میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے

---

[1] یہ مضمون ہندی پڑھنے والوں کے لئے ہندی میں لکھا گیا تھا۔ اسی کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

تھے۔ مگر ان میں سے صرف چند ہی ایسے ہیں جن کے کچھ ملفوظات اور اشعار اُردو میں ہم تک پہونچے ہیں۔ اِس جگہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے اِن میں صرف امیر خسرو اور سید گیسودراز کو اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ اوّل تو اُن کی متعدد تحریریں دستیاب ہوگئی ہیں اور دوم یہ کہ اُن کا اثر ادیب اور شاعر کی حیثیت سے گہرا نظر آتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ جس زمانے میں کھڑی بولی کا وہ ڈھانچہ کھڑا ہورہا تھا جسے اُردو کہا جاتا ہے، اُسی عہد میں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مختلف زبانیں ترقی کر رہی تھیں، جن میں برج بھاشا، ہریانی، اَودھی اور پوربی بولیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اُردو سے قریب بھی ہیں اور اُردو کی ہم عصر بھی۔ اسی وجہ سے کئی مسلمان صوفی شاعروں نے اپنے خیالات کا اظہار ان زبانوں اور بولیوں میں بھی کیا ہے، جن کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سبھی ہندی داں قطبن، منجھن، ملک محمد جائسی، عثمان اور نور محمد کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ امیر خسرو کی جو تخلیقات اُردو، ہندی یا ہندوستانی میں دستیاب ہوئی ہیں اُن میں دہلی کی کھڑی بولی کے علاوہ برج اور ہریانی کا میل بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ گیسودراز جو چودھویں صدی کے ایک بڑے صوفی فقیر تھے، تیمور کے حملے کے بعد دہلی سے دکن چلے گئے اور وہاں اپنی پریم بانی سنانے لگے۔ خسرو کی طرح وہ بھی فارسی کے ایک بڑے ادیب، عالم اور شاعر تھے اور اُردو میں صرف اپنے اُن مریدوں اور معتقدوں کے لئے لکھتے تھے جو فارسی عربی سے ناواقف تھے۔ اُن کے خیالات پر نرگن وادیوں کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں اور اُن کا مطالعہ اُن کی متعدد نظم اور نثر کی تحریروں میں کیا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے بعض خیالات اور اظہار کے بعض اسالیب مہاراشٹر کے ہندو بھگتوں سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔

یہ تو اُردو میں صوفی شعرا کی بنائی ہوئی روایتوں کی ابتدا تھی۔ آگے بڑھ کر اس میں اور قوت پیدا ہوئی۔ پندرہویں ہی صدی میں ایسے صوفی شعرا بھی نظر آنے لگتے ہیں جن کے صوفیانہ خیالات میں شعر و ادب کی فنی لطافتیں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اُن میں دکن کے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ اور گجرات کے خوب محمد چشتی بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ ان کا زمانہ وہی ہے جو جائسی، کبیر، سور اور تلسی داس کا ہے۔ میراں جی شمس العشاق کی تین نظمیں ملتی ہیں اور تینوں صوفیانہ خیالات سے مملو ہیں۔ اُن کے فرزند برہان الدین جانم جتنے بڑے صوفی تھے اُتنے ہی بڑے شاعر تھے۔ اُن کی نو دس طویل نظمیں موجود ہیں لیکن ابھی تک صرف ایک سکھ سہیلا شائع ہوئی ہے۔ گجرات کے خوب محمد چشتی اپنی نظم خوب ترنگ کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اس نظم کا موضوع بھی صوفیانہ مسائل کا تجزیہ اور اظہار ہے تاکہ فارسی، عربی نہ جاننے والے ان مسائل کو سمجھ سکیں لیکن خیالات کی گہرائی اور زبان کی نارسائی کی وجہ سے نظم اتنی مشکل ہوگئی کہ خود شاعر کو اس کی شرح فارسی میں لکھنی پڑی۔ دکنی اُردو ادب میں تصوّف کی جن روایتوں کو جڑ پکڑنے کا موقع ملا۔ وہ عوامی ہونے کی وجہ سے بہت گہری تھیں۔ اس لئے اُس وقت بھی پھلتی پھولتی رہیں جب دکن میں شاہی سرپرستی کا دَور شروع ہوا اور اکثر شعراء درباروں سے وابستہ ہوگئے اور شاعری عشق و عاشقی کی ترنگوں میں غرق ہوگئی۔ اس روایت کو دوبارہ اُس وقت زندگی ملی جب دکن کی مقامی حکومتیں ختم ہوگئیں اور تقریباً سارا دکن دہلی کی مغل حکومت کے زیرِ اقتدار آگیا۔ صوفیانہ میلانات کے زبردست احیا کا یہی تاریخی اور سیاسی سبب بھی ہوسکتا ہے۔ ولی گجراتی، قاضی محمود بحری، اور شاہ سراج اورنگ آبادی نہ صرف اِس عہد کے اور اس علاقے کے بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اُردو شاعری کی پوری تاریخ میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ شعراء محض صوفیانہ خیالات کی اشاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تقریباً صوفیانہ زندگی بھی گزارتے تھے، تصوّف کے متعلق اُن کی معلومات کتابی نہ تھی وہ اپنے باطنی تجربات بھی پیش کرتے تھے۔ ولی کی غزلیں، بحری کی مثنوی من لگن اور سراج کی مختلف شعری تخلیقات اس روایت کی کڑیاں ہیں جو اس وقت کی سبھی زبانوں میں قریب قریب اسی انداز میں ملتی ہیں۔

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کا سماجی اور تہذیبی ماحول اتنا بدل چکا تھا کہ اُس میں گہرے صوفیانہ خیالات کی بہت کم جگہ رہ گئی تھی مغلوں کے زوال اور سلطنت شاہی کے انحطاط کی وجہ سے جو دردناک اور تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی اُس نے ایک طرح کی یاس انگیزی اور قسمت پرستی کو جنم دیا لیکن اِس میں تیاگ، بھگتی اور قناعت پسندی کی وہ روح نہ تھی جو مایوسی کو بھی اُمید میں بدل دیتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں خود اعتمادی اور روحانی قوت اتنی گھٹ چکی تھی کہ لوگ بس جئے جارہے تھے، جیسے اُمید تھی نہ یاس،

نہ خواب تھے نہ حوصلے، نہ اُمنگ تھی نہ جوش۔ اس حالت میں بہت سے شاعروں نے جن کے خیالات صوفیانہ تصورات سے ملتے جلتے تھے اسی طرح کے خیالات پیش کئے، لیکن درحقیقت وہ راہِ تصوف کے رہنما نہ تھے، اُن میں جذبات و خیالات تو وہی تھے جو صدہا سال سے صوفی شعراء فارسی اُردو اور ہندی کے ظاہر کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن وہ آگ نہ تھی جو سچے صوفی یا سنت کی زندگی اور خیالات میں شعلہ بن کر چمکتی ہے۔

جب دہلی میں اُردو شاعری کا رواج ہوا اور سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے اُسے ادبی اہمیت بھی حاصل ہوگئی تو ابتدائی دَور کے شعراء نے تصوف ہی کا دامن تھاما۔ آبرو، حاتم، مظہر، ناجی، درد، میر سبھی کسی نہ کسی حیثیت سے، کم یا زیادہ صوفی تصورات سے متاثر تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد تو اس رنگ میں بالکل رنگے ہی ہوئے تھے، سلوک اور ریاضت کی راہوں سے گزرے تھے، پیری مریدی کے سلسلے سے منسلک تھے اور اُن کی عزت اسی طرح کی جاتی تھی جیسے بڑے فقراء کی کی جاتی ہے، اِس لئے اُن کے افکار میں تصوف کا وہ عنصر نمایاں ہے، جو عشق کے رُوحانی تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری کا اچھا خاصا حصہ اسی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے بچپن ہی میں ایک صوفی اور درویش باپ اور ایک منھ بولے فقیر چچا کی گود میں محبت اور تیاگ، فقر اور استغنا، جفاکشی اور درویشی کے تصورات اپنے اندر جذب کر لئے تھے۔ اُن کا بہت ہی دلچسپ اور پُراثر تذکرہ اُنھوں نے اپنی آپ بیتی ذکرِ میر میں کیا ہے۔ یہی باتیں اُن کے اشعار میں بڑی دلکشی، قوت اور فن کارانہ اثر انگیزی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

اٹھارویں سے گزر کر انیسویں صدی میں پہنچیں تو اُردو کے دو بہت بڑے شاعروں سے ملاقات ہوتی ہے، لکھنؤ کے خواجہ حیدر علی آتش اور دہلی کے مرزا اسداللہ خاں غالب۔ اُردو کی صوفیانہ شاعری کے مختصر سے جائزے میں بھی ان دونوں کا نام لینا ضروری ہے کیونکہ تصوف کی رُوح اِن دونوں کے یہاں جلوہ گر ہے۔ صوفی شعراء کے سلسلے میں آتش کا نام تو خواجہ میر درد کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ بھی صرف خیالات کے لحاظ سے نہیں، اپنے مزاج، شعور، رہن سہن کے لحاظ سے بھی ایک صوفی اور فقیر تھے۔ اُنھوں نے صوفیانہ تصورات کو شاعری میں اُس وقت پوری قوت سے جگہ دی، جب مذہب انسانوں کے لئے صرف رسم اور بندھن بن کر رہ گیا تھا۔ ان کی درویشانہ آزاد منشی اس ماحول میں بڑا حسن رکھتی تھی۔ مرزا غالب اپنے اعمال میں نہیں خیالات میں صوفی تھے۔ اُن کا فلسفۂ حیات وسیع المشرب اور اُن کا نقطۂ نظر ہر طرح کے مذہبی تنفر اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ صدیوں سے ہندوستان کے شیخ و برہمن نے ایک ساتھ رہ کر رواداری اور ہم خیالی کی جو دولت جمع کی تھی، اُس کا خوبصورت اظہار مرزا غالب کی شاعری میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہو چکا تھا، تعلیم، افکار و خیالات، طرزِ بود و ماند، تہذیبی شعور ہر چیز میں زبردست تغیر ہو رہا تھا، ان میں صوفیانہ خیالات کے لئے کوئی جگہ نہ تھی پھر بھی ان سے اخذ کئے جانے والے وسیع اندازِ نظر اور جذباتی ہم آہنگی کے دلکش پہلوؤں کو ہر دَور کے اُردو شعراء نے سینے سے لگائے رکھا۔ وہ اُن خیالات کو اپناتے رہے، جو مذہب اور ذات پات کے ہوتے ہوئے بھی انسانی محبت اور حق پسندی پر زور دیتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے نیاز بریلوی، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری، امر ناتھ ساحر دہلوی، بے نظیر شاہ، سورج نرائن مہر، کشن پرشاد شاد، امجد حیدرآبادی، اصغر گونڈوی اور دوسرے شعراء اس روایت کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ یہ شعراء موجودہ دَور کی بے یقینی اور بے رنگ مادیت کے باوجود صوفیانہ رنگ میں محبت کے گیت گاتے رہے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ صوفیوں کے بہت سے سلسلے اور طبقے ہیں جن کے خیالات میں مختلف قسم کے نازک اور باریک فرق ہیں۔ لیکن اُردو شاعروں نے اپنی تخلیقات میں کسی مخصوص مسلک یا سلسلہ کے طریقوں کی تلقین اور تبلیغ نہیں کی۔ بلکہ صرف تصوف کی اُس رُوح کو پیش کیا جسے آج انسان دوستی اور جذباتی ہم آہنگی کے اُصولوں کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

گیت کیا ہے؟

گیت مزاجاً نسوانیت کے غنائی اظہار کی ایک صورت ہے۔ ثقافتی لحاظ سے اس کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے اور زمین عورت سے مشابہ ہے۔ وہ عورت ہی کی طرح "رُوح" کو ایک ارضی جسم عطا کرتی ہے اور زندگی کی بقا اُس کا عظیم ترین مقصد ہے تاہم اس مقصد کی تکمیل کے لئے خود "زمین" کو "آسمان" کی ضرورت ہے۔ آسمان سے نہ صرف وہ برکھا نازل ہوتی ہے جس پر زمین کی روئیدگی کا دارومدار ہے بلکہ وہ روشنی بھی جسے اپنے اندر جذب کرکے وہ گویا تخلیق کے عمل میں مُبتلا ہو جاتی ہے۔ مزاجاً زمین متلوّن اور تغیر پذیر ہے۔ اور ہر نئے موسم سے ایک نیا لبادہ مستعار لیتی ہے۔ دوسری طرف آسمان خود کو روشنی۔ کہ تحرّک سے ظاہر کرتا ہے۔ جب آسمان اور زمین ملتے ہیں اور روشنی کا تحرّک خود کو زمین میں جذب کر دیتا ہے تو اُس کے نتیجے میں زمین زرخیز ہو جاتی ہے۔ یوں دیکھیں تو رات گویا زمین کے ایک حصّے کے لئے فراق اور مفارقت کا وقفہ ہے۔ جب کہ دن وصال اور ملن کی ایک صورت ہے۔ زمین کی متلوّن مزاجی کی سب سے بڑی علامت رگ وید کی دیوی ارسیانی ہے جو سدا ایک سی حالت میں نظر نہیں آتی۔ خود عورت نے تنوّع، رنگینی اور تلوّن کی صفات براہِ راست زمین سے حاصل کی ہیں۔ پھر جس طرح زمین، آسمان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کا مظہر پھول اپنے رنگ اور باس کی مدد سے تتلیوں اور بھونروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے بعینہٖ عورت بھی بناؤ سنگھار سے مرد (آسمان) کو سدا اپنی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔

عورت نے مرد کو اپنی طرف ملتفت کرنے کے لئے جو طریق اختیار کیا ہے اُسے عورت کے "جادو" کا نام ملا ہے۔ جادو سے مراد ہی یہ ہے کہ کوئی ایسی کیفیت وجود میں آئی ہے۔ جس نے فریقِ ثانی کی تمام مدافعتی قوتوں کو سلب کر لیا ہے۔ اس جادو کو زیادہ فعّال بنانے کے لئے عورت نے مرد کی تمام حِسّیات کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً بھڑکیلے رنگوں اور تیز خوشبوؤں کے استعمال سے اُس نے مرد کی باصرہ اور شامّہ کو تسکین بہم پہنچائی ہے اور اپنی آواز کے لوچ سے اس کی سامعت کو! گیت میں عورت کے اسی جادو کا پرتَو ملتا ہے۔ گویا گیت میں عورت کی ساری نسوانیت سمٹ کر یکجا ہو گئی ہے: اس کا حسن، آواز اور جسم کا لوچ ــــ یہ تمام پہلو گیت میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ بات قابلِ غور ہے کہ گیت میں سامعہ کا پہلو نسبتاً زیادہ اُجاگر ہوا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ گیت میں لَے، تھاپ اور جھنکار کا براہِ راست تعلق سامعت سے ہے۔ نمودِ حیات کے بارے میں بھی یہ قیاس کہ پہلے روشنی نمودار ہوئی جس کے لئے بصارت کو متحرک کیا گیا اس قدر قرینِ قیاس نہیں جتنا کہ یہ خیال کہ پہلے موسیقی وجود میں آئی جسے گرفت میں لینے کے لئے سب سے پہلے "سامعہ" کو متحرک کیا گیا۔ چنانچہ ہندو علم الاصنام میں برہما کی محبوبہ سرسوتی نغماتی زیر و بم کی مدد سے کائنات کی تخلیق کرتی ہے۔ اس خیال کی سچائی کا ثبوت انسانی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ بچّہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ہاں سب سے پہلے "سامعہ" متحرک

"سننے" کی کوشش کرتا ہے خود جنگل آوازوں کا مسکن ہے اور جنگل یا زمین سے جڑی ہے اور وہ دیکھنے اور پہچاننے سے بہت پہلے سے وابستہ تہذیب "سامعہ" کے مدارج سے گزر رہی ہوتی ہے۔ جب یہ تہذیب جنگل سے نکل کر کھلی فضا میں آتی ہے تو اس کی لطافت برانگیختہ ہو جاتی ہے۔ چونکہ گیت جنگل اور زمین کی پیداوار ہے اس لئے یہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سامعہ کو متحرک کرتا ہے۔ اسی لئے گیت مزاجاً موسیقی سے ہم آہنگ ہے، رقص اس کا ایک اضافی پہلو ہے اور یہ عورت کی مرد کے لئے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ چنانچہ بنیادی طور پر گیت میں مرد مخاطب اور معشوق ہے اور عورت ایک عاشقِ زار! پھر چونکہ گیت عورت کی طرف سے اظہارِ محبت کی ایک صورت ہے اس لئے اس میں سوچ اور تخیل کا تحرک نسبتاً بہت کم ہے۔ اس کی جگہ ایک والہانہ جذبے نے لے لی ہے۔ فی الواقعہ گیت عورت کے جسم کی پکار ہے اور اسی لئے اس میں نہ صرف جذبات کی فراوانی ہے بلکہ یہ کسی مثالی یا تخیلی محبوب کی بجائے، ایک گوشت پوست کے بت کو اپنی نگاہ کا مرکز بناتا ہے۔

مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ گیت عورت کے جسم کا اظہار نہیں بلکہ اس کی پکار ہے اور پکار اسی وقت وجود میں آتی ہے جب باہر سے جسم کو کوئی چرکا لگتا ہے۔ ایک ایسے ٹھہرے ہوئے معاشرے میں جس پر جنگل کی فضا پوری طرح مسلط ہو، فنونِ لطیفہ کی نمو ممکن ہی نہیں۔ فنونِ لطیفہ صرف اس وقت وجود میں آتے ہیں جب باہر سے کوئی عنصر اس معاشرے میں داخل ہوتا اور اسے "روح" عطا کر دیتا ہے بالکل ایسے ہی عورت، جنگل کے ایک خودرو پودے کی طرح اس "پکار" سے ناآشنا ہوتی ہے جو گیت کی جان ہے۔ پھر یکایک دور دیس سے کوئی مسافر آتا ہے۔ کورا برتن بج اٹھتا ہے۔ پودے کو ایک زخم لگتا ہے اور دل میں جذبہ متحرک ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پر گیت اس محبت کا اظہار ہے جو مسافر کو دیکھتے ہی عورت کے دل میں پیدا ہوئی اور جو مسافر کے چلے جانے کے بعد ایک "آتشِ پنہاں" کی صورت اختیار کر گئی۔ گیت کا اصل مزاج فراق اور مفارقت کی اسی آگ سے مرتب ہوتا ہے۔ کالیداس کی "شکنتلا" میں جب راجہ شکنتلا کو جنگل میں ملتا ہے، اس سے بیاہ رچاتا ہے، اس کے دل میں محبت اور رحم میں اپنا نطفہ چھوڑنے کے بعد واپس چلا جاتا اور شکنتلا کو بھول جاتا ہے تو شکنتلا کے دل میں جو کسک اور بے قراری جنم لیتی ہے وہی گیت کا اصل موضوع ہے۔ اور اسی ایک کیفیت کو ہر اس گیت میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو اس کے اصل مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

گیت، عورت کے جذبۂ آزادی کی پیداوار ہے یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب زمین سے چمٹی ہوئی عورت شعورِ ذات کی پہلی کروٹ سے آشنا ہوتی ہے اور تمام بندھنوں کو توڑ کر اپنے پیتم تک پہنچنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن تیاگ کا یہ عمل منفی انداز کا حامل نہیں۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ جسم اور اس کے مقتضیات سے "نجات" حاصل کی جائے جیسا کہ یوگ، ویدانت، اور بدھ مت وغیرہ میں عام ہے۔ یہ تیاگ تو ایسا مثبت عمل ہے جس میں مبتلا ہو کر عورت اپنے دیس کی دھرتی کو چھوڑنے اور اپنے پیتم کے دیس سے ایک نیا رشتہ استوار کرنے کی خواہش کرتی ہے ــ گویا عورت کی بنیادی فطرت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے منصب سے دست کش ہو کر تخلیق کے عمل سے ناآشنا ہو جاتی۔ وہ تو صرف اس محبت کے تحت جو اسے اپنے محبوب سے ملی ہے، اپنے میکے کو چھوڑنے کی خواہش کرتی ہے۔ گیت تیاگ کے اسی مثبت عمل کا ایک والہانہ اظہار ہے اور اسی لئے اس[1] میں عورت کا ایک لمحاتی جذبۂ آزادی جلوہ گر ہوا ہے۔ چنانچہ محبت سے ناآشنا ایک دوشیزہ اور گھر گرہستی میں جکڑی ہوئی وہ عورت جو اپنے پی کے دیس کا

[1] ہائے کیا بات کورے برتن کی۔ نظیر اکبر آبادی

ایک شجر سا ہے ــــــ اِن دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ دونوں زمین کی فطرت کے تابع، شجر اور سماج کے کل کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن اِن دو ادوار کا وہ درمیانی عرصہ جس میں عورت محبت کے ذائقے کو چکھتی اور اپنے دیس کو چھوڑ کر ایک نئے دیس کو سدھارنے کی خواہش کرتی ہے۔ دراصل آزادی کا وہ قیمتی وقفہ ہے جس نے گیت میں اپنا مکمل اظہار کیا ہے۔

گیت، عورت کے جذبۂ محبت کا اظہار ہے اور عورت سماج کے لئے ایک علامت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ گیت نہ صرف اس معاشرے میں جنم لیتا ہے جس کی اساس مادری نظام پر قائم ہوتی ہے بلکہ سماجی زندگی کے اُس دَور میں جنم لیتا ہے جب سوسائٹی اپنے بوجھل جسم میں روح کی پہلی کروٹ کو محسوس کرتی ہے۔ گویا گیت سوسائٹی کے "جذبۂ آزادی" کی ابتدائی صورت کو پیش کرتا ہے لیکن ابھی آزادی کی یہ "کروٹ" بطنِ مادر کے اندر ہے۔ تاحال اُس نے ماں سے الگ ہو کر ایک نئے جسم کا رُوپ اختیار نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جائے تو زمین یا ماں سے منقطع ہو کر خود گیت کسی اور صنفِ شعر میں ڈھل جائے۔ گیت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ 'ماں' زمین یا معاشرے کے بطن میں پیدا ہونے والی کروٹ کا علمبردار ہے ــــ چنانچہ گیت میں زمین سے وابستگی بہت توانا ہے۔ مثلاً گیت کی آواز میں دھرتی کی بہت سی دوسری آوازیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جیسے پپیہے کی 'پکار' کوئل کی 'کُوک' مینا کا 'ترنم' بھونرے کی 'گُن گُن' وغیرہ۔ اِسی طرح محبوب کے دیس کی طرف جاتا ہوا بادل یا چاند، ندی کنارا، جنگل، برکھا، پھلواری ــــ یہ تمام چیزیں مل کر وہ پس منظر تیار کر دیتی ہیں جس پر محبت اپنے نقوش اُجاگر کرتی ہے۔ اِس فضا میں فطرت کا ترنم، رقص، باس اور چھوئی موئی سی کیفیت ــ یہ سب کچھ شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب دُور سے آنے والی بنسی کی تان کو سُن کر (اور بنسی محبوب کا بُلاوا ہے) عورت گیت گاتی ہے تو گویا ساری دھرتی (فطرت) اپنے جادو کا تماشا دکھاتی اور رقص کرتی ہے۔ ہندو فلسفے میں دھرتی کے اِسی جادو کو پرکرتی یا لیلا کا نام ملا ہے اور پُرش کے لئے یہ ضروری قرار پایا ہے کہ وہ پرکرتی کے اِس جادُو سے باہر نِکل آئے۔ گیت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اِس میں پرکرتی کی فضا سے اُوپر اُٹھ کر محبوب کے آستانے تک پہنچنے کی آرزو جنم لیتی ہے۔ اور اِس خواہش کے احترام میں عورت اپنے پس منظر سے اوپر اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہرحال گیت عورت اور سوسائٹی کے جذبۂ آزادی کا مظہر ہے۔ اور یہ اُس سماج میں جنم لیتا ہے جو تہذیب کے مختلف مدارج کو طے کرنے کے بعد "روح" کے پرتو سے پہلی بار آشنا ہوتا ہے۔

گیت، محبت میں مبتلا، ایک عورت کے دل کی پکار تو ہے لیکن جیسا کہ ہر صنفِ شعر کا قاعدہ ہے، گیت میں بھی بعض اوقات تذکیر و تانیث سے بے اعتنائی کی روش اُبھری ہے اور بعض اوقات اُس نے مرد کی طرف سے اظہارِ محبت کی بھی صورت اختیار کی ہے۔ لیکن اس سے گیت کا بنیادی مزاج ہرگز تبدیل نہیں ہوا۔ کیوں کہ مرد کی طرف سے لکھے گئے گیت بھی نسوانیت کے لہجے، محبت کے ارضی پہلو اور سراپا نگاری کے ایک واضح میلان ہی کو سامنے لائے ہیں ــــ وہ میلان جس کے تحت بُت پرستی کے عمل کو توانائی حاصل ہوتی ہے نیز جس میں سوچ اور تخیل کا وہ عنصر ناپید ہے جو مرد کی محبت کو تحرک عطا کرتا ہے اور جس کے تحت مرد اکثر اوقات ارضی مظاہر سے منقطع ہو کر عشق کی ماورائی کیفیات میں ڈوب جاتا ہے۔ گیت تو بُت پرستی کا ایک عمل ہے اور اِس لئے اگر یہ عورت کی بجائے مرد کی طرف سے بھی کہا جائے تو اُس کے مزاج میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوتی۔ ویسے مرد کے کردار کا ایک نسوانی رُخ بھی ہوتا ہے جو اگر گیت میں اپنا اظہار کرے، تو اس میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ اس سب کے باوجود گیت بُنیادی طور پر عورت کے اظہارِ محبت کی ایک صورت ہے اور اُس کے معتدبہ حصے میں مرد ہی مخاطب اور محبوب ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی گیت وہ جذبہ ہے جو جسم کے نشاطی زیر و بم پر رقص کرتا ہے۔ یہ جذبہ محبوب کے لمس سے

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر دیکھئے)

ڈاکٹر سید حامد حسین

معاصرانہ تنقید

ادب کا کام زندگی کو دریافت کرنا ہے اور ناقد کا کام ادب کو دریافت کرنا۔ ادیب اور ناقد دونوں کا عمل اس حیثیت سے تخلیقی ہوتا ہے کہ دونوں اپنے خام مواد کو ایک تنظیم، ترتیب اور مفہوم کی وحدت بخشتے ہیں۔ ادیب زندگی کے رنگا رنگ تجربوں سے وہ نقوش تیار کرتا ہے جو ہمیں زندگی کے کسی پہلو، کسی حادثہ یا کسی تاثر سے ایک گہری مانوسیت اور قربت پیدا کرتے ہیں۔ ناقد اسی طرح اپنے خام مواد کے طور پر ادب کو استعمال کرتا ہے اور وہ ادب کی تاثیرات در اصل کے میلانات کو ادبی روایات کے ساتھ ایک منطقی ربط کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جس طرح ادیب اُن عام حادثات میں جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں اپنے فنکارانہ عمل سے ایک توانائی اور تاثر پیدا کرتا ہے، اسی طرح ایک ناقد کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ فن کی ان تاثیرات کو جو ہماری فنی حس کو بالواسطہ یا غیر شعوری طور پر آسودہ کرتی ہیں اس طرح اُجاگر کرے اور ان تاثرات کی اصل سے اس طرح واقف بنائے کہ ہم اس فن پارہ کی فنی عظمت سے شعوری طور پر واقف ہوسکیں۔ ادیب جو کام زندگی کے معمولی حادثات کے اندر فنی توانائی اور تاثر کی گہرائی دریافت کرکے انجام دیتا ہے، وہی کام ناقد ادب کی تخلیق و تاثیر کے ایک معنوی ربط کو دریافت کرنے کی صورت میں کرتا ہے۔ مگر جب تنقید نگار اپنے دَور کے ادب کو اپنا موضوع بناتا ہے تو وہ صرف اپنے عصر کے ادب کو دریافت کرتا ہے بلکہ وہ اپنے عہد کے بلند پایہ ادیب کو اور اُس کی عظمت کی اصل کو بھی دریافت کرتا ہے۔

ہمارے اپنے دَور کی ادبی تحریکات اور ادبی میلانات زندہ ہوتے ہیں۔ اِن میں ترقّی کے اِمکانات اور تجربوں کی گنجائش رہتی ہے۔ چنانچہ کوئی بات ایسی کہنا جو معاصر ادب کے بارے میں قطعی فیصل ہو ناممکن ہے۔ اپنے سے پچھلے دَور کی تحریکات ہمیں اپنی پُوری تکمیل کے ساتھ ملتی ہیں اور ہم ان کو ہر طرح پرکھنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ پرکھ ہمیں اپنے پچھلے دَور کے قد آور ادیبوں اور اُن کے زندۂ جاوید شاہکاروں کی یقین دہانی کراتی ہیں۔ مگر جب ایک ناقد اپنے عہد کے ادب کا جائزہ لیتا ہے تو اُس کے سامنے حقیقت کے ساتھ ساتھ امکانات کا ایک سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ متعدد تحریکات اور تجربے جو اُس کے عہد کے ادیب برت رہے ہوتے ہیں وہ ابھی اپنی امکانی تکمیل تک نہیں پہونچے ہوتے ہیں اور اُن میں ترمیم، توسیع اور ترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اس طرح ناقد کے سامنے اپنے دَور کی تحریکات بھی ہوتی ہیں اور نامور ادیب بھی۔ اور اُس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف زندہ رہنے والی تحریکات کی طرف نشان دہی کرے اور اُن کے امکانات کو واضح کرے بلکہ وہ اُن ادیبوں کو بھی دریافت کرے جو ان تحریکات کو اپنی پوری توانائی کے ساتھ اور اپنے فن کی سچائی کے ساتھ ساتھ بروئے کار لا رہے ہیں۔ اپنے سے پچھلے دَور کے اعلیٰ فن کاروں کو زندہ رکھنے میں زمانہ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے باوجودیکہ ہم ادب کی تحسین کے معاملہ میں شعور کو یکسر نظرانداز نہیں کرسکتے۔

مگر اپنے دَور کے ادب کے بارے میں بحث کرتے وقت ناقد کو اپنے عہد کے مذاق، میلانات، نظریاتی جانبداری اور فنی مقبولیت سب سے اُلجھنا پڑتا ہے اور تب ہی اپنے دَور کے فنکاروں کی قدر و قیمت مقرر کر پاتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات اچھے ناقد جو کلاسیکی ادب کے بارے میں ہم کو بڑی کارآمد روشنی بہم پہونچاتے ہیں وہ خود اپنے دَور کے ادب کے بارے میں یا تو منصفانہ خیالات نہیں رکھتے یا اُس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس کے پیچھے چند اسباب ضرور ہیں۔ ناقد عموماً اپنے سامنے ایک فنکارانہ تکمیل کا معیار رکھ کر چلتا ہے، وہ ادب یا فن کو اسی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے جس میں نقائص کم سے کم ہوں۔ کلاسیکی ادب پر جب اُس کی نگاہ پڑتی ہے تو اس کو سنگریزوں کے ساتھ ساتھ ہیرے بھی نظر آتے ہیں۔ اور ایسے ہیرے بھی جنہوں نے آب و تاب وقت کی رگڑ سے حاصل کی ہے۔ ایک طرف تو ہر دَور کے کم درجے کے لکھنے والے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف میر کی سینہ چاکی، غالب کی فکری صناعی، محمد حسین آزاد کی رمزیہ نگاری اور پریم چند کی فنی بیباختگی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ساتھ ہی ساتھ نظیر اکبرآبادی کی سی وہ بیمثال شاعری بھی نظر آتی ہے جس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کو واضح بنایا ہے۔ ناقد جب اپنے سامنے میر اور غالب، آزاد اور پریم چند جیسے فنی تکمیل کے نمونے دیکھتا ہے تو وہ یہ بھی توقع کرتا ہے کہ ادب میں ایسے شاہکاروں کی تخلیق جاری رہے لیکن اگر وہ عہد حاضر کی پوری بصیرت نہیں رکھتا تو اپنے زمانہ میں اس کو یہ توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حال ہمیشہ تجربوں کا دور ہوتا ہے اور ماضی روایت کی تکمیل حاصل کر چکا ہوتا ہے، چنانچہ صرف ماضی کے معیار پر حال کے ادب کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنے دَور کے فن پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو پہلے اپنے دور سے ہمدردی ضروری ہے۔ ہمدردی سے مقصد وہ جانبداری نہیں ہے جو محض بعض نظریاتی یا سماجی وجوہ کی بنا پر رسمی تائید یا اندھے عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ ناقد کی ہمدردی، اپنے دَور کے تخلیقی سرچشموں اور اپنے دور کے نئے فنی تجربوں کے ساتھ ذہنی خلوص سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر پریم چند کے دَور کا ناقد درباروں کے بجائے چوپالوں کے تذکرے پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو یقیناً وہ پریم چند کے تخلیقی مخزن سے قربت نہیں رکھتا۔ اسی طرح اگر اقبال کے دَور کا ناقد اقبال کی غزلوں میں کیفیت کے بجائے شعوری وزن پر اعتراض کرتا ہے تو وہ اقبال کے فنی تجربے سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ ناقد کو ہر نئی تحریک اور ہر نئے تجربے کی اندھا دھند تحسین کرنا چاہیے، ناقد کا کام تجزیاتی ہے اور اس کا مقصد دریافت کرنا ہے۔ وہ ہر نئی اور پرانی تحریک، نئے اور پرانے تجربے میں سے زندہ عناصر تلاش کرتا رہتا ہے اور اس لئے اُس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے نشیب و فراز میں زندہ اور ترقی آمادہ پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے لئے تیار رہے۔

نظریاتی طور پر ناقد اپنے عہد میں ایک رہنما کا فرض انجام دیتا ہے لیکن عملی طور پر اُسے بعض ناگزیر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت اپنے عہد کے ادب کے بارے میں وہ اتنا غیر جانبدار اور غیر متعلق بن بھی نہیں سکتا جتنا ہم اس سے توقع کرتے ہیں۔ ناقد اُسی ماحول اور انہیں سماجی حالات کا پروردہ ہوتا ہے جن کا اُس کے دور کا ادیب۔ چنانچہ لاشعوری طور پر وہ اپنے عہد کی غالب تحریکات کا ہمنوا ہوتا ہے۔ اس لئے اُس کو اپنے غیر جانبدار رویہ کو بنائے رکھنے کے لئے بڑی شعوری کاوش کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ مستقبل کے ادبی امکانات کے بارے میں بھی وہ محض قیاس کا سہارا لے سکتا ہے اور ان تجربوں اور تحریکات کے بارے میں جو اپنی ابتدائی شکل میں بڑی امید افزا معلوم ہوتی ہیں، وہ محض ایک سرسری رائے ہی دے سکتا ہے، وہ ادب کی روایات کے بارے میں پیشن گوئی کر ضرور سکتا ہے مگر وہ دوسرے سماجی حالات کے رُخ کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ان شعوری چیزوں

کے بارے میں بھی یقیناً نہیں بتا سکتا جو کل اُبلنے والے ہیں۔ اِس طرح اپنے خام مواد کے بارے میں اس کا علم پوری طرح حال کے اندر محدود رہتا ہے ۔ اِس کے علاوہ ناقد کے اپنے عہد کے سماجی اور اقتصادی نظریات اس کے نقطۂ نگاہ پر پرچھائیں ڈال سکتے ہیں ۔ اور اس کو اپنے دَور کی تحریکات کے ساتھ ہی ساتھ سوچنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ عموماً اکثر اس نظریاتی جانبداری کا سبب بن سکتی ہے ۔ جس کے نمونے آج ہمیں کافی نظر آجائیں گے ۔

ایک اور دِقت اپنے وقت کا مذاق بھی ہوتا ہے ۔ باوجودیکہ ناقد کو ہم ایک واضح شعوری حیثیت دیتے ہیں تاہم اس کو ہم اپنے دور سے باہر کوئی شخصیت تصور نہیں کر سکتے ۔ چند اصنافِ ادب ' بعض بیجے ' کچھ موضوعات ایک عہد میں مقبولیت حاصل کرتے رہتے ہیں ۔ یہ مقبولیت عام طور پر ادب سے آسودگی حاصل کرنے والوں کی بھی ہو سکتی ہے ۔ اور خاص خاص سخن فہموں اور خوش مذاقوں کی بھی ۔ اور اس کے لئے ناقد بھی اپنی تحسین کا اظہار کر سکتا ہے ۔ ناقد کی تحسین کے پیچھے یہ حقیقت بھی ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ تجربے ابھی ادب میں نئے ہوں اور وہ ان سے خوشگوار امکانات کی توقع رکھتا ہو ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو اپنے دور کی فوق صداقت سمجھتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسکے لئے سماجی اور نفسیاتی جواز بھی پیش کر سکتا ہو ۔ مثال کے طور پر نظم آزاد کے بارے میں تنقید کو لیجئے اِس کے ساتھ ناقد نے نئی صنف کے ناتے کافی ہمدردی برتی ۔ یا نچلے طبقہ کی بدحالی کے موضوع کو لیجئے ناقد نے اس کی حمایت کی ۔ کیونکہ اس نے یہ سمجھا کہ یہ اپنے دَور کی ایسی صداقت بھی ہے جو تخلیقی کاوشوں کے لئے تحریک کا سبب بن سکتی ہے مگر ۱۹۴۴ء کا ناقد یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ۱۹۶۵ء تک نظم آزاد وہ مقبولیت حاصل نہ کر پائے گی جو اس نے ابتدائی چند سالوں میں حاصل کی ۔ نہ ہی وہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ مزدور اور کسان ادب میں نعرہ بھی بن جائیں گے ۱۹۴۴ء کے ناقد نے دونوں چیزوں کو سراہا تھا مگر ہم اس کی تنقید کو بے کار نہیں کہہ سکتے ۔ آج کے اور ۱۹۴۴ء کے ناقد میں جو قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں ناقد ان دونوں موضوعات کے اثباتی امکانات کو جانتے سمجھتے اور ناقد کی کوشش ' وہ چاہے کسی عہد میں کام کر رہا ہو انہیں اثباتی امکانات کی جستجو رہی ہے ۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنے عہد کی بات کرتے ہوئے ناقد کوئی فیصلہ کن حکم نہیں لگا سکتا ۔ ادبی روایات اور حالات کے موڑ اس میں بڑی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں ۔

جہاں ایک تنہا ادیب پر تنقید کرنے کی بات ہے وہاں کبھی کبھی ایک دقت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ ناقد کا ادیب سے ذاتی ربط ہے ۔ سائنٹیفک تنقید کرتے ہوئے ہم ناقد سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بالکل غیر متاثر ہو اور وہ جو کچھ کہے اُسے ایک سائنسداں کی طرح سماجی ' معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں سے اُبھارے ۔ یہ تنقید کا آدرش ضرور ہے ۔ مگر صحیح معنوں میں ہم ایک زندہ ادیب کی شخصیت کو ایک زندہ ناقد کے ذہنی پس منظر سے جُدا نہیں کر سکتے ۔ ناقد کے فیصلہ اور اس کے نقطۂ نظر میں ادیب اور اُس کی شخصیت کا کسی نہ کسی قسم کا ردِ عمل شامل ہو سکتا ہے ۔ بہر حال اس کے باوجود کہ ایک ادیب کی شخصیت ناقد کے فیصلہ کو متاثر کر سکتی ہے ۔ بعض حالات میں ادیب کی شخصیت سے تعلق رکھنے والے عناصر تنقید کے لئے بڑے سود مند بھی ثابت ہو سکتے ہیں ۔ بعد میں آنے والے دَور کے ناقدوں کو ادیب کی اپنی شخصیت متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے دَور کے ناقد کے مقابلہ میں اس دَور کے ناقد کو یہ بھی سہولت حاصل ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ساری سماجی اور اخلاقی تحریکات واضح ہوتی ہیں ۔ اس کو اپنے عہد کی بصیرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے دَور کے ادب کو صحیح پس منظر میں رکھ کر جانچنے کے لئے پورا مواد اور پورے مواقع رکھتا ہے ۔ اگر وہ ادیب سے قربت بھی رکھتا ہے تو وہ ادیب کی شخصیت کے بارے میں ایسی براہِ راست معلومات بھی فراہم کر سکتا ہے جو آنے والے دَور کے ناقد کو کافی مدد پہونچا سکتی ہیں ۔ اس طرح باوجودیکہ ناقد سوانح نگار کا کام انجام

نہیں دے سکتا تاہم وہ اِس کے تخلیقی سرچشموں نفسیاتی پیچ وخم اور فطری میلانات سے وہ نتائج مرتب کر سکتا ہے جو اُس کی نئی اِنفرادیت کا باعث بنتے ہیں۔

معاصرانہ تنقید ہم کو اپنے ادب کی موجودہ تحریکات کا صحیح شعور مہیا کرتی ہے اور ہر موڑ اور ہر سطح پر ہم کو اپنی حیثیت اور اپنی سمت کا احساس دلا سکتی ہے۔ معاصرانہ تنقید اپنے دور کے مذاق کا منطقی تجزیہ پیش کر سکتی ہے۔ جو مستقبل کے ادبی مورخ کو ہمارے دور کے ادب کو سمجھنے اور اُس کا شعوری جواز پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ معاصرانہ تنقید کا یہ بھی کام ہے کہ بہتر اور کمتر ادیبوں کی طویل صف میں سے بہتر کو اُبھارتی ہے اور ادبی تاریخ میں اُن کے لئے جگہ پیدا کرنے میں مدد بہم پہونچاتی ہے۔

معاصرانہ تنقید صرف مستقبل کے لئے ہی کارآمد نہیں بلکہ وہ حال کے لئے بھی ایک قطب نُما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس سے ہم صرف اپنی ادبی تحرکات کی سمت ہی نہیں دریافت کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہم کو ادبی صحت برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ پرانی کہاوت ہے' پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ معاصرانہ تنقید ہم کو اُن انتہاپسندیوں سے پرہیز سکھاتی ہے جو صحت مند ادبی تحریکات میں انحطاط کا سبب بن سکتی ہیں۔ اِس طرح وہ ادب میں زندہ روایات کو فروغ دینے میں مدد پہونچاتی ہے۔ اور ایسے حالات پیدا کرتی ہے جن میں ادب میں بے جان روایات کو ختم کرنے کے لئے جو خلیے قسم کی شکستگی کے امکانات کم سے کم پیدا ہو سکیں تاکہ ادب میں نئے تجربوں کی توانائی، جاندار روایات کو صدمہ پہونچائے بغیر حاصل کی جا سکے۔ ادب ایک ارتقائی عمل ہے اور اِس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم شعوری طور پر گندہ اور زندہ عناصر میں تمیز کر کے اس کی صحیح سمت کے تعین میں مدد دیتے رہیں۔ یہ کام ذمہ دارانہ معاصرانہ تنقید بخوبی انجام دے سکتی ہے۔

ندا فاضلی

ہندی نو نظم —!

بیسویں صدی کی شروعات سے یورپ، امریکہ اور ایشیا کے کچھ دیسوں کی اُلجھنیں قریب قریب ایک سی ہی رہی ہیں ایک خوف و ہراس کی فضا، عالمی جنگ بیشن گوئیاں، روایتی اقدار پر شک و شبہ، جمہوریت کی عوامی مانگ، لادینیت کا پرچار، سائنس کے حیرتناک انکشافات، روس میں پرولتاری سرگرمیاں، اور ایک آفاقی نظریۂ آدم پرستی کا پھیلاؤ . . . . یہ تھا وہ ماحول جس سے متوسط طبقے کا ذہن شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا تھا اور اسکے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں، آرٹ، سیاست، اخلاقیات، میں نئے نئے روپوں میں ظاہر ہو رہے تھے !!

متوسط طبقہ کا ذہن ہی، ہر یُگ میں نئی اور پُرانی مصلحۃ کی ہاتھا پائی کے لئے میدان جنگ کا کام کرتا ہے گرتی ہوئی دیواروں کے شور میں نئی بنیادوں کی مدھم آوازوں کو پہچاننے اور ان کو تجزیاتی و تجرباتی سانچوں میں جانچنے پرکھنے کا عمل بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ بکھری ہوئی اکائیاں مختلف زاویوں سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں اور جب یہ کسی ایک خاص مرکزی نقطے پر آکر ٹھہرتی ہیں تو سماجی تاریخ میں ایک دور کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے کی شروعات !!

ہندی کا نیا ادب بھی، بدلتے ہوئے ماحول میں، انفرادی، ذہنی ردِ عمل کا اظہار ہے۔ یُوں تو اُس کے ہلکے دھندلے نشانات پہلے بھی کہیں کہیں ڈھونڈنے سے نظر آجاتے ہیں، لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے ہندی نظم میں جدیدیت کا رجحان ہندی کے مشہور کوی اگیے کی ادارت میں نکلے۔ ایک رسالے "تارسپتک" جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا۔ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

یہ پریوگ واد اندولن (تجرباتی تحریک) کی پہلی آواز تھی جو چھایا وادی (روسانوی تحریک) روایات سے کھلی بغاوت کے طور پر گونجی تھی۔ انگریزی ادب میں بھی Experimental poetry، رومانی (Romanticism) سست رفتاری کا ہی ردِ عمل تھی۔ نظم الہامی خیال آرائی اور خلاق پُراسراریت سے الگ ہو کر اس بجرے پُرے جیتے جاگتے بین الاقوامی سماج میں اپنی ذمے داری کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، تصوراتی قلابازیاں اور تخیلی جذباتیت جس نے ہندی نظم کو بے جان سا بنا کر رکھ دیا تھا، نئے حالات کی آنچ میں آپ ہی آپ پگھلنا شروع ہو گئیں۔

پہلے تارسپتک کے بعد دوسرا تارسپتک تقریباً آٹھ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ہندی جگت میں ایک گرجدار آواز تھی جس نے بہت ساری چھوٹی چھوٹی آوازوں کو پی کر جنم لیا تھا۔ پہلے تارسپتک کے شاعر تھے۔ رام بلاس شرما، پربھاکر ماچوے، گجانن مادھو مکتی بودھ، بھارت بھوشن اگروال اور اگیے۔ دوسرے تارسپتک کے شعرا میں ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، نریش مہتا، بھوانی پرشاد مشر، شمشیر بہادر سنگھ وغیرہ تھے۔

یوں تو ہر دور کی نظم ہی تجرباتی ہوتی ہے کیونکہ وہ موضوع و اسلوب دونوں لحاظ سے روایتی پگڈنڈیوں سے الگ

ہٹ کر ہی سامنے آتی ہے۔ نرالا بھی اپنے عہد کے نئے شاعر تھے اور بچن اور نریندر شرما کے پابند گیت بھی نئے اشاروں کی جھلکیاں لے کر سامنے آئے تھے۔ لیکن تارسپتک کے کویوں کے لہجے کی کڑواہٹ اور ذہنی جھلاہٹ ہندی ادبی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

چھایا واد کی [illegible] abstract thinking کے خلاف جہاں ایک طرف عملی و سماجی زندگی کی عکاسی کی مانگ ہوئی تو دوسری طرف نئے نئے فلسفوں کے زیر اثر ذہنی و دماغی باریک بینیوں کا دور بڑھا۔ شروع میں تو تجرباتی ذہن کا صرف ایک ہی روپ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کچھ ہی سالوں میں یہ کوی دو نظریاتی گروپ میں بٹ گئے۔ ایک منڈلی اُن لوگوں کی تھی جو شعوری طور پر ملک کے سیاسی و اقتصادی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مارکسی فلسفے کی انگلی پکڑے نئی راہوں کی کھوج میں جٹے ہوئے تھے۔

دوسرے گروپ والے سیاسی و سماجی شعور رکھتے ہوئے بھی اپنی ادبی انفرادیت کو قائم رکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے کسی نظریے کی ڈکٹیٹرشپ منظور نہیں کی۔ ان کے یہاں موضوع 'اسلوب' اور بھاشا کی نت نئی جھانکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ 'مشین ایج' میں سانس لیتے ہوئے انسان کی نفسیاتی کشمکش کی علامتی تصویر کشی بھی ہیں۔

پہلے گروپ کو ہندی میں پرگتی واد (ترقی پسند) اور دوسرے کو پریوگ واد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پہلے تارسپتک سے لے کر ماہنامہ پرتیک تک پریوگ واد نے ایک طویل ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شروع میں بھاشا ٹیکنک، فورم اور لہجے کے تجربوں پر زیادہ دھیان دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن صرف لباس ہی سب کچھ نہیں ہوتا، جسم کا بناؤ بھی اس میں شامل ہو تو حسن دوگنا ہو جاتا ہے۔ نرے ہیئتی تجربے تو ذہن کے کھوکھلے پن کی چغلی کھاتے ہیں۔ شاعر کا ذہن جب وقت کے مزاج کو نہیں پہچان پاتا تو الفاظ کی بازی گری پر اتر آتا ہے۔ نئے شاعروں میں 'الجھاؤ' اور چونکاتا ہوا ڈکشن ذہنی ناپختگی کی دلیل ہے۔

ہندی کی نئی نظم جس کی نشو و نما آزاد ہندوستان میں ہوئی، پریوگ واد کا ہی ترقی یافتہ روپ ہے۔ تارسپتک کی بھومی میں بوئے ہوئے بیج ہی اب شاداب پیڑ بنتے جا رہے تھے۔

تحریکِ آزادی ایک حسین خواب کی مانند نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کوئی چند روز اور میری جان کہہ کر تسلی دے رہا تھا اور کوئی بڑھتے ہوئے اندھیروں میں "اب مجھے سورج اگانا ہی پڑے گا" کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ مستقبل کی چمک دمک ہر اندھیرے کو گوارا بنائے ہوئے تھی۔ اور ہنستے ہوئے سورجوں اور جگمگاتے ہوئے مہتابوں کا پٹارا جب ۱۹۴۷ء کو برسوں کے انتظار کے بعد کھولا گیا تو ان گنت تھکی ہاری آنکھوں میں یاس و ہراس کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، قتل و خون کی بو سے بسا ہوا اندھیرا، افلاس و بے روزگاری کے دھوئیں سے گھٹا ہوا اندھیرا۔ رنگین خیالی ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے خوبصورت سپنے، تاروں میں اٹکی ہوئی چمگادڑوں کی طرح سوکھ سوکھ کر دھرتی پر آ گرے۔ جھکے ماتھوں، بند مٹھیوں، گرے کندھوں اور بجھی آنکھوں سے شور کرتے شہروں کی سڑکیں، ہوٹلیں، چوراہے اور نشست گاہیں بھر گئیں۔!!

ہندی کی نئی نظم کا شاعر انہیں گھٹی جگہوں، تنگ ہوٹلوں، اور شور کرتے چوراہوں پر زندگی کا بوجھ ڈھوتا ہوا ایک متوسط طبقے کا پڑھا لکھا انسان ہے۔ وہ جیون کو ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کے بجائے تپتی ہوئی سڑکوں پر کھڑا ہو کر پڑھتا ہے۔ وہ دن میں کئی کئی بار ٹوٹتا ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو سمیٹ کر آگے بڑھنے لگتا ہے۔ وہ ایک اکائی میں کئی اکائیوں کو جیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لہجے میں تلخی بھی ہے اور طنز بھی۔ مشین ایج کی تیز دوڑ میں ہانپتے ہوئے یہ شاعر اپنی

ذہنی ہلچل کو کسی ہم رقص کی کراہ کی باہوں یا کسی روحانی فلسفے کی آغوش کو نہیں سونپتے بلکہ وہ اسے ایک چراغ کی طرح روشن کر کے اپنی داخلی و خارجی زندگی اور سماج سے اس کی ہم آہنگی پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندی نئی نظم ایک ہی آلاپ میں گونجتا ہوا کوئی سماجی نعرہ نہیں ہے۔ یہ مختلف آوازوں میں رقص کرتی ہوئی الگ الگ دھڑکنیں ہیں۔

نئی نظم کی مقبولیت میں مکتی بودھ، شمشیر بہادر سنگھ، لکشمی کانت ورما، شری کانت، دشینت کمار، سروشیور دیال سکسینہ، بھوانی پرشاد مشر، سید شفیع الدین، دھرم ویر بھارتی اور نریش مہتا کا Contribution خاص ہے۔ ان شعرا نے صرف نئی نظمیں ہی نہیں لکھیں، نئی کویتا کے اندولن کو ان سے نئے زاویے بھی ملے۔ جیون ہر پہلو، ہر روپ اور ہر جگہ ان کویوں کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی کویتائیں، نئی علامتیں، نئے شبد، نئے محاورے اور نئی images کے سہارے چلتی ہیں جو نظم سے زیادہ نثر کے قریب ہیں۔ ان میں کچھ تو بحور و قوافی کے ساتھ نظم میں لَے کا سہارا بھی گوارا نہیں کرتے۔

دیٹ مین کی نظموں کی مانند ان میں شبدوں کے سنگیت کے بجائے، موضوعاتی غنائیت ملتی ہے جس کا تاثراتی سمبندھ دل کے بجائے دماغ سے زیادہ ہے۔

نئی نظم چھایا وادی کہر آلود فضا کے بہت بعد کا دور ہے، جس میں نئی بھومیوں کی کھوج، نفسیاتی کشمکش، دردمندی، اور نئے نئے تجرباتی طریقۂ اظہار کے رجحان نے کافی ترقی پائی۔ اس کی دو خصوصیات اہم ہیں۔

social realism (سماجی حقیقت نگاری)

individual realism (انفرادی حقیقت نگاری)

لیکن اس حقیقت نگاری کو naturalism کے معنی میں ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔ نئی نظم میں حقیقت نگاری خارجی فوٹوگرافی نہیں ہوتی۔ کسی خاص رویے سے کوئی ذہنی امپریشن ہی نئی نظم کا موضوع بن سکتا ہے۔

بھوانی پرشاد مشر تارسپتک کے کوی ہیں۔ ان کے لہجے کا تناؤ، سماجی شعور، جذباتی ٹھہراؤ اور طنزیاتی نشتریت نئے زمانے کے مزاج کے مطابق ہے۔ ان کا طنز جس کو وہ intellectual humor اور گہرا بنا دیتے ہیں۔ تیکھا اور ڈائریکٹ ہوتا ہے۔

پونجی وادی سماج، جس میں پیار، شرنگار، خلوص، ہر چیز کی قیمت پیسوں میں آنکی جاتی ہے، وہاں بھلا فن اور فنکاروں کی کیا قدر۔ بھوانی جی کی نظم "گیت فروش" آزادی کے بعد کے ہندوستان میں فنکاروں کی ناقدری پر ایک بھرپور طنز ہے۔

جی ہاں حضور
میں گیت بیچتا ہوں۔
میں طرح طرح کے گیت بیچتا ہوں۔
جی لوگوں نے تو بیچ دیئے ایمان
میں گیت بیچتا ہوں
جی ہاں حضور

سروشیور دیال کی نظمیں سیدھے اور سرل ڈکشن سے سجی ہوتی ہیں۔ اوڑھی ہوئی بودھکتا (ذہنیت) جو آج کے بیشتر نئے شاعروں کے یہاں عیب بنتی جا رہی ہے، سروشیور کی نظموں میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی تخلیقی سہجتا سے

ہلکی پھلکی علامات minor objects جیسے سر کنڈے کی گاڑی، گھاس کاٹنے کی مشین، کاٹھ کی گھنٹیاں، آٹے کی چڑیا وغیرہ کے سہارے چلتی ہیں۔ سروشیور ایک ہوشمند نئے کوی ہیں۔ سیاسی دنیا کی بدلتی ہوئی قدروں پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور تیکھی بھی۔ طنز ان کے لہجے کا خاص عنصر ہے۔ جنگ، امن، فسادات، کشمکش، تعصب، انسانیت ان سبھی موضوعات سے ان کا ذہنی و سماجی سمبندھ ہے۔ نئے سال کے استقبال میں ان کی خواہشات دیکھئے!

نیا سال
لوہاروں کی دہکتی ہوئی بھٹیوں سے
بھور کا آلوک پھیلا سکے۔
راہگیروں کی چھینیوں اور ہتھوڑوں سے
بھور کا سنگیت گنجا سکے۔
نیا سال دھوبیوں کے پاٹوں سے
ملاحوں کے ڈانڈوں سے
گتی کے گھنگرو باندھ سکے۔

. . . .

نیا ورش سب کا ہو

لوہاروں کی بھٹیوں، راہگیروں کی چھینیوں اور ہتھوڑے، دھوبیوں کے پاٹ اور ملاحوں کے ڈانڈوں ایسی کھردری اور معمولی چیزوں میں حسن کی تلاش اور انہیں موضوعِ شاعری بنا کر پیش کرنا، ہندی نئی نظم کی اہم خصوصیت ہے۔ ناوابستہ واد [illegible] نئے شاعروں کی آواز میں رچا بسا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہیومنزم چھایا واد کی رومانی ڈوریوں اور پرگتی واد کے فیشن ایبل گہواروں میں نہ جھولتے ہوئے، دھوپ میں پگھلتے جسموں اور گھٹے ہوئے ذہنوں میں پرورش پاتا ہے۔

نریش مہتا نئے انسان کے جیون کو اس روپ میں دیکھتے ہیں۔

زندگی!
دو انگلیوں میں دبی
سستی سگریٹ کے جلتے ٹکڑے کی طرح
جسے کچھ لمحوں میں پی کر
نالی میں پھینک دوں گا

. . . .

متوسط طبقے کا نوجوان جو پڑھا لکھا ہو کر بھی مارا مارا پھرتا ہے۔ جس کا ذہن بڑا اور ہاتھ بہت چھوٹے ہیں۔ اپنے ذہن کی وسعتوں میں بھٹکتا بھٹکتا جب تھک جاتا ہے اور زندگی کے ہلکے پھلکے رومان جب اس کے تیز شعور کی آنچ سے پگھل جاتے ہیں تو اسے دنیا کی ہر شے بے معنی اور بے مقصد لگنے لگتی ہے۔ وہ دنیا میں زندگی کو ایک بوجھ اور سالنوں کو ایک پاپ تصور کرنے لگتا ہے۔ فرسٹریشن آج کے نوجوان کی کمزوری بھی ہے اور مشینی عہد کے شور و ہنگامے کا ردِ عمل بھی۔

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی اپنے خاص انداز میں اسے محسوس کرتے ہیں۔ وہ نئے دور کے مفکر بھی ہیں لیکن سماج کی موجودہ روش سے مایوس بھی ہیں۔ ان کی نظم کا آخری ٹکڑا "آخر کب تک" آج کے ہزاروں نوجوانوں کی تھکی ماندی زندگیوں

کا ترجمان ہے۔

لڑنے والی مٹھیاں جیبوں میں بند
نیا دور لانے میں ناکام ہر چھند
کب تک
آخر کب تک؟

بھارتی کا لہجہ نرم اور دھیمہ ہے وہ چیخنے چلّانے کے بجائے غزلیاتی سرگوشیوں میں اپنی بات کہنے کے عادی ہیں۔ اُن کی نظموں میں نئے تیوروں کی گرمی بھی ہے اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ بھی۔

نکشتی کانت نرم سبھاؤ اور نرے احساسات کے شاعر ہیں۔ اُن کے شبدوں، تشبیہات اور علامات کے چناؤ میں ایک گھریلو اور مانوس فضا ملتی ہے۔ اُن کی نظر گہری اور پھیلی ہوئی ہے۔ سرولیشور جیسا تیکھا طنز اور چھچھلا پن تو اُن کی نظموں میں نہیں ہے مگر ایک قسم کا دبا دبا درد اور گھٹی گھٹی کسک ان کے لہجے کی نرمی میں بھی طنز کے تیور پیدا کئے ہوئے ہے ہستاکشر (دستخط) اُن کی مشہور نظم ہے۔ اقتباس دیکھئے!

میں آج بھی زندہ ہوں
اُس ہستاکھشر کی طرح
جو مذاق مذاق میں کسی پیڑ کے نیچے
پکنک تفریح میں کھدیا گیا تھا۔
ایک تیز دھار والے فولاد کی نوک
اب میری چھاتیوں میں گڑی ہے
اور اس پیڑ کا گھائل سینہ
اس داغ کی حفاظت ہر موسم میں کرتا ہے

. . . .

میں آج بھی زندہ ہوں۔

مکٹ بہاری سروج کا سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ اُن کی آواز سیدھی، تیز، گہری اور چبھتی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے زیادہ تر گیت ہی لکھے ہیں لیکن اس پابند فورم میں Time Spirit کی سوجھ بوجھ اور تازگی کو برقرار رکھنا واقعی قابل داد ہے۔ ایک گیت کی دو لائنیں دیکھئے۔

ہرا کائی کا دھاجن ہو گیا ہے
رام جانیں گنتیاں کیسے بڑھیں گی

دنود شکل تارسپتک کے دوسرے گروپ کے کویوں کی طرح انسان کی individual value پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ سماج میں سانس لیتے ہوئے انسانوں کی ذہنی کشمکش اور اس کے نفسیاتی تجزیئے کے شاعر ہیں۔ اپنے ڈکشن کے اعتبار سے یہ کسی اور کوی کے مقابلہ میں مکتی بودھ سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے!

میرا سر ہلکا ہو کر

اس کھلے سنسار میں تیرتا پھرتا ہے
سوچتا ہوں اسے پکڑوں، تو اس پر
ان پیروں، ہاتھوں، آنکھوں
اس پورے جسم کا بوجھ
کس کر باندھ دوں
اور اگر اس پر بھی وہ اُڑے
تو کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں ڈال دوں۔
اور ایک بڑا سا خاندان اس کی نگرانی پر رکھ دوں

کالج سے نکلے ہوئے نوجوان جن کی آنکھوں اور دماغ میں ان گنت خواب بسے ہوتے ہیں، جب انہیں چلتی پھرتی تیز رفتار دنیا میں قدم رکھنا پڑتا ہے تو وہ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح شادی رچا کر بچے پیدا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ نظم ٹوٹے ہوئے سپنوں کا مرثیہ ہی نہیں اس میں نوجوان ذہنوں کے فرسٹریشن کا سماجی علاج بھی پنہاں ہے۔

ہندی کا نیا گیت بھی نئی نظم ہی کا ایک پابند غنائی رُوپ ہے۔ اس کا جنم بھی انہیں حالات میں ہوا ہے۔ جیسے کہ نئی نظم کا۔ روایتی نورم کے بدلے نئے ہیئتی تجربے اور جانی پہچانی گھریلو فضا۔ ان گیتوں کے اہم عناصر ہیں نئے گیتوں میں آزادی کے بعد کے ماحول کی گرمی اور تلخی خاص طور سے نمایاں ہے۔ اوم پربھاکر، رام درشن مشر، ویریندر مشر، نریش سکسینہ اور شلبھ وغیرہ آج کل کامیاب گیت لکھ رہے ہیں۔

نئے شعراء لفظوں میں روایتی معنوں کی جگہ ان میں گہرے اور Emotional Word مفہوم بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں یہ خیال گھر کر چکا ہے کہ Directness کی روش پُرانی اور بے جان پڑ چکی ہے۔ اور وہ شاعری کی کلاسیکی بھاشا کو سانپ کی کینچلی کی طرح ہٹا کر نئے زاویوں سے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کے تجربے کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ، نفسیات، بازار، گلی، گاؤں سبھی سے وہ الفاظ چنتے ہیں اور اُن کا جا و بے جا استعمال بھی اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ جس سے نظموں میں تازگی ضرور آجاتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ انتہا پسندی کانوں کو بری بھی لگتی ہے۔ کیونکہ اچھی شاعری صرف خوبصورت موضوع ہی سے نہیں، موضوع اور ڈکشن کے خوبصورت امتزاج سے عبارت ہے۔

نئی نظم اسلوب، انداز، ایپروچ اور تیور کے لحاظ سے خلاؤں میں ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح نہیں جھول رہی۔ اس کا رشتہ ماضی کی صحت مند رجحانات سے بہت گہرا ہے۔ نری الفاظ کی بازی گری، رومانوی جذباتیت، قوافی اور بحور کی monotenous آہنگ سے انحراف کلاسکی ادب سے گہری سوجھ بوجھ ہی کا نتیجہ ہے۔

بقیہ "گیت کیا ہے" صفحہ ۲۱ ـ

بیدار ہوتا ہے لیکن اپنے اندرونی تحرک سے سُبک بار اور لطیف ہو کر جسم سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ جسم کو بھی لحظہ بھر کے لئے لطیف اور سبک بار بنا دیتا ہے۔ یوں کہ جذبے کی معیت میں جسم بھی گاتا اور رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے اسی لئے گیت میں جذبے کو نغمہ اور رقص کی سنگت حاصل ہوتی ہے۔ گیت وہ نئی رُوح ہے جس نے رحم مادر کے اندر جنم لیا ہے اور اپنے وجود سے ماں کے سارے جسم میں تھرتھری سی پیدا کر دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ نئی رُوح عورت کے جسم کے اندر ہے، اس سے باہر نہیں۔ جب یہ تکمیل کے ایک خاص مقام پر پہنچ کے بعد رحم مادر سے الگ ہو جاتی ہے تو گیت کے حربے کو چھوڑ کر ایک نئی صنف شعر کو اپنا لیتی ہے مگر یہ ایک الگ داستان ہے۔

رشید قریشی

قومی یکجہتی کا تاریخی پس منظر

مذاہب، تہذیبوں اور زبانوں کا مرکز ہندوستان، اپنے جلو میں اختلاف کی ایک دنیا لئے ہوئے ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا تاریخ کے ایک نئے دَور میں داخل ہو رہا ہے۔ راہ میں کتنے ہی حادثوں اور طوفانوں سے ٹکرانا پڑا۔ ہر حادثہ اس کی زندگی کا ایک باب بن گیا جس کا جائزہ لیں تو ہمیں آج بھی اس میں اپنے قدیم تصوّرات کے بھرپور نقوش ثبت ملیں گے۔ تاریخی حادثات کے اثرات کبھی ایک رَد میں نہیں بہتے اور طویل عرصے کے بعد ان کے مُثبت و منفی نتائج کا پتہ چل پاتا ہے۔

مختلف عسکری قوتیں جو مختلف اوقات میں اہلِ ہند سے دست و گریباں ہوئیں اُنھوں نے کبھی تو مقامی تہذیب کا تانا بانا بکھیر دیا اور کبھی خود ہندوستانی تہذیب میں اس طرح مُدغم ہو گئیں کہ اُن کا علیحدہ وجود ہی ختم ہو گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ قوتیں سیلاب بن کر بڑھیں اور ہم نے اسی سیلاب سے اپنے کھیتوں کی آبیاری کی۔ ان کھیتوں سے جو لہلہاتی فصل پیدا ہوئی اس نے ہندوستان کے طویل و عریض حصے کی تہذیبی بھوک کو غذا فراہم کی۔ کسی بھی مُلک کی تہذیب اور زبان میں اگر داخلی توانائی ہے تو خارجی اثرات چاہے کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں اسے ختم نہیں کر پاتے، بلکہ ان اثرات کے اتصال سے ان کی ہیئت ایک نیا رُوپ اختیار کر لیتی ہے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اس کی بہترین مثال ہے۔

کسی بھی مُلک کی تہذیبی اور لسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں متضاد عناصر سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ تضادات سے بھری پڑی ہے اور ہندوستان جس کی تاریخ اتنی طویل ہے اس کے لئے یہ تضاد ناگزیر بھی ہے۔ یہاں اکثر مذہبی، سیاسی اور اقتصادی عوامل نے عصبیت، طاقت اور ہوس سے میل کھایا ہے اور مُلک فرقوں، جماعتوں اور طبقوں کی متعدد اکائیوں میں تقسیم ہوا ہے۔ انتشاری طاقتیں جب پُورے حوصلے سے اجتماعی فکر پر یلغار کرتی ہیں تو سارے سماج میں نراجی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

آریوں کی آمد سے ہندوستان میں نسلی اور علمی برتری کا دَور شروع ہوا۔ مُلک طبقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو گیا۔ "ورن آشرم" کے فلسفے نے انسان کو اُونچ نیچ کے دائروں میں محصور کر دیا۔ اس طرح مُلک میں نفرت کی جو خلیج پیدا کی گئی وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس کو پُر کرنے کے لئے تاریخ نے کئی نامور ہستیاں پیدا کیں اور ان کی کوششوں کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے لیکن وہ فلسفہ جو ایمان کا جزو بن گیا سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ آج جب اس پر دستور کے پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں تو بھی اس کی پرچھائیں باقی ہے اور پرچھائیں کو قانون کی زنجیر بھی قید نہ کر سکی۔ اسے ضرورت ہے وسعت نظری کے تیروں کی نہیں تو پھر تاریکی کی۔ جب اندھیرے بڑھنا شروع ہوتے ہیں، سائے بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن جب تاریکی پُورے طور پر پھیل جاتی ہے سائے بھی ختم ہو جاتے ہیں لیکن کون ہے

جو تاریکی کو دعوت دینا پسند کرے گا؟ فاتح آریوں کی بالادستی نے ملکی باشندوں کو نقل مکانی پر مجبور کردیا۔ یک جہتی کی ایک کڑی ٹوٹ گئی۔ فاتح اور مفتوح کے درمیان علیحدگی پسندی کا رجحان تقویت پا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ دراوڑ لوگوں نے آسٹرک اور آسٹرک نے اپنے پیش رَو نیگریٹو کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہو۔ آریوں کی آمد نے ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح متاثر کیا کہ ہندوستان لسانی اور تہذیبی اعتبار سے کئی حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس تقسیم کے اثرات کو رد کرنے کے لئے قدیم مذہبی کتابوں میں کسی ایک حصّے یا ایک زبان بولنے والوں کو نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو موضوع بنایا گیا۔

"اتھروید کے پرتھوی سکتا کے باب میں سارے وطن پر رحمت کی دعا کی گئی اور اس کے دریا، سمندر، پہاڑ، قصبے اور گاؤں کا تذکرہ کیا گیا۔ جہاں آدمی اور عورتیں اپنے روزمرّہ کے کام میں مصروف، رقصاں، اور تبسم ریز ہیں۔ اسی میں اس کے دیوتاؤں اور اجداد کے عظیم الشان کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اور ایک اہم مقام پر لوگوں کو نانا دھرمو وواچس नान धर्मणो विवाचसम ہندی کہا گیا۔ یعنی جو کئی عقیدوں کے حامل اور کئی زبان بولنے والے ہیں" [۱]

برہمنوں کی کوشش سے ہندو مذہب شمال سے پھیل کر جنوب تک آ گیا جس کی وجہ سے ایک طرف تو مذہبی وحدت قائم ہوئی دوسری طرف برہمنوں نے اپنے آپ کو فوقیت دینے کے لئے ذاتوں کی تقسیم کو رواج دیا۔ ذاتوں کی شدّت نے انتشاری کیفیت پیدا کی اور اسی کے ردِّ عمل کی وجہ سے بُدھ مذہب وجود میں آیا۔ سنسکرت زبان جس نے ذاتوں اور طبقوں کی تقسیم میں نمایاں حصّہ لیا۔ مہاتما بُدھ کی زبردست تنقید کا نشانہ بنی۔ دنیا میں شاید کسی زبان پر ایسی سخت پابندی عائد نہیں کی گئی جیسی مہاتما بُدھ نے اپنے پیروؤں پر یہ کہہ کر لگائی کہ خبردار کبھی سنسکرت زبان میں بُدھ مذہب کا پرچار نہ کرنا! لیکن تاریخی تضاد پھر ہمارے سامنے آیا جب بُدھ مذہب کی تمام کتابیں سنسکرت میں منتقل کی گئیں۔

بُدھ مذہب کی تبلیغ کے لئے قدرت نے اشوک کو پیدا کیا۔ اشوک نے بُدھ مذہب ہی کو نہیں پھیلایا بلکہ ہندوستان کو یک جہتی کے نظریے سے بھی آشنا کیا۔ اس کی موت بُدھ مذہب اور موریہ سلطنت کے لئے یکساں نقصان دہ ثابت ہوئی۔ بُدھ مذہب کے زوال کے بعد نئے احساس کے ساتھ برہمنوں نے ہندو مذہب کی تجدید کی۔ ہندو مذہب شمال و جنوب میں پھیل گیا لیکن اس کے باوجود جنوبی ہند زبان اور تہذیب کے اعتبار سے شمالی ہندوستان سے الگ رہا۔ سنسکرت نے ایک علیحدہ زبان کی حیثیت سے انھیں متاثر کیا لیکن دراوڑی زبانیں بدستور ان کے خیالات و جذبات کا پیمانہ چھلکاتی رہیں، وقت نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ گپت بادشاہوں کے نقوش مدھم پڑ گئے۔ پورانک ہندو تہذیب جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں، ماند پڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے ہرش وردھن کا سورج چمک کر گہنا گیا۔ پورانک تہذیب کو ختم کرنے میں وسطِ ایشیا کے قبائل کا بڑا ہاتھ رہا۔ بعد میں یہی کعبہ کے پاسبان بن گئے۔ ".لیکن ان کی قبائلی رُوح نے تفریق و انتشار کے روگ کو جو ہندوستان کو لگ گیا تھا اور بڑھا دیا" (ڈاکٹر عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ)

ملک میں یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں آٹھویں صدی کے آخر میں ہم شنکر اچاریہ کی تحریک کو نظر انداز نہیں کرسکتے اس تحریک نے مذہب کی بُنیاد پر ملک کے مختلف حصّوں میں یگانگت پیدا کرنے میں حصّہ لیا۔ انھوں نے ملک کی چار سمتوں میں مٹھ قائم کئے جہاں زائرین اپنے مذہبی فرائض کی تکمیل کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس طرح ان کی کوشش سے ملک کی وحدت قائم ہوئی۔

---

[۱] Report on the Emotional Integration شائع کردہ پبلیکیشن ڈویژن صفحہ ۴

۸ ویں صدی کے آغاز سے ہندوستان میں ایک نئے مذہب کے ماننے والے داخل ہوئے۔ ان کے دل جذبات اور حوصلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار، ذہن میں مقصد اور سر پر ایک نئی تہذیب کا تاج تھا۔ ان سے پہلے بھی تاجر اور سیاح کی حیثیت سے اس مذہب کے ماننے والے ہندوستان میں آکر بس چکے تھے۔ نئے آنے والوں نے بت شکن کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی اولاد نے بڑے بڑے بت تراش پیدا کئے جن کے ناموں کے بغیر ہندوستان کی تہذیبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ جہاں بانی کے ولولوں سے معمور جیسے مذہبی جذبے کا اشیرواد حاصل تھا یہ مقامی حکومتوں سے گتھ گئے، یہ حکومتیں جو آپسی نفرت اور پھوٹ کے باعث پہلے ہی کمزور ہو چکی تھیں کس طرح انھیں ہندوستانی سرحدوں کے باہر دھکیلتیں! جنگ ہوتی رہی کبھی کوئی جیتا اور کبھی کوئی ہارا یہاں تک کہ نئے آنے والے دلّی کے راج سنگھاسن تک پہونچ گئے۔

مسلمانوں کی آمد سے ہندوؤں میں بے چینی پھیلنا ایک فطری امر تھا خاص طور سے برہمن اور اعلیٰ متوسط طبقہ کی عیش کوشی کا حصہ بٹانے کے لئے ایک گروہ اور پیدا ہو گیا۔ قیادت اور ملکیت پر جب زد پہونچتی ہے تو انسان بری طرح تڑپ جاتا ہے۔ ردِ عمل کے طور پر ملیچھ کا دائرہ وسیع کیا گیا اور مسلمان اس کی لپیٹ میں لے لئے گئے۔

حکومت ہمیشہ طاقت کے ذریعہ نہیں چلائی جاتی، کیونکہ جہاں صرف تلوار چلتی ہے ہل غائب ہو جاتے ہیں اور کھیتوں میں اناج کے بجائے خود رو گھوک اُگتی ہے۔ علم و ادب کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور تہذیب کا متحرک پہیہ رُک جاتا ہے۔ مسلمان بادشاہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھتے تھے وہ ایک متمدّن سماج پر حکومت کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے طاقت کے ساتھ فہم اور رواداری کو اپنایا۔ تلوار اس زمانہ کے لحاظ سے ناگزیر تھی وہ ہمیشہ کے لئے اسے نیام میں رکھ کر خود اپنا وجود خطرے میں ڈال نہیں سکتے تھے۔ بعد میں، اگر انھوں نے ایک ہاتھ میں تلوار لی تو دوسرے ہاتھ میں قلم۔ تلوار کے بل پر وہ دوسرے علاقے جیت کر ہندوستان میں ایک طرف سیاسی اتحاد قائم کرنا چاہتے تھے تو دوسری جانب اپنے نقطۂ نظر سے ملکی اصلاح بھی۔

مسلمان بادشاہوں کی ذہنی رَو اگرچہ مذہب سے متاثر ہوئی اور بعض نے اسلامی طرزِ فکر کے مطابق حکومت کی باگ موڑنا بھی چاہی لیکن وہ پورے طور سے اسلامی قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق عمل نہیں کر سکے۔ بعض اسلامی رسمیں جو پابند شرائط کے تحت عمل میں لائی جا سکتی تھیں سیاسی و معاشی فائدے کے لئے اسلام کے نام پر غلط طرح سے نافذ کی گئیں۔ مثال کے طور پر جزیہ کی رسم۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے جزیہ مخصوص حالات میں وصول کیا جا سکتا تھا مگر یہاں ان کے بغیر ہی عاید کیا گیا۔ مذہبی رسوم، اصطلاحوں اور بعض بادشاہوں کی مذہبی زندگی دیکھ کر ہم اس مغالطے میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کی حکومت اسلامی تھی۔ یہ حکومتیں مسلمان بادشاہوں کی شخصی حکومتیں تھیں انھیں مذہب کا اتنا خیال نہ تھا جتنا اپنے فائدے کا۔ مسلمان بادشاہ کس انداز میں سوچتے تھے اس کی عکّاسی علاؤالدین خلجی کے اس جملے سے بھرپور طور پر ہوتی ہے۔

"میں نہیں جانتا کہ شریعت کے لحاظ سے جائز و ناجائز کیا ہے، میں تو جو کچھ ملک کی بہتری اور موقع کے مطابق ٹھیک سمجھتا ہوں وہی احکام جاری کر دیتا ہوں" (گولڈن تاریخ از وشنو ناتھ)

دلی سلطنت کے وہ بادشاہ جو دُور رس نگاہ کے مالک تھے اُنھوں نے دیگر مذاہب کا خیال رکھا اور اس مخالفت سے بچے جو تعصب کے ردِ عمل سے پیدا ہو سکتی تھی۔ سلاطینِ دہلی کی رواداری کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

"سلاطینِ دہلی نے تو اتنی رواداری برتی کہ صرف قانونِ عام جاری کیا؛ دہ شخصی و مذہبی امور میں ہندوؤں کے دھرم شاستر کے اصول کو جاری رکھا اور اس کے نفاذ میں مدد دینے کے لئے ملک کی مرکزی عدالت اور صوبائی

کی عدالت میں پنڈت مقرر کئے۔" ۱

دلّی سلطنت کے بادشاہوں کے زمانہ میں یک جہتی کی فضا اس انداز میں نہیں پائی جیسی کہ مغل دور میں ہمیں نظر آتی ہے لیکن اس سلسلہ میں محمد تغلق، علاؤالدین خلجی اور شیر شاہ کی کوششیں قابلِ قدر رہی ہیں۔ اس زمانہ میں جو چیز یک جہتی کا ماحول پیدا کرنے میں مانع ہوئی وہ سیاسی وحدت تھی۔ مسلمان بادشاہ سارے ملک کو زیرِ نگیں دیکھنے کا خواب دیکھتے تھے دوسری جانب ملک کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کے حکمراں اپنی ریاست کا وجود برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ نتیجے میں لڑائیاں ہوئیں۔ اور ہم آہنگی کی فضا پیدا نہ ہو سکی۔

اس دور کی آزاد مسلم ریاستیں جنھیں اپنے وجود کے لئے غیر مسلمانوں کے سہارے کی زیادہ ضرورت تھی نسبتاً زیادہ بہتر طریقہ سے ہندو مسلم اتحاد کا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ بنگال کے مسلم حکمراں، دکن کے بہمنی سلاطین اور کشمیر کے سلطان زین العابدین وغیرہ کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اخوت و رواداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں میں حکمراں طبقے کے علاوہ ایک ایسا بھی طبقہ تھا جس نے ہندوستانی علم و ادب میں دلچسپی لی۔ امیر خسرو، ملک محمد جائسی، رس کھان وغیرہ ایسے فنکار ہیں جن کے نام جب بھی لئے جاتے ہیں تو سب ہی فرقے کے لوگوں کے دل عقیدت کے جذبات سے بھر جاتے ہیں۔ اسی طرح صوفیائے کرام نے باہمی اخوت و محبت کا درس دے کر ہندوستان کی بڑی آبادی کو ذہنی طور پر متاثر کیا۔ ناتھ پنتھیوں پر اسلام اور صوفیوں کی تعلیم کا جو اثر ہوا اس کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن ہندی ادب کی تاریخ میں لکھتے ہیں:

"گورکھ ناتھ خواہ وہ دسویں صدی یا تیرہویں صدی کے ہوں مسلمانوں کے ربط و تعلق میں آچکے تھے۔ اور ان کے ناتھ پنتھی پیرو اسلام کے ان مبلغوں سے اثر قبول کر رہے تھے اور ان کو بھی متاثر کر رہے تھے اس طرح ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان آہستہ آہستہ تشکیل کی جا رہی تھی۔" ۲

متاثر ہونے کا یہ عمل یک طرفہ نہیں تھا بلکہ خود مسلمان صوفی بھی ہندوستانی معاشرت سے اثر پذیر ہوئے" محبوب ازل کو مادی پیکر کی تخیل میں پیش کرنے کا رجحان ہندوستانی معاشرت کا ردِ عمل تھا مسلمان صوفیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہندو جوگیوں کی ہیئت کو بھی اپنایا۔

"ناتھ پنتھی ہی مسلمانوں کی آمد اور رابطے سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں پر بھی ان کا اثر پڑا۔ ابھی تک مسلمان فقیر گیروا کپڑے پہنے لمبی جھولیاں لٹکائے سارنگی بجاتے گاؤں گاؤں راجہ بھرتری کے گیت گاتے پھرتے تھے" ۳

مسلمان صوفیوں نے نرگن دھارا کے شعرا کو بے پناہ متاثر کیا۔ کرشن بھگتوں پر بھی ان کا گہرا اثر پڑا ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے:

"کرشن بھگتوں نے خاص طور پر صوفیوں سے اثر قبول کیا۔ عشق و محبت کا جو تصور انھوں نے اختیار کیا وہ تمام تر تصوف کے زیر اثر تھا۔ خود کو تصور خیالی کے سپرد کر دینا میرا بائی کی طرح صرف کرشن جی سے متعلق کر دینا۔ وصل و ہجر کے جو تصورات کرشن بھگتوں میں ملتے ہیں وہ صوفیوں کے اثر کا نتیجہ ہیں۔" ۴

صوفیائے کرام کے ساتھ ساتھ نرگن دھارا کے شعراء خاص طور سے کبیر اور گرونانک نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یک جہتی کے لئے جو کوشش کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل بن گئی۔ کبیر نے ذات پات کے فرق اور مختلف عقیدوں کے درمیان پھیلی ہوئی عصبیت کے خلاف جو جہاد کیا وہ ہمارے ماضی کا شاندار قومی اثاثہ ہے۔ کبیر کے بعد گرونانک نے نسلی امتیاز

۱۔ قومی زبان کا مسئلہ از ڈاکٹر عابد حسین ۲۔ ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن
۳۔ ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۲۳ ۴۔ ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۴۰

اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یک جہتی کی بھرپور کوشش کی۔ کبیر اور گرونانک کی بڑائی صرف اس میں نہیں ہے کہ اُنھوں نے یک جہتی کا واضح تصور پیش کیا بلکہ اظہارِ خیال کے لئے اُنھوں نے جو زبان اپنائی اُس نے بھی یک جہتی کے عناصر کو قوت دی۔

دلی سلطنت کے خاتمے کے بعد دلی کی چوکھٹ پر جبیں سائی کا منصب فرغنہ کے ایک دراز قد تیکھے خدوخال والے سپاہی کو نصیب ہوا جس کی شخصیت میں رزم و بزم کے دھارے بل کھاتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ بعد میں ان دھاروں سے ایک وسیع سمندر کی تخلیق ہوئی جس کی مترنم لہروں سے ہندوستان کی فضا مدہوش ہو اُٹھی۔ اکبر سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا دَور شروع ہوا اس کی آزاد خیالی اور تدبّر سے ہندوستان میں پہلی بار زیادہ مستحکم اور باوقار حکومت قائم ہوئی۔ اسکی کوششوں سے فارسی اور ہندی تہذیبیں نہ صرف ایک دوسرے کے قریب آئیں بلکہ ان کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب جس کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی زیادہ تیز رفتاری سے ارتقائی منزلیں طے کرنے لگی۔ اکبر یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مُلک میں سیاسی وحدت لانے کے لئے ضروری ہے کہ سب لوگوں کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے سیکولر ذہن بنانا شروع کیا۔ ایک طرف جنگ جُو راجپوتوں کی تائید حاصل کی تو دوسری جانب ہندو مفکّرین کو اپنے قریب لایا۔ اس کے علاوہ یک جہتی پیدا کرنے کے لئے اس نے کئی ٹھوس اقدام کئے۔ جزیہ ختم کردیا، مشترک نظامِ تعلیم رائج کیا۔ فارسی شعراء کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور ہندی شعراء کی سرپرستی کی۔ سنسکرت اور فارسی کے ترجمے کرائے۔ جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہتر موقع ملا۔ اکبر کے علاوہ ابوالفضل اور عبدالرحیم خانخاناں کی کوششیں بھی اس جانب بڑی قابلِ قدر ہیں۔ اس زمانہ میں ہندی علم و ادب نے بھی بڑی ترقی کی۔ رحیم، سُورداس اور بیربل تو اکبر کے دربار سے متعلق تھے ہی تلسی داس جیسا شاعر بھی اسی دَور میں پیدا ہوا۔

"..... فارسی کا بھی کافی اثر پڑا، حُسن و عشق کے وہ مضامین مضمون آفرینی اور (ریتی کال کے شعراء پر) نازک خیالی ہی سے اُنھوں نے اثر قبول نہیں کیا بلکہ فارسی کے بہت سے الفاظ اور شاعرانہ اصطلاحات کو بھی جگہ دی۔ خاص طور پر بہاری کی شاعری میں فارسی شاعری کی آوازِ بازگشت صاف سُنائی دیتی ہے"[1]

اس زمانے میں اُردو زبان میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے علم و ادب کا سرمایہ کافی حد تک وسیع ہوا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کے قریب آنے کا سلسلہ دُور تک جاری رہا۔ شاہجہاں کے آخری دَور سے حالات کچھ بدلنے لگے۔ اگرچہ اس کا احساس اورنگ زیب کے زمانے میں ہوا۔ اورنگ زیب کی انتہا پسندانہ پالیسی سے تکدّر کی فضا میں اضافہ ہوا۔ شیواجی نے مرکزی حکومت کو چیلنج کیا اور سیاسی لڑائیوں کو مذہبی رنگ دیکر عام ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنا چاہی۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں کھنچاؤ پیدا ہوگیا۔ اس کھنچاؤ کا اثر درباروں میں زیادہ اور بازاروں میں کم تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دَور میں مُلک میں سیاسی انتشار پیدا ہوگیا۔ سکھوں اور مرہٹوں نے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کرلیں۔ اس کے علاوہ مُلک اور بھی بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ لیکن وہ مشترکہ تہذیب جو مغلیہ سلطنت کے عروج میں بڑھی اور پھیلی بدستور اپنا دائرہ وسیع کرتی رہی۔ انگریزوں کے قدم جمانے تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی نزاع نہیں تھا۔ عبداللہ یوسف اس زمانے کی معاشرت کا حال

---

[1] تاریخ ادب ہندی از ڈاکٹر محمد حسن

لکھتے ہوئے میر کی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اِس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس زمانہ میں ہندو مسلمان تنازعہ کا فقدان تھا۔

"ذکرِ میر میں جہاں اُس زمانہ کی معاشرت اور حکومت کے بہت سے واقعات ملتے ہیں وہاں ایک یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ اُس زمانہ میں ہندو مسلمان سوال نابود تھا۔ اس سے بدتر کون سا زمانہ ہوگا جب کہ ملک میں ہر طرف خود غرضی اور خانہ جنگی، لُوٹ مار کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور زوال اور انحطاط کا انتہائی وقت آگیا تھا۔ تاہم ہندو مسلمانوں کے تعلقات بھائیوں جیسے تھے وہ لڑتے بھی تھے ملتے بھی تھے مگر اس دوستی و محبت، لڑائی اور بگاڑ میں مذہب و ملّت کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ آفت ان دونوں قوموں کی مشترکہ بدبختی کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔" [1]

ایک انگریز مورخ جیمز فارس اس اتحاد پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے

"دو اس قدر مختلف مذہبی اصولوں کے ماننے والوں میں اتنی رواداری کی مثال یہاں کے سوا اور کہیں ملنی مشکل ہے" [2]

آزادی کی پہلی لڑائی میں بھی ہندو مسلمان دوش بدوش حصّہ لیتے رہے۔ ایک طرف مسلمان علماء نے جہاد کے فتوے کے ذریعہ آزادی کی تڑپ پیدا کی، دوسری جانب پنڈتوں نے ہاتھ میں پوتھیاں لیکر دھرم شاستر کا حکم سُنایا کہ انگریز ملیچھوں سے لڑنا چاہیئے۔

"جب چارپائیوں پر تلنگوں کی لاشیں ان کے سامنے آئیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے اور نہ کریا کرم کی" [3]

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک ہی مقصد تھا غلامی کی زنجیر توڑ دی جائے، آزادی کا حصول اُن کا ایک مقدس فریضہ بن گیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اجتماعی جد و جہد کا احساس انگریزوں کو کس قدر تھا اِس کا اندازہ ایک انگریز شاعر الگزینڈرل کی نظم "ظفر الظفر بنام فتح انگریز" کے ان اشعار سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

جدہلی رسیدند جمعی لعیس ۔۔۔ در آں جنگ خود ہند شُد شرمگیں

ندارم از با عنباں ہیچ کام ۔۔۔ دو سر دارد، ایں رزم ازاں بدلجام

مسلماں جہادی ہنوداں ہمہ

جمعے بر سر کشتند از آں کہ دمہ

بہادر شہ طلبیدہ آں ہر سہ را ۔۔۔ قسم خوردہ آورد بر مدعا

ہنوداں قسم رام گنگا خوانند ۔۔۔ مسلماں قرآں بر سر نہند

پسر خویش را شاہ جرنیل کرد ۔۔۔ نبیرہ کہ بود آں را کرنیل کرد

ہنود و مسلماں بہ لہن و کرم

بہم گشتہ باخود بہ دین دھرم [4]

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صفحہ ۳۲ – [2] تاریخ عروج انگلشیہ بحوالہ ۱۸۵۷ کے مجاہد شعراء از امداد صابری صفحہ ۳۱۲ – [3] ۱۸۵۷ کے مجاہد شعراء از امداد صابری صفحہ ۱۵۰ – [4] ۱۸۵۷ کے مجاہد شعراء از امداد صابری صفحہ ۱۳۲

"۱۸۵۷ کی جد وجہد نے مختلف عقائد کے لوگوں کو ذہنی طور پر مجتمع کردیا۔ مُغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سے مختلف محاذ قائم ہو گئے تھے۔ آزادی کے جذبے نے ان میں ہم آہنگی قائم کی اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو سارے ہندوستان کا تاجدار بنانے میں لگ گئے۔ مرہٹوں اور مغلوں کے پُرانے جھگڑے کے باوجود نانا صاحب نے اس بات کا اعلان کرنے میں تامل نہیں کیا کہ وہ مغل دربار کے ایک صوبیدار ہیں" ع[1]

۱۸۵۷ کے بعد جب سارے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کیونکہ انھیں اس اتحاد کے سمندر میں اپنی حکمرانی کا سفینہ ڈوبتا نظر آیا۔ بڑی ہوشیاری سے انگریزوں نے دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان شکوک وشبہات کی فضا پیدا کی۔ انگریزوں نے جو اقتصادی پالیسی اپنائی اس سے دونوں مذاہب میں توازن ختم ہوگیا۔ سسکتے ہوئے جاگیردارانہ نظام نے مسلمانوں کی پستی میں ایک درجہ کا اور اضافہ کردیا۔ انگریزی تہذیب وتعلیم سے نفرت کے نتیجے میں زمانے کی رَو ان سے بہت آگے بڑھ گئی، اور اس طرح مسلمان اپنے دوسرے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے۔ ہم آہنگی کی کڑیاں ہلنے لگیں کیونکہ مساوات ہی مذاہب اور طبقات کے درمیان یک جہتی کی فضا برقرار رکھتی ہے۔ جب بھی مساوات کا توازن بگڑتا ہے تو یہ بات سو فیصدی یقینی ہوجاتی ہے کہ کھنچاؤ کی فضا پیدا ہو۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی دُوری کا ایک سبب اُس زمانے کی مذہبی رَو اور نیم مذہبی جماعتیں بھی ہیں۔ مذاہب کا تصور پر ۱۸۵۷ سے پہلے تھا اب اس کی شکل تھوڑی بہت بدل گئی۔ پہلے مذہبی جذبے کے تحت وسیع النظری، اُخوت اور خلوص کی فضا آلودہ کر دی بعد میں متعصبانہ عناصر اس میں داخل ہوگئے۔ ان مذہبی تحریکات کا مقصد مذہبی قدروں پر ہندوستانی ذہن کی تشکیل کرنا تھا۔ ان تحریکات کے مُبلغین نے کوشش کی کہ ذہن کے اُن دریچوں کو بند کردیا جائے جہاں آزاد خیالی کی شعاعیں اُجالا پھیلا سکتی تھیں۔ اِس طرح اُنھوں نے جدید نظریات سے رشتہ توڑ کر ماضیِ بعید کے حصار میں اپنے آپ کو مقید کرلیا۔ اِس حصار نے ان کے ذہن کی وسعت کو محدود کردیا اور مُلک کا ایک بڑا طبقہ جارحانہ قومیت و وطنیت کے احساس کی انگڑائی لینے لگا۔ جس کے نتائج بعد میں انتہائی بھیانک نکلے ان تحریکات سے متعلق جو افراد سیاسی محاذ پر کام کر رہے تھے اُن کے خیالات سے معاشرے میں بد دلی پھیلی جس کا احساس پنڈت جواہر لال نہرو، رجنی پام دت، ڈاکٹر عابد حسین اور دوسرے مفکّرین کو شدّت سے ہوا۔

"مسلمانوں میں ردِّ عمل کے طور پر سرسید کی تحریک شروع ہوئی جس کی وجہ سے ایک طرف مسلمان آزادی کی جدّوجہد سے علیٰحدہ ہوگئے اور اسی کے ساتھ ہندوؤں سے بھی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کانگریس سے متعلق تھی، جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو ہندوستان کے ان مسلمان علماء کی تحریک پر جو شاہ ولی اللہ سے وابستہ تھے ۱۸۸۶ میں ایک ہزار علماء نے نصرت الابرار کے نام سے ایک فتویٰ جاری کرکے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دی" ع[2]

شروع میں خود سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے داعی تھے اُنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ دونوں کو قریب لانے کی کوشش کی، لیکن جب بنارس کے قیام کے دوران اُنھوں نے دیکھا کہ ہندوؤں میں علیٰحدگی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں اور اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف تحریک چلائی جارہی ہے تو ان کے مسلک میں تبدیلی آگئی۔ سرسید جو کل تک مسلمانوں اور ہندوؤں کے بارے میں علیٰحدہ علیٰحدہ نہیں سوچتے تھے خالصتًا

ع[1] ڈاکٹر سین کی انگریزی تصنیف ۱۸۵۷ کے پیش لفظ کا ملخص ترجمہ از مولانا آزاد شائع شدہ آجکل جنگ آزادی نمبر

ع[2] قومی جدوجہد کے ڈھائی سو سال از اسرار احمد آزاد شائع شدہ آجکل جنگ آزادی نمبر

مسلمانوں کے رہنما بن گئے۔ انھیں کی تحریک نے آگے چل کر مسلم لیگ کو جنم دیا جس نے اپنے عروج کے زمانے میں یک جہتی کی فضا کو پارہ پارہ کردیا۔ کانگریس میں بھی ایک ایسا طبقہ تھا جس کا ذہن پورے طور پر صاف نہیں تھا۔ مولانا آزاد نے تقسیم ہند کے حالات بیان کرتے ہوئے اس طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"کانگریس میں برابر ایسے لوگ رہے جنھوں نے اپنے آپ کو قوم پرست ظاہر کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کا نقطۂ نظر خالص فرقہ وارانہ ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ہندوستان کی کوئی مشترک تہذیب نہیں ہے اور کانگریس جو بھی کہے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔" [1]

یہ ہندوستان کی خوش قسمتی رہی کہ اس نے خاصی تعداد میں ایسے افراد پیدا کئے جنھوں نے اس منافرت کا مقابلہ کیا اور ملک میں امن و آشتی کی فضا برقرار رکھنے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا، گاندھی جی نے تو اپنی زندگی ہی ان اصولوں کی خاطر قربان کردی۔ اُن کی سیاسی زندگی کا بہت سا حصہ باہمی اتحاد کے لئے صرف ہوا۔ اُنھوں نے پُوری کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ تاریخ جواہر لال نہرو اور ابو الکلام آزاد کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ موت نے ان رہنماؤں کو ہم سے چھین لیا جو زندگی بھر اپنی بھرپور توانائی سے ملک میں صحت مند فضا قائم کرنے کے لئے معاشرے پر اثر انداز رہے، جب انتظامیہ اور پولس امن برقرار رکھنے میں ناکام ہوئی تو یہ جواہر لال ہی تھے جنھوں نے ملک کے شاعروں اور ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ انسانی ذہن کے ان گوشوں کو جگائیں جہاں رحم، پیار اور مساوات کے جذبات جاگزیں ہیں۔ اگر یہ گوشے جاگ جائیں تو انسان اپنی سطح سے بلند ہو جائے اور معاشرے کی کتنی ہی بیماریاں ختم ہو جائیں۔

ملک کی اشتراکی تحریکات کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ اس تحریک نے جہاں محنت کشوں کو مذہبی تنگ نظری سے کھینچ کر اقتصادی محاذ پر جمع کیا، وہیں براہِ راست فرقہ واریت پر بھی زد لگائی۔ تحریک کے آفاقی جذبے نے اپنے سے متعلق افراد کو مذہبی، لسانی، علاقائی تنگ نظری کا باعمل ناقد بنا دیا۔ اگرچہ بعض اوقات یہاں فرقہ وارانہ جھگڑوں کے تجزیے میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر جھجک کا پہلو نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے نئے ہندوستان کا آغاز ہوا۔ آزادی اپنے ساتھ بہت سے مسائل لیکر آئی۔ بہت سی پیچیدگیاں جن کی بُنیاد انگریزوں کے زمانہ میں پڑ چکی تھی وہ بدلتے ہوئے حالات میں اور شدت سے اُبھریں۔ درآں حالیکہ بعض مسائل خود انگریزوں کے دورِ حکومت میں حل ہوئے۔ مثال کے طور پر سیاسی وحدت کا سوال جسے انگریز اپنے مقصد کے لئے کافی حد تک حل کر چکے تھے۔ آزادی کے بعد ریاستوں کا مسئلہ بھی مشکل نہ رہ گیا تھا۔ پنڈت نہرو کی رہنمائی میں ریاستوں میں جو تحریکات اُبھریں اُس نے اپنی طاقت تسلیم کرالی تھی۔ آزادی کے بعد طاقت ور مرکز سے ٹکرانے کی اُنھیں جرأت نہ ہوئی۔ شاہی کی اکڑ اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ حریف کمزور رہے، طاقتور مقابل کے سامنے اُسے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو مسائل درپیش ہوئے اُن میں سب سے بڑا مسئلہ فرقہ پرستی کا تھا۔ اس کے جہاں اور محرکات تھے سب سے بڑا محرک جذبۂ تقسیم ہند تھا۔ ہندوستان کے عوام کی ایک بڑی اکثریت اس تقسیم کے لئے تیار نہیں تھی لیکن جب تقسیم کے نتیجے میں ایک مسلم ریاست کا وجود عمل میں آگیا تو انھیں ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا وجود ایک بار کی طرح محسوس ہونے لگا۔ فسادات کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہوگیا ایک طرف باقاعدہ فسادات اور اسی کے ساتھ ساتھ

---

[1] ہماری آزادی ترجمہ INDIA WINS FREEDOM صفحہ ۳۹۶

ڈر، دہشت اور زبردستی کا ماحول تاکہ مسلمان گھبرا کر ملک چھوڑ دیں۔ ایسے ہی قابلِ افسوس حالات کا پاکستان میں اقلیتوں کو سامنا کرنا پڑا۔

مولانا آزاد نے ۱۹۴۷ء کی فرقہ واریت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے INDIA WINS FREEDOM میں لکھا ہے کہ فوج کا ایک کمان میں نہ ہونا اور ملازمین کا دو ملکوں میں تبادلہ ایسے عوامل تھے جن سے فرقہ وارانہ رجحانات کو اور تقویت پہونچی۔ فوج تو چند دنوں کے بعد علیحدہ ہوگئی لیکن انتظامیہ کے بعض افسران تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ گاندھی جی نے فساد کی آگ کو خون کی بوندوں سے ٹھنڈا کیا۔ فساد کی تلوار تو نیام میں چلی گئی لیکن تنگ نظری کا قلم تعصب کی سیاہی پھیلاتا رہا۔

مسلمانوں کی پستی کا دور برطانوی حکومت کے عہد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ انگریزی کی مخالفت نے انہیں اعلیٰ عہدوں سے زیادہ تر دور رکھا۔ بنگال میں مسٹر سی، آر، داس نے کوشش کی تھی کہ ان کے تناسب کے لحاظ سے بلکہ اور زیادہ نوکریاں دے کر اس فرق کو ختم کر دیا جائے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں رقیبانہ ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے اس خیال کی تائید کے بجائے مخالفت کی گئی، ان کے بعد کسی اور کو اس خیال کے اعادہ کی جرأت نہ ہوئی اور ہندوستان کی تقسیم کی ایک بڑی وجہ ہماری نظروں سے رہ گئی۔ اگر بر وقت اسے محسوس کر کے اس کے تدارک کی کوشش کی جاتی تو یہ تقسیم رک سکتی تھی۔ فراق گورکھپوری نے بالکل صحیح لکھا ہے

"اگر ہندوستان کا ہر گھرانہ خوش حال ہوتا تو ملک کے دو ٹکڑے نہ ہوتے" ۱

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ سگے بھائیوں میں بھی اگر معاشی اونچ نیچ ہو تو تعلقات میں وہ ہمواری نہیں ہوتی جو رشتے کا اقتضاء ہے۔ اس معاشی تفاوت کا احساس پنڈت نہرو کو بھی تھا اور وہ جانتے تھے کہ بغیر اقتصادی مساوات کے یہ اتحاد ممکن نہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کے لئے بڑی دشواریاں ہیں۔ اسی احساس نے ۱۳ مئی ۱۹۶۱ء کو وزراء اعلیٰ کی کانفرنس میں جس کی صدارت خود پنڈت جی نے کی یہ تجویز منظور کرائی کہ اگرچہ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے لئے کوئی مختص تناسب مقرر نہیں کیا جا سکتا پھر بھی اقتصادی میدان اور سرکاری ملازمتوں میں انھیں مواقع بہم پہونچانے پر خاص توجہ دینا چاہئے۔ اسی تجویز میں آگے چل کر توقع ظاہر کی گئی کہ حکومت کے تعاون سے اقلیتیں پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم میں بہتر سہولتیں حاصل کریں گی اور اس طرح دوسروں سے سرکاری نوکریوں میں داخلے کے لئے مقابلہ کے اعلیٰ مواقع دستیاب ہو جائیں گے" ۲

فرقہ پرستی کے محرکات میں ڈر اور خوف کو بھی بڑا دخل ہے۔ ہندو فرقہ پرست جماعتیں اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اگر مسلمانوں کو ذہنی اور اقتصادی طور پر دبا کر نہیں رکھا گیا تو وہ خود ان پر غالب آجائیں گے۔ ان کی اس رائے میں مسلمانوں کی جنگجویانہ اسپرٹ اور مسلمان ملکوں سے جذباتی وابستگی کو بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کو یہ خوف ہے کہ انھیں ہندو مذہب میں جذب نہ کر لیا جائے۔ اسی طرح کے ڈر اور خوف کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد مجیب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے

"اقلیت میں اگر خوف ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اکثریت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اجتماعی طور سے خود کو زیادہ سے زیادہ الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اکثریت میں ڈر بیٹھ جائے تو وہ چاہتی ہے کہ اقلیت ان تمام باتوں کو چھوڑ دے جو اسے الگ رکھتی ہیں اور اکثریت کے فائدے کو فائدہ ماننے لگتی ہے" ۳

۱۔ قومی یکجہتی کا مسئلہ از فراق گورکھپوری شائع شدہ نقوش جنوری ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۰۸۔ ۲۔ NATIONAL INTEGRATION شائع شدہ پبلیکیشن ڈویژن ۳۔ अल्पसंख्यक और राष्ट्रीय एकता از پروفیسر محمد مجیب شائع شدہ ہندی ہفتہ وار "ہندوستان" صفحہ ۱۱

جس طرح ہندوؤں کے ایک طبقہ کا ذہن صاف نہیں ہے اسی طرح مسلمانوں میں بہت سے لوگ ہیں جن کے دل و دماغ میں علیحدگی پسندانہ رجحانات موجود ہیں۔ آج کی سیاسی اصطلاح میں ہم اسے مدافعانہ فرقہ پرستی کہہ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی کچھ جماعتیں ہیں جن پر الزام ہے کہ وہ علیحدگی پسندانہ رجحان کو تقویت دے رہی ہیں لیکن اصل فرقہ پرستی جس کے خراب نتائج نکل سکتے ہیں وہ اُن مسلمان رہنماؤں کے دلوں میں موجود ہے جو ہیں تو قومی جماعتوں سے وابستہ لیکن خوف اور مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے جائز مطالبات جو در اصل انسانی مطالبات ہیں، پیش کرنے میں محض اس لئے گریز کرتے ہیں کہ کہیں اُن پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگ جائے۔

ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ یہاں صرف ایک ہندو مسلم سوال ہی نہیں ہے جو ملک میں یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں مانع ہو۔ ہندو سکھ مسئلہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے جسے سکھوں اور حکومت کے بعض رہنماؤں نے بڑی ہوش مندی سے فساد کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا۔ پنجابی صوبے کا سوال ایک لسانی معاملہ ہے جو غلط فہمی کی بنا پر مذہبی و سیاسی مسئلہ بن گیا۔ اکالی اس صوبے سے سکھوں کا مستقبل وابستہ سمجھتے ہیں۔ جواباً یہ کہا گیا کہ اس صوبے سے ملک کی مزید تقسیم کے امکانات روشن ہیں۔ انگریزوں کے زمانہ میں کبھی ہندو جین تنازعہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ جبلپور سے اس بدعت کا آغاز ہوا۔ ذات پات کا سوال بھی بہت اہم سوال ہے۔ سال میں ایک دو بار اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں میں تلخی بڑھ جاتی ہے۔ ذات پات کے مسئلہ پر اسی وجہ سے کانگریس کے اوادی سیشن میں سنجیدگی سے غور کیا گیا۔

قومی یک جہتی کی راہ میں اور بھی جو چیزیں رُکاوٹ بنی ہوئی ہیں اس میں زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ اس وسیع و عریض ہندوستان میں کئی زبانیں اور بے شمار بولیاں ہیں، اتنے بڑے مُلک میں اتنی زبانوں اور بولیوں کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس مسئلہ کو آسانی سے سُلجھایا جا سکتا تھا بشرطیکہ ہم تنگ نظری کو ترک دیتے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس مسئلہ پر ماہرین لسانیات کو غور و فکر کی دعوت دی جاتی تاکہ اسے سائنٹفک بُنیادوں پر حل کیا جاتا۔ مگر یہاں بھی ایک دشواری ہے کہ لسانیات کے ماہر بھی اپنی آنکھوں پر رنگین چشمے لگائے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد مُلک میں زبانوں کے جو معاملات اُلجھے اُس میں سب سے بڑا مسئلہ اُردو ہندی کا ہے۔ تعصب اور تنگ نظری نے لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اُردو کی زندگی ہندی کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔ اُردو سے تعصب کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی تخلیق میں اُردو نے بڑا حصہ لیا ہے جو در اصل ایک واہمہ ہے اس کا علاج اُسی وقت ممکن ہے جب ذہن کے گوشوں میں صاف اور تازہ ہوا آنے دی جائے۔ راجیندر ناتھ شیدا نے اپنے ایک مضمون "اُردو ادب اور قومیت" میں اس الزام کا جواب بڑے سُلجھے ہوئے انداز میں دیا ہے۔

"اُردو کو تقسیم وطن کا موجب قرار دینا اور یہ کہنا کہ اس نے ملک میں دو قوموں کا احساس پیدا کیا علت کو معلول قرار دینا ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ ملک کی سیاسی فضا میں تقسیم اور اتحاد کے درمیان جو کشمکش جاری تھی اس کا پرتو اُردو پر پڑا، اُردو ادب پڑھ کر ہی لوگوں میں تقسیم پسندی کے جراثیم پیدا ہونے کا نظریہ درست ہوتا تو اتحاد پسند مسلمانوں اور ہندوؤں پر بھی اس کا اثر پڑنا ضروری تھا، مگر ایسا نہیں ہوا اور پھر پاکستان کے طالب مسلمانوں نے بھی انگریزی میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو اُن کی اُردو کی کتابوں کی تمام خصوصیات کی حامل ہیں۔ انگریزی ادب کی روایات نے انھیں ایسا لکھنے سے کیوں باز نہ رکھا اور فرض کیجئے کہ مسلمانوں کی مادری زبان اُردو کے بجائے ہندی ہوتی تو کیا ضروری تھا کہ ان تصانیف میں ان خیالات و جذبات کا اظہار نہ ہوتا۔" [1]

---

[1] اُردو ادب اور قومیت از راجیندر ناتھ شیدا شائع شدہ "دورِ جدید" اُردو نمبر صفحہ ۴۲

ہندوستان میں اردو اور ہندی کا ہی ایک جھگڑا نہیں ہے۔ ہندی اور جنوب کی زبانوں کا جھگڑا خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہندی اور پنجابی کے پرستار بھی ایک دوسرے کے خلاف پر تولتے رہے ہیں۔ آسامی اور بنگالی کے جھگڑے نے سیکڑوں کی جانیں لیں۔ مرہٹی اور گجراتی زبان بولنے والے بھی خوب جی کھول کر لڑے۔ ان تمام جھگڑوں نے ہندوستان کے جذباتی اتحاد میں بڑی رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ زبان کے بارے میں اگر حقیقت پسندانہ پالیسی اپنائی جاتی تو یہ جھگڑے اتنی شدت اختیار نہ کرتے۔

علاقائیت بھی ایک برائی ہے۔ یہ زبان کے مسئلے سے بعض جگہوں پر پیوستہ ہے۔ جب علاقائی زبانوں کو بڑھنے کے مواقع اتنے نہیں ملے تو اس زبان کے جاننے والوں نے جارحانہ رُخ اختیار کیا۔ پنجابی زبان کے لئے جو تحریک چلائی گئی اس میں اسی جذبے کا ردِ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح دراوڑستان کے نعروں میں صدیوں کی شمال کی برتری کے خلاف احتجاج کی گونج سنائی دیتی ہے۔ علاقائیت کا مسئلہ ایک معاشی، تہذیبی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ جب تک ان تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور نہ ہوگا تحریکیں چلتی رہیں گی اور جذباتی یک جہتی مستحکم نہ ہو سکے گی۔

"ملک میں یک جہتی کے بارے میں جب ہم خیال کرتے ہیں تو اپنی مخصوص تہذیب کے حامل شہروں کی زندگی سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں کے دامن میں زندگی گذارنے والے قبائل ہمارے تصور میں آجاتے ہیں۔ ان کے اجداد جب آریائی غلبے کا مقابلہ نہ کر سکے تو وہ شہروں سے رُخ موڑ کر ویرانوں میں اپنی دنیا آباد کرنے پہنچ گئے۔ ان کی نسل بڑی سعادتمندی سے اپنے آباء واجداد کی پیروی کرتی آرہی ہے۔ ہندوستان کے شہروں نے کتنے انقلاب دیکھے اُجڑے، برباد ہوئے، پھر آباد ہوئے، زمانے کے پہیّے کے ساتھ حرکت کرتے رہے مگر ان قبائل پر تبدیلیوں کا اثر کم ہوا یہ قبائل جو مدھیہ پردیش، اڑیسہ، آسام وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ہندوستان کے قومی طرز زندگی کی پیچیدگیوں میں اضافہ کرتے ہیں" [1] انھیں انکی مخصوص تہذیب برقرار رکھ کر مطمئن کرنا ہے۔ تاکہ وہ دوسرے شہریوں کی طرح ہندوستان کی تعمیر میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں۔ اور شانہ بشانہ معاشی و سماجی ترقی کی راہیں طے کریں۔ ان قبائل کے بغیر ہندوستان کی تصویر ادھوری ہے اور ہمیں اس تصویر کو مکمل کرنا ہے۔

جب ہم ہندوستان میں یک جہتی کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو فرقہ واریت، علاقائیت، لسانی عصبیت، چھوت چھات اور قبائل کی منتشر زندگی ہمارے اذہان کا احاطہ کر لیتی ہے۔ ان مسائل کو حل کئے بغیر ہم یک جہتی اور ترقی دونوں سے دُور چلے جاتے ہیں۔ یک جہتی کے مسائل جتنے سیدھے سادے ہیں ان کو حل کرنے کے لئے اُتنا ہی پیچیدہ اندازِ فکر اختیار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسائل سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ گئے۔ قومی یک جہتی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بعض لوگوں نے آنکھ بند کرکے یہ حل پیش کر دیا کہ ملک میں ایک تہذیب، ایک زبان اور ایک رسم الخط کو رواج دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال کے پیش کرنے میں جو جذبہ پوشیدہ ہے وہ لاکھ چھُپائے نہیں چھُپ سکتا۔ اس وجہ سے کہیں قومی یک جہتی کو قومی یک رنگی نہ سمجھ لیا جائے۔ ڈاکٹر کے، ایم پانیکر نے ایک نیا خیال دیا کہ ہمیں قومی یک جہتی NATIONAL INTEGRATION کے بجائے قومی اتحاد NATIONAL UNITY پر زور دینا چاہئے۔ بعد میں جذباتی یک جہتی کی رپورٹ میں واضح طور پر اس شبہ کی تردید کی گئی کہ یک جہتی کے معنی یہ نہیں کہ ملک کو ایک رنگ میں رنگ دیا جائے۔ پھر بھی چالاک سیاستداں اور مفکرین ایرا پھیری سے وہی بات کہتے ہیں جس سے عوام اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ملک میں قدیم تہذیب کو جگا دیا جائے اور ایک زبان اور ایک

---

[1] PROBLEM OF NATIONAL INTEGRATION از جہدال موہن مکرجی

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر دیکھئے)

سیّد نقی احمد ارشاد

مہابت جنگ

اور

خاندانِ مہابت جنگ کی ادبی صحبتیں

ہمارے ادیبوں اور مورخوں نے جہاں شمالی مغربی ہندوستان کے اُردو کے شاعروں اور اُن کی ادبی صحبتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں شمالی مشرقی ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی صحبتوں کو قطعی فراموش کردیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اردو زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کررہی تھی جہاں سلطنت کو گھن لگ رہا تھا، فنونِ لطیفہ کو ترقی ہورہی تھی۔ شمالی مغربی ہندوستان تو اجڑ رہا تھا، تاہم وہاں کی ادبی صحبتوں کا کافی ذکر ہر تذکرہ و تاریخ میں ملتا ہے مگر شمالی مشرقی ہندوستان جہاں سلطنت صوبہ داروں کے ذریعہ قائم تھی۔ اُس کا بہت کم تذکرہ تاریخوں اور تذکروں میں ملتا ہے، اُس کا ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے شمالی مشرقی ہندوستان کے سیاسی حالات ہی ایسے تھے کہ مؤرخوں کی دوسری باتوں کے بیان کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی۔

بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ۔ اور آسام کے مغربی حصہ پر مرشد قلی جعفر خاں کا قبضہ تھا۔ اس کے بعد اُس کا داماد شجاع الدّولہ سریر آرائے مسند ہوا۔ شجاع الدّولہ کے بعد اُس کا بیٹا سرفراز خاں حکمراں ہوا۔ سرفراز خاں ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ چنانچہ اس کا فائدہ اٹھا کر علی وردی خاں ناظم بہار نے خروج کیا۔ ایک ہی جنگ کے بعد بہار۔ و بنگال۔ و آسام علی وردی خاں کے قبضے میں آگئے۔ اس زمانے کی ایک ادبی صحبت کا ذکر تذکرۂ عشق میں اِن الفاظ میں ہے۔

حیدر شاہ | ساکن شاہجہان آباد۔ بطریق سیر تا بہ عظیم آباد آمدہ و ازیں جا بہ ارادۂ روزگار بہ مرشد آباد رفتہ و در سرکارِ نواب سرفراز خاں صوبہ دار بنگالہ و اڈیسہ نوکر گشتہ۔ بعد شہادتِ نواب موصوف شاہِ مذکور ملازمت نواب مہابت جنگ نمودہ۔

نواب بجدِ نظر غرۂ سپاہگیری ایشاں فرمودہ کہ لاشِ شمارا در تمام شہدا تلاش نمودیم، ہرگاہ نیافتم۔ دریافت شد کہ شما زندہ آید و در جنگ طرح داریدہ مرد غیور بود۔ ترکِ روزگار نمودہ۔ در ہگلی نشستہ و زلاف سپگیری دست بردار شدہ۔ دو روپیہ یومیہ از سرکار فخر التجار عفر لہ می یافت۔ آخر بہ جنت شتافت۔ از دست سے

کام جو کیجے پورا نہ ادھورا کیجے   گر ادھورا ہے کو شش ستی پورا کیجے

یہ محمد شاہی دور کی اردو کا ایک نمونہ ہے۔

کہتے ہیں کہ حیدر شاہ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ عظیم آباد آئے۔ پھر مرشد آباد گئے اور وہاں نواب سرفراز خاں صوبیدار کی ملازمت اختیار کی جب مہابت جنگ نے سرفراز خاں پر غلبہ پایا تو حیدر شاہ نے مہابت جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ ایک دن مہابت جنگ نے کہا کہ اس جنگ کے مقتولین میں میں نے تمہاری لاش ہر جگہ تلاش کی مگر نہ ملی۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم زندہ ہو اور جنگ میں طرح دے گئے ہو۔ آدمی صاحبِ غیرت تھے نوکری چھوڑ دی اور بنگلی چلے گئے۔

علی وردی خاں مہابت جنگ خود بھی نہ صرف صاحب سیف تھا بلکہ صاحب ادب بھی جس کے شواہد تاریخوں اور تذکروں میں ملتے ہیں۔ سیر المتاخرین کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ علی وردی خاں کے نواسے سراج الدولہ نے نانا کے خلاف بغاوت کی۔ تھوڑے سے رفقا کو ساتھ لے کر عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا۔ اس شورشِ اور فساد کی خبر جب علی وردی خاں کو ملی تو اس نے نصیحت آمیز کلمے نواسے کے پاس کہلا بھیجے اور خود بھی عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا۔ پیارے نواسے نے نانا کی بات نہ مانی اور جواب یہ بھیجا کہ میرے لئے اس طرف کا رخ نہ کیجئے گا ورنہ یا تو میرا سر آپ کے ہاتھی کے نیچے ہوگا یا جناب عالی کا سر میرے دامن میں ہوگا۔

جب یہ جواب مہابت جنگ کو ملا تو وہ مسکرایا اور یہ رباعی پڑھی ؎

غازی کہ پئے شہادت اندر تگ و پوست ۔۔۔ غافل کہ شہید عشق فاضل تر از وست
فردائے قیامت ایں بہ آں کے ماند ۔۔۔ آں کشتۂ دشمن است وایں کشتۂ دوست

رباعی کا چوتھا مصرعہ سراج الدولہ کے حال پر پورا پورا تبصرہ کر رہا ہے۔ پورا واقعہ تفصیل سے سیر المتاخرین میں درج ہے۔

اُس زمانے کے امرا میں صرف دو ہی صاحبِ تدبیر تھے۔ ایک تو علی وردی خاں اور دوسرے نظام آصف جاہ اوّل۔ شراب خواری لہو لعب سے ان دونوں کو کوئی سروکار نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ دس برس کی مسلسل جنگ لڑنے کے بعد علی وردی خاں نے بہار و بنگال سے مرہٹوں کو اکھاڑ پھینکا ورنہ دہلی اور آگرہ کی طرح مرشد آباد اور عظیم آباد پر بھی مرہٹوں کا قبضہ ہوجاتا۔ باوجود اس کشمکش اور بے اطمینانی کی زندگی کے علی وردی خاں کی صحبتیں کبھی علما اور فضلا سے خالی نہیں رہیں۔ اس کے عہد کے علما میں بڑے بڑے صاحبِ باطن تھے۔ درباری مسخرے شاعروں کی اس کی صحبت میں گذر نہیں ہوتی تھی اور اس کا اُس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔

علی نقی خاں انتظار ۔ ان کے متعلق تذکرۂ شورش کی عبارت ہے۔

"علی نقی خاں انتظار" از شاہجہان آباد است، عمدہ تصنیفات بسیار دارد۔ شعر فارسی و ہندی ہر دو خوب می گوید، اصلاح از شاہ قدرت اللہ سلمہ اللہ می گیرد و قصۂ تازگی مضامین بسیار دارد۔ کلامش سامع افروز عالم است۔ دیوانش دیدہ نشد مگر اوراقے چند کہ بہ نظر در آمد۔ ایں چند شعر از آنست ؎

وقف ہے خانۂ دل قصد اگر اس کا ہے ۔۔۔ کہو ناوک سے کہ آ بیٹھے جگہ اس کا ہے
زلفِ شکیں تری دا کھی مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔ ہر شکن دامِ بلا تھی مجھے معلوم نہ تھا

اور بھی ایسے ہی صاف اشعار ہیں جو بسبب طوالت نقل نہیں کئے جاتے ہیں - انکے متعلق "تذکرۂ عشق" کی عبارت ہے ؎
"انتظار" - دہلوی - اسمش علی نقی خاں خلف علی اکبر خاں منکوشی - مردے عیاش و خوش اوقات بود - در عہدِ نواب علی وردی خاں بہادر مہابت جنگ در شہر مرشد آباد بہ کمال عیش و عشرت اوقاتِ عزیز بسر می برد و مشق سخن بہ مشورتِ شاہ قدرت اللہ قدرتؔ تخلص می کرد - اخر ہماں جا نقدِ جاں بجانِ آفریں سپرد از دست ؎

کیا ہے شمع نے کیا فروشی میں ہنر پیدا — کٹاتے دیر لگتی ہے کہ پھر کرتی ہے سر پیدا

محمد شاہی دَور کی اُردو کی ایک رباعی کا نمونہ ان کے کلام سے ملاحظہ کیجئے ؎

بیدرد کے چاہنے کی طاقت نہ رہی — دکھ درد لسا ہنے کی طاقت نہ رہی
تب آیا عیادت کو مری بالیں پر — جب دیکھا کراہنے کی طاقت نہ رہی

جلال الدین جلالؔ مہابت جنگ سے مرہٹوں کی لڑائی کا ذکر ایک جگہ اوپر آیا - اسی دَور میں جلال الدین جلالؔ جو خاص مرشد آباد کے رہنے والے تھے - جب مہابت جنگ نے مرہٹوں پر فتح پائی تو انھوں نے ایک تاریخ فارسی میں کہی ؎

سرِ شد ہم مرہٹہ ضمناً اڑیسہ ہم — تاریخ ایں دو فتح بیک گز دو فاختہ

تذکرہ میں تاریخ کے اعداد موجود نہیں ہیں مگر حساب لگانے سے ۱۱۵۵ھ نکلتا ہے۔ فارسی کے اِن دو مصرعوں میں دو واقعات کی طرف اشارہ ہے - ایک تو فتح اڑیسہ یعنی علی وردی خاں نے سابق صوبدار بنگالہ سرفراز خاں کے بہنوی مرشد قلی خاں کو اڑیسہ سے نکال باہر کیا اور اسی سال مرہٹوں کو بھی شکست دی - دوسرے مصرعہ کے نصف آخری حصہ کے اعداد نکالنے سے پتہ چلتا ہے ؎ بیک گز دو فاختہ کہ یہ واقعہ ۱۱۵۵ھ کا ہے - مآثرالامرا کے مطابق یہ واقعہ ۱۱۵۴ھ کا ہے یعنی ایک سال پہلے کا، وجہ ترجیح جلالؔ کی تاریخ کو دی جا سکتی ہے - مآثرالامرا کی عبارت ہے -

"چوں علی وردی خاں بعد قتل سرفراز خاں عازم آں سمت شد او[1] ہم فوجے فراہم کردہ بہ مقابلہ پرداخت د

---

[1] "او" سے اشارہ ہے میرزا لطف اللہ مرشد قلی خاں بہادر رستم جنگ - اس کے باپ کا نام حاجی شکر اللہ تبریزی تھا۔ یہ ایران سے ہندوستان آیا تھا اور بندرِ سورت میں رہنے لگا تھا - میرزا لطف اللہ کی پیدائش سورت میں ہوئی - جب جوان ہوا تو اپنے آبائی پیشۂ تجارت میں لگ گیا - بنگال پہونچا - شجاع الدولہ صوبہ دار بنگالہ تک رسائی ہوئی - شجاع الدولہ نے جوہر قابلیت دیکھ کر اپنی لڑکی سے اس کا عقد کر دیا - میرزا لطف اللہ کو لطف علی خاں کے خطاب سے سرفراز کیا - مرشد قلی جعفر خاں کے مرجانے کے بعد میرزا لطف اللہ کو بھی خطاب مرشد قلی خاں کا ملا اور شجاع الدولہ نے اسے اڑیسہ کا ناظم مقرر کیا - ۱۱۵۵ ہجری میں علی وردی سے شکست کھانے کے بعد دکن چلا گیا اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کی ملازمت و مصاحبت اختیار کر لی - اس نے ۱۱۶۴ ہجری میں رحلت کی - شاعر تھا اور تخلص مخمور رکھتا تھا - اس کی ایک بیت فارسی میں ہے ؎

سپندار از ضعیفان کارِ سنگیں بر نمی آید — کہ کوہ می شود صورت پذیر از خامۂ مو ئی

اس کی بیوی مہین بیگم دختر شجاع الدولہ عرصہ دراز تک زندہ رہی اور حیدرآباد دکن میں اپنے شوہر کی حویلی میں رہتی تھی - اس کا ایک بیٹا یحییٰ خاں بہت دنوں تک ککنپورہ دکن کا قلعہ دار بھی تھا - مآثرالامرا صفحہ ۵۵۰ جلد دوم - نقی احمد ارشاد

شکست یافتہ دکن رویہ شتافت۔ ودر ۱۱۵۴ ھجری باز اجتماع نمودہ بہ اڑیسہ آمد۔

تاریخ بنگالہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۷۴۱ء کا ہے۔ میرزا لطف اللہ مرشد قلی خاں کو نکال باہر کرنے کے بعد علی وردی خاں مہابت جنگ نے اپنے بھتیجے اور داماد سعید احمد خاں (صولت جنگ) کو اڑیسہ کا ناظم مقرر کیا۔ مگر صولت جنگ میں اسوقت تک جوہر قابلیت پیدا نہیں ہوئے تھے۔ جوان تھا۔ اس نے فوجوں کی تنخواہ میں کمی کر دی۔ زمینداروں پر ظلم کرنے لگا۔ خوبصورت اڑیہ عورتوں کو چن چن کر اپنے محل میں داخل کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڑیسہ میں زبردست شورش پیدا ہوئی۔ فوجوں نے بغاوت کی اور سعید احمد خاں کو قید کر لیا۔ ناچار پھر علی وردی خاں کو اڑیسہ پر حملہ کرنا پڑا۔ وہ داماد کو وہاں سے بچا لایا۔

مرشد قلی خاں تو دکن چلا گیا مگر وہاں اس کا میر بخشی، میر حبیب اردستانی چین سے نہیں بیٹھا۔ اپنے آقا کا حق نمک ادا کرنے کے لئے اس نے مرہٹوں کو علی وردی خاں کے خلاف ابھارا۔ رگھوجی بھونسلہ کے پاس صوبہ برار میں پہونچا اور فتح بنگالہ کی ترغیبیں دینے لگا۔ چنانچہ میر حبیب اردستانی کے ترغیب دلانے سے رگھوجی نے ایک لشکر بھاسکر پنڈت کی ماتحتی میں بنگال کی طرف روانہ کیا۔ برسوں مرہٹوں کے پے بہ پے حملے ہوتے رہے۔ اخیر میں تنگ آکر اور خانگی دشواریوں کی وجہ سے علی وردی خاں کو پیرانہ سالی میں صلح کرنی پڑی اور اڑیسہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔ مرہٹوں کی انھیں لڑائیوں میں سے کسی ایک لڑائی کا ذکر جلال الدین جلال کی تاریخ فتح میں آیا ہے۔

تذکرہ شورش کی عبارت ہے۔ جلال الدین جلال۔ شاعر رنگیں جلال الدین ساکن مرشد آباد در تواریخ عبور داشت وخود ہم اکثر تاریخ فتح نواب مہابت جنگ غفرلہ گفتہ۔ ایں تاریخ ہم از دست ؎

سر شد ہم مرہٹہ ضمناً اڑیسہ ہم — تاریخ ایں دو فتح بیک گز دو فاختہ

صلۂ آں از سرکار یافتہ و مثنوی ہم لبقید قلم آوردہ بود لیکن اشعار آں یاد نماندہ۔ از دست ؎

کماں ابرو کرے زیں گر سمند خود پسندی کو — مہ نو ماں لے آنکھوں سے وجہ نعل بندی کو

اس شعر میں کچھ کچھ غالب کی سی ترکیب معلوم ہوتی ہے۔

گز | اردو فارسی میں دو معنی میں ہندوستانی شعرا نے استعمال کیا ہے۔ ایک تو میر انیس کہہ گئے ہیں ؎

گز بن گیا تھا راہ خدا میں زمین کا۔ یعنی کچھ اپنے قدموں سے زمین ناپتا ہوا مسافر کربلا کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جلال کے اس مصرعہ میں "گز" سے مراد وہ بندوق ہے جس میں گز کی مدد سے چھرا بھرا جاتا ہے۔ علی وردی خاں کے عہد میں اس قسم کی بندوقوں کا استعمال ہوتا تھا۔ آج بھی کہیں کہیں ایسی بندوقیں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں اسے (MUZZLE LOADING GUN) کہتے ہیں۔

میر ظفر علی آزاد | علی وردی خاں ہی کے عہد میں میر ظفر علی آزاد مرشد آباد پہونچے اور آخر وہیں کے ہو رہے۔ تذکرۂ عشقی کی عبارت ہے۔

"آزاد" تخلص، دہلوی۔ اسمش میر ظفر علی۔ مردے آزاد مشرب، درد مند و آشفتہ حال بود۔ بیشتر مشق اشعار فارسی می کرد و با یکے از کنیزگان بیناسیگم نزاکت نام سلسلۂ تعشق داشت۔ مدتے در بنگالہ قیام ورزید۔

آخر بما نجاد لیعت حیات سپرد۔ از دست ؎

پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں ۔۔۔ یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
وعدۂ وصل تو کرتے ہو ولے سچ کہیو ۔۔۔ دل کو اس وعدہ سے میں شاد کروں یا نہ کروں

بعد کو اسی زمین میں قوافی بدل کے سودا نے فکر کی ہے اور میر مونس کی بھی مشہور غزل ہے ؎

یار آرام میں ہے وصل کی شب آخر ہے ۔۔۔ متفکر ہوں کہ بیدار کروں یا نہ کروں

شاہ علیم اللہ بیتاب اس دور کے سب سے بڑے صوفی اور عالم تھے۔ ان کے علاوہ شیخ ملا نصیر مرحوم تھے جن کی نسل سے نوابان شیخ پورہ و حسین آباد تھے۔ شاہ علیم اللہ بیتاب کے نام کی اہمیت ان کی اولادوں سے بڑھ جاتی ہے۔ ان کے ایک صاحب زادے سید ہدایت علی خاں اسد جنگ تھے جنھوں نے بہار کی صوبہ داری کی نیابت انجام دی تھی اور اس زمانے میں جب مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔ شاہ صاحب کے پوتے سید غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین ہوئے۔ تذکرۂ عشقی کی عبارت ہے۔

بیتاب۔ اسمش شاہ علیم اللہ۔ مردے فاضل۔ از متوطنان شہر الہ آباد است۔ بیشتر فکر فارسی می کند۔ گاہ گاہ بحسب اتفاق جہت تفریح طبع دوستاں مطلع وغزلے بہ زبان ریختہ می گوید۔ از دست ؎

دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے ۔۔۔ اس وقت میں تو اے مرے اللہ کہاں ہے
نہ بگولا ہے نہ یہ گرد ہے ویرانے کی ۔۔۔ خاک پھرتی ہے گی اڑتی کسی دیوانے کی

نہ پوچھ اے بندہ پرور مجھ کو یاں کس سے علاقہ ہے
میں وہ بندہ ہوں جس بندے کا صاحب تو ہی آقا ہے

تذکرۂ عشقی میں کل چھ اشعار ہیں۔ شاہ صاحب موصوف کے دو صاحب زادے تھے۔ سید راہب علی خاں اور سید ہدایت علی خاں۔ شاہ علیم اللہ اور سید ہدایت علی خاں کا مقبرہ شکستہ و بوسیدہ حالت میں محلہ ذن گولہ عظیم آباد میں اسوقت تک موجود ہے، جہاں راقم آثم کے بزرگوں کی بھی تربتیں ہیں۔ راہب علی خاں کے صاحب زادوں میں میر غلام حیدر رونق مشہور تھے اور سید ہدایت علی کے صاحب زادوں میں سید غلام حسین وفا صاحب سیر المتاخرین۔

خاندان مہابت جنگ مہابت جنگ کی حیات میں اور ان کے بعد بھی ان کے خاندان والوں نے شاعروں کی سرپرستی کی گرچہ یہ زمانہ نہایت قلیل تھا۔ مہابت جنگ کے خود کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ دو بیٹیاں دو بھتیجوں سے بیاہ دی گئی تھیں۔ ایک بیٹی کی شادی، زین الدین احمد خاں خلف حاجی احمد برادر بزرگ مہابت جنگ سے ہوئی تھی۔ ان صاحب زادی کے بطن سے سراج الدولہ تھا۔ زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ (نواب شہید) بہار کے نائب ناظم تھے۔ انھیں کے عہد میں سید ہدایت علی کو بہار کی نیابت سپرد ہوئی تھی، زین الدین احمد خاں کے دوسرے بھائی کا نام سعید احمد خاں تھا جن کا ذکر اوپر آیا۔ اڑیسہ میں ناکامیاب حکومت کے بعد علی وردی خاں نے پورنیہ کی فوجداری سعید احمد خاں صولت جنگ کے حوالے کر دی تھی۔ بعد کو فوجداری کا عہدہ صوبہ داری سے بدل گیا۔ زین الدین

احمد خاں افغانوں کے بلوے میں شہید کردئے گئے تھے۔ ان کا مزار عظیم آباد میں موجود ہے اور صولت جنگ کا انتقال پورنیہ میں مہابت جنگ کی موت سے چھ ماہ پہلے ہوا تھا جہاں ان کی قبر باغ جعفری میں موجود ہے۔ زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ پدر سراج الدولہ کی عمر گویا افغانوں اور مرہٹوں کی لڑائی میں تمام ہوئی تاہم ان میں ہر طرح کے جوہر قابلیت موجود تھے۔ ان ہی کے زمانہ میں عظیم آباد میں میر باقر حزیں شاگرد میرزا مظہر جانِ جاناں گذرے۔

میر محمد باقر حزیں

تذکرۂ شورش کی عبارت ہے۔ حزیں تخلص۔ شاگرد میرزا مظہر میر محمد باقر حزیں تخلص خلف فخر اللہ خاں ساکن عظیم آباد۔ بعد شہادت خانِ موصوف تشریف بہ شاہجہان آباد بردہ بہ خدمت خواجہ محمدی خاں صاحب غفرلہ رسیدہ و در آنجا دو دیوان بقید قلم در آوردہ لیکن دیوانِ دوم کے در جواب انعام اللہ خاں یقین بودہ ان قلیل بودہ بعد نادر شاہی در وقت حکومتِ زین الدین احمد خاں بہادر ہیبت جنگ از دہلی مراجعت نمودہ بعظیم آباد رسیدہ در سرکار نواب موصوف نوکر گشتہ و از ہمشیرۂ میر قدرت اللہ مغفور خلف حضرت شاہ شکر اللہ کہ فدا شدہ، تا زیست بہ عشرت و خرت ماندہ۔ از وست ؎

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا | ابرِ مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا
اے حزیں شکر کر ہے مصحفِ اربابِ جنوں | فیض سے حضرتِ مظہر کے یہ دیواں میرا

یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا یوں تھا کہ فصلِ گل میں چھوڑوں آشیاں اپنا

اخیر میں انھوں نے مرشد آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں فوت ہوئے۔

صولت جنگ اور شوکت جنگ

ہیبت جنگ کی شہادت کے بعد اور چچا کی تقلید میں سعید احمد خاں صولت جنگ نے اپنے کو سنبھالا۔ عورتوں کی صحبت کو ترک کیا۔ عالموں اور اونچے خاندان والوں کی صحبت اختیار کی۔ غریبوں اور مظلوموں کی فریاد سننے لگا۔ خاندانی امرا کی باریابی ہونے لگی اور انھیں اونچے عہدوں پر مقرر کرنے لگا۔ نماز صوم و صلوات میں وقت گذارنے لگا۔ اوقات مقررہ اور حکومت کے کاموں کے بعد فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لیتا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر تفصیل سے ریاض السلاطین ۳۵۵ اور سیر المتاخرین ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ میں موجود ہے۔ اس نے سات برسوں تک پورنیہ پر بحیثیت صوبہ دار حکومت کی۔ علی وردی خاں کے انتقال کے چند ماہ پہلے ۱۷۵۶ء میں پورنیہ میں رحلت کی اور باغ جعفری میں دفن کیا گیا۔

صولت جنگ کے بعد اس کا بیٹا شوکت جنگ فوجدار مقرر کیا گیا۔ یہ ایک تو کم سن اور ناتجربہ کار تھا۔ اس پر بھنگ کھانے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس وجہ سے مالیخولیا میں مبتلا تھا۔ یہاں تک کہ سراج الدولہ کے خلاف بلدی باڑی کی لڑائی میں توپ کے گولے سے مارا گیا۔ شوکت جنگ اکثر بھنگ کے نشہ میں بہت سی اول فول باتیں بھرے دربار میں کیا کرتا تھا۔

وہ کہتا تھا۔ یہاں کی آب وہوا میرے مناسب حال نہیں ہے۔ میں پہلے بنگال فتح کروں گا۔ اس کے بعد دہلی کے تخت پر اپنے مزاج کے مطابق بادشاہ بٹھاؤں گا اور خود ایران جا کے شیراز میں اپنا دارالامارت بناؤں گا۔ ایسی ایسی باتیں تاریخوں میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ عین حالت جنگ میں عورتوں کا طائفہ اپنے ساتھ لیتا گیا باوجود ان عیوب کے اپنے باپ کے بعض اچھے کردار سے بھی نا آشنا نہ تھا۔ صاحب سیرالمتاخرین کے مطابق شوکت جنگ جاہل تھا۔ اس میں زنانہ پن تھا۔ اور عورتوں کے لب و لہجہ میں باتیں کرتا تھا۔ وہ نہایت بُری بُری گالیاں بکتا تھا مگر اس کی تردید تذکرۂ عشقی کی عبارت سے ہوتی ہے۔

" گویند رسائی ذہن و طاقت لسّان بخوبی تمام دارد۔ از وست ؎

قید میں یوسف کو بھیجا واہ یونہی چاہیئے　　خوب کی تو نے زلیخا چاہ یونہی چاہیئے

شوکت جنگ کا تخلص سوزاں تھا۔ خود شاعر تھا اور شعرا کی صحبتیں پسند کرتا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے عہد کے مشہور شاعر حسب ذیل ہیں۔

میر محمد حیات حسرت | ان کے متعلق تذکرۂ عشقی کی عبارت ہے۔

" حسرت تخلص عظیم آبادی۔ اسمش میر محمد حیات۔ مخاطب بہ خطاب ہیبت قلی خاں از شاگردان میر باقر حزیں تخلص و بقول بعضے از شاگردان میرزا جان جاناں مظہر بود۔ چندے بہ رفاقت نواب شوکت جنگ خلف نواب صولت جنگ ناظم پورنیہ و مدتے بخدمت داروغگی عرض نواب سراج الدولہ بہادر۔ ناظم بنگال سرفرازی یافت۔ آخر در زمرۂ نواب مبارک الدولہ مبارک علی خاں بہادر منسلک بودہ۔ آخر ہما نجا بہ رحمت الٰہی پیوست۔ دیوانش قریب دو ہزار بیت باشد۔ این چند اشعار منتخبات دیوان اوست

آرام دیویں عشق میں یاد کھو دیا کریں　　ان ظالموں کی جو ہو رضا سو کیا کریں

غالباً اس مطلع میں انگریزوں کے جور و استبداد کی طرف اشارہ ہے۔

کعبہ میں ہم گئے نہ کیا ان بتوں کا عشق　　اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

رات کا سچ ہوا یہ خواب مرا　　مل گیا صبح آفتاب مرا

میر محمد رضا جراءت | ان کے متعلق تذکرۂ شورش کی عبارت ہے۔

" جراءت۔ شاعر اہل مروت و فتوت، میر محمد رضا جراءت، شاعر فارسی ولد سید محمد وحید وحید تخلص بخطاب سید صدرالدین منصب دار بادشاہی، صاحب جاگیر۔ در علم ظاہر عالم جید و منشی و متعدی و سخاو شجاع و شوخ طبع۔ چنانچہ می فرماید ؎

بسکہ تابد ز جبیں شوخی طبعم جراءت　　شمع ساں گرم بود محفل یاران از من

روزے در مدح نواب شوکت جنگ فرمودہ ؎

گر کند عزم چمن نواب شوکت جنگ ما　　گل پئے تعظیم او خیزد بسر نرگس بہ چشم

در ایام سفارت نوشتہ ؎

وہ چہ پرسی کہ چہا در غم ہجراں کردم　　چشم تر خاک بسر، چاک گریباں کردم

نواب موصوف روزے فرمائش شعر نمودہ، بدیہہ گفت ؎

اے کہ گل بندۂ بوئے تو و لیکن باغیست رنگ رخسار ترا لالہ غلام داغیست

در دیں داری، در جناب حضرت پنجتن پاک علیہم الصلوات والسلام محبّت و اعتقاد تمام داشت در ہر ماہ فاتحہ بتاریخ نمودہ. گاہے ناغہ نہ کرد۔ بروز پنجشنبہ نیز معہ اولیاء کرام، و بست دو روپیہ نقد بادر ماہہ خود کہ مبلغ شصت روپیہ سوئے خدمت کہ از سرکار نواب صولت جنگ مرحوم می یافت نذر سادات مثل میر محسن قلندر وغیرہ می نمود. چنانچہ در مدح غالب کل غالب حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام می فرماید ؎

دو جہاں روشن ز عکس نور مولا تا علیست آفتاب عالم سفلی و ہم بالا علیست

ان کا انتقال پورنیہ میں ہوا اور لاش عظیم آباد لائی گئی۔ شریعت آباد میں دفن کر دی گئی۔ میر ہادی مرحوم نے تاریخ وفات کہی ہے جو کسی تذکرہ میں درج ہے۔ یاد نہیں آتی ہے۔ میر محمد رضا کا اُردو میں ایک ہی شعر یادگار ہے ؎

نہ پایا کوئی بلبل نے گلوں سے مہرباں اپنا کیا اس واسطے جا گرم گلخن سے مکاں اپنا

میر مدن بیتاب | یہ سراج الدولہ کے میر بخشی تھے اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کے خلاف لڑ کر مارے گئے تھے۔ میر مدن کا مارا جانا گویا سراج الدولہ کی شکست تھی شاید ہی کوئی تاریخ ہو جس میں جنگ پلاسی کے بیان کے ساتھ میر مدن کا ذکر نہ ہو۔ یہ دہلوی تھے۔ تذکرۂ شورش کی عبارت ہے۔

"میر مدن بہادر۔ بیتاب تخلص. متوطن شاہجہاں آباد است۔ از چندے بطرف مرشد آباد آمدہ بخدمت بخشی گیری بسرکار نواب سراج الدولہ بہادر۔ منصور الملک مقروض گردیدہ۔ اقتدار و اعتبار بہم رسانیدہ۔ چوں شجاعت و سخاوت از خاندان خود میراث داشت در معرکہ شہید گردید. طبع موزوں داشت۔ گاہے گاہے بہ سوئے شعر ہم میلان می نمود. کلامش خالی از کیف نیست۔ ایں دو اشعار از اشعارش بہم رسانیدہ ؎

عبث خیال ہے دل کو خوشی کا دنیا میں کہ سایۂ رم آہو میں کس نے خواب کیا

بہت ہے یار سے ملنے کی آرزو بیتاب
یہ مدعا کو ہمارے خدا شتاب کرے

مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ اس زمانے میں بڑے بڑے علما و مشائخ بہار میں گذرے جن کا ذکر شاد عظیم آبادی نے تاریخ بہار مطبوعہ بار دوم ۱۸۹۱ء میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۱

"اُس کے (علی وردی خاں) کے زمانۂ ریاست میں بہار بڑے بڑے فاضلوں اور اہل اللہ کا مسکن تھا۔ مولوی نصیر متوطن شیخپورہ۔ بہت بڑے عالم تھے۔ ولایت ایران سے پڑھ کر آئے تھے میر غلام محمد بہاری، زائر حسین خاں میر محمد علیم تحقیق تخلص، شاعر کامل، میر رستم علی جن کی قبر مقبرہ، میر افضل سوداگر کشمیری میں ہے، شاہ محمد امین، شاہ ادہم، شاہ نعیم اللہ طباطبائی پدر سید ہدایت علی خاں جن کا مدفن مقبرہ نون گولہ میں ہے شاہ غلام علی ساکن موضع اوساس دیوہرہ متعلق پرگنہ اودل (گیا) شاہ بدیع الدین ساکن بہار اولاد شاہ شرف الدین منیری، شاہ کہایا سہسرامی و شاہ محمد مسیح ساکن الیا مضاف مونگیر و شاہ مولانا ساکن پرگنہ سورج گڈھہ۔ مدرسہ سیف خاں مرحوم میں اس وقت چار سو طلاب مستعد جمع تھے قاضی مظفر سا فاضل جناب شیخ محمد حسن، و شہید ثانی

(باقی صفحہ ۶۰ پر دیکھئے)

تمنا مظفرپوری

ہفتہ وار بمبئی پنچ بہادر

انیسویں صدی کے ایک ظریف اخبار "ڈیلی پنچ دہلی" کے متعلق ایک مضمون شاعر مارچ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوچکا ہے
اس مرتبہ انیسویں صدی کے ایک دوسرے ظریف اخبار "بمبئی پنچ بہادر" کے متعلق مضمون حاضر خدمت ہے۔

ہفتہ وار بمبئی پنچ بہادر ۱۸۹۸ء کے زیرِ نظر شمارے تیسری جلد کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے مالک ایڈیٹر تھے جناب حکیم عبدالحمید صاحب فرخ دہلوی اور یہ اخبار اُن ہی کی نگرانی میں مطبع حمیدی واقع بھنڈی بازار بمبئی سے چھپ کر مہینے میں چار بار ہر دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ جناب فرخ دہلوی کے زیرِادارت بمبئی پنچ بہادر کے علاوہ دو اور رسالے سلطان الاخبار روزانہ اور آزاد پنچ ہفت روزہ بھی شائع ہوتے تھے۔ بمبئی پنچ بہادر کی سالانہ قیمت دو روپیہ، سلطان الاخبار کی سالانہ قیمت بارہ روپیہ اور آزاد پنچ کی سالانہ قیمت دو روپیہ تھی۔ لیکن سلطان الاخبار اور پنچ بہادر کے سالانہ خریداروں کو آزاد پنچ مفت ملا کرتا تھا۔

ہفتہ وار بمبئی پنچ بہادر (جلد ۳ ۱۸۹۸ء) ہر ہفتے رنگین کاغذ پر سائز ½۱۰ × ۸ کے آٹھ صفحے اور ہر صفحے میں تین کالم ہوتے تھے شائع ہوتا تھا۔ "ٹائیٹل پیج کے نصف اوپر کے حصہ میں بمبئی پنچ بہادر موٹے حروف میں لکھا ہے اور نصف نیچے ہی سے مضمون شروع ہوجاتا ہے۔ پورا اخبار تین حصوں میں تقسیم ہے پہلا حصہ "مقدمۃ الجیش" کے عنوان سے ابتدائی سال میں یعنی ۴ جولائی ۱۸۹۸ء شمارہ ۲۷ تک تین صفحے اور پھر بعد میں شمارہ ۲۵ سے چار صفحے ادارہ کی طرف سے تحریر ہیں۔ دوسرا حصہ "معرکہ آرائی" کے عنوان کے تحت نامہ نگاروں کے مضمون سے پُر ہے۔ ان دونوں مستقل عنوان "مقدمۃ الجیش" اور "معرکہ آرائی" کے عنوان کے تحت ہر ہفتے سیاسی، ادبی، تفریحی [illegible] مضامین اور نظمیں الگ الگ سرخیوں کے ساتھ شامل ہیں۔ اور اس رسالہ کا تیسرا اور آخری حصہ ہے۔ جاسوسوں کی رپورٹیں۔ مختصر خبروں پر مشتمل آخری ایک صفحہ۔

اس آٹھ صفحے کے رسالے کے کسی ایک شمارے سے اقتباسات پیش کرنے پر قارئین کو اُس زمانے کے ادب، سیاست اور صحافت کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل نہیں ہوسکتی ـــ۔ اس لئے مختلف شماروں کے خاص خاص مضامین سے اقتباسات پیش کرتا ہوں جو کسی نہ کسی اعتبار سے ادبی یا تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

بمبئی پنچ بہادر جلد ۳ بمبئی دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۹۸ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۱۵ھ شمارہ ۱ صفحہ ۱۔
مقدمۃ الجیش کے مستقل عنوان کے تحت "آب آمد تیمم برخاست" ایک ایڈیٹوریل سال نو کی آمد پر لکھا گیا ہے۔

سالِ منحوس! تیرا کالا منہ … چل پرے ہٹ ہمیں نہ دکھلا منہ

...... یہ کمبخت سمجھا ہی نہیں چھوڑتا تھا بسن کے رسّے کی طرح کھنچا ہی چلا آتا تھا۔ گھڑی ساعت گنتے گنتے نوبت بہ دم شماری پہونچی لیکن اسکی بمشیار گھڑیاں تمام ہی نہیں ہوتی تھیں مگر کب تک آخر اس کے بھی بارہ بج گئے بستر ۹۵ء ...... تو ہاتھ کا ڈنڈا لے کر اس پر دوڑے تو یہ تان توڑا لے کر بھاگا۔ ورنہ تو یہ یہ کیا کھسکنے والا تھا۔

تین صفحہ میں طاعون قحط فتنہ فساد وغیرہ کا رونا روتے ہوئے نئے سال کی آمد کی خوشی میں ادارے کی طرف سے مضمون تحریر ہے

رسالہ کا دوسرا حصّہ (صفحہ ۳) "معرکہ آرائی" ہے پہلے کالم میں "ساقی نامۂ نوروز" ہے اور دوسرے کالم (صفحہ ۴) سے صفحہ ۵ کے دوسرے کالم تک) پر جشن سال نو" دنیا تمام بزم خرابات ہوگئی" کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ مضمون قارئین کی لطف اندوزی کے لئے پیش ہے۔

...... ہم اقوں کے جلسے جمے ہیں۔ ترنگیں اُڑ رہی ہیں ہر شخص کی زبان کوس لمن الملکی بجاتی ہے ہر ٹولی اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا راگ گاتی ہے۔ الغرض ساری دنیا کی قومیں جمع مصروف بادہ خواری ہیں اور ہر گروہ کی زبان پر حسب حال اشعار جاری ہیں۔

"روس کی طرف سے آواز آتی ہے،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے … حسن را پروردگار عشق را پیغمبرے

"مسٹر انگلستان حکیمانہ ادا سے مسکرا کر یہ کہتے ہیں۔

گر بادہ خوری تو باخرد منداں خور … یا با صنمے نوش لب خنداں خور
بسیار مخور ورد مکن فاش مساز … اندک خورد، گہ خورد پنہاں خور

جرمن جو خوب چہک چکے ہیں اخیر گلاس اٹھا کر احمر کا لطف دیکھ رہے ہیں یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

جاں نفزا ہے بادہ جس دم ہاتھ میں جام آگیا … سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

"فرانس سے سن کر نہ رہا گیا۔ بوتل کے کاگ کی طرح اُچھلکر بولا۔

میں رند بسیار نوش ہوں اے ساقی بدمست … کب ہوگی مری ایک دو ساغر سے تسلّی

"ترکی جو ابتک" صراحی تہی گشت و مینا خموش" کی کیفیت میں غرق تھا چونک کر بولا۔

ساقیا برخیز و درده جام را … خاک بر سر کن غم ایام را"
بیا ساقی کہ من مُردم دریں میخانہ خاکم کُن … بآب مئے بدہ غسلم کفن از برگ تاکم کن"

یونان سے بھی نہ رہا گیا۔ روس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید … کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

آسٹریا کو بھی ایک شعر یاد آگیا اس نے کہا تم کیوں چپ رہو۔ کہہ بھی گذرو۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو … اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

مصر نے خمیازہ لے کر کہا کہ ہمکو بھی ایک شعر یاد آیا۔

ہاتھوں میں جو طاقت نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مہدی سوڈانی نے سنتے ہی پکارا ؎　　غفور است ایزد تو ساغر بنوش

افریقہ کے مجمع سے آواز آئی۔

ابر اٹھا تھا کعبہ سے ، جھوم پڑا میخانوں پر　　بادہ کشو کا جھرمٹ ہے شیشوں پر پیمانوں پر

یہ سنکر مسلمانوں نے یک زبان ہوکر یہ قطعہ پڑھا۔

شب ساقی ازاں بادہ کہ در جام طرب کرد　　آتش بعجم درزد و تاراج عرب کرد
مستانہ بلاماں تو دستے زدہ بودیم　　ایں عقل جہول آمد و تعلیم ادب کرد

امیر کابل نے انگلستان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام　　مدعا ہم کو تو ساقی سے ہے اور جام سے کام

ہندوستان جو بیچارہ گردن جھکائے اتار بنوش و کباب گرم کے عوض مٹھی بھر بھونے چنے کی ایک ایک دال چن چن کر کھاتا جاتا ہے نشہ کا اُتار ہے مبتلائے زحمت خمار ہے۔ یوں گویا ہوتا ہے اور چپ ہو رہتا ہے۔

ہزاراں عقدہ چوں انگور در دل داشتم صائب　　بیک پیمانہ میسکرد ساقی حل مشکلہا

کہ اتنے میں ایک ہل چل ہلڑ مچگیا۔ بادہ کشاں سیہ مست۔ رنداں خرابانی۔ ایکدوسرے پر گرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جام صراحی ٹھوکروں سے فرشِ زمین پر ڈھلکتے پھرتے ہیں۔ بوتلیں اُولٹیں گلاس ٹوٹے۔ خم لنڈھے اور میکش پڑھتے ہوئے نکلنے لگے۔

مئے دو سالہ و ساقی چہاردہ سالہ　　مرا بس است ہمیں صحبتِ صغیر و کبیر

ہم بھی گھبرا کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لگے ہکا بکا ہو کر زمین و آسمان کو دیکھنے۔ اوس حال میں کیا دیکھتے ہیں کہ۔ پنچ بہادر علیہ الرحمہ دوسری جلد[1] شریف لئے نازل ہو رہے ہیں آتے ہی سبکو ڈانٹ بتائی کہ گھبراتے کیوں ہو۔ پھر ایک ایک پرچہ سب کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور کہنے لگے ؎

بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند　　چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

۹۷-۱۸۹۶ء میں ملک کے اکثر شہروں میں اور خاص طور پر بمبئی کے علاقوں میں زوروں کا طاعون پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے ابتدائی سال ۱۸۹۸ء کے پنچ بہادر میں ادارہ اور نامہ نگاروں کی طرف سے زیادہ تر مضامین طاعون پر ہیں یا پھر کچھ سالِ نو کی خوشی میں "ساقی نامے ہیں" سیاسی مضمون میں زیادہ تر سرحدی جھگڑوں اور آفریدیوں کی جھڑپ کا ذکر ملتا ہے۔ شمارہ ۳، ۷ رفروری کے اخبار میں ایک مضمون ہے۔

"...... خدا جانے سرحدی وحشیوں کو یہ کیا مرض پڑ گیا ہے کہ ہمارا گورہ فوج میں سے چھانٹ چھانٹ کے گداز نرم نرم چھوٹے چھوٹے غرض ہر طرح تیار دانہ دیکھکر ایک آدھ اچک لے جاتے ہیں اور کبھی تو دو چنوں پر ہٹ پھیری کرتے ہیں۔ چنانچہ درۂ شلکر کی ناگہانی جنگ میں ۱۲ گورے یعنی پورا سٹ کا سٹ اڑا لے گئے۔ خدا جانے وہاں لے جاکر ان کا مربہ ڈالتے ہیں کہ مربی بیاد و مربا بخور پر عمل کریں یا انگریزی

---

[1] دوسری کے بجائے تیسری جلد ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں یہ کتابت کی غلطی ہے۔

چٹنی بنائیں۔

۷ رفردوسی ہی کے شمارے میں "معرکہ آرائی" کے مستقل عنوان کے تحت ایک "ساقی نامہ شرعی" آزاد اکبر آبادی صاحب کا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پلا ساقیا جام مُل بے نظیر | ہوا دام الفت میں تیرے اسیر
تعشق میں اپنے مجھے کردے مست | میری نیستی کو تو اب کردے ہست
ہے دونوں جہاں کا تو ہی بادشاہ | نظر کر مرا دیکھ حال تباہ
ترے شاہی ایوان سے دور ہوں | جدائی سے تیرے میں رنجور ہوں
تو ہی شافع روزِ حشر و نشور | ترے نور کا ہے گا جگ میں ظہور
نہ کر جام دینے سے ہرگز گریز | تو خون صراحی و ساغر بریز
خدا کے لئے اے مرے ساقیا | جو ہے عشق کی مے وہ مجھ کو پلا
تصدق سے ان کے جو ہیں چار یار | خلیفہ ہیں تیرے یہ سب راز دار
بلا پاس اپنے مجھے یا رسول | مرے حال پر رحم کر یا رسول

یہ ساقی نامہ ۲۲ اشعار پر مشتمل ہے اور جتنے ساقی نامے ملے ہیں اُن میں سنجیدہ ہے اور مناجات کا رنگ لئے ہے ورنہ زیادہ تر ساقی نامے نیم عریاں اور ہلکے پھلکے مزاج پر مبنی ہیں۔ اسی شمارے میں دو اور ساقی نامے ہیں۔ اور ایک نظم "اللہ بچائے" معرکہ آرائی کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے۔ دلچسپی کے لئے نظم پڑھئے اور ساتھ ہی اُس وقت کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالت کا اندازہ کیجئے۔

دیکھو کہ عجب ہند پہ آئی یہ بلا ہے | اللہ بچائے
قانون رضامندی نے ناراض کیا ہے | اللہ بچائے
ایسا ہے زمانہ کہ شریفوں کو ہے فاقہ | اک دن نہ افاقہ
مذہب میں خطرناک عجب جھگڑا اٹھا ہے | اللہ بچائے
شادی نہ ہو دختر نہ ہو گر بارہ برس کی | کیا بات ہے کس کی
ہاں بیس برس تک بھی نہیں عقد ہوا ہے | اللہ بچائے
کیا بالغہ کی عمر بھی کوئی ہے مقرر | ہاں کھولئے دفتر
مذہب کی کتابوں میں یہ تخمینہ لکھا ہے | اللہ بچائے
اس بحث سے حاصل نہیں کچھ ہوگا ویکن | یہ بات ہے ممکن
سب ایک ہوں دروازہ عدالت کا کھلا ہے | اللہ بچائے
ہندو بھی مسلمان بھی دونوں ہیں پریشاں | شاکی کوئی گریاں
سرکار توجہ کرے کیا شور مچا ہے | اللہ بچائے
میونسپٹی بھی بیدینی بھی تہذیب ہے تہذیب | کیا خوب ہے تقریب
لٹ بٹ کوئی مسئلہ اس کی کیچڑ میں پڑا ہے | اللہ بچائے

میخواری نہ ہو وہ نہیں قانون سے بھاری — نقصان ہے بھاری
دہ سال کی شادی نہ ہو ہنگامہ بپا ہے — اللہ بچائے

اب تک اخبار کے دو حصّوں سے اقتباسات میں نے پیش کئے ہیں۔ اسکے تیسرے حصے "جاسوسوں کی رپورٹیں" سے ایک خبر پڑھئے ۔

"نہایت افسوس کی بات ہے کہ مولوی ابو القاسم فضل ربّی عراقی شاعر حضور نظام دکن بعارضہ بخار و ورم جگر ، رشعبان کو انتقال کر گئے۔ مرحوم غدر کے ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ بڑے قابل ناظم تھے ان کی پر جوش قومی نظمیں دلوں کو ہلا دیا کرتی تھیں ۔

شمارہ ۸ ۔ ۲۱ر فروری ۱۸۹۸ء مطابق ۲۹ ر رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ ۔ مقدمتہ الجیش کے عنوان کے تحت صفحہ اوّل کا نصف جو ادارہ کی طرف سے تحریر کیا گیا ہے ۔ فرخ صاحب مدیر بمبئی پنچ بہادر کی زبان اور اندازِ تحریر کے لئے نوٹ کرتا ہوں۔ پہلا کالم ۔

"الوداع اے بھیّا رمضان الوداع"

ساتھ افسوس کے کرتے ہیں وداع تیرے کو ہم اے بھیّا رمضان اور مانگتے ہیں اس بات کی تیرے سے معافی اے بھیّا رمضان کہ نہ کر سکا ہم سب میں سے ایک بھی متنفّس خاطر مدارات جیسی کہ چاہئے ہونی ہے اس شہر یا قریہ یا محلّہ یا جہان کے در انحالیکہ ہوتا ہے نزول ترا بیچ اس جہاں کے سال پورے میں مہینے ایک کے واسطے فقط۔ مگر بھیّا تھے اس برس تو ہم مجبور کرنے دعوتوں تیری کی سے کس واسطے کہ کر دیا ہم کو کنگال کال نے اور کر دیا دِلوں ہمارے کو سسّت مرا مر کلنے اور کر گیا ہڑپ لاکھوں جانوں کو طاعون بہادر جو ہے موذی بہت اور لمبے لمبے دانتوں والا اور گرد گھنٹال سرحدی وحشیوں کا ۔ ... (باقی حاشیہ پر تحریر تھا جو جلد بندھنے میں کٹ گیا ہے)

دوسرے کالم کی سرخی ہے ۔ "پیٹ بھروں کے لئے معذرت"

"بھیّا رمضان بہادر ! شک نہیں بیچ اس بات کے کہ ہو گیا ہو گا تو آزردہ بہت بمبئی کے ساکنان سے کیونکہ دکھائی ہیں دل تیرے کو یہاں کے بہت سے ہٹے کٹے موٹے مشنڈے حرامخور دن دھاڑے کھا کھا کر روٹیاں پھولی پھولی آڑ میں لال پردوں کے بیٹھ کر بیچ بازار والی ہوٹلوں کے اور اڑاتے تھے قہقہے تیرے یار دوستوں یعنی روزوں سے رہنے والوں پر اے بھیّا رمضان یہ بھول گئے حضرت عزرائیل صاحب کو اور نہیں کھاتے خوف طاعون بہادر سے ذرا بھی کر دیا ان وحشیوں نے نام بد اسلام کا۔ سمجھ لے گا ان سے خدا بیچ قیامت کے روز کے پس نہ کیجو تو شکایت ان کی خدائے جبّار و قہار سے ورنہ وہ دیگا الٹ تختہ بمبئی کا سبب سے اِن ناہنجاروں و کندۂ ناتراشوں کے اور پس جائے گا گھن ساتھ جو کے یعنی ہو جائیں گے برباد اوس کے بندے نیک بھی وجہ رہتے سہتے ایک جگہ کے ۔

مقدمتہ الجیش کے مستقل عنوان کے تحت ہولی کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ پر ایک مضمون "یہ ہولی رنگ لائیگی" ادارہ کی طرف سے تحریر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدر کے بعد جو نفاق ان دونوں فرقوں میں پیدا ہو گیا تھا وہ کس طرح آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ ۱۴ر مارچ کے شمارہ میں لکھتے ہیں۔

" دہلی میں اس سال وہ رنگین ہولی ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کے صفحے کے صفحے رنگ گئے بلکہ عجب نہیں جو تاریخ میں بھی یادگار رہے، ہندو مسلمانوں نے خوب پچکاری سے پچکاری اور دھار سے دھار لڑائی۔ فریقین کی گرمی محبت و جوش مسرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دونوں کی دھاریں بیر بہوٹی کے رنگ کی تھیں خوب کپڑے رنگے گئے ٹوپیاں رنگی گئیں جیسا کہ عید کے روز ہندوؤں نے مسلمانوں کو پان کھلائے ایسے انھوں نے بھی لونگ الائچی دار کھلا دئے۔ ادلہ بدلہ تو ٹھیک ہوا کیونکہ مسلمانوں کو تو یہ ہدایت کی گئی ہے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ اس لئے اسی پر انھوں نے یہ قیاس کر لیا ھل جزاء الپان الا الپان۔ شربت کے دَور دورے بھی خوب ہوئے "

پھر ۲۸ر مارچ کو لکھتے ہیں۔

' دہلی والوں کے اتفاق کا جوش و خروش آجکل خوب تاؤ پر ہے خدا کرے کہ ایک آنچ کی کسر نہ رہ جائے ورنہ بڑی دل لگی ہوگی مخالفین قہقہے ماریں گے ،...

...... اتفاق درحقیقت اسی وقت قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو جانی یا مالی نقصان پہنچے اور وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ دہلی میں جو ایک مسلمان کا لڑکا کسی لالہ جوہری خاں کی بگھی کی لپیٹ میں آگیا تو اس کا والد صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا ۔۔ ہر چند پولس نے بھی اسکو ابھارا مگر اس نے ایک نہ مانی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ گاڑی بھی تو اپنی تھی اگر یہ بات سچ ہے تو اس سے زیادہ ہم کو فخر کا کیا موقع ملے گا۔

حکیم عبدالحمید صاحب اور ان کا اخبار سرسید کی مخالفت کرتا تھا۔ ان کو طرح طرح سے بناتا تھا لیکن ان کی وفات پر اپنے ۱۱ر اپریل کے شمارے میں لکھتا ہے۔

' بعض اشخاص نے ہم سے یہ دریافت کیا ہے کہ سرسید احمد خاں بہادر کے انتقال کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے ان کا انتقال قابل افسوس ہے یا نہیں۔ لہٰذا اینجانب میرا بھی فرض ہوا کہ کچھ نہ کچھ رائے زنی کر ڈالیں۔

سید احمد خاں بہادر کے انتقال کی نسبت اگر ہم سے پوچھو تو ایک آنکھ ہنستی ہے اور ایک روتی ہے ہنسنا تو اس معنی سے کہ اس شخص نے دین میں کیسی کیسی خرابیاں ڈالیں کلام مجید میں تحریفیں کیں۔ من گھڑت تفسیریں صحابہ کرام، آئمۂ اربعہ مفسرین پر طرح طرح سے مضحکہ اڑایا ہے جنت دوزخ کو ڈھکوسلہ بتایا ہے حوروں کو دہلی کے چکلہ کی کھٹیارنیاں بنایا۔ غلماموں کو علیگڑھ کالج کے ملائم ملائم بے پر و بال چوزے قرار دئیے۔ غرض تمام نظام قدرت کو درہم برہم کر دیا۔ دینی علوم پر انگریزی کو ہر طرح افضل ٹھہرا کر حتی الامکان اوس نے دنیا سے مذہبی تعلیم اڑھوا دی ...... دوسرا پہلو یعنی ایک آنکھ روتی ہے، وہ اس اعتبار سے کہ اس کو خداوند کریم نے دنیاوی عزت ہر طرح کی عطا کی تھی عقل ایسی ہی کچھ تھی کہ بڑے بڑے انگریز مدبر اُن کے آگے کان پکڑتے تھے، مدرسہ جاری کر کے ہزاروں مسلمانوں کو دنیاوی عزت حاصل کرا دی "

سرسید کی وفات پر کشتہ سہارنپوری کی ایک تاریخ ۹ر مئی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی ملاحظہ ہو تاریخ۔

تاریخ وفات سرسید احمد خاں بہادر بالقابہ

غفرلہ
۱۳۱۵ھ

سرسید احمد خاں بہادر بھی چل دیا

۱۳۱۵ھ

سید احمد خاں بہادر مر گئے قوم کا اوندھا ہوا ہے تخت و تاج

درد کا سب کچھ ہوا درماں مگر — کیا ہے مرگ ناگہانی کا علاج

. . . .

چھوڑ کر فرش مکلف خاک میں — نیند کیونکر آئے اسے نازک مزاج
پنچ تو یہ ہے تھے بڑے بیدار مغز — کر گئے سر کی بدولت خوب راج
رنج و کلفت سے مبدّل ہو گئی — انبساط و ارتباط و ابتہاج
سال غم گشتہ سے ہاتف نے کہا — رہ گئے ہیں پنچ ری لاوارث آج

۱۳۱۵ھ

راقم ـ ہے ایک گشتۂ غم دیوبندی ۱۸۹۸ء

عبدالسمیع گشتہ صاحب دیوبندی (سہارنپور) کی ایک غزل بھی اس شمارے (۹ مئی ۱۸۹۶ء) میں شامل ہے ملاحظہ ہو۔

کرنہ اے صیاد ناہموار وار اب کی برس — ہو رہی ہے بلبل گلزار زار اب کی برس
ہو گئے اوس شوخ کے اغیار یار اب کی برس — پھرتے ہیں روتے ہوئے غمخوار خوار اب کی برس
نوک مژگاں سے اگر یوں ہی رہیگی نوک جھونک — دیکھ لیں گے طالب دیدار وار اب کی برس
تاز بے جا اٹھ نہیں سکتا ہے ضعف ہجر میں — اور کچھ جتلائیے سرکار کار اب کی برس
قطرۂ شبنم نہیں برگ گل نوخیز پر — رویا ہے گلزار گل زار زار اب کی برس
جب خیال خال جاناں ہے سپر میرے لئے — مجھ پہ کر سکتی نہیں تلوار وار اب کی برس

. . . .

بے سبب ہرگز نہیں گشتہ سے تو دامن کشاں — ہو گئے شاید ترے اغیار یار اب کی برس

پنچ لفظ انگریزی کا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں مسخرہ، ٹھٹھولنا (ٹھونا) اور لفظ مسخرہ کو لے کر انگریزی میں ایک اخبار پنچ (PUNCH) نکلا۔ یہ انگریزی کا ایک مشہور مزاحیہ اخبار تھا۔ اس اخبار میں خبریں مضامین سب کے سب مزاحیہ پیرائے میں لکھے ہوتے تھے۔ اس کے بعد لندن پنچ نکلا۔ ان پنچ اخباروں کا سال اجرا انہیں معلوم لیکن انگریزی کے "پنچ" اخبار کے نمونہ پر ہی منشی سجاد حسین اور ان کے رفیقوں نے "اودھ پنچ" جاری کیا تھا اور پھر اردو میں پنچ اخبار شائع ہونے کا سلسلہ جاری ہو گیا ـــ بمبئی پنچ بہادر بھی پنچ اخبار کے نمونے پر شائع ہوا تھا۔ اس کے اندر جو بھی نثر و نظم شائع ہوتی اُس کی زبان اور انداز بیان مزاحیہ ہوتا حتیٰ کہ اچھے اچھے مانے ہوئے سنجیدہ ادیب شاعر جنکی عظمت آج بھی تسلیم کی جاتی ہے جب پنچ اخبار کے لئے لکھتے تو اُن کی زبان اور انداز بیان مزاحیہ ہوتا۔ جیسے امیر مینائی، داغ ۔ ناسخ وغیرہ) لیکن یہ لوگ جب کچھ مزاحیہ لکھتے تو نام بدلکر اور کبھی کبھی توسین میں ان کا نام آتا ہے کیونکہ اس زمانے کا مزاج ضلع جگت، پھکڑپن اور بھانڈپن پر مبنی تھا۔ دراصل لوگوں کا مذاق ہی کچھ ایسا تھا کہ عریانیت گالی گلوج فحش الفاظ ادب میں کہنا اور سننا پسند کیے جاتے تھے لیکن بمبئی پنچ بہادر میں ایڈیٹر صاحب اس کا خیال رکھتے تھے کہ عریانیت نہ آنے پائے۔

امیر مینائی اور حضرت داغ کا نام بمبئی پنچ بہادر میں کئی جگہ آیا ہے لیکن اُن کا کوئی مضمون یا اُن کی کوئی غزل یا نظم

اس میں شامل نہیں ہے۔ ان کا نام صرف "ارمغانِ فرخ" کے سلسلے میں آیا ہے[1]۔ البتہ ناسخ کی ایک اور فتنہ کی کئی عدد نظمیں اور کئی نثری تخلیقات اب تک میری نظر سے بمبئی پنچ بہادر میں گزر چکی ہیں۔ ناسخ کے قلم میں کچھ عریانیت ہے فتنہ کی نثر کا نمونہ چھبیسویں شمارے بتاریخ ۲۰ جون سے پیش کرتا ہوں۔ سرخی ہے۔

ہوتے ہیں تر پسینے سے آغوشں میں حسیں

پھولوں سے مجھ کو ڈھب ہے عرق کی کشید کا

چاہے حسن کا آفتاب کوئی حسین ہو چاہے حسن کا چاند ہو۔ ہم اس وقت جس حسین کے سراپا کا فوٹو کھینچ رہے ہیں وہ ایک حسن کی کہکشاں ہے عجیب دلفریب حسن ہے عجیب بلا کا حسن ہے عجیب دلکش صورت ہے عجب موہنی تصویر ہے۔ کیا پری شکل ہے۔

اس نثری قصیدہ میں بدن کے ہر ہر عضو کی الگ الگ تشبیہہ کے ساتھ تعریف کی گئی ہے چونکہ مضمون طویل ہے اس لئے دو ایک عضو کے متعلق تعریف نوٹ کرتا ہوں۔

پیشانی کی تعریف میں فتنہ صاحب کہتے ہیں۔

"پیشانی ایک بالشت بھر ہیرے کا ٹکڑا ہے جس کے اندر سونا گلا کے بھرا گیا ہے اور وہ جبیں جبیں میں دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ جب قطراتِ عرق اس پر جھلکنے لگتے ہیں تو کچھ نہ پوچھئے۔ اس سنہری دلکش ہوئی پیشانی کا کیا عالم ہوجاتا ہے جن لوگوں نے بلوریں سفید گلاسوں سے شمع کی سنہری لو نکلتی دیکھی ہے اون کو اس روشن پیشانی پر کچھ اچنبھا نہ ہوگا۔

آنکھ کی تعریف میں دیکھئے۔

چھپنے نہ دیں گی آنکھیں تمہاری بے وفا مجھے ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

ان آنکھوں سے قضا تو نہیں جھانکتی مگر فتنے ضرور جھانک رہے ہیں اور فتنے بھی کون جن میں شرارت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے پتلیاں کیا ہیں جادو کے جگائے ہوئے دو پتلے ہیں جو نظر لڑتی ہے دل کے ٹکڑے کر دیتے ہیں آپ نے آنکھیں بہت دیکھی ہوں گی کہ جھکی رہتی ہیں اٹھ گئیں تو امیر کی شعر کا مزا آگیا ۔

کیا بلا تھی نگہ ہوش ربا ساقی کی اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا

رخسار کے بیان میں ملاحظہ ہو۔

" اب آپ گالوں کی لطافت ملاحت صباحت نہ پوچھئے۔ لطف سخن کے ساتھ کہیں آپ میرے مضمون کے بوسے

---

[1] "ارمغانِ فرخ" ایک گلدستہ ہے جس میں بمبئی پنچ بہادر میں دیئے گئے ہر ماہ کے مصرعہ طرح پر شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک معیاری مجموعہ تھا۔ کیونکہ گلدستہ کے لئے غزلوں کے انتخاب میں بڑی سختی برتی جاتی تھی۔ شرائط میں وہ لکھتے ہیں۔ غزلوں کا انتخاب سخت ہوگا مگر ہر شاعر کے طبیعت کے اندازہ سے۔ اس قاعدے کی یہاں تک پابندی کی جائے گی۔ کہ اگر حضرت امیر و حضرت داغ کا بھی کوئی شعر ان کے درجہ سے گرا ہوا ہوگا تو بے تامل نکال دیا جائے گا۔ مانا کہ حضرات موصوف فی زمانہ مضامین کی کل، اشعار کے انجن نازک خیالی کے پتلے ہیں مگر بندہ بشر ہے ہر قافیہ کے ساتھ طبیعت یکساں نہیں لڑتی بقول ناسخ مرحوم بہت باراں پرستی ہے گہر ہوتے ہیں کم پیدا۔ (از بمبئی پنچ بہادر شمارہ ۳۵ - ۲۹ اگست ۱۸۹۶ء)

[2] بمبئی پنچ بہادر میں شعر ہر جگہ تانیث استعمال ہوا ہے۔

نہ لینے لگیں اس کا بھی مضائقہ نہیں مگر ڈر ہے کہیں گالوں کے مضمون کے بوسے لینے سے اس حسن کی کہکشاں کے گالوں پر نیل نہ پڑجائیں۔ آپ خیال کرسکتے ہیں ایسی پیشانی اور چشم ابرو کے لئے قدرت نے کیسے چمپئی سنہرے رخسارے نہ بنائے ہونگے۔ اگر پیشانی میں سونا گلا کر بھر آگیا ہے تو ان گالوں میں ماہتاب کی شعاعوں کا رنگ ضرور بھر آگیا ہے۔۔۔۔"

اب لب کی تعریف بھی سن لیجیئے۔

" آپ گلاب کے ایک بڑے پھول کو توڑیں اور اوپر کے ورق کو الگ کردیں۔ اندر سے ہلکے رنگ کی پتیاں نکلیں گی بس ان دو پتیوں کو ملاکر یہ دو ہونٹھ دیکھ لیجئے۔

اس بت توبہ شکن کی از سر تا کمر ہر عضو کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" آگے ایمان جانے والی باتیں ہیں۔ نہ وہ دن ہیں نہ وہ سن ہیں اب صرف حسن پرستی لہ گئی ہے" ان کے اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مضمون ان کے زمانہ ضعیفی کا ہے۔

بمبئی پنچ بہادر آزاد اور حق گو اخبار تھا ایک بار کسی مضمون کی اشاعت پر گرفتار کرلئے گئے۔ بہت دنوں تک مقدمہ چلا ایڈیٹر صاحب ڈٹ کر لڑتے رہے۔ ۱۴ جولائی کے اپنے مقدمۃ الجیش میں لکھتے ہیں۔

" حضور پنچ بہادر کی رعایا ہر آیا اور کل ارا کین دولت خوش ہوکر بغلیں بجائیں کہ اینجانب علیہ الرحمہ والغفران مع الزندگی وباخیر وخوبی بیک بینی و دو گوش و نصف داڑھی و دو مونچھ سلامت باکرامت نازل ہوگئے اور ایہ اخیر انتھو خیرا کا کاغذی بھانڈ حرا مخور سانڈ دونوں ہاتھ سے کلیجہ تھام کر اکڑوں بیٹھ جائیں کہ حضور اینجانب دو مہینے اعتکاف میں بیٹھ کر آرام سے بسر کرکے تازہ دم ہوگئے۔۔۔"

ہم کو اپنے باپ خان کے سر کی قسم جو ہم آزاد نگاری اور ثقہ بدمعاشوں کی دھجیاں اڑانیسے چوکیں ہم کسی کی فطرت اور دھوکہ بازی سے آزادانہ روش کو کیوں چھوڑیں۔۔۔۔۔۔ ہم جب لکھیں گے دن کو دن اور رات کو رات سے

سر چھوڑیں گے وحشی تری زلفوں کے ہمیشہ ۔۔۔ یہ سودا نہیں جائے گا سر جائے تو جائے

" اثنائے مقدمہ میں بہت سے خیر خواہوں نے ان کو خطوط لکھے کہ وہ معافی کیوں نہیں مانگ لیتے جبکہ بڑے بڑے انگریزی اخبار معافی مانگ لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔

" اینجانب کی تحریر پتھر کی لکیر ہے جو لکھا سو لکھا جب ہم مضمون کو قول دے چکے اوس کی آفت اپنے ذمہ لے چکے تو پھر وقت پر زبان کیسے بدل دیتے۔ مثل مشہور ہے کہ وقت گذر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک جیل کے مصائب کے نزدیک زبان بدل دینا بیشرمی کیساتھ معافی مانگنا ہزار درجہ بدتر تھا۔ اگر ہم کو اپنی زبان کی پاسداری اور شرافت وحمیت کے صلے میں دو روز (دو ماہ) طرح طرح کا رنج وغم اوٹھانا پڑا تو کیا پرواہ ہے۔ باحوصلہ اور جوانمرد اس سے منھ نہیں موڑتے سے

وہ ہیجڑے ہیں اس سے جو گھبرا لیتے ہیں فرخ ۔۔۔ دنیا کا غم و رنج تو مردوں کے لئے ہے

اس طویل مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرخ صاحب باہمت الشان تھے۔ ان کے اندر زبان کا پاس اور شرافت وحمیت مکمل طور موجود تھی۔"

اب اسی ۱۴ جولائی مطابق ۱۳ صفر ۱۳۱۱ھ کے شمارے سے "جاسوسوں کی رپورٹیں" یعنی خبروں میں سے

ایک خبر ملاحظہ ہو"
" بانگی پور کے مولوی عظیم صاحب نے اپنے کتبخانہ کی ساری کتابیں ندوۃ العلما کے دار العلوم کے لئے وقف کر دیں
اور چند معزز لوگوں کو بلا کر اس کی خبر بھی دیدی اب امروز فردا میں اس کو باضابطہ طور پر ندوہ میں بھیجیں گے۔
بمبئی پنچ بہادر جلد ۳ ۔ ۱۸۹۸ء میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے ادبی اور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کے اقتباسات یا پورے کا پورا مضمون اس قابل ہے کہ دوبارہ شائع کیا جائے لیکن میں مضمون کے طویل ہو جانے کے ڈر سے مختلف شماروں کے کچھ اقتباسات ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ البتہ چلتے چلتے حضرت شاغل کی بمبیا شاعری کا" چاشنی کے لئے ۵ ر دسمبر کے شمارے سے پیش کرتا ہوں۔

سر پہ ٹوپی ہے نہ انگ پر ہے ازار نہ پیرن
حال یہ تنگ جہاں ہے ترے عریانوں کا

میری باتاں ترے سننے میں جو نئیں آتی ہیں
میل اسے جان نکلوا لے ذرا کانوں کا

کرکے ہم ہوڑی چلا پاتو ے سے فرنے کو
ہوٹ آپن نہیں جو خوف ہو طوفانوں کا

فرکے ڈرلی سے چلا جاتا ہے ہم جنگلی پیر
شوق لگتا ہے جو اپلے کو بمبیا بانوں کا

کام کتّے سے فکٹ لیتی ہے سرکتے دالی
ٹوٹا بمبئی میں نہیں ایسا ہے اتنا نوں کا

سائمری ایسی مری ہوتی ہے فکڑ نو فر
قافیہ تنگ ہے بمبئی کے سخندانوں کا

——— بقیہ "قومی یکجہتی کا تاریخی پس منظر" ——— صفحہ ۴۲) ———

رسم الخط کو رائج کیا جائے۔ بھارتیہ ودیا بھون نے ایک سمپوزیم میں کی گئی چند تقاریر کا مجموعہ۔ "What and Dis Integration & How to arrest" عدم یکجہتی کیا ہے؟ اور اسے کسطرح روکا جاسکتا ہے؟ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کے، ایم منشی، شریمن نرائن اگروال، پاٹل اور جے بی کرپلانی کی تقاریر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قومی یکجہتی کا مسئلہ صرف نفسیاتی، جذباتی اور روحانی ہے اور اسے قدیم تہذیب کا احیا کے ذریعہ ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ در اصل یہ یکجہتی کو سمجھنے کی ادھوری کوشش ہے۔ اس حل سے نہ تو مذہبی و لسانی اقلیتیں مطمئن ہوں گی اور نہ ہندوستان میں ذہنی اتحاد ہوگا۔ یکجہتی کا مسئلہ صرف نفسیاتی یا جذباتی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ سماجی و معاشی ہے اور اس کا تعلق معاشی و سیاسی اور سماجی مساوات اور یکساں ترقی کے مواقع سے ہے، جب تک ہندوستان کے سارے عوام ایک معاشی اور سماجی سطح پر نہ آجائیں اور انہیں اپنی تہذیب اور زبان کو ترقی دینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، قومی یکجہتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

——— بقیہ "مہابت جنگ اور خاندان مہابت جنگ کی ادبی خدمات" صفحہ ۵ ———

کی اولاد سے عالم باعمل تھے) جن کی قبر مقبرۂ سعادت خان میں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس مقبرہ کا صرف نام ہی نام ہے قبریں مسمار پڑی ہیں۔ پتھر تک کھد گئے"۔
ان کے علاوہ راجہ رام نرائن موزوں شاگرد شیخ علی حزیں، جن کے جوہر بعد کو کھلے۔ مذکورۂ بالا افراد کے اگر حالات جمع کئے جائیں تو ہر ایک پر ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے،

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم

جرائم کی چند حیرتناک داستانیں

اُردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے "میری داستان ـــــ یعنی چونتیس برس کی قید بامشقت کے کچھ حالات و واقعات" کے نام سے مرحوم ریاست حیدر آباد میں اپنی ملازمت کی داستان لکھی ہے۔ یہ کتاب چند در چند وجوہ کی بنا پر ابھی تک شائع نہ ہو سکی۔ مرزا صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اِس کتاب کا قلمی مسودہ مرحوم کے فرزندِ اکبر مرزا شرافت اللہ بیگ صاحب (ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر) کے پاس موجود ہے۔ موصوف کی اجازت سے اس داستان کا ایک دلچسپ باب یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا صاحب کی اِس عنایت کے لئے میں اپنی اور تمام قارئینِ "شاعر" کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سیّد مبارزالدّین رفعت

۱۶ ار فروری ۱۹۲۰ء کو مددگار معتمدی سے ہم کو اسپیشل مجسٹریٹی اضلاع پر ترقی ملی۔ اور اِس تاریخ کو ہم نے اس اہم خدمت کا جائزہ حاصل کر لیا۔ اِس سے پہلے کہ میں وہاں کے کچھ واقعات بیان کروں، یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اسپیشل مجسٹریٹی کیا چیز ہے۔ پہلے زمانے میں تمام ہندوستان میں ٹھگی و ڈکیتی کا ایک محکمہ قائم تھا اور اس کے لئے ایک خاص مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ بعد میں ٹھگی اور ڈکیتی کا محکمہ ٹوٹ گیا۔ اِس لئے اِس ریاستِ ابد مدت میں اِس کے بجائے خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم ہوا۔ اور ٹھگی اور ڈکیتی کے جو عہدہ دار تھے اُن کو خفیہ پولیس کے عہدہ دار قرار دیا گیا۔ اور اسپیشل مجسٹریٹی کا عہدہ بحال خود قائم رہا۔ تصفیہ یہ پایا کہ جتنے ڈکیتوں کے گیانگ کے مقدمات ہوں وہ سب خفیہ پولیس دریافت کرے اور ان کے چالان اسپیشل مجسٹریٹی میں پیش ہوں۔ یہ طریقہ مفید بھی بہت تھا کیونکہ ڈاکوؤں کے گیانگ علاقۂ انگریزی سے نکل کر یہاں کے مختلف تعلقوں میں وارداتیں کرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ ایک جگہ سے مال لوٹتے اور دوسری طرف فروخت کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ضابطۂ فوجداری کے لحاظ سے تمام عدالت ہائے متعلقہ میں مقدمات پیش ہوتے تو گواہوں کا مختلف عدالتوں میں پھرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ خرچہ زیادہ ہوتا اور گواہوں کو خدا جانے کہاں کہاں جانا پڑتا۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی وجہ سے یہ مصیبت باقی نہیں رہی جبکہ گیانگ علاقۂ سرکارِ عالی میں داخل ہو کر واردات کرتا وہاں سے اسپیشل مجسٹریٹ اپنا دورہ شروع کرتا۔ ملزمین اور اُن کے وکلا ساتھ ہوتے۔ دورے میں وہی راستہ اختیار کیا جاتا جو گیانگ نے اختیار کیا تھا۔ اِس طرح دورے کے ختم پر تمام وارداتوں کی شہادتیں قلم بند ہو جاتیں اور ایک ہی جگہ میں اُس گینگ کے متعلق تمام

مقدمات پیش ہوتے جو خاص اہمیت رکھتے ہوں یا جہاں ملزمین نے مختلف تعلقوں اور مقامات پر وارداتیں کی ہوں، غرض یہ ایک بڑا مفید محکمہ تھا۔ باوجود اس کے اسے توڑنے کی بیسیوں کوششیں کی جاچکی ہیں، لیکن اب تک قائم ہے اور میری رائے میں قائم رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دفعہ اس کے توڑنے کا مصمم ارادہ گورنمنٹ نے کرلیا تھا۔ اُس وقت میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری تھا۔ میں نے اپنے تجربے کے لحاظ سے ایک بہت بسیط نوٹ لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا تھا۔ اور اس تمام کام کو جو یہاں انجام پاتا ہے ظاہر کرکے محکمہ کی اہمیت بتائی تھی۔ میری یہ رائے منظور ہوئی اور اس عدالت کو توڑنے کا خیال گورنمنٹ نے ترک کردیا۔

میرے اس خدمت پر جانے سے پہلے جو صاحب اس جگہ پر کارگزار تھے، اُن کا نام "پولیس کے مجسٹریٹ" پڑ گیا تھا۔ اور اس میں کچھ اصلیت بھی تھی۔ کیونکہ ان کے اجلاس سے سو فیصدی مقدمات پولیس کے موافق طے پاتے تھے، گو مرافعہ میں ۹۹ فی صدی ٹوٹ جاتے تھے۔ اسی طرزِ عمل کی وجہ سے یہ ہوا کہ ایسے معمولی معمولی مقدمات میں بھی جن میں پولیس کو سزا دلانی مقصود ہوتی تھی، اسپیشل مجسٹریٹی میں پیش ہونے لگے اور اس اجلاس کے قیام کی جو غرض تھی، وہ فوت ہوگئی۔ میں نے شہادت کے جانچنے میں سختی شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے سال میرے پاس پونے تین سو مقدمات پیش ہوئے اور صرف ۵۶ میں پولیس کو کامیابی ہوئی۔ اس کی وجہ سے شروع میں گڑبڑ ضرور ہوئی مگر کیونکہ مسٹر گوڈ مددگار صدر ناظم کوتوالی جو خفیہ پولیس کے افسر تھے میرے کام سے مطمئن تھے، اور میری طبیعت سے بھی واقف ہوگئے تھے، اس لئے یہ گڑبڑ دب گئی اور میں اطمینان سے کام کرتا رہا۔ اور خفیہ پولیس والے بھی ایسے مقدمات میرے اجلاس پر پیش کرنے لگے جو واقعی اہم ہوتے تھے اور جن میں شہادت قابلِ اطمینان ہوتی تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہوتا ہے کہ سوائے ایک فیصلے کے میرے تمام فیصلے ہائیکورٹ تو کیا جوڈیشل تک بحال رہے۔ جو فیصلہ ٹوٹا ہے اُس کے واقعات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک بلوے میں فریقین کا چالان ہوا۔ میں نے ایک فریق کو حفاظتِ خود اختیاری کا فائدہ دیکر رہا کیا۔ اُس کی نگرانی عدالت العالیہ سے نامنظور ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے فریق کی شہادتِ صفائی لینے کے بعد میں نے بعض فریقین کو سزا دی۔ عدالت العالیہ میں اس کا مرافعہ ہوا۔ جس میں پہلے فریق کی نگرانی ہوئی تھی۔ تصفیہ ہوا کہ اس دوسرے فریق کو بھی حفاظتِ خود اختیاری کا حق حاصل تھا۔ اس لئے یہ فریق بھی بری کئے گئے۔ مزا یہ ہے کہ یہ دونوں فیصلے بطورِ نظیر چھپ گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ اُصول قائم ہوا کہ بلوہ کرنے میں فریقین کو حقِ حفاظتِ خود اختیاری حاصل ہے۔ اور اس طرح بلوہ کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دوسرے فیصلے کا وزن چھ سترا روپے ہے اور ایک ایسے رُکنِ عدالت العالیہ کے قلم کا مرہونِ منت ہے جن کے متعلق کچھ لکھنا ایک مشہورہ امر کو بیان کرنا ہے۔ میں بھی "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" پر عمل کرکے اس سے زیادہ کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسپیشل مجسٹریٹی میں کتنے اہم اور کس نوعیت کے مقدمات پیش ہوتے تھے، میں چند ایک مقدمات کے واقعات بطورِ نمونہ پیش کرتا ہوں۔

اُس زمانے میں موضع بیوی بزرگ جاگیر رحیم الدین صاحب (نواب رحیم یار جنگ) میں ڈاکوؤں کی ایک پارٹی قائم ہوئی جس کے سات سرغنے تھے۔ اسمٰعیل خاں، عبدالحمید خاں، جمعہ خاں، بوما اتو خاں، عابد خاں اور اکرم خاں۔ اس گینگ کا جولانگاہ اضلاع بیدر، ناندیڑ اور دیگر علاقہ جات تھے۔ اسمٰعیل خاں نہایت سفاک اور بدمعاش قسم کا آدمی تھا۔ عبدالحمید خاں افغانستان سے نیا نیا آیا تھا۔ اُس کی یہ سب ڈاکو بڑی عزت کرتے تھے۔ اُس کی عمر کوئی ساٹھ سال تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکے میں اگر قتل واقع ہوجاتا ہے تو اُس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے یہ اپنے سب ساتھیوں کو منع کرتا رہتا تھا (جان بچاکر کام کرو) اور یہی وجہ تھی کہ گو اس گینگ نے سیکڑوں ڈاکے ڈالے مگر کسی میں ایک بھی قتل نہیں ہوا۔ انکا طریقہ کار یہ تھا کہ سہ پہر کے کوئی چار بجے یہ لوگ اُس گاؤں میں پہونچتے تھے جہاں ان کو ڈاکہ ڈالنا ہوتا تھا اور جن مکانوں میں واردات

کرنی ہوتی تھی اُس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے۔ اور بندوقیں سرکرنی شروع کرتے۔ امو خاں راستے پر قرابین لے کر کھڑا ہو جاتا۔ عبدالحمید خاں دروازے پر تعینات ہوتا۔ یہ دونوں بندوقیں چھوڑتے اور باقی لوگ مکان کے اندر گھس کر مال و اسباب لوٹتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ گاؤں والے گوپھنوں سے مقابلہ کرتے لیکن بندوقوں کی آواز اور ان لوگوں کی سفاکی کے ڈر سے کوئی قریب نہ آتا۔ ایک دفعہ ایک گوپن کا پتھر امو خاں کے ایسے لگا کہ سر پھٹ گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکے کے بعد اُس کے ساتھی اُس کو اُٹھا لے گئے۔ ڈاکے کے لئے بلحاظ ضرورت یہ لوگ دوسرے بدمعاشوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور بعض موقعوں پر تو ان کی تعداد تیس چالیس تک ہو جاتی تھی۔

اس گینگ میں سب سے زیادہ خطرناک اور نڈر ڈاکو عابدین تھا۔ اُس کی عمر کوئی ۱۹۔۲۰ سال کی ہو گی۔ یہ ان پٹھانوں کے ہاں کا ایک چھوکرا تھا مگر ہمت اور بے باکی میں اُن سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ پوما ذات کا لمبا تڑنگا تھا اور بڑا بہادر اور سچا شخص تھا۔ بقیہ میں جو لوگ تھے اُن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ عادت سے مجبور ہو کر اور روپیہ حاصل کرنے کے لالچ میں پارٹی میں شریک ہو گئے تھے۔ آخر ان ڈاکوؤں نے وہ اُودھم مچایا کہ سرکار نے اسمٰعیل خاں، عبدالحمید خاں، جمعہ خاں، پیما عمر خاں اور عابدین کو قانون کی حفاظت سے باہر قرار دیا۔ یعنی ہر شخص کو اختیار دیا گیا کہ جہاں کہیں وہ جب کبھی کسی کو نظر آئیں، قتل کر دیں۔ اُس پر کوئی قانونی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی۔ ۶۰۔۷۰ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص کو قانون کی ضمانت سے باہر کر دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس کی ایک پارٹی جس میں تقریباً دو سو پچاس جوان، سب انسپکٹر، انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ تھے، بیدر میں تعینات ہوئی۔ لیکن ان ڈاکوؤں کی ہمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ باوجود اس انتظام کے اُنھوں نے ایک دن خاص بیدر سے تین میل پر دن کے چار بجے ڈاکہ ڈالا اور دو بنیوں کے مکان لوٹ لئے۔ وجہ یہ تھی کہ بیدر اور اُس کے اطراف میں مخبر لگے ہوئے تھے جو اُن کو خفیہ پولیس کی حرکت اور کارروائیوں کی اطلاع دیتے رہتے تھے۔

سب سے پہلے اس گینگ سے اسمٰعیل خاں الگ ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے ساتھیوں پر عرصہ تنگ ہو رہا ہے اس لئے اُس نے نکل جانا ہی مناسب سمجھا اور دوسرے اُس نے اپنی مغلکی سے ایک ایسی حرکت کی جس کی وجہ سے خود اُس گینگ والوں نے بھی اس سے رشتہ توڑ لیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن بیدر کا ایک نوجوان محرر پولیس نہا دھو کر ٹہلنے نکلا۔ مغرب کا وقت تھا۔ بیدر کے فتح دروازے کے پاس اُس کو اسمٰعیل خاں ملا۔ اور بے چارے محرر کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا کہ (اسمٰعیل خاں) اُس کا یہ کہنا تھا کہ اسمٰعیل خاں نے بندوق اُٹھا کر تڑ سے فائر کر دیا اور وہ غریب وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ قتل کرنا اس گینگ کے مقررہ اصول کے خلاف تھا اس لئے اسمٰعیل خاں سے ان لوگوں نے قطع تعلق کر لیا اور چونکہ وہ ان ڈاکوؤں کی وجہ سے خاصہ روپیہ والا ہو گیا تھا اس لئے اُس نے بھی ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب وہ گرفتار ہوا تو اُس کے پاس سے سونے کے ۲۱ کڑے نکلے۔ اُس کو سونا گلانا آتا تھا۔ اس لئے لوٹ میں اُسکو جو کچھ حصہ ملتا اُس کو گلاتا اور کڑے بنا کر رکھتا۔ اُس کی خرید و فروخت کا یہ طریقہ تھا کہ اگر کسی سے کوئی چیز خریدنی ہو تو اُس کے عوض میں کڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے دیتا۔ اسی وجہ سے ایک چھینی ہمیشہ اُس کے پاس رہتی تھی۔ یہاں سے نکل کر خدا معلوم کیسے راجہ شیوراج بہادر کی جاگیر کے مستقر دھرم آباد میں پولیس پٹیل ہو گیا۔ لالو پٹیل اپنا نام رکھا۔ کچھ دن تو خاموشی سے کام کرتا رہا۔ اس کے بعد گینگ بنا کر ڈاکہ زنی شروع کی۔ رات کو ڈاکہ ڈالتا صبح اُس کے پاس بہ حیثیت پولیس پٹیل رپورٹ پیش ہوتی۔ یہ جس طرح چاہتا واقعات کو اُلٹ پلٹ کر پولیس میں اطلاع دیتا۔ اور کچھ اس طرح کارروائی کرتا کہ پولیس کو واردات کے ملزمین کا پتہ نہ چلتا۔ یہاں اُس نے اپنی ایک داشتہ کو بھی قتل کر دیا۔ غرض ہوتے ہوتے خفیہ پولیس کو پتہ چل گیا کہ لالو پٹیل دراصل اسمٰعیل خاں ہیں۔ اس کی دریافت کے لئے منظور احمد خاں انسپکٹر مقرر ہوئے۔ دھرم آباد جا کر معلوم ہوا کہ لالو پٹیل باہر تشریف لے گئے ہیں اور شاید رات کے ایک دو بجے واپس آئیں گے۔

گاؤں کے باہر نالہ تھا۔ اُس کے پاس منظور احمد خاں بیٹھ کر پٹیل صاحب کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ساری رات اسی انتظار میں گذر گئی، صبح ہو رہی تھی کہ اسمٰعیل خاں بندوق ہاتھ میں لئے اُس نالے کے پاس آئے۔ منظور احمد خاں نے انکو روکا۔ اُنھوں نے مارنے کو بندوق اُٹھائی۔ منظور احمد خاں نے بڑھ کر بندوق پر ہاتھ ڈالا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ بندوق بھری ہوئی نہیں تھی اس لئے اسمٰعیل خاں نے بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا اور وہ اُس کے پیچھے دَوڑے۔ یہ نوجوان اور مضبوط قویٰ کے آدمی تھے۔ تھوڑی ہی دُور جا کر اُس کو پکڑ لیا۔ اور بعدِ تفتیش یہ حضرت میرے اجلاس پر اپنی داشتہ کے قتل کے سلسلے میں پیش ہوئے۔ مقدمات کی سماعت بیدر میں ہوئی۔ کچھ گواہ حاضر نہیں تھے۔ اس لئے تاریخ تبدیل ہوئی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے خطرناک شخص کو بیدر ہی کے جیل میں رکھتے اور اگر حیدرآباد واپس ہی کرنا تھا تو لاری میں روانہ کرتے۔ مگر غلطی سے کہو یا بیوقوفی سے کہو اس کو دو جوانوں کی حراست میں حیدرآباد روانہ کر دیا۔ بیدر سے حیدرآباد کا فاصلہ ۸۵ میل ہے۔ ۲۱ میل چل کر یہ لوگ رات گذارنے موضع اکیلی میں ٹھہرے۔ وہاں اسمٰعیل خاں نے ان جوانوں کو خوب سیندھی پلائی اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد اُس نے پھر گڑبڑ شروع کی تھی لیکن جلد ہی پکڑا گیا اور میرے اجلاس سے اُسکو ۲۰ سال کی سزا ہوئی۔ سُنتا ہوں کہ تھوڑے دن ہوئے خاں صاحب اس جہانِ فانی سے گذر گئے۔

قانون کی حمایت سے باہر ہونے کے بعد ہی عابدین بھی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ یہ کسی کام سے بندوق لیکر اُسی گاؤں میں گیا۔ وہاں والوں کو خبر ہو گئی۔ اور کوئی دو سو آدمیوں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس نے بندوق چھپائی۔ موضع کا پولیس پٹیل سامنے آگیا۔ اور کہا کہ "نے مارنا ہے تو مجھے مارلے" زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ایک آدمی مر جائے گا۔ مگر سمجھ لے کہ فیر ہونے کے بعد گاؤں والے تیری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ عابدین نے یہ سوچا کہ اس طرح ماریں کھا کر مرنے سے ایک دفعہ ہی مر جانا بہتر ہے۔ اسلئے اُس نے اپنے گلے پر بندوق رکھ کر اُس کا گھوڑا دبا دیا۔ اور اس طرح اُس کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

جب گورنمنٹ کو معلوم ہوا کہ بیدر میں خفیہ پولیس کی جو پارٹی ہے وہ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو اُس کی تنظیمِ جدید کی گئی۔ اور عزیز اللہ جیسے ہوشیار اور کارگذار شخص کو اُس کا آفیسرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ عزیز اللہ مرحوم نے جاتے ہی یہ کیا کہ اُن ڈاکوؤں کے گھروں کی تلاشی لی اور کسی نہ کسی طرح ان ڈاکوؤں کی عورتوں، بچوں اور رشتہ داروں کے پاس سے کوئی نہ کوئی مال مسروقہ برآمد کر لیا اور اس کے ساتھ ہی سب کے سب کو بیدر کی جیل میں پہونچا دیا۔ ان ڈاکوؤں کو خیال ہی نہ تھا کہ ان کی گرفتاری کی کارروائی یوں تنگ پکڑے گی۔ اس لئے اُنھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود گرفتار ہو کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ چنانچہ موضع بھالکی کے ایک وکیل حسیب شاہ خاں کے ذریعے سے سلسلہ جُنبانی شروع ہوئی۔ عزیز اللہ مرحوم جانتے تھے کہ اِن وکیل صاحب کا ان ڈاکوؤں سے کیا تعلق ہے لیکن وہ تھے بڑے پولیٹکل! اس لئے اِن وکیل صاحب سے اُنھوں نے راہ و رسم بڑھائی اور آخر یہ طے پایا کہ سب ڈاکو اپنے آپ کو اس شرط پر گرفتار کرا دیں گے کہ اُن کے جو لوگ پکڑے گئے ہیں اُن سب کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں ان ہی مقدمات کی دریافت کے لئے بیدر گیا ہوا تھا اور اوّل تعلقدار صاحب کے مکان کے صحن میں عزیز اللہ، میں، نذر محمد خاں انسپکٹر، علی وسیم کورٹ انسپکٹر، حسیب شاہ خاں اور چند آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پولیس کا جو جوان مکان کے باہر دروازے پر پہرہ دے رہا تھا، بھاگا ہوا آیا اور کہا "سارے ڈاکو دروازے پہ کھڑے ہیں اور اندر آنا چاہتے ہیں!" سمجھ لیجئے کہ اُس کے اِس کہنے کا کیا کچھ اثر وہاں کے بیٹھنے والوں پر پڑا ہو گا جن کو تصفیے کا حال معلوم نہ تھا بہر حال ان لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ملی اور وہ اونٹوں پر بیٹھے بندوقیں ہاتھ میں لئے اندر آئے۔ اُونٹوں سے اُتر کر ہماری کرسیوں کے قریب بیٹھ گئے۔ شرطوں پر بحث مباحثہ ہوا۔ تصفیہ ہوا۔ اُنھوں نے بندوقیں اور ہتھیار پولیس کے حوالے کئے۔ اور انکو گرفتار کر کے جیل خانے میں داخل کر دیا گیا۔ اسی گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ راستے سے اُونٹ اور دو آدمی بیگار میں لائے ہیں اور

یہ کہہ کر لائے ہیں کہ ہم سرکاری کام پر جا رہے ہیں۔ دوسرے حد اُن کے عزیزوں کے حقیات سے کوتوال نے دست برداری لے لی۔ اور ان کو اس بنا پر چھوڑ دیا کہ اصل سارقین گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد اس گینگ کے کوئی ۴۰ چالان میری عدالت میں پیش ہوئے۔ اموخاں کو سرکار نے وعدہ معافی دیا۔ اِس گینگ کے جو دوسرے شرکا، تھے وہ بھی گرفتار ہوئے، اور اِس طرح ۶۰۔۷۰ آدمی میرے سامنے آئے۔ گواہوں کی تعداد ۳۰۰ سے اُوپر تھی۔ میں نے ڈیڑھ مہینے میں یہ کام ختم کیا۔ اکثر مقدمات میں یہ لوگ چھوٹے۔ بعد میں سزا ہوئی۔ بعض سے پولیس نے دستبرداری کرلی۔ مگر پھر بھی مل ملا کر ہر ایک شریک کو اتنی سزا ہوئی کہ اس کے تمام عمر جیل میں رہنے کے لئے کافی تھی۔ مجھے عبدالحمید خاں کا یہ فقرہ تمام عمر یاد رہے گا کہ جب اُس سے کسی واردات کے متعلق جواب لیا جاتا تھا تو یہی جواب ملتا "سرکار ہم کو کچھ معلوم نہیں"۔ معلوم نہیں یہ لوگ مجھ سے کیوں بہت گھل مل گئے تھے۔ جب پولیس والے موجود نہیں ہوتے تھے تو مجھ سے بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ تمثیلاً اُس روز ایک مندر کے پجاری نے ان کے خلاف بڑی سخت شہادت ادا کی تھی۔ جب اجلاس برخاست ہوگیا اور پولیس والے چلے گئے تو یہ سب میری کُرسی کے سامنے آبیٹھے اور اُن میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ "سرکار وہ پجاری بڑا بے ایمان ہے، قسم خدا کی اُس نے ہم کو ایک ایک روٹی دو دو روپئے کو دی اور اب دیکھو ہمارے ہی مقابلے میں گواہی دے رہا ہے"۔ میں نے اُس کو پوچھنے پر کہ تم اتنے عرصے تک گرفتار کیوں نہ ہوسکے، اُنھوں نے جواب دیا کہ "سرکار ہم بڑی مصیبت میں تھے۔ شام کو کسی جنگل میں سوتے پہرہ قائم کرتے۔ گیارہ بجے پھر تبدیلِ مقام کرتے اور چار بجے کے قریب کسی تیسری جگہ جاکر آرام لیتے۔ کچھ عرصہ ہماری بڑی بُری طرح گذری۔ اِس گینگ میں سب سے ہمت والا شخص پوما لمبارہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سرکار جب ہم نے جرم کیا ہے تو اُس کو بیان کرتے کیوں شرمائیں۔ پہلے زمانہ ہمارے ساتھ تھا، اب ہمارے خلاف ہے۔ کیوں جھوٹ بول کر اپنے نامۂ اعمال میں ایک اور بُرائی کا اضافہ کریں۔ غرض مقدمات ختم ہوئے۔ تقریباً سب ملزمین کو سزا ہوئی اور جو آگ بیدر اور اُس کے نواح میں لگ رہی تھی وہ ذرا ٹھنڈی پڑی۔

ابھی پولیس نے پُوری طرح دم بھی نہیں لیا تھا کہ اموخاں کے بھائی شریف خاں نے اپنے ایک عزیز فیروز خاں کے ساتھ علمِ بغاوت بلند کیا۔ بیوی بزرگ کی گڑھی پر قبضہ کرلیا۔ گاؤں گاؤں سے پُرانی وضع کی توپیں لاکر فصیل پر چڑھائیں اور اِدھر اُدھر سے مار پیٹ کر کئی سو من بارود اور پتھر کے گولے جمع کئے۔ گڑھی پر ایک بڑا سا دھونسا (ڈھول) رکھا۔ ایک جھنڈا بلند کیا اور اس حصّۂ مُلک کے مالک بن بیٹھے۔ اب ان کا گینگ بیوی سے باہر جاتا، مال و اسباب لُوٹ کر لاتا۔ گڑھی کے دالانوں کو قالینوں، گاؤ تکیوں اور خوبصورت جھاڑ فانوسوں سے سجاتا۔ شریف خاں مسند پر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے۔ نواح کی رنڈیاں پکڑ کر لائی جاتیں، دیگیں پکتیں، کھانے بٹتے اور اِس طرح نوابی کی شان دکھائی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اِس گینگ کو کچھ اہمیت نہیں دی اِس لئے بجائے خفیہ پولیس کے پولیس اضلاع کو اس کی گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ ضلع بیدر کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محمد اسمٰعیل خاں کوئی دو سو جوانوں کو لے کر بھالکی پہونچے، جہاں سے بیوی کوئی آٹھ بارہ میل ہے۔ دو تین روز کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ گڑھی پر حملہ کرکے ان لوگوں کو گرفتار کیا جائے۔ لائن باندھ کر باجے بجاتے ہوئے یہ جمعیت بیوی پہونچی، گڑھی کا ایک رُخ میدان کی طرف ہے، اور بقیہ تین رُخوں پر گاؤں ہیں۔ اُنھوں نے میدان کے رُخ سے حملہ کرنا چاہا۔ بگلر نے تیاری کا بگل بجایا کہ اتنے عرصے میں گڑھی سے ایک آدمی نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں سفید جھنڈی تھی۔ چونکہ یہ باقاعدہ قاصد بن کر آیا تھا اِس لئے حملہ روک لیا گیا، اُس نے آکر کہا، "شریف خاں نے مجھے یہ اطلاع دینے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ گرفتار ہوجائیں ورنہ جمعیت حملہ کرے گی۔ شریف خاں نے جواب دیا کہ میری طرف سے اپنے افسروں سے کہہ دو کہ

نہایت ٹھاٹ سے رخصت ہوا۔
اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو توپوں میں آگ دیدی جائے گی۔ یہ سُن کر قاصد
حملے کا آغاز ہوا۔ جمعیت سے فصیل کوئی تیس چالیس قدم ہی رہ گئی تھی کہ تیس چالیس توپوں کے فیر ہوئے اور اس کے
بھاگنے میں آکر دم لیا۔
بعجو یہ جوانان کو توالی بھاگے تو
اس کی خبر صدر کو ہوئی اور پھر عزیز اللہ صاحب ان لوگوں کی گرفتاری کے لئے مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے بجائے حملہ
کرنے کے چالوں کا جال پھیلایا اور رفتہ رفتہ شریف خاں کے سارے ساتھیوں کو توڑ لیا۔ اب رہ گئے کون؟ شریف خاں
اور فیروز خاں! ان دونوں کا پکڑ لینا کیا مشکل تھا۔ گاؤں سے ہو کر چند آدمی رات کے وقت گڑھی میں گئے۔ یہ دونوں
کے دونوں شراب پیئے پڑے تھے، گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد ان کے دوسرے ساتھی بھی گرفتار ہو گئے۔ اور سب کے سب
میرے اجلاس پر پیش ہوئے۔ شریف خاں کو دیکھ کر واقعی افسوس ہوتا تھا۔ کوئی ۱۷-۱۸ سال کی عمر تھی۔ صورت
شکل بہت اچھی تھی۔ بڑا سمجھدار تھا۔ گواہوں پر جرح اس طرح کرتا تھا کہ کوئی وکیل بھی کیا کرے گا۔ لیکن مجھے اس سے
تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے افعال کو جُرم تو کیا بُرا ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اوّل درجے کا سفاک تھا۔ نو برس کی عمر میں ایک شخص
کو قتل کیا تھا۔ بوجہ کمسنی جُرم نہیں سمجھا گیا اور اس کو عدالت سے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد بارہ برس کی عمر میں دوسرا قتل کیا۔
اُس کی کم سنی کا لحاظ کر کے صرف چند مہینے کی سزا ہوئی۔ جیل میں رہ کر یہ اور پختہ کار ہو گیا، آخر سولہ برس کی عمر میں بھرے
بازار میں آکر دو آدمیوں کو مار ڈالا، چونکہ اس کے بعد یقین تھا کہ اب عدالت سے رعایت ہونے کی توقع نہیں اس لئے
حاصل کر لی ——
یہ ڈاکو ہو گئے، اور اپنے بزرگوں کی سزا پانے کے بعد اُن کی جگہ انھوں نے
شریف خاں اور فیروز خاں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شریف خاں صاف گو اور سیدھا سادا لڑکا تھا
مگر یہ حضرت اوّل درجے کے بدمعاش تھے۔ اس گینگ کے دوسرے لوگ تو ڈاکے میں مال و اسباب لوٹتے مگر یہ اُس گھر کی
عورتوں کی عزت لیتے۔ شریف خاں گو اس تماشے میں بادشاہ اور یہ وزیر تھے مگر ان کا اثر شریف خاں پر ایسا تھا کہ
رفتہ رفتہ یہ سب کچھ ہو گئے۔
یہ گینگ بیدر کے جیلخانے میں تھا، وہاں فیروز خاں نے یہ مشورہ دیا کہ مجھے جیل سے کسی طرح نکال دو تو میں تمام
گواہوں کو ختم کئے دیتا ہوں۔ اور جب گواہ ہی نہ رہیں گے تو سزا کس طرح ہوگی۔ ان کی تجویز پر سب راضی ہو گئے۔ جو دشمن
ان لوگوں کو ملتا تھا۔ اس میں سے تھوڑا بہت چھپاتے جاتے تھے۔ اور اس طرح اُنھوں نے کھانے پینے کا اتنا سامان
اس لئے جمع کر لیا کہ کئی دن تک فیروز خاں کو کھانے کی تکلیف نہ ہو۔ آخر ایک دن کسی نہ کسی طرح رات کو اُسے جیل سے
نکال ہی دیا۔ اور اُس نے جا کر ارد گرد کے مواضعات میں ہلچل مچا دی۔ گولی بغیر تو بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مانک راؤ
صاحب وکیل کو عین شہر کے دروازے پر آٹھ گولیاں ماریں۔ مگر وہ بھی ایسے سخت جان تھے کہ اتنی گولیاں کھا کر بھی
بچ گئے۔ چند گواہوں کو بھی زخمی کیا۔ بہت سی عورتوں کی عصمت دری کی۔ غرض بیدر کے گرد و نواح کے سب لوگ اس کی
جان کے دشمن ہو گئے۔ آخر ایک دن ایک میدان میں اُسے گھیر کر اور مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔
باقی گینگ کو اکثر مقدمات میں سزا ہوئی۔ اب سُنتا ہوں کہ شریف خاں اور جمعہ خاں کارروائیوں کی کچھ غلطی سے ابھی
حال میں قبل از وقت چھوٹ گئے ہیں۔ شریف خاں پھر اُدھم مچا رہا ہے۔ لیکن جمعہ خاں اس جیل کی ٹھوکر سے بیدار
ہو کر سنبھل گئے تھے اور ابھی تھوڑے دن ہوئے اس ناپاک دنیا سے کوچ کر گئے۔ میں جس زمانے میں گلبرگہ شریف کا
سشن جج تھا تو یہ جیل خانے کی ایک کارروائی میں شہادت دینے میرے اجلاس پر آئے تھے۔ داڑھی بہت بڑھا لی تھی
ماتھے پر نمازیں پڑھنے کی وجہ سے گٹھا بھی آگیا تھا اور اپنی غلطیوں کو سمجھنے بھی لگے تھے۔ اُن کی آواز سے میں نے اُنکو پہچانا

اور انھوں نے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد میرے چیمبر میں اپنے جور و ستم کا اعتراف بھی کیا۔ مگر اُس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ سرکار میں شریک تو ضرور تھا مگر لُوٹ مار میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ یہ لوگ زبردستی مجھے پکڑ کر لے جاتے تھے۔ اس سے سمجھ لیجیے کہ کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ یہ آخری فقرہ کہہ کر اُس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، سزا تو ہو ہی چکی تھی۔ اب جھُوٹ بولنے سے معلوم نہیں اُس کا کیا فائدہ تھا۔

اتو خاں کے تیسرے بھائی نصر اللہ خاں بھی کچھ دنوں کے لئے پانچوں سواروں میں شریک ہو گئے تھے۔ شریف خاں کے مقدمات میں انکا کام پیروی کرنا تھا۔ اِس گینگ کے سزایاب ہونے کے بعد اُنھوں نے ہاتھ پیر نکالے۔ اور ترکیب یہ کی کہ کوتوالی میں مخبری بھی کرتے رہے۔ لیکن یہ ایک ٹانگ سے لنگڑے تھے، اِس لئے جلد ہی ان کا پتہ چل گیا اور یہ بھی چالان ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہونچے۔

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب کے واقعات کو لیجیے۔ ان کا نام عبدالرحمٰن سوداگر تھا۔ نظام آباد کے کسی موضع میں رہتے اور بظاہر چوڑیوں کا بیوپار کرتے تھے۔ دَورے پر نکلتے اور جب گھر واپس آتے تو ہزار دو ہزار روپیہ لے کر آتے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ سفر میں جب کسی روپے پیسے والے کو دیکھتے تو اُس کے ہم سفر ہو جاتے تھے۔ موقع پا کر اُسکو دھتورہ دیتے اور اُس کا مال لیکر فرار ہو جاتے۔ اُن کی کارروائیوں نے ایسی وسعت پکڑی کہ حیدرآباد تو رہا ایک طرف، بمبئی، مدراس اور ممالک متوسط سے اُن کی گرفتاری کے انعام مقرر ہو گئے۔ مگر باوجود اس کے یہ لنگڑے تھے، اور بآسانی اُن کی شناخت ہو سکتی تھی، یہ اپنی چالاکیوں سے گرفتار نہ ہو سکے۔ داڑھی سے کچھ رنڈیاں اور اُن کے ساتھی ناوندگی آ رہے تھے، یہ بھی اسی درجے میں بیٹھے۔ راستے میں میل جول بڑھایا اور ناوندگی آ کر سب نے مِل کر سرائے میں قیام کیا۔ اُنھوں نے رات کو جلیبیاں بازار سے لاکر نیاز دی، جلیبیاں تقسیم کیں اور سب کو "چِت" کر دیا اور اُن کا مال لیا اور رات کی گاڑی سے نانڈیڑ آ گئے۔ یہاں کسی گاؤں سے چند بیوپاری دھوتیاں خرید نے حیدرآباد آرہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی دھوتی اُنھیں دکھا کر باور کرایا کہ ایسی دھوتیاں محبوب نگر کے بازار میں ۱۲-۱۲ آنے میں ملتی ہیں وہ لوگ محبوب نگر چلنے کو تیار ہو گئے۔ کیونکہ اُنھوں نے دیکھا کہ ایسی دھوتی حیدرآباد میں کسی طرح دو ڈھائی رُوپے سے کم نہیں مل سکتی۔ آخر پانچ آدمی وہ اور چھٹے یہ ٹانگوں میں بیٹھ کر محبوب نگر آئے۔ یہاں شام کے وقت پہونچے مسٹر عبدالرحمٰن نے یہاں بھی گُڑ پر نیاز دی۔ گُڑ تقسیم ہوا۔ وہ لوگ دیوانے ہو گئے۔ اور یہ اُن کے کوئی ہزار بارہ سو روپے لیکر بھاگ نکلے۔ رات کے کوئی دو بجے پولیس کے گشت کے جوانوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ بازار کی دو کانوں کے قفل توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے سب کو گرفتار کر لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس پیش کیا گیا، اُس نے قے کرا کے اُن کا علاج کیا۔ جب اُن کے ہوش و حواس دُرست ہوئے تو اُنھوں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ چونکہ عبدالرحمٰن صاحب کی کارگزاریوں سے پولیس پُوری طرح واقف تھی اور اُن کا حُلیہ بھی ہر تھانے میں پہونچ چکا تھا اِس لئے باوجود اِس کے کہ وہ عید کا دن تھا، محبوب نگر کے سب انسپکٹر سرورالدّین صاحب نے چاروں طرف آدمی دَوڑائے۔ اور خود بھی ریل میں بیٹھ کر اُن کی تلاش کو نکلے۔ محبوب نگر سے ۱۴ میل کے فاصلے پر جڑچرلہ کا اسٹیشن ہے۔ مسٹر عبدالرحمٰن، محبوب نگر سے یہاں تک پیدل آئے، اور یہاں ٹکٹ لیکر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ سرورالدّین صاحب کے جوانوں نے گاڑی کے مسافروں پر نظر ڈالنی شروع کی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ جونہی کوئی جوان ان کی گاڑی کے پاس سے گذرتا اور یہ ذرا تختے کی آڑ میں ہو گئے۔ ان کے اِس طرح کرنے سے ایک جوان پولیس کو شُبہ ہوا۔ اُس نے سرورالدّین صاحب سے جا کر کہا۔ اُنھوں نے آ کر اُن کو گاڑی سے اُتارا۔ اُن کا لنگڑا کر چلنا تھا کہ شُبہ کو تقویت ہو گئی۔

اور یہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے پاس سے پسے ہوئے دھتورے کی ایک تھیلی اور لال مرچوں کی ایک تھیلی نکلی۔ ان کا چالان بھی میری عدالت میں پیش ہوا۔ ان حضرت نے دھتورے کی قسموں پر جو سوالات ڈاکٹروں سے کئے ہیں اُن سے واقعی ان ڈاکٹروں کو چکر آ گیا۔ اور اُس کے بعد جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ جناب والا یہ تو بتایئے کہ کس قسم کا دھتورہ ایک نوجوان آدمی کو تھوڑی دیر کے لئے دیوانہ کر دیتا ہے۔ اور جب میں سب لوگوں پر برابر کا حصۂ نیاز تقسیم کرتا تھا تو پھر سب پر خواہ وہ جوان ہو یا بچّہ، عورت ہو یا مرد یکساں اثر کیوں ہوتا تھا اور اُن میں کبھی ایک بھی ضائع نہیں ہوتا تھا تو اِس کا ایک ڈاکٹر صاحب بھی جواب نہ دے سکے۔ میں نے سب ڈاکٹروں سے یہ سوال کیا کہ دھتورے کی تھیلی کے ساتھ ملزم کے پاس سے مرچوں کی تھیلی کیوں نکلی ہے۔ لیکن اِس کے متعلق کوئی صاحب بھی مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ آخر سزا ہونے کے بعد اُنھوں نے اِس معاملے کو حل کیا۔ میرے چیمبر میں آ کر کہا "سرکار بات یہ ہے کہ دھتورہ تو میں سب کو برابر دیتا تھا مگر جب یہ لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے تو بچّوں، عورتوں اور کمزور قویٰ والوں کو زبردستی اتنی مرچیں کھلا دیتا تھا کہ اُس سے دھتورے کا اثر کم ہو جاتا تھا۔" سزا کے بعد یہ حضرت جیل میں رکھے گئے اور بطورِ خاص ہدایت کر دی گئی کہ ہر شخص کو اُن سے بچے رہنا چاہیئے کہ کہیں یہ وارڈنوں پر اپنے دھتورے کا تجربہ نہ دُہرائیں۔

اب سُنئے کہ پائیگاہ کمیشن کے سلسلے میں کچھ راز کے کاغذات چھپوانے مجھے دار الطبع جانا پڑا۔ یہ مطبع جیل خانے کے اندر تھا۔ ایک روز جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر عبد الرحمٰن نہایت اطمینان سے سیّد ہیران سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میری آنکھ خطا کر رہی ہے مگر جب وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی عبد الرحمٰن صاحب سوداگر ہیں، بڑے متقی اور پرہیزگار بن گئے ہیں، اور اب جیل کے مہتمم صاحب اُن کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ واپس آتے ہی میں نے صدر ناظم صاحب کو توالی کو اِس کی اطلاع دی۔ اور اس کے بعد ان کی عزت وعظمت کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس کے بعد ایک تیسرے رنگ کے مقدمے کو دیکھئے۔ تعلقہ بھینسہ کا مستقر مدھول ہے۔ یہاں ایک صاحب میراں محی الدین نامی رہتے تھے۔ ان کے رعب اور ظلم و زیادتی کا یہ حال تھا کہ جس شخص کی زمین چاہتے کسی کو دلا دیتے۔ ساہوکاروں سے دستاویزیں اور بہی کھاتے چھین کر پھاڑ ڈالتے کسی عہدیدار کو خاطر میں نہ لاتے۔ غرض وہاں کے مالکِ کُل بن گئے تھے۔ آخر خفیہ پولیس نے اُن پر ہاتھ ڈالا۔ گرفتار ہوئے اور میرے سامنے لائے گئے۔ اُن کے رعب کی وجہ سے شہادت پیش نہ ہو سکی کہ اُن کو سزا ہو سکتی۔ اِس لئے یہ بَری ہوئے۔ فیصلہ سُنانے کے بعد میں نے اُن کو چیمبر میں بُلایا۔ اور کہا دیکھو میراں محی الدین میں نے ان مقدمات سے تم کو رہا کیا ہے لیکن مجھ کو اِس کا یقین ہو گیا ہے کہ ان مقدمات میں اصلیت ضرور تھی۔ اگر تم بھلے آدمی ہو تو اپنا رویّہ درست کر لو ورنہ یاد رکھو کہ اگر اس کے بعد تمہارا کوئی مقدمہ آیا تو کافی شہادت کے نہ ہونے کی صورت میں بھی تم کو جیل بھیج دونگا۔ اُنھوں نے یہ سُنکر بہت توبہ تِلّا کی اور مجھے بعد میں یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اُنھوں نے اپنی حالت کو دُرست بھی کر لیا ہے۔ ان کے چھُوٹنے کے کوئی دس برس بعد میں حیدر آباد کے اسٹیشن پر شاید گلبرگہ شریف جانے کے لئے کھڑا تھا، ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور میرے پاؤں پر گرنے لگا۔ میں نے اُٹھایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میراں محی الدین صاحب ہیں۔ میں نے کہا کہو کیسے ہو۔ کہنے لگے۔ سرکار آپ نے مجھے بڑے عذاب سے نجات دلائی اور میں سمجھ گیا کہ میں بہت غلط راستے پر چل رہا تھا۔ اب میرے کپڑے کی دوکان ہے۔ اچھی طرح چل رہی ہے اور خدا کے فضل سے میرے بال بچّے دل جمعی سے زندگی گذار رہے ہیں۔ اگر آپ اُس روز مجھ کو چیمبر میں بلا کر نہ سمجھائے ہوتے تو یقیناً میں اپنے پُرانے راستے پر چلا جاتا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ سُنکر مجھے کتنی خوشی ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ ایک ملزم کا راہِ راست پر لانا سو ملزمین کو سزا دینے سے بہتر ہے۔ ایک عرصے تک مدھول میں لوگوں کے بیچ بنے رہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔
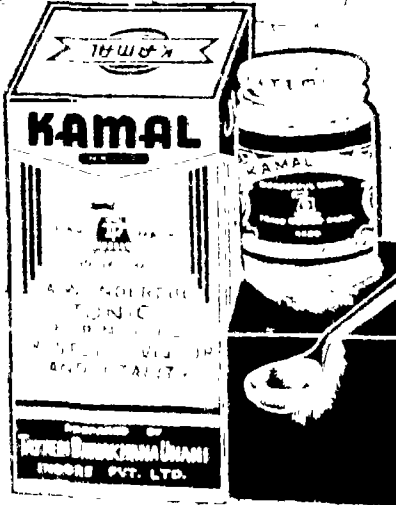
طبیہ دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ
کی مائیہ ناز ایجاد
جسم کے تمام غددوں کو تقویت دیکر بکثرت خون صالح پیدا کرتا ہے۔ بدرجۂ اعلیٰ مقوی اعصاب ہے۔
دل و دماغ
اور خصوصاً قوائے جسمانی کو طاقت دیتا ہے۔
KAMAL
کمال
طبی
منشی اور زہریلی دواؤں سے بالکل پاک ہے۔
مکمل کورس ۲۴ روز کیلئے ۲۰ روپئے
۱۲ روز کیلئے ۱۰ روپئے
ملنے کا پتہ
طبیہ دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ
۵۱ بوہرہ بازار۔ اندور سٹی (ایم۔ پی) فون:- ۶۳۳۴
طبیہ دواخانہ یونانی
فون:- ۳۲۴۸۸۳
محمد علی روڈ بمبئی ۳
چوک بازار اجین
جیل روڈ۔ اندور
چند شہرۂ آفاق خصوصی ادویات
طبی ڈی نوتھہ پاؤڈر
امراض دندان کیلئے مشہور و مستند منجن۔ پایوریا کی بہترین دوا اور عام روزانہ استعمال کے لئے بہترین منجن
بڑی شیشی ۱/۳۷
چھوٹی شیشی صرف -/۳۷
عرق ماء اللحم
کھوئی ہوئی قوت کی بحالی کے لئے نفیس مرکب موسم سرما کی جان
بڑی بوتل قسم اعلیٰ ۱۲/۵۰
آدھی بوتل ۶/۳۷
لبوب کبیر
طب یونانی کا مشہور مرکب بہترین صحیح اجزاء سے تیار کردہ
قسم اعلیٰ ۱۰ تولہ ۳/۷۵
سعالین پلز
کھانسی اور بچوں کے امراض کیلئے اکسیری گولیاں
ایک تولہ کی شیشی ۳/۱۲
۶ ماشہ کی شیشی ۱/۵۶
شارحی
کمی خون، ضعف اعضاء، مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے بہترین ٹانک
مکمل کورس ۷/۲۵
۱۲ روز کیلئے ۳/۵۰

جمیل مظہری

فکرِ جمیل

(قطعات)

(۱)

یہ کیوں کہوں کہ کسی کو پکارتا ہوں جمیلؔ
جو دے جواب اُسی کو پکارتا ہوں میں
کہ منفعل نہیں میری غیور مایوسی
خدا اگر ہے چُپ تو خودی کو پکارتا ہوں میں

(۲)

گُم وہ ہجر و وصل میں اُگم یہ خیر و شر میں ہے
عشق بھی سفر میں ہے عقل بھی سفر میں ہے
کسی سے پُوچھئے پتہ منزلِ بعید کا
وہ بھی رہگذر میں ہے یہ بھی رہگذر میں ہے

(۳)

جو کھا چکے ہیں لُو کے طمانچے تمام عمر
دُھوپ اُن کو ہے پسند نہ ہے روشنی قبول
اُن خستگانِ راہ میں کیجے مرا شمار
سائے کے شوق میں جو کرے تیرگی قبول

(۴)

زندگی تجھ کو سو طریقوں سے — آزما آزما کے دیکھ لیا
حرم و دیر بھی دو کانیں ہیں — ہم نے دونوں کو جا کے دیکھ لیا
میکدے میں بھی کچھ نہیں ملتا — پی کے دیکھا پلا کے دیکھ لیا

(۵)

عشق کے مشورے سُنے تو جمیلؔ — زندگی کا مزا مگر نہ ملا
لذّتِ غم سے آشنا نہ ہوئے — انبساطِ دل و نظر نہ ملا
مختصر ہے یہ ماجرا اپنا — سر ملا اور دردِ سر نہ ملا

شمیم کرہانی

اُداس لمحے

بہار گرد ہوئی، چاندنی غبار ہوئی
سفید پڑ گئے تارے، پگھل گیا مہتاب
چراغ راہ گذر جھلملا کے سو بھی گئے
مگر مری نگہِ آرزو رہی بے خواب

نہ جانے کون سی بجلی، نہ جانے کون سی آگ
تمام رات گری زندگی کے خرمن پر
کسے شہید کیا شامِ غم نے کیا معلوم
پڑی ہیں خون کی بوندیں سحر کے دامن پر

یہی ہے رہزنِ ارماں کی آرزو تو چلو
پھر ایک رات کے لٹنے کا انتظار کریں
ابھی تو صبح ہوئی ہے ابھی تو شام ہے دُور
شمیم، خوں شدہ لمحات ہی شمار کریں

جگن ناتھ آزاد

اقبال

حریمِ شعر میں جو شمع حالیؔ نے جلائی تھی
اُسے اک روز مشرق کا اُجالا کر دیا تُو نے
پیامِ "آدمیت احترامِ آدمی" دے کر[1]
ادب میں آدمی کا بول بالا کر دیا تُو نے

ترے افکار پر ایمان لائیں یا نہ لائیں ہم
ترے افکار کی عظمت سے منکر ہو نہیں سکتے
جو دولت فکر کی اذہان کو تو نے عطا کی ہے
نئے اذہان اس دولت سے منکر ہو نہیں سکتے

قمر سے مشتری تک مشتری سے آنسوئے گردوں
کیا اس گرم جوشی سے ستاروں کا سفر تُو نے
کہ اپنی فکر سے اس خاک کی تقدیر چمکا دی
کیا ذرّوں کو نورِ آگہی سے باخبر تُو نے

ملا فانیں وہ تیری بحر تری سے اور شوخی سے
ترے نغمے سے کھلتا ہے کہ اوجِ زندگی کیا ہے
اگر ہوتا مصنفؔ "کامیڈی" کا اس زمانے میں
تو اس کو تو یہ سمجھاتا مقامِ آدمی کیا ہے[2]

---

[1] "آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی" (جاوید نامہ)

[2] اس بند میں دو ایک امور وضاحت طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسرے شعر کا تاثر اقبال کے اس شعر سے پیدا ہوا ہے
اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا کہ مقامِ کبریا کیا ہے

ترے افکارِ عالی میں ہے غلطاں دردِ انسانی
ترے نغمات میں ارضِ جہاں کا دل دھڑکتا ہے
تجھے جو ہند سے بیگانہ سمجھیں اُن سے کیا کہیئے
کہ تیرے شعر میں ہندوستاں کا دِل دھڑکتا ہے

جگایا اِس طرح تیری نوا نے ارضِ مشرق کو
کہ مشرق کا ہر اِک اہلِ نوا ممنون ہے تیرا
غلط ہے یہ کہ تُو ہے محض ہند و پاک کا محسن
یہ ہند و پاک کیا کُل ایشیا ممنون ہے تیرا

ترے افکار کی دُنیا کا میں بھی ایک مسافر ہوں
ترے "اسرار" سے پہنچا ہوں تیری "ارمغاں" تک میں
جو کوئی اِس سفر کی داستاں پوچھے تو بتلا دوں
کہ چل کر چاند سے آیا ہوں پھر خاوراں تک میں

ترے افکار کیا ہیں اِک نظامِ شمس ہے گویا
سبک فکرِ بشر کے جس کی تابانی سے روشن ہیں
تفکر کی، سخن کی، جذبِ دل کی، سوزِ پنہاں کی
یہ سب دُنیائیں تیرے شعرِ نورانی سے روشن ہیں

اقبال نے یہ شعر نطشے کے بارے میں کہا ہے۔ میں نے اپنے شعر میں دانتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِس کی وضاحت سے قبل ایک اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ "جاوید نامہ" میں اقبال رومی کی رہنمائی میں جب فلکِ قمر پر پہنچتے ہیں تو اُن کی ملاقات ایک "عارفِ ہندی" سے ہوتی ہے۔ اقبال نے اِس "عارفِ ہندی" کے متعلق عنوان میں یہ لکھا ہے کہ "اہلِ ہند او را جہاں دوست می گویند" مترجمین اور شارحینِ کلامِ اقبال نے "جہاں دوست" کا بالکل سامنے کا ترجمہ کرکے اس کے معنی "وشوامتر" لکھ دئے ہیں۔ حالانکہ اس عنوان کے تحت اقبال کا شعر ؎

موی بر سر بستہ و عریاں بدن گردِ او مارِ سفیدے حلقہ زن

اور پھر ملاقات کا فلکِ قمر میں ہونا، اِس بات کی بہت بڑی دلیلیں ہیں کہ "جہاں دوست" سے مُراد وشوامتر نہیں بلکہ "شوجی مہاراج" ہیں۔

خیر میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے مصنف کی عالمِ سیارگان میں عظیم عیسائی شخصیتوں سے اور اقبال کی عظیم غیر مسلمان شخصیتوں سے ملاقاتوں میں ایک فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ڈیوائن کامیڈی کے مصنف نے اکثر و بیشتر غیر عیسائیوں کا ذکر توہین آمیز طریقے سے کیا ہے اور جو شخصیت جتنی بڑی نظر آتی ہے۔ اُس کا ذکر اتنی ہی نفرت اور حقارت سے کیا ہے۔ اس کے خلاف اقبال نے غیر مسلم اکابر کے ذکر میں اپنی عقیدت اور محبت کے وہ پھول نچھاور کئے ہیں، جن کی خوشبو سے عالمِ انسانیت ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ ان اکابر میں شیو جی مہاراج اور مہاراج بھرتری ہری کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سلام مچھلی شہری

زہرۂ عید

"ـــ زہرۂ عید" کا پیکر ہے وہی ــ روح نہیں
کھا کے آئی ہے بڑی زخم وحشیں چوٹ کہیں

چوڑیاں بجتی ہیں ـــــ آواز نہیں ہوتی ہے
دلکشی مائل پرواز نہیں ہوتی ہے

خیر مقدم کے بھی پُر نور نظارے چپ ہیں
پھول خاموش، ہوا، چاند ستارے چپ ہیں
اور تو اور مساجد کے منارے چپ ہیں

کوئی انجانا قصور اس سے ہوا ہے شاید
"زہرۂ عید" سے "اللّٰہ" خفا ہے شاید

کچھ سکون دلِ پامال ضروری ہے سلام!
خیر مقدم تو بہر حال ضروری ہے سلام!

لاکھ افسردہ سہی، آ تجھے رعنائی دوں
واقعی ایک مسرت بھری انگڑائی دوں

دل ہے مے خوار میں بھی شمع جواں ملتی ہے
کبھی نغمہ، کبھی آوازِ اذاں ملتی ہے

میں بھی مسجد کے مناروں ہی کا پروردہ ہوں
نور و نکہت کے نظاروں ہی کا پروردہ ہوں!!

رفعت سروش

مُسافر

جانے کس موڑ پر کھڑا ہوں میں
کوئی آواز ہے، نہ آہٹ ہے

راستے اپنے ہاتھ پھیلائے
کاروانوں کے منتظر ہیں، مگر
کوئی صورت نظر نہیں آتی

شام اُترنے لگی خلاؤں سے
تیرہ و تار ہو چلی ہے فضا
راستوں کو بھی نیند آنے لگی

جانے وہ کون سے مُسافر ہیں
منزلیں خود پکارتی ہیں جنھیں
میں تو ذوقِ سفر لئے دل میں
تک رہا ہوں ہر ایک رستے کو
سوچتا ہوں کدھر بڑھاؤں قدم
ہر طرف تیرگی کا پہرہ ہے

جانے کس موڑ پر کھڑا ہوں میں
کوئی آواز ہے نہ آہٹ ہے

سوچتا ہوں تو کانپ اُٹھتا ہوں
کیا یہی موڑ میری منزل ہے!
تیرگی اور اُداس تنہائی،
کیا یہی زندگی کا حاصل ہے!!

نازش پرتاپ گڑھی

اے زبان

میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہے یارو
میرے لفظوں میں تمہارا بھی بیاں ہے یارو

اے زباں! تُونے تماشے کے تنِ نازک کو
گرمیٔ جنبشِ لب، سوزِ گلو بخش دیئے
اے زباں تُونے تفکّر کے لبِ تشنہ کو
حرف والفاظ کے صد جام وسبو بخش دیئے

جب بھی احساس کا پیمانہ اُٹھایا میں نے
تیرے اعجاز نے الفاظ کا جادو گھولا
جب بھی خاموشی وحیرت کی کڑی دُھوپ ملی
دوش پر تیری ہی آواز نے گیسو کھولا

یہ مری فکرِ سخن، یہ مری پروازِ خیال
اپنی دھرتی کے حقائق سے گریزاں نہ ہوئی
میرے افکار نے خوابوں کا سہارا نہ لیا
میری تخییل خلاؤں میں پرافشاں نہ ہوئی

بے شمار اشکوں سے آہوں سے ہوا ہوں نزدیک
جب کہیں میں نے درِ فکر ونظر کھولا ہے
کبھی بے نام سے سنّاٹوں میں اُلجھا ہوں میں
جب کہیں جل کے کوئی حرفِ تپاں بولا ہے

میں نے ہر سوزِ تمنّا کو لگایا دل سے
ہر دُعا کی خلشِ بے اثری بھی ہے
کتنے ہی سینوں کی سوزش مجھے محسوس ہوئی
کتنی آنکھوں کی پریشاں نظری بھی ہے

کیسے آجاتا ہے دل آنکھوں میں آنسو بن کر
کیسے بنتی ہے شرابِ طلبی۔ دیکھی ہے
جن کے ہونٹوں پہ ہیں خورشید وسحر کی باتیں
اُن کے ذہنوں میں عجب تیرہ شبی دیکھی ہے

جب بھی چونکی ہے کوئی شاخِ خزاں دیدہ کہیں
اُس کو نورُستہ بہاروں کا قرینہ آیا
جب بھی انساں نے اُٹھائی ہے نگاہِ جرأت
نذر میں چاند کے ماتھے کا پسینہ آیا

دیکھتا رہتا ہوں تا دُور میں اپنا رستہ
کوئی رہزن تو نہیں ہے کوئی کھٹکا تو نہیں
کوئی عالم ہو مجھے رہتا ہے ہر لمحہ خیال
میرا خورشیدِ سحر راہ سے بھٹکا تو نہیں

آتشِ غم نے بنایا ہے مجھے محرمِ نوا
سوزِ دل نے مرے لفظوں کو حرارت دی ہے
مجھ کو ماحول سے لہجے کی توانائی ملی
میرے اخلاص نے الفاظ میں قوت دی ہے

صبحِ مستقبلِ ہستی نے دیئے عزم ویقیں
شامِ ماضی نے روایات کی دولت دی ہے

اے زباں تجھ سے مری فکر ونظر کی تفسیر
ہونٹ کھُلتے ہیں تو میں تجھ کو صدا دیتا ہوں
تجھ سے لفظوں کے بھڑکتے ہوئے شعلے لے کر
اپنے افکار کے دامن سے ہوا دیتا ہوں

دستِ افسانۂ ہستی کے کفِ سادہ کو
تیرے ہی برگِ دل آرا کی حنا دیتا ہوں
تیرے آنچل کا کوئی ننھا سا ٹکڑا لے کر
سر برہنہ ہوں جو مائیں تو ردا دیتا ہوں

کسی جگنو کا تخیّل بھی نہ گزرا ہو جہاں
میں وہاں مشعلِ خورشید جلا دیتا ہوں

دل کے ہر جذبۂ بے نام کا پردہ رکھا
تیرے پیراہنِ رنگیں کو دعا دیتا ہوں

کسی بے کس، کسی بے بس، کسی مجبور کی آس
تھرتھرائی ہے تو اِک نظم لکھی ہے میں نے
کسی ارماں، کسی حسرت، کسی تعبیر کی آنکھ
ڈبڈبائی ہے تو اِک نظم لکھی ہے میں نے
شمعِ آزادیٔ انساں جو کسی جھونکے سے
جھلملائی ہے تو اک نظم لکھی ہے میں نے
آتشِ گل سے سہی، پھر بھی مرے گلشن تک
آنچ آئی ہے تو اِک نظم لکھی ہے میں نے

اے زباں اے مری تنہائی دل کی ہمراز
تجھ کو یوں ہی نہ سرِ راہ لُٹایا میں نے
تیری قوت کو سلیقے سے کیا اِستعمال
مطمئن ہوں کہ تجھے ڈھنگ سے برتا میں نے

اک نئے موڑ پر آپہونچی ہے تہذیبِ وطن
ساتھ جو اس کا نہ دے گا وہ اُجڑ جائے گا
زندگی کے لئے ہے حرکت و تغیر ضرور
بہتا پانی کہیں ٹھہرے گا تو سڑ جائے گا

اِس حقیقت کو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا
ہر نئے دور میں اقدار بدل جاتے ہیں
مرکزِ فکر و نظر ہوتا ہے جوں ہی تبدیل
علم و فن کے سبھی معیار بدل جاتے ہیں
یہی تقدیرِ ازل ہے کہ جہاں کی کوئی شئے
خود نہ بدلے تو اُسے وقت بدل دیتا ہے

توڑ لیتی ہے جو اس دھرتی سے رشتہ اپنا
پلٹ کے تاریخ ہر اُس شئے کو کچل دیتا ہے

اے زباں تیرے خد و خال بھی بدلیں گے مگر
تو عوامی ہے تجھے موت نہیں آسکتی
تیرے جلوؤں کو نیا رُخ تو ملے گا۔ لیکن
تیرگی کلیتاً تجھ پہ نہیں چھا سکتی

لفظ و معنی کے سمجھنے میں تکلف ہی سہی
دل مگر زیست کے ارمان سمجھ لیتا ہے
ذکر اپنا ہو تو ہر ذرّے کو مل جاتے ہیں کان
بات اپنی ہو تو انسان سمجھ لیتا ہے

کبھی دہکے ہوئے چہروں کو بنایا اپنا
کبھی بکھرے ہوئے گیسو سے محبت کی ہے
میں سدا زیست کے ہنگاموں سے نزدیک رہا
میں نے اس دھرتی کی خوشبو سے محبت کی ہے

یہ مرے گیت ہیں، یہ نظمیں ہیں، یہ غزلیں ہیں
غمِ دوراں نے غمِ دہر نے پالا ہے انھیں
میرے ماحول میں بکھری ہوئی ہر تلخی نے
میرے احساس کے سینے سے نکالا ہے انھیں
اِن کے ہر رُخ پہ مرے دور کی پرچھائیں ہے
میری دنیا کے حقائق نے سنبھالا ہے انھیں
اے زباں تو نے بڑے پیار، بڑے چاؤ کے ساتھ
ایک انداز سے الفاظ میں ڈھالا ہے اُنھیں

میں یہ کیوں سوچوں کہ مٹ جائیں گی میری نظمیں
میں نے ہر نظم کی تخلیق میں محنت کی ہے
میں یہ کیوں سوچوں کہ تاریک ہے صبحِ فردا
میں نے انسان کو سورج کی بشارت دی ہے

کنول پرشاد کنول

بہاروں کا سفیر

ہائے یہ کیفیتِ دل کہ سنائے نہ بنے
نقشۂ رنگِ تمنا کہ دکھائے نہ بنے

پیار کے لاکھ سمندر ہیں کہ لہرائے ہیں
یا دہم کس کی منانے کے لئے آئے ہیں

آنکھ کہتی ہے کہ نظروں کا اُجالا نہ رہا
پیار کی جوت محبت کا شوالہ نہ رہا

پاؤں کہتے ہیں کہ زنجیرِ جنوں ٹوٹ گئی
حوصلے کہتے ہیں، ہمت کا ہمالہ نہ رہا

جس کی نظروں سے چراغاں ہوں ظلمت میں
زہر امرت بنے جس میں وہ پیالہ نہ رہا

خار زاروں کو تبسم سے جو گلزار کرے
وہ بہاروں کا امیں، وہ گُلِ لالہ نہ رہا

منزلیں زیرِ قدم جسکے بچھی جاتی تھیں
اب وہ راہی نہ رہا اب وہ جیالہ نہ رہا

دل سے آتی ہے مگر آج یہ اکثر آواز
مسکراتا ہے کوئی دیکھ پسِ پردۂ ناز

عشق کو جامِ فنا کون پلا سکتا ہے
کون اس شعلۂ رقصاں کو بجھا سکتا ہے

دل مرے، جذبۂ بیدار نہیں مر سکتا
حسن مر جائے مگر پیار نہیں مر سکتا

گُل گیا بوئے گل آب ہی چمن میں پھیلی
جوت ہوگی نہ جو آہر کی کسی دن میلی

چمکے ہے شب میں جو رشکِ مہِ کامل بنکر
دھڑکے ہے جو مرے پہلو میں مرا دل بنکر

سید حرمت الاکرام

فن کا مورّخ

عظمتِ فن! نہ ملا کوئی مورّخ مجھ کو!
داستاں میری بھی کرنی ہے زمانے کو رقم
مجھ کو بھی چاہیئے لمحوں کے مورّخ کا قلم
میں نے مرمر کی چٹانوں کا سہارا نہ لیا
اپنے سحر آفریں نغموں سے ابھارے کئی تاج
مجھ کو بھی وقت کی تاریخ سے لینا ہے خراج
زندگی کہہ نہ سکے شاہ جہاں مجھ کو تو کیا
پیار کو گنبد و دیوار کا پہنا کے لباس
خاک کے ذرّوں پہ رکھ دی ابدیت کی اساس
اے زمانے کے مورّخ! مرا دل چیر کے دیکھ
آ! یہ شہکار، مری ندرتِ تعمیر کو دیکھ

دولتِ فکر نے مجھ کو بھی کیا خاک بسر
مجھ کو بھی جبرِ مشیت نے بنایا ہے ظفر
وہ ظفر، دہلیِ مرحوم کی عظمت کا امیں
کوچۂ یار میں دو گز نہ ملی جس کو زمیں
وہ کہ اک صیدِ زبوں سطوتِ شاہانہ کا
جس کو ارمان رہا تاجِ گدایانہ کا
زندگی نے جسے دی محلوں میں پلنے کی سزا
وہ جو خود اپنا جنازہ لیئے رنگون گیا
جس کی شریانوں سے ٹپکا کی اک اک بوند لہو
ایک اک سانس بنی جس کے جگر کا نشتر
جھلملا بھی نہ سکے پلکوں کے جس کی آنسو
اپنے احوال سے خود جس نے چرائی ہو نظر

شعر کہہ کہہ کے غمِ ذات کی دلجوئی کی
نوحہ و سوز کے لہجے میں غزل گوئی کی
ہے مری خواجگیِ فن بھی قتیلِ مہ و سال
مرا خامہ بھی ہے خوں گشتۂ نیرنگِ کمال
کس مورّخ سے کرے عظمتِ شاعر فریاد؟
کون اس جشنِ ہلاکت کی لکھے گا روداد؟

رام کی طرح بھٹکتا ہوں بیابانوں میں
حکمِ بن باس کا دنیا سے ملا ہے مجھ کو
کیکئی بن کے کسی ماں نے ڈسا ہے مجھ کو
لکشمن ہے کوئی اس دور کے انسانوں میں؟
بے سہارا ہوں مگر پیار کی بانہوں کا حصار
دشتِ وحشت میں نگہباں ہے مری سیتا کا
مکر کی شوخ زبانی کو ہوا جانے گا!
اپنا منہ تکتا ہے راون کی ہوس کا پندار
کہہ دو آواز نہ دے مجھ کو اجودھیا کی زمیں
فطرتِ عشق سمجھنے لگی صحرا کی زباں
انھیں کانٹوں میں ہے شاید مری منزل پنہاں
اور کچھ اور ابھی ہوگا یہ افسانہ رنگیں
مجھ کو درکار نہیں مرتبہ و جاہ کے پھول
عشرتِ جاں ہے یہ تپتی یہ سلگتی ہوئی دھول
کون دیکھے گا مرا سوزِ طلب، سوزِ جگر
کیوں خلاؤں میں بھٹکتی ہے مورّخ کی نظر

مری نغمی میں بھی ہے کرشن کے ہونٹوں کی نوا
میرے نغموں میں ہے رقصاں کسی رادھا کا جمال
بندرا بن کی طرح گونج اُٹھی ہے دُنیا
گوپیاں وقت کی شاعر سے یہ کرتی ہیں سوال
ترے سینے میں بھی لہراتی ہے ایسی کوئی آگ؟
نام جس کا ہو بصیرت کی زباں میں گیتا
میں یہ کہتا ہوں مری لَے ہے زمانے کا سُہاگ
پانڈو بھانپ گئے ہیں مرے فن کے تیور
مرے گیتوں میں ہے ارجن کی صداقت کی ظفر

زندگی جس کی مہکتی ہوئی زُلفوں کا فسُوں
مرے امروز کی جنت، مرے فردا کی ارم
زندگی، جس کے دہکتے ہوئے رُخسار کا نور
میری راتوں کا سہارا، مری صبحوں کا بھرم
زندگی، جس سے ہے پائندہ مرا ذوقِ جنوں
زندگی، جس سے ہے زندہ مری چاہت کا غرور
زندگی، میری دلارا مرے خوابوں کا غرور
زندگی، جس سے درخشندہ ہے دھرتی کی جبیں
زندگی، جس سے فروزاں ہیں تخیل کے دیئے
بے ستوں کاٹے ہیں کیا کیا اسی شیریں کے لئے
خسروی اپنی جلالت پہ بہت اترائی
تیشۂ فن کی صلابت سے نہ ٹکرا پائی
عظمتِ کوہکنی ہے مرا سرمایۂ ناز
چاہیئے مجھ کو بھی تاریخ کے صفحوں کا گداز

چاہیئے مجھ کو بھی لمحوں کے مورخ کا قلم
داستاں میری بھی کرنی ہے زمانے کو رقم
تاجِ زرِ عظمتِ فن نے مجھے پہنایا ہے
ناز مجھ کو ہے کہ شاعر کا قلم پایا ہے

نما بیگم رضوی

مُلاقات

رات، سنّاٹا، در و بام کے ہونٹوں پہ سکوت
راہیں چُپ چاپ ہیں پتّھر کے بُتوں کی مانند
روشنی طاقوں میں اُلسائی ہوئی بیٹھی ہے
نیند آنکھوں کے دریچوں سے لگی بیٹھی ہے

دن کے ہنگاموں کی رونق کو بجھے دیر ہوئی
چاند کو نکلے، ستاروں کو سجے دیر ہوئی
اب کسی چشمِ نگہدار کا خطرہ بھی نہیں
وقت کے ہاتھ میں اب سنگِ ملامت بھی نہیں
دل جو مچلے تو کوئی ٹوکنے والا بھی نہیں
جسم پگھلے تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں

اے نگارِ دل و جاں شوق کی باہوں میں مچل
سایہ سایہ یونہی آغوشِ چمن زار میں چل
دن ستم پیشہ ہے، رازوں کو اُگل دیتا ہے
رات معصوم ہے رازوں کو چھپا لیتی ہے

عمیق حنفی

ٹٹہری کے انڈے

ہاتھی گھوڑے رتھ اور پیادے
سب آپس میں جوجھ رہے تھے

اور دیوتا اِندر لوک میں
کوئی پہیلی بوجھ رہے تھے
مٹی، پانی، آگ، ہوا آکاش سبھی تھے
جنگ کا ایندھن
کاٹ رہے تھے کورو پانڈو
جیون بندھن
ایک ہاتھی کی پیٹھ سے کٹ کر
پیتل کا ایک بھاری گھنٹا
ایک ٹٹہری کے انڈوں پر گرا
اِن جیون۔ بیجوں کو اُس نے ڈھانپ لیا
اور جس گھڑی
ختم ہوا وہ خونیں تانڈو
موت کی اِس وادی میں

پیتل کے گھنٹے کے اندر
جیون کے چہچہے سنائی دیئے
تین انڈوں کے خول توڑ کر
سناٹے کو چیر گئیں معصوم آوازیں
منظر بدلا ——
یہ میرا خلوص،
یہ میرا شعور،
یہ میرا ضمیر،
اس پُر ہول فضا میں
رُوح کے اِس سناٹے میں
میرے فن کی دیواروں میں چہک رہے ہیں!

کرشن موہن

شہر کا فریب

دِل کو آگہی کب تھی
ایک وقت تھا، جب تھی انجمن مرا مسکن
دوستوں کا حُسنِ ظن، تھا مِرا گُلِ دامن
مَیں تھا اِک تماشائی، محوِ بزم آرائی
خلوتوں کا دشمن تھا جلوتوں کا شیدائی
قہوہ خانے سے مجھ کو ربطِ خاص پیدا تھا
کیفِ شہرِ دِلّی سے تھا مِرا دِلی رشتہ
ہر ادا تمدّن کی بس گئی تھی نس نس میں
کھا رہا تھا ہر جادہ میرے پیار کی قسمیں
ایک وہ زمانہ تھا

ایک یہ زمانہ ہے
شہر کا فریب و شر آج میری آنکھوں میں دُھول جھونکے ہے
کین و بُغض کا غوغا مجھ پہ بھونکنے کو ہے۔
شہر کی حصیں سڑکیں، سنگدل تماشائی
بے نیاز ہرجائی
میرا ہمدرد کیا جانیں
میں پریکھالوں میں، اپنے ہی خیالوں میں مست ہوتا ہوں
اب تو محفلوں میں بھی اجنبی و تنہا ہوں

ہوں اسیرِ شر خیزی
کب میسّر آئے گی راحتِ کم آمیزی
کھوکھلی ثقافت کی یہ فریب انگیزی
موجِ تندی و تیزی
مجھ کو راس کیا آتی
میرے ہمنشینوں کے دل میں اک جلن سی ہے
قہوہ خانے کے اندر حبس سا گھٹن سی ہے
ذہن میں تھکن سی ہے
چند ساعتیں بیٹھیں کیوں نہ چل کے باہر ہم اُس وسیع میدان میں
جس کا دل کشادہ ہے
میرے دل ہی کی مانند . . . . . .

زیست کے دُھندلکے میں میرا دِل چمکتا تھا
جیسے اک کنول اُجلا، پاکدامن و معصوم
مُضطرب، تموّج خیز، گدلے سے پانی میں
یہ کنول، تر و تازہ۔
جس کے رُوپ کا جادو چار سمت چھایا تھا
جو بچا رہا تا دیر جھیل کے تلاطم سے
آج اِس کی زد میں ہے

۱؎ مضبوط

یوسف ناظم

وہ لوگ

وہ لوگ اور ہیں جو زندگی کی راہوں میں — نگہ کا نور، دلوں کا لہو چھڑکتے ہیں

وہ لوگ اور ہیں شادابیٔ چمن کے لئے — روش روش پہ جو روحِ نمو چھڑکتے ہیں
ہر اک کلی کو تبسم کی آب دینے کو — ہر ایک شاخ پہ جو رنگ و بو چھڑکتے ہیں
وہ لوگ اور ہیں آرائشِ جہاں کے لئے — جو ارمغانِ وفا، کو بکو، چھڑکتے ہیں

ہے جن کا کام جگر کاوی و جہاں داری — وہ لوگ اور ہیں جن کا ہے شغل بیداری
جو بادِ صرصر و سیلِ بلا سے لڑتے ہیں — جو حق کی بات کی خاطر خدا سے لڑتے ہیں
جو ظلم و جور مٹانے کا عہد کرتے ہیں — وہ لوگ اور ہیں جو آشتی پہ مرتے ہیں

وہ لوگ اور ہیں جو درد مند ہوتے ہیں — جو دوستی کے لئے جان اپنی کھوتے ہیں
جو زندگی کی علامت ہیں شمع محفل ہیں — جو روحِ بزمِ جہاں ہیں نشانِ منزل ہیں
سنا ہے ایسے ہی کچھ لوگ اب بھی جیتے ہیں — جو دوسروں کے گریباں کے چاک سیتے ہیں

ہمیں تو عمر لگی ہے تلاش کرنے میں — کوئی بتائے کہاں ایسے لوگ رہتے ہیں
کہاں ہیں لوگ جو اوروں کو زندگی دیدیں
اندھیری رات کو تھوڑی سی روشنی دیدیں

مخمور سعیدی

نئی نسل کے ساتھ ایک شام

ہاں یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر نے
زندگی کی فضا بدل ڈالی
نت نئے فلسفوں کے بوجھ تلے
روحِ انسانیت کچل ڈالی

روز و شب کے بگڑ گئے چہرے
مسخ ہو کر یہ کائنات رہی
انقلاباتِ وقت کے ہاتھوں
دن رہا دن، نہ رات رات رہی

جس کی صورت تھی جانی پہچانی
اب وہ دنیا نظر نہیں آتی
گم شدہ قافلے وہ یادوں کے
اب کچھ اُن کی خبر نہیں آتی

نور و ظلمت کا اک اُفق سے ظہور
اک حقیقت ہے اب طلسم نہیں
جو مسیحا، وہی ہے قاتل بھی
معتبر آج کوئی "اِسم" نہیں

جن کے پرتو سے تھی زمیں روشن
اب وہ سورج نہ وہ ستارے ہیں
حسن سے نابلد نگاہوں میں
منہ چڑاتے ہوئے نظارے ہیں

ضرب سے منتشر خیالی کی
لفظ و معنی کا ربط ٹوٹ گیا
ہر سخن گو کے ہاتھ سے گویا
دامنِ اعتبار چھوٹ گیا

زلزلوں کی گرج میں مدت سے
نغمۂ عافیت کی لے گم ہے
قلبِ دریا تو کیا، کناروں تک
شورِ طغیانی و تلاطم ہے

جمنے پاتی نہیں نگاہ ابھی
اور منظر بدل بھی جاتا ہے
اس چہروں کو کچھ نہیں جھکتے
موم کا بت پگھل بھی جاتا ہے

سینۂ وقت میں نہیں باقی
جذبۂ حسن پروری کوئی
زندگی کی کسی ادا میں بھی اب
جاں نوازی نہ دلبری کوئی

ہاں! یہ سب سچ ہے اور یہ بھی درست
ہم اسی زندگی کے ہیں نقال
زندگی کی جو عام حالت ہے
اس سے کیوں مختلف ہو اپنا حال؟

پھر بھی اک بات سوچنی ہے کہ ہم
محض نقال ہیں کہ اور بھی کچھ؟
کیا برا ہے "جہاں شناسوں" میں
ہوں جو خود آگہی کے طور بھی کچھ؟

ہم جو کرتب دکھاتے رہتے ہیں
ان کا مقصود کیا ہے کچھ تو کھلے
فکر و فن کی بساط پر آخر
یہ اچھل کود کیا ہے کچھ تو کھلے

بندروں کو فلاسفر سمجھے
اس قدر بھی غبی یہ دور نہیں
نازِ دانشوری بجا، لیکن
مسخرہ پن ہے یہ کچھ اور نہیں

اسرار اکبرآبادی

سرد بلا

(موجودہ بین الاقوامی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر)

برف کے اونچے پہاڑوں کے ٹھٹھرتے سائے
گھوم کر آ گئے وہ بھاپ کے میدانوں میں
جم گیا سرد فضاؤں پہ لرزتا اسموگ[1]
چاندنی لوٹ گئی چاند کے ویرانوں میں

سرمئی سرد خلاؤں میں نگاہیں بھٹکیں
فاصلے پھیل گئے رات کے بالوں کی طرح
ذہن کی آنکھ کے رنگین ادھورے سپنے
ہر طرف چھا گئے پھر روئی کے گالوں کی طرح

گوشِ احساس نے طوفان کی آواز سنی
پھر نظر جا کے رکی ٹوٹتے میناروں پر
دم بخود تیز ہواؤں کے جلالی چہرے
جم گئے دور کھڑی برف کی دیواروں پر

سرد ماحول کی یہ سرد بلا سر سے ٹلے
زندگی! آگ جلا، آگ کا اک تیر چلے

(۱) نیا انگلش لفظ۔ جب دھواں اور کہر گھل مل جاتے ہیں۔ (Smog = Fog + Smoke)

راج نرائن رازؔ

اِستعجاب

شام کے شنگرفی اُجالوں میں
آسماں اِس طرح سے روشن تھا
جیسے قوسِ قزح کے کچھ ٹکڑے
ٹوٹ کر کھل گئے ہوں پانی میں

ہر طرف سحر کی سی کیفیت
ہر طرف اِک سکونِ بے پایاں

— نیلی، نکھری ہوئی فضاؤں میں
نگراں آفتابِ شام کی سمت
چوٹیاں سربلند پربت کی،
پُرسکوں، پُرشکوہ، عرش وقار

— اور اِنہیں میں سے ایک چوٹی پر
ایک شاہیں - تمام رعنائی
سرخوش و سربلند بیٹھا تھا
بات کرتا تھا آسمانوں سے

دوسری سمت زیرِ کوہِ گراں
دھند ہی دھند، روشنی کم کم
دلدلی غار — جھاڑ جنگل کے
جن پہ چڑیوں کا ایک کثیر انبوہ
بے محابا مچا رہا تھا غُل،

اور شاہیں کی فلسفی آنکھیں
سوچ میں بے طرح سے ڈوبی تھیں
پوچھتا تھا وہ خود سے رہ رہ کر
ننھی چڑیوں میں غُل یہ کیسا ہے!

اویس احمد دوراں

آئینے ٹوٹ رہے ہیں

بڑی لطیف ہے دُنیا، بہت حسین ہو تم
قدم قدم پہ جمالِ نشاطِ محبوبی
روش روش ہے گُل و یاسمن کی رعنائی
نظر نظر میں ہیں دلداری و مسیحائی
چمن میں عام ہے افسانۂ زلیخائی
تمام گیسوئے جاناں کی بھینی بھینی مہک
پیامِ خلوتِ اصنام دیتی رہتی ہے
تسلیاں سحر و شام دیتی رہتی ہے
مگر یہ دُکھ، یہ غریبی، یہ دردِ محرومی
نہ صرف مجھ سے، مری ہی طرح کروڑوں سے
جمالِ زیست کا احساس چھینے جاتے ہیں
تصورات کے آئینے توڑے جاتے ہیں
یہ دُکھ، یہ دَورِ غریبی، یہ شامِ محرومی
نظامِ جبر و تشدد کی دین ہیں، لیکن
مرے نصیب اب اس کے خلاف گلشن سے
کوئی صدا، کوئی آواز تک نہیں آتی
یہ لگ رہا ہے کہ غم سے نڈھال کوئی نہیں
فغاں بہ لب نہیں آشفتہ حال کوئی نہیں
سبھی ہیں محوِ طرب پائمال کوئی نہیں

نہ جانے کیسی سیاست نے ہونٹ سی ڈالے
کہ جور سہہ کے رفیقانِ تند خو چپ ہیں
خزاں کے ڈر سے فدایانِ رنگ و بو چپ ہیں
یہ بے دلی جو شبِ غم کے ساتھ آئی ہے
یہ بے حسی جو فقط انتشار لائی ہے
یہ خامشی جو ہر اک بام و در پہ چھائی ہے
مرے چمن کو بھیانک بنا کے چھوڑ نہ دے
گُلوں کے رُخ کو بیاباں کی سمت موڑ نہ دے
فروغ پائے نہ کیوں راہِ غم کی تاریکی
مسافروں کے دلوں میں نہ زندگی نہ کرن
نظامِ جبر نے سارے چراغ پھونک دیے
کروڑوں آنکھوں سے منزل کے خواب چھین لیے
گلاب و صندل و سنبل کے چاہنے والے
نشاطِ موسمِ گُل سے ہیں اس طرح محروم
کہ ان کے جسم پہ اب تارِ پیرہن بھی نہیں
مرے چمن کے تہی دامنوں کا حال ہے زار
غموں کی رات بڑی بے کلی سے کٹتی ہے
مگر کچھ اہلِ ہوس، اہلِ اقتدار و نشاط
گلی گلی میں قناعت کا درس دیتے ہیں
یہ خشک ہونٹوں کو جب دیکھتے ہیں محفل میں
چمن کی عزت و حرمت کا نام لیتے ہیں
یہ رُت اگر رہی یونہی تو غم نصیبوں کو
پھر ایک بار دل و جاں پہ کھیلنا ہوگا
پھر ایک بار بنامِ حیات و بیداری
مرے رفیقو! تمہیں درد جھیلنا ہوگا

نصیر پرواز

چنگاری

کھڑا ہوں میں درمیانِ صحرا
ہر ایک جانب بچھی ہوئی ہے
وہ ریت جس میں نمو نہیں ہے
نہ پھل نہ پتے نہ سبزہ و گل
نہ سیلِ ارماں نہ موجِ خواہش
تباہیاں ہی تباہیاں ہیں
سراب کے بے شمار منظر
نہ کوئی رستہ نہ کوئی رہبر

میں سوچتا ہوں کبھی تو پوچھوں
خدائے برتر سے جا کے آشنا
وہ کون سی مصلحت ہے جس نے
زمیں کو تقسیم کر دیا ہے
کہیں کوئی جنتوں کی وادی
تمام دلکش تمام رنگیں
کہیں سلگتی ہوئی فضائیں
ترس رہی ہیں کہ بوند کوئی
اداس ہونٹوں پہ آ کے ٹھہرے
دلہن کی مانند کوئی بدلی
بصد ادا گر یہاں سے گزرے
یہ اس سے پانی کی بھیک مانگیں
انھیں بھی ارمان ہے کھلائیں

جوار کی لالہ زار فصلیں
سفید گیہوں، لذیذ چاول
گلاب اور موتیا کی خوشبو
حسین بیلوں کے بکھرے گیسو
انھیں بھی حسرت ہے دل کا جادو
غرور سے ان کو گدگدائے
بڑی ادا سے انھیں منائے
یہ تشنہ روحیں یہ پیاسی آنکھیں
وفا کے ساغر سے مست ہو کر
جوان بن کر حسین ہو کر
اناج کے بے شمار دانے
تمام عالم کو نذر کر دیں

مگر کوئی بھولا بھٹکا بادل
کبھی نہ جلتی زمیں سے گزرا
نہ کوئی گلِ آرزو کا مہکا
اداس و ویران ہے یہ بستی
جو روزِ اول سے یونہی ہر دم
چتا کی مانند جل رہی ہے
میں دیکھتا ہوں اگر یہ منظر
تو سوچتا ہوں خدا سے پوچھوں
وجودِ صحرا کا راز کیا ہے؟

حامدی کشمیری

پھسل کے چاند گرا اور سیہ گھٹاؤں کی
شکستہ قبر نے اپنے دہن کو باز کیا
خموش و تیرہ دورا ہے پہ یہ عظیم چنار
سیاہیوں کے سمندر میں گھر گیا، ڈوبا
سکوتِ نیم شبی میں کہیں یہ ماتم کی
صدائیں اٹھتی ہیں، برفیلی انگلیاں غم کی
قریب آ کے مری روح کو مسلتی ہیں
بس اک ستارہ ہے لے لو آنکھ میں آنسو
کہاں بھٹکتی ہے تیری نظر مسافرِ شب
میں تیری دنیا ہوں مجھ کو اگر تو پہچانے
الٰہی خیر، یہ بوڑھے چنار کی آواز
ہوا کا جھونکا تھا شاید ہوا سے ٹکرایا
نہیں یہ سیکڑوں آوازیں ہیں جو ٹکرائیں
برس برس گئے آئینہ خانوں پر پتھر
یہ سنگ باریاں رو کو، میں زور سے چیخا
چنار تھم سا گیا، کائنات گیر وجود
ابھر رہے ہیں ہر اک سمت دو تین کھنڈر

ہیں بھٹکی روحوں کے جن میں سیاہ پوش جلوس
طویل راہوں پہ دم روکے شب کے سناٹے
شکست خوردہ امیدوں کے واپسیں لشکر
عمیق غاروں میں گرتے ہیں لڑکھڑاتے ہوئے
خموش رات میں کوئی صدا نہیں آتی
اجاڑ لمحے، پُر اسرار سائے، ویرانے
دھوئیں میں ڈوبے سسکتے ہوئے سیہ خانے
اسی چنار کے سائے میں ہم شبِ مہتاب
ملے تھے اور تری پلکوں پہ اشک سلگے تھے
چراغ جلتے رہے رات کے دریچوں پر
لپٹ لپٹ گیا شاخِ چنار سے مہتاب
وہ لمحہ جب ترے چہرے پہ چاند اتر آیا
چنار نور کی مشعل کی طرح جلنے لگا

میں اب اکیلا ہی بیٹھا ہوں اس چنار کے پاس
چنار ظلمتِ شب کی یہ کائنات بسیط
اسی میں گم ہے نہیں میرے چاند کی دنیا

صہبا متھراوی

اے اچھّے مُسافر

(کراچی میں اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" سے خطاب)

آ ۔ حسن و محبت کی پناہیں چوموں
تو دیکھ کے آیا ہے مرا اُجڑا دیار

آ ۔ صدق و وفا کی بارگاہیں چوموں
آ ۔ میں تری خاموش نگاہیں چوموں

کیسا ہے بتا ؛ میری محبت کا دیار
دے اذنِ سخن اپنی نگاہوں کو ذرا

وہ محفلِ عشرت وہ جوانی کا مزار
اے اچھّے مسافر تری نظروں کے نثار

کیسا ہے بتا ؛ عشق کا "وہ تاج محل"
بہتی تھی جہاں شعروادب کی جمنا

کھلتے تھے جہاں میری مُرادوں کے کنول
ہر گوشہ مہکتا تھا جہاں نظم و غزل

اب جائے تو کہنا مری الفت کے سلام
مٹنے سے جو باقی ہوں محبت کے نقوش

برسوں کے خلوص اور عقیدت کے سلام
اُن چوم کے کہنا انہیں حسرت کے سلام

کہنا مرے اک طورِ فروزاں سے سلام
جو وقت کی آندھی سے کبھی بجھ نہ سکی

کہنا مری اک مشعلِ عرفاں سے سلام
کہنا مری اُس شمعِ درخشاں سے سلام

کہنا مرے اُجڑے ہوئے میخانوں سے
اک میکشِ دیرینہ نے بھیجا ہے سلام

کہنا مرے ٹوٹے ہوئے پیمانوں سے
اخلاص سے اعجاز سے ارمانوں سے

اے اچھّے مسافر تری آمد کے نثار
تو دیکھ کے آیا ہے مرا اُجڑا دیار

رونق دکنی

سمجھوتہ

وہی خلش کہ جو دل میں تھی آرزو بنکر
نظر میں آج ہے بیتاب جستجو بن کر

وہ اک جمود کہ جہدِ طلب پہ حاوی تھا
رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا لہو بن کر

وہ اک ادا، جو تھی غارتگرِ متاعِ قرار
رہی ہے شوقِ فراواں کی آبرو بن کر

وہ اک حجاب، جو تھا باعثِ شکستِ جمال
شکستہ حال ہے بیگانۂ رفو بن کر

وہ اک فریب، جو شرمندۂ خلوص رہا
وفا کی گود میں ہے جوششِ نمو بن کر

وہ اک نگاہ جو آلودۂ رعونت تھی
لنڈھا رہی ہے مئے سرخوشی سبو بن کر

وہ اک خیال، جو الجھن میں مبتلا تھا کبھی
ہے آج عطر فشاں زلفِ مشک بو بن کر

وہ ایک پیار، جو بیگانۂ تخاطب تھا
ہے آج "آپ" سے "تم" اور "تم" سے "تو" بن کر

وہ اک شعورِ جفا رنگ تھا جو کفر بدوش
ہے سجدہ ریز بصد عجز قبلہ رو بن کر

وہ اک تبسمِ بے ساختہ جو تھا مفقود
ہے آج قہقہہ بردوش صلح جو بن کر

وہ خامشی، کہ جو تھی غیرتِ سکوتِ مرگ
قبولِ فہم ہے، اندازِ گفتگو بن کر

وہ درد جس سے کبھی زرد رو تھے دل کے کنول
ہے گلفشاں وہی تسخیرِ رنگ و بو بن کر

گذر رہے ہیں بصد کشمکش مرے دن رات
بہ فیضِ تلخیٔ دوراں، بہ اہتمامِ حیات
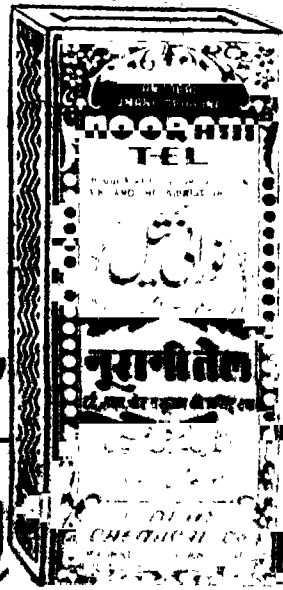
مُسافرو ......

آپ کا تعاون ٹرینوں میں

آگ

سے بچا سکتا ہے

آگ سے بچاؤ کے لئے

مندرجۂ ذیل حفاظتی قاعدے اپنائیے۔
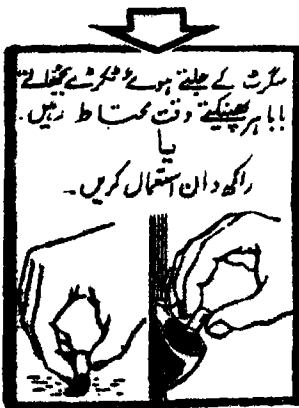
سینٹرل ریلوے کے ذریعہ سفر میں حفاظت کی خاطر شائع کیا گیا

کرشن چندر

جامن کا پیڑ

افسانے

رات کو بڑے زور کا جھکڑ چلا۔ سکریٹریٹ کے لان میں جامن کا ایک درخت گر پڑا۔ صبح جب مالی نے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی دبا پڑا ہے!

مالی دَوڑا دَوڑا چپراسی کے پاس گیا۔ چپراسی دوڑا دوڑا کلرک کے پاس گیا۔ کلرک دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ سپرنٹنڈنٹ دوڑا دوڑا باہر لان میں آیا۔ منٹوں میں گرے ہوئے درخت کے نیچے دبے ہوئے آدمی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔!

"بے چارا! جامن کا پیڑ! کتنا پھلدار تھا"۔ ایک کلرک بولا!

"اور اِس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں!" دوسرا کلرک یاد کرتے ہوئے بولا۔

"میں پھلوں کے موسم میں جھولی بھر کے لے جاتا تھا۔ میرے بچے اِس کی جامنیں کتنی خوشی سے کھاتے تھے"۔ تیسرا کلرک تقریباً آبدیدہ ہو کر بولا۔

"مگر یہ آدمی ——؟" مالی نے دبے ہوئے آدمی کی طرف اِشارہ کیا ——!

"ہاں۔ یہ آدمی ——!" سپرنٹنڈنٹ سوچ میں پڑ گیا۔

"پتہ نہیں زندہ ہے کہ مر گیا؟" ایک چپراسی نے پوچھا۔

"مر گیا ہوگا، اتنا بھاری تنا جس کی پیٹھ پر گرے وہ بچ کیسے سکتا ہے؟" دوسرا چپراسی بولا۔

"نہیں، میں زندہ ہوں!" دبے ہوئے آدمی نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا ——!

"زندہ ہے!" ایک کلرک نے حیرت سے کہا۔

"درخت کو ہٹا کر اِسے جلدی سے نکال لینا چاہیئے"۔ مالی نے مشورہ دیا۔

"مشکل معلوم ہوتا ہے"۔ ایک کاہل اور موٹا چپراسی بولا۔ "درخت کا تنا بہت بھاری اور وزنی ہے!"

"کیا مشکل ہے؟" مالی بولا۔ "اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب حکم دیں تو ابھی پندرہ بیس مالی چپراسی اور کلرک لگا کر درخت کے نیچے سے دبے ہوئے آدمی کو نکالا جا سکتا ہے!"

"مالی ٹھیک کہتا ہے"۔ بہت سے کلرک اک دم بول پڑے۔ "لگاؤ زور۔ ہم تیار ہیں"!

اک دم بہت سے لوگ درخت کو اُٹھانے پر تیار ہو گئے!

"ٹھہرو!" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "میں انڈر سکریٹری سے مشورہ کر لوں!"

سپرنٹنڈنٹ انڈر سیکریٹری کے پاس گیا۔ انڈر سیکریٹری ڈپٹی سکریٹری کے پاس گیا۔ ڈپٹی سیکریٹری جائنٹ سکریٹری کے پاس گیا۔ جائنٹ سکریٹری چیف سکریٹری کے پاس گیا۔ چیف سکریٹری منسٹر کے پاس گیا ۔ منسٹر نے چیف سکریٹری سے کچھ کہا۔ چیف سکریٹری نے جائنٹ سکریٹری سے کچھ کہا۔ جائنٹ سکریٹری نے ڈپٹی سکریٹری سے کہا۔ ڈپٹی سکریٹری نے انڈر سکریٹری سے کہا۔ فائل چلتی رہی۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا ـــ!

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ ہو گئی تھی ۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے ۔ کچھ من چلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر درخت کو خود سے ہٹا دینے کا تہیہ کر رہے تھے کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ فائل لئے بھاگا بھاگا آیا۔ بولا۔

"ہم لوگ خود سے اس درخت کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمۂ تجارت سے متعلق ہیں اور یہ درخت کا معاملہ ہے جو محکمۂ زراعت کی تحویل میں ہے ۔ اس لئے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمۂ زراعت میں بھیج رہا ہوں وہاں سے جواب آتے ہی اس درخت کو ہٹوا دیا جائے گا ـــــ!

دوسرے دن محکمۂ زراعت سے جواب آیا۔ کہ درخت محکمۂ تجارت کے لان میں گرا ہے اس لئے اس درخت کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ تجارت پر عائد ہوتی ہے !

یہ جواب پڑھ کر محکمۂ تجارت کو غصہ آگیا۔ انہوں نے فوراً لکھا کہ پیڑوں کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ زراعت پر عائد ہوتی ہے ۔ محکمۂ تجارت کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے !

دوسرے دن بھی فائل چلتی رہی۔ شام کو جواب آگیا۔ ہم اس معاملہ کو ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک پھلدار درخت کا معاملہ ہے اور اگری کلچرل ڈیپارٹمنٹ صرف اناج اور کھیتی باڑی کے معاملوں میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہے ۔ جامن کا پیڑ ایک پھلدار پیڑ ہے ۔ اسلئے یہ پیڑ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے !

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو دال بھات کھلایا ـ حالانکہ لان کے چاروں طرف پولس کا پہرہ تھا کہ کہیں لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کے درخت کو خود سے ہٹوانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک پولس کانسٹیبل کو رحم آگیا۔ اور اس نے مالی کو دبے ہوئے آدمی کو کھانا کھلانے کی اجازت دے دی !

مالی نے دبے ہوئے آدمی سے کہا ـــ "تمہاری فائل چل رہی ہے۔ امید ہے، کل تک فیصلہ ہو جائیگا"!

دبا ہوا آدمی کچھ نہیں بولا۔

مالی نے پیڑ کے تنے کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "خیریت گزری کہ تنا تمہارے کولہے پر گرا۔ اگر کمر پر گرتا تو ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔"!

دبا ہوا آدمی پھر بھی کچھ نہیں بولا ۔

مالی نے پھر کہا۔ "تمہارا یہاں کوئی وارث ہے تو مجھے اس کا اتہ پتہ بتاؤ۔ میں انہیں خبر دینے کی کوشش کروں گا"!

"میں لاوارث ہوں"۔ دبے ہوئے آدمی نے بڑی مشکل سے کہا۔

مالی افسوس ظاہر کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔!

تیسرے دن ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے جواب آگیا ۔ بڑا کڑا جواب تھا۔ اور طنز آمیز ـــ ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ کا سکریٹری ادبی مزاج کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لکھا تھا "حیرت ہے۔ اس سمے جب ہم "درخت اگاؤ" اسکیم

بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے سرکاری افسر موجود ہیں جو درختوں کو کاٹنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک پھلدار درخت کا۔ اور وہ بھی جامن کے درخت کو جس کے پھل عوام بڑی رغبت سے کھاتے ہیں ؟

ہمارا محکمہ کسی حالت میں اس پھلدار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا — !

"اب کیا کیا جائے ؟ — ایک منچلے نے کہا۔ "اگر درخت کاٹا نہیں جا سکتا، تو اس آدمی کو کاٹ کر نکال لیا جائے" !

"یہ دیکھیے" اس آدمی نے اشارہ سے بتایا۔ "اگر اس آدمی کو عین بیچ میں سے یعنی دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے تو آدھا آدمی اِدھر سے نکل آئے گا۔ آدھا آدمی اُدھر سے باہر آ جائیگا۔ اور درخت وہیں کا وہیں رہے گا — !

"مگر اس طرح سے تو میں مر جاؤں گا" ! دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی ٹھیک کہتا ہے" ! ایک کلرک بولا۔

آدمی کو کاٹنے والی تجویز پیش کرنے والے نے پُرزور احتجاج کیا۔ "آپ جانتے نہیں ہیں۔ آجکل پلاسٹک سرجری کتنی ترقی کر چکی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اگر اس آدمی کو بیچ میں سے کاٹ کر نکال لیا جائے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے دھڑ کے مقام پر اس آدمی کو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے" !

اب کے فائل کو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ نے فوراً اس پر ایکشن لیا۔ اور جس دن فائیل اُن کے محکمے میں پہنچی۔ اُسکے دوسرے ہی دن انہوں نے اپنے محکمے کا سب سے قابل پلاسٹک سرجن تحقیقات کے لئے بھیج دیا۔ سرجن نے دبے ہوئے آدمی کو اچھی طرح ٹٹول کر، اُس کی صحت دیکھکر، خون کا دباؤ، سانس کی آمد و رفت، دل اور پھیپھڑوں کی جانچ کر کے رپورٹ بھیجدی کہ اس آدمی کا پلاسٹک آپریشن تو ہو سکتا ہے اور آپریشن کامیاب ہو جائیگا۔ مگر آدمی مر جائے گا — !

لہٰذا یہ تجویز بھی رَد کر دی گئی !

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لُقمے ڈالتے ہوئے اُسے بتایا۔ "اب معاملہ اُوپر چلا گیا ہے — سُننے میں آیا ہے کہ کل سکریٹریٹ کے سارے سیکریٹریوں کی میٹنگ ہو گی۔ اُس میں تمہارا کیس رکھا جائیگا۔ اُمید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا" !

دبا ہوا آدمی ایک آہ بھر کے آہستہ سے بولا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

مالی نے اچنبھے سے منہ میں اُنگلی دبائی۔ حیرت سے بولا۔ "کیا تم شاعر ہو" ؟

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

دوسرے دن مالی نے چپراسی کو بتایا۔ چپراسی نے کلرک کو۔ کلرک نے ہیڈ کلرک کو۔ تھوڑے ہی عرصے میں سکریٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ اس کی خبر شہر میں بھی پھیل گئی اور شام تک محلّے محلّے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سکریٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا اور دبے ہوئے آدمی کے گرد ایک مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سکریٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سکریٹری تک جنہیں ادب اور شعر سے لگاؤ تھا۔ رُک گئے، کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی

کو اپنی غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ کئی کلرک اُس سے اپنی غزلوں پر اصلاح لینے کے لئے مصر ہونے لگے!

جب یہ پتہ چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے تو سکریٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے لہٰذا اس فائل کا تعلق نہ ایگری کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے ہے نہ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے بلکہ صرف کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے ــ کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی کہ جلد سے جلد اس معاملے کا فیصلہ کرکے بدنصیب شاعر کو اس شجر سایہ دار سے رہائی دلائی جائے!

فائل کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکاڈمی کے سکریٹری کے پاس پہنچی۔ بے چارہ سکریٹری اسی وقت اپنی گاڑی میں سوار ہوکر سکریٹریٹ پہنچا اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا ــ!

"تم شاعر ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں!" دبے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔

"کیا تخلص کرتے ہو؟"

"اوسؔ!"

"اوسؔ؟" ــ سکریٹری زور سے چیخا ــ "کیا تم وہی اوسؔ ہو، جسکا مجموعۂ کلام "اوس کے پھول" حال ہی میں شائع ہوا ہے!"

دبے ہوئے شاعر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم ہماری اکاڈمی کے ممبر ہو؟" سکریٹری نے پوچھا۔

"نہیں ــ!"

"حیرت ہے!" سکریٹری نے زور سے چیخا۔ اتنا بڑا شاعر۔ "اوس کے پھول" کا مصنف اور ہماری اکاڈمی کا ممبر نہیں ہے۔ اُف اُف ــ! کیسی غلطی ہوگئی ہم سے، کتنا بڑا شاعر اور کیسے گوشۂ گمنامی میں دبا پڑا ہے"؟

"گمنامی میں نہیں۔ ایک درخت کے نیچے دبا ہوں۔ براہ کرم مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکال لیجئے ــ!"

"ابھی بندوبست کرتا ہوں"۔ سکریٹری فوراً بولا۔ اور فوراً جاکر اُس نے اپنے محکمے میں رپورٹ کی!

دوسرے دن سکریٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا اور بولا۔ "مبارک ہو۔ مٹھائی کھلاؤ۔ ہماری سرکاری اکاڈمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا ہے۔ یہ لو پروانۂ انتخاب!

"مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو"! دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا ــ

اُس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید تشنج اور کرب میں مبتلا ہے!

"یہ ہم نہیں کرسکتے!" سکریٹری نے کہا۔ "اور جو ہم کرسکتے تھے، وہ ہم نے کردیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کرسکتے ہیں کہ اگر تم مرجاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو۔ تو ہم وہ بھی کرسکتے ہیں!"

"میں ابھی زندہ ہوں"۔ شاعر رُک رُک کر بولا۔ "مجھے زندہ رکھو!"

"مصیبت یہ ہے" سرکاری ادبی اکاڈمی کا سکریٹری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ کہ "ہمارا محکمہ صرف کلچر سے متعلق ہے۔ درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں آری کلہاڑی سے متعلق ہے۔ اُس کے لئے ہم نے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے اور ارجنٹ لکھا ہے!"

شام کو مالی نے آکر دبے ہوئے آدمی کو بتایا۔ "کل فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آکر اس درخت کو کاٹ دیں گے۔ اور تمہاری جان بچ جائیگی ـــ!

مالی بہت خوش تھا۔ دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے لئے لڑے جارہا تھا۔ کل تک، صبح تک .... کسی نہ کسی طرح اُسے زندہ رہنا ہے!

دوسرے دن جب فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آری کلہاڑی لے کر پہنچے۔ تو اُن کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا۔ محکمۂ خارجہ سے حکم آیا تھا کہ اس درخت کو نہ کاٹا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومت پی ٹونیا کے وزیر اعظم نے سیکریٹریٹ کے لان میں لگایا تھا اب اگر یہ درخت کاٹا گیا تو اس امر کا شدید اندیشہ تھا کہ حکومت پی ٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لئے بگڑ جائیں گے۔!

"مگر ایک آدمی کی جان کا سوال ہے"! ایک کلرک غصّے سے چلاّیا۔

"دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے"! دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو سمجھایا..... "اور یہ بھی تو سمجھو کہ حکومت پی ٹونیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔ کیا ہم اُن کی دوستی کی خاطر ایک آدمی کی زندگی کو بھی قربان نہیں کرسکتے؟"

"شاعر کو مرجانا چاہیئے!"

"بلاشبہ!"

انڈر سکریٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا۔ "آج صبح وزیر اعظم دورے سے واپس آگئے ہیں۔ آج چار بجے محکمۂ خارجہ اس درخت کی فائیل اُن کے سامنے پیش کرے گا۔ جو وہ فیصلہ دیں گے وہی سب کو منظور ہوگا ـــ!"

شام کے پانچ بجے خود سپرنٹنڈنٹ شاعر کی فائیل لے کر اُس کے پاس آیا۔ "سنتے ہو؟" آتے ہی وہ خوشی سے فائیل کو ہلاتے ہوئے چلاّیا ـــ "وزیر اعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ اس واقعہ کی ساری بین الاقوامی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا۔ اور تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلوگے!

"سنتے ہو؟ آج تمہاری فائیل مکمل ہوگئی!" سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کے بازو کو ہلا کر کہا۔

مگر شاعر کا ہاتھ سرد تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے جان۔ اور چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اُس کے منہ میں جارہی تھی......!

اُسکی زندگی کی فائیل بھی مکمل ہوچکی تھی!

کوثر چاند پوری

بازی گر

جس رفتار سے دن چڑھ رہا تھا، بالکل اُسی انداز سے کام میں تیزی اور مزدوروں میں سرگرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی، سو ڈیڑھ سو مزدور سُرخ چیونٹوں کی مانند سروں پر مٹی کی ڈلیاں رکھے ایک قطار میں آگے پیچھے رینگ رہے تھے۔ ایک طرف کھدائی ہو رہی تھی دوسری طرف سڑک پر مٹی ڈال کر اسٹیم رولر چلایا جا رہا تھا۔ انجن کی چھک چھک، دھک دھک اور مزدوروں کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ نے ماحول میں دُور تک زندگی سی بکھیر دی تھی، تھوڑے فاصلہ پر کچا بندھ بنا کر ندی کی دھار روک دی گئی تھی اور ندی کی رُکی ہوئی دھار کو ہرے بھرے درختوں کے سائے میں اس طرح لیٹی تھی جیسے کوئی چنچل اور سرکش قسم کی دوشیزہ گھر سے بھاگتے وقت پکڑلی گئی ہو اور اب کُنبہ کے بڑے بوڑھوں کے پیروں میں نہایت عاجزی کے ساتھ لوٹ رہی ہو، اُس کی بے چین مگر اسیر موجیں رہائی کی درخواست کر رہی تھیں قریب ہی میدان میں مہوے کے درخت تھے، ان کے نیچے تین ٹینٹ گڑے ہوئے تھے، ان کی چھتیں سونے کی طرح پیلی تھیں جیسے ان کے اوپر آسمان سے سونے کی بارش ہو چکی ہو، ان سے دو جریب کے فاصلہ پر ساٹھ ستر جھونپڑیاں تھیں جن کے آگے مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے بچے یوں کُلبلا رہے تھے جیسے کھیت میں ننھے ننھے پودے سر ابھار رہے ہوں۔ جگہ جگہ چُولھے بنے ہوئے تھے، ان کے پیٹ میں اسوقت تھوڑی تھوڑی راکھ ہی تھی، سیٹھ دھنی رام کا نوجوان داماد مانک چند کالی کور کی دودھ سے زیادہ سفید دھوتی پر اتنا ہی اُجلا ململ کا کُرتہ پہنے سر کے ریشمی بالوں میں سیدھی مانگ نکالے ایک بیڑ کی چھاؤں میں کھڑا اپتلی سی پگڈنڈی پر آگے پیچھے رینگتے ہوئے مزدوروں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اُس کا خیال تھا کہ ان کے سروں پر مٹی سے بھری جو ڈلیاں رکھی ہوئی ہیں وہ جلد ہی نوٹوں سے بھر جائیں گی پھر یہ سب نوٹ سیٹھ دھنی رام کے اُس لاکر کے پیٹ میں دفن ہو جائیں گے جو بینک میں رکھا ہوا ہے اور کسی کو نہیں معلوم کہ اس میں اب تک کتنے نوٹ جمع ہو چکے ہیں۔ مہوے کی شاخوں میں ہوا سے جُنبش ہوتی تو مانک چند کو ایسا لگتا جیسے سر پر شراب کی بوندیں ٹپک پڑی ہوں اور حواس پر نشہ چھا جاتا۔

مانک چند کا نام اِسی سال ٹھیکہ داروں کی لِسٹ میں درج ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ قسم کے ٹھیکہ دار بھی حیران رہ گئے تھے کہ ان کے مقابلہ میں اس روڈ کے لئے دھنی رام مانک چند کا ٹینڈر منظور ہو گیا تھا حالانکہ اُنھوں نے بھی اپنی تجوریوں کو داؤں پر لگا دیا تھا، شانتا نے نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ سب ہاتھ ملتے رہ گئے اور پانسہ دھنی رام، مانک چند کے نام پڑا، مانک چند کو صوبہ کی راجدھانی میں آئے ابھی بہت زمانہ نہیں گذرا تھا اتنے ہی عرصہ میں اُس نے سیٹھ کی ہدایت سے کئی ڈنر دے ڈالے تھے، ان میں بڑے بڑے افسروں نے شرکت کی تھی، انتظامات کی دیکھ بھال مانک چند کی بیوی

شانتا ہی کیا کرتی تھی، وہ سیٹھ دھنی رام کی اکلوتی اور بیحد خوبصورت لڑکی تھی، رنگین ساری میں ملبوس اور ایوننگ اِن پیرس میں معطر وہ اپنے پتلے اور یاقوت کی طرح سُرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتی تو دھنک سی کھل جاتی، مہمانوں کی آنکھوں میں چکا چوند آجاتی کہ وہ کانٹے کی جگہ چھری مُنہ میں ڈال لیتے، چیف انجینئر نے پہلے ہی ڈنر پر مانک چند سے پُوچھا

کیا دھندا کرتے ہیں آپ سیٹھ مانک چند جی؟

اس نے مُسکرا کر جواب دیا

دھندا کوئی نہیں کرتا۔ سوچ رہا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد کئی آوازیں سُنائی دیں۔

پریس لگائیے، میں آپ کی پُوری سہائتا کروں گا۔

لکڑی کا کاروبار بڑا جاندار ہے، ایک جنگل نیلام ہونے والا ہے۔

اسٹیشنری سپلائی کرنی چاہیئے آپ کو، مانک چند جی اس کے لئے بڑا میدان ہے۔

فرنیچر کا ایک کارخانہ ضرور ہونا چاہیئے یہاں۔

آخر میں چیف انجینئر نے سوئیٹ ڈش میں چمچہ مارتے ہوئے کہا

ہمیں ایک اچھا ٹھیکہ دار چاہیئے جو روڈ کنسٹرکشن ROAD CONSTRUCTION سے دلچسپی رکھے آپ بہت اسمارٹ معلوم ہوتے ہیں۔

اور یہی تجویز مانک چند کے دل میں اُتر گئی، اُس نے سوچا سیٹھ نے بھی گھر چھوڑتے وقت پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے ٹھیکوں کی تعریف کی تھی۔

مانک چند کو بڑی آسانی سے پانچ لاکھ کا ٹھیکہ مل گیا، سیٹھ دھنی رام خبر ملتے ہی دیس سے چل پڑے اصل سرمایہ دار وہی تھے۔ مانک چند اُن کے کارکن یا منیجر کی حیثیت رکھتا تھا، شانتا کے علاوہ سیٹھ کے کوئی اولاد نہ تھی، اس کی شادی تھوڑے ہی دن پہلے مانک چند سے ہو گئی تھی، وہی سیٹھ کی جائداد کا مالک بننے والا تھا۔ لیکن سیٹھ جیتے جی اُسے کچھ دینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ مرنے کو بھی تیار نہ تھے، دو چار سال پہلے کروڑپتی بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے اب نہ جانے کیا بننے جا رہے تھے۔ مانک چند کو وہ جس دھندے پر لگاتے اس کی نگرانی خود کرتے، جو سڑک مانک چند کو بنانی تھی وہ شہر سے بہت دُور تھی طے یہ ہوا کہ سیٹھ کا ہیڈ کوارٹر شہر ہی میں رہے گا اور مانک چند موقع پر قیام کرے گا، دھندا بالکل نیا تھا مانک چند نقشہ کی لائنیں تک نہ پہچانتا تھا، اس کی امداد کے لئے ایک تجربہ کار اوورسیر رکھ لیا گیا۔ مانک چند اور وہ دونوں جمال کھیڑہ چلے گئے جو صرف "کھیڑہ" بھی کہلاتا تھا، تحصیل کے کاغذات میں اس کا نام۔ جمال کھیڑہ کلاں" لکھا ہوا تھا، یہ بہت چھوٹا گاؤں تھا اور ندی کے کنارے ہی آباد تھا۔ اوورسیر نے موقع پر پہونچ کر نقشہ دیکھا ضروری پیمائش کی، پڑاؤ کے لئے جگہ کا انتخاب کیا، گاؤں کے سامنے ہی کئی درکا پُل بنانا تھا۔ اوورسیر نے مشورہ دیا کہ ایک طرف سڑک پر مٹی ڈالنے اور رولر چلانے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے دوسری طرف بنیادیں کھود کر پُل کے پائے کھڑے کر دئے جائیں تاکہ برسات تک چھت ڈالی جا سکے اور مزدوروں کی آمد و رفت میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو۔ ندی جس پر پُل بنایا جانے والا تھا، بہت بڑی نہ تھی برسات میں پاٹ ضرور چوڑا ہو جاتا تھا اسی وجہ سے پُل کی لمبائی زیادہ رکھی گئی تھی، اگلے ہفتہ شانتا باپ کے ساتھ کام دیکھنے آئی، وہ یہاں آکر بہت خوش ہوئی، اُس کے لئے یہ دنیا بالکل نئی بھی تھی اور دلچسپ بھی، شام کے سُرمئی

دھندلکے پھیل جانے پر وہ ٹینٹ سے نکلی اور جنگل میں منگل دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ مزدوروں کی چھوٹی سی
بستی سے جیون دھارا اُبل رہی تھی، جگہ جگہ چولھوں میں آگ جل رہی تھی اور پیڑوں کی چوٹیوں پر گاڑھے دھوئیں
کا ایک ایسا آکاش بنتا جا رہا تھا جسے شانتا اپنا ہی سمجھ رہی تھی، شاید اِس لئے کہ دھوئیں کے اِسی آکاش نے
اُوپر والے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کو زمین تک پہونچنے سے پہلے ہی روک لیا تھا، وہ مانک چند
کے ساتھ ٹہلتی ہوئی ندی پر گئی تو یہاں کی خاموش اور سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ فضا میں سانس لیتے ہی
اسے اپنی دوشیزگی یاد آگئی جو اتنی ہی دُھندلی، اور گونگی تھی، اس میں کوئی ہنگامہ نہ تھا کوئی حرکت اور جنبش
نہ تھی۔ تیز ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہی نہ تھا وہ ندی کی اسی دھار کی مانند آگے بڑھنا بھول گئی تھی، مانک چند کو بھی
قُدرت اِسی طرح چُپ چاپ اس کی خلوت میں لے آئی تھی جیسے نوکرانی کھانے کی میز پر آہستہ سے ٹھنڈے پانی کی
بوتل ریفریجریٹر سے نکال کر رکھ گئی ہو، جسے کھانے کے بعد لازمی طور پر گلاس میں اونڈیل کر مُنہ سے لگا لینا ہو ——
مانک چند سچ مچ ٹھنڈے پانی کی بوتل ہی تھا۔ اندھیرا ہونے پر ستاروں کی مدّھم روشنی میں وہ دونوں کیمپ میں آگئے
جہاں پیٹرومیکس لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی جگمگا رہی تھی، ایک ٹینٹ میں سیٹھ کا پلنگ لگا دیا گیا تھا وہ بستر پر
لیٹ چکے تھے اور ایک مزدور مُٹھی چاپی کر رہا تھا، بغیر مالش کرائے سیٹھ کو نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ دوسرے خیمہ میں
مانک چند اور شانتا کے بستر لگائے گئے تھے تیسرا جو ان دونوں سے زیادہ آراستہ تھا خالی پڑا تھا، دو چار دن کے اندر
ہی صاحب کا دورہ ہونے والا تھا یہ تیسرا ٹینٹ اسی کے لئے لگایا اور سجایا گیا تھا، دعوت کا سامان شانتا اپنے ساتھ
لے آئی تھی۔ شراب کی چند بوتلیں بھی بڑی احتیاط سے لائی گئی تھیں۔ سیٹھ نے عمر بھر شراب چکھی تک نہ تھی، وہ عورت
اور شراب دونوں کی لذّت سے ناواقف ہی تھے۔ عورت کو کسی زمانہ میں دوا کے طور پر گلے سے اُتارا بھی تھا، مگر شراب
سُونگھی تک نہ تھی، دوسروں کو ضرور پلائی تھی، ایک دلفریب شام کو جب سُورج کافی ڈھل چکا تھا، اور مویشی گاؤں
کی سمت لوٹنے لگے تھے، کچے راستے پر دُھول کے مرغولے ناچنے لگے۔ پھر موٹر کا ہارن بجا، سب نے جان لیا کہ صاحب
آرہا ہے، مانک چند نے مزدوروں، کاریگروں اور میٹوں کو سلام کے لئے لائن میں کھڑا کر دیا۔ اِن سے کچھ آگے
سیٹھ دھنی رام جی اور داماد سے بھڑ کر کھڑے ہوگئے۔ انجینئر نے موٹر ذرا آہستہ ہی کی تھی کہ مانک چند نے دوڑ کر
کھڑکی کھولی، دھنی رام جی نے سلام کرنے کے بعد مہکتا ہوا ہار گلے میں ڈال دیا۔ انجینئر نے ہنستے اور دانت نکالتے ہوئے
شانتا کی جانب دیکھا اور ہاتھ جوڑ دئے۔

کھانے کا انتظام شانتا نے خود کیا، سیٹھ دھنی رام ڈنر ٹیبل پر نہیں آئے، مانک چند اور شانتا نے پینے اور کھانے
میں انجینئر کا ساتھ دیا، میز پر بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں، مانک چند پُل کے کاموں کے متعلق اور سیر سے بات کرنے لگا،
اور شانتا صاحب کو لطیفے دکھاتی رہی، اُس نے صاحب کو ان اُلجھنوں سے بھی آگاہ کیا جو کام کے آگے بڑھانے میں رُکاوٹ
بنتی جا رہی تھیں، اُس نے انھیں دُور کرنے کا وعدہ کیا، اور ایک رننگ بل RUNNING BILL کی منظوری
دی، صبح کو پل اور سڑک کا معائنہ کرنے کے بعد انجینئر واپس چلا گیا۔ مہینے بھر کے اندر ہی اس کے کئی چکر ہوگئے اس کے
آنے کی اطلاع پاتے ہی شانتا بھی شہر سے کیمپ میں آجایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ کیمپ نہیں آسکی تو صاحب کا مُوڈ
بگڑ گیا، اس نے کھانا نہیں کھایا، کام پر چند اعتراضات بھی کردئے اور بل سے کچھ رقم کاٹ دی۔ اگلی مرتبہ شانتا نے
سب کچھ ٹھیک کر لیا، بل بھی درست کر دیا گیا، ایک مرتبہ مزدوروں نے مانک چند کی شکایت کر دی کہ وہ کھیتوں کی پیمائش
صحیح نہیں کرتا، ان کے پیسے کم بنتے ہیں، اِس کی تحقیقات کے لئے شانتا خود انجینئر کو لے کر آئی، شکایت بالکل جھوٹی نکلی۔

صاحب نے پچاس مزدوروں کو کام سے ہٹا دیا، وہ دوسرے ٹھیکہ دار کے یہاں لگ گئے۔ تین روز بعد انھیں وہاں سے بھی بھگا دیا گیا۔ آخر بڑی مشکل سے انھوں نے بالی جی کو راضی کر کے اپنا قصور معاف کرایا۔

شانتا نے انجینئر کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا، کوئی اُلجھن پیدا ہو جاتی تو وہی اسے سلجھاتی، بلوں کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو شانتا صاحب سے فون پر بات کر کے اُسی دن چیک جاری کرا لیتی، اکثر ایسا ہوتا کہ انجینئر کیمپ میں آتا اور کھانے سے منٹ کر شانتا سے کہتا آپ میژرمینٹ بک MEASUREMENT BOOK چیک کرنے میں میری مدد کریں گی اور جب تک یہ کام ختم نہ ہوگا، یہیں بیٹھی میرے ساتھ جاگتی رہیں گی۔

وہ کافی پڑھی لکھی تھی، انجینئر کو اس کے ساتھ جاگنے اور کام کرنے میں بڑا لطف آتا۔

مئی جون کی شدید گرمی میں پڑاؤ تنور بن گیا، دو بجے کے بعد زمین دہکنے لگتی، اُوپر سے بھی آگ برستی رہتی، شانتا کو گرمی کی تاب نہ تھی، اُس نے اور سیٹھ دھنی رام نے ایک روز بھی بے ضرورت پڑاؤ میں ٹھہرنا پسند نہ کیا، انجینئر دَورے پر آتا تو اُسی دن دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے بُلا لیا جاتا۔ انجینئر بھی ان کی تکلیف کے خیال سے اکثر شام ہی کو آتا جب ماحول ذرا ٹھنڈا ہو جاتا، برسات قریب آگئی تھی، ٹھیکہ دار نے پُوری توجہ پُل پر لگا دی تھی۔ مزدوروں اور کاریگروں کی تعداد دوگنی کر دی گئی تھی۔ پتھر اور گٹی ڈھونے پر دس بارہ ٹرک لگے ہوئے تھے، اسی دَوران میں انجینئر کا تبادلہ ہو گیا، اُس کی جگہ دوسرا انجینئر آیا وہ سرحد کا رہنے والا تھا اور بہت سخت تھا۔ پہلا معائنہ کرتے ہی اُس نے پُل کا نصف پایہ گرانے کا حکم دے دیا۔ اِس پر بڑی گڑبڑ ہوئی۔ دھنی رام جی شانتا کو لیکر آئے، لیکن نئے انجینئر نے حکم تبدیل نہیں کیا۔ دھنی رام اور شانتا کی ساری اپیلیں بیکار گئیں۔ اُس نے ڈنر قبول کرنے سے انکار کر دیا، ٹھیکہ دار سے شراب کی بوتلوں کا تحفہ لینا بھی پسند نہ کیا۔ کام کے متعلق جتنی باتیں اُس نے کیں مانک چند ہی سے کیں، شانتا کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا، اس نے باپ سے شکایت کی۔

بڑا بُڈھا ہے انجینئر، میں کبھی اِس سے بات نہیں کروں گی! سیٹھ دھنی رام مایوسی کے عالم میں اپنی لمبی چٹیا میں گرہیں لگاتے رہے مُنہ سے کچھ نہ بولے۔

دوسرے تیسرے دَورے پر صاحب ذرا نرم پڑا اور اس نے مانک چند کو مطمئن کیا کہ اُس کا جس قدر نقصان ہُوا ہے وہ کسی اور طرح پُورا کر دیا جائے گا، چوتھی مرتبہ وہ کیمپ میں آیا تو مانک چند نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا کھانا تیار ہے!

آج میں ضرور تمہارے ڈیرے پر کھانا کھاؤں گا۔

تیسر اپوئنٹ پہلے ہی سے انجینئر کے لئے مخصوص تھا، انجینئر تبدیل ہوا تھا پوئنٹ نہیں بدلا تھا، اتفاق سے سیٹھ دھنی رام بھی اس دن وہیں موجود تھے مگر شانتا نہیں تھی، اُسے اب کیمپ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

کھانے کی میز پر آتے ہی انجینئر نے ہنس کر کہا

تم ساتھ دوگے مانک چند جی، یہ بات سب کو معلوم ہے کہ میں نان ویجی ٹیرین ہوں!

کوئی بات نہیں، مانک چند نے جواب دیا

ڈنر کی میز پر شراب بھی تھی، مانک چند نے انجینئر کا پُورا ساتھ دیا، وہ بہت خوش ہوا اُس نے آفس پہونچتے ہی دھنی رام مانک چند کا ایک اور ٹینڈر منظور کر دیا۔ اُس کے نرخ بہت اچھے تھے، دھنی رام کی کوفت دُور ہو گئی وہ اب بڑی خوشی سے جال کھیرتے آئے تھے مگر شانتا کو منا کر یہاں لانے میں کامیاب نہ ہوئے وہ اِس ماحول ہی سے اکتا گئی تھی۔

اور لوٹ کر پھر دوشیزگی کی اُسی اُداس فضا میں پہونچ گئی تھی، جسے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی، دھنی رام انجینئر کے آنے سے پہلے ہی مٹھائی، پھل اور شراب وغیرہ لیکر کیمپ میں آجایا کرتے تھے، اب اُنھیں یہاں کی گرمی بالکل نہیں ستاتی تھی۔ ایک روز شام ہی کو انجینئر دَورے پر پہونچ گیا، دھنی رام وہیں تھے، برسات قریب آگئی تھی، پُل مکمل کرنے کی دُھن سب ہی پر سوار تھی، مزدوروں کے جھونپڑوں پر ٹین اور سیمنٹ کی چادریں ڈال دی گئی تھیں، مانک چند نے اپنے لئے مندر میں رہنے کا ٹھکانا کرلیا تھا مگر اب تک وہ ٹینٹ ہی میں تھا کوئی بھرپُور بارش ابھی نہیں ہوئی تھی کام نہایت تیزی سے ہو رہا تھا مزدوروں کی ایک نئی مدد بُندیلکھنڈ سے بلالی گئی تھی، وہ پہاڑ کی جڑیں گویا توڑنے پر لگی ہوئی تھی۔ پُل پر چھت ڈالنے کا وقت آگیا تھا سانچے تیار ہو چکے تھے، ان کے اُوپر لوہا بچھایا جارہا تھا، مزدور ہرنوں کی ڈار کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، وہ سیمنٹ، پتھر، اینٹیں اور دوسری چیزیں سروں پر اُٹھائے دوڑ رہے تھے۔ کوئی بھاری گارڈر اُٹھایا جاتا تو مزدور بہت زور سے چیخنے لگتے، انجینئر سرگرمی کا یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوا، آسمان ابرآلود تھا اُس نے واپسی کا پروگرام منسوخ کردیا، رات کو ٹینٹ ہی میں رہ پڑا، پُل کے متعلق اوورسیر کو بہت سی ہدایات دیں، یہ بھی بتایا کہ اچانک مینہ برس جانے کی صورت میں بیچ کے دو تین پہرے بالکل صاف کردئے جائیں، کھانے کا انتظام مانک چند ہی کی طرف سے تھا، کھانے کے بعد انجینئر گیارہ بجے تک کام میں مشغول رہا، دھنی رام اور مانک چند باہر کرسیوں پر بیٹھے رہے عجب ہوا میں ذرا خنکی آگئی تو انجینئر نے خیمہ کا پردہ گرا دیا اور مانک چند کو آنے کا اشارہ کیا، وہ جلدی سے اُدھر چلا۔ سیٹھ دھنی رام بھی پیچھے پیچھے چلے۔

انجینئر نے دونوں کو آتے دیکھ کر کہا

سیٹھ تم آرام کرو، مانک چند کو نقشہ لیکر آنے دو!

نقشہ دھنی رام کے ہاتھ میں تھا، اُنھوں نے مانک چند کو دے دیا اور مانک چند نگاہیں نیچے کئے اندر جانے لگا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ سیٹھ دھنی رام کا داماد نہ ہو اُن کی لڑکی ہو اور دھنی رام اُس چابکدست بازیگر کی طرح مانک چند کو اندر جاتے دیکھتے رہے جو کبوتر کو خرگوش بنا کر مجمع سے پیسے اکٹھے کیا کرتا ہے۔

کرتار سنگھ دُگّل

۲۷ مئی دو بجے بعد دوپہر

بکھرے بکھرے بال، پھٹی پھٹی آنکھیں، مُنھ پر اِدھر اُدھر چپکی ہوئی دال، باہر برآمدے میں بیٹھی گووندی، آپ سے آپ گاتی جارہی ہے۔

"بلیئے روئیں گی، چپیڑ کھائیں گی
چُپ کرکے گڈی دیچ بیٹھ جا"
(گوری، اگر روئے گی تو چانٹا پڑے گا، چُپ چاپ گاڑی میں بیٹھ جا)

ٹین کے ڈبّہ پر تال دیتی، سر ہلاتی، پھٹی ہوئی آواز میں گووندی گاتی بھی جاتی ہے، ہنستی بھی جاتی ہے۔

"کون ہے چانٹا مارنے والا؟ کوئی مار کے تو دیکھے؟ نہرو راجے کا راج ہے!"

گاتے گاتے گووندی، آپ سے آپ بولنے لگتی ہے۔

"..... مارے گا تو چانٹا کھالوں گی۔ ایک طرف مارے گا، دوسرا گال سامنے کردوں گی! ..... چانٹا مارے گا! مار کے تو دیکھے! میرے مرد کو نہیں جانتا؟ میں نے نہرو کو چِٹھی لکھ دی ہے۔ میرے گھر والا مجھے ڈھونڈھ دے۔ میرا مرد پتہ نہیں کہاں جا ڈوبے ہیں نگوڑے!"

"بلیئے روئیں گی، چپیڑ کھائیں گی!"

جیسے پھٹی ہوئی ڈھولک ہو، اپنی بے سُری آواز میں گاتی ہوئی گووندی مُڑ مُڑ کر کمرے کی طرف دیکھتی ہے، ریڈیو کیوں نہیں بج رہا؟ ہر روز صبح، ہر روز دوپہر، ہر روز شام، برآمدے میں آکر بیٹھ جاتی ہے، ریڈیو سُننے کی شوقین! جتنی دیر ریڈیو بجتا رہتا ہے، گووندی برآمدے میں سے نہیں ہلتی، پھیل کر بیٹھی رہتی ہے کئی سال ہوئے ریڈیو پر شرنارتھیوں کے لئے سندیس براڈکاسٹ ہوتے تھے۔ کئی سال ہوئے یہ سندیس براڈکاسٹ ہونے بند ہوگئے، لیکن گووندی کا پاگل پن، وہ اب بھی اسی انتظار میں ہے کہ اُس کے لئے کوئی سندیس ضرور سُنایا جائے گا۔

"بلیئے روئیں گی چپیڑ کھائیں گی"

گاتے گاتے گووندی، ہر بار پلٹ کر جب کمرے کی طرف دیکھتی ہے، اُس کی پھٹی ہوئی قمیص میں سے اُس کا انگ نظر آنے لگتا ہے۔ گوری کی سوکھی ہوئی چھاگل جیسی چھاتیاں، گووندی کا نیم برہنہ انگ کوئی نئی بات نہیں۔ گلی، محلے میں کس نے نہیں اُسے دیکھا ہوگا۔؟ کبھی قمیص اُدھڑی ہوئی ہے، کبھی گریباں پھٹا ہوا ہے۔ اُسے یوں بے حال دیکھ اڑوس پڑوس کی عورتیں آٹھویں دسویں روز بعد اُس سے کپڑے بدلوا دیتیں۔ لیکن گووندی پھر ویسی کی ویسی ہوتی۔

ٹوٹے ہوئے بٹن، گھسا پھٹا آنگا، مُنچا گھوا پاجپا۔

"بلیٹے رومیں گی چیپڑ کھائیں گی"

شاید ریڈیو چلنے میں ابھی کچھ وقت ہے گوونڈی بغل میں سے پُرانے اخباروں کے پُلندے کو کھول، ایک ایک ورق کو تہہ کر رہی ہے جو کوڑے کے ڈھیر پر سے اُٹھائے، لوگوں کے ردّی خط پتروں کے پلندے کو ایک ایک کر کے دیکھتی ہے، جیسے پڑتال کر رہی ہو۔ بچہ اِس طرح سرہلاتی ہے، جیسے نہ اخبار کے کاغذوں میں اور نہ ہی کسی خط پتر میں اپنا سندیس ملا ہو۔ پھر گوونڈی اناپ شناپ بکنا شروع کر دیتی ہے۔ سندیس نہ بھیجنے والوں کے ماں باپ کو رونے پیٹنے لگ جاتی ہے۔

"گوونڈی" تو نے پھر بکنا شروع کر دیا! میری بیوی، اُسے ڈانٹتی ہے۔ گوونڈی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور جو آگے بڑھ کر میری بیوی ریڈیو کھول دیتی ہے۔ اُس نے آزما کر دیکھا ہے، اور کوئی چیز گوونڈی کو چُپ نہیں کرا سکتی۔ ریڈیو سُنتے ہی جیسے وہ سب کچھ بھول جاتی۔

مجھے گوونڈی پر بڑا ترس آتا ہے۔ خاص طور پر اُس دن سے، جب میں نے اُسے ایک چانٹا دے مارا تھا۔ بات یوں ہے، میں باہر دورے سے لوٹا تھا۔ اندر گھر کا مرد آرام کر رہا ہو تو کوئی ریڈیو کیسے چلائے؟ گوونڈی کو ایک بار سمجھایا گیا، دوبار سمجھایا گیا، لیکن اُس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ وہ گالیاں بکنے لگی۔ ریڈیو کیوں نہیں کھولتے؟ اُس کا سندیس براڈ کاسٹ ہو گیا تو کون ذمّہ دار ہو گا؟ کوئی بات بھی ہوئی!" گوونڈی بکے جا رہی تھی۔ کوئی بات بھی ہوئی" میں جا کر نہرو سے کہوں گی۔ میرا سندیس نہیں سنواتے مجھے!" یوں گوونڈی بک جھک کر رہی تھی، کہ غصہ سے اُبلتا ہُوا میں اپنے بستر پر سے اُٹھا اور برآمدے میں بیٹھی گوونڈی کے مُنہ پر ایک زنّاٹے کا چانٹا جڑ دیا۔ پانچ کی پانچ اُنگلیاں اُس کے گال میں کھُب گئیں اور گوونڈی ہکا بکا میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ خیرہ آنکھیں بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہو لیا۔ اُس پگلی کو کیا پتہ، وہ کیا کر رہی تھی، کیا کہہ رہی تھی۔ میں بھی اُس کے ساتھ دیوانہ ہو گیا تھا۔ سارا دن، گوونڈی برآمدے میں پتھر بنی چُپ چاپ پڑی رہی، نہ کچھ کھایا نہ کچھ پیا۔ سانجھ ہونے کو آئی جب میں کسی کام سے باہر گیا، میری بیوی نے گوونڈی کی منّت سماجت کر کے اُسے منا لیا۔

کوئی سالوں سے گوونڈی اسی بستی میں رہ رہی ہے۔ کوئی کہتا یہاں سے آئی، کوئی کہتا وہاں سے۔ مگر اصل بات یہ ہے، شرنارتھیوں کا ایک قافلہ سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے قافلہ کسی وجہ سے رُکا اور گوونڈی سڑک کے کنارے ذرا سے پانی پینے چلی گئی۔ پانی پی کر مڑی تو دیکھا، کمبخت ٹرک والے، ٹرک چلا کر چل دئے تھے۔ شاید جان بُوجھ کر اِس دیوانی سے اُنہوں نے پیچھا چھڑایا ہو۔ اور پھر گوونڈی اسی بستی کی ہو گئی۔ ہمیشہ یہی کہتی، اُسے آ کر کوئی لے جائے گا۔ اُس کے نام ریڈیو پر سندیس سُنایا جائے گا۔ نہرو راجے کا راج ہے، کوئی مذاق تھوڑی ہے! بار بار یہی کہتی اور دن بھر گلیوں میں سے پُرانے پوسٹ کارڈ ڈھونڈتی رہتی یا پھر اخباروں کے ٹکڑے سمیٹتی رہتی۔

بستی کے جو لوگ گوونڈی کے پاگل پن سے تنگ آ کر اُسے پاگل خانے چھوڑ آتے۔ چار دن، اور وہ لوٹ آتی۔ "ہم تو آ بھی گئے!" گھر گھر جا کر کہتی۔ "ہم تو آ بھی گئے! ہم تو آ بھی گئے! نہرو راجے کا راج ہے قانون مجھے بند کر سکتا ہے؟ ہم تو آ بھی گئے!" اور بستی کی عورتیں سر پیٹ کر رہ جاتیں۔

عجیب عجیب کہانیاں، گوونڈی کے پاگل پن کے بارے میں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا کسی نے اُسے کچھ کھلا دیا ہے۔ کوئی کہتا اُس پر کسی نے ٹونکا کر دیا ہے، کوئی کہتا عشق کی ماری ہوئی ہے۔ جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ گوونڈی سُندر بھی تو کتنی تھی۔

ابھی تک آثار باقی تھے، اپنے زمانے میں ایک پری سی رہی ہوگی۔ اُس کا گورا رنگ، انگ انگ کی بناوٹ، اُونچا لمبا قد بت۔

گووندی کی اصل کہانی بڑی دل دوز تھی۔ ملک کی آزادی کے دنوں میں جو لہو کی ہولی کھیلی گئی تھی، گووندی اسکا شکار ہے۔ گووندی کے گاؤں میں جب فسادی داخل ہوئے، گووندی کے گھر میں اس کا مرد تھا، دو بیٹے تھے، ایک بیٹی تھی۔ آنگن میں گھستے ہی فسادیوں نے گووندی کو اپنے گھر والوں سے الگ کر دیا، گووندی، علاقہ بھر میں جس کے حسن کا چرچا رہا۔ اور ایک ایک کر کے اُس کے خاندان کے ہر فرد کو اُس کی آنکھوں کے سامنے نیزوں پر اُچھال دیا گیا... گووندی کے گھر والے کو، گووندی کی بیٹی کو اور گووندی کے دونوں بیٹوں کو!

اور اُس رات کہنے والے کہتے ہیں، شراب میں بدمست اوندھے پڑے فسادیوں کے مُنہ پر تھوک کر، گووندی وہاں سے بھاگ نکلی۔ بھوکی، پیاسی کئی دن جنگلوں میں گھومتی رہی۔ اُس کے پاؤں کانٹوں سے چھِل گئے۔ اُس کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ پھر ایک فوجی ٹکڑی کی نظر اُس پر پڑی۔ اور وہ اُسے شرنارتھی کیمپ میں لے آئے۔

وہ دِن اور آج کا دِن، گووندی آپ سے آپ بولتی رہتی ہے۔ چُپ ہوتی ہے تو گھنٹوں پتھر کی بت بنی رہتی ہے۔ نہ کھانے کی سُدھ نہ پینے کا ہوش۔

اڑوس پڑوس کی عورتیں اُس کی اُڑسی ہوئی شلوار کو نیچے کھینچ کھینچ کر، اُس کی پنڈلیوں کو ڈھانپتی رہتیں۔ اُس کے بٹن بند کر کے اُس کی چھاتیوں کو چھپاتی رہتیں، پھر بھی اُس کا کوئی نہ کوئی انگ ان ڈھانپا رہتا۔

"گووندی! تُو عورت ذات کا کوئی پردہ رہنے دے گی کہ نہیں"؟ گلی محلے کی عورتیں اُسے کوستیں۔

"ہیں! یہ کیا۔ برآمدے میں بیٹھی، ریڈیو سُن رہی، گووندی سامنے سڑک پر جھاڑو دے رہی جمعدارنی کے بچّے کو اُٹھا لائی ہے اور اپنا دودھ اُس کے مُنہ میں دے رہی ہے۔ سُوکھی، بچکی چھاتیاں ——— بچّہ بار بار سر ہلاتا ہے اور مُنہ بسورنے لگتا ہے۔ لیکن گووندی اُس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور پھر بچّے کی ماں آ کر، گووندی سے اپنا بچّہ چھین لیتی ہے۔ گووندی من من کی گالیاں تول رہی ہے۔ جمعدارن کے ماں باپ کو گن رہی ہے۔ کتنی گندی، کتنی بھدّی بھدّی گالیاں، توبہ توبہ!! اور گووندی کا ایک پستان جو اُس نے جمعدارن کے بچّے کے مُنہ میں دیا تھا، ویسے کا ویسا ہی گریباں سے باہر لٹک رہا ہے۔

میری بیوی اُسے سمجھاتی ہے، میں اُسے سمجھا رہا ہوں، لیکن گووندی ایک سانس گالیاں بکے جا رہی ہے۔ اور پھر اچانک ریڈیو کا پروگرام روک کر، آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کوئی اعلان کرتا ہے: "بھارت کے پردھان منتری جواہر لال نہرو چل بسے.......!!!"

ریڈیو پر یہ خبر سُن کر ہم سب کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی ہے۔ میاں بیوی، ہم دونوں ریڈیو میں سر دیے کر سُن رہے ہیں! "صبح سویرے اُن کی چھاتی میں درد اُٹھا اور وہ بے ہوش ہو گئے.....!"

درد بھری آواز میں اعلان جاری ہے۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے جیسے ہمیں سُنائی دینا بند ہو جاتا ہے۔ ایدھر بھر گلی محلوں، بستی بھر میں ایک ہاہاکار مچ جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ باہر سڑک پر آمد و رفت کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ موٹروں اور اسکوٹروں کے ہارن چلا رہے ہیں۔ گھبرائے ہوئے، پریشان قدم تیز تیز اُٹھ رہے ہیں۔ دوکانیں بند ہو رہی ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں باہر بوندیں پڑنے لگی ہیں۔

اور میں مُڑ کر گو وندی کی طرف دیکھتا ہوں۔ جہاں بیٹھی تھی، وہیں کی وہیں بیٹھی ہے۔ چھل چھل اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں جیسے کوئی باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ روئے جا رہی ہے... روئے جا رہی ہے، جیسے کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔

آنسو کسی کی آنکھوں میں روکے نہیں رُکتے۔ ریڈیو سے بار بار اعلان ہوتا ہے۔ بار بار جیسے کوئی کلیجہ نوچ کر الگ کر رہا ہو۔

چھل چھل آنسو روتی، گو وندی نے باہر لٹکتی چھاتی قمیص کے اندر کر لی ہے۔ چھل چھل آنسو روتی گو وندی قمیص کے بٹن بند کر رہی ہے۔ چھل چھل آنسو روتی گو وندی مُنہ پر بکھرے بالوں کو سنبھال لیتی ہے۔ چھل چھل آنسو روتی گو وندی کے چہرے پر اِدھر اُدھر چپکی ہوئی دال دُھل گئی ہے۔ چھل چھل آنسو روتی گو وندی کی پلکیں، جو آٹھوں پہر بھیگی بھیگی رہتی تھیں مُند گئی ہیں، جیسے کوئی سالوں سے سویا ہُوا، اچانک جاگ جائے، گو وندی کے چہرے پر سے وحشت، ویرانگی اور پاگل پن کے آثار ہٹ گئے ہیں۔

اور پھر گو وندی، اُونچی لمبی نازنین، ہولے ہولے اُٹھ کر میری بیوی کے پاس آتی ہے۔ "چلو بہن، نہرو جی کی کوٹھی چلیں!" میری بیوی حیران ہو رہی ہے۔ گو وندی کو جیسے کبھی کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ ایک بھلے چنگے انسان کی طرح باتیں کر رہی ہے "پنڈت جی کے درشن کرنے چلتے ہیں، باہر سے ٹیکسی لے لیں گے۔" اور گو وندی نے اپنے دوپٹے کے پلّو کے ساتھ بندھے پانچ روپے کے نوٹ کو میری بیوی کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہے۔ پُرانا گِھسا ہوا فرنگی کے زمانے کا نوٹ، جیسے گو وندی کتنے سالوں سے سنبھال سنبھال کر رکھے ہوئے تھی۔

اور پھر گو وندی کی نظر آئینہ پر جا پڑتی ہے۔ "ہائے میں مَری! یہ حال میں نے کیا بنا رکھا ہے اپنا؟" اُس کے مُنہ سے اچانک نکلتا ہے۔ "توبہ توبہ جیسے کوئی پاگل ہو!"

مہندر ناتھ

رسمِ اُلفت

جب کبھی کپور کا کسی سے لڑائی جھگڑا ہوتا، تو انھیں ضرور دَورہ پڑتا۔ یہ دَورہ بھی عجیب وغریب سا ہوتا۔ لوگوں کو جب دورہ پڑتا ہے تو وہ اکثر بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ لیکن کپور کو جب دَورہ پڑتا تو وہ رونے لگتے۔ دس پندرہ منٹ رو دھو کر وہ خود بخود خاموش ہوجاتے۔

آج جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو وہ رو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید کپور صاحب کا میری بیوی سے جھگڑا ہوا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی، صرف لکھنؤ سے خط آیا ہے۔ بے حد اصرار کے بعد کپور صاحب نے بتایا کہ اُن کے بھائی کیلاش نے بلایا ہے۔

کیا بات ہے؟

"کیلاش سخت بیمار ہے" یہ کہہ کر وہ رونے لگے۔ میں نے اُنھیں چُپ کرانے کی کوشش کی، مگر کپور کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اتنا تو ضرور جانتا ہوں کہ کیلاش کپور کا چھوٹا بھائی تھا اور کپور کیلاش کا بڑا بھائی۔ ان دونوں بھائیوں کا عجیب وغریب مزاج تھا۔ چھوٹے بچوں سے اتنا پیار کہ ماؤں کی ممتا بھی ان کے آگے شرما جائے۔ دلوں میں بے حد خلوص اور پیار ـــــ دوسروں کے لئے اتنا قربانی کا جذبہ کہ جس کی مثال آجکل ذرا کم ہی ملے گی۔ تقریباً تین سال ہوئے جب کیلاش پہلی بار ہمارے یہاں آیا تھا۔ قد میں اپنے بھائی سے بڑا تھا۔ مگر اپنے بڑے بھائی کا بڑا احترام کرتا حتیٰ کہ اپنے بڑے بھائی کے سامنے سگریٹ نہ پیتا۔ اُونچی آواز میں بات تک نہ کرتا۔ حالانکہ دونوں بھائیوں کی عمر میں تین چار سال کا فرق ہوگا۔

جب تک کیلاش ہمارے یہاں رہا، میں نے یہ محسوس کیا کہ کیلاش کو گھر کے کام کاج کرنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں ایک کے بجائے دو نوکرانیاں تھیں۔ پھر بھی وہ میری بیوی سے کہتا ـــــ "بھابی جی آج میں کھانا پکاؤں گا" بازار سے جاکر سبزیاں لاتا۔ اُنھیں صاف کرکے دھوتا اور کاٹ کر چولھے پر چڑھاتا۔ جب کھانا تیار ہوجاتا تو خود پلیٹیں صاف کرکے کھانا پروس کر رکھتا۔ کھانا اتنا لذیذ ہوتا کہ بڑے بڑے خانساماں کیلاش کے آگے پانی بھرنے لگیں۔ تقریباً دو مہینے کیلاش ہمارے یہاں ٹھہرا۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ لایا۔ کبھی کبھار ذکر کرتا تو صرف اپنے بڑے بھائی کے بچوں کا یا بھابی کا۔

کھانا کھلاتے ہوئے کہتا۔ منجو نے کھانا کھا لیا ہوگا۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ جب تک میں اُسے تھپک کر نہ سلاؤں،

سوتی نہیں۔ بھائی صاحب شیلا کو جب تک پریوں والی کہانی نہ سناؤں وہ جاگتی رہے گی۔ سب سے چھوٹی نوتن یوں ہنسی مسکراتی میری گود میں آجائے گی، جیسے میرے سوا کسی اور کو نہیں جانتی، اسکول سے واپس گھر پہونچتے ہی بچے پوچھنے لگتے۔ "چاچا جی آج کیا لائے؟" میں انھیں میٹھی گولیاں اور ٹافیاں دیتا۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے میری ٹانگوں سے لپٹ جاتے۔ اور میں دن بھر کی تھکن بھول جاتا۔

کیلاش نے جب کبھی بات کی تو صرف اپنے بھائی کے بچّوں کی۔ وہ خود کنوارا تھا۔ نہ کپور نے شادی کی تھی نہ کیلاش نے۔ بڑا بھائی کچھ سال ہوئے دل حرکت اچانک بند ہوجانے سے مرگیا تھا۔ اور اپنے پیچھے ایک بیوی اور گیارہ بچوں کی لمبی قطار چھوڑ گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد، بڑے بھائی نے ان دونوں بھائیوں کو بیٹوں کی طرح پالا۔ کپور جب جوان ہوا تو اُس نے بمبئی کا رُخ کیا۔ کیلاش اپنے بڑے بھائی کے پاس رہ گیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسکول میں ٹیچر ہو گیا۔ یوں شادی کون نہیں کرنا چاہتا؟ کون اپنا گھر بسانا نہیں چاہتا؟ کون نہیں چاہتا کہ وہ عورت کے جسم سے پیار نہ کرے۔ اسی قسم کی تمنائیں کس کے دل میں پیدا نہیں ہوتیں؟ مگر جب حالات موافق نہ ہوں اور گھر میں بڑے بھائی کے گیارہ بچے اور ایک بیوی مُنھ کھولے بیٹھی ہو اور جب رسمِ وفا خون میں رچ جائے تو شاید اس قسم کے انسان اپنی ذاتی خواہشوں کو کچل دیتے ہیں۔ اور وہ محض دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔

کپور بمبئی میں رہ کر اپنی آمدنی کا زیادہ حصّہ اپنی بھابی کو بھیجتا رہا۔ اور کیلاش نے قسم کھائی کہ وہ اپنی ساری زندگی اس خاندان کے پالنے پوسنے میں صرف کردے گا۔ جب کبھی میں اس قسم کے پیار اور ایثار کی بات سنتا ہوں تو ـــــ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

در اصل انسانی زندگی میں پیار اور قربانی کے جذبے کو کہیں تو ختم ہونا چاہیئے؟ پچھلے کئی دنوں سے کیلاش کے خط پر خط آرہے تھے۔ "بھائی صاحب میں سخت بیمار ہوں، آپ آکر مل جائیے۔ اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کوئی ڈاکٹر کہتا ہے تمہیں ٹی بی ہے۔ کوئی کہتا ہے جگر خراب ہے اور کوئی کہتا ہے تمہیں کینسر ہے۔"

وہ خط کپور پڑھ کر مجھے سُناتے۔ میں کپور صاحب سے کہتا۔ "آپ جاتے کیوں نہیں۔" وہ مُنھ پھیر کر خاموش سے ہو جاتے۔ اور مجھے بہت غصّہ آتا۔ یہ عجیب و غریب قسم کا بھائی ہے۔ جس کا بھائی موت کے مُنھ میں ہے، پھر بھی اس سے ملنے نہیں جاتا۔

جب کبھی کیلاش کا ذکر آتا تو ایک عجیب قسم کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی۔ یوں کیلاش دیکھنے میں خوبصورت نہ تھا۔ درمیانہ قد، دراز گردن سارنگ۔ قبول صورت، نہایت متین اور سنجیدہ۔ وہ ہنستا بہت کم تھا۔ بلکہ میں نے اُسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک عجیب سی اُداسی اُس کے چہرے پر چھائی رہتی۔ رخساروں کا رنگ زرد زرد سا تھا اور بھائی کے بچّوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ـــــ "کیا آپ جارہے ہیں کپور صاحب ــــ؟"

"جی نہیں۔ ... کیلاش کے علاج کے لئے روپئے منی آرڈر کرادئے ہیں۔"

"روپئے تو آپ نے بھیج دئے ہیں، مگر اُس کا علاج کون کرائے گا ـــــ؟"

"کپور صاحب آپ کا بھائی علاج نہیں کرائے گا۔ اتنا بڑا کنبہ۔ گیارہ بچے۔ ایک بھابی۔ آپ ہی بتایئے وہ اپنے اُوپر کیا خرچ کرتا ہوگا ـــ؟" میں اس سے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

اس سے آگے اور کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا کوئی اپنا مزاج بدل سکتا ہے؟ اگر شرافت خون میں رچ جائے تو کیا کوئی اُسے مٹا سکتا ہے؟ کیا انسان اپنے چہرے کو بدل سکتا ہے؟ رُوح کی آواز کو دبا سکتا ہے؟ یوں تو زندہ رہنے کیلئے

انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ ڈلکے ڈالتا ہے۔ دوسروں کا خون کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کی کمائی کھا جاتا ہے۔ اور یہ انسان اپنی کمائی۔۔۔۔ اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتا ——— یہ کیلاش اپنے لئے گھر کیوں نہیں لیتا ——— ؟ اپنی صحت بنانے کے لئے دودھ کیوں نہیں پیتا ——— ؟ وٹامن کا استعمال کیوں نہیں کرتا ——— ؟ میں تو صاف کہتا ہوں۔ اگر کیلاش زندہ رہے گا، تو اُس کے بھائی کے بچے بھی زندہ رہیں گے۔۔۔۔ خیر میں کیلاش کو خط لکھوں گا ——— بھلے مانس! اپنی ذات پر کچھ خرچ کرو! اپنا علاج کراؤ۔ یہ کیسا پاگل پن ہے؟ یہ کیسا جنون ہے؟ جو تمہارے سر پر سوار ہے!

چار دن کے بعد کیلاش کا خط آیا۔ اُس کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ میں نے کپور صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ کہنے لگے "میں اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس کی بھابی سے لڑائی ہوئی ہوگی۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے لڑکے کو اکثر ڈانٹتا رہتا ہے کہ لکھا پڑھا کرو۔ اور بھابی اس بات پر چڑتی ہیں کہ میرے بیٹے کو کیوں ڈانٹتے ہو؟ وہ بھابی کے سامنے بولتا نہیں۔ وہ کڑھتا رہتا ہے۔ اور پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو نا روپے ملتے ہی اُسکی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ اُسے ایک ہی روگ ہے، اپنے بھائی کے بچوں کو پالنا۔ اپنی رتی بھر پروا نہیں۔"

چند دن اور گذر گئے۔ کپور صاحب کی بھتیجی کا خط آیا کہ "ماتا جی لڑ کے میکے چلی گئیں۔ چاچا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ چلے آیئے نا"۔ کچھ دن اور گذرے ——— ایک پڑوسی کا خط ملا۔۔۔۔۔ کیلاش کی حالت نازک ہے۔ وہ اپنا علاج نہیں کراتے۔ جب میں اُنھیں دیکھنے گیا تو اُن کا بستر سے اُٹھنا محال تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں آخری بار اپنے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔ در اصل بھائی صاحب اِس گھر میں کیلاش کا علاج ٹھیک طرح سے نہیں ہوتا۔ آپ سوچئے اتنا بڑا کنبہ اور اتنی کم تنخواہ۔ وقت پر نہ دودھ نہ انڈا۔ دوا تک نہیں ملتی۔ کیلاش کو چاہیئے کہ مکان چھوڑ کر الگ رہے اور اپنا علاج کرائے۔ ورنہ کیلاش چند دنوں کا مہمان ہے۔ آپ اُسے یہاں سے لے جایئے۔"

کپور صاحب نے وہ خط مجھے دکھایا۔ میں نے کہا آپ کا پڑوسی درست کہتا ہے۔ جب تک کیلاش اُس گھر کو نہیں چھوڑیگا۔ کبھی تندرست نہ ہوگا۔ اُس سے کہئے کہ وہ الگ مکان لے کر رہے۔ اور اپنی بیماری کا علاج کرلے۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔

کپور صاحب نے اُسے شاید لکھ دیا۔ شاید سب کچھ لکھ دیا ——— جو کچھ نہیں لکھنا تھا وہ بھی لکھ دیا۔ اور ساتھ ہی بذریعہ تار منی آرڈر دو سو روپئے بھجوا دیئے۔

چند دن گذرنے کے بعد کیلاش کی ایک لمبی چوڑی چٹھی آئی کہ آپ کا تار منی آرڈر مل گیا۔ اب میری طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ مجھے ٹی بی نہیں ہے اور کینسر بھی نہیں، صرف جگر خراب ہے۔ اِس لئے نیا خون نہیں بنتا۔ اب مسلسل علاج کراؤں گا۔ جہاں تک گھر کے جھگڑے کا تعلق ہے، میں اُس کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بھائی صاحب لڑائی کس گھر میں نہیں ہوتی؟ میرا بھابی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بھابی واپس آگئی ہیں۔ میں نے دو سو روپے اُن کی ہتھیلی پر رکھ دیئے، وہ میری خاطر داری کرتی ہیں اور ہر طرح سے میری دیکھ بھال کرتی ہیں۔ وقت پر دودھ، کھانا اور دوا ملتی ہے۔ اب میں اچھا ہو جاؤں گا۔ ضرور اچھا ہو جاؤں گا۔ فکر نہ کیجئے بھائی صاحب۔۔۔

کپور صاحب نے یہ خط پڑھ کر مجھے سُنایا۔ اور کہنے لگے۔ اُسے بھابی اور بچوں سے بہت پیار ہے۔ وہ اُس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ سب کچھ سُنکر میں غصّے سے بھنا گیا۔ عجیب جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ اُسے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ جتنی تنخواہ ملتی ہے اپنی بھابی اور بچوں پر صَرف کرتا ہے۔ کمبخت نے مرنے کی ٹھان لی ہے ———

کبھی کبھار میں یوں سوچتا ہوں جیسے میں کبھی نہیں مروں گا۔ زندگی سے مجھے اتنی محبت کیوں ہے ـــــ؟ شاید انسان اپنی موت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔ سوچ لے تو شاید کبھی اتنا سنگدل نہ بنے۔ اسی طرح چند ہفتے اور گذر گئے۔ جس طوفان کا مجھے انتظار تھا وہ نہیں آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ کیلاش کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہو گی۔ آجکل کپور صاحب رُوپے بھیجتے۔ کیلاش ضرور اپنی ذات پر صَرف کرتا ہوگا ـــــ ایک دن اچانک کپور صاحب کے نام تار آیا کہ کیلاش بسترِ مرگ پر ہے۔ آپ فوراً آیئے۔

اُس تار کے بعد بھتیجی کا خط آیا کہ کل کیلاش چاچا بے ہوش ہو گئے۔ آج انھیں ہاسپٹل میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اُن کے بائیں پھیپھڑے میں کینسر ہے۔ بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ چاچاجی اِس بار ضرور آیئے گا۔ کیلاش چاچا آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی اُنھیں ہوش آتا ہے تو اُن کے مُنھ سے یہی الفاظ نکلتے ہیں کیا لکھشمن آگئے؟...

(کپور صاحب کو اُن کے عزیز و اقارب لکھشمن کہہ کر پُکارتے ہیں)

اگر وہ نہیں آئے تو میرے لئے کار منگوا دو، میں اُس میں بیٹھ کر بمبئی جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں، میں اُن سے مل کر بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ چاچاجی اِس خط کو تار سمجھ کر فوراً آجایئے۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ایک بار چاچاجی کو دیکھنے ضرور آجایئے۔ پھر دوبارہ آپ کو یہاں آنے کے لئے کبھی نہیں کہوں گی ـــــ

کپور صاحب نے تار پڑھا ـــــ خط پڑھا ـــــ مگر اِس بار دورہ نہ پڑا ـــــ جب انسان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے، تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔

"آپ ضرور جایئے کپور صاحب! کچھ عجب نہیں آپ کو دیکھ کر کیلاش تندرست ہو جائے۔ گو میں معجزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ پھر بھی کیلاش کی زندگی کے لئے اِن توہمات پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

میں جانتا ہوں کپور صاحب اپنے بھائی کی خواہش پُوری نہ کر پائیں گے۔ وہ اپنے بھائی سے ملنا نہیں چاہیں گے۔ اِس لئے نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے ملنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اِس لئے کہ جہاں کپور صاحب کام کرتے ہیں۔ اگر اُسے چھوڑ کر چلے گئے تو وہ کام ہمیشہ کے لئے اُن سے چھُوٹ جائے گا۔ میں خاموش رہا زیادہ زور نہ دے سکا۔ جذباتی رَو میں بہہ کر میں کسی کی زندگی سے کھیلنا نہیں چاہتا۔

دوسری شام میں نے دیکھا کپور صاحب اپنے ٹرنک میں کپڑے رکھ رہے تھے۔ کہنے لگے میں نے روپوں کا انتظام کر لیا ہے۔ اور سوچ لیا ہے کہ اگر یہ کام میرے ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو نکل جائے میں اپنے بھائی کی آخری خواہش ضرور پُوری کرونگا۔ شاید کوئی معجزہ ہو جائے بھائی صاحب۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگے۔

اُسی رات کپور صاحب گاڑی میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ دو دن تک نہ کوئی تار آیا، نہ خط۔ میں نے سوچ لیا کہ کیلاش کی حالت ضرور بہتر ہو گئی ہو گی ـــــ بیسویں صدی میں معجزے بھی ہوتے ہیں۔ شکر ہے پرماتما کا، جس نے کیلاش کو موت کے مُنھ سے بچا لیا۔

اگلے دن جب بستر سے اُٹھا ہی تھا کہ کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا۔ تو سامنے ڈاکیہ کھڑا تھا۔ اگر کیلاش مر گیا ہوتا تو تار آتا۔ اِس چِٹھی میں ضرور لکھا ہوگا، کہ کیلاش کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چِٹھی کھولی ـــــ لکھا تھا۔

"میں پہلی بار کیلاش سے ملنے گیا تھا بھائی صاحب۔ تو وہ بے ہوش تھا۔ اُس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا۔ دوسری بار

(بقیہ صفحہ ۱۴۲ پر دیکھیے)

ست پرکاش سنگر

آدرش اسکول

دھرم آنند ہائی اسکول ہمارے علاقے کا بہترین تعلیمی ادارہ ہے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ لکھی رام جی کا شمار، صوبے کے ممتاز ماہرانِ تعلیم میں کیا جاتا ہے۔ یہ اُن کی اَنتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اسکول نے اتنی ترقی کی ہے اور صُوبے میں ایک خاص جگہ حاصل کی ہے۔ اسکول میں دو ہزار طلبار اور بیس کم ایک سو معلّم ہیں

سردیوں میں اسکول کی گھنٹی صبح نَو بجے بجتی ہے، نَو بجکر پانچ منٹ پر صدر دروازہ بند ہوجاتا ہے، اور شام کے پانچ بجے سے پیشتر نہیں کُھل سکتا۔ ڈسپلن کا یہ حال ہے کہ طلبار تو درکنار، اساتذہ بھی باہر نہیں جاسکتے۔ سَوا نَو بجے دوسری گھنٹی بجتی ہے تاکہ طلبار اور ٹیچرز بیریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے ہوکر پرارتھنا کرسکیں۔ پرارتھنا کے بعد ہی، دن کا معمول شروع ہوتاہے۔ پرارتھنا میں ایشور سے سچ کے پجاری، بہادر اور نڈر بننے کی درخواست کی جاتی ہے۔ پرارتھنا کو عملی جامہ پہنانے کی صبح ہی سے کوشش شروع ہوجاتی ہے۔

اسکول کے دو اصول ہیں جنہیں ہر وقت سامنے رکھا جاتا ہے۔ اعلیٰ ڈسپلن اور عُمدہ نتائج۔ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے طلبار کو سزا دی جائے۔ ایسے طلبار کو پبلک سزا دینے ہی سے اُس کا مطلب پُورا ہوسکتا ہے۔ پرارتھنا کے فوراً بعد ہیڈ ماسٹر صاحب اُن طالب علموں کے نام اناؤنس کرتے ہیں جنھوں نے ایک دن قبل ڈسپلن کی خلاف ورزی کی تھی اور ساتھ ہی اُن کے لئے مستوجب سزا کا اعلان کرتے ہیں۔

"نیکی رام اور پھُولا سنگھ کل آپس میں لڑے۔ اُنھیں پانچ پانچ رُوپے جُرمانہ اور دس دس بیت کی سزا۔"

"ناتھو رام کو ماسٹر دربارہ سنگھ نے کلاس میں سوتے ہوئے پکڑ لیا۔ ناتھو رام کو پانچ بیت اور دو رُوپے جُرمانہ۔"

"ولایت سنگھ دوسا نج کو، ماسٹر بِرتل سہائے طوطا پُوری کی تازہ کٹی مونچھوں پر ریمارکس کسنے کے جُرم میں دو بیت اور ایک روپیہ جرمانہ۔"

"دسوندھا سنگھ سیلو مزارعیہ نے ماسٹر گُلونت رائے جھوکروی کی میلی پگڑی کو دیکھ کر ناک کو یوں سکوڑا جس سے کلاس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اِس جُرم کی پاداش میں دسوندھا سنگھ سیلو مزارعیہ، اسٹوڈنٹ نویں کلاس، سیکشن "ج" کو تین گھنٹے کمرۂ کلاس میں کھڑا ہونے کی سزا اور بارہ آنے جُرمانہ۔"

"ساتویں کلاس کے سبھی ودیارتھیوں کے ماسٹر جگن ناتھ دو دو بیت رسید کریں گے۔ کل ماسٹر جگن ناتھ کے

کمرۂ کلاس میں داخل ہونے پر سبھی طلباء آدھ منٹ دیر سے کھڑے ہوئے۔"

"لالہ گینڈا رام کو برآمدہ میں سے گزرتے دیکھ کر چوہڑ سنگھ بانکوی اور غلام نبی لودھی نے چھینک مارنے کی کوشش کی۔ اس جرم کی پاداش میں اُن دونوں کو دو دو بیت کی سزا۔"

"سبق یاد نہ کرنے پر پانچویں کلاس کے جُملہ طلباء کو دو گھنٹے دیر سے چھٹّی کی سزا۔"

"اسکول کے چپراسی فوجا سنگھ لوہ گھڑی، سے مذاق کرنے پر، گردھاری لعل رانا اور موتا سنگھ اندری کی دوپہر کی چھٹّی اور روٹی بند۔"

تعلیم کا اصول سیدھی قضانت ہے کہ طلباء کو مستوجب سزا دینے سے کترانا نہیں چاہئے اور اس اصول کے تحت لالہ مُکھی رام جی بالکل نہیں کتراتے۔ چانن سنگھ، کلاس فور ملازم، تیل میں بھگوئی ہوئی بیت، ہیڈ ماسٹر کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے، جس طرح مغلئے ہیرو کو تلوار پیش کی جائے۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر سردار گورمکھ سنگھ مرنالوی، باری باری لڑکوں کے نام پکارتے ہیں۔ سزا یافتہ طلباء قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نام پکارے جانے پر، ہر ایک طالب علم آگے بڑھتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، جو جذباتیت سے ایکدم مبرّا رہتے ہیں، ہر لڑکے سے پُوچھتے ہیں۔

"بیت یا جُرمانہ؟"

اسے کہتے ہیں دریا دلی۔ اس کا نام ہے فیّاضی۔ سزا یافتہ لڑکوں کے ساتھ اتنی رعایت برتی جاتی ہے کہ اُنھیں اپنی پسندیدہ سزا کے انتخاب کرنے کی پُوری پُوری آزادی ہے۔ کتنا عُمدہ سسٹم ہے کہ لڑکوں پر سزا ٹھونسی نہیں جاتی۔ جو لڑکا بیت سے پٹنے کے خلاف ہے، وہ بخوشی تمام، پیسے ادا کر سکتا ہے۔ اکثر طلباء بیت کھانے سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی نظر میں یہ اُن کی غلطی ہے، سختی جھیلنے اور جسم کو مضبوط بنانے کے لئے، اس سے بڑھ کر کون سا اچھا طریقہ ہے؟ امیر ماں باپ کی اولاد ہونے کے سبب، کچھ لڑکے بلا ہچکچاہٹ جُرمانہ ادا کر دیتے ہیں۔ کچھ دوستوں کے رحم و کرم پر پلتے ہیں اور اُن سے پیسے لے لیتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اس کارِ خیر کے لئے اُدھار مانگ لیتے ہیں۔ کچھ لڑکے جُرأت مندانہ قدم اُٹھا کر اِدھر اُدھر سے چُرا لاتے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر کچھ ایسے بدقسمت ضرور بچ جاتے ہیں جو اُدھار نہیں مانگ سکتے، چوری کرنے سے خائف رہتے ہیں، والدین کی غُربت کے سبب، جُرمانہ ادا کرنے سے عاجز ہیں، اُنہیں بیت کھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ ایسے لڑکوں کی حالت پر رحم کھا کر ہیڈ ماسٹر صاحب اُن کے جُرمانے کو بیت کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں، ایسا کرنے سے بباطن وہ خوش ہوتے ہیں۔ سختی جھیلنے والے لڑکے آگے جا کر دیش کے لئے ریڑھ کی ہڈّی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ناٹے قد اور کالے رنگ کے لالہ مُکھی رام جی صرف دیکھنے ہی میں سادھارن لگتے ہیں۔ اپنا بایاں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر جب وہ چھڑی کو مجرم لڑکے کے ہاتھ پر مارتے ہیں، تو اپنے اندر زبردست طاقت کا احساس کرتے ہیں۔ اسکول میں یہ مثل مشہور ہے کہ اُنھوں نے ایک دیوی کو اپنے بس میں کر رکھا ہے، وگرنہ ایک سُوکھے شریر والا شخص کہاں سے اتنی شکتی بٹور لا سکتا ہے؟ اور ایک بیت کھانے کے بعد، پاکھر سنگھ جیسے فولادی جسم والا لڑکا بھی درد سے کراہ اُٹھتا ہے۔ دس بیت کھانے والا تو کئی دن تک بستر پر سے نہیں اُٹھ سکتا۔

لالہ مُکھی رام کی ہر پالیسی کے اندر ایک اصول کارفرما ہوتا ہے۔ لڑکوں کو بیتوں سے پیٹ کر وہ اُن کے اندر فولادی قوّت پیدا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی نوجوان آگے جا کر اور مُنھ سے آہ نکالے بغیر بڑی سے بڑی مصیبت کو ہنسی خوشی برداشت کر سکتے ہیں۔ سیکڑوں نہیں، ہزاروں ساتھیوں کے سامنے مار کھا کر، اُن کے اندر سے شرم و حیا کی تہیں ختم ہو جائیں گی اور عملی سیاست میں حصّہ لینے کے لئے کارآمد ثابت ہوں گی۔ تعلیمی معاملوں میں لالہ مُکھی رام جی ودیشی تجربات کو اپنانے میں جلد بازی سے کام لینے کے حق میں نہیں۔ سزا دینے سے بچّے کی پرسنلٹی پر بُرا اثر پڑتا ہے، اُس کی شخصیت پُوری طرح اُبھر کر نہیں آتی، ایسی باتوں کو فضول

جانا کر، وہ اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ جدید طریقۂ تعلیم، پُرانے طریقۂ تعلیم سے بدرجۂ اتم بہتر ہے، وہ ایسی خرافات میں یقین نہیں رکھتے۔ آخر پُرانے طریقۂ تعلیم ہی نے رام اور کرشن، گوتم اور مہاویر، کالی داس اور بھو بھوتی، بھرتری ہری اور بان بھٹ کو عظمت کی بلندیوں پر پہونچایا تھا۔ جہانگیر اور ابوالفضل نے مانٹیسری اسکولوں میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ چندر گپت اور اشوک، علاؤالدین اور اورنگ زیب یوروپین طریقۂ تعلیم کی پیداوار نہیں تھے۔ اگر ہمارا پُرانا سسٹم صدیوں تک کارآمد رہا اور اتنی عظیم شخصیتوں کو پیدا کرتا رہا، تو آج بیسویں صدی کے وسط میں ایکدم ناکارہ کیسے ثابت ہو گیا۔ اُسی سسٹم کو جاری رکھنا ہوگا۔ اُسی کے ساتھ بیت کو اُس کی برتریت عطا کرنی ہوگی۔

شڑاپ! شڑاپ! شڑاپ!

بیتوں کی آواز فضا میں گونج اُٹھتی ہے۔ اِن لڑکوں کو پبلک میں اس لئے سزا دی جاتی ہے تاکہ دوسرے طلباء کے لئے یہ عبرتناک ہو اور وہ ایسے جُرموں کا اعادہ نہ کریں۔ لیکن یہ چھوکرے بھی کتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں، سیکھنے کا نام ہی نہیں لیتے، اُس سے توبہ کرتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ گُستاخ ہوتے جاتے ہیں۔ اِس لئے زیادہ سختی کی ضرورت پڑتی ہے۔ سزا دینا اور بھی لازم ہوتا جاتا ہے۔ نو اور پانچ کے درمیان گیٹ کو پار کرنا، دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کرنا اور ہر ٹیچر کو ہر بار ملنے پر نمستے نہ کرنا جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔ کیریکٹر کو سُدھارنے کے لئے سزا اُتنی ہی لازم ہے، جتنی جسم کے لئے خوراک، اکثر حالات میں اُس سے بھی زیادہ۔

بیتوں کے علاوہ کچھ جرائم صرف جُرمانے کی زد میں آتے ہیں، اِن میں مارپیٹ کی ضرورت نہیں پڑتی جیسے گملے اور شیشے توڑنا، پھولوں کی کیاریوں یا گھاس کے لانوں کو خراب کرنا، پانی والا مٹکا توڑنا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، دیوار کو سیاہی سے کالا کرنا۔

اِس کے بعد ماسٹروں کی باری آتی ہے۔ لالہ مُکھی رام سزا کے بارے میں رُو رعایت نہیں کرتے، مجرم چاہے لڑکے ہوں یا ٹیچرز۔ کلاس میں دیر سے پہونچنے والے، کورس وقت پر ختم نہ کرنے والے، گالی گلوچ سے کام لینے والے، لڑکوں کی کاپیاں نہ جانچنے والے اساتذہ مجرموں کے زُمرے میں شامل نہیں۔ جُرمانہ کے علاوہ ماسٹروں کو سزا نہیں دی جاتی، ہاں، لڑکوں کے سامنے اُن کی بےعزّتی ضرور کی جاتی ہے۔

اس کی کسر وہ لڑکوں پر نکالتے ہیں۔ سادھارن باتوں پر وہ غصّے سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اُس دن سائنس کی کلاس میں ایک آلہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ماسٹر گردھاری لعل ٹوٹا مزاری کو پانچ رُوپیہ جُرمانہ ہو گیا۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی سامنے کی قطار میں بیٹھے برجیے سنگھ کو مُسکراتے دیکھ جل بھُن اُٹھے۔ سائنس کی کلاس میں مُسکرانے سے مطلب؟ تاؤ میں آکر بولے

"کھڑے ہو جاؤ۔"

گیارہ سالہ برجیے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"مُسکرائے کیوں تھے؟"

"جی! ویسے ہی۔"

"کیوں؟ کیا تازہ باپ مرا ہے؟"

"سر! سر! ایسا نہیں کہنا....."

"کیا ایسا نہیں؟ مجھے شِکشا دے رہے ہو؟ مجھے سِکھلانا چاہتے ہو؟ ہاتھ باہر نکالو۔"

اس نے دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔

"تمہارا ہاتھ نیلا کیوں ہے؟"

"سر ا سیاہی گر جانے سے۔"

"سیاہی کیسے گر گئی؟"

"ہاتھ لگ جانے سے۔"

"تو قصور تمہارا نہیں، ہاتھ کا ہے۔ لاؤ اِسے دُرست کر دوں۔"

اتنا کہہ کر اُنھوں نے تڑاک تڑاک بیت لگانے شروع کر دیئے۔ دائیں ہاتھ پر، پھر بائیں ہاتھ پر۔ دائیں پر۔ بائیں پر۔ جب ہاتھ سُوج گئے اور وہ اُنھیں آگے نہ کر سکا، تو ماسٹر جی نے بیت بازوؤں پر چلانی شروع کر دی۔ پھر کندھوں پر۔ لوہے کی نہ ہونے کے سبب، بیت ٹوٹ گئی۔ اِس پر اُنھیں مزید غصّہ آگیا۔ جیسے یہ بھی نریش کا دوش تھا۔ چھڑی ٹوٹ گئی تو کیا؟ مُکّے کیوں نہ استعمال کئے جائیں؟ اُنھوں نے بے تحاشا مُکّے برسانے شروع کئے۔ پانچ منٹ کے بعد بے دَم ہو گئے اور جیسے اِس پروگرام سے اُوب کر، اُسے ختم کرنے کے وچار سے ایک مُکّہ پوری قوت سے، اُس کی ناک پر دے مارا۔ آجکل کے لڑکوں کی ناک بھی کس قدر کمزور ہوتی ہے جو ایک مُکّے کی کراری چوٹ نہ سہہ سکی؟ خون کا فوارہ چھوٹتے ہی نریش بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ضبطِ نفس کا یہ کمال کہ چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں۔ پاکھر سنگھ کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔ پانی آنے پر اُس کے چھینٹے نریش کے مُنھ پر مارے۔ سر پر بھی دھار ڈالی۔ جب وہ ہوش میں آیا تو بولے

"اب اگر سیاہی گرائی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ہاں، لڑکو آج کیا پڑھنا ہے؟"

یونیورسٹی کے طلباء جواب میں کہہ دیتے

"کچھ نہیں آج چھٹی کیجئے۔"

لیکن اسکول کے بچّوں میں اتنا دَم کہاں؟

لڑکوں کے چال چلن اور عادات سُدھارنے کے بارے میں اسکول کے لگ بھگ سبھی ماسٹر درجۂ کمال تک پہونچ چکے ہیں۔ ہندی کے ادھیاپک شری نین سنگھ دیپک ایک آنکھ کے مالک ہوتے ہوئے بھی کوتا کرتے ہیں، بولتے وقت "س" کو "ف" میں بدل دیتے ہیں۔ ایک دن کلاس میں بولے

"تم لوگوں نے فوامی فرودانند کا نام فُنا ہے؟"

"فُنا ہے، ما فٹر جی!" سُریندر نے جواب دیا۔

"کون ہنفا ہے کلاف میں؟"

"کوئی نہیں، پنڈت جی۔"

"تب ہی" پنڈت جی بولے۔ "فوامی فرودانند جی ہمارے دیف کے بہت بڑے مہا پُرف تھے۔ وہ کبھی فے خوف نہیں کھاتے تھے۔ پُولیف فے بھی نہیں۔ ہر فام کو فاڑھے فات بجے فماج کے مندر میں فاندار بھاشن دیتے تھے۔ فُنا فَب نے؟"

"فُنا پنڈت جی۔" نریش نے جواب دیا۔

"فریف! تم ہنفے کیوں؟" پنڈت جی غصّے میں آکر کہنے لگے۔ غصّہ آنے پر اُن کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔ کھ... کھ... کھڑا ہو جا.... دُفٹ کہیں کا! تمہیں ابھی اِف ہنفی کی فزا دیتا ہوں۔ بدمعاف کہیں کا!"

اور اُس کے پاس جا کر اُس کے گالوں پر لگاتار آٹھ دس طمانچے جڑ دیئے۔ گال سُوج گئے۔ بھلا وہ کیوں ہنسا تھا؟
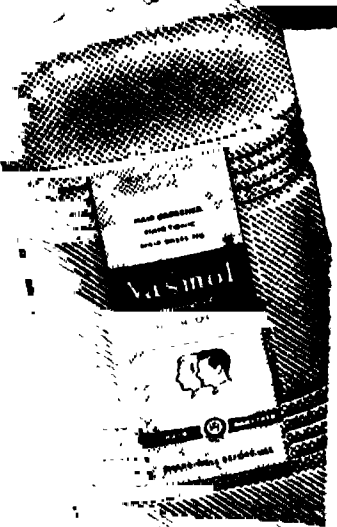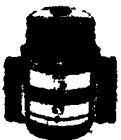
ہر کلاس کا ایک ہیڈ بوائے ہوتا ہے جو ذہانت نہیں، جسامت کے اعتبار سے چُنا جاتا ہے۔ ہر ماسٹر کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اسکول کے بلند ڈسپلن کو برقرار رکھنے کے لئے بیت کا استعمال کرنے سے گریز نہ کرے۔ دراصل یہی اسکا بہترین استعمال ہے۔ ہر ماسٹر اِس ہتھیار کا بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ کئی لڑکے بیت کھانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اسکول میں اُنھیں ڈھیٹ کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ ماسٹر کی غیر حاضری میں ہیڈ بوائے اِس ضمن میں جملہ فرائض بجا لاتا ہے، اور بصد خوشی لڑکوں کی مرمّت کرتا ہے۔ عموماً وہ سمجھدار لڑکا ہوتا ہے اور گھر سے ناشتہ اور کھانا لانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ہر اسٹوڈنٹ اُسے اپنا مہمان بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ لڑکے ماسٹر سے زیادہ، اُس کے مُکّے سے خائف رہتے ہیں۔

اسکول کو جتنی گرانٹ ملتی ہے، اُتنی ہی رقم چندے اور جُرمانے سے وصول کرنی ہوتی ہے۔ جن لڑکوں پر جُرمانہ نہیں ہوتا، اُنہیں چندہ لانے کو کہا جاتا ہے۔ جو پاس ہوتے ہیں، اُنہیں اِس خوشی میں پیسے دینے ہوتے ہیں، جو فیل ہوتے ہیں، اُنہیں اسپیشل کلاس میں آنا ہوتا ہے۔ اس کی فیس صرف دس روپیہ ماہانہ ہے، جس میں سے دو روپیہ ماسٹر جی کو ملتا ہے۔

لالہ مکھی رام جی کے وِچار میں تعلیم اور اسکول کی ترقّی کا معیار، نتائج اور وظائف سے جانا جاتا ہے۔ اور اُن کے اسکول میں ہر سال نوّے فیصدی لڑکے پاس ہوتے ہیں اور پچاس فیصدی لڑکے وظیفے پاتے ہیں۔ شہر کے بڑے افسران، تاجران اور دوسرے لوگ اپنے بچّوں کے کردار کو بلند کرنے، اُن میں ڈسپلن پیدا کرنے اور اُنھیں ذمّے دار شہری بنانے کے بلند ارادے سے اُنہیں آدرش ہیڈ ماسٹر صاحب کے آدرش اسکول میں بھیجنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

انور عنایت اللہ

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اُس دن جوں ہی ڈاکٹر صاحب کا موٹا تگڑا کتا شیخ وفاتی کی کوٹھی میں داخل ہوا میرا ماتھا ٹھنکا۔ شیخ وفاتی نے حال ہی میں یہ شاندار کوٹھی کرائے پر لی تھی اور اُن کی صدر میں گوشت کی بہت بڑی دوکان تھی۔

میں نے فوراً پولیس کو اطلاع دینے کی ٹھانی۔ ڈائرکٹری میں سے میرآباد تھانے کا نمبر ڈھونڈا اور ڈائل کیا۔ چند لمحے گھنٹی بجتی رہی۔ پھر دوسری طرف سے آواز آئی ۔ "ہیلو۔"

"جی۔ مجھے رپٹ لکھوانی ہے فون پر۔ لکھوائی جا سکتی ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"جی کیا فرمایا؟ ——— رپٹ؟ ——— مزید مزید ——— قصّہ کیا ہے؟" پوچھا گیا۔

"اجی جناب قصّہ تشویش ناک ہے۔ میرے پڑوس میں ایک شاندار کوٹھی ہے جس میں شیخ وفاتی ——— جی کیا فرمایا؟ ——— فسادی؟" میں چیخ پڑا۔ "فسادی نہیں جناب۔ شیخ وفاتی وہی جن کی صدر میں گوشت کی بہت بڑی دوکان ہے۔ جناب اُن کی کوٹھی میں ابھی ابھی ایک کتّا داخل ہوا ہے ——— جی؟ مجھے کیا اعتراض ہے؟ ——— اجی صاحب ——— آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔ یہ اُن کی کوٹھی ہے۔ گوشت صدر میں بکتا ہے جو صرف چند میل دور ہے ——— جی؟ مجھے کیا تکلیف ہے؟ ——— دیکھئے انسپکٹر صاحب۔ مجھ سے مذاق نہ کیجئے۔ میں آپ کے سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کر دوں گا۔ تفصیل یہ ہے کہ پچھلے چند مہینوں سے یعنی جب سے شیخ وفاتی نے یہ کوٹھی کرائے پر لی ہے۔ یہاں محلّے میں عجیب عجیب واقعات ہوئے ہیں۔ جو بھی جانور اس کوٹھی میں داخل ہوتا ہے اُسے محلّے والے پھر کبھی نہیں دیکھتے۔ جناب یقین کیجئے۔ میں نے دن رات اِس کوٹھی کی نگرانی کی ہے ——— جی کیا فرمایا؟ ——— میں ڈھنگ کی ملازمت کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟ ——— حضور ——— آپ کی اطلاع کے لئے میں دس سال سے ملازم ہوں اور بڑا افسر ہوں کہ اسی لئے اتنا وقت مل جاتا ہے ——— کیا کہا؟؟؟ ——— نامعقول ——— بدتمیز ——— اگر غلط نمبر تھا تو پہلے ہی کیوں نہیں بتایا ——— بکواس بند کرو۔"

میں نے غصّہ میں ریسیور زور سے پٹک دیا۔ اب میں اُس بدتمیز کو کیسے بتاتا کہ میں نے شیخ وفاتی کی کوٹھی کی نگرانی کیوں کی تھی۔ میری عمر ۳۷ سال کی ہو گئی تھی اور اب تک میں کنوارا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ابا جان مرحوم کی وصیت تھی کہ بیٹا شادی صرف اعلیٰ نسل کی لڑکی سے کرنا۔ بدقسمتی سے مجھے ایسی لڑکی اب تک نہیں ملی تھی۔ ایک دعوت میں ایک خوبصورت لڑکی ملی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش اطوار، خوش گفتار۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُسے نہ میری عینک کے موٹے شیشوں پر اعتراض تھا اور نہ اِس پر کہ میرا سر بالوں کی علّت سے پاک تھا۔ جب تعلقات بڑھے اور دل کو دل سے راہ ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ شیخ وفاتی کی لڑکی تھی جن کی صدر میں گوشت کی دوکان تھی!

یکایک سامنے کی سڑک پر دو امریکن لڑکے نظر آئے دونوں

نے سفید چست بنیان اور سُرخ تنگ پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے اِدھر اُدھر سائیکلیں دوڑا رہے تھے۔ عموماً دن کو مہرآباد ہاؤسنگ سوسائٹی کی سڑکیں ویران ہوتیں۔ نہ جانے کیوں ان گورے چٹے امریکیوں کو دیکھ کر مجھے ایک بار پھر شیخ وفاتی یاد آگئے۔ جن کی مرسیڈیز کار کا رنگ سرخ تھا اور پھر مجھے شمّو یاد آگئی جسے سُرخ رنگ بہت پسند تھا۔ جس کی لاڈلی بلّی منّو بھی غائب تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے تعلقات ختم ہو گئے تھے اور ایک بار پھر میں کنوارا رہ گیا تھا۔

ہُوا یہ کہ میں اُس کی بلّی کو اپنے ساتھ لا رہا تھا کہ یکایک شیخ وفاتی کی کوٹھی کے پاس وہ میری گود سے اُچھلی اور کوٹھی کے اندر غائب ہو گئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ شمّو کو جب اِس کی اطلاع ملی تو اُس نے مجھ ہی کو قصوروار قرار دیا اور بول چال بند کر دی۔ شادی تو اُس سے ویسے بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بعد کو پتہ چلا کہ اُس کے نانا کی کان پور میں جوتوں کی بہت بڑی دوکان تھی!

میں نے دوبارہ ڈائرکٹری دیکھی، احتیاط سے نمبر ملایا۔ اب کے ایک خاتون بولیں۔ " ہیلو " میں نے سوچا۔ غالباً اب تھانوں میں عورتیں بھی کام کرنے لگی ہیں۔

" کہاں سے بول رہی ہیں آپ! ———— مہرآباد تھانے سے؟ " میں نے پوچھا۔ یہ سُننا تھا کہ دوسری طرف وہ بپھر پڑیں۔ " نہیں نہیں۔ غلط نمبر —— یہ ڈاک کھانہ نہیں ہے۔ سیٹھ جالو جی بھالو جی کی کوٹھی ہے۔ " فوراً سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے جھنجھلا کر گھڑی دیکھی۔ تین بجے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیخ وفاتی سے کیسے بدلہ لوں۔

یکایک ایک ترکیب سوجھی اور میں سیدھا ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ صدر دروازے کی گھنٹی بجائی، چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کھٹ پٹ۔ کھٹ پٹ کی آوازیں یوں آئی جیسے دو اونچی ایڑیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں اِس طرف آ رہی ہوں۔ یہ آواز بالکل قریب آگئی اور دروازہ کھلا تو مجھے یوں لگا جیسے چاند بدلی سے نکل آیا ہو۔ دروازے کا رنگ آبنوسی تھا اور جو لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی۔

" معاف کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب کا ——؟ " میں نے گفتگو کی ابتدا ہی کی تھی کہ اُس نے فوراً کہا۔

" جی اُن کا مطب ناظم آباد میں ہے اور وہ اِس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ " یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے روکا۔

" معاف کیجئے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری کا پتہ نہیں پوچھنا ہے۔ میں تو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اُن کا یعنی آپ کا کُتّا ابھی ابھی اُس پیلی کوٹھی میں داخل ہوا ہے۔ "

اِس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ " واہ صاحب واہ —— کُتّا اندر داخل ہوا ہے تو اِس میں پریشانی کی ایسی آخر کون سی بات ہے؟ ———— میرا اسنوپی (Snoopy) تو بڑا ملنسار کُتّا ہے اس کا یہاں کی اکثر کوٹھیوں میں آنا جانا ہے۔ آپ نے بھی کمال کر دیا کہ بھری دوپہر میں صرف یہی بتانے گھر سے نکل پڑے۔ "

وہ نہ جانے کیسے دیکھ کر یہ سب کہہ رہی تھی۔ کم از کم اِس کا یقین تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھیں بیک وقت مشرق اور مغرب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرا تو سر چکرا گیا۔ اتنی حسین شکل اور ایسی پاگل کر دینے والی آنکھیں؟ —— پھر سوچا میاں انسان کی کجی ہی تو ہے۔ ناک اچھی ہے اور رنگ بھی گورا ہے۔ جسم بھی حسین ہے۔ اگر سلسلہ چل نکلے تو کیا مضائقہ ہے؟ —— اور پھر تم کون سے بڑے ہو؟

میں فوراً ہوش میں آگیا اور میں نے کہا۔ " دیکھئے خدارا سنجیدگی سے میری باتیں سُنئیے۔ معاملہ نہایت تشویشناک ہے۔ آپ کا کُتّا جس کوٹھی میں داخل ہوا ہے وہ شیخ وفاتی کی ہے۔ جن کی صدر میں گوشت کی بڑی دوکان ہے۔ جب سے وہ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں آئے ہیں مہرآباد کے ہر قسم کے جانور تیزی سے غائب ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کا کُتّا بھی ہمیشہ کے لئے گیا! "

یہ سُننا تھا کہ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ " اوہ خدایا۔ یعنی اسنوپی ہمیشہ کے لئے گیا۔ ؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں کیا کروں گی اُس کے بغیر؟ خدارا کوئی ترکیب کیجئے۔ اُس کی جان بچائیے۔ میں ساری عمر احسان مند رہوں گی۔ اس وقت گھر میں اور کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد مانگوں۔ "

اُس نے یہ الفاظ اتنے پیار سے ادا کئے کہ میں فوراً سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوگیا۔ پہلے تعارف ہوا اور پھر ہم نے سر جوڑ کر ایک نہایت جامع اسکیم تیار کی اور چپ چاپ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی سڑکیں حسبِ دستور ویران تھیں۔ اور چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ ہم جب وفاقی کی کوٹھی کے قریب پہنچے تو مجھے ایک بڑا درخت نظر آیا۔ جس پر چڑھ کر اندر کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ گُبترہ نے یعنی ڈاکٹر صاحب کی لڑکی نے چوکیداری کا فرض اپنے ذمّے لیا اور میں نے درخت پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں جھانکا۔ اندر بڑا خوبصورت لان تھا اور اس وقت کوٹھی پُرسکون تھی۔ اب جو میں نے ناک پر عینک درست کر کے نظریں دوڑائیں تو میرا منہ حیرت سے کھُلا رہ گیا۔ بڑے پھاٹک کے قریب اسنوپی کھڑا دُم ہلا ہلا کر خوشی خوشی اپنی نسل کے اور بہت سے کُتّوں سے تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ قریب ہی لان پر کئی رنگ برنگی بلّیاں قیلولہ فرما رہی تھیں جن میں سمّو کی بلّی بھی تھی۔ بعض کی آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں اور بعض کی بند۔ لیکن سب کی سب مطمئن نظر آرہی تھیں!

یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے اپنے آپ کو بے حد ذلیل محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا کہ وفاقی صاحب کی صاحبزادی کو جانوروں سے عشق تھا اسی لئے اُن کے یہاں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر آباد تھا۔ رنگ برنگے طوطے، کبوتر، مینا، کوئلیں، ہرن، خرگوش، بکریاں وغیرہ وغیرہ محلّے بھر کے کُتّے اور بلّیاں بھی غالباً ان بڑی بڑی کوٹھیوں کی ویرانی اور اپنی تنہائی سے اُکتا کر یہیں جمع ہو رہی تھیں۔ یہاں مخل جانے کے مواقع بھی زیادہ تھے۔

اب یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں فوراً درخت سے کود پڑا۔
"کیا دیکھا آپ نے؟ — اسنوپی ہے وہاں، زندہ تو ہے نا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"شی"! میں نے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "ذرا آہستہ — وہ زندہ تو ہے لیکن دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ چلئے پھاٹک کی طرف چلتے ہیں اور اُسے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اُسے پکار دیجئے گا۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی آواز سُن کر وہ بھاگ نکلے۔"

یہ سُنتا تھا کہ گُبترہ کی باچھیں کھل گئیں اور وہ مجھے اور زیادہ حسین لگی۔ ہم دونوں پھاٹک تک گئے۔ گُبترہ نے پہلے سیٹی بجائی۔ اور پھر آہستہ سے اسنوپی کو پکارا۔ چند لمحوں کے بعد یکایک اسنوپی صاحب پھاٹک کے نیچے سے برآمد ہوئے اور گُبترہ کے گلے سے آن لگے۔

چنانچہ اِس طرح گُبترہ سے میرے تعلقات بڑھے اور رفتہ رفتہ ہوتے ہوتے ہم شیر و شکر ہو گئے۔ مغرب تک مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ مثلاً یہ کہ وہ ہر روز بلا ناغہ ٹوِسٹ (Twist) کرتی ہے تاکہ بقول اُس کے کمر پتلی ہو اور فِگر (Figure) نکل آئے۔ اس کی اماں کا وزن پہلے کئی من تھا لیکن جب سے انھوں نے ٹوِسٹ (Twist) شروع کیا تھا۔ اُن کا وزن گھٹ کر صرف ڈھائی من رہ گیا تھا اور وہ بے حد اسمارٹ ہوگئی تھیں۔ آج کل وہ لاہور گئی ہوئی تھیں۔ اِس لئے مطلع صاف تھا۔

میں نے ٹھاٹ سے شام کی شاندار چائے پی۔ رات کا کھانا کھایا۔ اور جب رات کے گیارہ بج گئے تو گُبترہ نے مجھے بھی ٹوِسٹ (Twist) کی باریکیاں سکھانی شروع کر دیں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میری توند بڑھنے والی تھی۔ ابھی ہم نے ابتدا ہی کی تھی کہ یکایک باہر شور و غل سُنائی دیا۔

"شاید ڈاکٹر صاحب لوٹ آئے ہیں۔" میں نے گھبرا کر اُس سے کہا۔ اس پر وہ کھِلکھلا کر ہنس پڑی اور بڑے پیار سے مجھے دیکھا۔ یقیناً مجھ ہی کو دیکھا ہوگا۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ اُس وقت تک اُس کی بیک وقت مشرق و مغرب کو دیکھنے والی حسین آنکھوں سے مانوس نہیں ہوا تھا۔

"آپ ڈریئے نہیں" وہ بولی "ڈیڈی آج بارہ بجے سے پہلے نہیں لوٹیں گے — یہ تو دادا جان کا ٹرک ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرے دادا رشتے کے میرے نانا بھی ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں اب تک آپس ہی میں شادیاں ہوا کرتی تھیں لیکن اب ڈیڈی نے فیصلہ کیا ہے کہ میری شادی وہ ضرور باہر کریں گے!"

اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں اور مجھے اپنے کپڑے تنگ ہوتے

(بقیہ صفحہ ۱۲۵ پر دیکھئے)

جوگندر پال

سِٹل بے بی

اِس سال بھی نیو ایئر ایو پر مسٹر اور مسز چوہان نے چند قریبی دوستوں کو اپنے لونج میں شراب نوشی کی دعوت دے رکھی تھی۔ نیا سال شروع ہونے میں جب کوئی ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا تو شرابی شوہروں کو اپنی بیویاں محبوبائیں بن بن کر نظر آنے لگیں۔

"قسم تمھاری مالتی" مسٹر کھنّہ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ "تم سے محبت کرنے سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں جو بھی کیا ہے گناہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہی تو ہے۔" مالتی اپنے پیگ سے ایک گھونٹ بھر کر مسکرانے لگی۔ "میری شادی سے پہلے جو آپ کے پاؤ درجن بچوں کی فوج تیار تھی، وہ میں آپ ہی کے گناہ بھگت رہی ہوں۔"

"لیکن میری جان، تم گریٹ ہو۔"

"نان سنس!" راجیش نے اپنی شراب سے سر اٹھا کر کہا۔ "کوئی عورت گریٹ نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ عورت گریٹ ہوتی تو عورت کیسے ہوتی؟"

"ہاں، بیچاری گائے ہوتی، بلّی یا بکری ہوتی، یا بندریا ہوتی۔" مسز کنور نے تیز تیز کہا اور منہ پھلا کر اپنی ڈرنک اٹھائی۔

"اگر واقعی ایسا ہی ہوتا تو مردوں کا کیا حشر ہوتا؟" مسٹر کھنّہ نے پوچھا۔

"شٹ اپ!" مسز کھنّہ نے ہنس کر اپنے شوہر سے کہا۔

"لیجیے میڈیم، ہم شٹ اپ ہو گئے۔" اس کا شوہر کہنے لگا۔ "پر اعتراض تو شری راجیش کی طرف سے ہوا تھا۔ انھیں بھی شٹ اپ کروا دیجیے نا۔"

"میں نے صرف اس لئے شادی نہیں کی کہ شٹ اپ ہونے کی بجائے ہمیشہ اپنی بات دو ٹوک کہہ سکوں۔ سمجھے!"

"مگر تمھاری باتیں بالکل مہمل ہوتی ہیں راجیش" مسز کنور نے کہا۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ عورت گریٹ ہوتی تو عورت کیسے ہوتی؟ کیا مرد گریٹ ہو کر مرد نہیں رہتا۔"

"مسز کنور، بھئی یہ بات تو غلط نہیں ہے" مسز چوہان نے کہا۔ "میں نے کئی بڑے آدمیوں کی تصویریں دیکھی ہیں، پر کوئی ایک مرد بھی جی میں نہیں کھپتا ـــــــ"

لیکن سوال اس وقت کسی مرد کا نہیں، عورت کا ہے۔ میں راجیش سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ گریٹ عورت کو عورت نہیں تو اور کیا ہونا چاہیے۔؟ سمجھی؟"

"اس کا انحصار اُس کی اپنی پسند پر ہے۔" راجیش اپنے گلاس کی طرف منہ لے جاتے ہوئے ٹھہر گیا۔ "اگر میں عورت ہوتا تو ـــــــ"

"اگر تم عورت ہوتے راجیش، تو میں فوراً اپنا سیکس بدل لیتی اور پھر تم سے شادی کر کے تم سے بچے جنوا جنوا کر تمہارا بھرکس نکال دیتی۔"

"مجھے بتاؤ مسز کنور" مسز چوہان برانڈی کے دو ایک گھونٹ حلق سے اتار کر کہنے لگی۔ "کہ سیکس کیونکر بدلا جاتا ہے میری بڑی خواہش ہے کہ چوہان میری بیوی ہو اور میں اُس کا

شوہر کیوں چوہان؟

"ہاں ڈیر" شوہر نے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن تم بڑی نیک اور وفادار خاتون ہو۔ اور میں گنہگار آدمی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں تمہاری عورت ہوتا تو چند ہی روز میں کسی پرائے مرد کے ساتھ بھاگ جاتا۔"

"تو اب کسی پرائی عورت کے ساتھ بھاگ جاؤ نا، تاکہ میرے چند روز آرام سے کٹیں۔"

"کیا تم میرے بغیر آرام سے رہ سکو گی ڈیر؟"

"نان سنس!" راجیش ہنسنے لگا۔ "کیا اسٹیٹ کا لا اینڈ آرڈر تمہارے وجود سے قائم ہے جو تمہارے بغیر بگڑ جائے گا اور تمہاری بیوی آرام سے نہ رہ سکے گی۔"

"نہیں راجیش۔" مسز چوہان نے اپنے شوہر کی طرف سے کہا۔ "آرام اور چین کا سارا لا اینڈ آرڈر یہی نہیں ہوتا۔"

"تو شراب پیو اور اس سے چین نہ ملے تو پلاؤ ــــــ"

"اچھا، بھلا ہم شراب کیوں پیتے ہیں؟" مسز کنور نے سوال کیا۔ "نشہ کے لئے؟"

"ہاں، اور کس لئے؟" چوہان نے جواب دینے کے لئے پوچھا۔

"نہیں۔" راجیش انھیں بتانے لگا۔ "میں نشہ کے لئے نہیں پیتا۔ پئے بغیر مجھے ہمیشہ یوں ہی لگتا ہے کہ میں نشہ میں ہوں۔ اے ساری دنیا بے ہوش ہیں۔ مگر پی کر میں ہوش میں آجاتا ہوں اور سارا جہاں مجھے نشہ میں دھت معلوم ہونے لگتا ہے۔ کاش میں اتنا ابنارمل نہ ہوتا! ــــــ"

"تم ہو نارمل ہی میرے بھائی۔" چوہان نے اُسے بتایا۔ "لیکن تمہارا پرابلم یہ ہے کہ تم نارمل ہونا نہیں چاہتے۔ ہم سب کا پرابلم یہی ہے کہ ہم سب معمولی آدمی ہیں۔ مگر اپنے معمولی پن کو تسلیم نہیں کرتے۔"

"نہیں، میں تمہاری طرح معمولی نہیں ہوں۔"

"تو تم ہو کیا؟ عظیم شاعر؟"

"شاعری انسان کی اولین نظم کے بعد اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔"

"فلسفی"

"فلسفہ کی دختر کلاں کا نام حماقت ہے۔"

"تو کیا تم کوئی بہت بڑے رہنما ہو؟ آخر تم ہو کیا؟"

راجیش نے اپنی شراب غٹ غٹ چڑھا کر سب کی طرف دیکھا۔

"میں ــــــ میں اپنے دور کی عظمت کا نمائندہ ہوں۔ میں کچھ نہیں کرتا کیونکہ میرے پیش رو اتنا کچھ کرنے کے باوجود مجھے جاہل معلوم ہوتے ہیں۔ میں صرف سوچتا ہوں اور سوچ سوچ کر اب سوچنا بھی مجھے بے معنی معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر انسان سوچنا بند کر دے، بالکل بند کر دے تو بھلا اُسے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اُسے اپنی سوچ سے کیا فائدہ پہنچا ہے۔ ؟ ــــــ"

"ٹن ــ ٹن ــ! ــــ" کلاک سے گیارہ بجے کی ٹن ٹن ہونے لگی۔

سب شرابی یہ ٹن ٹن سُن کر، گھونٹ گھونٹ شراب پی پی کر اُداس ہونے لگے۔

"ٹن!"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ وقت سوچ سوچ کر آگے بڑھتا ہے؟ اگر کہیں یہ سوچنے کے لئے ایک لمحہ رک جائے، صرف ایک لمحہ تو کل عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے ــــ ایک گھنٹہ بعد نئے سال کی آمد پر میں اپنے آپ سے وعدہ کروں گا کہ کبھی نہیں سوچوں گا، وقت کے مانند خالی الذہن ہو جاؤں گا۔ ــــــ"

"میں جب خالی الذہن ہوتی ہوں راجیش۔" مسز چوہان اسے بتانے لگی۔ "تو مجھے بہت بھلا لگتا ہے۔ اتنا بھلا، مانو میں اپنی ماں کی چھاتیوں سے خوب سیر ہو کر دودھ پی چکی ہوں اور اب وہاں اپنے ننھے منے ہاتھ رکھے سونے لگی ہوں ــــــ لیکن پھر اچانک کہیں سے یہ شیطان آنکلتا ہے۔" اُس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور میرا خالی ذہن دیکھتے دیکھتے اُلٹی سیدھی خواہشات سے لدجاتا ہے۔ سر بھاری ہونے لگتا ہے۔ طبیعت گرنا شروع ہو جاتی ہے گویا مجھے ہر گھڑی چوہان کا بچہ جننا ہو ــــــ میرے نام دو ایک لاکھ روپیہ جمع کروا کے تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟" اُس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"دو نہیں چار لاکھ روپیہ لے لو ڈیر۔" اُس کا شوہر کہنے لگا۔ "لیکن طلاق کا نام نہ لو۔ تم طلاق کا نام لیتی ہو تو میری ماں مرجاتی ہے ــــ"

راجیش، ہم سب کے لئے فسٹ کلاس تگڑی سی کاک ٹیل تیار کرو دوست۔"

راجیش اپنی جگہ سے اُٹھ کر پہلو کی ایک بڑی سی میز کے قریب آ کھڑا ہوا، جہاں بھانت بھانت کی شراب رکھی تھی اور کاک ٹیل تیار کرنے لگا۔

"میری ایک بات مانو گے؟" مسز چوہان نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "پلیز نئے سال کے پہلے لمحے سے مجھے اپنی ماں بنا لو یا ایسا نہیں کر سکتے تو مجھے کہیں سے ایک بچہ لا دو جو مجھے سارا دن ماں ماں، کہہ کے پریشان کر دے۔"

وہ اپنے گلاس سے بچی کھچی شراب کے گھونٹ بھرنے لگی۔

"مجھے تمہارا بچہ جننے کے خیال سے بڑی کوفت ہوتی ہے مگر جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے ماں کہہ کے پکارے۔ ماں! ماں! چوہان، تم ہی مجھے ماں کہہ کر پکارو! کیا تمہاری ماں مجھ سے بہتر عورت تھی جو تم صرف اُسے ہی اپنی ماں سمجھتے ہو؟ مجھ میں بچہ پیدا کرنے کی ہمت نہیں لیکن میں ماں بننا چاہتی ہوں چوہان، سنا تم نے؟ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔"

کنور نے اُٹھ کر گراموفون پر ڈانس کے لئے چند ریکارڈ فٹ کئے اور مسز چوہان کے پاس آکر کہنے لگا۔ "مسز چوہان، آؤ ہم ڈانس کریں۔"

"ڈانس —؟ ڈانس سے مجھے کیا خوشی ہو گی میرے دوست؟" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیا تم مجھے کوئی حرامی بچہ نہیں دے سکتے کنور پلیز؟"

"کامنی، تمہاری طبیعت خراب ہے؟" اُس کے شوہر نے پوچھا۔

"نہیں، میری طبیعت خراب نہیں ـــــــ آؤ کنور، آؤ ناچیں!"

وہ دونوں کمرے کی ایک کھلی جانب آکر ناچنے لگے۔

"مالتی۔" کھنہ اپنی بیوی کے قریب سرک آیا۔ "قسم تمہاری ـــــــ"

"بور مت کرو جیون۔" اُس کی بیوی نے کہا۔ "اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو چپ چاپ پیئے جاؤ اور مجھے چپ چاپ پینے دو۔"

"چپ چاپ! کیوں ڈیر؟"

"کیونکہ کئی دن بعد آج میں اچانک اپنے ساتھ آ بیٹھی ہوں اور مجھے اپنی رفاقت میں بڑا چین مل رہا ہے۔"

"تو میں کس کے ساتھ بیٹھوں؟"

"میرے ساتھ" مسز کنور نے کہا "آؤ ہم بارہ بجے تک اتنی پی لیں کہ نئے سال کی آمد پر ہمیں یہ معلوم ہو گویا ساری دنیا پانی میں ڈوب گئی ہے اور صرف تم اور میں انسان کی کہانی کو پھر سے شروع کرنے کو باقی رہ گئے ہیں ـــــ"

"لو بھئی، کاک ٹیل تیار ہو گئی۔" راجیش نے کاک ٹیل کا ٹرے ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور اپنا گلاس اٹھا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

دوسروں نے بھی اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے۔

"ٹن!"

کلاک نے ساڑھے گیارہ بجے کے ٹائم کا اعلان کیا۔

"نصف گھنٹہ اور!"

ٹک! ٹک! ٹک! ٹک! گویا بچہ جننے سے پہلے گھڑی کے جسم میں دردوں کی گٹھڑی کھل گئی ہو۔

"چوہان، تمہاری بیوی کو ماں بننے کا بڑا شوق ہے۔" کھنہ اُس سے کہنے لگا۔

"اور تمہاری کو نہیں؟" مالتی نے اپنے شوہر سے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔ "مگر کیا فائدہ؟ مجھے معلوم ہے انسانی بچہ تو کیا، تمہارے خون میں چوہے کے جراثیم بھی نہیں۔"

"بھئی ہم نے تو شادی کے فوراً ہی بعد معاملہ ہموار کر دیا تھا۔" مسز کنور انہیں بتانے لگی۔ "بچے وچے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ـــــــ لیکن سچ بتاؤں میری ایک خواہش ہے۔ وہ یہ کہ میں مرد ہوتی اور ایک دم کسی عورت کے پیٹ میں نصف درجن بچے آباد کر دیتی۔"

"نیا سال کہاں سے آتا ہے راجیش؟" چوہان نے راجیش کی بنائی ہوئی کاک ٹیل چکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری کاک ٹیل واقعی بڑے مزے کی ہے یار۔ یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے مختلف شرابوں

کا مرکب ہم نہیں چکھ رہے، بلکہ ہمارے منھ میں یہ شرابیں ایک دوسرے کو چکھ رہی ہیں۔ نا مسز کنور؟ ـــــ نئے سال کی آمد میں اب بس پندرہ بیس منٹ باقی ہیں۔ نیا سال آتا کہاں سے ہے راجیش ؟"

"اپنی ماں کے پیٹ سے، موہن لال چوہان۔" راجیش نے اُسے بتایا۔

"کیا وقت کی ماں ہماری طرح بانجھ نہیں ؟" مسز کھنہ نے پوچھا۔

"عورت اس لئے بانجھ ہوگئی ہے مادام۔" راجیش نے کہا۔ "کہ فطرت اُس سے بچّے جنوانے کے سوا اور کوئی کام نہیں لینا چاہتی لیکن عورت اپنے آپ سے اِس کام کے سوا دوسرے سب کام لینا چاہتی ہے ـــــ مسٹر کھنہ تم نے ابھی تک میری کاک ٹیل نہیں چکھی ؟"

"میں ایک وقت میں ایک ہی شراب پینے کا عادی ہوں۔"

"ڈرو نہیں میرے دوست، پی جاؤ۔ آئندہ سال اُسی کا ہے جو کاک ٹیل پیئے گا، جس میں بیک وقت دس ڈرنک پینے کی جرأت ہوگی۔ پی جاؤ! ـــــ وہ دیکھو وقت کے پیٹ میں نیا سال اب نیچے لڑھک آیا ہے۔ مسز چوہان کنور کے جسم میں کھٹ کھٹ کر ناچ رہی ہے اور ناچ ناچ کر اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بانجھ نہیں رہی۔ اُس کی ہڈیوں سے نئے سال کا پیکر برآمد ہو رہا ہے، باہر دیکھو، آسمان کا چہرہ کسی حبشی کے چہرے کے مانند لذّتِ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ نیا سال آ رہا ہے دوستو ـــــ"

ٹن ـــــ ٹن ! ـــــ !

ٹھیک بارہ بجے چوہان کے لوبخ کی بجلی فیل ہوگئی۔ روشنی گل ہوگئی !

ٹن !

خاموشی، اندھیرا، ماتم !

ٹن !

"میرے دوستو، تم سب چُپ کیوں ہو گئے ہو؟ کہاں ہو ؟ ـــــ"

ٹن !

"نئے سال نے پیدا ہو کر، رو رو کر اپنی ہستی کا اعلان کیوں نہیں کیا؟ کیا ـــ کیا وقت کے بطن سے نسل بے بی پیدا ہوا ہے؟ یا کچھ پیدا ہی نہیں ہوا؟ نیا دَور بھی نئے انسان کی طرح بانجھ ہو گیا ہے ؟! ـــــ"

ٹن ـــــ !

"میرے دوستو، تم شاید اندھیرے میں اپنے اپنے زمین کے ٹکڑے بدل بدل کر بیج دے رہے ہو، مگر تمہاری کُل زمین بنجر ہے، ثمر آفریں نہیں ! ـــــ"

ٹن ـــــ !

"میں اکیلا بھی کیا کر سکتا ہوں ؟ مجھے کسی سے محبّت نہیں، کسی سے بغل گیر ہونے کی خواہش نہیں۔ کاش کوئی اپنے آپ سے لپٹ کر اپنی طاقت کا اخراج کر سکتا، آفرینش کا سامنا کر سکتا۔

بقیہ افسانہ "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" صفحہ ۱۲۱

ہوئے محسوس ہوئے۔

"واقعی ؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "تمہارے دادا زندہ ہیں ؟"

"وہ کرتے کیا ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"تاجر ہیں۔ بولٹن مارکیٹ میں ان کی سبزی ترکاری کی بہت بڑی دوکان ہے!!! ـــــ یہ ٹرک منڈی جا رہا ہے!!!"

یہ سُننا تھا کہ یوں محسوس ہوا جیسے پلک جھپکتے حسین خیالات کا قلعہ زمین پر آ رہا۔ میرا سر چکرا گیا۔ وہ بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جانے ان چند لمحوں میں کیا ہوا۔ مجھے فوراً ہوش آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ابّا جان کی وصیت نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ دل نے کہا۔ میاں ـــ تم بھی کس چکّر میں پڑ گئے؟ کیا رکھا ہے اِن باتوں میں ؟ یہ کیا کم ہے کہ یہ لڑکی ہم مذہب ہے۔ کل کو تمہاری اولاد کیا بیچے گی۔ اس کی ابھی سے فکر کیوں ؟

میں نے فوراً اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرا، مُسکرا کر ٹائی کی گرہ درست کی اور پھر پیار سے بشریٰ کا ہاتھ یوں تھام لیا۔ جیسے اگر اب کے یہ ہاتھ چھوٹا تو زندگی بھر کنوارہ رہ جاؤں گا۔!

گورنجن سنگھ

کبوتری

نام تھا چمپا۔ اور چمپا کے پھول ہی کی طرح اُس کے نام کی مہک گلی محلّے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگ سانولا، اور جسم دُبلا پتلا۔ لیکن لوہے کی طرح مضبوط اور لچکدار۔ دماغ کی سخت تھی۔ کبھی کبھی اپنے گھر والے سے ہاتھا پائی ہو جاتی تو مقابلہ برابر کا رہتا۔

وہ نل سے نہا کر لوٹ رہی تھی۔ بھیگی ساڑی جسم سے چپک گئی تھی۔ جیسے پھول کی پنکھڑی چپکی رہتی ہے۔ بلبیر مستری کی آنکھیں اُسے ایسے گھور رہی تھیں، جیسے وہ اُس پر کوئی جادو کر رہا ہو۔ چمپا مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑائی، بہت تو ر آنکھوں میں بھولا پڑے۔ آنکھ پھٹا بھڑوا۔

ساری گلی میں کسی کی مجال نہیں تھی جو اُسے یوں گھور کر دیکھے۔ ایک بلبیر مستری ہی ایسا ڈھیٹ اور بے شرم آدمی تھا جسے اتنی جرأت ہوتی تھی۔ وہ اُس کی اس حرکت پر آگ کھا کر رہ جاتی۔ گھر والے کا کچھ لحاظ تھا۔ کیونکہ اُس کا گھر والا موہن اُسے بھیّا کہہ کر پکارتا تھا۔ بلبیر مستری سے روپیہ قرض لیکر وہ اُسے بیاہ کر لایا تھا۔ لیکن ایسی بے شرم نظریں، ایسی بے حیا مُسکراہٹ، چمپا کا جی چاہتا اُس کے منہ پر تھوک دے۔

گھر آکر اُس نے کپڑے بدل لئے۔ چولی چھوٹی پڑ گئی تھی۔ اُسے بڑے جتن سے باندھنا پڑا۔ آنگن میں بیٹھ کر وہ اپنا دھیان بلبیر مستری سے دوسری طرف لیجانے کے خیال سے سُوپ میں سُکھائے دھنئے میں سے چھوٹے چھوٹے کنکر چُننے لگی۔ آنگن میں گولر کا ایک درخت تھا۔ جس میں مرچ جیسے ہرے ہرے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھل لگے ہوئے تھے اور سفید سفید دانے دار پھول کھل رہے تھے۔ صحن جھڑے ہوئے پھولوں سے اٹا پڑا تھا۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو نے نہ جانے اُس کی طبیعت پر کیا اثر ڈالا، وہ دھنئے میں سے پتھر بینتی بینتی، اُٹھ کر بکھرے ہوئے پھول چُننے لگی۔ اور پھر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ گنگنانے لگی۔

وہ روز بہت سارے پھول اکٹھے کر کے اُنکا ہار گوندھ لیتی ہے۔ اور نہا دھو کر اُسے سر کے جوڑے سے لپیٹ لیتی ہے۔

وہ پھول اکٹھے کر رہی تھی اور اوپر درخت پر بیٹھے کوّے کاؤں کاؤں کر رہے تھے۔ یہ کاؤں کاؤں اُسے بہت بُری لگتی ہے۔ اُن کا کرخت لہجہ گھر کے سُونے پن کو اور خوفناک بنا دیتا ہے۔

پھول چُنتے چُنتے اُس کا دھیان کہیں اور چلا گیا۔ بچپن میں وہ اسی طرح سکھی سہیلیوں کے ساتھ گاؤں کے ایک باغیچے میں پھول چُننے جایا کرتی تھی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ کیسے پیارے دن تھے۔

اچانک آنگن میں ایک طرف بیٹھا ہوا کُتّا اٹھ کر غرایا۔ باہر سے مینڈک جیسی ٹرّاتی ہوئی آواز سُنائی دی۔ موہن . . . ! موہن ابھی کام سے نہیں لوٹا کیا؟

چمپا نے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا۔ سامنے بلبیر مستری کھڑا للچائی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں، ابھی نہیں آئے ہیں۔ چھٹی کے بعد وہ سیدھے گھر نہیں آتے۔"

"ہاں یہ تو جانتا ہوں۔ دارو پینے نکل جاتا ہے نا۔ لیکن ایسا کر کے وہ ٹھیک نہیں کرتا۔ کیا تم اُسے ٹوکتی نہیں . . . . ؟

ٹوکتے تو ہیں۔ پر وہ . . . ." وہ کچھ کہتی کہتی رُک گئی۔ اُسے لگا مستری تو جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہا ہے۔ اُسے ہمارے گھر کی باتوں سے کیا۔؟ اس لئے وہ بات بدل کر بولی "آج تو کہہ کر ہی گئے ہیں کہ دیر سے گھر لوٹیں گے۔"

اندر کوٹھری میں کچھ کھڑکھڑاہٹ سی سُنائی پڑی۔

"آموتی آ . . . دیکھ تو چوہا پھنسا ہے . . . ." وہ پچکارتی ہوئی کُتّے کو کوٹھری کے اندر لے گئی۔ اور باہر سے اُس کا دروازہ بند کر لیا۔

مستری نے اُس کی اس حرکت کو بھانپا اور موچھوں پر تاؤ دیتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

چند لمحات بعد چمپا کوٹھری سے باہر نکلی اور باہر کا دروازہ بھی بند کر کے آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی۔ جانے کیوں جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ سا رہا تھا۔ جسم میں ہمیشہ ایک تھکن سی رہتی ہے۔ اور اُس کا جی چاہتا ہے کہ اسی طرح کھاٹ پر لیٹی رہا کرے۔ جب میکے میں تھی تو اُسے یہ سُستی نہیں چھوتی تھی۔ کبھی کھیت کھلیان میں کام، تو کبھی کسی کے یہاں چاکری . . . ماں جہاں بھی جاتی تھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ گھر میں اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا جو کما کر لا کر کھلاتا۔ کام دھام کر کے ہی گذارہ چلتا تھا۔ ماں مرتے مرتے اُس کے ہاتھ پیلے کر گئی تھی۔ اُسے سونپ گئی تھی، ایک گنوار موہن کو۔ مِل میں کام کرتا تھا۔ جو سو سوا سو پگار ملتی، آدھی سے زیادہ قرضہ میں کٹ جاتی۔ باقی کی وہ شراب پی جاتا۔ بڑی مشکل سے وہ آٹھ دس روپئے لا کر اُس کے ہاتھ میں تھماتا۔ گھر کا خرچ کیسے چلتا تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ اپنے خصم پر اُسے غصّہ آتا تھا۔ بیحد غصّہ۔ اور وہ اُس سے لڑنے بھڑنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ اور اگر موہن سرِ تسلیم خم کر دے اور یہ کہہ دے کہ "لے مار . . . . مارنا چاہتی ہے تو مار۔ تیرے ہاتھ سے تو پھول برستے ہیں ری چمپا . . . ." تو اُسے اُس پر رحم آجاتا۔ آنچل میں مُنھ چھُپا کر رونے لگتی۔ بُزدل . . . نامرد . . . کاہے مرد کا جنم لیا، کاہے ہم کو بیاہ کر لائے۔؟

اُس کے اپنے اندر کی بغاوت، اپنے اندر کی کرختگی ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ موہن نہ صرف اُس کی بڑی پسلی بلکہ اُس کے تکبّر اور غرور کو بھی چکنا چوُر کر کے رکھ دے۔ اس جسم میں غصّے کے زہر کی جو آگ ہے اُسے فنا کر دے۔ نہیں تو یہ آگ اُسے جلا کر راکھ کر دے گی۔

ایک دن شاید ایسا ہو جاتا، اور موہن قہر میں آکر اُس کی بڑی پسلی ایک کر دیتا، لیکن اُس دن بھی وہ اُس سے ہار گیا تھا۔ ہُوا یوں کہ بلبیر مستری نے اُس کے خلاف شکایت کی تھی کہ وہ رام بچن پنواڑی کی دُکان پر جا کر کافی دیر تک کھڑی رہتی ہے۔ وہاں جو بدتمیز لوفر لوگ آتے ہیں اُن سے ہنس ہنس کر بے حیائی سے باتیں کیا کرتی ہے۔

بس اتنا سُن کر موہن رات گئے وقت ڈنڈا لیکر اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ اُس کے ہاتھ سے دو ڈنڈے کھا لیتی تو گویا سر سے ایک بوجھ اُتر جاتا۔ ایک غم و درد جو اُسے اندر ہی اندر کُریدتا رہتا ہے، کم ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ موہن شراب پی کر آیا تھا۔ وہ گھڑک گھڑک کر صرف یہی رَٹ لگاتا رہا کہ وہ رام بچن کی دُکان پر کیوں جاتی ہے؟ بلبیر مستری نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے، اور پھر گالیاں . . . بکواس . . . چیں چیں . . . پوں پوں . . . .

کچھ دیر تک وہ اُس کی بکواس سُنتی رہی تھی۔ لیکن جب بار بار بلبیر مستری کا نام آنے لگا تو، چڑ کر اُس نے اُسے ایک زور کا دھکا دیا۔ "چل ہٹ نامرد بھڑوا!"

وہ چُپ چاپ کوٹھری سے باہر نکل کر آنگن میں چارپائی پر آلیٹا تھا۔ تب وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی تھی۔ خُوب

ردی تھی۔ بلبیر مستری سے اُسے نفرت تھی۔ لیکن موہن اُس کا بھگت تھا۔ وہ اُسے پہلے کے علاوہ اُستاد کہہ کر بھی پکارتا تھا۔
جب موہن کو کارخانہ میں نوکری نہیں ملی تھی، وہ بلبیر مستری کے ساتھ ہی پنجاب موٹر ورکس میں موٹر کا کام سیکھا کرتا تھا۔
تبھی سے یہ اُستادی شاگردی کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔

موہن کو کام سے دو بجے چھٹی ہوئی تھی۔ لیکن وہ سانجھ ڈھلے گھر پہنچا۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ چمپا نے دیکھتے ہی سر پیٹ لیا۔ "آ گئے دارو پی کر... !"

"ارے نہیں! ذرا منگرو کے ساتھ ندی کے اُس پار چلا گیا تھا۔ وہیں تھوڑا....." اور وہ دھپ سے آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر گر پڑا۔

"جا مر! ہم بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے...!" چمپا روٹھ کر کوٹھری کے اندر چلی گئی، اُسے شراب سے بہت نفرت تھی۔ اُس کی بو ہی سے اُسے اُبکائی آنے لگتی تھی۔ آج اُس نے بڑے جتن سے کھانا بنایا تھا۔ دو ترکاریاں تیار کی تھیں۔ موہن کے انتظار میں نہ اُس نے آپ کھایا۔ اور نہ اب اُسے کھلانے کو طبیعت چاہی۔ اُس کا جی چاہا، وہ ایک چھڑی ہاتھ میں لے لے اور اُس پر خوب برسائے۔ تب تک برساتی رہے جب تک کہ اُس کا نشہ ہرن نہ ہو جائے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ ہواؤں میں خنکی بھر آئی تھی۔ صحن میں کھڑا اگو گل کا درخت اپنی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ اچانک چمپا کے غصہ نے کروٹ لی اور وہ اُٹھ کر کوٹھری سے باہر آئی۔ اُسے ہاتھ کا سہارا دیکر بڑی مشکل سے اندر لے گئی۔ اُسے چارپائی پر دھکیل، خود اُس کے قریب بیٹھ گئی، اور بولی۔ "لاج نہیں آتی۔ ہم کو اسی لئے بیاہ کر لائے ہو کہ سب ٹھٹھا مسخری کریں۔ اور اپنے دارو پی کر ہوش گنوا کر سب کو تماشہ دکھاؤ۔ ارے کا تم بلبیر مستری کا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔؟"

موہن آنکھیں کُرید کر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا۔ "وہ تم سے پھر کچھ بولا تھا...؟"

"بولے گا کیا... ! منھ نہیں نوچ لیں گی۔ لیکن تم کا اندھے ہو۔ تم کو کچھ نہیں سوجھتا۔ !؟

موہن طیش میں چارپائی پر سے اُٹھا، اور گرتا پڑتا سا گھر کے باہر جانے لگا۔

چمپا نے اُس کی بانہہ پکڑ لی۔

اُس نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ٹھہرو باہر مت جاؤ۔" وہ چیخنے لگی۔

لیکن اُس نے ایک نہیں سُنی۔ اور باہر آ کر بلبیر مستری کو اونچی اونچی آواز میں للکارنے لگا۔

چمپا بھی باہر نکل آئی اور اُسے گھر کے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن موہن نہیں مانا۔ اور اُس نے طیش میں آ کر اُس کے گالوں پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ پہلی مرتبہ چمپا نے یہ محسوس کیا جیسے اُس کے سر سے کچھ بوجھ نیچے گر پڑا ہے۔ حیرت سے اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

موہن چیخے جا رہا تھا۔ گلی کے کچھ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ بلبیر مستری بھی باہر آ گیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہونے ہی کو تھی کہ پاس پڑوس کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ چمپا کچھ لوگوں کی مدد سے اُسے گھر کے اندر لے آئی، اور دروازہ بند کر لیا۔ جو چانٹا اُس نے کھایا تھا اُس کی وجہ سے اب بھی اُس کی کنپٹیوں میں جلن ہو رہی تھی۔ پر نہ جانے کیوں اُسے غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے پیار سے موہن کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ "اتنے جوش میں آ جاؤ گے، معلوم نہیں تھا۔"

"دیکھ چمپا!" وہ اُسے لال سُرخ آنکھیں دکھاتا ہوا بولا۔ "کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے گی تو تجھے جان سے مار ڈالوں گا سالی۔"

وہ ہونٹوں میں مسکرائی "بہت بہادر بن گئے بھنا... !"

"ابھی تو نے میرا غصہ دیکھا ہی کہاں ہے۔"

چمپا کو لگا آج موہن گیدڑ سے شیر بن گیا ہے۔ اب اُس کے لئے ڈر نے مرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہ گئی۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ جس کا دوسرے دن گلی میں خوب چرچا رہا۔ سویرے جب چمپا نل پر پانی لینے گئی تو بلبیر مستری اُسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بالٹی لیکر نل پر نہیں آیا۔ دُور کھڑا داتون کرتا رہا۔ اور بار بار تھوک پھینکتا ہوا اپنی گندی ذہنیت کا ثبوت دیتا رہا۔

چمپا نے ایک مرتبہ اُس کی طرف نظریں گھما کر دیکھا تو اُس نے محسوس کیا وہ اُسے کچا ہی چبا جائے گا۔ اُس نے فوراً ہی اپنا مُنھ دوسری طرف پھیر لیا۔

جب چمپا شروع شروع میں اِس بستی میں آئی تھی، تو اِس گلی کی ہر شئے اُسے حسین لگی تھی۔ کیا آدمی اور کیا گھر۔ درختوں کے سائے تلے بسنے والے کوارٹر، اور کھیلنے والے بچے۔ کبھی کبھی بڑی بوڑھیاں بھی وہاں بیٹھ کر آپس میں بیتے دنوں کی باتیں کرتیں، اور کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور کام کاج کی چرچا کرتے۔ اِس گلی میں کھیتوں جیسی کڑی دُھوپ جسم میں نہیں چُبھتی تھی۔ لُو کے جھونکے نہیں آتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی کارخانہ کے دھوئیں سے فضا بوجھل ضرور ہو جاتی تھی۔ اُڑنے والی راکھ سے کپڑے لتے ضرور کالے ہو جاتے تھے لیکن پھر بھی موہن کے ساتھ رہنے میں سب کچھ پیارا لگتا تھا۔ ہاں بستی کے پاس ہی جو ندی بہتی کبھی اُس طرف جاتی، میدان نظر آتا، ڈھور ڈنگروں کو چرتا دیکھتی، مٹی کے بنے کچے گھر نظر آتے تو گاؤں یاد آجاتا۔ اب وہ کبھی گاؤں لوٹ کر جانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کون تھا وہاں کس کے پاس جاتی۔ موہن تو لڑکپن ہی میں اپنے گاؤں سے بھاگ آیا تھا۔ کسی سے کوئی ناطہ نہیں تھا۔

دن اسی طرح بیتے جا رہے تھے۔

جاڑے کی سرد رات تھی۔ دس بجا چاہتے تھے کافی دیر ہوئی بج چکا تھا۔ چمپا باہر لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ ٹھنڈک لگی تو اُٹھ کر اندر آگئی۔ جانے موہن ابھی تک کام سے کیوں نہیں لوٹا تھا۔ دو سے دس کی ڈیوٹی میں تو وہ کبھی دیر سے گھر نہیں لوٹتا تھا۔ پر آج نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی۔ جب باہر نل پر بالٹیوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دیں تو، وہ سمجھ گئی، ڈیوٹی والے گھروں کو لوٹ آئے ہیں۔ وہ اُٹھ کر باہر آئی۔ پڑوس کا بنارسی بالٹی میں پانی لے گھر کی طرف آرہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے پکارا۔ "بھیا!"

"کیا ہے چمپا——" بنارسی رُک کر بولا۔

"تمہارے بھائی ابھی تک کام سے نہیں لوٹے.... !"

"موہن تو پانچ ہی بجے گیٹ پاس لیکر کارخانہ سے چل دیا تھا چمپا!"

"کہاں... ؟"

"اتنا معلوم نہیں۔ گھر نہیں آیا تھا کیا.... ؟"

"نہیں تو.... !"

"کچھ کہہ کر بھی نہیں گیا... ؟"

"نہیں بالکل نہیں... !"

"تب کہنا مشکل ہے، کہاں گیا... دیکھو تھوڑی دیر میں لوٹ آئے گا۔"

چمپا کا ماتھا ٹھنکا۔ موہن بھلا کہاں گیا ہوگا۔ کہیں جائے تو بتا کر جاتا ہے۔ ایک دارو پینے جائے تو کہہ کر نہیں جاتا۔ وہ مایوس سی اندر گھر میں لوٹ آئی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ باہر دروازہ کھلا چھوڑ دیا کہ موہن آئے گا تو اسے اٹھنا نہیں پڑے گا۔ وہ اُٹھی تو جھگڑا ضرور ہوگا۔ وہ ضرور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہیں پینے پلانے گیا ہوگا۔

چند لمحے اسی طرح سوچتے سوچتے وہ پھر سوگئی۔ آنکھ کھلی تب سویرا ہو چکا تھا۔ اُٹھتے ہی سب سے پہلے موہن کا دھیان آیا۔ دیکھا بغل والی چارپائی خالی پڑی تھی۔ باہر کا دروازہ اُسی طرح بغیر سانکل کا بند پڑا تھا۔ اور صحن کی چارپائی سُونی۔ وہ آتا تو اُسے ضرور جگاتا۔

وہ اُٹھ کر باہر آئی۔ پڑوسن کو بُلا کر کہا "مالتی، میرے گھر والے کل کے کام پر گئے ہیں۔ ابھی تک نہیں لوٹے ہیں گھبرا رہا ہے۔"

مالتی بولی۔ "اُوپر ٹائم ہوگا۔۔۔"

"نہیں بنارسی کہہ رہا تھا، وہ کل شام ہی سے گیٹ پاس لیکر کارخانہ سے باہر نکل آیا تھا۔"

"تب تو تمہیں کو معلوم ہوگا، کہاں گیا ہے۔۔۔"

"کچھ کہہ کر جاتا تو پتہ چلتا۔۔۔"

"تب کسی کو بھیج کر پتہ منگا دُ بہن۔۔۔!"

کس کو بھیجے۔۔۔؟ وہ اُداس گھر میں آ بیٹھی۔

دن کے قریب نو دس بج رہے تھے۔ وہ موہن کا انتظار کرتی ہوئی مایوس ہو کر رونے لگی۔ ساری گلی میں یہ خبر پھیل گئی کہ موہن کل دوپہر کا ڈیوٹی پر گیا، ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ چمپا کو چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا ہے۔

پاس پڑوس کی کچھ عورتیں آئیں اور چمپا کو دلاسا دینے لگیں۔ "کاہے روتی ہے۔ آجائے گا۔ نوکری چھوڑ کر کہاں جائے گا۔ کہیں شراب پی کر پڑا ہوگا۔ ہوش میں آئے گا تو گھر پلٹ آئے گا۔"

دوپہر کے وقت اچانک گلی محلے میں ایک افواہ سی پھیل گئی۔ ندی کے اُس پار جنگل میں ایک لاش پائی گئی ہے۔ کسی نے خون کر دیا ہے۔ چمپا سُن کر سناٹے میں آگئی۔ کہیں وہ موہن ہی تو نہیں۔ نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔!

وہ دَوڑی دَوڑی بنارسی کے پاس گئی۔

بنارسی اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی، اُس کے آنے کا مقصد سمجھ کر بولا۔ "ہم لوگ ابھی اُس پار جا کر خبر لاتے ہیں بھوجی ــ چنتا مت کرو۔"

فوراً ہی کچھ لوگ ندی کے اُس پار جنگل کی اُور چل دئے۔

چمپا پریشان تھی۔ اُس کے دل میں ایک نامعلوم سا خدشہ بیٹھ گیا تھا۔ ضرور کوئی ناگوار حادثہ پیش آئیگا۔ وہ بھوکی پیاسی بیٹھی گلی کے لوگوں کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

شام کے وقت کہیں بنارسی کی ٹولی واپس لوٹی۔ ساتھ ہی ایک منحوس خبر لائی۔ جنگل کے تھانے کے حلقہ میں ایک لاش پائی گئی تھی، جو پہچان میں نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ گیدڑ بُری طرح اُس کے جسم کا گوشت نوچ چکے تھے۔ لاش کے تن پر جو کپڑے تھے اُس سے وہ مزدور لگتا۔ اُس کی جیب میں ایک روپے کا نوٹ اور کارخانہ کا گیٹ پاس تھا۔ اُسی سے پتہ چلا کہ وہ لاش موہن کی تھی۔

چمپا نے ہائے رام کہتے ہوئے اپنا ماتھا فرش پر پٹک دیا۔

"پولیس والوں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش ٹھکانے لگا دی ہے۔" بنارسی بولا۔ "اب موہن کا انتظار مت کرو بھوجی!"

چمپا کی آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ کس قدر ابھاگن ہے جو اپنے مرے ہوئے پتی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکی۔ رات گئے تک پاس پڑوس اور گلی محلے کی عورتیں پُرسے کو آتی رہیں۔ انھوں نے اپنے غم کا اظہار کیا۔ موہن کی موت پر افسوس ظاہر کیا اور چمپا سے ہمدردی جتائی۔ وہ گُم سُم سب کچھ سُنتی رہی۔ نہ منہ سے کچھ بولی نہ آنکھوں سے آنسو ٹپکایا۔ نہ کچھ کھایا پیا۔ ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ماتھے کا سیندور مٹ گیا۔

گہری کالی بھیانک رات تھی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ موتی تھا اور گوگل کا درخت، جو آہستہ آہستہ ہوا میں ڈول رہا تھا اور اُسے لگ رہا تھا جیسے موہن کی رُوح یہیں کہیں چکر کاٹ رہی ہے۔ وہ آنگن میں سُونی چارپائی سے ماتھا ٹیکے اور آنکھیں مُوندے بیٹھی رہی، اچانک کُتا غرّایا تو اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے دیکھا کھُلے ہوئے دروازے سے کوئی جھانک رہا تھا۔

"چمپا ۔۔!" فوراً ہی ایک آواز سُنائی دی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آواز بلبیر مستری کی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے میں سیٹھی سے لَوٹا ہوں۔ موہن کی موت کی خبر سُن کر بڑا دُکھ ہوا۔"

وہ اُٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

بلبیر مستری قریب آکر بولا۔ "کیسے یہ سب ہُوا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔۔۔؟"

"نہیں ۔۔!" وہ آہستہ سے بولی۔

"کس نے کیا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا۔۔۔؟"

"نہیں ۔۔!"

"رومت ۔۔! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ بیکار اپنے آپ کو پریشان کرو گی تو وہ لَوٹ تھوڑے ہی آئے گا۔ اور دیکھو کوئی کام ہو تو بتا دینا۔ پرایا مت سمجھنا۔۔۔!

"نہیں۔ میں نے ایسا کب سمجھا ہے۔۔۔" کہتے ہوئے چمپا کا گلا رُندھ گیا۔

"سویرے سے تم نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔۔۔؟"

وہ چُپ رہی۔

"دیکھو یہ تمہارے لئے لایا ہوں۔ کھا لینا۔" اُس نے کاغذ کا ایک ٹھونگا ایک طرف رکھ دیا۔ اور موہن کی کہانی چھیڑ دی۔ پُرانی باتیں، پُرانے قصّے۔ کیسے اُس نے اُسے اپنا شاگرد بنایا تھا۔ کیسے کام سکھایا تھا۔ کس طرح بیاہ کے لئے قرض دیا تھا، وغیرہ وغیرہ کئی باتیں سُناتا رہا۔

چمپا سب کچھ سُنتی رہی۔ پَون گھنٹہ بلبیر اُس کا مغز چاٹتا رہا۔ وہ کھڑی سُنتی رہی۔

جب وہ اُٹھ کر گیا تو اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز اُٹھائی اور کُتّے کے سامنے پھینک دی۔ اوندھے منہ چارپائی پر گر پڑی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اُس بستی اور گلی کے لوگوں کی زندگی یا موت لوگوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی، موہن کی موت سے وہاں کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

مہینہ بھر چمپا سوچ بھی نہ سکی کہ اب وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ بنارسی کے مشورہ پر اُس نے کارخانہ میں نوکری کی درخواست دے دی۔ وہاں سے بلاوا آیا۔ نوکری مل گئی اور اُس کی ایک نئی زندگی شروع ہو گئی۔

سویرے کی گئی شام کو گھر واپس لوٹتی۔ لباس راکھ اور گرد سے اٹا ہوتا۔ ہاتھ پیروں پر کوئلے کی کالک جمی ہوتی۔

آتے ہی کھانا پکانے میں جُٹ جاتی۔ کھانے پینے اور برتن مانجھ دھو کر رکھنے میں نو دس بج جاتے۔ رات کو جو سوتی تو سویرے سویرے پانچ کے بھونپو پر ہی آنکھ کھلتی۔ ایک بڑی مشغول اور بندھی ٹکی زندگی بن گئی۔ گلی محلے کی عورتیں اُسے حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ وہ خود یوں محسوس کرنے لگی جیسے وہ کسی نئی دنیا میں رہنے لگی ہو۔ جہاں کام دھام اور کھانے پینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ گھر میں ایک پُرانا لنگا دُجرت گوگل کے درخت سے رہ گیا ہے یا موتی کُتّے سے۔ گوگل کا درخت اُسی طرح خوشبو بکھیرتا اور موتی اُسی طرح دُم ہلا کر اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا، گھر کا پہرہ دیتا۔ اِن کے علاوہ گلی میں ایک شخص تھا بلبیر مستری۔ اُسے بھی اُس سے ہمدردی تھی۔ موقع بے موقع وہ اُس سے خواہ مخواہ کی ہمدردی جتائے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں حرص ہوتی اور مُنہ سے رال ٹپکتی۔ باتوں باتوں میں چٹکی لے جاتا۔ اب وہ اُس کی حرکتوں پر غصہ کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ بلکہ مسکرا کر رہ جاتی۔

ایک دن رات گئے جوگیا دلال کی ماں آئی۔ اِدھر اُدھر کا سماچار پوچھا۔ نوکری اور کام کی باتیں کیں، اور شکایت بھرے لہجے میں بولی: "چمپا تو نے گلی کے لوگوں سے ملنا جُلنا کیوں بند کر دیا...؟

چمپا نے کہا: "کیا کروں ماں، دن بھر کارخانہ میں، گاڑی میں سے کوئلہ اُتارتے اُتارتے ہاتھ پاؤں تھک جاتے ہیں۔ ماتھا گھومنے لگتا ہے۔ کام سے تھک کر آؤ تو بس سو جانے کو من کرتا ہے۔ کہیں آنے جانے کو من نہیں کرتا۔" -

جوگیا کی ماں بولی: "کاہے اتنا جان سُکھاتی ہو۔ پھر سے گھر بسا لے۔ نوکری چھوڑ دو اور آرام سے رہو... کہو تو کچھ پتہ کریں.....؟

"گھر بسا لوں..." وہ پھیکی سی ہنسی ہنسی "کون ہے جو میرے ساتھ گھر بسانا چاہتا ہے؟"

"بلبیر مستری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مستری جی..!" وہ پھر اُسی طرح ہنسی۔ "ہے تو آدمی کھرا۔ لیکن گلی والے سک کریں گے۔!"

"کیسا سک...؟

"ویسا ہی... جیسا ہوتا ہے.. کہیں گے پہلے ہی سے کچھ..... وہ دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کے ہنسنے لگی۔

"ارے نہیں..." جوگیا کی ماں مسکرا کر بولی۔ "سب جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں ماں۔" اچانک چمپا کے چہرے کے بھاؤ بدل گئے۔

"یہی کہ تم دونوں میں پہلے سے بات چیت ہے...!"

"اچھا...!" چمپا پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"سچ بتا پیٹ میں کس کا ہے...؟" جوگیا کی ماں نے فوراً ایک سوال کیا۔

"بھگوان کا دیا ہے۔ کا بتاؤں...!" لاج سے چمپا کی گردن نیچے جھک گئی۔ آنکھوں کے پپوٹے بھیگ گئے۔

"میں تو سب جانتی ہوں۔" جوگیا کی ماں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ "تب ٹھیک ہے نا۔ مستری سے بات کروں...؟"

"سوچ کر بتاؤں گی۔" کہتی ہوئی چمپا اُٹھ کر چولھے پر چڑھی ہوئی دال کی ہنڈیا میں پانی ڈالنے لگی۔

جوگیا کی ماں بھی اُٹھتی ہوئی بولی۔ "اچھا اب چلوں۔ پھر آؤں گی۔"

چمپا اُس کے ساتھ دروازے تک آئی۔ وہ گھر سے باہر چلی گئی تو دروازہ بند کر کے گوگل کے درخت تلے آکھڑی ہوئی۔ وہ اُس کے تنے سے لپٹ گئی، گویا وہ مونس و غمخوار ہو اور مُنہ ہی مُنہ میں پھسپھسائی۔ سُنا تم نے... سُنا جوگیا کی ماں

کیا کہہ رہی تھی...؟"

موتی لپک کر اُس کی طرف آیا۔ شاید اُسے مالکن کی اِس حرکت پر تعجب ہو رہا تھا۔

آنگن میں جو انگیٹھی سُلگ رہی تھی، اُس کے گرد روشنی کا ایک سُرخ سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ ہنڈیا میں دال اُبل رہی تھی۔ ٹھیک ایسی ہی ایک آگ اُس کے اندر دہک رہی تھی۔ اُس کا دل اُبل رہا تھا۔

"تھو... !" نفرت سے اُس نے زمین پر تھوک دیا، اُن سب کے مُنھ پر تھو، جو جھوٹ بولتے ہیں۔ تُو نے تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اسے بر جھ دیتا۔

وہ کوٹھری میں چلی آئی۔

آٹھ بجے تک کھانا پک کر تیار ہو گیا تھا لیکن کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی، لیکن اب اُسے اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اُس کے لئے بھی کھانا پڑتا ہے جو پیٹ میں ہے۔ اُس کے خُون سے ایک زندگی اور رُوپ لے رہی ہے۔

کھا پی کر اور برتن وغیرہ مانجھ دھو کر وہ صبح کے لئے پانی لینے کے لئے نل پر آگئی۔ جانے کیوں آج اُسے نل تلے درخت کا سمٹا ہوا سایہ بڑا پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے گلی میں بھٹک رہے تھے۔ نل بالکل خالی پڑا تھا۔ اچانک کسی کے کھنکھارنے کی آواز نے اُسے چونکا سا دیا۔

ایک سایہ سا اُس کے قریب آیا۔ جس کی آنکھوں میں جیسے انگارے سے دہک رہے تھے۔ وہ تھا بلبیر مستری۔ آہستہ سے پھسپھسایا۔ "کیا خبر ہے چمپا... ؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"جاڑا نہیں لگتا... ؟"

"جسم میں جان ہے تو، جاڑا لگے گا ہی... !"

"یہ تو تمہارے آرام کے دن ہیں... !"

"سو تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔"

جوگیا کی ماں ہمارے یہاں آئی تھی۔ سب بات بتا گئی۔ کاہے ہم کو بدنام کرتی ہو... ؟ لیکن تمہارے خاطر ہم سب بات اپنے اُوپر لینے کو تیار ہیں۔

بالٹی میں پانی بھر گیا تھا۔ چمپا چُپ چاپ بالٹی اُٹھا گھر کی طرف چل دی۔

دوسرے تیسرے دن ہی بات آگ کی طرح گلی میں پھیل گئی کہ چمپا مستری کے بچّے کی ماں بننے والی ہے۔

محلّے والیوں میں سے کوئی ہنسی، کوئی شرمائی، کسی نے پھبتی کسی، کسی نے دانتوں تلے اُنگلی دبائی۔ بات چمپا کے کانوں تک بھی پہنچی۔ ڈیوٹی پر سکھی سہیلیوں نے مذاق کیا۔ اور وہ اُن باتوں کا بُرا ماننے کے بجائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بلبیر مستری بڑا پریشان تھا۔ گلی محلّے کی عورتیں اُس سے مُنھ چھپانے لگیں، گھونگھٹ کاڑھنے لگیں، اور پیٹھ پیچھے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ یار دوستوں کے برتاؤ میں گستاخی سی آگئی۔ اُس نے محسوس کیا جیسے وہ سب کے سامنے ننگا ہو گیا ہے۔ چمپا نے "ہاں" بھی نہیں کہا اور جگ ہنسائی بھی ہو رہی ہے۔

رات شاید آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ چمپا سو رہی تھی۔ بہت کڑاکے جاڑا تھا۔ اچانک موتی بھونکنے لگا۔ اُسکی نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے سُنا کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ روز کوئی اسی طرح آتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ موتی بھونکتا ہے، اور اُس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتی ہے۔ آنے والا پھر لوٹ جاتا ہے لیکن

جانے کیوں آج اُس کا دروازہ کھول دینے کو جی چاہا۔ وہ بے خوف سی اُٹھ کر صحن میں آئی۔ چاند آسمان پر ٹھیک سر پر چمک رہا تھا۔ ہوا اوس کی وجہ سے بوجھل تھی۔ گوگل کا درخت خاموش کھڑا اپنی خوشبو بکھیر رہا تھا ———

دروازہ کے قریب کھڑے ہو کر اُس نے پوچھا۔ "کون ہے . . . ؟"

"میں ہوں رے بلبیر مستری . . ." مستری کی آواز سُنائی دی۔

"اوہ مستری جی . . . !؟"

"دروازہ کھولو . . . !"

"کاہے . . . دروازہ کاہے کھولیں . . . ؟"

"ایک بات ہے . . . !"

"بولئے . . . !"

"دروازہ کھولو۔ تب نہ کہیں . . . !"

"ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ دروازہ کھولیں۔" چمپا نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔

"ہم کوئی پرائے تھوڑے ہی ہیں . . . !"

چمپا کے مُنھ سے ہلکی سی ہنسی پھوٹ پڑی۔

بلبیر مستری دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ اسی ہنسی کی وجہ سے تو ہم سب کچھ سہہ رہے ہیں۔ تیرے لئے میں بہت بدنام ہو رہا ہوں رے چمپا۔

"کاہے . . . ؟" چمپا پھر ہنس دی۔

"تیرے بچّہ جو ہونے والا ہے۔ سب میرے کو . . . . . مطلب یہ کہ . . . . . ."

"تو پھر کیا ہوا . . . ." چمپا درمیان ہی میں بولی۔ "ٹھیک ہی تو کہتے ہیں سب . . . . ."

"لیکن تیرے میرے اور بھگوان کے سوا اور کون جانتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں تیرے بچّے کا باپ نہیں . . ."

"دُنیا میں جھوٹ ہی تو ہے سچ کہاں ہے۔" اچانک چمپا کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

"میرے بدنام ہونے سے تیرے کو مزہ ملتا ہے کیا . . . ؟"

"ہاں . . . !" وہ پھر ہنس دی۔

"دروازہ کھولو نا . . . . !"

"نہیں جاؤ۔ گلی کا کوئی آدمی دیکھے گا تو کیا کہے گا . . . جاؤ۔" چمپا پھر کوٹھری میں آ گئی۔

دروازہ پر رفتہ رفتہ کھٹ کھٹ ہوتی ہی رہی۔

وہ کوٹھری کا دروازہ پھر اندر سے بند کر کے چارپائی پر لیٹ گئی۔ سردی کے باوجود اُس کا جسم جل سا رہا تھا۔ دل سُرعت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ مُنھ ہی مُنھ میں بھُنبھُنائی۔ اطمینان رکھو مستری دروازہ ایک دن کھُلے گا۔ ضرور کھُلے گا۔

دن بیتتے گئے۔ اسی طرح چمپا کے دروازہ پر کئی بار کھٹ کھٹ ہوئی۔ کئی مرتبہ چمپا اُٹھ اُٹھ کر دروازہ تک گئی۔ لیکن اُس نے دروازہ نہیں کھولا۔ بلبیر مستری بار بار یقین دلاتا رہا۔ "چمپا میرے من میں پاپ نہیں ہے رے۔ میں کھالی تیرے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ سامنے بیٹھا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

دروازہ پھر بھی نہیں کھُلا۔

جب اس کے ماں بننے کے دن اور قریب آگئے، تو کمپنی کی طرف سے اُسے ایک مہینے کی چھٹی مل گئی۔ وہ گھر ہی میں رہنے لگی۔

تب بھی بلبیر مستری کا پیغام آتا رہا۔ "کوئی روپیہ پیسہ کا ضرورت ہے تو لے لو۔ میرا سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ یہ گھر، یہ دھن دولت، سب کچھ تمہارے لئے ہے۔"

اور اُس نے جواب بھجوایا۔ "بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

جب دن اور قریب آگئے تو چمپا کمپنی کے اسپتال میں بھرتی ہو گئی۔ گھر میں اُس کی دیکھ بھال کون کرتا۔

دو چار دنوں بعد اُس کے ایک بچہ ہوا۔ بہت تکلیف دے کر لیکن وہ اُس کی صورت نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ جب وہ پیدا ہوا، تو وہ بے ہوش پڑی تھی اور بچہ مرا ہوا تھا۔

مہینہ دس دن بعد جب وہ گھر لوٹ کر آئی، اُس نے محسوس کیا، جیسے وہ کچھ گنوا آئی ہے۔ موہن جو اُسے ایک نشانی دے گیا تھا، اُسے وہ کھو آئی ہے۔

دُکھ تکلیف اور افسوس کی وجہ سے وہ مہینہ بھر اور کام پر نہیں گئی۔ اس درمیان بلبیر مستری کئی مرتبہ اُس سے دُکھ سُکھ کی باتیں کرنے آیا۔ کچھ دیر بیٹھا اور پھر چلا گیا۔ ایک دن وہ بولا۔ "یہ گھر چھوڑ دو اور چلو میرے یہاں چل کر رہو....."

وہ کچھ نہیں بولی۔ اور صرف معنی خیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔

جب وہ کام پر جانے لگی تو اُس کی زندگی پھر ایک بندھے ہوئے اصول کے مطابق چلنے لگی۔ وہی کارخانہ کا ماحول تھا، آگ راکھ اور دھواں... اور ایک جدوجہد۔ موہن کے ساتھی اکثر اُس سے ہنسی مذاق کرتے۔ اس ماحول میں ہنسی مذاق سے محنت کا بار کچھ ہلکا ہو جاتا ہے، وقت آسانی سے کٹ جاتا ہے۔

سردیاں کب کی بیت چکی تھیں۔ بہار کا موسم بھی آیا اور چلا گیا۔ گوکل کے پُرانے پتے جھڑ چکے تھے۔ اُن کی جگہ نئے پتوں نے لے لی تھی۔ نئے نئے پھول پھوٹے تھے۔ کچھ جھڑ گئے۔ کچھ نے نئے پھلوں کو جنم دیا۔ لال لال پکے ہوئے پھل انگاروں کی طرح دہکتے۔ گلی کے ڈھیر سارے بچے گھر کے آنگن میں پھلوں کے لالچ میں آ اکٹھے ہوتے۔ وہ سب کو پھل توڑ توڑ کر بانٹتی، اور محسوس کرتی، یہ سب بچے اُسی کے ہیں۔ ساری گلی کے لوگ اُس کے اپنے ہیں۔ چاہے کوئی اُس سے بات کرے یا نہ کرے۔ دُکھ سُکھ کو آئے یا نہ آئے۔

ایک دن جوگیا صبح سویرے اُس کے یہاں آیا اور بولا۔ "مجھے بلبیر مستری نے ایک ضروری بات سے بھیجا ہے..."

"کیا بات ہے بولو..." اُس کا دل کھٹکا۔ بات تو بُرائی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن جوگیا کہنے لگا۔ "بلبیر مستری نے پُوچھا ہے، موہن کا قرضہ کب چُکے گا؟"

"جلدی ہی چُک جائے گا..." وہ بولی۔ "میں ایک ایک پائی ادا کر دوں گی۔"

"دوسرا ذریعہ بھی تو ہو سکتا ہے...!"

وہ ہنس دی۔ "مستری سے کہو، روپیہ ہی چاہیئے نا۔ سود کے ساتھ سب ادا کر دوں گی۔"

جوگیا مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

چمپا کے من میں ایک نئی چنتا نے جنم لیا، قرضہ کو تو وہ بالکل بھول ہی گئی تھی۔ ٹھیک ہے وہ روپیہ دے دیگی۔ روپیہ رکھ کر کرے گی بھی کیا۔ اُسے نہ روپئے سے محبت ہے نہ اپنے آپ سے۔ اور نہ ہی اس زندگی سے۔ کبھی اُس کا جی چاہتا کچھ کھا کر مر جائے، اور وہیں چلی جائے، جہاں موہن چلا گیا ہے۔

اچانک ایک دن گلی کے ایک کونے والے گھر سے رونے چیخنے کی آواز اُٹھی۔ پتہ چلا، غلامی ہر کھو کوتے ہوئی اور

وہ ایک آدھ گھنٹے میں چٹ پٹ ہو گیا۔ ٹھیک اُس کے دو چار گھنٹے بعد اُس کی بیوی بھی مر گئی۔ پھر موت نے اُس کے بچّے کو آدبوچا۔ بات پھیلتے دیر نہ لگی، ہیضہ پھوٹ پڑا ہے۔ اور دو گھروں میں اس کے آثار دکھائی دئے۔ دوپہر تک کئی گھر اس کی زد میں آ گئے۔ ساری گلی میں ایک خوف سا چھا گیا۔

کمپنی کا ڈاکٹر آیا، اُس نے سب کو ٹیکہ لینے کو کہا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ چمپا کے پاس پڑوس کے لوگ بھی چلے گئے۔ اُنھوں نے اُسے بھی چلنے کو کہا لیکن وہ نہیں گئی۔ ساری گلی میں صرف دو چار ہی لوگ رہ گئے۔ گلی سنسان ہو گئی۔ رات کے سنّاٹے میں وہ ویرانی اور گمبھیر ہو اُٹھتی جیسے رونے والے کُتّے کی آواز اور بھیانک بنا دیتی۔ رات کو دن کی حرارت میں جھلسی ہوئی ہوائیں چلتیں، اور گلی کے درخت سسکیاں سی لیتے محسوس ہوتے۔ چمپا حیرت و استعجاب میں قدرت کے اِس قہر کو دیکھتی۔ گلی میں بہت ساری موتیں دیکھ کر اُسے زندگی سے اور زیادہ بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔

ایک رات موتی بڑے زور سے بھونکا۔ اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا... بلبیر مستری ڈولتا ڈگمگاتا سا گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

مستری نے گھر میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چمپا دوڑ کر کوٹھری کے اندر گھس گئی، اور اُس نے بھی اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

بلبیر دروازہ کھٹکھٹاتا ہوا بولا "دروازہ کھولو...!" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، وہ نشہ میں تھا۔

وہ اندر سے بولی "جاؤ چلے جاؤ مستری جاؤ....."

"نہیں رے چمپا، میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا... ساتھ لیکر جاؤں گا۔"

"کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا...!"

"میرے تیرے بارے میں سبھی جانتے ہیں...."

"ہم سے تمہیں اتنا موہ کاہے ہے...؟"

"بھگوان جانے ہم تیرے بنا نہیں رہ سکتے۔"

"موہن بھی تو یہی کہا کرتا تھا کہ وہ میرے بنا نہیں رہ سکتا لیکن کیسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے اکیلی ہی چھوڑ گیا۔"

"اُس کا نام مت لو... میرے سامنے اُس کا نام مت لو۔" مستری دروازہ پیٹنے لگا۔

چمپا بولی۔ "اگر موہن ہوتا تو کیا تم اس طرح آکر دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمّت کرتے....!؟"

"کرتا۔ ضرور... کرتا" وہ پھر دروازہ پیٹنے لگا۔

"تبھی نہ مارا گیا۔"

"مارتا نہیں تو کیا کرتا تیرے لئے سب کچھ کرنا پڑا۔"

چمپا کے جسم میں سہرن سی دوڑ گئی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "پر اُسے تم نے مارا کیسے تھا، یہ تو کبھی نہیں بتایا...!"

"تم سُن کر کیا کرو گی..." بلبیر مستری کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

"بتاؤ، تبھی دروازہ کھولوں گی.....!"

"تو سُنو...!" مستری دانت چبا چبا کر کہنے لگا "جس دن اُسکی موت آئی تھی، اُس دن ہُوا ایسا کہ چندو نے اُسے بہکا کر کہا تھا، تو میر ساتھ جنگل میں گئی ہوئی ہے۔ بس اِسی غصّہ میں وہ کارخانہ سے پاس لیکر جنگل کی طرف آیا۔ اور پھر میں نے جو جنگلی آدمی تیار کر رکھے تھے، اُنھوں نے اُسے پکڑ کر...."

(بقیہ صفحہ ۱۴۶ پر دیکھئے)

اکرام جاوید

دُھواں

آسمان پر چاند تاروں کے چراغ اور زمین پر فرحت ہوٹل کی روشنیاں جل رہی ہیں اور فرحت ہوٹل کے چمن کے ایک پُرسکون گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا میں سوچ رہا ہوں کہ آج ہر شے سے دُھواں سا کیوں اُٹھ رہا ہے۔ نیلے آسمان کا بھرپور چاند ہو کہ فرحت ہوٹل کے بلب سب ہی جل رہے ہیں۔ یہ کیسی آگ ہے جو آسمان پر چاند ستاروں کو اور زمین پر پھولوں اور انسانی دلوں کو جلائے جا رہی ہے۔ یہ آگ جو جل رہی ہے، جلا رہی ہے مگر جس کے شعلے دکھائی نہیں دیتے۔ دُھواں بھی کم اُٹھتا ہے۔ اور کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن آج میری آنکھوں کو یہ کیسی بصارت مل گئی ہے۔ آج میں ساری کائنات کو شعلوں میں گھرا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہر طرف دُھواں پھیلا ہوا ہے۔ موت اور تباہی کا دُھواں، تنگ نظری اور تعصّب کا دُھواں، نفرت اور تشدّد کا دُھواں، خود غرضی اور خونخواری کا دُھواں، . . . میں اِس دُھوئیں کو کیا نام دوں ——؟ یہ بے نام اور پُراسرار دھواں جو فضا میں زہریلے ناگ کی طرح پھن اُٹھائے بل کھا رہا ہے —— !

میں نے جنگل کی آگ نہیں دیکھی ہے۔ میں نے چنار کے خشک درخت کو جلتے ہوئے نہیں دیکھا ہے پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ جنگل کی آگ کیسی ہوتی ہے۔ اور چنار کا خشک درخت کس طرح جلتا ہے۔ اِس لئے کہ میں نے شہروں اور دیہاتوں میں شعلہ بدوش انسانی آبادیاں دیکھی ہیں۔ اِنسانوں کو چنار کے خشک درختوں کی طرح جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ آگ اور دُھوئیں کے پس منظر سے ایک انسانی پیکر اُبھر آیا ہے۔ سُوکھا سُکڑا، سیاہ فام، متوسط قد کا ایک بوڑھا جس کی عُمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہے۔ اُس کے جسم میں سیاہ جلد کے نیچے گوشت کم اور ہڈیاں زیادہ ہیں۔ اُس کے لمبوترے بدوضع سر پر میل اور گرد سے اَٹے ہوئے نیم سیاہ اور نیم سفید بالوں کا بَن سا اُگا ہوا ہے۔ چہرے کا رنگ انتہائی سیاہ ہے۔ جیسے جلی ہوئی لکڑی کا کوئلہ۔ اور رُخساروں کی ہڈیاں کچھ اس طرح اُبھری ہوئی ہیں کہ اُس کا سیاہ بے رونق چہرہ، گھنی سفید مائل ابروؤں تلے دھنسی دھنسی سی لال انگارہ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پھیلے ہوئے دہانے کے اندر سے نظر آنے والے باقی ماندہ زرد نیلے دانتوں کے ساتھ کسی مُردہ چمگادڑ یا زخمی لگڑبھگے جیسا بھیانک اور خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ وہ اِس وقت میلی اور جا بجا پیوندوں سے مزیّن خاکی قمیص اور پھٹے ہوئے ہرک کے پاجامے میں ملبوس ہے۔ آدمی وضعدار ہے اِس لئے ننگے سر تو پھرتا ہے لیکن ننگے پیر نکلنا گوارا نہیں کرتا۔ اِس وقت بھی اُس کے پاؤں میں ربر کی برسوں پُرانی گھسی پھٹی اور ٹوٹی ہوئی ایک چپّل موجود ہے۔ اِن تمام چیزوں سے اُس کی غُربت اور خستہ حالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سُوکھا سُکڑا ساٹھ برس کا یہ بوڑھا، چنار کا خشک درخت، غلام علی ہے۔ جامعہ سُلطانیہ کا علٰحدہ کردہ اُستادِ عربی غلام علی اب بھی علم و حکمت کے انمول خزانے اپنے سینے میں پنہاں رکھتا ہے۔ کسی زمانے میں عربی صَرف و نحو پر اُسے اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ فلسفہ اور ادب پر اُسے کامل عبور حاصل تھا اور وہ پورے قرآن مجید کا حافظ تھا۔ وہ اب بھی فلسفہ اور ادب پر عبور رکھتا ہے؛ حافظ قرآن ہے، زندگی کے اِسرار سے اچھی طرح واقف بھی ہے مگر اب علم و حکمت کا کوئی قدردان نہیں ہے۔ اب وہ محلّے کی مسجد میں بچّوں کو صبح کے وقت قرآن پڑھایا کرتا ہے

اس کا کوئی معاوضہ مقرر نہیں ہے۔ تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی ہے جو صرف چند دنوں کے لئے کافی ہوتی ہے اور مہینے کے باقی دن سخت کشمکش میں گزرتے ہیں۔ گھر میں کھانے والے پورے آٹھ افراد ہیں۔ اُس نے جوانی کے آخری زمانے میں شادی کی تھی اور اب وہ ساٹھ برس کا ہو چکا ہے۔ لیکن اُس کے نصف درجن بچوں میں سب سے چھوٹی بچّی کی عُمر صرف چھ سال ہے۔!

آپ نے غلام علی کو دیکھا ہے انوار صاحب؟

میں خیالوں کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھر آتا ہوں۔ اور چالیس برس کا کسرتی بدن اور ہنس مکھ چہرے والا سانولا سلونا حسّام مجھے گھورتے ہوئے سامنے والی کُرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

"آج تک میں نے اتنا پُر اسرار آدمی کبھی نہیں دیکھا۔" حسّام سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہتا ہے "ویسے اُسے دیکھتے تو سب ہی ہیں مگر دیکھنے والی نظروں کو وہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایک حقیر و فقیر سا کمزور اور بدوضع بوڑھا کتنا قابل اور لائق ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا انوار صاحب۔ وہ اِس عُمر میں بھی جوان آدمیوں کی طرح سوچتا اور زندگی کے لئے کشمکش کرتا ہے۔ وہ خدا پرست بھی ہے اور خدا کو بُرا بھلا بھی کہتا ہے۔"

"یہ اُس کی عظمت کی نشانی ہے۔" میں آہستہ سے کہتا ہوں۔

"عظمت وظمت تو نہیں جناب۔" حسّام لاپرواہی سے کہتا ہے "وہ خدا پرست اِس لئے ہے کہ وہ اپنے علم سے اُسے پہچانتا ہے اور خدا کو بُرا بھلا اِس لئے کہتا ہے کہ وہ اُس کی مدد نہیں کر رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ بھی آپ لوگوں کی طرح ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ مگر اُسے مُلازمت نہیں مِل رہی ہے۔"

"ملازمت تو ہم لوگوں کو بھی نہیں مِل رہی ہے۔ ہم جو جوان ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔" میں تلخی سے کہتا ہوں۔ "اِس دَور میں جو لوگ جیتے ہیں واقعی کمال کرتے ہیں۔"

"غلام علی تو مر رہا ہے۔ اکیلا ہی نہیں بلکہ اپنے خاندان کے آٹھ افراد کے ساتھ" حسّام تاسف بھرے لہجے میں کہتا ہے۔ "بے چارہ مُلازمت کرنا چاہتا ہے اور مُلازمت اُسے نہیں مِل سکتی۔ بچّوں اور بڑوں کے لئے وہ عربی کا اسکول کھولنا چاہتا ہے، مگر اُس کے پاس سرمایہ نہیں اور پھر اِس زمانے میں عربی اسکول کا چلانا بہُت مشکل کام ہے۔" حسّام رُک کر کہتا ہے۔ "آج وہ صبح سے بھُوکا تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچّے بھُوک سے بِلک رہے تھے۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا اُس کی عادت نہیں ہے۔ میں نے خود سے ہی اصرار کر کے اُسے کچھ پیسے دے دیئے۔ اور اب وہ گھر گیا ہے"۔

"حسّام صاحب" بات میرے مُنہ تک آ کر رہ جاتی ہے۔ اِس زمانے میں سیکڑوں ہزاروں لوگ اِسی طرح بسر کرتے ہیں۔ بہرحال آپ نے رات بھر کے لئے اُسے فکرِ معاش سے نجات دِلا دی۔ مگر رات کے بعد جو صُبح آئے گی اُس کا کیا ہوگا؟ کل غلام علی اور اُس کی بیوی اور بچّوں کا حلق کیسے تر ہو سکے گا؟ بے روزگاری اور ہولناک گرانی کے تاریک دَور کا انجام کیا ہوگا؟ کب تک انسان، انسان کی خود غرضی اور سفّاکیت کے جبر کا شکار ہوتا رہے گا۔ کب تک مسرّت اور آسودگی کے لئے انسان کی رُوح ترستی رہے گی۔ آخر اس دَرد کا علاج ہے بھی یا نہیں ــــ؟ بے شمار سوالات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ خیالات کی تیز و تُند موجوں پر بہتا ہوا میں اپنے گھر چلا آتا ہوں۔ ایسے ہی سوالات میرے گھر کے در و دیوار کرنے لگتے ہیں۔ میرا کمرہ مجھ سے پُوچھتا ہے کہ آج دن بھر جو تم تلاش میں دربدر بھٹکتے رہے اُس سے کیا حاصل ہوا؟ میری بوڑھی بیوہ ماں کی سوالی نگاہیں مجھ سے کچھ اور فریب اور جھُوٹی تسلیاں چاہتی ہیں۔ میری کتابیں، میرے افسانے اور کہانیاں اور شیشے کے فریم میں لگی ہوئی ڈگری مجسّم سوال بن جاتی ہے اور میں بستر پر دراز ہو جاتا ہوں۔ اور نیند آنکھوں سے یُوں دُور بھاگتی ہے جیسے غلام علی سے زندگی بھاگ رہی ہے۔!

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ سویرے اُٹھ کر نیند آلود آنکھوں سے ٹیبل پر پڑے ہوئے کال لیٹر کو دیکھتا ہوں تو

یاد آتا ہے کہ آج دن کے نو بجے ملازمت کے سلسلے میں مجھے انٹرویو کے لئے دفترِ روزگار جانا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ اور دفترِ روزگار جاتے ہوئے سوچتا ہوں کہ زندہ رہنے کے لئے مجھے وہ کام کرنا ہی پڑے گا جیسے سب ہی کر سکتے ہیں اور جس کو میں انجام بھی دُوں تب بھی کوئی اور ایسے کر سکتا ہے۔ اور میرا کام جسے میرے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس کام کو میں اب اچھی طرح انجام نہ دے سکوں گا۔ شدتِ احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اور خیال آتا ہے کہ میں کہاں دولت کے لئے مرتا ہوں۔ میں تو صرف پیٹ بھر کھانا، تن بھر لباس اور سر چھپانے کے لئے موزوں جگہ اور اپنے فن کا جادُو جگانے کے لئے فرصت اور ذہنی سکون چاہتا ہوں۔ لیکن فن پر زندہ رہنا مشکل ہے۔ صرف کہانیاں لکھ کر کوئی بھی سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اِن ہی خیالوں میں کھویا ہوا میں دفترِ روزگار پہنچ جاتا ہوں۔ انٹرویو دے کر گھر واپس ہو جاتا ہوں ـــــ!

راستے میں فرحت ہوٹل کے قریب وہی کالا کلوٹا ڈراؤنی شکل کا بُوڑھا غلام علی دکھائی دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھوں سے مجھے گھُورتا ہے۔ اور انتہائی بے بسی سے کہتا ہے "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو آیئے ہوٹل میں چل بیٹھیں۔ آج دن بھر گھر ہی میں پڑا رہا۔ بڑی وحشت اور گھبراہٹ ہو رہی ہے چلئے باتوں سے جی بہل جائے گا"

اور میں خاموشی کے ساتھ ہوٹل میں چلا جاتا ہوں۔ ایک چائے کی پیالی کو دو برابر حصّوں میں بانٹ کر پینے کے بعد ہم دونوں باتوں میں معروف ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا غلام علی خالص علمی اور ادبی زبان میں گفتگو کر رہا ہے اُس نے الفاظ کی صُورت میں اپنی مجبور زندگی کا نقشہ میرے ذہن پر کھینچ دیا ہے۔ مجبور اور تاریک ترین زندگی کی کہانی اپنے نقطۂ عُروج پر پہنچتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے۔ "میرا لڑکا جس کی عُمر دس سال کی ہے، ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر سرکاری دواخانے میں پڑا ہُوا ہے۔ اُس کی حالت نازک ہے۔ جانے کب شمعِ زندگی گُل ہو جائے"

اور کوئی سخت سی شے میرے سینے میں آکر پھنس جاتی ہے۔ دِل تڑپ جاتا ہے۔ سارے ماحول پر غم اور یاس کا تاریک غُبار چھا جاتا ہے۔ بوڑھا کبھی کا جا چکا ہے۔ اور میں ندھیرے خیالوں میں گم سُم صُورت بنا بیٹھا ہوں۔ اُوپر نیلے آسمان پر سفید ابر کے بے شمار ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ اور مجھے دکھائی دیتا ہے جیسے اِن سفید بادلوں کے درمیان ایک دس سالہ بھُوکا ننگا لڑکا کھڑا اچھل اچھل کر رو رہا ہے۔ اور اُس پر موت کی سیاہ چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ اُسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اُسے میں بھی نہیں بچا سکتا۔ اِس لئے کہ اُس کا باپ ایک ساٹھ برس کا گھِسا پِٹا بوڑھا ہے۔ اور اِس بُوڑھے کے پاس علم و ہُنر تو ہے مگر دولت نہیں ہے۔ جو شخص خود پیٹ بھر نہ کھا سکے۔ اور اپنی بیوی اور بچّوں کو روٹی کا ایک ٹکڑا تک وقت پر فراہم نہ کر سکے۔ وہ اِس مرتے ہوئے بچّے کو کیا بچا سکتا ہے۔ موت تو ایک تباہ کن اور بڑی زبردست طاقت ہے۔ موت جس کے ادنیٰ ایجنٹ ہیں۔ یہ ذخیرہ اندوز کالے بازار کے شہزادے، جنگ باز اور انسانوں کو زندگی کے حق سے محروم کر دینے والے شیطان۔ اِس بچّے کو دنیا میں بڑے بڑے اور قابلِ فخر کارنامے انجام دینے ہیں۔ دُنیا کے سنوارنے اور سجانے کے لئے اس کی خدمات ضروری ہیں۔ مگر موت کا سایہ اُس پر پڑ چکا ہے۔ اِسے بچانے کے لئے دوا چاہئے، قیمتی دوائیں اور انجکشن درکار ہیں۔ اور روپیہ تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ میں جو کہانیاں لکھتا ہوں۔ میں جس کی اپنی کوئی آمدنی نہیں ہے۔ اور جو اپنی ڈگری کے بل بُوتے پر ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ میرا دستِ خودداری بھی روپے کے لئے عزیز رشتہ داروں کے آگے پھیلتا ہے۔ ایک تشدد ہے جس کے ذریعے انسان کی شخصی عزت اور خودداری کو مکمل تباہ کیا جا رہا ہے اور مسخ شدہ رُوحوں اور نفرت بھرے دلوں کی فصل اُگائی جا رہی ہے۔ میرے معبُود۔ جب یہ فصل تیار ہو جائے گی تو تیری دُنیا کا کیا ہو گا ـــــ؟

اُس رات بھی نیند آنکھوں سے دُور مجسّم سوال بنی کھڑی رہتی ہے۔ رات بھر ذہن خیالوں کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے۔ صبح سویرے اُٹھ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ ٹہلتے ٹہلتے فرحت ہوٹل تک آجاتا ہوں۔ فرحت ہوٹل پر ابھی رات کا خمار باقی ہے۔ فضا میں ہر طرف ہلکا ہلکا سا دھواں اب بھی اُٹھ رہا ہے۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میری نظر سیاہ فام سُوکھے سُکڑے بُوڑھے غلام علی

پر پڑتی ہے جو ایک پانچ چھ سال کی کالی کلوٹی میلی کچیلی معصوم مُورت بچی کے ساتھ نہاری کی دیگ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ بچی کی بھوکی للچائی ہوئی نظریں نہاری کی دیگ اور گرم گرم کلچوں کے انبار سے ہٹ کر میری طرف اُٹھ جاتی ہیں، اور پھر سہم جاتی ہیں۔ اُس کے موٹے موٹے گالوں پر جمی ہوئی آنسوؤں کی لکیر پگھل کر بہنے لگتی ہے۔ اور اُس کا بوڑھا باپ غلام علی سٹ پٹا جاتا ہے۔ اُس کے ہاتھوں سے المونیم کا میلا میلا سا کٹورہ فرش پر گر جاتا ہے۔ اور دُوسرے ہی لمحے وہ جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیتا ہے۔ اُس کی لال انگارہ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک گہری دُھند میں ڈوب جاتی ہیں۔ یُوں لگتا ہے جیسے وہ ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اُبلنے والے سات سمندروں کو ایک ہی سانس میں پینے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اُس کی بھاری آواز لڑکھڑاتی ہوئی اُبھرتی ہے۔

"میری بچّی ہے۔ بھوکی ہے"!

میں اُس کی آنکھوں کی آگ اور آواز کی حدّت سے پگھلنے لگتا ہوں۔ کچھ دیر کے لئے سکتہ میں آجاتا ہوں۔ المونیم کا خالی کٹورہ لئے ہوئے بوڑھا غلام علی واپس جانے لگا ہے۔ اُس کی معصوم بھوکی بچّی رونے لگی ہے۔ وہ خالی ہاتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور اُس کا بوڑھا باپ جو عالم ہے۔ فلسفہ اور حکمت کو خوب جانتا ہے۔ موت اور حیات کی پیچیدہ گتھیوں کو خوبی سے سُلجھا سکتا ہے۔ مگر اب اس قابل نہیں ہے کہ اپنی چھ سالہ بھوکی بچّی کو نہاری اور کلچے کھلا سکے۔ میں ان دونوں کو اندر ہوٹل میں لے آتا ہوں۔ اُن دونوں کے لئے نہاری اور کلچوں کا آڈر دینا چاہتا ہوں کہ وہ کہہ اُٹھتا ہے۔

"نہیں میرے لئے نہیں۔ صرف اِسے کھلا دیجئے۔ رات بھر ستاتی رہی ہے یہ"۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے: "رات میں میرے بچے کا دواخانہ میں انتقال ہو گیا۔ رات ہی کو اُس کی لاش گھر لے آیا ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ لاش کب تک گھر میں رہ سکے گی۔ آدمی کو پیدا ہونے کے لئے روپیہ چاہیئے' دنیا میں بڑھنے زندہ رہنے کے لئے پیسہ چاہیئے۔ اور مرنے کے بعد بھی آخری سفر کے لئے پیسہ چاہیئے۔ کتنا عجیب چکر ہے۔ پیسہ پیسہ۔ تجارت۔ زندگی خود ایک تجارت بن گئی ہے"۔ وہ عجیب سے لہجے میں کہتا ہے۔ "زندگی کتنی سستی ہو گئی ہے بابا۔ ایک کیلو چاول کی قیمت سے بھی کم قیمت ہے"!

مجھ پر پے در پے بجلیاں سی ٹوٹ پڑتی ہیں۔ ہر طرف سے تیز بھڑکتے ہوئے شعلے مجھے گھیر لیتے ہیں۔ بوڑھے غلام علی کی آواز الفاظ کے شعلے برسا رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ بوڑھا غلام علی کتنے صبر و ضبط سے کام لے رہا ہے لیکن اُس کی باتیں، اُس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ ـــ کہیں بے چارے کے دماغ پر تو اثر نہیں ہو گیا۔ آدمی ہی تو ہے غریب۔ کوئی پتھر یا فولاد تو نہیں۔ مسلسل جبر و تشدد سے پتھر کی سخت چٹانیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور یہ تو ایک گوشت پوست کا کانچ سے زیادہ نازک پتلہ ہے۔ میرے دل میں درد کا ایک طوفانی سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اور غلام علی کی چھوٹی چھوٹی بوڑھی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تک نہیں ہے۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے"۔ مجھے اپنے لختِ جگر کے مرنے کا اتنا غم نہیں ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے مرنے کے لئے اور موت کے لئے وقت یا عُمر کی کوئی قید نہیں ہے اور پھر موت جسم کو آتی ہے انسان کو نہیں۔ میرا بیٹا جسم کی قید سے آزاد ہو کر ساری کائنات میں ہَوا اور خوشبو کی طرح پھیل گیا ہے۔ خیر یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح بچّے کی لاش کی تدفین کا انتظام کروں۔ میں ایک خلوت پسند آدمی ہوں۔ بڑے لوگوں سے میری جان پہچان نہیں ہے۔ ہر کس و ناکس کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہاں اتنی بے حیائی اور خود فروشی کے باوجود جی نہیں چاہتا ـ نہیں چاہتا ـ لیکن کیا کیا جائے"! بوڑھا غلام علی پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا ہے اور میرے دل و دماغ پر اُس کا ایک ایک لفظ برق بن کر گر رہا ہے۔ اِس بھیگی ہوئی ہوئی شکست خوردہ آواز میں کتنی بجلیاں کڑک رہی ہیں، کتنے شعلے لہرا رہے ہیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں کہ کس طرح اِس بوڑھے غم زدہ باپ کے درد کا مداوا کیا جائے۔ اِس لمحہ بوڑھے غلام علی کے لئے میں کٹھن سے کٹھن کام کر سکتا ہوں۔ بڑی سے بڑی

قربانی دے سکتا ہوں۔

"پھر میری نظریں بوڑھے کی معصوم بچّی پر جم جاتی ہیں جو میرے مقابل بیٹھی ہوئی نہاری اور کلچے کھا رہی ہے اور اس انداز میں نوالے اٹھا رہی ہے جیسے اُس کے دوسرے بھائی بہن اُس سے نوالہ چھین لیں گے۔ کھانے کے معاملے میں انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ اور اس زمانے میں تو لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگے ہیں۔ طاقتور کمزور کا کھانا چھین لیتا ہے۔ حقوق یافتہ غیر حقوق یافتہ لوگوں پر زندگی کی وسعتیں محدود کر دیتے ہیں۔ پانی میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے اور آبادی میں بڑا آدمی چھوٹے آدمی کو کھا جاتا ہے۔ یہ سب عام اور پُرانی باتیں ہیں۔ زمانے نے ترقی کی ہے تو اندازِ ستم بھی شائستہ ہو گئے ہیں۔ ظلم مگر ختم کہاں ہوا ہے؟ سوچتے سوچتے میں بہت دُور نکل گیا ہوں۔ میرے سامنے بوڑھا غلام علی مجسّم سوال بنا بیٹھا ہے۔ اُس کی معصوم بچّی نے کھانا ختم کر دیا ہے۔ اور اپنے میلے کچیلے ہاتھ میں کلچے کا بچا ہوا ٹکڑا لئے ننگا ہوں ہی ننگا ہوں میں اپنے بوڑھے باپ سے کہہ رہی ہے "اب چلو یہاں سے!"

"تم فکرمند کیوں ہوتے ہو بابا۔"؟ بوڑھے غلام علی کی آواز دھیرے سے بلند ہوتی ہے۔" دیکھو۔ میں اپنے بچّے کی میّت خیرات کے پیسوں سے اُٹھانا نہیں چاہتا۔ میں ابھی حالات سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے حالات بدلیں گے اور مجھے کوئی کام مل جائے گا۔ اور اُس وقت میں پائی پائی چکا دوں گا۔ تم اگر کسی سے مجھے قرض ہی دلا دو تو بہت ہے۔ میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

اور میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اِس زمانے میں قرض کا ملنا اتنا آسان کہاں ہے؟ ساہوکار سود پر روپیہ دیتے تو ہیں مگر ضمانت پر یا کسی قیمتی شے کو امانت رکھ کر دیتے ہیں اور میرے پاس کون سی ایسی شے ہے جسے گروی یا امانت میں رکھا جا سکتا ہے۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ بے کاری کے دِنوں میں کام آ چکا ہے اب عزیز رشتہ داروں کے رحم و کرم پر بسر ہوتی ہے۔ لیکن بوڑھے غلام علی کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

"تم کوئی اذیت لینا۔ مرا ہوا مردہ اور پکا ہوا کھانا زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ مگر تم اُداس کیوں ہونے ہو رہا؟"

مجھے اس آواز میں اپنے مرحوم باپ کی پیاری محبت بھری آواز سُنائی دیتی ہے اور کھوئی ہوئی اِس آواز کے ساتھ ہی والدِ مرحوم کی یاد آ جاتی ہے۔ اور پھر اُس سونے کی جیبی گھڑی کا خیال آتا ہے جو اب بھی والدِ مرحوم کی نشانی کی صورت میں محفوظ ہے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور میں بوڑھے غلام علی کو ہوٹل میں چھوڑ کر گھر کی طرف بھاگ آتا ہوں۔!

سونے کی اُس جیبی گھڑی کو لیتے ہوئے بوڑھے غلام علی کے سوکھے سکڑے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اور فرطِ جذبات سے رُندھی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہا ہے۔

"میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن یہ گھڑی۔ بالکل یہی گھڑی تمہیں واپس کر دوں گا۔ اُس وقت تک میں زندہ رہوں گا۔ یقین کرو۔"

بوڑھے غلام علی کے لہجے میں اب کی بار مایوسی کم ہے اور جوشِ عمل اور یقین کی گرمی زیادہ۔ اور مجھ پر سکتہ کا سا عالم طاری ہے۔ جب ایک ساٹھ سالہ سوکھا ٹکڑا کمزور بوڑھا آنے والے اچھے دنوں پر یقین رکھتا ہے تو پھر میں کیوں مایوسی کو دل میں جگہ دوں۔ میں جو ابھی جوان ہوں، صحت مند ہوں۔ میں ابھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ابھی وقت نہیں گیا۔! وقت کے سیلِ رواں میں کتنے لمحے، کتنے دن اور کتنے ہی ماہ و سال بہہ گئے۔

میں اپنے آفس کے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں۔ کھلی کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وقفے وقفے سے کمرے

میں داخل ہوتے ہیں۔ اور فضا کو تازہ گلاب کی خوشبو سے معطر کرکے واپس چلے جاتے ہیں۔ تازہ گلاب کی یہ خوشبو ملک اور قوم کی زندگی میں ایک خاموش انقلاب لائی ہے۔ حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ اور آج میں ایک ایسے محکمہ کا ذمہ دار عہدہ دار ہوں۔ جو امن محبت اور انسانیت کے اصولوں کو ملک بھر ہی میں نہیں ساری دنیا میں عام کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ گلشن وطن کا وہ پہلا سرخ گلاب جس نے سارے گلستان کی ازسرِنو تزئین کی، جس نے پھولوں کو کھلنا اور کھل کر مہکنا سکھایا۔ وہ سرخ گلاب آج گلستان میں نہیں ہے۔ مگر اس کی خوشبو اب بھی موجود ہے۔ ہمیشہ موجود رہے گی۔ کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو جنبش ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی کوئی متوالا جھونکا ہے جو گلاب کی خوشبو کو لئے ادھر سے آ رہا ہے۔ لیکن پردہ آہستہ سے اُٹھتا ہے۔ اور پھر اسی کے ساتھ ایک جانا پہچانا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔

میں چونک جاتا ہوں اور احتراماً اُٹھ جاتا ہوں۔ اور سفید ہرک کی شیروانی اور سفید پائجامہ میں ملبوس غلام علی کو حیرت سے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ اُس کے خزاں آلود سوکھے سیاہ چہرے پر اب وہ پہلی سی کرختگی نہیں ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دردوغم کی آگ کا پتہ نہیں ہے۔ بوڑھا غلام علی کسقدر بدل گیا ہے۔

"یہ سب تمہاری بدولت ہے بابا"۔ میری حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے بوڑھا کہہ رہا ہے۔

"تم نے اُس دن سونے کی جیبی گھڑی نہ دی ہوتی تو شاید اس وقت تک میں زندہ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔" اُس کی آواز احسان مندی کے بوجھ سے لرز رہی ہے۔ "میں نے گھڑی گروی رکھ کر اپنے بچے کی تدفین کا انتظام کیا اور باقی رُوپیوں سے ایک اسکول کھول دیا۔ . . . خدا کے فضل سے اب اسکول چل نکلا ہے۔ اور تمہیں صورت دکھانے کے قابل ہو سکا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اپنی شیروانی کی جیب سے ایک سُرخ مخملی ڈبیہ نکال کر میری طرف بڑھا دیتا ہے۔ "شکر ہے میں تمہاری امانت لوٹا رہا ہوں۔" اُسکی بھاری گونجدار آواز صاف اور پُرسکون ہے۔ "خدا آپ کو بے شک اس کا اجر دے گا۔"

"وہ تو خدا نے دے ہی دیا ہے قبلہ" میں حیرت اور مُسرّت سے کہتا ہوں۔ اور والدِ مرحوم کی یادگار سونے کی جیبی گھڑی کو جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ "آپ کو آمدنی کا ذریعہ مل گیا۔ یہی میرے لئے سب سے بڑا اجر ہے۔"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے غلام علی چلا جاتا ہے۔ اور میں برسوں پُرانی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ میری نگاہوں کے آگے نیلا آسمان اُبھر آیا ہے۔ جس پر سفید سفید بادلوں کے درمیان ایک دس سالہ بھوکا ننگا بچہ چلا چلا کر رو رہا ہے اور اس پر موت کی سیاہ چیلیں منڈلا رہی ہیں، اُسے لیکن اب بچایا جا سکتا ہے۔ اب اُسے کسمپرسی کے عالم میں بے وقت مرنا نہیں پڑیگا۔ اب کوئی بھی کلی بِن کھِلے، بِن خوشبو اُڑائے نہیں مُرجھائے گی ـــــ میں پُورے عزم و یقین سے سوچتا ہوں۔ زمین و آسمان کے درمیان اب بھی دُھواں بل کھا رہا ہے۔ موت اور تباہی کا دُھواں۔ غُربت و افلاس کا دھُواں، خود غرضی اور نفرت کا دھواں۔ ایٹمی دھماکوں کا دُھواں۔ اور ٹھنڈی ہوا کے نازک اور لطیف جھونکے تازہ گلاب کی خوشبو کو لئے اِس کالے دھوئیں کو صاف کرتے جا رہے ہیں۔ فضا صاف ہوتی جا رہی ہے۔ فضا صاف ہو ہی جائے گی ـــــــ!

ـــــــ بقیہ افسانہ "رسم اُلفت" صفحہ ۱۱۲ ـــــــ

گیا تو اُس نے ایک بار آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا "بچوں کے لئے رُوپے لائے ہو کشن؟" میں نے کہا کافی روپئے لایا ہوں کیلاش! رُوپوں کا فکر نہ کرو، پرماتما کے لئے تو اچھا ہو جا۔ اُس کے بعد کیلاش نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ کیلاش نے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا ـــــ اُس کے آگے میں کچھ نہ پڑھ سکا۔ میں بے حد سنگدل ہوں۔ میں اپنے باپ کی موت پر نہ رویا تھا۔ اس وقت آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں نہ روک سکا۔ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس وقت میرے ہونٹوں سے چند الفاظ نکلے ـــــ "کیلاش تمہارا کلیجہ بھی پتھر کا تھا۔ کیا رسم اُلفت کو یُوں نبھاتے ہیں ـــــ؟ کہ فرشتے بھی اُس راہ پر نہ چل سکیں ـــــ!

آمنہ ابوالحسن

ٹرمینس

وہ ایک کلرک باپ کا بیٹا تھا لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد پہلا خیال جو وجے کے دل میں پیدا ہوا، بڑا آدمی بننے کا تھا۔

اتفاق زمانہ کہیے یا شومیٔ تقدیر کمسنی ہی میں اُس کا باپ گُذر گیا اور اُسے ناچار بس ڈرائیور بننا پڑا۔
پچھلے کئی سال سے وہ مسلسل بس چلا رہا تھا۔ ہر روز اس کا واسطہ ایک نئی بس سے پڑتا اور اُن بے شمار اجنبی چہروں سے جو چند گھنٹے کے لئے اُسکی بس میں سوار ہوتے اور اپنی اپنی منزلوں پر اُتر جاتے۔ ڈیوٹی ختم کر کے تھکا ماندہ وہ منہ ہاتھ دھوتا کچھ کھا پی کر کسی گھنے پیڑ کی چھاؤں میں سُستانے پڑ جاتا یا کبھی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر بھوک پیاس سے بے پروا گپ ہانکتا۔ مسلسل محنت نے اُس کی ہیئت بگاڑ دی تھی تاہم وہ ایک پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ مضبوط متناسب اور خوبرو۔ عورتیں اسے دیکھ کر کھُس پھُس کرتیں، لڑکیاں دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتیں لیکن یہ سب تھوڑی دیر کے لئے ہوتا، پھر فوراً ہی وہ اُس کی شخصیت کو اس طرح بھُول جاتیں جیسے رات کے دیکھے ہوئے خواب کو صبح۔ اگر کسی کو اُس سے دلچسپی ہوتی بھی تو زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کے لئے جبکہ وجے کاروباری دلچسپی کا مطلق دلدادہ نہ تھا۔
کچھ دنوں تک اُسے اپنا کام دلچسپ بھی محسوس ہوا لیکن جلد ہی کرب و اضطراب اور تلاش و جستجو اُسکی زندگی سے بالکل زائل ہو گئے۔ بس میں سوار ہونے والی ہر نئی شخصیت سے چند منٹوں کا نظری تبادلہ باقاعدہ عمل کی طرح بے کیف اور بے جان ہو گیا۔ اس کے ربط اور تسلسل نے وجے کی زندگی سے وہ گرمی اور جولانی چھین لی جو عمر اور فطرت کا تقاضہ ہوا کرتی ہے ـــــ وجے کو اپنی زندگی مشین کا ایک پُرزہ محسوس ہوتی جو مشین کی حرکت تک اس کا ساتھ دیکر ساکت ہو جائے۔ سڑک اُس کی مستقل ساتھی تھی اور تھکن اس کا ناقابلِ تقسیم حصہ! فطری خواہشات نے اُس میں اِس حد تک دم توڑ دیا تھا کہ وہ خود کو انسان سمجھتے ہوئے بھی ڈر محسوس کرتا۔

بہت عرصہ پہلے کلوا نے اس کی توجہ بس میں سوار ہونے والی ایک لڑکی کی طرف مبذول کرائی تھی۔ لڑکی اکیلی تھی اور بے باک۔ اُس نے تھوڑی ہی دیر میں اپنے اطراف بیٹھنے والوں سے جان پہچان پیدا کر لی پھر راستہ بھر اُس کے قہقہے سب کے کانوں میں امرت گھولتے گئے تھے۔ کلوا نے مُسکرا کر پُوچھا تھا "کیوں ماسٹر ہے نا چیز؟" تو وجے کو کلوا کی بات بُری لگی تھی، لیکن لڑکی کا رویہ ہی ایسا تھا کہ وہ خُون کے گھونٹ پی کر چُپ رہ گیا کلوا کو ڈانٹ نہ سکا۔
وجے کو باتونی لوگ پسند نہ تھے اُس نے بچپن سے خاموش اور صبر طلب زندگی گذاری تھی جو تھوڑی بہت شرارتیں اور

شوخیاں اس کے بچپن کا حصہ تھیں وہی اس کا سرمایہ۔ تاہم اس نے کئی بار پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ یوں بھی وہ اس میکانیکی عمل کا عادی ہو چکا تھا۔ ہر اسٹاپ پر اُترنے اور چڑھنے والوں کو گردن گھما گھما کر دیکھتے رہنے کا لیکن اُس دن ایک عجیب سا خیال بھی اُس کے دل میں آیا تھا۔ کیوں نہ اگلے اسٹاپ پر جہاں بس تھوڑی دیر کے لئے رُک جاتی ہے وہ بھی اس لڑکی سے بات کرے لیکن اگلے ہی لمحے لڑکی کے قہقہوں نے اُس کے رونگٹے کھڑے کر دئے اور اُس نے کانوں پر دستی لپیٹ لی۔ کلوا ہنس پڑا۔

"راستے کے گرد و غبار میں یہی تو چند چراغ ہیں ماسٹر۔ اگر انھیں بھی بجھا دو تو پھر اس سڑی بُسی پھیکی سیٹھی سپاٹ اور یکساں زندگی کا مطلب ہی کیا رہ جائے۔

سایہ دار درخت اللہ میاں نے تھکے ماندوں کو چھاؤں پہونچانے ہی کے لئے اُگائے ہیں۔ اگر کوئی سرپھرا انھیں راہ کی رُکاوٹ سمجھ کر کٹوا ڈالے تو اُن بے سہارا بدنصیب انسانوں کا کیا بنے جنھیں زندگی کے ریگستان میں چند لمحوں کے لئے بھی کوئی سایہ کوئی شلٹر نہ مل سکا۔"

وجے نے پریشان ہو کر کلوا کو دیکھا اور سوچا۔ کلوا کے اندر کا انسان اتنا معقول اور فلسفی کس طرح ہو سکتا ہے۔ کلوا جو ایک معمولی بس کلینر ہے، جس کی ساری زندگی صبر اور قناعت کے کڑوے پھل چباتے گذر گئی جس نے ہر اچھی چیز کو ہوس کی حد تک دیکھا اور آنکھوں کی زکوٰۃ سمجھا۔ تب ماتھے سے پسینہ پونچھ کر وجے پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا اور گاڑی درمیانی اسٹاپ پر پہونچ کر رُک گئی۔

کیلے، اُبلے ہوئے چنے، نمکین مونگ پھلیاں اور گُڑ سے بنی ہوئی مٹھائیاں بیچنے والے بس کے اطراف جمع ہو گئے۔ مردوں نے سگریٹ سُلگائے اور جلدی جلدی نیچے اُتر گئے۔ عورتوں نے باتیں ختم کر دیں اور بچوں کو سمیٹنے لگیں۔

بچے کھڑکیوں سے باہر کود جانے کے لئے بے قرار ہو گئے۔ پھر اُس مختصر سے لین دین کا وقتی سلسلہ چل پڑا جس سے وجے کو مطلق کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہ سارا تنگ عرصہ اُس کی زندگی کا ایک غیر محسوس مگر مستقل حصہ بن چکا تھا سو وہ بھی بس سے باہر کود پڑا۔

کلوا کو چائے لانے کے لئے بھیج کر وہ بڑے پیڑ کے نیچے کسی قدر ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ——— ہر طرف دُھول تھی اور خارش زدہ کتے، گاؤں کے وہ بچے جو دھوپ کی تمازت کے عادی بندروں کی طرح اُچھلتے پھر رہے تھے۔ کسی کسی مسافر کو نظروں میں تول کر بڑی ڈھٹائی سے اُس کے سامنے جم جاتے اور کچھ نہ کچھ لئے بغیر ہرگز نہ ٹلتے۔

یہ سب کچھ بہت اُکتا دینے والا تھا کہ اچانک ایک تیز خوشبو وجے کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وجے نے بوکھلا کر کلوا کو پکارنا چاہا پھر ہمت کر کے خود ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسی روشن تپتی ہوئی سخت دوپہر میں بھی اُسے جاڑے کی خنکی اپنے بدن میں تیرتی محسوس ہوئی۔

یہ وہی لڑکی تھی۔ لڑکی نے ایک کھُلا کھُلا اُڑتا ہوا قہقہہ لگایا، پھر دوپٹہ بڑی ادا سے سمیٹ کر لہراتی بل کھاتی ہوئی اُس کے قریب سے گذر گئی۔

وجے کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کے بدن کے سارے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

اُسی وقت کلوا ہوٹل کے چھوکرے کے ساتھ ناک سڑکتا اور گندی گالیاں بکتا ہوا نمودار ہوا اور وجے کا چہرہ دیکھ کر فوراً پیڑ کی اوٹ میں دبک گیا۔ پھر بڑی تھکی ہوئی بڑی حسرت بھری آواز میں آہستہ آہستہ گانے لگا۔

" تیری ناچک ناچک صورت کو. . . . "

"صورت کے بچے" وجے چلّا کر بولا۔ "جلدی جلدی کام نمٹا۔ یہ تیرا گھر نہیں اسٹاپ ہے۔"

"ماسٹر کی تو....." گالی کلوا کے ہونٹوں سے باہر نہ نکل سکی۔ وہ بڑی بے زاری سے کام میں جُت گیا۔

اس واقعے کے بعد ہی سبھی خواہشیں وجے کے دل میں بالکل فنا ہوگئیں۔ کتنی ہی عورتیں اس کی بس میں سوار ہوئیں اور اُتر گئیں۔ لڑکیوں نے قہقہے لگائے، ان کے دوپٹوں کے رنگ لوگوں کے دلوں پر دھنک کی طرح پھیل پھیل گئے لیکن وجے نے کبھی نظر اُٹھا کر اُنھیں نہیں دیکھا۔ سدھے ہوئے جانور کی طرح وہ ہر اسٹاپ پر انجن بند یا اسٹارٹ کرنے سے پہلے پیچھے ضرور مڑتا لیکن اس عمل میں کوئی لذت، کوئی مسرت، کوئی راحت نہ ہوتی کہ عرصۂ دراز کے بعد جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کے دل پر زندگی کا بوجھ ـــ پیچھے مڑتے ہی اس کی نظر ٹھٹک کر رہ گئی پھر یہ نظر اس کی اُونچی نشست کے بالمقابل بس کی پچھلی سیٹ پر ٹھہری رہ گئی اور اُسے اُس مقدس کتاب کا خیال آگیا جو شیلف میں رکھی ہر گیانی کی توجہ بے اختیار اپنی طرف کھینچے لیکن جسے ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک محسوس ہو کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔

کلوا ابھی تک نہیں آیا تھا وجے نے جیب سے دستی نکال کر برسوں کے اَن دُھلے میلے شیشے کو بڑی بے قراری سے صاف کیا۔

گرد ہر چیز کو دُھندلا دیتی ہے لیکن وقت کا طاقتور ہاتھ ـــــ ؟

بڑی مسرت سے مُسکرا کر اُس نے پھر صاف کئے ہوئے شیشے سے پیچھے دیکھا اور ایک نئی قوت نے حوصلے سے مغلوب ہو کر بس اسٹارٹ کر دی۔ کوئی بھولا بسرا گیت آپ ہی آپ اس کے لبوں تک کھنچا چلا آیا گیت جو ہمیشہ اس کے تحت الشعور میں محفوظ رہا آواز بن کر باہر نہ نکل سکا لیکن اب ـــــ بس اُس پالنے کی طرح ہلکی محسوس ہوئی جس کی ڈور ماں کے ہاتھ میں تھمی احتیاط سے کھنچ رہی ہو اور ہمیشہ کی گڑھوں بھری سڑک پھولوں بھری وہ روش بن گئی جس پر احتیاط سے چلنے کی مسرت وجے کی رگ رگ میں آگ بن کر سما گئی۔

کلوا حیرت سے اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے ماسٹر آج تو بہت مُسکرا رہے ہو"

اور وجے مسکراہٹ ضبط کر کے حاکمانہ لہجے میں بولا۔ "چُپ" پھر بس کو ہوائی جہاز سمجھ کر بڑے فخر سے اسپیڈ میں لیتا چلا گیا اور جہاں جہاں گڑھے آئے ایسی احتیاط برتی کہ کلوا کچھ نہ سمجھ کر بھی کان کھُجانے لگا اور لڑکی نے باہر جھانکنا ترک کر کے ایسی تعریفی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا کہ وجے کا سینہ مسرت سے فٹ بال بن گیا اور اس انجان اچانک لمحے کی گرفت اسکی زندگی پر اتنی مضبوط اتنی محیط ہو گئی کہ وہ سب کچھ بھول کر بڑی اُمید سے مستقبل کی طرف دیکھنے لگا۔

ماضی ایک ورق ہے ـــــ اور مستقبل ایک کتاب ـــــ !!

سچائی کے قرب اور اُس کی کشش نے ایکدم اُسے موہ لیا۔ پہلی بار اُس نے محسوس کیا وہ بھی ایک انسان ہے۔ اسکی بھی ایک منزل ہے، اُسے بھی وہاں پہونچنے کی جلدی اور چاہ ہے۔ تب وہ بڑی احتیاط سے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا، اور لڑکی ہر بار ذرا سا مُسکرا کر آنکھیں جُھکا تی رہی حتیٰ کہ شام کے اندھیرے میں روشنی کے جگنو تھرتھرانے لگے۔ بادلوں کے گھنے سائے اپنی پرچھائیاں سمیٹنے لگے۔ شہر پہونچنے کے لئے ایک گھنٹہ اور تین اسٹاپس رہ گئے۔

اگلے ہی اسٹاپ پر وجے نے پھول بیچنے والے سے ایک اچھا سا گجرا منھ مانگی قیمت پر خرید لیا اور بڑی احتیاط سے دستی میں لپیٹ کر آگے والے خانے میں رکھ لیا۔ جب سفر ختم ہو جائے گا، بس رُک جائے گی اور سب مسافر اپنے اپنے راستے چلے جائیں گے تو وہ یہ گجرا چُپکے سے لڑکی کو تھما دے گا اور بھاگ کر گھر جائے گا، جہاں اُس کی بوڑھی ماں اس کے اچھے مستقبل کے مسلسل انتظار میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گنوا چُکی ہے۔ جس نے اپنے گھر کے مُٹھی بھر آنگن میں مُدت ہوئی پھولوں کا ایک منڈوا ڈالا اور اس کی دیکھ ریکھ اور حفاظت اس طرح کرتی آئی جیسے کنجوس اپنے خزانے کی جی جان سے کرتا ہو۔ جو ہمیشہ اُس سے کہتی رہی، اس گھر میں بہو لا اور اس منڈوے کی حفاظت کر لیکن وجے نے کبھی اس بات پر سنجیدگی سے

غور نہیں کیا لیکن آج ـــــ؟

وجے نے دستی میں لپٹا ہوا گجرا بڑے اشتیاق سے ہونٹوں سے لگا لیا اور کھلتی ہوئی کلیوں کو پھول بنتے ہوئے دیکھنے لگا۔ صرف ایک اسٹاپ اور پھر ٹرمینس آجائے گا۔ اُس کی زندگی کا فیصلہ کن لمحہ ـــــ!

اس نے دستی سے چہرے کا پسینہ پونچھا اور بس کی رفتار کم کرنے لگا پھر اُترنے والوں کو بڑے لطف سے دیکھنے لگا۔

گھر پہونچنے کی بے تابی ـــــ!

ماں باپ بیوی بچوں بہن بھائیوں سے ملنے کی عجلت ـ سکون ـــ!!

زندگی کتنی پھیلی ہوئی، کتنی بڑھیا ہے ـــــ

اُسی وقت کلوا معنی خیز انداز میں مسکرایا تو زندگی میں پہلی بار وجے کو کلوا پر بڑا رحم آیا۔ زندگی کے ریگ زار کا تنہا مسافر۔ تپتا ہوا۔ تڑپتا ہوا ـــ کہ اچانک وجے چونک پڑا۔

لڑکی اپنی نشست سے اُٹھ کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسٹیرنگ پر وجے کی مضبوط گٹھیلی انگلیاں کومل شاخوں کی طرح کپکپا گئیں۔

تو کیا یہ آخری اسٹاپ سے پہلے اُتر جائے گی؟

مگر اُس کی ڈیوٹی تو ابھی ختم نہیں ہوئی؟؟

"نہیں نہیں" اس کے دل نے کہا۔ "اس طرح نہ بچھڑو۔ منزل کو آہی لینے دو۔"

مگر لڑکی نے ایکبار ہی آنکھیں جھکا لیں اور جلدی سے اُتر گئی۔

وجے نے اُسے روشنیوں کے پیچھے گم ہوتے دیکھا۔ دو آنسو بے اختیار اُس کی آنکھوں میں کھنچے چلے آئے۔

میری بوڑھی اماں۔ تیرا بیٹا وہ چقماق ہے جس کے سینے میں آگ چھپی ہوئی ہے لیکن جس کی کوئی انفرادیت کوئی زندگی نہیں۔ جو دوسروں کے لئے وقف ہے۔

اُس نے دستی میں لپٹا ہوا گجرا بڑی بے دردی سے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور ایک جھٹکے سے بس اسٹارٹ کردی۔

راہ پھر اس کی منتظر تھی لیکن اب اُسے آگے جانے کی جلدی نہیں تھی۔

زندگی کا ٹرمینس کب کا گذر چکا تھا ـــــ!!!

ــــــ (بقیہ افسانہ "کبوتری" صفحہ ۱۳۶) ــــــ

اور عین اُسوقت کوٹھری کا دروازہ کھُلا۔ چمپا تی ہوئی کلہاڑی اُٹھی اور بلبیر مستری کی کھوپڑی میں دھنس گئی۔

"آہ.....!" ایک بھیانک چیخ کے ساتھ وہ نیچے گر پڑا۔ جس طرح تنے سے کٹا ہوا درخت زمین پر آرہتا ہے۔ اُسکی چیخ بھونکنے والے موتی اور باہر رونے والے کُتّوں کی آوازوں میں کھو سی گئی۔

چمپا کھڑی ہانپ رہی تھی۔ سر کے بال چہرے پر بکھر سے گئے تھے۔ سارے جسم سے پسینہ چھُوٹنے لگا تھا۔ "اسی دن کا انتظار تھا۔" وہ بڑبڑائی "میں یہی سُننا چاہتی تھی تمہارے مُنہ سے مستری۔"

لالٹین کی روشنی میں اُس نے دیکھا سارا فرش خون سے بھر گیا تھا۔ بلبیر مستری کی لاش خون میں لت پت مُنہ کھولے پڑی تھی۔ کچھ دیر تڑپی بھی نہیں۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتی رہی۔ اور پھر خوفناک قہقہے لگانے لگی۔ پاگلوں کی طرح ہنستی ہوئی وہ گھر سے باہر گلی میں آگئی۔ اُسکی ہنسی کی آواز سُن کر رونے والے کُتّے لمحہ بھر کو اپنا رونا بند کر کے آہستہ سے غرّائے موتی چُوں چُوں کرتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے دَوڑا چلا آیا۔ گلی کے سنّاٹے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

چمپا ہنستی ہوئی گلی سے باہر دَوڑی چلی جارہی تھی، اور تاریکی میں کھڑے درخت خشک پتّوں کی تالیاں بجاتے مسکرا رہے تھے۔

تلوک چند محروم

○

دعائیں مانگئے کیا ترکِ آرزو کے لئے
کہ یہ بھی ایک تمنّا ہے جستجو کے لئے

بنائے خانۂ دِل آرزو سے ہے برباد
سِتم یہ ہے کہ بنا بھی ہے آرزو کے لئے

کچھ اور بات سہی، عرضِ مدّعا نہ سہی
ہیں اور بھی کئی موضوع گفتگو کے لئے

پڑی جو ہم پہ نظر میکدے میں واعظ کی
وہیں صراحی اُٹھا کر چلا وضو کے لئے

انہی میں بہہ گئی افسوس آبرُو اپنی
بہے جو اشک محبت کی آبرو کے لئے

اِسی لئے تو ہے بے چشم سوزنِ ہر خار
نہیں ہے دامنِ صد چاکِ گُل رفو کے لئے

چمن میں ہر گلِ تر سینہ چاک ہی محروم نہ جائیے گا تماشائے رنگ و بُو کیلئے

آنند نرائن مُلّا

پستیٔ حوصلۂ عام سے آگے نہ بڑھی — جو نظر حسن سرِ بام سے آگے نہ بڑھی
آگیا پاس تو ساقی کے بفیضِ مے و جام — گفتگو ذکرِ مے و جام سے آگے نہ بڑھی
زیست کے جبر سے کتنی ہی دلوں کی رُوداد — اشک آلودہ سی اک شام سے آگے نہ بڑھی
یہی کندہ ہے ہر اک تربتِ ناکامی پر — آرزو ولولۂ خام سے آگے نہ بڑھی
زیست دیتی ہی رہی شوق کو عنوان نئے — داستاں کوئی ترے نام سے آگے نہ بڑھی
نئی تنظیمِ چمن غم کا مداوا نہ ہوئی — یہ بھی رسمِ قفس و دام سے آگے نہ بڑھی
اس کو کیا کہہ کے بتاؤں تجھے میرے ہمدم — اک خلش جو غمِ بے نام سے آگے نہ بڑھی
کرنے بیٹھا تھا ترے جور کا شکوہ او رہات — فتنہ انگیزیٔ ایام سے آگے نہ بڑھی
میں نے چاہا تھا بھلادوں تجھے اے دوست مگر — یہ خطا وہ تھی جو اقدام سے آگے نہ بڑھی
کسی مقصد کی حرارت نہیں شامل تو حیات — مستیٔ رقصِ سُبک گام سے آگے نہ بڑھی
چشمِ آوارۂ مُلّا کی اُڑی تھی تو خبر — شکر ہے حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی

اِضطرابِ دُنیا

ایک کروٹ بڑی ہی لینے کو — مضطرب بار بار ہے دُنیا
جیسے اک مرگِ ناگہاں کیلئے — ہمہ تن بے قرار ہے دُنیا

میکش اکبرآبادی

تسے گیسو کی بُو غم کے مسافر پا ہی جاتے ہیں
صبا کتنا سنبھالے یہ تو کچھ لہرا ہی جاتے ہیں

نہ ہوں خوش جب بھی نظریں کچھ نہ کچھ فرما ہی دیتی ہیں
وہ بے مہکے ہوئے کچھ پھول تو برسا ہی جاتے ہیں

نہیں ہے منحصر غم اور خوشی پر آپ کیوں سوچیں
مری آنکھوں میں آنسو بے سبب بھی آ ہی جاتے ہیں

یہ شعلہ رُو حقیقت ہیں کہ دھوکا کچھ بھی ہوں لیکن
میں جب چھوتا ہوں میرے ہاتھ کو جھلسا ہی جاتے ہیں

کبھی گزرے دنوں کی یاد اُن کو آ ہی جاتی ہے
شکایت لے کے میری پاس میرے آ ہی جاتے ہیں

خوشی سے بھی دلوں کا خون ہو جاتا ہے اے میکش
یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو کمھلا ہی جاتے ہیں

غلام ربانی تاباںؔ

○

کرے گا کوئی خطاؤں سے درگزر کب تک
حیات لغزشِ پیہم سہی مگر کب تک

تمہاری بزم سے اُٹھنے کو اُٹھ تو آئے ہیں
یہ دیکھنا ہے بھٹکتے ہیں در بدر کب تک

اک آشیاں کی حقیقت ہی کیا رہے نہ رہے
گلوں کے دور میں اندیشۂ شرر کب تک

قدم قدم پہ سُناکر نویدِ منزل کی
فریب دے گی مسافر کو رہ گزر کب تک

یہ مشورہ تھا خرد کا کہیں کے ہو جاؤ ق پھروگے خاک اڑاتے اِدھر اُدھر کب تک
جنوں کا درس مگر دل کو سازگار آیا وہ دَیر ہو کہ حرم قیدِ بام و در کب تک

اگر یہی ہیں شب و روزِ عاشقی تاباںؔ
نہ ہوگا دل کا زیاں جان کا ضرر کب تک

ماہرالقادری

○

ترے نام سے جس کو نسبت نہ ہوگی
وہ افسانہ ہوگا حقیقت نہ ہوگی

خزاں سے کے تصوّر میں اسطرح گم ہوں
بہار آئے گی مجھکو وحشت نہ ہوگی

بہت شوخ ہیں میری گستاخ نظریں
خطائیں کروں گا ندامت نہ ہوگی

خدا جانے کب تک مرے ناصحوں کو
خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہوگی

سلامت رہے میری بزمِ تصوّر
وہ آئیں گے اور اُن کو زحمت نہ ہوگی

خزاں ہے غنیمت بہار آ نہ جائے
نشیمن بنانے کی فرصت نہ ہوگی

یہ روزِ ازل فیصلہ ہو چکا ہے
مسرّت شریکِ محبّت نہ ہوگی

بہت کچھ ہے اُن کے ستم کا سہارا
کرم کی بھی شاید ضرورت نہ ہوگی

جو سجدے میں دل بھی جھکے گا نہ ماہرؔ
وہ کچھ اور شے ہے عبادت نہ ہوگی

منظر صدیقی اکبرآبادی

یہ گُمان ہے غلط، زندگی سنور گئی
قدرِ آدمی کہاں، وضعِ راہبر گئی

یہ سُنا ہے آئیں گے بن کے وہ قرارِ دل
یعنی آہِ نیم شب اپنا کام کر گئی

آپ سیرِ ماہ کو باغ میں جو آگئے
پھول مُشکبو ہوئے چاندنی نکھر گئی

اَب بھی ظلم و جور میں اُن کے کچھ کمی نہیں
ہو یقین کس طرح خُوئے فتنہ گر گئی

جس سے تھی ضیا فروز صبح و شامِ زندگی
کس سے پُوچھئے کہ وہ زندگی کدھر گئی

کر گئی زہے نصیب مجھکو آشنائے غم
ملئے وہ نگاہ جو دل سے تا جگر گئی

قُربتِ جمال ہی جب نہ راس آسکی
آتشِ فراق ہی دِل کو خاک کر گئی

رہنمائے عشق ہے جب سے پرتَوِ جمال
تیرگی نکھر گئی، کلفتِ سفر گئی

آفتاب و ماہتاب ماند ہو کے رہ گئے
آپ کے شباب کی ضَو جدھر جدھر گئی

ہم سے منظرِ حزیں اُن کو واسطہ ہی کیا
اُن کو اِس سے کیا غرض ہم پہ جو گُذر گئی

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

یوں تو مجھے نشاط سے بھی ہے ربط
در اصل میں غم سے آشنا ہوں

صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں

تقدیرِ جنوں پہ ہنس رہا ہوں
تعبیرِ جنوں

ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

شفا گوالیاری

یاد اُن کی زندگیٔ مختصر کے ساتھ ہے　　مرحبا منزل ہماری رہگزر کے ساتھ ہے

ماورائے حدِّ خلوت چاہتا ہوں اُن کی دید　　ذوقِ نظّارہ بھی کیوں میری نظر کے ساتھ ہے

رہروِ گم کردہ منزل کا نہیں اتنا ملال　　خبر اُسکی مانگیے جو راہبر کے ساتھ ہے

خود ہی جلوہ بن گیا ہوں جلوہ گاہِ ناز میں　　شاید اُنکی بھی نظر میری نظر کے ساتھ ہے

ہے زوال النسل کو انسانیت ہی لازوال　　دیکھئے اک مُعتبر نا مُعتبر کے ساتھ ہے

خوفِ تشہیر، احترامِ حُسن، خودداریٔ عشق　　کشمکش کی ایک دنیا چشمِ تر کے ساتھ ہے

قافلے والو خبر تو لو کہ اپنا قافلہ　　راہزن کے ساتھ ہے یا راہبر کے ساتھ ہے

کون رویا ہے شبِ غم کر کے تاروں کو گواہ　　لرزاں لرزاں اک اُجالا بھی سحر کے ساتھ ہے

اپنی منزل پر پہنچ کر ہی رہوں گا بالیقیں

اے شفا میرا سفر اک دیدہ ور کے ساتھ ہے

مظہر امام

حسن بے پردہ تو ہے، عزم تماشا ہی نہیں — آنکھ موجود، مگر دیکھنے والا ہی نہیں

ناز کیا کیا تھا ہمیں اپنے اِس آئینے پر — غور سے دیکھا تو اپنا کہیں چہرہ ہی نہیں

رات بھر جاگ کے ڈھونڈا کئے ہم جلوۂ نور — صبح کو شمع ملی ہے تو اندھیرا ہی نہیں

اتنے نزدیک سے ہم تیری صدا کیا سنتے — دور سے تو نے کبھی ہم کو پکارا ہی نہیں

کتنے رستے تھے جو منزل کی طرف جاتے تھے — پاس پہنچے ہیں جو منزل کے تو رستا ہی نہیں

صبح کے بھولے تو ہو، شام کو واپس آجاؤ — اور یہ کہہ دو کہ تم نے مجھے چاہا ہی نہیں

محفلِ جشنِ طرب صبح تلک گرم رہی — خیر خواہوں کو وہاں ہم نے بلایا ہی نہیں

یوں بھی لکھتے تھے غزل ہم تو سرِ شامِ فراق — آج تو خیر، ملاقات کا وعدہ ہی نہیں

کیسے رکھو گے نئی قدر کی بنیاد امامؔ
تم نے کھوئی ہوئی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں

طرفہ بھنڈاروی

○

سوزِ غم کو دی ہوا، بادیدۂ پُرنم رہے
عمر بھر ہم دلنوازِ شعلہ و شبنم رہے

دُور اُس کی زندگی سے کیوں سوادِ غم رہے
جس کی قسمت میں تری زلفوں کا پیچ و خم رہے

جو تھا جیسا اُس نے ویسا ہی وہاں سمجھا ہمیں
آئینہ بن کر رہے جس انجمن میں ہم رہے

حُسن کی آرائشوں سے فطرتاً نسبت نہیں
کیوں جبینِ برگِ گُل پر قشقۂ شبنم رہے

پھوٹتی ہے شب کی ظلمت سے شعاعِ آفتاب
ہو گی تخلیقِ مسرت بھی، وجودِ غم رہے

آؤ مل کر کچھ کریں تنظیمِ نَو کا اہتمام
ناکہ شیرازۂ رنگِ چمن برہم رہے

اِس جہانِ رنگ و بُو میں کس کو حاصل ہے ثبات
دو گھڑی ہم بھی چمن میں صورتِ شبنم رہے

ختم ہوتی ہیں جہاں نقد و تعبیر کی حدیں
اُن خلاؤں میں ہمارے شوق کا پرچم رہے

اُن کی قُربت کیا کہیں، اُن کی عنایت کیا کہیں
جب بھی پہنچے ہیں وہاں طرفہؔ تو ہم ہی ہم رہے

قیصر قلندر

○

ویرانِ آرزو کا چمن، دیکھتے رہے
ہم یاد کی نحیف کرن، دیکھتے رہے

دل کی جراحتوں کی چبھن، دیکھتے رہے
رعنائیوں کا ایک گگن دیکھتے رہے

زلفوں میں کھو گئی ہے شبِ آرزو یہیں
تھکے ہوئے یہ دار و رسن دیکھتے رہے

ہر نقشِ پا کے لب پہ کھِلا آبلوں کا رنگ
راہِ طلب کی ایک چبھن دیکھتے رہے

حدِ نگاہ تک نہ تھا منزل کا کچھ نشاں
تصویرِ آرزو میں تھکن دیکھتے رہے

آبِ وفا تھا ہجر کے صحرا سے دو قدم
بے چارگیٔ تشنہ دہن دیکھتے رہے

موجِ ہوا میں انگبیں کی رچ گئی مہک
جانِ گلاب تیرا بدن دیکھتے رہے

جب چاند کا شباب کھِلا برف زار پر
وادی پہ چاندنی کا کفن دیکھتے رہے

مہکے ہیں آرزو کے چمن زار میں خیال
کس کس ادا سے جانِ ختن دیکھتے رہے

مینائے وقت میں ہے حوادث کی تُندمے
صبحِ ازل سے رنج و محن دیکھتے رہے

زلفیں سنوارتی ہوئی آئی عروسِ شام
خاموشیاں تھیں نغمہ فگن دیکھتے رہے

آئی خزاں چنار و چمن میں لگی ہے آگ
اس روپ میں بہا وطن دیکھتے رہے

موجِ خزاں نے چھین لیا رودِ گل سے رنگ
آشفتہ حال دشت و چمن دیکھتے رہے

قیصر کے لب پہ عارض و گیسو کی بات تھی
حسرت سے کتنے غنچہ دہن دیکھتے رہے

زیدی جعفر رضا

عشق فطرت کا تقاضا ہے تو ایسا ہی سہی
خود مشیت کا یہ منشا ہے، تو ایسا ہی سہی

جو بڑا پیار سے ہم نے اُسے مخلص سمجھا
اب اگر پیار بھی دھوکا ہے، تو ایسا ہی سہی

توڑنا دِل کسی بیکس کا سہارا دیکر
تم سمجھتے ہو کہ اچھا ہے، تو ایسا ہی سہی

جس نے پتھر سے خداؤں کے ابھارے ہیں نقوش
وہ اگر خاک کا پتلا ہے تو ایسا ہی سہی

ہم سنائیں گے بڑے شوق سے رازِ غمِ دل
آج جب آپ نے چھیڑا ہے تو ایسا ہی سہی

زندگی موت سے ٹکرانے کی کوشش ہی تو ہے
موت قربِ لبِ دریا ہے تو ایسا ہی سہی

اُن سے شکوہ نہ کسی بات کا کیجے جعفر
غم ہی تقدیر کا حصّہ ہے تو ایسا ہی سہی

خاور بانکوٹی

روشنی تو ہے، لیکن معتبر نہیں یارو!
اپنی آرزوؤں کی، یہ سحر نہیں یارو!

صبحِ نو کی راہوں میں دُود رنگ اداسی ہے
منتقل فقط اپنے بام و در نہیں یارو!

درد کا فزوں ہونا ورنہ غیر ممکن تھا
وقت اپنا پرسانِ چارہ گر نہیں یارو!

ہیں جنوں پرستی کے اور بھی چلن کتنے
صرف چاک دامانی معتبر نہیں یارو!

بعد و قربِ منزل سے لوگ آشنا کب ہیں
ورنہ سامنے تنہا رہگزر نہیں یارو!

زخم خوردہ سینوں کا جس میں درد ڈھل جائے
وہ فغاں سہی، لیکن بااثر نہیں یارو!

مہر و ماہ میں جن کو تم تلاش کرتے ہو
فرش پر وہ جلوے ہیں عرش پر نہیں یارو!

جن کا کام اُڑنا ہے، وہ طیور اُڑ لینگے
ناگزیر تو قیدِ بال و پر نہیں یارو!

سچ بتاؤ خاور کے فن کو پوچھتے کیوں ہو
شاعری (سمجھتے ہو جب) ہنر نہیں یارو!

علامہ شبلی

○

آگہی دشمنِ شوریدہ سَراں ہے اے دوست!
عشق ہر دور میں رُسوائے جہاں ہے اے دوست!

تھا اب ذوقِ پرستش کا بیاں ہے اے دوست!
یُوں تو کہنے کو وہی کوئے بُتاں ہے اے دوست!

سنگ ہی قسمتِ آشفتہ سراں ہے اے دوست!
زندگی کاہے کو ہے؟ کوہِ گراں ہے اے دوست!

ہر حقیقت ترے افسونِ تجلّی کے طفیل
رونقِ محفلِ افسانہ گراں ہے اے دوست!

سرفروشانِ محبت کا خدا حافظ ہے
ہر طرف معرکۂ سُود و زیاں ہے اے دوست!

دل کی آواز ملا دی تھی زباں سے جس نے
آج وہ شوقِ ہم آہنگ کہاں ہے اے دوست!

لالہ و گُل کو ملی ہے دلِ شبلی سے وہ آگ
سارا ماحولِ چمن جس سے تپاں ہے اے دوست!

واحد پریمی

○

اس طرح ظُلمتِ حالات پر آنسو نہ بہاؤ
سوز دل میں ہے تو خود شمعِ فروزاں بن جاؤ

راہِ حق پر جو چلے ہو تو بصد خندہ لبی
جتنے طوفان ملیں تم انہیں سینے سے لگاؤ

اے خرد مندو نہیں کچھ تو لحاظِ جنوں
پھول برساؤ کہ دیوانوں پہ پتھر برساؤ

ایک دن آپ وہ اس آگ میں جل جائیں گے
جن کے سینوں میں سُلگتے ہیں، مت بھڑکاؤ

غنچہ و لالہ بھی سہمے سے نظر آتے ہیں
اے نگہبانِ چمن اپنی ذرا خیر مناؤ

ہم پرستارانِ وفا کو نہیں کوئی پروا
تم بڑے شوق سے ہر فتنۂ جاں سوز اٹھاؤ

صرف آسودہ لبوں ہی پہ نوازش کیسی
پیرِ میخانہ ذرا تشنہ لبوں کو بھی پلاؤ

وقت اس کا متقاضی ہے کہ تم اے واحدؔ
اپنے اشعار سے سوئے ہوئے ذہنوں کو جگاؤ

اعجاز صدیقی

○

یہ دُنیا خالی تو نہیں انسانوں سے
ملتے رہیئے، اپنوں سے بیگانوں سے

کِس کو غرض ہے کون حقایق تک پہنچے!
کام تو چل ہی جاتے ہیں افسانوں سے

سب سے بڑا یہ سانحہ میخانہ ہے
پیمانے ٹکرا جائیں پیمانوں سے

یہ بھی نکلی جادوں ہی کا ایک سراب
منزل تک آئے تھے کن ارمانوں سے!

دیجئے کوئی آپ ہی دانائی کا ثبوت
نادانی تو ممکن ہے نادانوں سے

جاگ گیا ہے شاید ظرفِ بادہ کشاں
شور یہ اُٹھا ہے کیسا میخانوں سے؟

پانوٗں نہیں ہیں ابتک کانٹوں سے فارغ
ہاتھ ابھی تک اُلجھے ہیں دامانوں سے

شمع کو تم سے ربط ہے اپنی تابش تک
کون کہے، یہ محفل میں پروانوں سے

حلِ مسائل ہے اِن کی یہ طرزِ جنوں
بچ بچ کر کیوں چلتے ہو دیوانوں سے!

اُن کو بنا دو قتل نگہِ دولتمنداں
بھوک اُگے جن کھیتوں سے کھلیانوں سے

اندر اندر کھول رہی ہے آتشِ گُل
شعلے اور بھی اُٹھینگے گُل خانوں سے

قاتل ہیں ایک ایسی زباں کے درپئے قتل
جس نے رشتہ جوڑ دیا انسانوں سے

اور ابھی باقی ہے کتنی فصلِ جنوں؟
پوچھ رہے ہیں دیوانے، دیوانوں سے!

کچھ ہاتھوں میں پتھر ہیں بیتاب اعجازؔ
جھانک رہی ہیں کچھ آنکھیں ایوانوں سے!؟

کنھیا لال کپور

مجھے ٹکٹ دو

(سنگر کے ہندی افسانوں کا مجموعہ)

آج سے کئی صدیاں پہلے کی بات ہے کہ کوئی فلسفی دوپہر کے وقت چراغ لے کر گلیوں اور بازاروں میں گھوم رہا تھا کسی نے پوچھا "چراغ لے کر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ فلسفی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "انسان"۔ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر بھی اُسی فلسفی کی طرح گزشتہ اٹھارہ سال سے یعنی جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے تب سے چراغ لے کر انسان کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ لیکن انہیں آج تک اپنے مشن میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار اپنی جانی پہچانی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہیں۔

ہو جسکے دل میں درد وہ انساں نہیں ملا
لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے!

اس فلسفی اور ڈاکٹر سنگر میں محض ایک فرق ہے کہ ڈاکٹر سنگر ہنسنے اور ہنسانے والے فلسفی ہیں۔ فلسفی اور ہنسی! ہے نا! ہنسانے والی بات!

بیسویں صدی میں یہ سامیہ واد سے لے کر پریوگ واد اور پریوگ واد سے لے کر بھیتی واد تک بڑے بڑے واد جاری ہوئے یا جاری کئے گئے۔ ان سبھی کا تذکرہ کسی نہ کسی کتاب میں مل جاتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک واد کا جو اس صدی کی مخصوص دین ہے اور جس کے پیروکار کم از کم پینتالیس کروڑ لوگ ہیں، کسی پُستک میں ذکر نہیں ملتا اس واد کو کسی بہتر نام کی غیر موجودگی میں ہم "لومڑ واد" کہہ سکتے ہیں۔ لومڑ واد یعنی Foxism۔ جیسے جارج آرول نے Double-think کہا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ واد کچھ اس تیزی سے ہمارے دیش میں پھیلا جس تیزی سے کوئی وبا پھوٹتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اس کا شکار ہو گیا۔ میر نے کہا تھا ؎

وہ ہوئے ہم ہوئے کہ میر ہوئے
اُسکی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

طنز و مزاح

بیسویں صدی میں اس کی زلفوں کی جگہ "لومڑ واد" نے لے لی ہے۔ نیتا ہو کہ پروفیسر، ڈاکٹر ہو یا انجنیئر، ٹیچر ہو یا ایڈیٹر، سب لومڑ واد کا دم بھرتے ہیں۔ گفتار اور کردار میں اتنا فرق ہے کہ ڈاکٹر سنگر کو کہنا پڑتا ہے "ڈارون بھی کتنا مورکھ تھا جو سمجھتا تھا کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے وہ لومڑ تھے۔

ہندی کے نئے افسانوں کے مجموعہ "مجھے ٹکٹ دو" میں ڈاکٹر سنگر کا خاص موضوع لومڑ واد ہے۔ "مجھے ٹکٹ دو" افسانہ

کا مرکزی کردار ایک نیتا نہیں، ایک بہت بڑا اور مکار لومڑ ہے، جو ٹکٹ کا اس لئے حقدار ہے کہ وہ باقی لومڑوں سے زیادہ چالاک ہے۔ "جنتا کا نمائندہ" اور "آدرش نیتا" میں بھی اُن لومڑوں کا ذکر ہے جو ہمارے سیاسی اکھاڑے کے پہلوان ہیں۔ آدرش اسکول"، "ٹیگور اور کھیتی باڑی" نیز "داماد کا انتخاب" پڑھنے سے آپ کا تعارف اُن لومڑوں سے ہوگا جو ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ "جانچ کمیٹی" میں ان لومڑوں کا تذکرہ ہے جنہیں ہم عام فہم زبان میں انجینئر کہتے ہیں۔ دندان ساز کا بھی تذکرہ ہے اور "درد سوا ہوتا ہے" کہانی میں اُن لومڑوں کا تذکرہ ہے جو ہمارے تعلیمی میدان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ "ترقی کے منازل" میں ایک سے ایک بڑھ کر چالاک لومڑ کا ذکر ہے۔ آپ سنگر کی کوئی کہانی مضمون یا ایکانکی پڑھ لیجئے، آپ کی اس کردار سے ضرور بھینٹ ہوگی۔ ہندی اور اردو ادب کو ڈاکٹر سنگر کی یہ عظیم دین ہے۔

ڈاکٹر سنگر کا سماجی شعور اس قدر پختہ ہے کہ اُن کی نگاہ ہمارے سماج کی ہر ایک خامی پر پڑتی ہے۔ دیکھنے میں، اور دیکھنے ہی میں کیوں، حقیقت میں، سنگر صاحب اتنے شریف ہیں کہ آدمی اس بات کا قیاس تک نہیں کر سکتا کہ وہ بھی کسی پر کراری چوٹ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کرتے ہیں اور اس بھرپور انداز سے کہ جس پر یہ چوٹ کی جاتی ہے وہ تلملانے کے بعد مسکرانے لگتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "اگر میں آپ کی طرح ستیہ وادی ہوتا یعنی ست پرکاش سنگر ہوتا، تو اپنے متعلق یہی بات کہتا۔"

در اصل لگی لپٹی سے بچتے ہوئے سچی بات کہنا ہی طنز کی کامیابی کی کسوٹی ہے۔ سنگر صاحب اس نقطہ سے خوب شناسا ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عظیم اور کامیاب طنز نگار ہیں۔ "مجھے ٹکٹ دو" میں اُن کا طنز ہمارے موجودہ سماج کا صحیح تجزیہ کرتا ہوا، ہمیں اس بات کی چیتاونی دے رہا ہے کہ ہم کس تیز رفتاری سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ آنے والا تاریخ داں لکھے کہ ہماری تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہمارے سارے راشٹر نے مل کر خود کشی کر لی، طنز نگار سنگر ہمیں اس تشویش ناک حالت سے روشناس کرا رہے ہیں۔ طنز نگار تب ہی چوٹ کر سکتا ہے۔ جب اس کے دل کو چوٹ لگی ہو۔ جب تک یہ بات نہ ہو، اس کا طنز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

"مجھے ٹکٹ دو" ایک کتاب نہیں، سڑک کے کنارے پر لگا ہوا ایک عظیم سائن بورڈ ہے۔ اور اس سڑک پر ہمارا سماجی رتھ چلا جا رہا ہے۔ اس کا کوچوان شراب میں دُھت اور مسافر نیند میں مدہوش ہیں۔ اس سائن بورڈ پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔ "خطرہ! آگے ایک بہت خطرناک اور گہری کھڈ ہے۔ اس میں گر گئے تو رتھ تو چکنا چور ہوگا ہی، صدیوں تک تمہارے انجر پنجر بھی نہیں ملیں گے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ اگر رتھ کو پیچھے نہیں موڑ سکتے، تو کم از کم کوچوان ہی کو جگا دو۔"

"مجھے ٹکٹ دو" راج کمل پرکاشن دلی نے شائع کیا ہے۔ ۵۰۴ صفحات ہیں اور قیمت پانچ روپیہ

غلام احمد فرقتؔ کاکوروی

اُفقؔ لکھنوی میری نظر میں

تقریباً دو مہینے ہوئے جب ایک صاحب نے مجھ سے آکر کہا کہ کچھ لوگ دلّی، لکھنو اور حیدرآباد میں اُفقؔ ڈے منانے جارہے ہیں۔ مجھے یہ سُنکر بڑی ہنسی آئی کہ ایک چیز جو ابتدائے آفرینش سے خود اپنا نائٹ اور ڈے مناتی چلی آرہی ہے اُس کا صد سالہ ڈے منانا کیا معنی؟ اُفق کا صد سالہ ڈے منانے کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ کی دانست میں افق کو پیدا ہوئے سو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ حالانکہ جہاں تک افق کی پیدائش کا تعلق ہے اُس کا یوم ولادت تو آجتک بڑے بڑے پیغمبر اور رشی مُنی بھی نہیں بتا سکے۔ چہ جائیکہ ہم آپ۔

مگر ایک دن جب منورؔ لکھنوی میرے غریب خانہ پر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افقؔ کا یوم پیدائش نومبر کی آخری تاریخوں میں منانا طے پایا ہے تب مجھے احساس ہوا کہ اچھا یوم افقؔ سے مُراد افقؔ صاحب کے یوم پیدائش سے ہے۔ جن کے ہموطن ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے اور جو اپنے دور کے (جسامت سے قطع نظر) ایک بھاری بھرکم استاد فن تھے۔ اور جن کا کلام میں اب سے پچاس برس قبل کے بعض رسائل اور اخبارات میں پڑھ چکا ہوں۔ پھر جب لمعاتِ افقؔ پر میں نے نگاہ دوڑائی، اور افقؔ صاحب کا شجرۂ نسب دیکھا تو اِس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ہمارے ہندوستان میں ذرہ افقؔ کو جنم دیئے بیٹھا ہے۔ آجتک میں یورپ کے سائنسدانوں کی اِس تحقیق پر حیران تھا کہ انہوں نے ذرّہ سے ایٹم بم کیسے تیار کر لئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ان سائنسدانوں کی تحقیق سے قبل ہمارے ہندوستان میں ذرہ افقؔ کو پیدا کر چکا ہے۔ تو انکی تحقیق میرے سامنے ٹھنڈا نظر آنے لگی۔ اُفقؔ صاحب کے خاندانی سلسلہ کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ اگر ولی دکنی سے لیکر گوپی ناتھ امنؔ تک کوئی شاعر بھی نہ پیدا ہوا ہوتا تو بھی صرف ہمارے لکھنؤ کے محلے نوبستے کی مردم خیز سرزمین ہی اس کمی کو پُورا کرنے کو کافی تھی جس نے مطلع سے مقطع تک شعر و ادب میں وہ گلہائے رنگارنگ کھلائے ہیں کہ اب اُردو شاعری کسی دوسرے ادب کی دست نگر نہیں۔ اور اِن اساتذۂ فن نے ایسے ایسے ایٹم چلائے کہ بڑے بڑے دیوان دیوانوں کی طرح ساکت و صامت بنکر رہ گئے۔ اب افقؔ صاحب کے شجرۂ نسب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ اُن کے دادا کے دادا اودے راج مطلعؔ تھے۔ یعنی جہاں سے سورج اور چاند نکلتے ہیں۔ اُسکے بعد اُفقؔ صاحب کے پردادا منشی ایشوری پرشاد شعاعؔ پیدا ہوئے جو سپہرِ ادب پر آفتابِ سخن بن کر طلوع ہوئے اور جنہوں نے اپنی شعاعوں سے اُردو اور فارسی شاعری کو جگمگا دیا۔ اسکے بعد اُفقؔ صاحب کے دادا منشی پورن چند ذرّہؔ تشریف لائے جو اپنے دور میں ذرّہ سے آفتاب بن کر چمکے۔ اسکے بعد خود اُفقؔ صاحب کی آفاقیت جو شاعری کی ہر صنف میں ہمکو چھائی چھائی نظر آتی ہے یعنی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک محلہ نوبستہ ہمکو آباد نظر آیا۔ افقؔ صاحب کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنّا

کی یہ دلی تمنا تھی کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور اس ابرِ نیساں سے کوئی ایسا موتی پیدا ہو جو اپنی آب وتاب سے دنیائے سخن کو تابناک اور منوّر کر دے۔ چنانچہ اُفق صاحب کے بعد اُن کے صاحبزادے منشی بشیشور پرشاد منوّر پیدا ہوئے جو بحمدللہ آج ہم میں اور آپ میں موجود ہیں اور جو ہندی ادب کی مشہور تصانیف کو اردو دنیا میں روشن اور منوّر کر رہے ہیں۔ انکی رفیقۂ حیات تک شاعرہ ہیں اور میاں بیوی ابتک اس درجہ شعر و ادب میں گم ہیں کہ اُنہوں نے اولاد تک کی پروا نہ کی اور دونوں نے اشعار ہی کو اپنی اولادِ حقیقی سمجھ لیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ نجیب الطرفین شاعر کسے کہتے ہیں تو میں کہدونگا کہ جناب منوّر لکھنوی کو، بقیہ شعراء تو وہ ہیں جنکے سلسلۂ نسب میں کئی تھلیارے اِدھر اُدھر مُڑ گئے ہیں۔

مگر جناب منوّر لکھنوی سے مجھے اس معاملہ میں شکایت ضرور ہے کہ اُنہوں نے جہاں اپنے میں اپنے والدِ ماجد کے تمام اوصافِ حمیدہ پیدا کئے تھے وہاں کاش تھوڑی بہت رندی بھی اختیار کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بھلا باپ بیٹوں میں آپ نے کہیں ایسا بُعد بھی دیکھا ہے کہ ایک طرف محلے نولبستہ لکھنؤ میں رندِ بلا نوش باپ کی رندی کی قسمیں کھاتے ہیں اور دوسری طرف صاحبزادے دریا گنج دلّی میں کھڑے لوگوں سے اپنے تقویٰ کا حلف اُٹھوا رہے ہیں۔

تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

بہر حال اِس میں منوّر صاحب کی بھی خطا نہیں، بلکہ اسکی تمام ذمّہ داری اِس فلکِ کجرفتار پر عاید ہوتی ہے جو سیدھے جادے میں کجی پیدا کرنا اپنا مسلک سمجھتا ہے۔ مگر اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منوّر صاحب چہرے مہرے میں خواہ اپنے والد سے ملتے جلتے ہوں یا نہ ہوں مگر صلاحیتوں میں تو اسدرجہ اپنے والد سے قریب ہیں کہ اتنا قریب شاید ہی کوئی باپ اپنے بیٹے سے رہا ہو۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر، ناظم اور نثر نگار بھی تھے۔ ایک بلند مرتبہ رند، ڈراما نگار بھی صحافت نگاری، ناول نویسی اور مزاح نگاری ان کی گھُٹی میں پڑی تھی۔ اُنہوں نے رامائن کئی انداز سے نظم کی مگر اُن کی رامائن یکقافیہ منظوم جو اُنہوں نے اپنی کم عمری میں تصنیف کی تھی ایک شاہکار ہے۔ میری دانست میں ایک شاعر جو ایک قافیہ میں ہزاروں شعر نظم کر سکتا ہو وہ کلام کی کونسی ایسی صنف ہے جس کا قافیہ نہیں تنگ کر سکتا۔ اُنہوں نے مُسدّس مثنویاں اور قصائد میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنے ہمعصروں سے اپنا لوہا منوا لیا۔ وہ سناتن دھرمی بھی تھے اور رند مشرب بھی۔ گویا دونوں کے درمیان ڈھینڈا چیرے کھڑے تھے۔ سنجیدگی کے علمبردار بھی تھے اور بذلہ سنجی کے طرفدار، ان کی تصانیف و تراجم کی کثیر تعداد اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر فن مولا تھے۔ اُنہوں نے ملکی، قومی، مذہبی، درسی اور اصلاحی موضوعات میں جس پر بھی قلم اٹھایا اُس کا ناطقہ بند کر دیا۔ مہابھارت، رامائن والمکی، ناڈراجستان اور شریمد بھگوت کے جو فاضلانہ تراجم پنجاب میں رہ کر کئے، اُن کی عظمت آجتک دلوں پر نقش ہے۔

لمعاتِ اُفق میں اُفق صاحب کا جو مزاحیہ کلام درج ہے وہ اگرچہ بہت مختصر ہے اور صرف چار پانچ نظموں تک محدود ہے مگر اُسے پڑھ کر اُن کی نادر الکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اُنہوں نے مزاحیہ انداز میں جو پولیٹیکل نوحہ لکھا ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اللہ کرے ٹیکس کی جڑ پیڑ سے ہو ناس، کچھ بھی نہ کیا پاس
کمبخت نے لی کاڑھے پسینے کی کمائی لے لے ڈالے دریغا
چولھے کی یہاں فکر اُدھر ٹیکس کا جنجال، ہو کیوں نہ برا حال

؎ شیاں بھی ایک صاحب کا تخلص ہے۔

سرکار اُدھر اور اِدھر گھر کی لگائی ۔ ہائے وائے درلیغا
یکساں ہوا پانی کا برسنا نہ برسنا، چھوٹا نہ ترستا
غلّے کی گرانی ہوئی بنیوں کی بن آئی ۔ لے وائے درلیغا
ماں ہوگئیں شاہنشۂ جرمن کی نظر بند، ملکہ کی جگر بند
کیسی خبر اللہ نے افق ہم کو سنائی لے وائے درلیغا

اسی طرح ٹیکس نامہ کے عنوان سے اُن کی ایک نظم ہے جس کے تین بند ملاحظہ ہوں ۔

ہے انکم ٹیکس اہل ہند کے افلاس کا بانی
یہ ہے ہندوستاں کی بہتری کا دشمنِ جانی
یہ دولت لوٹنے کے واسطے ہے نادرِ ثانی
شہِ محمود غزنی ہے نہ احمد شاہ درّانی
نہتّا ہو کے لوٹے قافلہ جو یہ وہ ڈاکو ہے
رعایا کو یہ جیتا جاگتا گویا ہلاکو ہے

اُدھر تو زور ہے بے روزگاری کا گرانی کا
اِدھر نرغہ گروہِ فاقہ مستِ خاندانی کا
ٹیکس ہے اس پہ طرہ اور باعث نیم جانی کا
سواری نوکری بیوپار گھر ناج اور پانی کا

کہاں تک کوئی دے کچھ انتہا ہے ٹیکس دینے کی
نہ جانے دیگا منہ تک بجت کیا ہچکی پسینے کی

کاش کچھ عرصے کے لئے افق صاحب اِس دور میں پیدا ہو گئے ہوتے تو وہ انکم ٹیکس کے پوتوں، نواسوں اور پرپوتوں کو بھی انکم ٹیکس، سپر ٹیکس، سیلس ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، لینڈ ٹیکس ہاؤس ٹیکس، روڈ ٹیکس، برتھ ٹیکس، ڈیتھ ٹیکس کی شکل میں دیکھ لیتے ۔ اور یہ حشرات الارض قسم کے ٹیکسوں سے سب سے بڑا فائدہ ہمارے ادب کو یہ ہوتا کہ ان کی بہت سی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں اُردو ادب میں شامل ہو کر ایک طرف اگر اردو ادب میں اضافہ کرتیں تو دوسری طرف اِن نظموں کے مجموعوں کا ٹیکس ہماری قومی حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرتا ۔ یہی چیز ان کو کئی نوحے لکھانے پر مجبور کرتی ۔ مثلاً گرانی کا نوحہ، مفلسی کا نوحہ بے روزگاری کا نوحہ، زندگی کا نوحہ، موت کا نوحہ ۔

ہمیں جناب منوّر لکھنوی سے بڑی امیدیں تھیں کہ وہ

پدر اگر نتواند پسر تمام کند

کے اصول پر عمل درآمد کریں گے ۔ مگر انہوں نے پیدا ہوتے ہی سرکاری ملازمت کرکے اپنی بعض صلاحیتوں پر خود کلہاڑی مار لی ۔ مگر ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے ۔ میں اُن کو کئی ہارس پاور کا مترجم سمجھتا ہوں اور باپ بیٹوں کے ترجموں میں یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ صاحبزادے نے ترجمے کو زیادہ منوّر اور روشن کیا یا باپ نے اُسے آفاقیت بخشی ۔ میں تو جب اُن سے ملنے جاتا تھا تو بہو کی بچوں سے رخصت ہو کر اور والدہ سے دودو ہو گفتگو کر ۔ اس وجہ سے کہ کہیں منوّر صاحب مجھے ترجمہ کر کے یہ ایک مجموعہ نہ تیار کرلیں ۔ جناب منوّر لکھنوی میں جو غیر معمولی نظم و نثر میں ترجمہ کرنے کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اُس سے خیال ہوتا ہے کہ جس

(باقی)

احمد جمال پاشا

ایک سنسنی خیز چوری

کافی رات گذر چکی تھی مگر ابھی تک گھر کے لوگ واپس نہیں لوٹے تھے۔ سب کے سب ایک شادی میں گئے ہوئے تھے اور میں گھر کی حفاظت کی غرض سے سب کے انتظار میں آنگن میں بستر جمائے آسمان کے تارے دیکھ رہا تھا۔

ابھی میں ستاروں کی دنیا میں اپنی قسمت کا ستارہ تلاش ہی کر رہا تھا کہ اچانک مجھے کھٹکا محسوس ہوا، جیسے کسی نے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھا دی اور اُسکے ساتھ دیوار پر کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو بلم اور لاٹھیاں لئے کوئی ایک درجن انتہائی خستہ حال چور میرے سامنے کھڑے تھے۔ خستہ حال اس وجہ سے کہ میرے دل میں چوروں کے بارے میں انتہائی خوفناک تصور تھا کہ بڑی بڑی خوفناک مونچھیں اور آنکھیں، انتہائی لمبے چوڑے گاما پہلوان قسم کے لوگ مُنہ پر نقاب ڈالے ہاتھ میں پستول یا تلوار لئے چوری کرنے آتے ہوں گے۔ مگر یہ سب کے سب انتہائی دُبلے پتلے کمزور، کسی کے جسم پر ایک کپڑا تک سلامت نہ تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ مجھے مارنے کے لئے بلم اور لاٹھیاں لئے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بلم اور لاٹھیوں کے سہارے یہ کھڑے ہیں اور وہ ان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک جوان نے کڑک کر کہا۔

"خبردار جو ذرا بھی جُنبش کی ورنہ بلم سینے کے پار ہو جائے گا" یہ نوجوان جو اگر میں پھونک بھی مار دیتا تو اُڑ جاتا۔ مجھے خیال ہوا کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ حالت یہ اور کڑک اتنی، مگر اس خستہ حال کے بلم کا رُخ اپنے سینے کی جانب دیکھ کر میں ایک دم سے اس سے زیادہ خستہ حال ہو گیا۔ اور میں نے گھبرا کر مری ہوئی آواز سے کہا۔

اطمینان رکھو، نہ جنبش کروں گا، نہ مُنہ سے آواز نکالوں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر چاہتے کیا ہو ــــ؟

چور بولے ــــ "جو کچھ بھی ہو، سیدھی طرح رکھدو"۔

میں نے تکئے کے نیچے سے کنجیاں نکال کر چوروں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــــ

"یہ تجوری کی کنجیاں ہیں۔ جو کچھ روپیہ، زیور، وغیرہ ہے وہ اسی میں ہے اور میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ــــ"

ایک چور نے کنجیوں کا گچھا میرے مُنہ پر مارتے ہوئے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلیگا۔ اس پر سختی کرو۔ روپیہ، زیور کا بھلا ہم لوگ کیا کریں گے ــــ" اُس نے کہا ــــ "روپیہ زیور نہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے ــــ؟"

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ عجب چور ہیں۔ جنہیں جواہرات اور نقدی کے بجائے "وہ" کی تلاش ہے ــــ

(بقیہ صفحہ ۱۷۰ پر دیکھئے)

مکتوبات

عمیق حنفی ——— اندور

تازہ شمارے میں برادرم مظفر حنفی کا مضمون "نئی اور پرانی تنقید" بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے اُنکے خلوص، نیک نیتی اور کرب پر کوئی شک نہیں۔ اُنکے مقصد کی بے لوثی سے بھی میں متاثر ہُوا، لیکن ذاتی طور پر میں اپنے بارے میں ناقدوں کی بے توجہی یا کم توجہی کا شاکی نہیں اور نہ اپنے آپکو مظلوم شعراء میں شمار کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی تخلیق کار کو ناقدوں کی عدم توجہی کا شکوہ کرنا چاہیئے بلکہ تخلیق کار کو ناقدوں کی طرف سے عدم توجہی برتنی چاہیئے۔ میں تو اپنے طور پر تخلیقی کام کرتا چلا جا رہا ہوں اور اِس یقین و اعتماد کے ساتھ کئے جا رہا ہوں کہ جلد یا دیر سے نہ صرف ناقد بلکہ ادب کے اہلِ بست و کشاد اِس کام کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اگر نہ ہوئے تو نقصان میرا نہیں اُنھیں کا ہوگا۔ تنقید تو تخلیق کی تابع ہے، اُسے تو تخلیق کے ساتھ ساتھ چلنا ہی چاہیئے۔ اگر بہت پچھڑ گئی یا اُونگھتی رہی، تو اِسی کو دوڑنا ہوگا۔

یوں بھی تو ہماری تنقید ایک علمی اور تحقیقی فن کی حیثیت سے گول مٹول، گھِسی پِٹی اور پسماندہ اصطلاحات کے گورکھ دھندے بنا لینے پر اکتفا کر رہی ہے۔ نئے حالات، نئے فکری اور فنی تقاضے، نئے علمی شعور، نئے احساس سے بے تعلق ہو رہی ہے۔ پُرانے ناقدوں سے بہت زیادہ توقع رکھنا فضول ہے۔ موجودہ حالات میں بہتر یہی ہے کہ تخلیق کار خود اپنے ہمعصروں اور اُن کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے رہیں، اُن کا جائزہ لیتے رہیں اور تجزیہ کرتے رہیں۔ ایک بات اور ہے۔ انعام، اعزاز، تنقیدی RECOGNITION انتخابات میں شرکت، کار، بنگلہ، ملازم، ادبی عہدے وغیرہ کی فکر کرنا یا اُن سے منفی یا مثبت تاثر قبول کرنا تخلیقی صلاحیت اور فنی عوامل کے حق میں درست نہیں ہوتا۔ میرا اپنا عقیدہ تو نیکی کر دریا میں ڈال ہے۔ کسی کو انعام یا اعزاز ملے، کسی پر کتاب یا مضمون شائع ہو، کوئی کچھ ہو جائے میں متاثر نہیں ہوتا۔ (ہوتی بھی ہے تو کسی ذاتی تعلق کی وجہ سے مجھے خوشی ہی ہوتی ہے)۔ میں تخلیق کو تنقید کی سند کا محتاج نہیں مانتا۔

البتہ ایک قلمکار کے ناطے تو نہیں، اُردو زبان و ادب کے ایک پرستار کی حیثیت سے میں خود ایک نئی، جاندار، ہمعصر اور صحت مند تنقید اور اپنی راہ آپ بنانے والے غیر نصابی ناقدوں کے ظہور اور وُرود کا متمنی ضرور ہوں۔

کرشن موہن ——— دہلی

مُدّت مدید کے بعد "شاعر" کا شمارہ نمبر ۱۲ ملا۔ گذشتہ شماروں کے نہ ملنے کا ملال ہے۔ خصوصاً اُس شمارے کو ترس رہا ہوں جس میں "فراق کی غزلیں" والا مقالہ شائع ہوا تھا۔ تازہ شمارے میں مظفر حنفی کا مقالہ "نئی اور پُرانی تنقید" بہت پسند آیا۔ مفتوں کوٹوی کی نظم "یہ راہیں" بھی بہت شگفتہ ہے۔ اِس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے مذاقِ ادب میں جدت و تازگی کو بھی دخل ہے۔ چند ایک دیگر نظمیں بھی اچھی ہیں۔ لیکن حسن ظہیر صاحب نے یہ کیا نظم کہی ہے: "کرن در کرن" تو خیر غلط ہے ہی۔ اسے میں گوارا کر لیتا اگر نظم میں کوئی بات ہوتی۔ دو ایک غزلیں حیات افروز ہیں۔

طرفہ قریشی ——— ناگپور

دسمبر ۶۲ء کا "شاعر" بڑی تاخیر کے ساتھ موصول ہُوا لیکن تاثیر سے بھرپور۔ مقالے تین ہیں اور تینوں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ مظفر حنفی صاحب نے "نئی اور پُرانی تنقید" پر نہایت اچھی اور تفصیلی بحث کی ہے۔ لیکن نئی نسل کے شعراء اور ادباء کو ادبی بال و پَر دینے والے اساتذہ اور محسنین کا ذکر نفی کے برابر ہے۔

اُردو ادب میں جانبدارانہ تنقید نگاری ابتو ایک طرح کا فیشن بن چکی ہے، جو جس سے جتنا قریب ہے اُتنا ہی خوش قسمت ہے۔

نظمیں اور غزلیں بھی اچھی اور مقصدی ہیں لیکن نظموں سے

غزلوں کا معیار اس مرتبہ کافی بلند ہے اور اس میں آپکے حُسنِ انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ نظمیں کتنی ہی مقصدی سہی، جب تک اُن میں نغماتی خوش آہنگی اور ڈھانچے کی یکسانیت نہ ہوگی، تاثیر سے مطلقاً خالی ہی ہوں گی۔

ایک جگہ "کرن در کرن" کی ترکیب بھی نظر سے گزری۔

مکتوبات میں قیصر قلندر کا خط جامع حقائق پر مبنی ہے۔

—— (بقیہ "ایک سنسنی خیز چوری" صفحہ ۱۶۸) ——

میں نے کہا "بھائی اگر روپیہ زیور نہیں چاہئے تو گھر موجود ہے جس چیز کی ضرورت ہو یا تم کو پسند آئے اپنی سمجھ کر بے شک لے جاؤ، مگر میری جان تو چھوڑ دو۔"

اس کے بعد چوروں نے گھر کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ کافی دیر کے بعد وہ گھر بھر سے مال اسباب باندھ کر میرے پاس آئے اور بولے۔

"جب تک ہم لوگ کافی دُور تک نہ چلے جائیں تم اسی طرح خاموش لیٹے رہنا دروازے پر ہمارا ایک آدمی موجود رہے گا۔ اگر تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو اُس کا بلّم تمہارے سینے کے پار ہو جائے گا۔۔!"

اس کے بعد چور چلدیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چور آخر سارا گھر چھان مارنے کے بعد لے کیا جا رہے ہیں۔ ان سب کے ہاتھوں میں کچھ چھوٹی بڑی پوٹلیاں تھیں۔ کافی دیر کے بعد میں اُٹھا میں نے سیف دیکھی، روپیہ، زیور اور دوسری قیمتی اشیاء اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا تھا۔ مشین، ٹائپ رائیٹر، ریڈیو، فریج، گھڑی، کولر، صوفہ سیٹ، کپڑوں کی الماری غرض ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی، اس کے بعد اناج رکھنے والے کمرے میں گیا دیکھا کہ جن برتنوں میں گیہوں، شکر، چاول، دالیں، نمک، پیاز، اور مصالحے وغیرہ رکھے رہتے تھے وہ سب خالی اوندھے پڑے تھے۔ نعمت خانہ بالکل صاف ہو چکا تھا اور باورچی خانے میں بالکل جھاڑو پھر چکی تھی۔
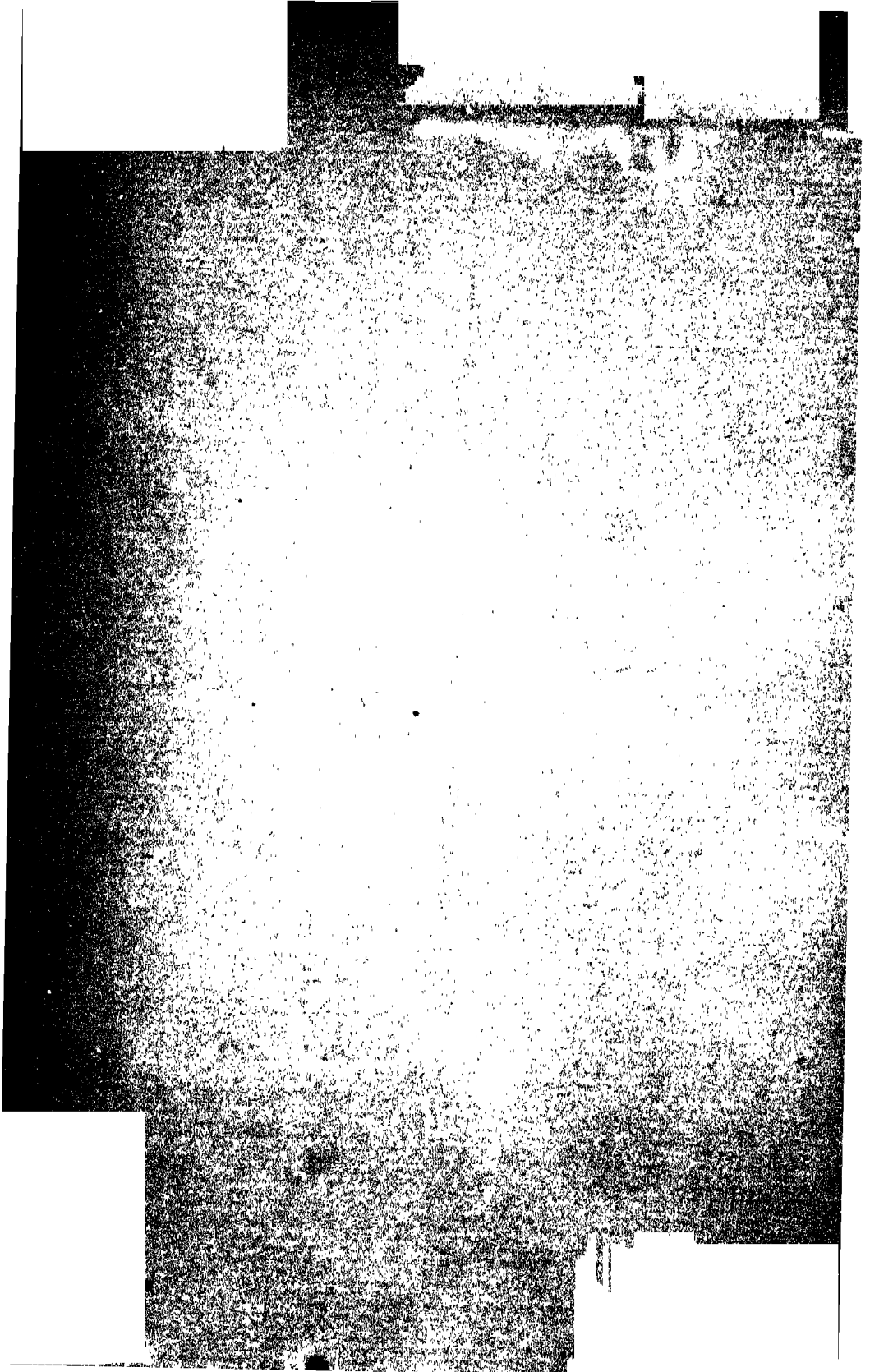
بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات "شاعر" بمبئی

(فارم نمبر ۴ رول نمبر ۸)

۱۔ مقامِ اشاعت ــــ بمبئی۔ ۲۔ وقفۂ اشاعت۔ ماہانہ

۳۔ پرنٹر ــــــ اعجاز صدیقی
۴۔ پبلشر ــــــ " } ۵۔ قومیت ہندوستانی

۶۔ ایڈیٹرز ــــ اعجاز صدیقی۔ مہندر ناتھ

۷۔ قومیت ــــ ہندوستانی

۸۔ پتہ۔ ۱۲ دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی نمبر ۴

۹۔ ملکیت ــــ اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) اعجاز صدیقی

The "SHAIR" Bombay 8
(36 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

شعر
JAMIA LIBRARY
14 JUN 1965

JAMIA LIBRARY DELHI
جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم
اردو کا چھتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ
14 JUN 1965
ماہنامہ
شاعر
مارچ و اپریل ۱۹۶۵ء
بمبئی
ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ
زر سالانہ
سات روپے
زر ششماہی
چار روپیہ
ممالک غیر سے
۱۴ شلنگ
فی پرچہ
۱۰ آنے (۶۲ پیسے)
مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس ۱۵۲۶ بمبئی
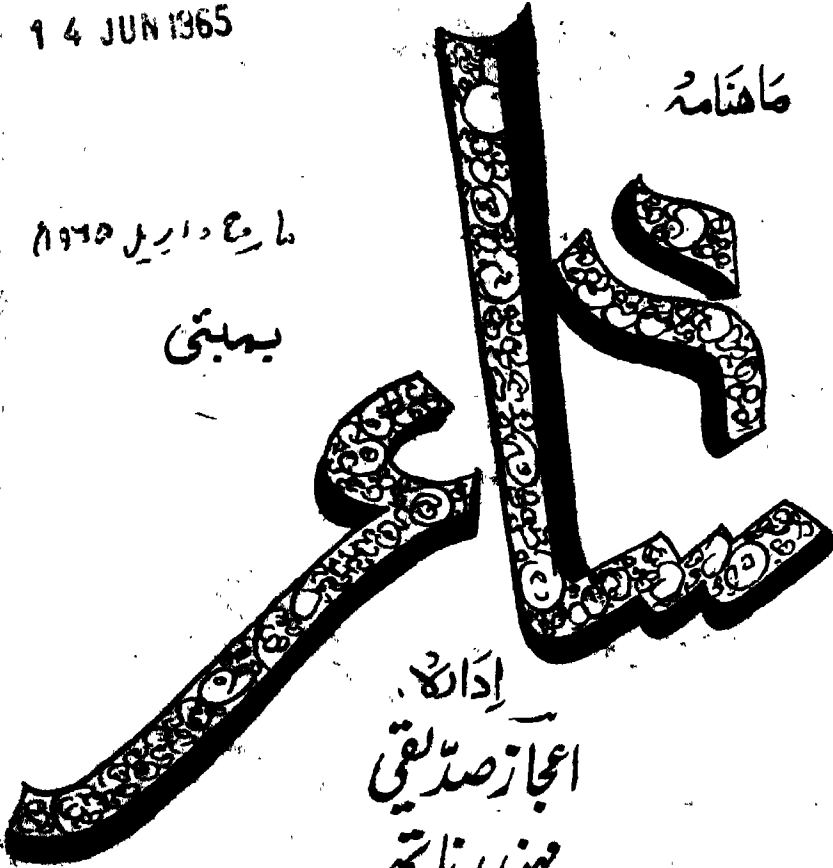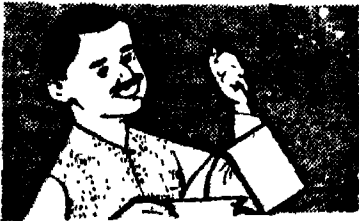
برقی قوت مہاراشٹر کے دیہاتی علاقہ میں
خوشحالی کا راستہ کھول رہی ہے
برقی قوت اپنے ساتھ زندگی کی بہت سی سہولتیں لائی ہے۔ مہاراشٹر کے بہت سے دیہات آج ان سہولتوں سے فیضیاب ہونے کے قابل ہوگئے ہیں جو پہلے صرف شہری علاقوں تک محدود تھیں
برقی قوت زراعتی پیداوار کے اضافہ میں مدد دیتی ہے نیز چھوٹی صنعتوں کی ترقی میں کام آتی ہے لہذا دیہاتی علاقوں میں برقی قوت کی توسیع دیہاتی اقتصادیات کے توازن کو برقرار رکھنے میں بہت موثر ثابت ہوگی۔
مہاراشٹر کے دیہاتی علاقوں کو برقی قوت سے آراستہ کرنے کا کام بہت موثر ہے۔ پہلے یوم مہاراشٹر کے وقت برقی قوت سے آراستہ دیہات کی تعداد ۵۳۴۲ تھی مگر اب یہ تعداد ۳۱ دسمبر ۶۴ء تک ۲۶۸۷ پر پہونچ گئی ہے تیسرے پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک مزید ۵۸۰ دیہات میں برقی قوت پہونچ جائے گی اور اس طرح مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔
ڈائرکٹر آف پبلسٹی
حکومت مہاراشٹر
بمبئی
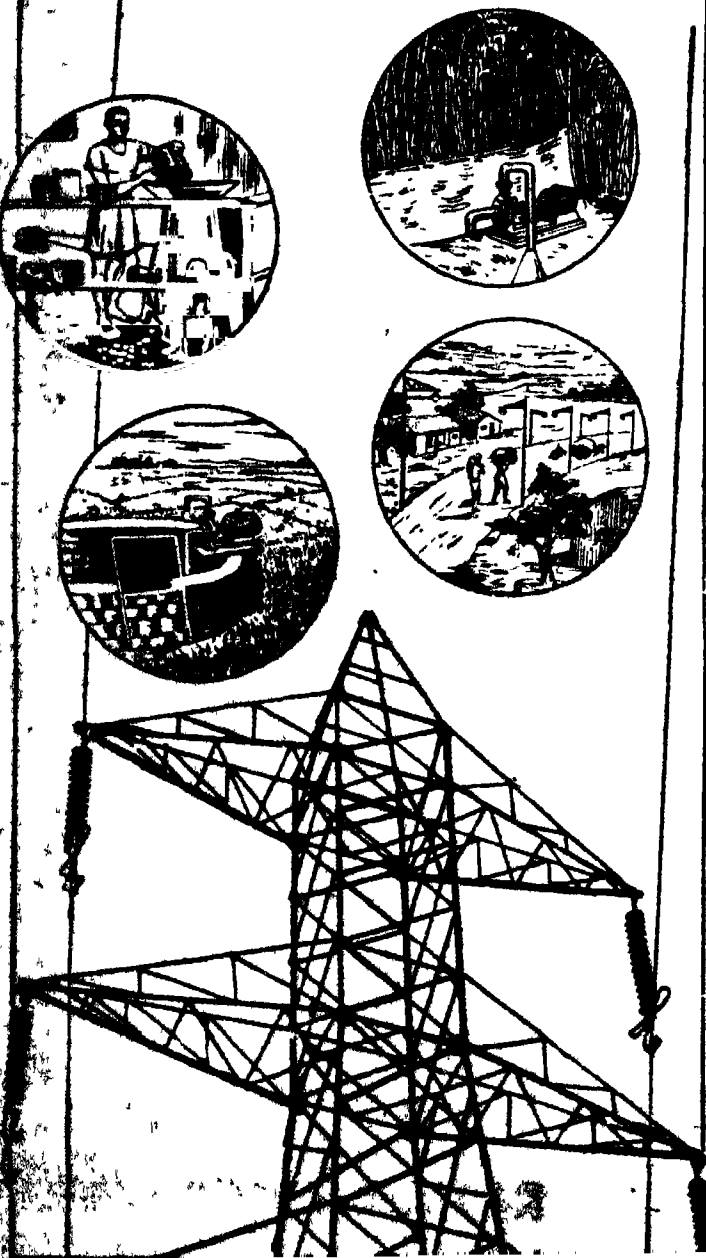
ادارۂ

شاعر

فخر و مسرت کے ساتھ

اُردو کی آٹھ

مایۂ ناز شخصیتوں

پر علی الترتیب

نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر

پیش کرنے کا ہنگامی اعلان کرتا ہے

- ۱۔ کرشن چندر نمبر
- ۲۔ سردار جعفری نمبر
- ۳۔ رشید احمد صدیقی نمبر
- ۴۔ راجندر سنگھ بیدی نمبر
- ۵۔ احتشام حسین نمبر
- ۶۔ خواجہ احمد عباس نمبر
- ۷۔ کنھیا لال کپور نمبر
- ۸۔ ساحر لدھیانوی نمبر

ان کے علاوہ دیگر مشاہیر اُردو پر بھی شاعر خصوصی نمبر پیش کرے گا......

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

کی منفرد شخصیت اور اُس کے عظیم و ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہند و پاک کے مشہور قلمکاروں بلکہ دُنیا کے کئی بڑے مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں پیش کئے جائیں گے

●

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ۔ اُس کی عظمت کی کہانی۔ اُس کی تصانیف کا جائزہ۔ اُس کے زندۂ اسلوب فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر

● عالمی ادب میں کرشن چندر کا درجہ ●

درجنوں تصاویر

تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

ترتیب

شاعر
بمبئی

افکارِ ادارہ

مقالات

نظمیں

افسانے

ڈرامہ

غزلیں

مکتوبات

ضیاء حسنی • امیر چند بہار • خاور بانکوٹی

جلد ۳۶ • تصویر سرِورق ——— خوشتر گرامی • شمارہ ۴-۳

ایک اپیل

"شاعر" کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت

ہندستانی زبانوں کے جرائد ایک نئے موڑ سے گذر رہے ہیں ـــ
پرانے طریقے دم توڑ چکے ہیں۔ اُردو کے جرائد بھی ایک نیا حسن و معیار
چاہتے ہیں

"شاعر" کا مسلسل چھتیس سالہ سفر اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی طویل علمی و ادبی خدمات کا سب ہی کو اعتراف ہے۔ "شاعر" اب ایک قومی مقصد بن چکا ہے اور اُردو زبان کے لئے وجہ فخر و نازش ہے۔ اس کی ترقی و بقا کے لئے وہ سب کچھ ہونا چاہیئے۔ جس کی ایک قومی ادارے کو ضرورت ہوتی ہے

اِس وقت اُردو کے تقریباً سب ہی جرائد اپنی قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں
لیکن ہم نہیں چاہتے کہ "شاعر" کی قیمت بڑھا کر اُس کے حلقے کو محدود کیا جائے۔
صحت مند ادب کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی سعی کرنا ہمارا مطمح نظر ہے۔

اِس عظیم مقصد اور "شاعر" کو نیا حسن و معیار دینے کے لئے ہم دردمندانِ اُردو سے صرف دس ہزار روپے کی فراہمی کی درخواست کرتے ہیں۔ اپنے قدیم خدمت گذار اداروں کے لئے اِس قسم کی اعانتیں عام طور پر کی جاتی رہی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ "شاعر" کے لئے اُردو دوست آگے نہ بڑھیں۔

"شاعر" کے پڑھنے اور پسند کرنے والوں میں ایسے مخیّر اور ادب نواز حضرات موجود ہیں جو اِس رقم کا انتظام فرما سکتے ہیں۔ یہ رقم ایک شخص بھی دے سکتا ہے اور دس حضرات مل کر بھی اِس کارِ ادب میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ بہر حال یہ "شاعر نوازی" تاریخ ادب اُردو میں اُن کے نام کو زندہ رکھے گی۔ اور "شاعر" کی بنیادوں کو استحکام عطا کریگی۔

اعجاز صدیقی

[illegible]

جُعَات

اُردو دوستو اور دشمنو!

میں یہ مختصر تقریر آل پارٹیز اُردو کنونشن دہلی میں پیش کرنے والا تھا لیکن
اُس کے التوا کی ایک غلط اخباری اطلاع کی بنا پر دہلی نہ جاسکا۔

اُردو دوستی، اِس عظیم ملک سے دوستی ہے، ہندستانی قوم سے دوستی ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی اجداد کے ورثے اور بھارت کی ہزاروں سال کی تاریخ سے دوستی ہے۔ اور اُردو دشمنی گویا اِن سب سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ بولو، جواب دو، تم اپنی قومی روایات کے دوست ہو یا دشمن؟ ہندستان ہمالہ کی طرح مہان اور عظیم ہندوستان، یہ شنکر، پوِتر، خوبصورت اور مقدس سرزمین، رشیوں، مُنیوں، ولیوں اور اوتاروں کی دھرتی ہے جس نے پاپ کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی، جس نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔ آج اُس کے لوگ ناحق پر کیوں اَڑے ہوئے ہیں؟ اُردو کا مطالبہ جمہوری مطالبہ ہے۔ اُردو کے حق کو مانو اور قوم پرستوں کو پوری دُنیا سے یہ کہنے کا موقع نہ دو کہ ہماری جمہوریت مشتبہ ہے۔ ہمارا جمہوری نظام اور جمہوری آئین تو سب کو زندہ رکھنے کے لئے ہے۔ قومیں ہوں یا زبانیں۔ یہ نظام مار ڈالنے کے لئے تو نہیں بنایا گیا ہے۔ اُردو کا مسئلہ صرف زبان کا مسئلہ نہیں ہے، ریاست کا مسئلہ ہے۔ قومی ایکتا اور یکجہتی کا مسئلہ

اُردو دوستو اور دشمنو!!

تم کیا پسند کرتے ہو؟ ریاست کا دیوالیہ پن یا اُس کا فکری اور شعوری انداز وارتقا۔ ہندستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہو۔۔ یا چاہتے ہو کہ یہ عظیم ملک متحد رہے، اُس کی روایات زندہ رہیں۔ اِس عظیم ملک کی زبانیں ہی اِس کا اتحاد اور اِس کی کُلاہِ افتخار ہیں۔ اِن تمام قابلِ قدر زبانوں میں اُردو زبان اتحاد اور ایکتا کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ ہندوستان کی نصف سے زیادہ آبادی کی زبان اب بھی وہی ہے جو آزادی سے پہلے تھی۔ یعنی سادہ اُردو یا ہندوستانی۔ گاندھی جی کی زبان، پنڈت نہرو کی زبان۔ راجندر پرساد کی زبان۔ کیا تم باپو کا احترام بھول گئے۔ پنڈت نہرو جیسے محسنِ اعظم اور دُنیا کے عظیم رہنما کا ادب و لحاظ بھی تمہاری نظر میں نہیں رہا۔!!

اُردو کے گلے پر چھری نہ پھیرو، اِن کی رُوحیں تڑپ رہی ہیں، چیخ رہی ہیں۔ لال قلعہ کی فصیل سے اُن تمام رہنماؤں کی آوازیں آرہی ہیں جنہوں نے اِس ملک کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ اپنے سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔ اِن میں سب سے آگے وہی تھے جو دشمنوں کو اُردو میں للکارتے تھے۔ اُردو میں نعرے لگاتے تھے۔

اُردو دوستو اور دشمنو!!

وقت تو گذر جاتا ہے اور یہ وقت بھی گذر جائے گا۔ تم اُردو کو ختم کرنا چاہتے ہو۔۔ ختم کردو، لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے نتائج پر بھی غور کرلو۔ اگر اُردو ختم ہوگئی تو ہندی بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ تمہاری پوری مشینری چاہے کتنا ہی زور کیوں نہ لگائے اُردو کی موت کے کچھ دن بعد ہندی کی موت بھی واقع ہو جائے گی۔ اس کے کچھ اسباب ہیں، بات ذرا [illegible]

شاعر بھی

ہوں۔ سوچو، غور کرو۔ اُس بُرے وقت سے ڈرو۔ آج سیاست کی ترازو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کل کسی دوسری سیاسی پارٹی کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے۔ آج کو غنیمت سمجھو۔ اِس ترازو کے ایک پلڑے میں اُردو اور ہندی کو ساتھ ساتھ رکھ دو۔ یقین کرو، یہ پلڑا ہمیشہ جھکا رہے گا۔

ہندوستانی زبانوں کے خزانے میں اُردو کی حیثیت کوہِ نُور ہیرے کی ہے۔ ایک ہیرا تم نے کھو دیا۔ کیا اب اِس دوسرے ہیرے کو بھی کھو دینا چاہتے ہو؟!

اُردو دوستو اور دشمنو۔!!

تم ہندوستان کے کئی صوبوں کے اسکولوں اور کالجوں سے اُردو کو ختم کر چکے ہو یا ختم کر دینے کا ارادہ رکھتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کرتے کہ اُن صوبوں میں آزادی سے پہلے کی طرح سب کے لئے اُردو اور ہندی دونوں زبانیں سیکھنا لازمی قرار دے دو۔ ذریعۂ امتحان خود طالب علموں پر چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ایک نیا ہندوستان جنم لے سکتا ہے۔ ہماری قومی یک جہتی کا نیا سورج طلوع ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی سب زبانیں پیار کے قابل ہیں۔ جنوب کی ہوں یا شمال کی، مغرب کی ہوں یا مشرق کی۔ اور اُردو زبان تو چاروں سمتوں میں بھی، بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی کوئی زبان، سوائے ہندی زبان کے، اُردو کے خلاف نہیں ہے۔ ہندی کے دوستوں اور پریمیوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ وہ اُردو دشمنی ترک کر دیں۔ اِس میں خود اُن کا نقصان ہے۔ قوم اور مُلک کا نقصان ہے۔ اُنھیں خود آگے بڑھ کر اُردو کو گلے سے لگانا چاہیئے۔ اِس زبان کے ادب کو آج دُنیا کے بہترین ادب کے ساتھ رکھا جا رہا ہے۔ یہ اُردو ادب دراصل ہندوستانی ادب ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی جنتا کی زبان ہے۔ اِس سے ہندوستان کی آبرو اور شان ہے، عظمت اور وقعت ہے۔ اِس آبرو، عظمت اور شان کو باقی رہنے دو۔

اُردو دوستو اور دشمنو!!

اُردو زبان کو نقصان پہنچ گیا اور پہنچ رہا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ جنتا کی زبان ختم نہیں ہوا کرتی۔ بیکس اور مجبور عوام کی پکار آسمانوں کے پردے چاک کر دیا کرتی ہے۔ اِس اشارے کو سمجھو۔ وقت کی نزاکتوں کا خیال کرو۔ اُردو عوام بیدار ہو چکے ہیں۔ کروڑوں ہندو، مسلمان اور سکھ اُردو کے سوال کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب اُن کے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ ضد اور ہٹ چھوڑ دو، اگر خود کو ایک باوقار، سمجھدار اور حق پرست حکومت کے اراکین کہلانا چاہتے ہو تو اعلان کر دو کہ اُردو زبان کو اس کے علاقوں میں دوسری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اگر تم نے آج یہ اعلان نہیں کیا تو کل اُردو عوام کی طاقت تم سے یہ اعلان کرا کے رہے گی۔!

اُردو، ہندی اور ہندوستان کی سب زبانیں

زندہ باد۔!!

(دستخط) صدیقی

علی جواد زیدی

سنسکرت میں فنی تکلفات

سنسکرت ادب میں ویدوں کے بعد (جن کی تخلیق کا نقطۂ آغاز پندرہویں صدی قبل مسیح تک پہنچ جاتا ہے) اُن عظیم رزمیوں کا دَور آتا ہے جن میں "مہابھارت" اور "رامائن" جیسے شاہکار شامل ہیں۔ رزم کے علاوہ بھی بہت سے موضوعات پر اِس زبان کے اہلِ قلم خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ انھیں میں وہ تصانیف بھی شامل ہیں جن میں عوام کی بہبود اور تنظیمِ حیات کے مسائل سے بحث ہوئی ہے اور جنھیں علمی اصطلاح میں "شاستر" کہتے ہیں۔ اگرچہ سنسکرت میں ان کتابوں کو تقدس کا رتبہ بھی حاصل ہوگیا ہے لیکن ان کے موضوعات ادبی، علمی، اخلاقی اور سیاسی سبھی ہیں اور انھیں دراصل اصنافِ علوم کے مترادف سمجھنا چاہیئے۔ عام طور سے شاستروں کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے جن میں ویدوں کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔ یہ تعداد یوں گنائی جاتی ہے:۔

(۱) شکشا (۲) کلپ (۳) ویاکرن (۴) نِروکت (۵) جیوتش (۶) چھند (۷) رگ وید (۸) یجروید (۹) سام وید (۱۰) اتھروید (۱۱) یمانسا (۱۲) نیائے (۱۳) دھرم شاستر (۱۴) پُران (۱۵) آیُروید (۱۶) دھنروید (۱۷) گاندھروید (۱۸) ارتھ شاستر۔

تاریخ، کام شاستر، النکار، ناٹیہ شاستر، سانکھیہ اور یوگ وغیرہ موضوعات ان کے علاوہ تھے۔ جو زبان کئی صدیوں سے اِن تمام علوم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو اس میں الفاظ و اسالیب کے تنوع اور اصطلاحات کے عظیم ذخائر پر تعجب کی گنجائش نہیں ہے۔

سنسکرت کی ادبی تاریخ کے ابتدائی دَور کے بعد علماء و شعراء تفسیر و تشریح میں پڑ گئے اور اسالیب رفتہ رفتہ پیچیدہ اور دقیق تر ہوتے گئے۔ اگرچہ ویدوں میں بھی کہیں کہیں ادبی فن کاری اور صناعی کے ابتدائی نقوش مِل جاتے ہیں لیکن علی العموم ویدوں کا اندازِ بیان سادہ و پُرکار ہے۔ ویدوں کے بعد سارا زور علمیت کے اظہار اور صناعی ہی پر صَرف کیا جانے لگا۔ اِس دَور کی تصانیف کو پڑھتے وقت اگر ایک طرف نفاست و تکلف کا احساس ہوتا ہے، تو دوسری طرف عالمانہ طمطراق اور زاہدانہ خشکی کا بھی۔ اظہارِ علم کی خشکی سے بس رزمیہ ہی بچ پائے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر اجزاء ادبی لطافت اور چاشنی سے بھرپور ہیں۔ رزمیوں کے علاوہ عشقیہ شاعری میں بھی پُرکاری اور سادگی ہے۔ عشقیہ شاعری کے بعض آثار کالی داس سے پہلے بھی مِل جاتے ہیں، لیکن باقاعدہ عشقیہ شاعری کا بانی کالی داس کو ہی سمجھنا چاہیئے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ ویدوں کے زمانے کے وہ شعراء بھی عشقیہ ادب کی تخلیق سے محروم نہ رہے ہوں گے جو طلوعِ سحر کی تشبیہہ ایسی حسین رقاصہ یا حسینہ سے دیتے ہیں جو اپنے عاشق کے لئے سینہ کے بند کھول دیتی ہے[1]۔ بہرحال کالیداس کے یہاں

---

[1] "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" از کیتھ، ص ۴۲

عاشقانہ شاعری کلاسیکی عظمت و حُسن کا رُعب دھارن کر لیتی ہے اور اُس کی سادگی اور جاندار معنویت دلوں کو موہ لیتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ روایت زیادہ دُور تک نہ جا سکی بلکہ آگے چل کر گھڑی کی سُوئی کچھ اُلٹی چلنے لگی اور بداعت اور صنّاعی کی طرف توجہ بڑھ گئی۔

سنسکرت ادب میں صنائع و بدائع کو ابتدا ہی سے ایک بلند مقام حاصل رہا ہے۔ یاسک، نگارگیہ، پانِنی، کاتیاین اور پتن جل کے زمانے میں بھی صنائع کے باقاعدہ ارتقا کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے رُدرَدمن کے کتبوں میں جو سنسکرت عبارتیں ملتی ہیں اُن میں نہ صرف یہ کہ صناعانہ زبان استعمال کی گئی ہے بلکہ "النکار شاستر" (علم بدیع) کے کئی اصول کی طرف اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ بھرت کے "ناٹیہ شاستر" میں (جسے اب علی العموم تیسری صدی عیسوی کی تصنیف مانا جانے لگا ہے) سولہواں باب ہی صنایع و بدایع کی تشریح و تفسیر کے لئے وقف ہے۔ اس میں ۳۶ شعری زیوروں کے علاوہ ۴ النکار، دس اسقام شعری اور دس محاسن شعری گنائے گئے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی سے بارہویں صدی تک کا دَور صنایع و بدایع اور اسالیب کی ترقی و کثرت کے لئے خصوصیت سے ممتاز ہے۔ اس دَور میں النکار کے موضوع پر جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اُن کے ناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ چند کے نام یہ ہیں: (ا) بھامہ کا "کاویالنکار" (۷ ویں صدی) (ب) دنڈی کا "کاویادرش" (۷ ویں صدی) (ج) اُدبھٹ کا "کاویالنکار سار سنگرہ" (۸ ویں صدی) (د) وامن کا "کاویالنکار سُوتر" (۹ ویں صدی) (ہ) رُدرٹ کا "کاویالنکار" (۹ ویں صدی نصف اوّل) (و) آنند وردھن کا "دُھونیالوک" (۹ ویں صدی نصف آخر) (ز) کُنتک کا "وکروکتی جیوت" (۱۰ ویں صدی، نصف اوّل) (ح) بھوج راج کا "سرسوتی کنٹھابھرن" (۱۱ ویں صدی نصف اوّل) (ط) ممّٹ کا "کاویہ پرکاش" (۱۱ ویں صدی نصف اوّل) اور (ی) رُیّک کا "النکار سروسو" (۱۲ ویں صدی نصف اوّل)[1] ان کے علاوہ راج شیکھر کی "کاویہ میمانسا" (۹ ویں صدی)، ہیم چندر کی "کاویہ انوشاسن" اور باگ بھٹ کے "النکار" کا موضوعِ سخن بھی صنایع و بدایع ہے۔ اُدھر علم عروض میں پنگلاچاریہ کا "پنگل چھند سوتر" دامودر مشر کا "وانی بھوشن" ہیم چندر کا "چھند انوشاشن" اور کشیمیندر کا "سوورت تلک" اسی زمانے کی تصنیفیں ہیں اور اوزان و بحور کے تنوع کا پتہ دیتی ہیں۔[2] یہ سلسلہ سنسکرت کے زوال کے باوجود بارہویں صدی عیسوی کے بعد بھی چلتا رہا اور جے دیو، ودیادھر، وشوناتھ، کیشو مشر اور اپیّہ دیکشت کی وساطت سے دَورِ مغلیہ کے عروج (۱۷ ویں صدی) تک جا پہنچا۔

سنسکرت میں صنایع و بدایع کی تشریح و تفسیر ہی نہیں ہوتی رہی ہے بلکہ اسے باقاعدہ طور سے برتا بھی گیا ہے۔ دراصل تفسیر و تشریح، تخلیق کے بعد کی منزل ہے۔ پہلے یہ صنایع برت لئے گئے ہوں گے تب شارحین و مفسرین کے ہاتھ لگے ہوں گے۔ اس کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ سنسکرت شاعروں نے ابتدا ہی سے تکلف کو اختیار کیا اور تکلف تفریح کے طور پر نہیں بلکہ ایک باضابطہ علمی مشغلے کے طور پر۔ واتساین کے "کام سوتر" سے (جو یقیناً کالی داس کا پیشرو ہے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور کے شعراء، لغت، عروض، قواعد اور علم بیان کے علاوہ "کام سوتر" کو بھی ضرور پڑھتے تھے۔ "کام سوتر" میں جو شہری شرفا (ناگرک) کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ کافی دلچسپ ہے۔ اس کے گھر میں عیش و عشرت کے سامان مثلاً پنجروں میں بند چڑیاں، باغ میں پڑے جھولے، مرغوں اور مینڈھوں کی لڑائیاں، رقص و موسیقی کی محفلیں، ناٹک، شعری مقابلے، عورتوں کے ساتھ گلگشت، شراب نوشی وغیرہ سبھی موجود ہیں۔ اس طرح کا ماحول نفاست، تکلف اور صنّاعی کے لئے یقیناً سازگار تھا کیونکہ

---

[1] "ہندی ساہتیہ کوش" ص ۴۴۔ [2] "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" ص ۹۷-۹۶۔

اور نقادوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس لئے شعراء بھی چوکنے رہتے تھے اور اپنے ذی علم نکتہ چینوں کو مطمئن کرنے کیلئے حُسنِ بیان کے پیچ وخم کے ساتھ مبالغہ آرائیوں اور معنی آفرینیوں سے بھی کام لیتے رہتے تھے۔

کیتھ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر ابتدائی رزمیوں (مہابھارت وغیرہ) کی سادگی رفتہ رفتہ زیادہ پُرتکلف طرزِ اظہار کا پیش خیمہ نہ بنتی تو تعجب کی بات ہوتی۔ اپنشدوں میں ایسے بادشاہوں کا ذکر آتا ہے جو معاصر فلسفیوں کے مابین مباحثے کراتے تھے اور کامیاب ہونے والوں کو انعام واکرام سے نوازتے تھے[1] انھیں بادشاہوں میں ایسے بھی تھے جو اپنی مدح سُن کر خوش ہوتے تھے اسی وجہ سے ویدک زمانے میں بھی دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ناراشنسی" (قصائد) کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ "رگوید" میں تو یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ اچھے قصیدہ خوانوں کو اچھا خاصا انعام مل جایا کرتا تھا۔ ان مقابلوں، مسابقوں اور بارشِ انعام کی فضا میں شاعروں نے اسکی کوشش کی ہوگی کہ اپنے اسالیب میں تنوّع پیدا کریں اور فنی صنّاعیوں میں زیادہ سے زیادہ کمال بہم پہنچائیں تاکہ دربار میں ان کا بول بالا ہو اور حریف خفیف ہو۔ اسی کوشش میں رزمیہ کا نسبتہً سادہ طرزِ ادا پس پُشت جا پڑا ہوگا اور ایک پُرتکلف طرز کا ارتقا عہد بہ عہد ہوتا رہا ہوگا۔

درباری شاعری ہی نہیں بلکہ عشقیہ شاعری کے فروغ سے بھی صنّاعیوں کو بڑھاوا ملا ہے۔ اس کا بعید قرینِ قیاس سبب کیتھ نے یہ بتایا ہے کہ رزمیہ کے سادہ اندازِ بیان کے لئے بہت سے اوزان وبحور کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ رزمیہ میں پیچیدہ اوزان وبحور مناسب ہی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس عشقیہ شاعری میں موضوعات کے محدود ہونے کی وجہ سے اسالیب اور عروضی اشکال میں تنوّع کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ رزمیہ دَور کے بعد سے برابر ایسے عشقیہ ادب کی تخلیق ہوتی رہی جس میں اوزان واسالیب کی جدّتیں وجود میں آئیں اور صنائع و بدائع کا ذوق بڑھتا گیا۔

گُپت خاندان (چوتھی صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک) کے دَوران حکومت میں سنسکرت درباری اور تمام اعلیٰ طبقوں کی زبان تھی۔ اس دَور میں مختلف علوم مثلاً ریاضی، ہیئت، جیوتش وغیرہ کو فروغ ہوا اور اسالیب میں نفاست اور تکلف، باریکی اور صنّاعی نے راہ پائی۔ کالیداس اس دَور کا سب سے عظیم شاعر ہے لیکن وہ بھی تکلف و صنائع کو ناپسند نہیں کرتا۔ البتہ اس کے یہاں ایک توازن کا احساس ہوتا ہے اور وہ ایسی صنّاعی سے گریز کرتا ہے جو اثر آفرینی میں حارج ہو۔ پھر بھی اسکے یہاں صنائع میں تجنیس خطی وصوتی، تکرارِ حروف، صوتیاتی اثرات، تشبیہات، تضاد وتطابق، مراعات النظیر، تمثیل، ایہام وغیرہ سبھی ملتے ہیں۔

کالی داس کے بعد بھارَوی کو دیکھئے (جو غالباً چھٹی صدی عیسوی میں گذرا ہے) تو صنائع کے غیر محتاط استعمال کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ پُورے پُورے مصرعے صنعت مقلوب میں ہیں۔ یہی حال بھٹی، کماردا س، ماگھ، مینٹھ، بھومک، واسودیو، شیوسوامی، ابھی نند، منکھ، بلکہ کشیمیندر تک کا ہے۔ پھر بارہویں صدی کے تین شاعروں سندھیا کرنندی، دھنن جے اور کوی راج نے تو جدّت پسندی کی دُھن میں شاعری کو معمّہ ہی بنادیا۔ سنسکرت کے مرکب الفاظ کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کو اگر مختلف مقامات سے توڑا جائے تو حروف کی مجموعی تعداد گھٹائے بڑھائے یا ان کے تقدّم وتاخر میں تبدیلی کے بغیر ہی ایسے نئے الفاظ بن جاتے ہیں کہ معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت میں ایک ایک لفظ کے بے شمار معنی ہوتے ہیں۔ ان دو خصوصیتوں کا فائدہ اُٹھا کر ایسے قصّے نظم کئے گئے جن کے مصرعوں کو اگر مختلف مقامات پر وقف کرکے

---

[1] "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" از کیتھ ص ۴۱

پڑھا جائے تو دو الگ داستانیں بن جاتی ہیں۔ مرکب الفاظ کو ایک طرح پڑھئے تو ایک داستان ہے اور دوسرے اوقاف پر توڑ کر پڑھئے تو دوسری داستان ہے۔ مصرع جوں کا توں رہتا ہے کوئی حرف نہ تو آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے اور نہ ایک حرف بھی گھٹانا پڑتا ہے۔ مثلاً سندھیاکرنندی کی "رام پال چرت" میں بیک وقت رام چندر جی اور راجہ رام پال کی داستانیں نظم کی گئی ہیں اور دھننجے اور کوی راج کی "راگھو پانڈویہ" میں بیک وقت "مہابھارت" کا قصہ بھی نظم ہوا ہے اور انھیں مصرعوں سے "رامائن" کی داستان بھی نکلتی ہے۔ چدامبر نے ایک قدم اور بڑھایا اور "راگھو پانڈویہ یادویہ" کو اس طرح نظم کیا کہ اس میں "رامائن" اور "مہابھارت" کے قصوں کے علاوہ ایک قصہ "سبھاگوت پران" کا بھی نظم ہو گیا۔ یہ تو قصے کہانیوں کی بات تھی۔ کلھن جب "راج ترنگنی" کے نام سے منظوم تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ بھی اکثر موقعوں پر صنائع و بدائع سے دامن نہیں چھڑا پاتا۔ "کُٹنک" کا مصنف تو باقاعدہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر تجنیسات کے استعمال میں اس سے کوئی بازی لیجائے تو وہ سزا کے طور پر اس کے لئے ٹوٹے گھڑے میں پانی بھر بھر کے لیجائے گا۔ ہرش وردھن کے درباری تیورا (ساتویں صدی عیسوی) نے "نیہ رشتک" میں اپنی بیٹی کے حُسن کا بھی تفصیلی بیان کیا ہے اور بعض اوقات شوخ جزویات تک سے گُریز نہیں کیا۔ اس تصنیف میں بھی میَورا کا طرزِ تحریر پُر تکلف ہے۔ اور ابہام و تجنیس وغیرہ صنعتوں سے لبریز۔ بان کی "چنڈی شتک" اگرچہ مذہبی موضوع پر ہے، لیکن اس میں بھی صنائع اور آورد کی بھرمار ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سنسکرت کے سبھی شعرا صنائع و بدائع کے استعمال میں افراط کے عادی اور فنی نفاستوں کے استعمال میں غیر محتاط ہیں۔ اسی صف میں بھرتری ہری (ساتویں صدی؟) اور امرو یا امروک اور جے دیو بھی ہیں صنائع و بدائع ان موخر الذکر شعرا کے یہاں بھی ہیں لیکن متوازن۔ اُن کی تحریروں میں اسلوب کے تکلفات گراں نہیں گزرتے۔

عربی، فارسی اور اُردو پر اثر

سنسکرت کے ان فنی تکلفات کا اثر صرف انھیں زبانوں پر نہیں پڑا ہے جو براہِ راست سنسکرت سے فیضیاب ہوئی ہیں بلکہ فارسی اور عربی تک نے اس عظیم زبان کی خوشہ چینی کی ہے۔ "کلیلہ و دمنہ" نے ثقافتی لین دین کی راہیں کھول دی تھیں۔ عربی جیسی ترقی دوست زبان نے جو صنائع و تکلفات اپنے مزاج کے موافق پائے اُنھیں اختیار کر لیا۔ علمی اور فنی تنگ نظری سے عربی نا آشنا رہی ہے۔ جہاں حدیث نبوی یہ ہو کہ اگر علم چین میں بھی ملے تو حاصل کیا جائے، وہاں لسانی یا ملکی عصبیت کا تصور ہی کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ پھر عرب تجارت پیشہ تھے، فتوحات نے انھیں مختلف ملکوں میں بکھیر دیا تھا۔ اس لئے زبان و بیان کے معاملے میں ان کا نقطۂ نگاہ وسیع ہو گیا تھا اور یہی وسعتِ قلب و نظر سنسکرت سے مطالب و اسالیب اخذ کرنے کا باعث بھی ہی۔ عباسیوں نے سنسکرت سے علوم کے تراجم عربی زبان میں کرائے اور اس کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ ہی بنا دیا۔ عربوں کو اپنی زبان پر اتنا ناز تھا کہ وہ غیر عرب کو گونگا کہتے تھے لیکن یہ دورِ جاہلیت کی کہانی تھی۔ بعد میں تو ہند، یونان، روم وغیرہ سے انھیں جو کچھ بھی ملا اُنھوں نے اپنایا۔

ہندوستان میں بھی عربوں، ایرانیوں، مُغلوں اور ترکوں نے سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں کے ادب سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ ترجموں کا کام شاہی سرپرستی میں ہوتا رہا۔ سلطان زین العابدین کشمیری، فیروز شاہ، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب، قلی قطب شاہ، واجد علی شاہ، اور دوسرے مسلم سلاطین نے ہندی علوم سے دلی رغبت و شغف کا اظہار کیا اور اسی رُجحان کی وجہ سے اس مشترکہ تہذیب نے جنم لیا جسے ہم آج ہندی تہذیب کہتے ہیں اور جو ہمارا سرمایۂ افتخار ہے۔ اس میں ہندوستان کی قدیم ترین روایات کے پہلو بہ پہلو بابل، نیل، یونان

اور روما کی تہذیبیں بھی ہیں اور حجاز و ترکی و ایران کی بھی۔ یہ انھیں روایات کا اثر ہے کہ بعض اہلِ ایران ہندوستانی فارسی کے بہت سے پہلوؤں کو سمجھ نہیں پاتے اور اسے "سبک ہندی" کہہ کر اس کو اس کے مرتبے سے گرانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

یہ "سبک ہندی" جس کو فیضی، خسرو، عرفی، قتیل، بیدل، حزیں، غالب اور اقبال جیسے شاعر ملے ایک عظیم ادبی روایت ہے، جس پر ابھی تک کام ہی نہیں ہوا ہے۔ اس میں قدسی، طالب، کلیم اور عرفی جیسے ایرانی شعراء بھی شامل ہیں کیونکہ انھوں نے ہندوستان ہی میں رہ کر اپنے فن کو جلا دی اور بعض تو یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے۔ اگر ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے فنی اجتہادات میں سنسکرت کی فنی روایتوں کی جھلک صاف نظر آئے گی۔ اگر ان کے نغموں کا آہنگ، ایرانی نغمہ سے مختلف ہے تو اس میں نہ حیرانی کی بات ہے اور نہ شرم کی۔ ان کا نغمہ یقیناً ہندی راگ راگنیوں سے سُر تال ملاتا ہے۔

عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ فارسی اور اُردو کے سبھی شاعر سنسکرت سے کُلیتہً بیگانہ تھے۔ اسی وجہ سے یہ شُبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان شاعروں نے سنسکرت کی فنی لطافتوں کو کیونکر اخذ کیا ہوگا۔ شبہ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سندھ میں قرامطہ کے زمانے میں، بلکہ اس کے بھی پہلے دکنی سواحلِ ہند اور گجرات میں ہندی عربوں نے عرب روایات کے ساتھ ہندی روایات کو بھی پالا پوسا ہے۔ تجارت اور مذہب کی ضرورتوں سے اس اختلاط کو بڑھاوا ملا اور بعد میں سیاسی ضرورتوں نے مزید تعاون و استحکام عطا کیا۔ عربی میں سنسکرت کے اثرات عباسی دور سے ہندوستان کے باہر بھی نظر آنے لگے تھے۔ جب ہندوستان میں عربی اور فارسی ادب کی پرورش و پرداخت باضابطہ طور سے اور بڑے پیمانے پر ہونے لگی تو یہ اثرات اور بھی نمایاں ہوئے۔ سلطنت دہلی کے قیام کے بعد سنسکرت کتابوں کے ترجمے کی طرف توجہ کی جانے لگی اور ایسے علماء اور ادباء سامنے آنے لگے جو عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت کے ادبی اور ثقافتی ورثے سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اپنی سنسکرت دانی کا خود ذکر کیا ہے۔ مسعود سعد سلمان جو اُن کا پیشرو اور غزنوی دور کا شاعر ہے اور جس کی جائے پیدائش ہندوستان ہی میں ہے، ہندی روایات سے آگاہ معلوم ہوتا ہے بلکہ صاحب "مجمع الفصحا" کے بیان کے مطابق ایک ہندی دیوان کا مصنف بھی تھا۔ فیروز شاہ، علاؤالدین خلجی، سلطان زین العابدین اور اکبر وغیرہ کی کوششوں سے ہمارے ادباء اور شعراء سنسکرت کے فنی اکتسابات اور علمی رُجحانات سے محسوس طور پر آشنا ہو چلے تھے۔ جو سنسکرت نہیں جانتے تھے وہ مقامی زبانوں کی بدولت اِن اثرات سے قریب تر آ رہے تھے۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سنسکرت کے فنی اثرات عربی فارسی یا اُردو میں غیر ارادی یا غیر محسوس طور پر داخل نہیں ہو رہے تھے بلکہ سیاسی عوامل اور سماجی عناصر مِل جُل کر اِس ثقافتی لین دین کی رفتار کو تیز تر کر رہے تھے۔ اگر ایک طرف "رامائن" "مہابھارت" "اتھروید" وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف "قرآن مجید" اور احادیث کے ذخائر بھی ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ "یوسف زلیخا" کا سنسکرت میں ترجمہ کیا جا رہا تھا غرض شاہی سرپرستی کے سائے میں عربی کے عالم اور سنسکرت کے پنڈت ایک ہی جگہ بیٹھ کر علمی خدمت میں مصروف نظر آتے تھے۔ خانِ خاناں کے دربار میں سنسکرت کے علماء اور برج بھاشا کے شعراء یکساں طور پر عزت کی جگہ پاتے تھے اور اپنے فنی اکتسابات پر انعام کے مستحق قرار پاتے تھے۔ کیا ان حالات میں یہ تعجب کی بات ہوگی کہ سنسکرت کی فنی خصوصیتوں سے بھی ہمارے شاعر آگاہ ہوئے؟ سنسکرت کی کتابوں کے علاوہ سنسکرت روایات سے واقفیت کا ایک بڑا وسیلہ برج بھاشا اور دوسری ہندی

زبانوں پر غالب تھا۔ ان مقامی زبانوں نے سنسکرت کی روایات کو بڑی حد تک اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اور چونکہ برج بھاشا" اودھی" وغیرہ زبانوں کے ادب تک عربی فارسی اور اُردو کے ادیبوں کی براہِ راست رسائی تھی اس لئے انھیں بالواسطہ بھی سنسکرت روایات سے قریب آنے کا موقع مِلا۔ شعراء کے علاوہ بادشاہ اور شاہزادے بھی اسی طرح متاثر ہوئے تھے۔ شاہزادوں کو باقاعدہ طور سے سنسکرت اور برج بھاشا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ داراشکوہ کا تو ذکر ہی نہیں ہے جو سنسکرت کا بہت ہی بلند پایہ عالم تھا۔ اکبر خود برج بھاشا میں شاعری کرتا تھا اور اس نے اپنے بیٹے دانیال کی تعلیم اس نہج پر کرائی تھی کہ اس کے ذوقِ ادب میں ہندی روایات رچ بس گئی تھیں۔ چنانچہ جہانگیر نے "تزکِ جہانگیری" میں لکھا ہے کہ دانیال نغمۂ ہندی کی جانب مائل تھا۔ اور اہلِ ہند کی زبان اور اصطلاح میں اچھے خاصے شعر کہہ لیتا تھا۔ اکبر کے چہیتے امیر عبدالرحیم خان خاناں کی سنسکرت دانی اور ہندی نوازی مُسلّم ہے اور اُس کے دوہے آج بھی ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کے اجزا کی طرح داخلِ درس ہیں۔

اورنگ زیب کی سیاسی پالیسیوں کے بارے میں جو عام خیالات پھیلے ہوئے ہیں ان میں یہ پہلو بعض اوقات فراموش ہو جاتا ہے کہ اورنگ زیب کا ذوقِ شعری ہندی سبکِ شعری سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔ فارسی میں اس کے محبوب شاعر صائب اور غنی تھے جو اُس دَور کی فارسی میں سنسکرت کے اثرات کے عکّاس تھے۔ اس نے خود اپنے چہیتے بیٹے اعظم شاہ کی ہندی تعلیم کے لئے میرزا خان بن فخرالدین کو متعین کیا تھا۔ میرزا خاں نے اعظم شاہ کے مطالعے کے لئے "تحفۃ الہند" نامی کتاب فارسی میں لکھی۔ اس میں سنسکرت کے مختلف علوم کے خلاصے ہیں۔ بالخصوص پنگل، النکار، شرنگار رس، کوک، اور لغات ہندی وغیرہ کے علیحدہ علیحدہ ابواب ہیں۔ یہ کتاب علی گڈھ یونیورسٹی میں مجھے ڈاکٹر سید نورالحسن صاحب، صدر شعبۂ تاریخ کی وساطت سے دیکھنے کو ملی تھی اور اب یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کی اشاعت بھی انھیں کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔ اس میں سنسکرت کے صنائع اور بدائع اور رسوں کا باقاعدہ تشریحی ذکر ہے۔ غلام علی آزاد نے اپنی عربی تصنیف "سبحۃ المرجان" میں سنسکرت کے صنائع و بدائع کا ذکر کیا ہے اور اُن کے عربی ترجمے بھی کر دئے ہیں۔ اُنھوں نے صنائع کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ کون سے صنائع عربی کے مختص ہیں، کون عربی اور سنسکرت کے درمیان مشترک ہیں اور کون سے ایسے ہیں جو ہندی کے لئے مخصوص ہیں۔ کچھ صنعتوں کا اُنھوں نے استخراج کیا ہے۔ پھر آیاتِ کلامِ ربّانی اور احادیثِ نبوی کے علاوہ دواوینِ شعراء اور مجامیعِ ادباء سے انکی مثالیں بھی عربی میں پیش کی ہیں۔ خود ایک عربی قصیدہ لکھا ہے جس میں مثالاً صنائع کا استعمال کیا ہے۔ بعد میں اُنھوں نے "سبحۃ المرجان" کا فارسی ترجمہ "غزلان الہند" کے نام سے کیا۔ اسی طرح "سروِ آزاد" میں اُنھوں نے صرف بلگرام کے کئی ایسے علماء کا ذکر کیا ہے جو عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت کے روایات سے کلّی واقفیت اور انھیں برتنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

بدقسمتی سے اُردو کے ابتدائی دَور کے شعراء میں عالم کم تھے۔ اُنھیں عربی اور فارسی کی صرف معمولی اور رسمی تعلیم حاصل تھی اس لئے وہ نہ تو عربی سے باضابطہ استفادہ کر سکے اور نہ سنسکرت سے۔ لیکن ہندی فارسی اور برج بھاشا کے اثرات۔ ان کے یہاں بھی عام ہیں بالخصوص بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، گجرات، عظیم آباد، بنگالہ، اودھ اور جونپور میں ان اثرات کو خاص طور سے پھلنے پھُولنے کا موقع ملا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے محققین اس موضوع پر تفصیلی تحقیق کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُردو زبان سنسکرت اور دوسری ہندی زبانوں سے کتنی اور کس حد تک اخذ و عطا کرتی رہی ہے۔ اور ہمارے ادب میں جو فنی تکلّفات نظر آتے ہیں اس پر کہاں تک سنسکرت اور دوسری ہندی زبانوں کی پرچھائیں پڑی ہے۔

ملک اسمٰعیل حسن خاں

اقبال کی منظر نگاری[1]

منظریہ شاعری کے معنی ہیں ایسی شاعری جس میں مظاہر و مناظرِ قدرت کی تصویریں کھینچی جائیں، اور انسان نے مناظر کو جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے اُن کو الفاظ کے ذریعہ ادا کر دیا جائے۔ اب اگر اُس نے صحیح جو کچھ دیکھا ہے وہی بیان کر دیا تو وہ سادہ، سپاٹ، منظر نگاری ہوگی اور اگر اُس کے ساتھ محسوس کر کے لکھنے کی شرط بھی ملحوظ رکھی ہے تو اُس میں تاثیر اور شعریت بھی مل جائے گی، ملٹن کے الفاظ میں ہر اچھا ادب کسی بڑے فنکار کا خونِ جگر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر نقش خونِ جگر کے بغیر ناتمام ہے ؏

"معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" (اقبال)

منظر نگاری شاعری کی ایک قسم، یعنی شاعری کا ایک موضوع ہے، یہ بذاتِ خود ایک وسیع قسمِ سخن ہے جس میں شاعر مناظرِ فطرت کی عکاسی یعنی موسموں، فصلوں، پھلوں، پھولوں، بالفاظِ دیگر نباتات و جمادات و حیوانات وغیرہ کا بیان اور دیگر مناظرِ فطرت مثلاً دریا، پہاڑ، چاند، گھٹا، گرمی، لُو، دھوپ، کھیت، تالاب، نہر وغیرہ وغیرہ کی عکاسی کرتا ہے، فطرت کی رعنائیاں اور دل آویزیاں ہر ذی حس اور ذی شعور شخص کے احساسات و جذبات میں تموّج و برانگیختگی پیدا کرتی ہیں، اور مختلف و متعدد شعراء کے یہاں اس تموّج کا گہرا عکس رُوحِ فن پر شعوری و غیر شعوری طور پر پڑتا رہتا ہے، اس سے شاعر کی جمالیاتی حس، اور اُس کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، جس شاعر میں جتنا زیادہ اور جتنا لطیف جمالیاتی ذوق لو فیہ ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ وہ حسین مناظر و مظاہر میں لُطف و لذّت محسوس کرتا اور اُن کا ذکر بڑے ذوق و شوق اور بڑے خوبصورت انداز میں کرتا ہے، جس قدر وہ خود متاثر ہوتا ہے، اُسی نسبت سے اُس کا اُس منظر یا پیکر کا بیان بھی واقعیت آمیز اور دل آویز ہوتا ہے، اس سے اُن مناظر سے اُس کی وابستگی کے جھوٹ سچ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن محض منظر نگاری کسی بڑی شاعری کا موضوع نہیں بن سکتی، البتہ "فطرت پرستی" بڑی یا اعلیٰ شاعری کی دلیل اور اُسکا موضوع بن سکتی ہے، اُس میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے، انگریز شعراء محض منظر نگاری نہیں کرتے اُن کے یہاں PHILOSOPHY OF NATURE ہے، محض مناظر کی عکاسی یا فوٹوگرافی نہیں۔ وہ اُس کے ذریعہ حقیقت کا عرفان حاصل کرتے ہیں، اسرارِ حیات کو سمجھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور فطرت میں "رُوحانیت" کو بھی تلاش کرتے ہیں، لیکن اُردو کے منظر نگار شعراء کے یہاں (جوش کے علاوہ) منظر نگاری فطرت کی عکاسی محض یا فطری مناظر کو پس منظر میں استعمال کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ قلی قطب شاہ سے لیکر اقبال تک کے منظر نگار شعراء کا کلام اس کا روشن ثبوت ہے۔ چونکہ اُردو شاعری فارسی

---

[1] یہ مضمون میرے THESIS کے ایک باب "جوش کی منظر نگاری" کا ایک حصہ ہے۔

شاعری بھی

البتہ بعد کے دور میں
شاعری کے نقشِ قدم پر چلی اس لئے اُس میں بھی اوّل اوّل منظر نگاری یا فطرت پرستی کا کوئی قابلِ ذکر دخل نہیں رہا، البتہ بعد کے دور میں
کبھی کبھار مُنھ کا مزہ بدلنے کے لئے ایک آدھ جگہ یا پھر قصیدوں، مثنویوں اور مرثیوں میں پسِ منظر کے طور پر کہیں کہیں مناظرِ فطرت کے
بکھرے ہوئے جلوے مل جاتے ہیں۔ غزلوں کا کینڈا خود قصائد کی تشبیب سے ماخوذ تھا جو LYRICAL POETRY کی ایک قسم
تھی لیکن وہ (قصائد کی تشبیب) بھی با وجود بہاریہ و برسات کے تذکروں کے محض خیالی اور مصنوعی ہوتی تھی۔ حقیقی مناظر کا آب و

رنگ ہمیشہ اُس سے دُور رہا۔
جوشؔ سے قبل ہمارے ادب میں جو منظر نگار شاعر ملتے ہیں، اُن کو ہم دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں، اِس کو یوں بھی
کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ سے قبل ہمارے ادب میں جس طرح کی منظریہ شاعری ملتی ہے اُس کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔
ایک قسم تو وہ ہے جس میں شعراء نے مناظرِ فطرت کو پسِ منظر کے طور پر استعمال کیا ہے، اِس قسم کے ذیل میں ایسے سب
قصیدہ نگار آجاتے ہیں، جنھوں نے قصائد کی تشبیب میں کسی نہ کسی صُورت سے مناظرِ فطرت سے کام لیا ہے، مثال کے بطور
سوداؔ۔ انشاؔ۔ ذوقؔ۔ غالبؔ۔ منیرؔ شکوہ آبادی۔ محسنؔ کاکوروی وغیرہ۔
اسی طرح تمام مثنوی نگار جن کے یہاں کہیں نہ کہیں مناظرِ فطرت کی مصوّری ملتی ہے اِس میں شامل ہیں، کیونکہ مثنویوں میں
بھی مناظر کے پسِ منظر کے ذریعہ کہانی کو آگے بڑھایا جاتا ہے، مثلاً ابنِ نشاطیؔ۔ وجہیؔ۔ میرؔ۔ میر حسنؔ۔ منیرؔ۔ شوقؔ وغیرہ شعراء کے یہاں

منظر نگاری کا یہی مقصد ملتا ہے۔
مرثیہ گو شعراء مثلاً ضمیرؔ، انیسؔ اور دبیرؔ وغیرہ کے یہاں بھی مناظرِ فطرت کی حیثیت "چہرہ" (تمہید یا پسِ منظر) کی ہے، اِن شعراء
نے بھی مناظرِ فطرت سے زیادہ تر پسِ منظر کا کام لیا ہے۔
کے علاوہ بیسویں صدی میں اقبالؔ نے بھی
دوسری قسم جو جوشؔ سے قبل یعنی اُن کے پیشروؤں کے یہاں ملتی ہے، وہ مناظر کی محض عکاسی (فوٹوگرافی) ہے جس کا
کوئی مقصد یا کوئی مطمحِ نظر بجز اُس سے لُطف اُٹھانے یا محظوظ ہونے کے اور کچھ نہیں ہے یعنی وہ مقصود بالذات یا اپنے
ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ ایسے شعراء کی فہرست میں قدماء میں قلی قطب شاہ۔ نظیرؔ اکبر آبادی اور جدید شعراء میں حالیؔ۔
آزادؔ۔ اسمٰعیلؔ۔ شوقؔ قدوائی۔ چکبستؔ۔ سُرورؔ۔ بے نظیر شاہ۔ صفیؔ اور اقبالؔ بھی آتے ہیں، اقبالؔ کی ابتدائی نظمیں
جو بانگِ درا میں شامل ہیں اُن میں سے اکثر مناظر کی عکاسی یعنی منظر نگاری برائے منظر نگاری کی حیثیت رکھتی ہیں ———

اِس وقت اقبالؔ کی منظر نگاری کے متعلق کچھ گذارش مقصود ہے۔
اقبالؔ کی منظر کشی پر متعدد اشخاص نے اظہارِ رائے کیا اور اُس کو سراہا ہے، بلکہ اُن کو ایک اعلیٰ درجے کا منظر نگار ثابت کرنے
کی بھی کوشش کی ہے۔ طویل و بسیط کتابوں میں بھی، اُن کی شاعری کے اِس پہلو پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور مختصر مقالات میں بھی۔ اور یہ
اپنی جگہ ایک حقیقت بھی ہے کہ مناظرِ فطرت سے اقبالؔ نے اپنی بعض نظموں میں مختلف طرح سے کام لیا ہے، کہیں اُنکی حیثیت
مرکزی ہے، اور کہیں ضمنی۔ کہیں صرف پسِ منظر کے لئے اُن کو استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اِس کے با وجود اقبالؔ "اعلیٰ یا
عمدہ" تو کُجا ایک اچھے اور کامیاب منظر نگار شاعر بھی ہرگز نہیں ہیں، اُن کی شاعری میں منظر نگاری ایک ضمنی حیثیت رکھتی
ہے، جس پر غالباً خود اُنھوں نے بھی کبھی توجہ نہیں کی، اور نہ مناظرِ فطرت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ ڈاکٹر عبداللہ کے
الفاظ میں" اُن کو شیدائے فطرت سمجھنے کے بجائے حریفِ فطرت کہنے کو جی چاہتا ہے۔"[1]
اقبالؔ کی نظرِ فطرت کی کوتاہیوں اور خامیوں، بے قاعدگی اور نظم و ضبط کی کمی پر پہلے پڑتی ہے جو تراش خراش کے بعد

---

[1] مقاماتِ اقبال صفحہ ۳۲۔

درست یا مفید مطلب ہو سکتی ہے، اُنھوں نے خود ایک جگہ صاف الفاظ میں کہا ہے کہ ؎

فطرت کو خرد کے رُو برو کر | تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر
عُریاں ہیں ترے چمن کی حوریں | چاکِ گُل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت | جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تُو کر

اقبال عناصرِ فطرت کو انسانی فطرت کے امکانات کے مقابلہ میں لاچار و مجبور تصور کرتے ہیں، فطرت اپنے اندر تغیر و تبدل کی صلاحیت نہیں رکھتی، وہ فطرت کی تکمیل کے مدعی اور بانی (انسانی) صناعیوں کے مقابلے میں خود کو اُس کا حریف ہی سمجھتے ہیں، اس لئے وہ کہتے ہیں ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم | سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم

(محاورہ مابینِ خدا و انسان)

اُنھوں نے مناظرِ فطرت کو اپنے مقاصد، یعنی نکاتِ فلسفہ اور جذباتِ ملت کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے استعمال کیا ہے منظر نگاری اُن کا موضوع یا مقصود نہیں ہے، اسی لئے ہم کو اُن کے یہاں فطرت کا عمیق مشاہدہ، تجربات کا تنوع اور جزئیات کا تسلسل نہیں ملتا، اُنھوں نے جو نظمیں محض مناظرِ فطرت پر لکھی ہیں اُن میں بھی ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے، اس کی وجہ سے مناظر کی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی، عبدالقادر سروری کے بقول "اقبال کے مناظر تفصیلی نہیں بلکہ ایمائی ہوتے ہیں[1]۔" اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اُنھوں نے مناظرِ فطرت پر نسبتاً طویل نظمیں بھی لکھی ہیں، اُن میں فطرت کا حُسن زیادہ واضح شکل میں دیکھنے میں آتا ہے لیکن اُن نظموں کو پڑھ کر بھی اقبال کو "پیغمبرِ فطرت" تو الگ ایک اچھا منظر نگار بھی نہیں کہا جا سکتا، اُن میں بھی تفصیل کے بجائے اجمال، مشاہدہ کے بجائے تخیل کی فراوانی ہے، اُن کو پڑھ کر ہم کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم اُن مناظر کو کسی مقام پر کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطرت کی رعنائیوں اور نیرنگیوں میں کھو نہیں جاتے، وہ فطرت کے نہ مصور ہیں نہ ادا شناس۔ بانگِ درا کا شاعر مبلغ کم اور شاعر زیادہ ہے، اُن کی بانگِ درا کے بعد کی شاعری اگرچہ فکری لحاظ سے بہت بلند پایہ اور اپنا جواب آپ ہے لیکن اُس میں مناظرِ فطرت کے وہ نقوش بھی نہیں ملتے جو دَورِ اوّل کی نظموں میں جھلک اُٹھے ہیں۔ اُن کے فلسفیانہ رُجحان نے اُن کی توجہ کا رُخ اس طرف سے پھیر دیا، اس سے نقصان یہ ہوا کہ وہ اپنے ابتدائی دَور کی نظموں میں منظر نگاری کے جو مرقعے پیش کر رہے تھے وہ تکمیل کی کسی حد تک پہنچے بغیر درمیان بلکہ شروع ہی میں مُرجھا کر رہ گئے۔ پھر اس کے ساتھ اور اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو خاص اہم ہے وہ یہ کہ اقبال کی فطرت نگاری اُن کے فطرت کے عمیق مشاہدے کا نتیجہ نہ تھی بلکہ زیادہ تر تخیلی اور سطحی مشاہدہ کی پیداوار تھی، جس کی وجہ سے اُس میں کوئی گہرائی اور حُسن پیدا نہ ہو سکا، اس کا اعتراف اقبال کے پرستار ڈاکٹر عبداللہ نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"اقبال کی ذہنی تحریک یا تخلیقی داعیے عموماً خارجی محرکات سے زیادہ اُن کے تخیل سے اُبھرتے ہیں، فطرت کا براہِ راست مشاہدہ بہت کم ہے، اور وہ اپنی ان مشاہدات کی کمی کو تخیل اور ذہانت سے پُورا کرتے ہیں"۔[2]

اس کے علاوہ اُن کے یہاں مقامی رنگ اور ہندوستانی فضا بھی بہت کم ملتی ہے، اور انداز بیان پر فارسیت کے غلبہ کے باعث ایک طرح کا اجنبی پن اور تکلف پیدا ہو گیا ہے، جس سے منظر نگاری کا حُسن سمٹ کر رہ جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر کوئی خوشگوار اثر

---

[1] جدید اُردو شاعری صفحہ ۱۷۰۔ [2] مقاماتِ اقبال صفحہ ۹۔

نہیں چھوڑتا۔ اُنھوں نے مناظر کو زیادہ تر پس منظر کے لئے استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ہم آگے چل کر اُن کے فلسفیانہ نکات اور حکیمانہ مسائل میں اُلجھ کر یا اُن میں ڈوب کر مناظر کی دلکشی و حُسن کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں، اور اصل مقصد یا اقبال کا اصل موضوعِ نظم ہی ہم کو یاد رہ جاتا ہے، غالباً انہی سب باتوں کے پیشِ نظر سردار جعفری نے کہا تھا کہ "اقبال کے یہاں روایتی اثرات زیادہ تھے اور کلاسیکی انداز تھا، ہمالیہ والی نظم کا انداز کم ہو تا گیا اور اُس کی جگہ لالہ و گُل اور سمن زار لیتے گئے"[1] جیسا کہ اُوپر کہا گیا کہ اقبال کی منظر نگاری تخیلی (خیالی) زیادہ ہے، اُس میں تکلف بھی بہت ہے، یہ تکلف کچھ تو اُن کی فارسی آمیز زبان اور لب و لہجہ سے پیدا ہوا ہے اور کچھ غیر ہندوستانی فضا و ماحول کے باعث۔ مناظر کی خوبصورتی و رعنائی کا احساس اُس سے نہیں ہوتا، یہاں سادگی کا وہ حُسن نہیں جو مناظر کو دلنشین کر کے پیش کرے، اُن کی منظر نگاری کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مناظر ہم پر نہیں چھاتے بلکہ اقبال ہم پر چھائے جا رہے ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ اُفق سے آشکار — صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر — کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر — محملِ پروازِ باندھا ہے سر دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اِس کھیتی کا ہے — بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے — سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی — کھینچتا ہو میاں کی ظلمت سے تیغ آبدار
مطلعِ خورشید میں مُضمر ہے یوں مضمونِ صبح — جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار (نمودِ صبح)

تشبیہات کی نُدرت، تعبیرات کی طرفگی، تخیل کی لالہ کاری، تراکیب کی بھرمار کے باعث بے شبہ نظم اچھی کہی جا سکتی ہے، لیکن صناعی و فنکاری اور تکلف کے اِس ڈھیر میں مناظر کی اصل رُوح تربت بن کر رہ گئی ہے، کسی ایک شعر سے "نمودِ صبح" کا مبہم سا نقشہ یا منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آتا، دبیر نے جہاں "طلوعِ صبح" کا نقشہ کھینچا ہے وہ بھی تخیل و مبالغہ اور تشبیہات و تمثیلات کی میناکاری کے باعث کچھ ایسا ہی ہے ؎

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیٔ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٔ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہُنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یُوسف غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہُوا — یعنی غروبِ ماہِ تجلّی نشاں ہُوا
یُونس دہانِ ماہیٔ شب سے عیاں ہُوا — یعنی طلوعِ نیّرِ مشرق ستاں ہُوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

کیا رات کے ختم ہونے، اور آفتاب کے طلوع اور ضیا بار ہونے کی کوئی صاف اور دلکش تصویر اِس لفظی طلسم کاری سے سامنے آتی ہے؟

---

[1] ترقی پسند ادب صفحہ ۱۵۵۔ (پہلا ایڈیشن)

میں نے سطور بالا میں کہا تھا کہ اقبال نے مناظرِ فطرت کو کہیں کہیں مرکزی حیثیت سے بھی برتا ہے اور زیادہ تر نفسِ موضوع کے اثر کو تیز کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر بھی استعمال کیا ہے ---- اپنی شاعری کے پہلے دَور میں انھوں نے مغرب کے فطرت پرست شاعروں کے اثر سے فطرت کے موضوعات پر براہِ راست نظمیں لکھی ہیں۔ بانگِ درا میں اس قسم کی متعدد نظمیں مل جاتی ہیں مثلاً ہمالہ۔ ابرِ کوہسار۔ ایک آرزو۔ آفتابِ صبح۔ ماہِ نو۔ پیامِ صبح۔ جگنو۔ ابر۔ ایک شام۔ نمودِ صبح۔ چاندنی رات۔ وغیرہ، ان نظموں میں بھی کم و بیش وہی نقائص مل جاتے ہیں جن کی طرف اشارے کیے گئے ہیں لیکن بانگِ درا کی نظموں میں کم اور اپنے دوسرے اور تیسرے دَور میں زیادہ انھوں نے فطرت کو پسِ منظر کے لئے استعمال کیا ہے، اس طرح کی نظموں میں بزمِ انجم۔ خضرِ راہ۔ جوابِ خضر۔ ساقی نامہ۔ ذوق و شوق۔ رات اور شاعر۔ گورستانِ شاہی اور ع "پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن" وغیرہ ہیں۔

اقبال کی منظر نگاری کا ایک بنیادی عیب جو اُنکی منظر نگاری کے تخئیلی ہونے کے عیب سے زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ وہ مناظر کے بیان میں بعید ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں، جن سے کوئی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی، اقبال نے شاید ہی کسی نظم میں جزئیات سے کام لیا ہو، یہ کوتاہی اُن کی اس قسم و قبیل کی تقریباً تمام نظموں میں ملتی ہے، یہاں دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل   ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب   نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی   نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی   (ماہِ نو)

بس اس کے بعد دوسری بات شروع ہو جاتی ہے، منظر نگاری یہیں پر ختم ہو جاتی ہے، آپ نے دیکھا کہ اختصار و اجمال کے علاوہ کتنا تکلف اور تصنع ہے، اس کے بعد صرف تین شعر اور ہیں، جن کا منظر نگاری سے کوئی تعلق نہیں، دوسری مثال دیکھئے، نظم کا عنوان ہے "گورستانِ شاہی":-

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے   کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں   صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی   بربطِ قدرت کی اک دھیمی نوا ہے خامشی

تکلف برطرف کوئی صحیح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آتا، ایک دُھندلا سا چھایا ہوا ہے، مناظر دُھندلے ہیں، بس اس کے بعد اقبال دوسرے مسائلِ نظم شروع کر دیتے ہیں، منظر نگاری یہیں ختم ہو جاتی ہے، ایک دوسری مثال مشہور نظم "خضرِ راہ" سے ؎

۱- ساحلِ دریا پہ میں اِک رات تھا محوِ نظر   گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
۲- شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر   تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
۳- جیسے گہوارہ میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار   موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں محوِ خواب
۴- رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر   انجم کم ضَو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

پہلے شعر سے کوئی منظر سوائے اس کے کہ شاعر دریا پر کھڑا ہے نظر نہیں آتا۔ دوسرے شعر میں دریا کو "نرم سیر" اور "تصویرِ آب" کہا ہے اور اس کے بعد سکون کو تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں دُہرایا ہے چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں کوئی منظر

نہیں ایک واقعہ بیان کیا ہے، دوسرے مصرع میں ضرور ایک منظر ہے اور بس۔ اس کے بعد شاعر اپنے مقصد کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ مناظر کی عکاسی کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ ہر بات مبہم اور غیر مکمل رہ جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں حسنِ فطرت نیس کی طرح زیادہ تر ٹکڑوں ٹکڑوں میں بکھرا ہوا ہے جس سے کوئی واضح تصویر سامنے نہیں آتی۔ ان بکھرے جلوؤں سے کوئی آئینہ نہیں بنتا۔ ایک دوسری نظم "ذوق و شوق" میں مناظر کی ایک جھلک آنکھ مچولی کی طرح یوں دکھائی ہے ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں — چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب — کوہِ اِضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دُھل گئے — ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

"مسجدِ قرطبہ" میں بھی مناظر کی دو ایک جھلکیاں مل جاتی ہیں، لیکن ان کو پڑھ کر ذہن ایک تشنگی محسوس کرتا ہے، کیونکہ شاعر درمیان میں مناظر کے دو ایک نقش ابھار کر وہاں سے غائب ہو جاتا یا یکدم اپنے مقصدِ اصلی کی طرف آگے بڑھ جاتا ہے مثلاً ؎

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اس اجمال کے علاوہ منظر میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ یہ فضا ہماری دیکھی بھالی نہیں، وہ اس رنگین بیان کے باوجود دل میں جگہ نہیں بناتے۔ کوہِ اِضم، ریگِ نواحِ کاظمہ، آبِ روانِ کبیر کا ذکر پڑھ کر ذہن چونک اٹھتا ہے۔ ایک دوسری نظم "ایک شام" (دریائے نیکر، ہائیڈل برگ کے کنارے پر) میں گو تاثیر، کشش اور خوشگوار انداز ملتا ہے، اس کو پڑھ کر شروع سے آخر تک ایک تسلسل و تاثر قائم رہتا ہے، لیکن اجمال و اختصار کے نقص کے علاوہ اس نظم میں بھی فضا و ماحول اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں، دریائے نیکر کی فضا کے تصور سے بہ سبب واقف نہ ہونے کے کوئی لطف نہیں ملتا نہ کوئی جانا پہچانا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اقبال کے یہاں ایک نگینہ ضرور ایسا ملتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے، اس میں بھی اگرچہ اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس میں مناظر نسبتاً واضح اور صاف ہیں، تکلف و تصنع بھی نہیں، اس کی سادگی و خوبصورتی کا جواب نہیں ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح   اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حُسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے   ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

لیکن اقبال کے یہاں ایسی مثالیں خال خال ہیں، اُن کی منظر نگاری کا یہ مجموعی انداز اور وصف نہیں ہے، اُس میں یہ ہندوستانی فضا نہیں، اُس میں تفصیل کے بجائے اجمال ہے، مشاہدہ اور تجربہ کے بجائے تخیل کی رنگ آمیزی زیادہ ہے اس لئے اُن کو منظر نگار شاعر" کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ اُنھوں نے مناظر قدرت سے اپنے مقصد یا ضرورت کے تحت کام لیا ہے" خالص منظر نگاری" اُن کا شعار، یا مقصد یا مطمحِ نظر کبھی نہیں رہا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی تصنیف "مقاماتِ اقبال" کے دو مضامین میں اقبال کی فطرت نگاری سے بحث کی ہے، یہاں اُن مضامین کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن سے میری بات اور زیادہ صاف ہوجاتی ہے:۔

۱۔ اُن کی نظموں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اقبال کے ذہن کو تعینِ مقام سے زیادہ دلبستگی نہیں۔

۲۔ اُن کے کلام میں خیالی مرقعے بے شمار ہیں۔

۳۔ اُن کے یہاں ہمالہ اور اُس کی جزئیات کے یہ مرقعے کسی جمالیاتی تحریک کا نتیجہ نہیں، اور یہ اُن کی مرقع کشی مقصود بالذات نہیں بلکہ شاعر نے اُن کو یا تو اپنی نظموں کا پس منظر بنایا ہے یا اُن سے کائنات کے اسرار کی تفسیر و تشریح کا کام لیا ہے۔

۴۔ وہ حُسنِ فطرت کو پہلے اخلاقی اور روحانی حقائق کے ادراک کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعد میں تسخیرِ فطرت کا۔ اقبال کی بیشتر تصویریں خیالی ہیں۔ وہ جب مفرد اشیاء کی مصوری کرتے ہیں تو خارجی جزئیات سے زیادہ اُن اشیاء کے پوشیدہ اسرار، حکمت و بصیرت کا بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔

۵۔ اقبال کو اس طرح کا شاعرِ فطرت سمجھنا سخت غلطی ہے جس طرح کا ورڈ سورتھ کو سمجھا جاتا ہے، انگریزی شاعروں میں وہ اگر کسی شاعر کے کسی قدر قریب ہے تو وہ براؤننگ ہے، جس کی شاعری میں فطرت مقصود بالذات نہیں بلکہ بعض افکار کی تشریح کے لئے پس منظر کا کام دیتی ہے۔ براؤننگ کے یہاں فطرت کی وہی اشیاء حسین ہیں، جو قوت، جلال اور توانائی کا مظہر ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی فطرت کی رعنائی اُس کی لطافتوں میں نہیں بلکہ اُس کے پُرجلال مظاہر میں ہے۔

اشرف قادری

خوشتر گرامی ـــــ بہ حیثیت طنز نگار

طنز نگاری اور مزاح نویسی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ دیکھنے میں آسان مگر قلم اُٹھانے کے بعد دل گردے پھوٹ جاتے ہیں اور اُسوقت محسوس ہوتا ہے کہ طنز نگار ایک خاردار کُرسی پر بیٹھا ہے۔ اگر اس نے ذرا سی بھی غلطی کی تو وہ خود اسکا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لئے طنز نگار کے لئے اپنی بذلہ سنجی، مزاح و ظرافت کے اظہار کے لئے فطری رجحان، مناسب الفاظ کا چناؤ، مضمون میں سنجیدگی اور جرأتِ مقابلہ کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لیجیے کہ خود مُنہ کی کھانا پڑتی ہے، اور دوسروں کے لئے تفریح کا سامان بننا پڑتا ہے۔

ادب برائے ادب بھی ہوتا ہے اور برائے زندگی بھی ـــــ اس لئے ادب کا زندگی سے قریب رہنا ضروری ہے۔ ادب کے ہر شعبہ کو اپنی باذبیت اور چاشنی کے لئے زندگی کے عنوانات کو ہی اپنا مرکزِ نگاہ بنانا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خود ادیب ناکامی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ادب کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، اقتصادی ہو یا معاشرتی۔ اس کے صحیح نقشہ کو دُنیا کے سامنے پیش کرے تاکہ قارئین اسے پڑھنے کے بعد اپنی اچھائیوں اور بُرائیوں کو محسوس کرسکیں اور اپنی زندگی کی کمزوریوں پر قابو پاکر اپنی اصلاح کرسکیں۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو ادب کا مقصد ہی فوت ہوجائے۔ ادیب زندگی کے ہر شعبہ پر ناقدانہ نگاہ رکھتا ہے اور اس کی خرابیوں کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر بناتا ہے۔

تبصرہ، تنقید اور طنز یہ تینوں ادب کی وہ اصناف ہیں جو خصوصیت سے انسان کی زندگی کی اصلاح چاہتی ہیں۔ مگر تینوں کا طریقۂ کار الگ الگ ہے۔ تبصرہ کے ذریعہ انسانی زندگی کے روشن پہلوؤں کو اُجاگر کرکے دوسروں کے لئے ایک مشعلِ راہ دکھائی جاتی ہے۔ تنقید سے انسان کی اچھی اور بُری فطرتوں پر روشنی ڈال کر اچھائیوں کی طرف دعوتِ عمل دی جاتی ہے اور بُرائیوں سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کے احساس کو ابھارا جاتا ہے۔ لیکن طنز و مزاح زندگی کے صرف خراب پہلوؤں کو طشت ازبام کرنے کا دوسرا نام ہے۔ طنز کے ذریعہ تاریک سے تاریک پہلوؤں کو کھلے اور صاف الفاظ میں پیش کرتے ہیں تاکہ عبرت ہو اور قاری کے دل میں ایک جذبۂ اجتناب پیدا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں ہر روز ایسے لمحات آتے ہیں جو گُدگُدیوں اور چٹکیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اور ان لمحات کی یاد ہی لبوں پر مُسکراہٹ پھیلا دینے کے لئے کافی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مزاح کا صحیح ذوق وہی ہے کہ ہم خود

اپنے خلاف دوسروں کے مزاح سے لطف اندوز ہوسکیں۔ دوسروں کی غلطیوں پر ہنسنا آسان ہے مگر جب اپنی صورت آئینہ میں انسان دیکھے اور اپنی بے ڈھنگی شکل وشباہت کو باوجود روحی تکلیف وکرب کے، دوسروں کی ہنسی کا نشانہ بننے کے تصور ہی سے بے اختیار ہنس پڑے، وہ طنز ومزاح کی بہترین مثال ہے۔ اپنے ہی دُکھ اور اپنی ہی چوٹ پر ہنس پڑنا جرأتِ رندانہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اپنی حماقت کے تکلیف دہ نتیجوں پر ہنسنا بہت ہی مشکل کام ہے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں اُن کی جواں ہمتی میں کلام نہیں۔ یہ ایک مستند مقولہ ہے کہ ظرافت نام ہے بے ڈھنگے پن اور زندگی کے نہ سمجھنے کا۔"

طنز وظرافت آجکل دو قسم کی ہے۔ ایک فطری اور دوسری مصنوعی۔ یوں تو طنز ومزاح نگار بہت ہیں مگر بہت کم ایسے اہلِ قلم ہیں جن کا طنز فطری ہے۔ ورنہ زیادہ تر ایسے ہیں جو ہماری زندگی کی بے قاعدگی، رسم ورواج کی غلطیوں۔ انسانیت سوز حرکتوں، ظلم وجبر کی داستانوں اور مظلوموں کی کہانیوں کو سُنتے ہیں، دیکھتے ہیں مگر اُن پر صحیح ناقدانہ نظر نہیں ڈال سکتے۔ وہ سرسری طور پر اپنا ایک خیال پیدا کرلیتے ہیں اور لکھنے لگتے ہیں۔ اُن کے پاس اصلاح کا خیال ضرور ہوتا ہے مگر اُنہیں اِس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ مزاح اور بد مذاقی کے درمیان ایک باریک خطِ فاصل ہے اور یہیں سے اُن کے مصنوعی اور غیر فطری ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

میرا ہی نہیں بلکہ بہت سے نقّادوں کا خیال ہے کہ طنز نگاری باقی تمام اصناف ادب سے خواہ نثر ہو یا نظم، تنقید ہو یا تبصرہ، بہت مشکل کام ہے۔ سوائے طنز نگاری کے باقی تمام اصناف ادب کو ارادی اور غیر ارادی دونوں صورتوں میں تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن طنز ومزاح کی صورت یہ ہے کہ اگر طبیعت حاضر نہ ہو اور اسکا رنگ دل ودماغ پر گہرا نہ ہو اور مزاح کی کیفیت اپنے اُوپر طاری نہ کی جائے تو لکھنا ناممکن ہے۔ آئے دن کی گفتگو میں دوستوں کے ساتھ اگر طبیعت موزوں ہوتی ہے تو ایک سے ایک عمدہ اور مناسب فقرہ چُست ہوجاتا ہے مگر طبیعت کے حاضر نہ ہونے کی صُورت میں ذہین سے ذہین آدمی بھی خود ہی اپنے سوال کے جواب میں سخت اور مناسب جملہ چُست ہوجانے سے تمام محفل کے لئے سامانِ تفریح، اور تختۂ مشق بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی طنز نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ مُسکراتا رہے اور ہنستا رہے۔ کھِسیانی ہنسی ہی سہی۔

پروفیسر سید احتشام حسین فرماتے ہیں کہ "سرمایہ دارانہ سماج اور سیاست کے موجودہ بحران کو دلکشی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے طنز ایک لاجواب ذریعۂ اظہار ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ طنز نگاری مشکل ترین اصناف ادب میں سے ہے، اور مثال سے واضح کرنے کی ضرورت ہو تو میں کہوں گا کہ طنز نگاری ننگی تلوار پر ناچنے سے کم نہیں ہے کیونکہ ذراسی لغزش میں زخمی ہوجانا یقینی ہے۔ تلخی میں حلاوت اور حلاوت میں تلخی پیدا کرنا طنز نگار کے لئے ضروری ہے۔"

سوؔدا اور انشاؔر سے لیکر آج تک بہت سے طنز نگار نثر ونظم میں ہوئے اور سب نے اپنی اپنی اہلیت اور قابلیت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ سوؔدا اور انشاؔر کے زمانے میں جو صحیح طنز نگاری ہونی چاہیئے وہ مفقود تھی کیونکہ ان کے یہاں طنزیات تنگ نظری، ہجو اور سطحی مذاق پر منحصر ہے۔ لیکن جب ہم لوگ اکبرؔ الہ آبادی تک پہنچتے ہیں تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم میں طنز نے ایک بہت اُونچا مقام حاصل کرلیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اکبرؔ کے کلام سے طنز وظرافت کی پُوری ایک تاریخ مرتب کرسکتے ہیں۔ جس قسم کا طنز ومزاح اکبرؔ کے کلام میں ہے اِس سے پہلے کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اور نہ ان کے بعد کوئی شاعر اِس میدان میں اُن سے سبقت حاصل کرسکا۔

نثر میں بھی متعدد لوگوں نے طنز ومزاح کو اپنایا مگر بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبرؔ الہ آبادی کی

طرح خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جس سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اس ڈھنگ کا طنز نگار نثر میں کمیاب تھا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ خوشتر صاحب کو طنز و ظرافت کا ملکہ قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ جو ہر بات میں اپنی فطری زندہ دلی سے کوئی نہ کوئی پہلو ہنسنے اور ہنسانے کا نکال لیتے ہیں اور اپنے اچھوتے طرز بیان سے لوگوں کو متاثر کر دیتے ہیں۔

طنز کا مقصد تنقید و اصلاح ہوتا ہے اور ظرافت کا منشا تفریح ہے۔ طنز میں تو بگڑنے میں کچھ دیر لگتی ہے، مگر ظرافت میں چوک معاف نہیں کی جاتی۔ خالص طنز میں تلخی اور نشتریت ہوتی ہے۔ اس کو ہلکا کرنے کے لئے ظرافت کی چاشنی ڈالی جاتی ہے۔ خوشتر گرامی کی طنزیات کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی، اصلاحی اور بنیادی ہیں۔ اُن کی تحریر میں طنز و ظرافت کا بڑا لطیف و حسین امتزاج ہے۔

خوشتر گرامی کے "تیر و نشتر" جو بیسویں صدی کے ہر پرچہ کی ابتدا میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، طنز و ظرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ اُن میں پڑھنے والے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ "تیر و نشتر" خوشتر گرامی کے اُن خیالات و احساسات کے ترجمان ہوتے ہیں جو صالح ہیں۔ ان میں خلوص، سچائی، آزادی، عدل و انصاف اور سب سے اہم انسان دوستی کے تقاضوں سے پیدا ہونے والے جذبات سانس لیتے ہیں۔ اور یہ اُن لوگوں کو متاثر کرتے ہیں جو ان خصوصیات کو عزیز رکھتے ہیں۔ ورنہ اوروں کے لئے ایک کڑوا اور تلخ گھونٹ ہوتے ہیں۔ خوشتر صاحب اپنے تیر و نشتر میں فرماتے ہیں ۔

"دہلی میں بہت سے پارک بنائے جائیں گے ... " تاکہ مکانوں کی قلت دور ہو اور لوگ کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا میں رہ سکیں۔

"مستعفی وزراء کو دوبارہ وزارت میں لینے پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔" (سری پاٹل) ...... ورنہ آپ کا چانس ختم ہو جاتا۔ اب تو اُمید ہے۔

"طلباء قربانیاں دینے کا جذبہ پیدا کریں۔" ایک عنوان ... اور اس جذبہ کے تحت سب سے پہلے تعلیم کو قربان کریں۔

"ہند اور پاکستان کے درمیان جنگ نہیں ہوگی" ایک عنوان .... جن سنگھیوں کی جانب سے پُرزور احتجاج ۔

خوشتر صاحب لکھتے ہیں :۔

"کرپشن اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے" گلزاری لال نندا .... جمہوریت زبان پر ہے اور کرپشن دلوں میں۔

"اپنے مقصد پر نظر رکھو" لال بہادر شاستری کا مشورہ ...... اس مشورہ پر تو ہر کانگریسی پہلے ہی سے عمل کر رہا ہے۔

"وزارت کی پیش کش" ...... نیکی اور پوچھ پوچھ۔

آپ ہی کہئے کتنا لطیف طنز اور بے باک اظہارِ خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشتر صاحب سماجی اور سیاسی کمزوریوں کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کا موقع مہیا کرتے ہیں۔

خوشتر صاحب نے تنگ نظری اور قدامت پسندی کی سخت مذمت کی ہے لیکن جو کڑوی دوا اُنہوں نے تہذیب معاشرت کی بیماریوں کے لئے تجویز کی ہے وہ شکر میں لپٹی ہوئی ہے جس کو نازک سے نازک طبیعت والا بھی گوارا کر لیتا ہے۔ وہ طنز و ظرافت کے ذریعہ اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، تمدنی اور تعلیمی غرض ہر شعبہ کے عیوب و نقائص کو [illegible] کرکے اُن کا مضحکہ خیز اور کثافت آمیز رُخ ہمارے سامنے کر دیتے ہیں۔ ہم بظاہر اُن کی باتوں پر ہنستے ہیں مگر [illegible]

میں اپنی مکروہ صورتوں کو دیکھ کر شرمندہ بھی ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں، اور اسی شرمندگی کے احساس کو ختم کرنے اور اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ہم ہنستے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"قول و فعل کا تضاد" ایک عنوان.... جو آج کل کے لیڈروں کا طرۂ امتیاز ہے۔

"امریکہ میں کاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے"..... اور ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں، ہمارے یہاں بھی بے کاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

"کنٹرول یا اناج کی سرکاری تجارت سے خوراک کا مسئلہ حل نہیں ہوگا" شری پاٹل........ بلکہ اس کے لئے تقریروں اور بیان بازی کی ضرورت ہے۔

"آٹے میں ملاوٹ کی روک تھام کے لئے انسپکٹر مقرر کئے گئے"...... اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ انسپکٹر خالص ہیں۔ ان میں ملاوٹ نہیں ہے۔

واقعتاً خوشتر گرامی کی بذلہ سنجی بڑی معیاری ہے اور ان میں سماجی اور سیاسی شعور بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کسی کو بخشنا اُن کے لئے ممکن نہیں، جو سامنے آ گیا اُسی کی دُرگت بنا دی۔ اُن کے مناسب الفاظ اور چُست جملوں میں انتہائی توازن ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اُردو بین الاقوامی زبان بن سکتی ہے" ایک عنوان....... خواہ مخواہ بن سکتی ہے۔ ہندی رکشا سمیتی والے مورچہ لگا کر روک دیں گے۔

"چین کا کردار" ایک عنوان....... دوست بن کر پیٹھ میں خنجر گھونپنا ہے۔

"اسکولوں میں بلیک بورڈ نہیں ہے" ایک عنوان..... محکمۂ تعلیم کا سیاہ کارنامہ۔

"ایک شاعر نے لکھا ہے ؎ چُپکے سے لے رہے ہیں وہ رشوت چُھپا کے ہاتھ"...... کوئی کلرک ہوگا نہ ہوا وزیر پارٹی فنڈ کے نام پر بے دھڑک ہو کر لیتا۔

"عام لوگوں کے مقابلہ میں ڈاکٹروں میں خودکشی کی وارداتیں زیادہ"..... ایک خبر..... شمشان گھاٹ اور اور قبرستانوں کی آبادی بڑھانے کے بعد ڈاکٹروں کا پرائشچت۔

"تبت کا مستقبل شاندار ہے" دلائی لامہ...... جس میں آپ کے مستقبل کی جھلک پوشیدہ ہے۔

اُن کے یہاں طنز و مزاح کا ایک سے ایک بہتر نمونہ ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس قدر غور کریں گے اُتنا ہی زیادہ لُطف محسوس ہوگا۔ ان کی طنزیات کتنی ہی مضحکہ خیز اور قہقہہ انگیز کیوں نہ ہوں لیکن طرزِ بیان ہمیشہ سنجیدہ اور متین رہتا ہے۔ ان کا معیارِ طنز بہت اُونچا ہے۔ خوشتر صاحب کا کمال یہ ہے کہ اُن کے یہاں ابتذال نہیں ہوتا۔ تلخ سے تلخ اور کڑوے سے کڑوے طنز اور شوخ سے شوخ ظرافت میں بھی عریانیت چھو کر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں وہ سنجیدگی کے قائل ہیں، اگرچہ ان میں کافی شدّت اور بے باکی ہے۔ ان کی تمام گدگدیوں اور چٹکیوں میں جدّت اور ندرت ہوتی ہے۔

اگر خوشتر گرامی کے "تیر و نشتر" کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو صحیح طور پر ہمیں اُن کے طنز و ظرافت کی ادبی حیثیت کا احساس ہو سکتا ہے۔ رسالہ میں ہر ماہ اِن کا شائع ہونا ایک "صحافیانہ عادت" کہا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خوشتر کے طنز و ظرافت کی ایک زبردست ادبی قدر و قیمت بھی ہے۔

اثر فاروقی

جوگیندر پال سے۔ ایک ادبی بات چیت

اثر فاروقی: آداب عرض ہے پال صاحب۔
جوگیندر پال: آداب عرض ہے فاروقی صاحب۔
اثر فاروقی: آپ کے ہاتھ میں تھمی ہوئی پنسل بتا رہی ہے کہ آپ کوئی "ٹھوس" کام کر رہے تھے یا پھر "ادب" کا ؟
جوگیندر پال: جی ہاں! ذرا "ٹھوس" کام کر رہا تھا۔ کمبخت حکومت نے انکم ٹیکس کا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔ اس لئے حساب جوڑ رہا تھا۔
اثر فاروقی: آپ کا زیرِ تحریر ناولٹ جوگینا تا ہندوستان کے سفر پہ ہے کہاں تک پہنچا ؟
جوگیندر پال: چل رہا ہے، مزے لے لے کر لکھ رہا ہوں۔ اس لئے دیر ہو رہی ہے۔
اثر فاروقی: اچھا پال صاحب، میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ نہ تو میں روایتی انداز میں آپ کی عمر پوچھوں گا اور نہ ہی آپ کے لکھنے کا وقت وانداز۔ کیوں نہ ہم ٹھیٹھ انداز میں بات کریں ؟
جوگیندر پال: جی ہاں! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ انٹرویو کی شکل میں آدمی ذرا "بن" کر بات کرتا ہے۔ اس لئے راست گفتگو ہی ٹھیک رہے گی۔
اثر فاروقی: اچھا پال صاحب، یہ بتایئے نئی زمانہ ادبی رفتار کے تمام تر حسن و نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک فن کار کے لئے خواہ وہ ادیب ہو یا شاعر، تنقیدی شعور کی کیا اہمیت ہے ؟
جوگیندر پال: میری رائے اثر صاحب یہ ہے کہ ایک فن کار میں خود تنقیدی کا رچا ہوا شعور ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ جگہ جگہ اپنی ہی تخلیقات میں بھلے برے کی تمیز کر سکے۔ اور پھر نقادوں کی "جانبدارانہ" رایوں سے بھی بچ سکے۔ موجودہ ادبی رفتار کی دھارا میں یہ بات اور بھی ضروری ہے کیونکہ یہ واضح حقیقت ہے کہ کئی وجوہ کی بنا پر یہ نقاد حضرات بعض فن کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔
اثر فاروقی: پال صاحب۔ جب تنقید کی بات نکل ہے تو کیوں نہ ہم اس ضمن میں بھی بات کر کے "راہ بہ راہ" چلیں ؟
جوگیندر پال: مناسب خیال ہے۔
اثر فاروقی: نقادوں میں آپ نے سب سے زیادہ کس کی تحریروں کو قابلِ اعتنا سمجھا ہے۔
جوگیندر پال: فی الحال مجتبیٰ حسین بے طرح میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں مجھے سچائی و حق اور غیر جانبداری ہیرے کی کاٹ کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اُن کا انداز بہت ہی متوازی و مدلل ہوتا ہے۔
اثر فاروقی: اگر میں روایتی انداز سے ہٹ کر یہ پوچھوں کہ کن حضرات کو آپ نقاد نہیں سمجھتے۔
جوگیندر پال: میں اپنے ڈاکٹر صاحب عبادت بریلوی سے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ وہ نقاد تو ضرور ہیں لیکن شاید اکادمی یا درسی قسم کے نقاد۔
اثر فاروقی: کیا ایک ادیب میں تنقیدی شعور کے علاوہ سماجی شعور کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

جوگیندر پال :۔ بے حد ضروری ہے، بغیر اس کے ایک فن کار اپنی تخلیقات کو ماحول کا عکاس کس طرح بنا سکتا ہے ؟

اشرفاروقی :۔ ہمارے بعض ممتاز اور قدیم ترین لکھنے والے اپنے ساتھی لکھنے والوں کے سماجی شعور کے متعلق شاکی نظر آتے ہیں ؟ بات خلا نزاعی ہے اس لئے میں مثال کے طور پر کہوں کہ رام لعل صاحب کو قرۃ العین حیدر سے یہ شکایت ہے کہ ان میں سماجی شعور کی کمی ہے اور یہ کہ رضیہ فصیح احمد اُن سے "آگے ہیں"۔ اس سلسلے میں رام لعل نے ایک ماہنامہ میں ایک تفصیلی خط بھی لکھا ہے۔

جوگیندر پال :۔ فاروقی صاحب، قرۃ العین حیدر اور رضیہ فصیح احمد کا کسی بھی طرح کوئی تقابل نہیں۔ میں دونوں سے شخصی طور پر مل چکا ہوں۔ جس طرح قرۃ العین حیدر کی تحریریں تیز و تند اور تیکھی ہوتی ہیں، اسی طرح اُن کی شخصیت بھی متاثر کن ہے۔ رضیہ فصیح احمد اچھا لکھتی ہیں اور اُن کی تحریریں ہی کی طرح اُن کی شخصیت میں بھی سادگی و سچائی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ قرۃ العین میں رضیہ کی بہ نسبت سماجی شعور زیادہ ہے۔ وہ شاید ہمارے دور کے پیچیدہ مسائل کو بہتر سمجھتی ہیں۔

اشرفاروقی :۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ قرۃ العین کے پاس ابہام زیادہ ہے۔ جس کی عمدہ مثال "آگ کا دریا" ہے۔

جوگیندر پال :۔ میں ادب میں کسی قدر ابہام کا قائل ہوں۔ یہ بھی کیا ہوا کہ ساری بات ہی قاری پر واضح کر دی جائے۔ مگر ابہام کا حسن یہ ہوتا ہے ــ گویا کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہو اور کچھ کچھ گویا ذہن سے SLIP ہو رہا ہو۔

اشرفاروقی :۔ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ "آگ کا دریا" ایک عام قاری ہضم نہیں کر پاتا۔ جب کہ وہ پریم چند یا کرشن چندر کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

جوگیندر پال :۔ جی ہاں، جیسے کسی عام آدمی کا ذہن زندگی کی کئی عام فہم دلآویز SITUATIONS کو اپنا لیتا ہے لیکن کئی دیگر SITUATIONS اُس کا ذہنی تجربہ نہیں ہو پاتیں۔

اشرفاروقی :۔ کیا ادب کو اِس طرح خاص و عام کی اصطلاحات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر عوامی ادب کی تعریف کیا ہوگی؟

جوگیندر پال :۔ یہی تو مشکل ہے کہ ادب کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

اشرفاروقی :۔ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ آپ افسانہ نویسوں میں کسے زیادہ پسند کرتے ہیں، میں کرشن چندر کے متعلق پہلے دریافت کر لوں؟

جوگیندر پال :۔ بات کا انداز بڑا دلچسپ ہے۔ کرشن چندر فی الواقعی حساس اور ذہین فن کار ہیں۔ میں اُنھیں اُردو افسانے میں بہت بڑے مقام کا حامل سمجھتا ہوں۔ اُن کے لہجے کی رومانیت شاید "پڑھے لکھے" لوگوں کو کھٹکتی ہے۔ لیکن رومان بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے اور پھر یہی کیا کم ہے کہ اِن "پڑھے لکھے" چند لوگوں کو چھوڑ کر کئی دوسرے پڑھے لکھے لوگ کرشن چندر کو پڑھتے ہوئے جان بوجھ کر بے وقوف بن جانا چاہتے ہیں۔

اشرفاروقی :۔ انھیں پڑھ کر میں اکثر سوچتا ہوں کہ اُنھیں ایثار کی حد تک فن سے لگاؤ ہے۔

جوگیندر پال :۔ ہاں اصل واقعہ بھی یہی ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی زندگی کی ابتدائی ساعتوں ہی سے بہترین زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اور غالباً اُن کے پاس ایسا کرنے کے سبھی ذرائع موجود تھے لیکن یہ درویش اُردو افسانہ سے وابستہ ہو گیا۔

اشرفاروقی :۔ اچھا پال صاحب از خود آپ کسی افسانہ نویس کے متعلق بتائیں گے ؟

جوگیندر پال :۔ راجندر سنگھ بیدی کو میں صرف ایک ممتاز، مقبول اور عوامی ادیب ہی نہیں سمجھتا بلکہ وہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ بے حد شریف۔ یہ بھی شاید اُردو ادب کی واحد مثال ہے۔ میں اپنی حد تک اِن دونوں حضرات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔

اشرفاروقی :۔ چند اور افسانہ نگاروں کے متعلق پسندیدگی ؟ نام چھوٹ بھی تو سکتے ہیں۔ کسی کے ناراض ہونے کا کیا سوال ــ ؟

جوگیندر پال :۔ جی ہاں! علی عباس حسینی، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، خواجہ احمد عباس، رام لعل، سید خلیل احمد، اقبال متین، قاضی عبدالستار، قیصر تمکین، ستیش بترا، بلراج مینرا اور خواتین کی یہ آبرو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی اور ــــ

اثر فاروقی :۔ اچھا اب ـــ اور کیا ؟

جوگیندر پال :۔ یہی کہ ان کہانی کاروں کے ذکر میں کہیں آپ کی وہ کہانی "مسیحا" نہ بھول جاؤں۔ پچھلے "الشجاع" میں پڑھی تھی۔ مجھے آپ کا فکری انداز بہت پسند آیا۔

اثر فاروقی :۔ اچھا اب ایک اہم مسئلہ کی طرف آئیں۔ اور وہ ہے موجودہ حالات میں اُردو کا موقف ؟

جوگیندر پال :۔ میں نہ تو زیادہ پُر اُمید ہوں اور نہ زیادہ مایوس، پنڈت آنند نرائن مُلّا جیسی دو چار آوازیں اور اُٹھیں تو ہمارا مسئلہ حل ہو گا ہی۔

اثر فاروقی :۔ آپ کی پہلی کہانی اور اُس کی اشاعت ؟

جوگیندر پال :۔ اس سے کیا ہوگا ؟

اثر فاروقی :۔ کہانیوں کی تعداد ؟

جوگیندر پال :۔ تعداد سے بھی بات نہیں بنتی۔

اثر فاروقی :۔ اچھا پال صاحب۔

جوگیندر پال :۔ اچھا صاحب۔

جوش ملیح آبادی

ایک یاد اور صدہا پہلو

(۱)

قریبِ شام جب اک سوگواری دل پہ چھاتی ہے
سسکتے کنج کو اُلٹی ہوا نوحے سناتی ہے
شفق دھندلی فضا میں خون کے آنسو بہاتی ہے
بیابانِ گلستاں، بادِ خزاں کی رتھ جب آتی ہے
اور اُس کی رَو میں جب ہر ایک پتّی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲)

تھکے سے جھٹپٹے میں اونگھنے لگتے ہیں جب منظر
فضا کی سوگواری اوڑھ لیتی ہے سیہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک ذرا سا شہر سے ہٹ کر
کماں کی طرح بل کھائے ہوئے خوابیدہ ساحل پر
مرے دل کے سمندر میں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۳)

نظر آتا نہیں اک پھول بھی جس وقت دامن میں
کوئی تنہا پرندہ، شب کو بول اٹھتا ہے جب بن میں
سسکتی ہے زمردی سی چاندنی جب صحنِ گلشن میں
اور اک ویران عشرت گاہ کے خوابیدہ روزن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۴)

سُبک سازنگیاں جب گونجتی ہیں بزمِ یاراں میں
گھنی زلفوں کی مہکیں، تیرتی پھرتی ہیں ایواں میں
نگاہوں کے سفینے ڈوب جاتے ہیں جب افشاں میں
اور اس موقع پہ، مجھ آشفتہ قسمت کی رگِ جاں میں
مچلتی راگنی، جب آتشِ بن کر سنسناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۵)

انگیٹھی کے کنارے، جب بہ فیضِ جامِ زرافشاں
وہ راتیں بولتی ہیں، جو کبھی تھیں قلزمِ الحاں
پرانی داستانیں جب پہنتی ہیں نئے عنواں
اور اس موقع پہ گھبرا کر بیادِ وعدۂ جاناں
نظر جب ایک عاشق کی گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۶)

اُفق پر پھوٹتا ہے، صبح کا جس وقت فوّارا
تھرکتا ہے، سنہری وادیوں میں سرمئی دھارا
شلوکا دھوپ چھاؤں کا پہن لیتا ہے اندھیارا
نظر آتا ہے آدھے چاند کی آغوش میں تارا
اور اپنی سیج کو جب آرزو ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۷)

فلک کی رنگ باری سے، فضا کی مسکراہٹ سے
افق کی طرفہ انگڑائی سے، شبنم کی لگاوٹ سے
چمن کی خاک گل پرور کی ٹھنڈی گنگناہٹ سے
نسیمِ صبح کے تواج بوسوں کی چٹاچٹ سے
کلی میں جب چٹکنے کی تمنا گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۸)

ہوائے سرد چھوتی ہے لٹیں جب رشکِ ترکاں کی
جگر میں چٹکی لیتی ہے مہک انفاسِ خوباں کی
گلابی روشنی سے، آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی
اور اس کے ساتھ ہی پہلی کرن صبحِ بہاراں کی
جب اس اجڑے ہوئے سینے میں چھپ کر ٹوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۹)

پگھلتی ہے سرِ دوشِ صبا جب شکریں سردی
لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دلوں کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی
سسک جاتی ہے جب دوشِ فضا کی ملگجی وردی
نویلی صبح جب آہستہ سے کنگن گھماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۰)

طرب کا رنگ اڑا کر، جشن کی دھوموں کو مرجھا کر
ربابوں کو بجھا کر، راگ کے شعلوں کو جھلا کر
فضا کو کپکپا کر، چمپئی مکھڑوں کو سنولا کر
صبا کی نیمیاں کھا کھا کر آئینوں کو دھندلا کر
قریبِ صبح جب شمعِ شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۱)

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوشنواؤں پر
برستی ہے نکیلی کج کلاہی دل رباؤں پر
اترتی ہے مٹھاس آئینہ پیکر مہ لقاؤں پر
ندا سی راگنی، گھنگرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی بھیرویں مکھڑے سے جب گھونگٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۲)

مسلسل دو نگاہوں سے ایک ہو جاتے ہیں جب چل چل
ہزاروں ولولوں سے پھوٹتی ہے جب ہری کونپل
اڑا دیتی ہے دن سے کاگ جوشِ مے سے جب بوتل
پپوٹے کم سنوں کے نیند سے ہوتے ہیں جب بوجھل
پھنسی چولی میں ہولی جب نئی ہل چل مچاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۳)

بھری برسات میں جب ناچتے ہیں دھوم سے جگنو
محیطِ رنگ میں جب تیرتا ہے نشترِ "پی ہو"
ہوا پر جب مچلتی ہیں پھواریں دم بدم پہلو
کھنکتی بوندیوں میں، تیر برساتی ہے جب کو کو
رخِ جاناں میں ڈھل کر لوکے گل جب تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۴)

گرجتے گونجتے کمبخت ساون کے مہینے میں
لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شبِ غم کے دہکتے کھولتے ٹھنڈے سفینے میں
تمنائے سحر جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
حیات اپنی امیدوں کے جنازے جب اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۵)

اُچھلتا ڈوبتا ہے چاند جب ابرِ گریزاں میں
ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں شبنم کے شبستاں میں
کبھی پیچکا، کبھی لرزاں دھواں ہوتا ہے میداں میں
اور اک اندازِ نو سے ڈوب کر شوقِ فراواں میں
تھکی جمنا کو گنگا جب کلیجے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۶)

لرزتے ہیں در و دیوار پر یادوں کے جب سائے
نظر آتی ہیں جب گم کردہ گھڑیاں بال بکھرائے
جھلک اُٹھتے ہیں جب وہ چاند کب سے تھے جو گہنائے
ہوا آتی ہے جب بکھرے ہوئے لمحوں کو بہکائے
فضا جب گھپ اندھیرے میں بجھی باتیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۷)

نفس کی آمد و شد کو گھنی زلفوں میں اُلجھا کر
اُصولِ بے حسی و خوفِ رسوائی کو ٹھکرا کر
بھرے جلسوں میں رازِ عاشقی کا عود سلگا کر
کھنکتے ساز پر آواز کی پازیب جھنکا کر
جب اُس ناپختہ سن کی خام کاری گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۸)

مرا یہ چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا
متاعِ مہ وشاں تھا دولت محمل نشیناں تھا
کلیسائے نگاراں کعبۂ اصنامِ دوراں تھا
جو کل کی بات ہے بت خانۂ توہم حسیناں تھا
جب اس چہرے سے خود میری بچارن منہ چھپاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۱۹)

اُٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی ملاقاتیں
ملاقاتیں، دعائیں، شکریے، شکوے، مناجاتیں
بھرے چاندی کی تھالی میں دہکتی کنڈنی باتیں
مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
اور ان کی آب شبنم آگ دل میں جب لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۰)

جہاں میری تمناؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں
جہاں کل رت جگوں نے ساز پر راتیں بجائی تھیں
گھنی زلفوں کے سائے میں جہاں نیندیں جگائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پر تمتمیں مہریں لگائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ گلی آنکھیں جھکاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۱)

حیا سے کانپ کر، جھک کر، بہجوم شرمساری سے
کلائی میں ٹپک کنگن گھما کر بے قراری سے
ذرا سا لڑکھڑا کر اک ادائے بادہ خواری سے
دھنک کی سی حسین انگڑائی لے کر طرحداری سے
کوئی کم سن کسی کو دیکھ کر جب مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۲)

کوئی اٹھتی گلی میں رات کو کیا کیا جتن کرتی
جھجکتی، ڈولتی، تھمتی، ٹھہر جاتی قدم دھرتی
لرزتی، ہانپتی، رکتی، دبکتی، ہولتی، مرتی
سمٹتی، کانپتی، ڈرتی، جھجکتی، جھینپتی، ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آ کر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۳)

چمن کو غرقِ سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھونرا
تباہِ عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھونرا
خموشی کو لطیف آواز کر جاتا ہے جب بھونرا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھونرا

اور اُس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۴)

بجائے تاجداری سے تنگ آ کر بجنگ آ کر
سزاؤں، ذلتوں، پابندیوں، فاقوں سے گھبرا کر
بھڑکتے جذبۂ ناموسِ انسانی کی شہ پا کر
چھچھورے حاکموں کی نازبرداری سے اُکتا کر

غرورِ آسماں کو جب زمیں نیچا دکھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۵)

جہاں لیلےٰ کے عشوے سرنگوں رہتے ہیں محمل میں
گھٹی رہتی ہیں دکھیاروں کی فریادیں جہاں دل میں
جہاں جھنکار دم سادھے پڑی رہتی ہے پائل میں
جہاں سرگوشیاں تک جرم ہیں اس قصرِ باطل میں

گرجتے سورماؤں کی زباں جب اللاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۶)

چمک جاتا ہے جب مظلوم کے سینے کا انگارا
فضائے ظلم پر باقی نہیں رہتا کوئی تارا
مذاقِ سرفروشی کا اُبل پڑتا ہے فوّارا
مچلتا ہے شہیدوں کے لہو کا دُور تک دھارا!

اپنی تلوار مقتولوں کو جب دولہا بناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۷)

کڑکتی ہے کمانِ بے کساں جب فرقِ سلطاں پر
گرہ دُوں ہاتھ پڑتے ہیں حکومت کے گریباں پر
چھری مجبور کی چلتی ہے جابر کی رگِ جاں پر
سُلگتے جھونپڑوں کی آگ منڈلاتی ہے ایواں پر

گدا کے خون میں جب شہریاری ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۸)

اُبلتے ظلم کا پانی سَروں سے جب گذرتا ہے
جوانوں کے دلوں میں جذبۂ غیرت اُبھرتا ہے
سرِ میداں بپا اقدارِ انسانی جو مرتا ہے
بجائے غم پدر مرگِ پسر پر ناز کرتا ہے

بوجِ فخر ماں جب لاش بیٹے کی اُٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۲۹)

جہاں کج اہلِ وحشت کی جبیں پر تاج ہوتا ہے
جہاں شہرِ حقوقِ زندگی تاراج ہوتا ہے
جہاں ہر آن سُولی پر نیا علّاج ہوتا ہے
جہاں ننگے سروں پر روز لاٹھی چارج ہوتا ہے

وہاں بارود ایوانوں کو بھک سے جب اُڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

(۳۰)

جو مظلوموں کی ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑ دیتی ہے
جو عفریتِ حکومت کی کلائی موڑ دیتی ہے
جو شاہیں چشمِ فرعونوں کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے
جو قلعوں کو فقط ضربِ نظر سے توڑ دیتی ہے

کسی جاں باز میں جب وہ بغاوت گھڑگھڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

عنوان چشتی

تضاد

بجا کہ شہر میں جشنِ نشاط ہوتا ہے
یہ جام و بادہ و ساقی، یہ رقص و رنگِ بہار
یہ ساز و نغمہ و مُطرب، یہ سیم و زر کی پھوار
یہ جامِ چشم، حسیں ماہتاب چہروں کے
لبِ ہوس کے لئے ہیں گلاب چہروں کے
سیاہ دائرے ہیں ارتباط ہوتا ہے
بجا کہ شہر میں جشنِ نشاط ہوتا ہے

مگر، یہ شام کی ویرانیوں کے سائے میں
غموں کی دھوپ میں جھلسی ہوئی خوشی کی طرح
خود اپنے کاندھوں پہ اپنی ہی لاش اٹھائے ہوئے
رہِ حیات میں اِک فرضِ منصبی کی طرح
نگارِ صبح کو دینے لہو کا نذرانہ!
وفا پرست، طرح دار آدمی کی طرح
قدم قدم پہ سناتے ہوئے پیامِ سحر دوش
کسی پیمبرِ عرفان و آگہی کی طرح
جلا رہے ہیں دلوں کو بنامِ جذب و جنوں
چراغِ جاں کی طرح، مشعلِ خودی کی طرح
مری طرح ہی یہ دیوانے اجنبی تو نہیں
سفیرِ روشنیٔ ذہن و زندگی تو نہیں

سیّد احمد شمیم

خوابوں کا محل

جانے کب رات کا ٹوٹے گا یہ جادو اے دوست
جانے کب ہوگی سحر بخت سیہ کی اپنے
دامنِ صبر میں ایک تار نہیں ہے باقی
اب تو اُمید کا ہر رنگ محل ٹوٹ چکا
آج خوابوں کے گلستاں میں کوئی پھول نہیں

موسمِ گل کی تمنا کا یہ انجام حزیں
وقت کی بیتی ہوئی دھوپ اُسکے سائے!
میرے مونس، مرے غم خوار! بتادے اتنا
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے؟
میں کوئی طفلکِ معصوم نہیں ہوں کہ یونہی
چاند کو چھونے کی حسرت میں مچلتا ہی رہوں
چاند پھر چاند ہے، وہ ہاتھ نہیں آئے گا
میں بساؤں بھی جو خوابوں کا کوئی تاج محل
ایک ہی ضربِ حقیقت سے بکھر جائے گا

احمد رئیس

شاعر

مجھ کو آوارہ و وحشی نہ کہو
میں فقط عارض و لب ہی کا پرستار نہیں
میں فقط کاکلِ مشکیں میں گرفتار نہیں
میرے گیتوں میں نہیں صرف محبت ہی کا زہر
میرے نغموں میں غمِ دہر کا امرت بھی تو ہے!
میں نے تخلیق کئے
چاند، ستارے، افلاک
فرشِ گُل
موجِ صبا
شہرِ نوا
نکہت و نور
میں نے بخشا ہے زمانے کو نیا ایک شعور
میرے افکار سے تزئینِ بہاراں ہوگی
میرے اشعار سے اک صبحِ درخشاں ہوگی

شاعر بمبئی
حیدر علی شاہ

تیری آنکھیں

ہم زباں تیری ہے یہ ساری فضائے خاموش
سرد جھونکا بھی ہوا کا کوئی آتا ہے تو یوں
کوئی سنّاٹا، نہ آواز، نہ آہٹ کوئی
شاخ سے پھول بھی گرتا ہے تو یوں
جیسے آہستہ سے جھپکائی ہوں تو نے پلکیں
اور ہاں۔ دل بھی دھڑکتا تو ہے تیرا لیکن
جیسے مجرم ہو کوئی
سُن نہ لے کوئی کہیں دیکھ نہ لے
وہ ترے صحن کے رنگین گلاب
باڑھ مہندی کی جو اس صحن کے ہے تین طرف
ہے بسی جس میں ترے جسم کی خوشبوئے لطیف
ایسے خاموش ہیں جیسے کوئی خوشبو ہی نہ ہو
ایک احساس ہوا اور وہ بھی بہت مُبہم سا
سرسراہٹ نہیں ملبوس میں بھی
کُھلتے ہیں در مگر آہٹ بھی نہیں
نغمۂ شوق نہ سرگوشئ اقرارِ وفا
پھر بھی ہوں شاد کہ تیری آنکھیں ہیں دل کی غماز تو ہیں

صدیق تنہا

رَدِّ عمل

کتنے ہی احباب بچارے
پوچھتے رہتے ہیں یہ مجھ سے
تم نے بھی کیا پیار کیا ہے
سپنوں کو بیدار کیا ہے

"اُمیدوں پر زلفوں کے کیا سائے سے لہرائے ہیں
رخساروں کے رنگ سنہرے چنچل مَن کو بھائے ہیں
آنکھوں نے کیا خواب کے ساغر مستی سے چھلکائے ہیں!!"
ہونٹوں نے لمحات کے رنگیں آنچل بھی جھلکائے ہیں

"کیا فرقت کی دھوپ میں اکثر
یاس کے تپتے صحراؤں میں
بھٹکے ہو تم تنہا تنہا
یا پھر بزمِ تنہائی میں
اشکِ الم کی گہرائی میں
بیٹھے بیٹھے ڈوب گئے ہو!"

"کیا تم اس سنسار کی خاطر
توڑ کے آشاؤں کے بندھن
بے مقصد ہنستے رہتے ہو
من ہی من جلتے رہتے ہو!"

کتنی ہی بیباک نگاہیں
دُور تلک مجھ کو تکتی ہیں
لیکن میں اُن سب سے بچ کر
غمِ جہاں کی تاریکی میں
چھپ جاتا ہوں، کھو جاتا ہوں

ظفر غوری

اُمیّد

جب بھی دفتر سے لوٹتا ہوں میں
ذہن درماندہ، قلب افسردہ
ناتواں دل کے زخمی شانوں پر
ہر غمِ جاں، غمِ جہاں لے کر
گھر میں آتا ہوں
ناگہاں، اکثر
چونکتا ہوں سُبک سی آہٹ سے
ایک معصوم مسکراہٹ سے
شہد احساس میں پگھلتا ہے
دل کے ویران خارزاروں میں
باغِ جنت کے پھول کھلتے ہیں
شوخ، بے معنی تتلی باتوں سے
رُوح کے زنگ خوردہ تاروں سے
نغمۂ سرمدی اُبلتا ہے!!
میری کونین جھوم اٹھتی ہے!!!
نرم و نازک سا پھول سا پیکر
میری باہوں میں جھول جاتا ہے
اُس کے چہرے پہ، اُس کی آنکھوں میں
عہدِ نو کی سحر دمکتی ہے!!
اور میں ــ خوابوں میں کھو سا جاتا ہوں
چھٹ گئے کہرا، اندھیرے ہستی کے
دُور تک ہے فروغِ راہِ حیات
مسکراتی ہے منزلِ اُمیّد!
دیتی ہے آرزوئے نو کی نوید

شاعر ہیچ

واہی

افواہ نگار

شہر سے اپنے نکلتا ہے جو ڈیلی اخبار — اُسی اخبار کا ہوں سب سے اہم نامہ نگار
منفعت بخش یہ پیشہ ہے بہر طور ہوں خوش — کام ایسا کہ ذرا بھی نہ طبیعت پہ ہو بار
بینک بیلنس بھی ہے گھر بھی بنایا ہے نیا — ہے سواری کے لئے ایک نئی موٹر کار
"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے" — اس لئے اور بھی رہتا ہوں مسرت بہ کنار
سنسنی خیز خبر گڑھ کے رقم کرتا ہوں — وہ بھی گھر بیٹھے۔ کہ جس میں نہ ہو محنت درکار
میری تحریر پہ سر دھنتے ہیں پڑھنے والے — میرے اسلوب سے قائم ہے صحافت کا وقار
وہ کو کاہ بناتا ہے تو رائی کو پہاڑ — جب روانہ ہوتا ہے میرا قلم توسنِ رفتار
یاد ہے وہ بھی زمانہ کہ جب اس کوچے میں — میں نے رکھا تھا قدم پہلے پہل با دلِ زار
کہیں بلوہ کہیں اغوا کہیں جلسہ ہوتا — جا پہنچتا تھا وہاں دوڑ کے دیوانہ وار
بات جو ہوتی وہی چھان پھٹک کر لکھتا — کسی افواہ پہ میں کان نہ دھرتا زنہار
اس کے باوصف ہمیشہ یہ نتیجہ نکلا — کہ ایڈیٹر کو مرے نام سے چڑھتا تھا بخار
میری تحریر میں جس درجہ صداقت ہوتی — وہ اسی درجہ مجھے ڈانٹ پلاتا ہر بار
میرے مکتوب میں تحریف و اضافہ کر کے — پھر نئے سر سے کیا کرتا تھا مضموں تیار
ایک ہم پیشہ صحافی کا ہے احسان مگر — جس نے اک روز بتائے مجھے نکتے دو چار
دفعتاً میری صحافت کا مقدر جاگا — دفعتاً میرا قلم بن گیا چرچل کا سگار
اور اب تو ہے ایڈیٹر سے مرا یارانہ — میری تحریر میں پاتا ہے وہ اپنا معیار
اب تو جی کھول کے بے پر کی اڑاتا ہوں میں — اب تو معراجِ ترقی پہ ہے اس کا اخبار

مَن گھڑت بات بھی کیا قدر و اثر رکھتی ہے
"پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے"

کشمیر ترقی کی شاہراہ پر

جمہوریہ ہند کے ایک مکمل حصے کی حیثیت سے ریاست جموں و کشمیر (رقبہ ۸۶،۶۶۵ مربع میل۔ آبادی ۳۵،۶۰،۹۷۶) نے مختلف شعبوں میں آزادی کے چند سالوں میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے۔

۱۔ ابتدائی جماعتوں (KINDERGARTEN) سے یونیورسٹی معیار تک کی تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔ ریاست میں ۱۹۴۷ء۔ ۱۹۶۴ء کے دوران ہر قسم کے تعلیمی اداروں کی تعداد ۱۶۳۳ سے بڑھ کر ۶،۸۶۲ اور طالب علموں کی مجموعی تعداد ۱،۰۲،۵۰۰ سے بڑھ کر ۵،۱۴،۰۰۰ ہو گئی ہے۔

۲۔ ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے نومبر ۱۹۴۸ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آج یہاں ۱۴ مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیمی سہولت مہیا ہے۔

۳۔ چند حالیہ سالوں میں پیشہ ورانہ کالج اور ادارے جیسے ایک میڈیکل کالج۔ ایک انجینئرنگ کالج۔ دو زراعتی کالج، دو پالی ٹکنک اور سات زراعتی تربیتی ادارے قائم کئے گئے۔

۴۔ پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کو ۱۰٫۵۲ کروڑ روپے اور ۲۵٫۹۵ کروڑ روپے سے علی الترتیب مکمل کیا گیا۔ تیسرا پنج سالہ منصوبہ جس کے لئے ۷۵٫۱۴ کروڑ روپے منظور کئے گئے۔ ترقی پذیر ہے۔ پنجسالہ منصوبوں کے نتیجے میں ۳۳،۵۱۹ لوگوں کو مزید روزگار فراہم ہوا۔

۵۔ ریاست میں مالگذاری کی وصولیابی جو ۱۹۴۶-۴۷ء میں ۲۷۴٫۴۵ لاکھ روپے تھی اس سے بڑھ کر ۱۹۶۵ء-۱۹۶۶ء میں ۱۶۶۱٫۳۰ لاکھ روپے ہو گی۔

۶۔ گذشتہ چند سالوں میں ریاست کی برقی طاقت ۴۰۰۰ کلوواٹ سے بڑھ کر ۳۱۰۰۰ کلوواٹ تک پہنچ گئی ہے۔

۷۔ ۱۹۴۷ء میں صحتِ عامہ پر فی کس خرچ ۴۷ پیسے تھا جو ۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۵ء میں بڑھ کر فی کس ۵ روپے ۸۰ پیسے ہو گیا۔ عوام کے لئے مفت علاج کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

۸۔ ۱۹۵۵ء۔ ۱۹۵۶ء میں معیارِ زندگی کے حساب سے فی کس آمدنی ۲۰۰٫۴۱ روپے تھی جو ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۱ء کے درمیان ۲۵۲٫۱۰ روپے ہو گئی۔

۹۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۴ء کے درمیان پانچ ہزار سے زائد جوانوں کو پیشہ ورانہ تربیت کے لئے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔ جس پر ۲۷،۰۸،۹۶،۰۰۰ روپے خرچ ہوئے۔

۱۰۔ عمر کا اوسط ۳۲ سال سے بڑھ کر ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۶۱ء کے درمیان ۴۷ سال ہو گیا۔

جاری کردہ

محکمۂ اطلاعاتِ عامہ۔ حکومت جموں و کشمیر

رام لعل

ہمدردی

ایک غنڈا ہمارے پیچھے بنارس اسٹیشن پر اُترتے ہی لگ گیا تھا۔ میری بیوی، میرے مرحوم دوست ہندر کی نوجوان بیوہ اور میں، اسٹیشن کی عمارت سے باہر آئے تو وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے آتا دکھائی دیا۔ جب ہم تانگے میں بیٹھ کر شہر چل دیئے تو اُس نے بھی ایک رکشا میں بیٹھ کر ہمارا پیچھا کیا۔ جب ہم گنگا جی کے گھاٹ کے قریب ایک ہوٹل میں جانے کے لئے تانگے سے اُترے تو وہ بھی ذرا فاصلے پر رکشا رکوا کر اُتر پڑا۔ سارے راستے میں وہ رشمی ہی کو گہری نظر سے گھورتا اور اشارے کرتا آیا تھا۔ شکل وشباہت اور لباس وغیرہ کے ڈھنگ سے وہ بیس بائیس برس کا کوئی طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کسی قدر غصے سے اُس کی طرف دیکھا کہ وہ ٹل جائے۔ پہلے تو اُس نے مجھے نظرانداز کر کے رشمی کو گھورنا جاری رکھا لیکن پھر سر جھکا کر ایک طرف چل دیا اور میں کچھ مطمئن سا ہو کر عورتوں اور اسباب کے پیچھے ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

رشمی پچھلے ایک مہینے سے سخت غم زدہ تھی۔ ہندر ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اُن کی شادی کو صرف دو سال ہی ہوئے تھے۔ خاوند کی موت کے بعد اُس کی آنکھیں ایک بار بھی خشک نہیں ہوئی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ ہندر کا ذکر آتے ہی وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے بیٹھ جاتی۔ اُس کی وجہ سے ہم لوگ بھی دُکھی ہو جاتے تھے۔ دل ودماغ کی ایسی کیفیت میں کوئی غنڈا پریشان کرنے پر اُتر آئے تو ہماری تکلیف کتنی بڑھ جاتی تھی!

ہوٹل میں پہنچ کر میرا جی چاہا کر تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں۔ میں گزشتہ ایک ہفتے سے اِن عورتوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتا پھرا۔ میرے عزیز دوست کی دہلی اور بمبئی کے درمیان جس ہوائی جہاز کے حادثے میں موت واقع ہوئی تھی، رشمی اُس کو اور اُس جگہ کو جہاں پر جہاز گرا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی،

یہ اُس کا جذباتی ردِّ عمل تھا۔ ہم اُسے راجستھان میں الور سے ساٹھ میل دُور مرتضےٰ پور نامی گاؤں میں لے گئے تھے۔ وہاں کا سفر بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ آدھا راستہ بس سے طے کیا تھا۔ باقی ٹرک، بیل گاڑی سے اور پیدل چل کر۔ وہاں سے جہاز کا ملبہ ہٹایا جا چکا تھا۔ لیکن جلی ہوئی لاشوں اور چیزوں کے نشانات ابھی تک موجود تھے۔ کسی کا زمین میں دھنسا ہوا سموکنگ پائپ، دھوپ کے چشمے کا ایک گرد آلود شیشہ، کچھ بکھرے ہوئے اخبار اور میگزین اور جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئی ایک بچے کی ٹوپی۔ رشمی اپنے خاوند کی آخری وقت کی بے بسی کا تصور کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ہم خود بھی آبدیدہ ہو اُٹھے تھے۔ میری بیوی اور میں اُسے دلاسہ دینے کی کوشش میں خود بھی رو اُٹھتے تھے۔ ہندر الیکٹرانکس کی ہائر اسٹڈیز کے لئے ایک سال کے لئے ہالینڈ جا رہا تھا۔ جاتے وقت وہ رشمی سے کہہ گیا تھا، وہ اُسے بھی وہاں جلدی بُلا لے گا، جب اُس کے لئے وہاں کوئی جاب ڈھونڈ لے گا! رشمی اب رو رو کر خاوند کو پکارنے لگتی تھی ـــ اب بُلا کیوں نہیں لیتے مجھے؟ جاتی بار کونسا وعدہ کیا تھا مجھ سے!'

جسمیں اور نوجوان عورت کو ایسی رقت انگیز کیفیت میں دیکھنا اور سنبھالنا بڑی ہمت کا کام تھا۔ وہاں سے ہم تھک ہار کر لوٹ گئے

تھے، جہاں ٹوٹے ہوئے جہاز کا ملبہ لے جایا جا چکا تھا۔ ایئر فورس کے ہینگر میں بے شمار ٹوٹے ہوئے، کچلے ہوئے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرے ہوئے ہوائی جہاز رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر انسانی پنجروں کی طرف بھی خیال جاتا تھا، جو کبھی کبھی ایسی حالت میں پڑے رہ جاتے ہیں۔ وہاں بڑی جانکاہ خاموشی تھی۔ رشمی ہمارے آگے آگے اُن ڈھانچوں کے درمیان ایک عجیب سی پژمردہ کیفیت لئے ڈھیر سے ڈھیرے گھومتی رہی تھی۔ دراصل وہ ابھی تک المونیم کے ٹکڑوں میں اپنے مرحوم خاوند کا لمس ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ یہ ٹکڑے کبھی ایک مکمل، زندہ اور آرام دہ جہاز کی شکل تھے۔ چندر اُس میں کسی ایک سیٹ پر آنکھیں موند کر لیٹا لیٹا اُسے یاد کرتے ہوئے مر گیا تھا۔

ہم لوگ اُسی دن شام کو دہلی لوٹ آتے لیکن پلیٹ فارم پر الہ آباد جانے والی ایک گاڑی دیکھ کر رشمی نے پریاگ جانے کی خواہش ظاہر کردی۔ ہم اُسی گاڑی سے الہ آباد چل دیئے تھے۔ الہ آباد پہنچ کر اُس نے بنارس جانے کے لئے کہا تو ہم اُسے بنارس لے گئے تھے ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح اُس کا جی بہل جائے۔ اُس کا دُکھ کم ہو جائے۔ نہیں تو وہ اپنی صحت کھو بیٹھے گی۔

سخت تکان کی وجہ سے مجھے جلد ہی نیند آگئی۔ لیکن اچانک اپنے کندھے پر کچھ دباؤ محسوس کر کے جاگ پڑا۔ میری بیوی مجھے اشنان کے لئے گھاٹ پر چلنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ رشمی اور وہ اپنے اپنے کپڑوں کی ایک ایک پوٹلی بازوؤں میں لئے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ابھی چلیں؟ ابھی!"

"ابھی نہیں تو کیا دوپہر میں چلیئے گا۔؟"

اُس وقت صبح کے دس بج چکے تھے۔ میں جھٹ پٹ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اگرچہ بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ تھکن کے آثار تو ان عورتوں کے چہرے پر بھی نمایاں تھے۔ دونوں ہی مُرجھائی ہوئی اور زرد ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ انہیں بھی چند گھنٹوں کے لئے فوری آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ گھاٹ سے لوٹ کر آرام کریں گے۔ میں انھیں ساتھ لئے ہوئے باہر آگیا۔

گھاٹ پر بڑی رونق تھی۔ لوگ — عورتیں مرد اشنان کر رہے تھے۔ ماتھے پر تلک لگا رہے تھے۔ آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں کچھ پڑھتے ہوئے سورج کو پانی دے رہے تھے۔ پوجا پاٹھ کرانے والی بھجن منڈلیاں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اپنے بھجن دُور دُور تک پہنچا رہی تھیں۔ نہا دھو کر اور پوجا کر کے رشمی نے لولے، لنگڑے، اندھے اور کوڑھی فقیروں میں بہت سارے پیسے بانٹے۔ اس کے بعد ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر ایک میل کے نیم دائرے میں بنے ہوئے گھاٹوں اور مندروں کے درشن کرنے نکل گئے۔ کشتی کا ملاح ایک اچھا خاصا گائیڈ بھی تھا۔ وہ ہر ایک گھاٹ کا نام، اُس کی تاریخ اور اہمیت بھی ہمیں بتاتا جا رہا تھا۔ اُس کی باتیں سُن سُن کر دونوں عورتیں اپنے بھیگے ہوئے بال کمر پر پھیلائے بڑی عقیدت سے ہر ایک مندر اور گھاٹ کے سامنے سر جھکا دیتی تھیں۔ اس سارے سفر میں پہلی مرتبہ رشمی کے چہرے پر غم کی کیفیت ہلکی ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ جیسے اب وہ بھگوان کے فیصلے پر دل ہی دل میں مطمئن ہو گئی ہو! اس سے مجھے بھی کافی اطمینان ملا۔

ملاح نے ہمیں پھر اُسی جگہ پر لا اُتارا، جہاں سے ہمیں سوار کیا تھا لیکن گھاٹ پر اُترتے ہی وہ آدمی پھر دکھائی دے گیا۔ پتھر کی ایک چوڑی سِل پر بیٹھا بڑے اطمینان سے سیگرٹ پی رہا تھا۔ لیکن رشمی پر بھی نظر جمائے ہوئے تھا۔

میں اُسے نظر انداز کر کے عورتوں کو ساتھ لے کر بنارس کے مشہور مندر دیکھنے چل دیا۔ ہم لوگ جہاں جہاں گئے وہ بھی پیچھے پیچھے ہی رہا۔ کہیں نہ کہیں بھیڑ میں یا کسی موڑ پر اُس کا چہرہ دکھائی دے جاتا لیکن اب میں اُسے مکمل طور پر نظر انداز کئے ہوئے تھا۔ جو آدمی اس قدر ڈھیٹ اور بے شرم ہو اسے نظر انداز ہی کر دینا اچھا ہے۔ لیکن اُس کے پیچھے پیچھے آنے سے عورتیں بھی باخبر ہو چکی تھیں۔ بار بار گھبرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگتی تھیں۔

اُنہی کے اصرار پر ہم لوگ اُسی شام کو بنارس سے چل پڑے — حالانکہ ایک روز اور وہاں ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔

شام کو دہلی جانے والی گاڑی میں جب ہم سوار ہوئے تو اُس آدمی کو پھر وہاں موجود پایا۔ ہمارے ڈبے کے سامنے سے بار بار گزرتا تھا اور رشمی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا تھا۔ میں نے اُسے سخت غصے سے گھور کر دیکھا۔ لیکن اُس نے میری کوئی پروا نہیں کی۔ رشمی پلیٹ فارم کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی اُس گُنڈے کی حرکتوں کا ایک تاثر تھا۔ کسی قدر خفت کا جیسے ہو کہ

بھی یقیناً شامل تھا۔

جب گاڑی چلی تو وہ لپک کر ہمارے ڈبے میں آگیا۔ اُس ڈبے میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اب میں اُسے اپنے ساتھ سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میں نفرت، غصہ اور خوف سے کانپ اُٹھا لیکن وہ بڑے اطمینان سے ہونٹوں میں سگرٹ دبائے کھلے دروازے کے بیچ ہینڈل پکڑے ہوئے باہر دیکھ رہا تھا۔

دونوں عورتوں کے چہرے پر اب خوف و ہراس کی واضح لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر ذرا آگے نکلی تو اُس نے سر گھما کر رشمی کو پھر گھورا تو میں خود پر مزید قابو نہ پاسکا۔ بجلی کی سرعت سے آگے بڑھ کر اپنی پوری قوت سے اُس کی پیٹھ پر ایک لات جما دی اور اُسے کئی اُلٹی سیدھی گالیاں بھی دے ڈالیں۔

وہ یہ لات کھا کر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فوراً ہی نیچے جا گرا۔ عورتیں گھبرا کر چیخ اُٹھیں لیکن میں نے انھیں سختی سے خاموش رہنے کے لئے کہہ دیا۔ اپنی جگہ پر واپس آکر بھی اُس کے خلاف بکتا جھکتا رہا۔

اُسی وقت گاڑی کی زنجیر کھینچ لی گئی۔ کچھ لوگوں نے اُسے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مجھے پہلی بار خطرے کا احساس ہوا ــــ کہیں وہ مر کر کٹ نہ گیا ہو۔

میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا وہ زخمی حالت میں ایک طرف پڑا ہوا تھا لیکن کٹا نہیں تھا۔ بہت سے لوگ گاڑی سے اُتر اُتر کر اُس کے پاس جا رہے تھے۔ آخری ڈبے میں سے گارڈ بھی اُتر کر چلا آرہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے سمجھ لیا اب پریشانی اور بڑھ جائے گی۔ عورتیں بڑی سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور اُس کے بعد وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اُس نے سب سے کہہ دیا کہ میں نے ہی اُسے چلتی گاڑی سے گرایا ہے۔!

گارڈ نے میرے پاس آکر گرانے کا سبب پوچھا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ "جی نہیں، میرا کیا مطلب اِسے گرا دینے سے! جی نہیں میں اِسے پہچانتا تک نہیں ہوں! آخر اِس نے میرا کیا بگاڑا تھا، جو اِسے دھکا دیتا!"

میں نے محسوس کیا جھوٹ بولنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ میں نے عورتوں سے بھی انجان بنے رہنے کے لئے کہہ دیا اور گاڑی سے اُتر کر بڑی بے خوفی سے گارڈ کے پاس اُس آدمی کے پاس گیا۔ اُس سے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کیوں بے! تم میرے ڈبے میں آئے ہی کب تھے؟ جھوٹ کیوں بولتے ہو؟"

اس کا بازو لہولہان ہو چکا تھا۔ زمین پر پڑے پڑے سخت تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے میری طرف شکائتی نظروں سے دیکھا اور کہا ــ "بے شک تم ہی نے مجھے گرایا! جھوٹ تم بول رہے ہو۔ تم نے مجھے گالی بھی دی۔!"

سب لوگ مجھے اور اُسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ سب کی نظروں میں میرے لئے سخت نفرت اور غصّے کا اظہار تھا۔ میرا ساتھ دینے والا وہاں ایک چہرہ بھی نہیں تھا۔ لیکن میں اپنی کہی ہوئی بات پر اَڑا رہا۔ "میں نے اِسے ہرگز نہیں گرایا ہے۔ اِس نے میرا کیا بگاڑا تھا۔"

اُسی وقت ہجوم میں سے مجھے ایک عورت سرک کر سامنے آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ رشمی تھی۔ اُس نے آتے ہی پہلے مجھے تیز، نفرت اور غصّے بھری نظر سے دیکھا پھر اس آدمی کے پاس بیٹھ کر اُس کے زخمی کندھے کو چھو کر بولی۔

"اُف! یہ تو اُتر گیا ہے! ہائے! اب کیا ہو گا؟؟"

عوض سعید

زخمی دریچے

سردیوں کا زمانہ تھا اور سردی کی تیز چبھتی ہوئی ہوائیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ صبح کے آٹھ بجے جب اچانک ہلکی سی دھوپ دریچوں سے جھانکنے لگی تو شوکت کو احساس ہوا کہ وہ آج ضرورت سے زیادہ سو گیا ہے۔ اُس نے لحاف منہ پر سے ہٹا کر دیکھا دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی بدستور دس بجا رہی تھی۔ اُسے اچانک خیال آیا یہ گھڑی تو مدتوں سے بند پڑی ہے۔ اُسے بیسیوں گھڑی ریپیر کرانے کے منصوبے باندھتے گزر گئے؛ لیکن بات آجکل پر ٹلتی رہی اور وہ گھڑی درست نہ کرا سکا۔ پھر دفعتاً اس کا خیال ابا میاں کی طرف گیا جو کمرے میں پڑے بے طرح کھانس رہے تھے۔ اُن کی کھانسی کے بھیانک نشتر اُس کے دل میں کسی تیز چاقو کی طرح آہستہ آہستہ اُتر رہے تھے۔ خدا نہ کرے اگر وہ ایک دن چپکے سے چلے جائیں تو اِس گھر کا کیا ہوگا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ذرا سکون ملتے ہی باقاعدگی سے اُن کا علاج کرائے گا۔ "بھائی جان ذرا باہر سے لکڑیاں تو لا دیجئے۔ ادھر چلے کوئلوں پر تو ناشتہ پکنے سے رہا۔" مہر نے شوکت کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔

"کیا مہینے سے پہلے ہی لکڑیاں ختم ہو گئیں۔ ابھی تو مہینے کے آٹھ دن پڑے ہیں۔"

"آپ جو روز گرم پانی سے غسل فرماتے ہیں، یہ اُسی کی برکات ہیں۔"

مہر کے اس جواب نے جیسے اُس کا منہ بند کر کے رکھ دیا۔ اُس نے اُٹھ کر کوٹ کی جیب میں سے اٹھنی نکالی اور مہر کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ کیا بات ہوئی کیا لکڑیاں بھی مجھے باہر جا کر لانا ہوں گی۔"

"تو اس میں کیا حرج ہے کوئی تمہیں کھا تو نہیں لے گا گھر کے سامنے ہی تو ٹال ہے۔"

"اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ ہم باہر جا نہیں سکتے۔ ابا میاں نے پرسوں ہی کہا تھا کہ اب تو ۱۴ برس کی ہو گئی ہے مجھے پردہ کرنا چاہیے اور باہر جانا ہی ہو تو شوکت کے ہمراہ جانا۔ تنہا کبھی نہ جانا۔" سُنا آپ نے۔

شوکت ایک لمحہ کے لئے سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اُس کے سامنے مہر کھڑی تھی۔ اُس کے رُخساروں میں سُرخیاں جھلک رہی تھیں اور قد بھی کچھ اونچا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات اِس سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اور آج جب مہر نے اپنے بڑے ہونے کی بات مُنہ سے کہی تو اُسے احساس ہوا کہ وہ ذمّہ داریوں کے بوجھ تلے دب سا گیا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہیں بھائی جان؟"

"تیری شادی کی بات۔"

شاعر مبشر

"وہ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ چلئے لکڑیاں لے آیئے۔ دیکھئے ابا میاں کی آواز آرہی ہے۔"

شوکت بادلِ ناخواستہ بستر سے اُٹھا اور جب وہ لکڑیوں کا گٹھا تھامے گھر میں داخل ہوا تو مہر دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"مسکرا کیا رہی ہو سنبھالو یہ لکڑیاں" یہ کہہ کر شوکت نے لکڑیوں کے گٹھے کو زمین پر آہستہ سے رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد مہر ناشتے کی کشتی تھامے اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو اسے حیرت سی ہوئی کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے ہی میں اپنا ناشتہ تیار کر لیا تھا۔ جب شوکت نے اس کی تعریف کی تو مہر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "ادھ بھائی جان" پراٹھے اور آملیٹ تیار کرنا بھی کوئی کام ہے؟"

شوکت نے سوچا کاش وہ مہر کو آگے تعلیم دلوا سکتا۔ محدود آمدنی نے گھر کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ بی اے پاس کرنے تک اس نے بہت کچھ پاپڑ بیلے تھے اور وہ ابھی تک بیکار ہی تھا۔

ٹیوشن سے کچھ آمدنی ضرور ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن وہ آمدنی ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی بہن اور بیمار باپ کے ساتھ خوشگوار زندگی گذار سکے۔

کبھی کبھی وہ گھنٹوں سوچا کرتا۔ وہ گریجویٹ بھی ہے اور سمجھدار بھی۔ پھر کیا بات ہے جو وہ ہر انٹرویو میں ناکام رہتا ہے۔ کہیں اُس میں خود کوئی ایسی خامی تو نہیں ہو اُسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ ایک ایسا جوہر ہے جو منوں مٹی کے نیچے دبا پڑا ہے۔ کوئی جوہر شناس نگاہیں ہی اُسے پاتال سے آکاش تک لے جا سکتی ہیں۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک ڈاکیہ نے اسے ایک خط دیا۔ یہ ایک بڑی تجارتی فرم کی جانب سے بھیجا ہوا اس کے تقرر کا آرڈر تھا۔ اُسے نوکری مل چکی تھی ڈھائی سو روپے ماہوار کی وہ خوشی سے پاگل سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے ابا میاں کے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہاں مہر دوا کی شیشی لئے کھڑی تھی۔ جب شوکت نے نوکری کے ملنے کی خوشخبری سنائی تو ابا میاں کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

جب خوشی حد سے سوا ہو جاتی ہے تو شاید آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ یا جب مایوسی کی کوکھ سے اُمید جنم لیتی ہے۔ تو آدمی باؤلا سا ہو جاتا ہے۔ کچھ یہی کیفیت ابا میاں کی تھی اور ساتھ ساتھ مہر کی بھی۔

"مہر ذرا پینٹ شرٹ تو پریس کر دینا۔ کل مجھے اپنی محبوبہ کے ہاں جانا ہے۔"

شوکت نے ابا میاں کے کمرے سے نکلتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"محبوبہ کے پاس یا آفس۔"

"نوکری میرے لئے محبوبہ سے کیا کچھ کم ہے۔"

"یہ شاعری چھوڑئے کہیں ہمارا بیڑہ غرق نہ ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی پینٹ اور شرٹ تھامے کمرے کی جانب چلی گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد شوکت نے بھی باہر کی راہ لی۔

جب وہ بڑے بازار سے گزرا تو کپڑوں کی بے شمار دوکانوں کو دیکھ کر اُسے بے طرح احساس ہوا کہ اس نے ایک عرصے سے نئے کپڑے نہیں سلوائے ہیں۔ لیکن اب وہ رفتہ رفتہ نئے کپڑے سلوائے گا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ ایک ابرو سے ٹکرا گیا دو غصیلی نگاہیں دیر تک اُسے گھورتی رہیں۔ اور وہ معذرت چاہتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

شام جب وہ گھر لوٹا تو اُس نے دیکھا۔ اُس کا پینٹ اور شرٹ ہینگر پر سلیقے سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ قہر کو اس کا کتنا خیال ہے۔

دوسرے دن جب آفس جاکر اس نے ڈیوٹی ریزیوم د (RESUME) کی تو اسے احساس ہوا جیسے اُس نے نیا جنم لیا ہو۔ چند ہی دنوں میں اُس نے کام سے واقفیت حاصل کرلی اور رفتہ رفتہ وہ دلاور بیگ کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ جو امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم کے کرتا دھرتا تھے۔ گو وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ لیکن طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے وہ بھاگتی ہوئی جوانی کو مشکل سے تھامے کھڑے ہوں۔

ایک دن وہ کام ختم کرکے گھر لوٹنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کہ دلاور بیگ اس کے کمرے میں داخل ہوئے شوکت تعظیماً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

" انھوں نے بڑی شفقت سے بیٹھو بیٹھو اس طرح کہا جیسے وہ فرم کے منیجر نہ ہوں اُس کے اپنے ابا میاں ہوں۔

" بڑے محنتی ہو صاحبزادے۔ تمہیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ "

" جی یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ " شوکت نے مودّبانہ انداز میں کہا۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

دن تیزی سے گذرنے لگے اور جب پہلی تنخواہ کا دن آیا تو اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ دو سو پچاس روپئے کرارے نوٹوں کا اُس نے بار بار جائزہ لیا۔ اور کوٹ کی جیب میں احتیاط سے رکھ کر گھر کی جانب چل پڑا۔

جب اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو قہر نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ " صبح سے ابا میاں کی طبیعت بے حد خراب ہے انھیں دل کے دورے پڑ رہے ہیں۔ " اور شوکت کو یوں لگا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل جا رہی ہو۔ وہ گھبرایا ہوا نکڑ والے سندھی ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے تک شوکت کے ابا میاں کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

شوکت کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اور قہر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جب دلاور بیگ کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بھی دوڑے دوڑے شوکت کے گھر آئے۔ اُسے پیار سے گلے لگاکر دلاسہ دیا۔

شام کو جب جنازہ اٹھایا گیا تو اس وقت بھی دلاور بیگ جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گئے۔ جب وہ منوں مٹی کے ڈھیر تلے اپنے ابا میاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تو اس وقت بھی دلاور بیگ اس کے ساتھ ہی تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شوکت کے قریبی عزیز ہوں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے قہر کے دل سے غم کے بادل آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔ قہر کی اس تبدیلی نے جیسے شوکت کی ساری پریشانیاں دور کردیں۔

کبھی کبھار دلاور بیگ بھی شام کو شوکت کے گھر کسی نہ کسی بہانے ضرور آجاتے۔ اور اس دوران جب وہ اُن کے لئے چائے لے کر آتا تو وہ چسکیاں بھرتے ہوئے چائے کی خوب خوب تعریف کرتے۔

" دیکھو کتنی لذیذ چائے ہے۔ بھئی واہ۔ ہمیں گھر میں ایسی چائے کہاں نصیب ہوتی ہے۔ "

" یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ " وہ جیسے ہی قہر کی طرف سے انکساری برتتا اور دلاور بیگ مسکرا کر رہ جاتے۔

پھر ایک دن انھوں نے شوکت کو گھر پر چائے کی دعوت دی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اس موضوع پر آگئے جس کے لئے شاید انھوں نے شوکت کو بلوایا تھا۔

" شوکت! قہر اب بڑی ہوگئی ہے۔ تم اُس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ خوبصورت بھی ہے اور سگھڑ بھی۔

جوان لڑکیوں کو اس طرح گھر نہیں بٹھا کر رکھنا چاہیئے ۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ دلاور صاحب کی بات کا کیا جواب دے ۔ اُسے ملازم ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جن کی ساری زندگی روپیہ جمع کرنے کے منصوبے بنانے ہی میں گزر جاتی ہے لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھوں میں خالی پرس ہوتے ہیں ۔

وہ سوچنے لگا ۔ اس طرح قمر کی شادی کب ہوگی ۔ زیور، فرنیچر، کپڑے آخر وہ کب خرید سکے گا ۔

وہ چپ چاپ دلاور بیگ کے گھر سے لوٹ آیا ۔

دوسرے دن جب وہ آفس آیا تو اس کا دل بجھا بجھا سا تھا ۔ اس کے کمرے کے بالکل مقابل رام داس اکاؤنٹنٹ کا کمرہ تھا ۔ جو ہمیشہ اپنے ماتحت کلرکوں کے ساتھ جھک جھک کرنے کا عادی تھا ۔ جب گھڑی نے شام کے پانچ بجائے تو شوکت کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ ابھی اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے رام داس کی آواز ٹکرائی ۔ "یار یہ اپنا باس پھر ایک بار شادی رچانے کی فکر میں ہے ، جانتے ہو وہ لونڈیا کون ہے ؟ شوکت کی بہن ۔۔۔"

شوکت کو یوں لگا جیسے سر بازار کسی نے اُس کی بے عزتی کر دی ہو ۔ وہ من من بھر وزنی پاؤں اٹھاتا ہوا ۔ گھر کی طرف چل دیا ۔

"قمر تو اب بڑی ہوگئی ہے ۔ تم اُس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے ۔"

دلاور بیگ کے الفاظ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہے تھے ۔ اس کا دماغ غم اور غصے کے مارے پھٹا جا رہا تھا ۔

پھر ایک دن دلاور بیگ نے شوکت کے گھر آکر آفس کے مینجمنٹ کے تعلق سے بہت سی باتیں کیں ۔ تھوڑی دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد انھوں نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا ۔

"کیا شوکت چائے نہیں پلاؤ گے ۔ مجھے تمہارے گھر کی چائے بے حد پسند ہے ۔"

"ابھی آجائے گی اطمینان رکھیئے ۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا ۔ جب وہ چائے کی ٹرے تھامے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو دلاور بیگ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ انھوں نے شوکت کی آہٹ پر چونک کر چائے کی پیالی تھامی اور آہستہ آہستہ چائے پینے لگے ۔

" آج آپ بہت زیادہ فکرمند معلوم ہوتے ہیں ۔" شوکت نے چائے کا ایک گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے کہا ۔

"ہاں شوکت ، میں کئی دن سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا ۔ مگر کہہ نہ سکا ۔ تم تو مجھے جانتے ہی ہو نا ۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔ جائیداد ۔ دولت ، عزت ، شہرت ، نوکر چاکر ۔ اس کے باوجود چند دنوں سے میں بڑا مغموم ہوں ۔ تم چاہو تو میرا غم دور کر سکتے ہو ۔ میرا مطلب ہے کہ قمر کو میں اپنی شریکِ زندگی بنانا چاہتا ہوں ۔ جب سے میں نے اُسے دیکھا ہے .... ابھی وہ جملہ پورا کر بھی نہ پائے تھے کہ شوکت نے بھوکے شیر کی مانند گرجتے ہوئے کہا ۔

" آگے کچھ نہ کہیئے دلاور صاحب ۔ اگر آپ اس وقت میرے گھر مہمان نہ ہوتے تو میں نے آپ کو گردن دبا کر باہر نکال دیا ہوتا ۔ کیا آپ دولت کے بل بوتے پر قمر کو خریدنا چاہتے ہیں ۔ مجھے آپ کی نوکری نہیں چاہیئے ۔ کان کھول کر سن لیجئے ۔ اب آپ جا سکتے ہیں ۔"

دلاور بیگ کے مُنھ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ اُنھیں اپنی شکست کا بے طرح احساس تھا ۔ وہ جھینپتے ہوئے ندامت سے چپکے چپکے سے باہر چلے گئے ۔

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر دیکھئے)

رضاء الجبار

مٹی کا کھلونا

چھوٹے بابو کی شادی ہونیوالی ہے
چھوٹے بابو کی شادی ہونیوالی ہے
جیسے کاغذ کے چرمُر سے یہی آواز نکل رہی ہو۔ فائلوں کی اُٹھا پٹک میں یہی آواز چھپی ہو اور الماری کے پٹ چیں چیں کرتے ہوئے یہی صدا کہہ رہے ہوں۔ دیال کو اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ مالک کے گھر میں یہ پہلی شادی ہے۔ مالک کے لڑکے کی شادی مالک کی خوشی ہے۔ اس لئے وہ مالک کے دفتر کے کلرکوں کی بھی خوشی ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سب ہنس بول کر شریک ہوتے ہیں۔ تحفے تحائف اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دیتے ہیں۔ تحفہ نہ دیں تو ناک کٹ جائے گی۔ دیال نے میز کی سطح پر بچھے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ جھریاں پڑے چہرے پر بڑی سی ناک نمایاں تھی۔ اس نے درد و کرب کے ساتھ سوچا کر کوئی تحفہ ضرور دینا پڑے گا۔ تحفہ نہیں تو سلامی کے لئے کچھ رقم دولہا کے ہاتھ میں رکھنا ہی پڑے گی۔ خوشی کی خبر بھی کبھی کبھی اُداس بنا دیتی ہے۔ ایسی اداسی جس کا اظہار بھی مشکل ہوتا ہے، جسے چھپانا پڑتا ہے۔

دیال نے بھی اس اداسی کو چھپایا اور ایک کاغذ دینے مالک کے کمرے میں گیا تو چہرے پر خوشی کے تاثرات لا کر بولا "تاریخ تو طے ہو گئی ہو گی مالک"

ہاں۔ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ کو ہے"

"بھگوان دونوں کی جوڑی کو سدا سکھی رکھے، خوش اور آباد رکھے"

گھر پہنچتے پہنچتے اسے دیر ہو گئی۔ اس دن اسے ڈاکٹر کے ہاں بھی جانا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ وہ اس شام کو ضرور آئے۔ تب ڈاکٹر ایک لیڈی ڈاکٹر کا پتہ دے گا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر بغیر فیس لئے گھر پر آکر اس کی بیوی کا معائنہ کرے گی۔ دیال کی بیوی جو حاملہ تھی۔ ایک آدھ مہینہ میں وہ ایک نووارد کی توقع کر رہی تھی۔ بس میں بیٹھا ہوا دیال سوچنے لگا "بیوی، بچے، ڈاکٹر، دفتر، مالک کے بچوں کی شادی۔ اپنے بچوں کی ضرورتیں، کپڑے لتے، رہنا سہنا، کھانا پینا، اف زندگی میں کتنے چکر ہیں جو صرف ایک محدود تنخواہ کے اطراف گھومتے ہیں۔"

ڈاکٹر کے ہاں پہنچا تو ذرا دیر ہو گئی تھی۔ مریضوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اندر کے کمرے میں ایک کے بعد ایک مریض کو دیکھ رہے تھے۔ دروازے پر چپراسی کھڑا تھا۔ جس نے ڈاکٹر سے ملنے کے لئے آئے ہوئے لوگوں کی کیو لگا رکھی تھی۔ لیکن شاید وہ زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے کیو لگانے کے باوجود ان لوگوں کو جو ذرا اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جو ذرا بھی با اثر شخص نظر آتے پہلے چھوڑ دیتا۔ دوسرے مریض اپنی نظریں اٹھا کر خاموش احتجاج کرتے تو بات کو سمجھ جاتے لیکن احتجاج کو خاموشی سے برداشت کر دیتا۔ دیال کے کپڑے سیدھے سادے اور کسی قدر میلے تھے۔ اس لئے جبر

آنے کے باوجود بھی اُس کا نمبر نہیں لگ سکا۔ وہ اندر ہی اندر جھلّانے لگا کہ ڈاکٹر صاحب نے اُس اسسٹنٹ مارداروغہ کو یہاں کیوں بٹھا دیا ہے۔ دیال کے لئے دروازے میں کھڑے ہوئے چپراسی کو اس بات پر قائل کرنا کہ دیال ایک بہت ضروری کام سے آیا ہے اور اُسے فوراً ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ ایک دشوار مہم تھی کھڑے کھڑے دیال کو ایک ترکیب سوجھی اُس نے اپنے کوٹ کے جیب ٹٹولے۔ ایک چونّی اُسے مل گئی۔ قریب آکر بڑی احتیاط سے اس طرح کہ لوگ نہ دیکھ لیں چونّی چپراسی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے دیال بولا۔

"دیکھو پہلوان! مجھے ڈاکٹر صاحب سے فوراً ملنا ہے، انھوں نے مجھے آج اور ابھی آنے کے لئے کہا تھا۔ دیر ہو جائے گی تو ایک مریض کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اوہ" چپراسی ہنس کر بولا "لالہ جی آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اچھا اب اگلا آپ ہی کا نمبر ہوگا"

دیال اندر گیا تو ڈاکٹر جھلّا گیا اور خفگی سے بولا "مسٹر دیال آپ ہر کام مفت میں چاہتے ہیں۔ لیکن یہ آسانی کی خاطر دو چار منٹ پہلے بھی نہیں آسکتے"

دیال اکتا کر بولا "ڈاکٹر صاحب مجھے آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا۔ باہر تھا"

"آپ باہر تھے۔ شاید سمجھ رہے ہوں گے کہ مجھے خواب پڑے گا۔ کہ آپ آچکے ہیں" پھر ذرا نرم ہو کر بولے۔ "میں چاہتا تھا کہ آپ ڈاکٹر مس ساتھر کے گھر پر ان کے ڈسپنسری پہو پہنچنے سے قبل پہنچ جائیں۔ خیر آپ کوشش کیجئے آپ کی قسمت۔ میں چھٹی دیئے دیتا ہوں۔"

دفعتاً باہر کھڑے ہوئے چپراسی نے دروازہ کھولا۔ اندر دو تین سوٹ میں ملبوس نوجوان آگئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی سے اچھل پڑے۔

"ہلو ہلو ورما صاحب کہئے بھئی کیسے آنا ہوا۔ کیوں خیریت ــــ"

ورما نے اپنے بازو والے کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ میرے دوست ہیں مسٹر جین۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے ان کی۔ یہی کچھ تین چار مہینے ہوئے" "آج ان کی بیوی کی طبیعت یکایک گر گئی۔ بہت پریشان ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ ہمارے ڈاکٹر یہیں رہتے ہیں اپنے ہی آدمی ہیں گھر پر چل کر دیکھ لیں گے۔"

"ضرور۔ ضرور" ڈاکٹر صاحب بچھے جا رہے تھے۔

"تو پھر چلئے۔ ہم موٹر لے آئے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ میں آپ واپس آجا سکتے ہیں۔"

"چلئے" ڈاکٹر صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ دیال کا منھ لٹک گیا۔ سب لوگ باہر چلے گئے تو چپراسی سے ملائمت سے کہا۔

"چلئے لالہ جی آپ ذرا باہر بیٹھ جایئے ڈاکٹر صاحب کے آنے کے بعد آجایئے گا۔" دیال باہر آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فون کی گھنٹی بج گئی۔ کمپونڈر نے اٹھایا کچھ بات کی اور پھر باہر آکر زور سے بولا،

"ڈاکٹر صاحب کو آنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ پرانے مریض کل والی دوا لیکر چلے جائیں اور نئے مریض کل صبح آجائیں۔"

دیال اپنا سر تھام کر سوچنے لگا کہ وہ سفارش کی چھٹی لینے آیا تھا، اُس کا شمار کون سے زمرے میں ہوگا۔ نئے مریضوں کے یا پرانے مریضوں کے۔

گھر پہنچا تو رات بہت ہو گئی تھی۔ بیوی پلنگ پر سو رہی تھی۔ بچہ جاگ رہا تھا اور بیمار بھی تھی

بہن بملا بھابی کا کھانا تیار کئے راہ تک رہی تھی۔ دیال نے بیوی کی طرف اشارہ کیا اور بملا سے پوچھا "بھابی کی طبیعت کیسی ہے ؟ " ساتھ ہی بیوی کے پلنگ پر جھک گیا۔ جیسے اس سے کہنا چاہتا ہو۔

"نخے کی ماں ! اگلے مہینے تم بچہ دینے والی ہو اور اگلے مہینے چھوٹے بابو کی شادی بھی ہو رہی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک پروگرام ایک آدھ ماہ کے لئے رک جائے تو کتنی قدر سہولت ہوگی۔ چھوٹے بابو کی شادی کو روکو انا اپنے بس کی بات نہیں تو کیا نو وارد کو ایک آدھ ماہ دیر سے آنے کے لئے نوٹس دینا بھی تمہارے بس کی بات نہیں۔"

لیکن بیوی کی صرف سانس چلتی رہی۔ بملا نے قریب آکر کہا "حالت ویسی ہی ہے چلو آپ کھانا کھالو بھیا شیام نے بھی نہیں کھایا۔ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

شیام نے پتاجی کی آواز سنی تو دوڑ کر آیا۔ اور لپٹ گیا۔ دیال کو جیسے سکون ملا۔ اس کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ گھر کی جنت کتنا سکھ دیتی ہے، اس بے لوث پیار میں وہ سارے غم فراموش کر دیتا ہے، وہ سب کچھ بھول جاتا ہے تینوں دسترخوان پر آکر بیٹھے۔ کھاتے ہوئے تتلا کر شیام نے کہا۔

"بالو کے پتاجی نے بالو کو خزانہ لاکر دیا۔ ہمیں بھی ایک لادو نا پتاجی" دیال ہنسنے لگا اور بولا۔ "بیٹا خزانہ لانے کے لئے الہ دین کا چراغ چاہیئے۔ سمجھے ؟"

"تو پھر الہ دین کا چراغ لادو۔"

دیال سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

صبح دیال دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تو شیام پھر آکر پاؤں سے لپٹ گیا اور یاد دلانے لگا۔

"پتاجی پتاجی بتایئے خزانہ لے آئیں گے نا آپ۔"

دفتر کے خیال ہی سے دیال کا موڈ خراب ہوگیا تھا اس لئے جھلا کر بولا۔

"چل ہٹ یہاں سے" شیام بسورنے لگا۔

پلنگ پر سے اٹھ کر بیوی بڑی ملائمت سے بولی۔ "کیا ہے آخر ملوں جھڑک جھڑک کر آپ اپنے ہی بچے کا دل توڑتے ہیں۔"

بڑے دلخراش لہجے میں دیال بولا "اور نہیں تو کیا کرے گا۔ مفلس باپ سے خزانہ مانگنے چلا ہے۔ ذرا اس کا دماغ تو دیکھو۔"

بیوی کا ہنسنے لگی اور بولی۔ "آپ بات کو بڑی دیر سے سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب پیسے جمع کرنے کی ہانڈی سے ہے۔ جس میں ایک سوراخ ہوتا ہے۔ باقی سب جگہوں سے بند ہوتی ہے۔ کمہار اس کھلونے کو خزانے کے نام سے چھ پیسوں میں بیچ رہا ہے۔"

"اوہ وہ پیسے جمع کرنے کی ہانڈی" دیال نے فوراً یاد کیا اور مسکراتے ہوئے شیام کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"لو بیٹا اب مان جاؤ میں ضرور لاؤں گا۔ لو یہ وعدہ رہا۔"

گھر سے نکلنے کے بعد دیال سوچنے لگا۔ کہ وہ کیسا باپ ہے۔ اپنے اتنے چھوٹے بچے کو یوں معمولی معمولی بات پر جھڑک دیتا ہے۔ اسے یوں نہیں کرنا چاہیئے۔ پھر اس نے یاد کیا کہ اس نے اپنی بیوی سے چھوٹے بابو کی شادی بابت ضرور کہہ دیا تھا لیکن یہ نہ کہہ سکا کہ چھوٹے بابو کو شادی میں کوئی تحفہ دینا ہے۔ تحفہ نہیں تو کم از کم سلامی ضرور دینی ہے اور اس کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے، کہیں سے پیسے مہیا ہونے چاہئیں۔ ورنہ وہ کیا صورت لے کر شیخ صاحب کا سامنا کریگا۔

دیال نے یہ آخری بات اپنی بیوی سے نہیں بتائی۔ کیونکہ گھر کی حالت ہی ایسی تھی۔ تنخواہ میں جو کچھ بھی ملتا تھا وہی مہینہ بھر کے خرچ کو بس نہیں ہوتا تھا۔ پھر اب ایسی باتیں وہ بیوی سے کرے گا۔ تو خواہ مخواہ وہ جی میں کڑھے گی پیسے بچانے کی خاطر دوا نہیں پیئے گی۔ اور اس کا اثر اس کی صحت پر اور نئے آنے والے بچے پر پڑے گا۔

بس اسٹینڈ پر کھڑا دیال سوچنے میں معروف تھا۔ آج بس آنے میں نہ جانے کیوں اتنی دیر لگ رہی تھی۔ دفعتاً ایک خیال تیر کی طرح اس کے دماغ میں آیا، کیوں نہ وہ ایک کے بجائے دو عدد مٹی کے کھلونے خرید لے۔ ایک شیام کے لئے اور ایک اس کے اپنے لئے۔ وہ بس میں جانے کی بجائے روز دفتر پیدل چلا جایا کرے گا۔ آنے اور جانے کے روز تیس پیسے بچائے گا۔ اور اس کو ہانڈی میں روز ڈال کر بھول جائے گا۔ مہینہ کے ختم پر کم از کم ساڑھے سات روپے ضرور جمع ہو جائیں گے۔ دو تین روپے اور کچھ ادھر ادھر کر کے تو پھر بس بے کام چل جائے گا۔ اس خیال نے اسے بے پناہ مسرت دی اور ایک ذہنی الجھن کا خاتمہ ہو گیا۔ جب وہ دفتر پہنچا تو اس کے چہرے پر تر و تازگی آ گئی۔ دفتر میں ہر ایک سے چہک چہک کر گفتگو کرنے لگا۔ سب سے پوچھتا جاتا کہ وہ لوگ چھوٹے بابو کی شادی میں کیونکر ہاتھ بٹائیں گے۔ دیال کی باتیں سن کر دفتر کے نوجوانوں نے سرگوشی کی۔

"آج کاکا جی بڑے موڈ میں ہیں۔ پتہ نہیں کاکی نے کیا کھلایا۔"

اپنے خیال کو دیال اس دن عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کیونکہ شام میں اسے پھر ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا، وہاں سے بازار جانا تھا لیکن دوسرے دن سے اس نے باقاعدہ اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ صبح گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے نکل جاتا، بیوی پوچھتی تو کہہ دیتا کہ دفتر میں کام بہت ہے۔ اور اسے ہی نپٹانا پڑتا ہے۔ شام میں ہر روز دیر سے آنے کی بھی یہی وجہ بتائی۔ آٹھ دس دن تو اس جوش میں جوں کے توں کٹ گئے۔ لیکن اس کے بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ دفتر بس کی بجائے پیدل چل کر جانا ہمالیہ پہاڑ پر چڑھنا ہے۔ دفتر پہنچتا تو انتہائی تھک جاتا۔ پسینے سے تر بتر ہو کر ہانپنے لگتا۔ نظروں کے سامنے چھوٹے بابو آ جاتے۔ چھوٹے بابو دولہا بنے ہیں۔ چھوٹے بابو منگل پھیرے کر رہے ہیں، چھوٹے بابو مسکرا رہے ہیں۔ اور چھوٹے بابو اس کے سامنے کھڑے ہیں۔

چند اور دن گذرے تو دفتر کے لوگ مسلسل دیال سے سوالات کرنے لگے کہ اسے کیا ہو گیا ہے، کیوں اس کی صحت ہر دن گرتی جا رہی ہے۔ وہ دبلا اور کمزور ہو رہا ہے۔ وہ اپنا علاج کیوں نہیں کرتا۔ وہ کسی ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں جاتا۔ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں شہر سے باہر کسی پہاڑی مقام پر کیوں نہیں چلا جاتا۔ دیال سب سوالات کے جواب میں صرف ایک تلخ مسکراہٹ دے دیتا۔ جیسے یہ مسکراہٹ بھی ایک زبان ہے۔ اور اس زبان سے وہ اپنے دفتر کے نوجوان دوستوں کو کہہ رہا ہو کہ زندگی ایک معمہ ہے۔ اور زندگی کی تلخیاں ہی اس بات کا ثبوت ہیں۔ تلخیاں جو آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیتی ہیں تلخیاں جو تنومند کمر کو کمان کر دیتی ہیں

"ایک دن بیوی نے اسے پکڑ لیا اور گھبرا کر بولی:" آپ یہ نوکری چھوڑ دیجئے۔"

دیال کو خاموشی کی عادت پڑ گئی تھی لیکن اس بات پر چونک کر فوراً بولا "پھر کھائیں گے کیا۔ ؟"

"کوئی نوکری اور مل جائے گی" بیوی بولی "ایسی نوکری بھی کیا کہ جس کی ذمہ داری کا بوجھ صحت کو روندتا چلے۔ آپ کے مالک سمجھتے کیوں نہیں۔ کہ آپ ان کے کاموں کے لئے اتنا زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔ ذمہ داری کا احساس اچھا ہے۔ لیکن توازن کے ساتھ"

دفعتاً نوزائیدہ بچہ غوں غاں کرتے ہوئے رونے لگا۔ دیال نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ بالکل پھول

کی طرح۔ بچّہ پھر بھی رو رہا تھا غوں غاں غوں غاں۔ دیال ہاتھوں کو ہلا کر اسے جھولا دیتا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ننھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوچ رہا تھا کہ اُس کی حالت اور بچے کی حالت ایک جیسی ہے۔ دونوں ہی اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اپنی مصیبت کا حال قریب ترین ہستی کو بھی سنا نہیں سکتے۔ اف یہ لمحات کتنے صبر آزما ہوتے ہیں۔

بیوی نے بچے کو دیال کے ہاتھ میں سے لے لیا۔ غوں غاں کرتا ہوا بچہ چُسر چُسر کر کے دودھ پینے لگا اور خاموش ہو گیا۔ دیال کو بیوی کی بات کا جواب دینا تھا۔ اس لئے بازو کی کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگا۔

"بس اب آٹھ دس دن ہی تو رہ گئے ہیں چھوٹے بالو کی شادی ہو جانے دو۔ پھر میں ملک سے کہہ دوں گا۔ وہ میری بات یقیناً مان لیں گے۔ اس سے پہلے کہنا مناسب نہیں۔"

"اس سے پہلے نہ کہنا چاہیں تو نہ کہیں لیکن پرسوں چھٹی کے دن آپ کو ڈاکٹر کے ہاں ضرور جانا ہوگا۔ کوئی اچھی سی ٹانک لکھوا لیجئے۔"

"کسی دن چلا جاؤں گا" دیال نے لاپروائی سے کہا اور بازو سے اٹھا کر چار دن کا پرانا اخبار پڑھنے لگا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ چھوٹے بالو کی شادی سر پر آ گئی تھی۔ صرف دو دن رہ گئے تھے۔ دیال کی بیوی کمرے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ دوڑتی ہوئی بملا آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بھری ہوئی ریزگاری تھی کمرے میں آ کر اس نے میز پر ڈھیر لگا دی۔ دس دس اور پانچ پانچ نئے پیسوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر دیال کی بیوی کے چہرے پر سوالیہ نشان ابھرا۔

"بھابی" بملا بولی "بھیّا کا صندوق کپڑوں سے تتر بتر ہو گیا تھا۔ جمانے کے خیال سے میں نے کپڑے نکالے۔ کالا کوٹ نکالا تو اُس میں سے یہ کھلونا لڑھک کر ٹوٹ گیا۔ اسی میں سے یہ سب پیسے نکلے ہیں۔"

پیسوں کا ڈھیر دیکھ کر بہت سوں کو ہنسی کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر دیال کی بیوی کیوں متّشنیٰ رہتی اس نے ہنستے ہوئے بملا سے کہا۔ "اپنی بیویوں سے چھپا کر یوں پیسے جمع کرنے میں معلوم نہیں مردوں کو کیوں سکون ملتا ہے۔"

"لیکن بھابی کہاں سے آئے ہوں گے۔" بملا پر تفتیش کا موڈ تھا۔

"آتے کہاں سے" دیال کی بیوی نے جواب دیا۔ "سودے کے پیسوں میں سے بچائے گئے ہوں گے" پھر کچھ سوچ کر بولی "ضرور یہ میرے لئے ایک ساڑی لانا چاہتے ہوں گے۔ ان دو مہینوں کے بعد ہمارے شادی کی آٹھویں سالگرہ ہے۔ پانچویں اور چھٹے برس میں وہ یوں ہی اچانک مجھے ساڑیاں لا کر دئے تھے۔ اس بار بھی یہی ارادہ ہوگا۔ لیکن اب جبکہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ تو بھلا کیوں نہ ہم ان ہی کے لئے ایک دھوتی خرید لیں پرسوں چھوٹے بالو کی شادی ہے اور ان کے پاس کوئی نئی دھوتی نہیں۔ تم آج ہی چلی جاؤ بازار۔"

دیال کی بیوی خود نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ اس کا بچہ ابھی چند ہی دنوں کا تھا۔ بملا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بھابی کی ساڑی کی بجائے بھیّا کی دھوتی آ جائے، اچھی ہی تو بات تھی۔

شام کو حسبِ معمول دیال آیا۔ پیسے ڈالنے کے لئے سب کی نظروں سے بچ کر اندرونی کمرے میں گیا۔ لیکن صندوق کے اندر کالے کوٹ کی تہہ میں خزانے کی ہانڈی کو نہ پا کر اُس کی جان نکل گئی۔ سٹ پٹائی ہوئی حالت میں باہر آیا تو بیوی کے لبوں پر ایک دبی ہوئی مسکراہٹ دیکھی۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ جس کے باعث مردوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ دیال کو فکر ہوئی کہ یہ راز جو وقت سے پہلے افشا ہو گیا نہ جانے کیا رنگ لائے۔

چٹنی نے بات کو درمیان ہی میں سے شروع کیا اور کہا " ترکاری بھاجی کے پیسوں میں سے آپ بچا تے رہے نا ــ ؟ "

"نہیں" دیال نے ملزموں کی طرح سر ہلا کر صفائی پیش کی۔

" پھر ؟ "

" بس کا کرایہ بچاتا رہا " کوئی راہ نظر نہیں آئی تو دیال نے صاف بتا دیا۔

" کیا ــ ؟ " بیوی نے چلا کر کہا " آپ دفتر پیدل جاتے رہے پیدل آتے رہے۔"

" ہاں ــ "

" اسی لئے اتنی جلدی جا کر اتنی دیر سے تھک کر لوٹ آتے ہو۔ مجھ سے جھوٹ کیوں کہا تھا کہ دفتر میں کام زیادہ ہے" دیال نے اس بار مظلوموں کے انداز میں کہا " ڈرتا تھا مجھے کہ تم ٹوک دوگی۔ مجھے ایسا کرنے سے منع کروگی۔ کوئی اور چارہ نہیں تھا "

بیوی کی آواز میں تڑپ آگئی اور اس نے جواب دیا " ایسی بھی کیا ضرورت تھی۔ میرے پاس تو کافی ساڑیاں ہیں ــ "

" ساڑی ؟ " دیال نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا " میں نے تو چھوٹے بابو کی شادی کے لئے جمع کئے تاکہ شادی میں اُن کے لئے تحفہ نہیں تو سلامی کے طور پر ہی دے سکوں " لیکن جب بیوی نے سارا حال بتایا اور کہا کہ شادی میں پہن کر جانے کے لئے نئی دھوتی آ بچکی ہے تو دیال کا منہ لٹک گیا۔ اسے اپنی بیوی پر بے حد غصہ آیا۔ جس مشکل کو اُس نے ایک مہینے کی مشقت سے آسان بنا دیا تھا اس پر ننھے کی ماں نے پانی پھیر دیا۔ حالات کے ہاتھوں میں وہ خود بھی ایک مٹی کا کھلونا ہے۔ جو ذرا سی بے احتیاطی سے لڑھک کر فرش پر گرتا تو ٹوٹ جاتا۔ اس رات وہ چین سے سونے کی بجائے دھوتی کو فروخت کر دینے یا سود پر قرض لینے کے امکانات پر غور کرتا رہا۔ اگر یہ ممکنات اس کی مشکل دور نہ کریں تو وہ شادی میں نہیں جائے گا۔ اُس نے تہیّہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن کچھ بھی نہ ہو سکا۔

جب دیال کی بیوی اندرونی کمرے میں آئی تو اپنے شوہر کو مایوسی سے پلنگ پر پڑا ہوا پایا۔ شادی کی رسم کے لئے چند گھنٹے باقی تھے۔ اس کی بیوی نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

" اچھا ہے آپ نہیں جایئے گا "

" ہاں نہیں جاؤں گا " دیال نے جواب دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی آواز کہیں بہت دُور سے آ رہی ہے۔

دیال کی بیوی نے اُسی اونچی آواز میں فوراً کہا " گھر پر بچّے کو سنبھالیئے۔ آپ کے بجائے میں چلی جاؤں گی " دیال ہڑبڑا کر پلنگ پر سے اٹھا۔ بیوی نے دوسرا جملہ کہا " اور مالک سے پوچھوں گی کہ وہ پیسوں کے اتنے بھوکے کیوں ہیں ــ "

دیال نے گھبرا کر کہا " میں نے کب کہا کہ وہ پیسوں کے بھوکے ہیں ــ "

بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا " پھر اسی لئے تو آپ شادی میں جانے کے لئے ہچکچا رہے ہیں "

" یہ بات نہیں ہے "

"میں سب جانتی ہوں حالانکہ شادی بیاہ کے موقع پر لوگ دلہا دلہن کو آشیرواد دینے اور نیک خواہشات کا اظہار کرنے جاتے ہیں۔ آپ کے مالک یہی تو چاہتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے" دیال نے انجانے سے کہہ دیا پھر چونک کر بیوی کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ آشیرواد اور نیک خواہشات کا اظہار۔ ہاں! ہاں! یہ تو وہ دے سکتا ہے۔ دے سکتا ہے تو پھر کیوں گھر پڑا ہے۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ دماغ کی الجھنیں سلجھتی جا رہی تھیں۔ بیوی کی بات میں کتنی وزن دار دلیل تھی۔ اس دلیل نے اُسے قائل کر دیا۔ کتنی اچھی سی بات ہے اور کتنی معمولی بھی لیکن یہ اس کے دماغ میں پہلے نہ آسکی۔ اس زاویہ سے بات کو سوچنے کا موقع اسے نہیں ملا۔ اپنے آپ کو وہ اب تک ایک مٹی کے کھلونے کے حامل سمجھ رہا تھا۔ دیال کو احساس ہونے لگا کہ ایک گہرا بوجھ اس کے ذہن سے اترتا جا رہا ہے۔ اپنے جسم میں اس نے ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ جیسے وہ شام کا بھٹکا تھا اب اسے صبح کا نور مل گیا ہو۔

دیال کا دل اچھلنے لگا کیونکہ اس دلیل کے پیچھے اسے ایک خزانہ مل گیا تھا۔ اب وہ تنومند ہو جائے گا۔ خوشی سے پھر ایک بار پھول جائے گا۔ وہ لپک کر نئی دھوتی کی جانب بڑھا۔ اور کپڑے بدلتے ہوئے یاد کیا۔ کہ ایک بار بچپن میں وہ مار کے ڈر سے اسکول نہ جانے کا تصفیہ کیا تھا تو ماں نے اسے سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔ اب یہ عورت بیوی کے روپ میں اسے منا کر شادی میں بھیج رہی ہے۔ کچھ بھی تو فرق نہیں۔ ان دونوں کی تعلیم جگ دونوں نے اسے آڑے وقتوں میں ہمت دی۔ آگے بڑھایا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ ایک اور شادی کرے تاکہ آڑے وقتوں میں ہمت دینے والوں میں ایک اور اضافہ ہو۔ اپنے خیال پر اُسے ہنسی بھی آ گئی۔ دھوتی پر اجلی قمیص پہنی تو بیوی کو کوٹ ہاتھ میں لئے منتظر پایا۔ کوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو بیوی نے مسکرا کر پوچھا۔

"پیدل جائیے گا یا بس سے ــــ ؟"

دیال نے اسی مسکراہٹ میں جواب دیا۔

"پیدل جائیں گے تمہارے دشمن ـ"

پھر اپنی جھینپ کو چھپانے کی کامیاب کوشش کر لینے کے بعد بولا۔

"اچھا ہاں میرے لئے ایک پان تو لگا دو ننھے کی ماں ــ !"

بقیہ افسانہ زخمی دریچے صفحہ ۴۶

شوکت جب کمرے میں داخل ہوا تو مہر سسکیاں بھر رہی تھی۔

"تم نے سُنا ہے مہر وہ بدمعاش ولاور کیا کہہ رہا تھا۔"

"میں نے سب باتیں سُن لی ہیں بھائی جان۔ سب باتیں سُن لی ہیں۔ مگر آپ نے انہیں کیوں رد کر دیا کہیے۔ کہیے نا بھائی جان ـ یہ کہہ کر وہ شوکت سے لپٹ کر رونے لگی۔ اور شوکت کو احساس ہوا جیسے آج اُس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہو ـ!!

نجمہ سمیع

پرچھائیاں

ساکن پانی میں لہریں اٹھ رہی تھیں
کسی نے مرجھایا ہوا کنول کا پھول پھینکا تھا۔
لہروں کے سینے پر ڈولتا ہوا کمل۔ کمل۔ من کے شانت ساگر میں کمل کا چہرہ کھل اٹھا۔ لہریں اونچی اونچی اٹھنے لگیں۔
کہیں کوئی طوفان نہ آجائے۔

" سدھا ۔۔۔ ایک آہ کی طرح کسی نے کہا۔ اس سرگوشی میں کتنی بے چارگی، کتنی تشنگی، پیار کی کتنی بھوک اور امنگ سمائی ہوئی تھی۔

" رنو ۔ رنورانی ۔۔۔ کسی نے اونچے سُروں میں پکارا، آواز میں اتاہ پیار کی گہرائیاں تھیں

" جی ۔۔۔ " اس کی اپنی آواز میں بھیرویں کے غمگین سُر گھلے ہوئے تھے۔

سامنے آئینے میں ایک پرچھائیں نظر آرہی تھی۔ یہ کس کی آنکھیں ہیں جن میں مسرت کی چمک نہیں، غم کی پرچھائیاں ہیں۔ یہ کس کے مسکراہٹ سے ناآشنا پھیکے پھیکے لب تھے۔ یہ کس کا چہرہ ہے جس پر شباب کی سرخی نہیں حسرتوں کی زردی چھائی ہے اسے اپنا چہرہ بڑا اجنبی لگا۔

" سدھا ۔" غم کے جذبات سے بوجھل آواز میں کمل نے پکارا۔ اس کی گہری افسردہ آنکھیں ایک پل کے لئے مسرت سے چمک اٹھیں۔

" رنو رانی ۔۔۔ " دل کی گہرائیوں سے عشرت نے پکارا۔ اس کی آنکھیں کامیابی کے احساس سے دمک رہی تھیں۔

"سدھا ۔۔" رنو رانی ۔۔ " اس کے دائیں بائیں سرگوشیاں تیز ہوتی گئیں۔

" نہیں نہیں ۔ میں سدھا کو نہیں جانتی ۔ میں رنو کو نہیں پہچانتی ۔ چلے جاؤ ۔ چلے جاؤ ۔۔ " اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور میز پر چہرہ جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

" میں کمل ہوں سدھا۔ مجھے بھول گئیں۔ پہلی بار ہم مندر کی سیڑھیوں پر ملے تھے۔ تم پوجا کے لئے جا رہی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں پھول تھے۔ اور تمہیں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا تھا۔ تم تو خود دیوی ہو پھر تم کس دیوی کی پوجا کرنا چاہتی ہو، میرے دل نے چپکے سے کہا تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سارے پھول تمہارے قدموں پر رکھ دیئے تھے تم جھجک کر پیچھے ہٹ گئی تھیں اور تم نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا تھا تمہاری آنکھیں کتنی گمبھیر تھیں۔ میں من ہی من میں کانپ اٹھا تھا۔ میں نے نمشکار کے لئے ہاتھ جوڑ دیئے اور ایک لفظ بھی منھ سے کہے بغیر تم چپ چاپ چلی گئی تھیں۔ تم ہر روز پوجا کے لئے آتیں اور میں دور کھڑا اپنی دیوی کے درشن کرتا۔ دل کا دیا روشن کر کے تمہارے چرنوں میں اپنے ارمانوں کے پھول

چڑھایا کرتا۔ اپنے آنسوؤں کی انجلی دیا کرتا۔ دن گزرتے رہے اور ایک وقت ایسا آیا جب میرے خیالوں اور تصورات سے نکل کر تم میرے ساتھ تھیں۔ میری زندگی کے سبزہ زاروں پر تمہاری محبت شبنم کی طرح برس رہی تھی۔ مگر اچانک دھرتی ماتا کے سینے پر بہتے ہوئے گرم لاوے جیسی نفرت نے میرے سبزہ زاروں کو جھلس دیا۔ نفرت کے پھیلتے بڑھتے اندھیروں میں تمہارا ہاتھ چھوٹ گیا۔ میری کلا کا دم گھٹ گیا۔ محبت کی سُریلی میٹھی تانیں نفرت کی بھیانک چیخوں تلے دب گئیں۔ تم کھو گئیں، میری زندگی کھو گئی۔ منزل منزل بھٹکتا تمہاری تلاش میں آج اتنے سال بعد اچانک تم تک پہنچا ہوں۔ ایک نئی زندگی کی امید لئے۔ میرے آدرشوں کے مرجھائے پھولوں کی ایک ایک پتی۔ بہار کے پہلے جھونکے سے تھرتھرا رہی ہے۔ مگر۔ تم مجھے بھول گئیں۔ بھول گئیں۔ وقت کے ظالم چکر نے تمہارے ذہن سے ماضی کے خوبصورت لمحوں کو چھین لیا۔ یاد کرو سُدھا۔ میں کمل ہوں۔ جو تمہارے من کے ساگر میں کھِلا تھا۔ سُدھا۔ سُدھا۔ "

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھا کر ایک بار اُس نے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

" رقوّانی۔ "کسی نے سرگوشی کی۔" تم نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔ آج سے میں تمہیں رقوّانی پکارا کروں گا، تمہیں پسند ہے یہ نام؟ مگر تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں جھلملانے لگے۔ یہ آنکھیں ہنسنے کے لئے ہیں۔ یہ مایوسی دلوں کو زندگی کی آرزو بخشتی ہے۔ یاد ہے؟ گھور اندھیرے کی کوکھ سے تم امید کی کرن بن کر نکلی تھیں۔ میں آگ اور خون کے نہ جانے کتنے طوفانوں سے لڑتے ہوئے تمہیں یہاں تک بچا کر لایا تھا۔ تم دِیئے کی لو کی طرح تھیں۔ جو تیز ہوا میں جھلملا رہی تھی۔ اور اس ٹمٹماتے دِیئے کی لو کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو وابستہ کر دیا تھا۔ اس تھرتھراتی لو کے گرد اپنے مضبوط ہاتھوں کا کٹورا بنا کر اسے طوفانی ہواؤں سے بچانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا یہ لو میری آنکھوں میں ہمیشہ جھلملاتی رہے۔ جس کی زندگی میں روشنی کی ایک بھی کرن نہ ہو۔ اس کے لئے دِیئے کی مدھم جوتی ہی سب کچھ ہے۔ تم میری زندگی کی روشنی ہو۔ رقو۔ رقوّانی۔ "

" سدھا۔ سدھا۔ تم سے میری کلا زندہ ہے۔ تم میرے انسپریشن کا سورس ہو سدھا۔ "

" رقوّانی۔ تمہارے وجود سے میری دنیا میں اجالا پھیلا ہے۔ "

" سدھا۔ تم میری ہو۔ "

" رقوّانی۔ تم میری ہو۔ "

" نہیں نہیں۔ میں کسی کی نہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرے چاروں طرف خلا ہے اور میں اس خلا میں بھٹک رہی ہوں۔ اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں۔ کوئی مذہب نہیں۔ میں صرف انسان ہوں۔ مگر انسان کی اس دنیا کو ضرورت نہیں۔ یہاں کوئی نہیں جس کا مذہب انسانیت ہو۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ مذہب کی گروہ بندیوں کا اندھیرا۔ کوئی نہیں جو اس اندھیرے میں انسانیت کے چراغ کی لو جلائے۔ جو انسان کے ڈگمگاتے وجود کو سہارا دے اور یہ سارے طوفان۔ انسانیت کے قدم ڈگمگا دینے والے طوفان ٹھنڈے پڑ جائیں۔ کوئی نہیں کوئی نہیں۔ " اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ کمل اور عشرت کی پرچھائیاں، رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں گم ہو چکی تھیں۔ سویرا کب ہوگا؟ اس اندھیری رات کا سویرا؟

اعجاز صدیقی

(فکرِ تازہ)

گھیرے کچھ اور ہو کے رہے زندگی کے زخم
خود آدمی نے پھیل دئے آدمی کے زخم!

پھر سے سجا رہے ہیں اندھیروں کی انجمن
وہ تیرہ بخت، جن کو ملے روشنی کے زخم!

رُوندے گئے ہیں سبزۂ بیگانہ کی طرح
سہتے رہے ہیں وقت کی ہر بے رُخی کے زخم

زخموں سے چُور چُور رہے اپنا غریب دل
کچھ دوستی کے زخم ہیں، کچھ دشمنی کے زخم

ہیں بے نیازِ چارۂ رسم و تکلفات
رکھتے ہیں زیرِ دامنِ دل سادگی کے زخم

اے سعئ اندمال تری آبرو کی خیر
اتنے کبھی ہوئے تھے نہ رُسوا کسی کے زخم!

ہر گام پائے راہ رَواں ہے لہو لہان
یہ رہزنی کے زخم ہیں، یا رہبری کے زخم؟

پھر بھی نہ مطمئن ہوئی تہذیبِ آستاں
ہم نے جبیں پہ ڈال لئے بندگی کے زخم!

قحطِ وفا میں کاش کبھی یوں بھی ہو سکے
ایک اجنبی کا ہاتھ ہو، ایک اجنبی کے زخم!

تا میکدے میں دَرد کی چنگاریاں اُڑیں
رہنے بھی دو لبوں پہ مرے تشنگی کے زخم

جس کو بہت عزیز رہی گردِ اعتبار
رُو دے اُٹھے ہیں آج یکایک اُسی کے زخم!

اک ”تم“[1] نے کیا دیا ہے فریبِ تعلقات؟
اعجاز کھا چکا ہے بہت دوستی کے زخم

---

[1] یادِ معنوی ڈاکٹر شفق گوالیاری کی نذر۔ غزل کی یہ زمین اور اس کا یہ مقطع اُن ہی کی منافقانہ نوازشوں کے شدید تاثر کا نتیجہ ہے۔ میں اپنی زندگی بھر کی سنجیدگی میں پہلی بار اس جذباتی فروگذاشت کے لئے ادبی دُنیا سے معذرت خواہ ہوں۔ اعجاز

نامی انصاری

○

(نذرِ غالب)

تھے جتنے اہلِ ذوق شہیدِ ستم ہوئے
فتنے تری نگاہ کے پھر بھی نہ کم ہوئے
اِک حرف بھی نہ گردشِ دوراں مٹا سکی
مدّت ہوئی حدیثِ محبّت رقم ہوئے

ق

کچھ شورِ آہ و نالۂ و فریاد ہی سہی
اِک عمر ہوگئی سرِ تسلیم خم ہوئے
پھر جشنِ چاکِ جیب و گریباں منائیے
فصلِ بہار کے سر و ساماں بہم ہوئے

ق

کس دن نہ بے نیازیٔ خوباں سے رَن پڑا
کس روز سرنگوں نہ ہمارے عَلَم ہوئے
اِک موجِ آرزو تھی کہ زخمی نہ ہو سکی
اِک جوشِ حوصلہ تھا کہ پسپا نہ ہم ہوئے

ق

کرتے رہے ستائشِ حسنِ صنم بُراں
دل پہ ہمارے گرچہ بہت کچھ ستم ہوئے
کہتے رہے نگاہِ محبّت کی داستاں
گو موردِ عتابِ جہاں اِس میں ہم ہوئے
"لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"
غالبؔ

پیامؔ فتحپوری

○

(نذرِ غالب)

دل ہے حریصِ لذّتِ آزار کیا کریں
اب کم ہے ظرف سے رسن و دار کیا کریں
آئی تھیں سامنے سبھی دُنیا کی نعمتیں
دل کو تو ہے پسند غمِ یار کیا کریں
آلودۂ غبار ہے پھر عشق کی فضا
اے دل تصوّرِ لب و رخسار کیا کریں
پھر رُوبرو ہے معرکۂ جہدِ زندگی
گر راہ میں ہے سایۂ دیوار کیا کریں
اے زندگی! جو چاہے سزا دے قبول ہے
ہیں تیری آرزو کے خطاوار کیا کریں
آوارگانِ زیست کہاں اور سکوں کہاں
مانا ہے خلد کوچۂ دلدار کیا کریں
کچھ زرپرست آئے تھے ہم کو خریدنے
لیکن نہ بِک سکا دلِ خوددار کیا کریں
چارہ گر دل کو کس لئے الزام دیں پیامؔ
غم دل کو ہو عزیز تو غمخوار کیا کریں

متین سباوش

○

زندگی کے ساز پر جلتے ہوئے نغمات ہیں
رقص فرما شعلۂ دل کی طرح ذرات ہیں

ہیں بگولوں کی طرح تارِ نفس بہکے ہوئے
زندگانی کی جنوں پرور سبھی آیات ہیں

ہے مدارِ فکرِ انساں، برق و جوہر کی نمود
آتشِ غم سے حسیں، تہذیب کے باغات ہیں

ناز فرما جن کی تابانی پہ تھی عقلِ بشر
آج وہ خورشید و انجم کتنے کم اوقات ہیں

کون کہتا ہے مقدر کو زمانے کا رقیب
برق آسا ہیں عزائم، آتشیں لمحات ہیں

ہم کہ تھے دلداریٔ موجِ حوادث پر نثار
شورِ طوفاں سے عبارت دل نشیں جذبات ہیں

جن کو رکھتی تھی معطر تیری یادوں کی شمیم
تیغ کی جھنکار میں گم وہ حسیں دن رات ہیں

جن کی گرمی سے پگھل جائے سیاست کا زجاج
ان کے افکار میں ایسی بھی کچھ آیات ہیں

وقت کی محراب میں اک شمعِ نو روشن کریں
رازدانِ آندھیوں ہم حادثِ آفات ہیں

کون ڈھونڈے گرمیٔ رخسارِ خوباں اے سروش
آتشِ پیکار سے شعلہ فگن جذبات ہیں

عنبر چغتائی

○

تاریک خلاؤں میں بہ حیرت نگراں ہیں
ہم لوگ کہ جو نبض شناسانِ جہاں ہیں

یادیں کہ جہاں ہیں، اثرِ سود و زیاں ہیں
لیکن غمِ جاناں میں یہی نغمۂ جاں ہیں

کچھ شیشے کے قلعوں سے چلے آتے ہیں پتھر
دیوانے ابھی خیر سے دیوانے کہاں ہیں

سیارۂ آوارہ سے جنباں ہیں فضا میں
کونین میں اب تک وہاں ہم ہی نہاں ہیں

تسخیرِ مہ و مہر بھی حصہ ہے انہی کا
جو محرمِ اسرارِ حرم کاہکشاں ہیں

ہر عہد میں فرقِ من و تو ہم نے مٹایا
ہر دور میں شائستۂ تدبیرِ جہاں ہیں

ہیں مذہب و ملت کی سیاست سے بہت دور
ہم اہلِ جنوں ایک ہیں دنیا میں جہاں ہیں

معیارِ جوانی نہیں انساں کا سن و سال
جو لوگ جواں ہیں، وہ بہر حال جواں ہیں

اے رودِ جمن، قلعۂ و ممتازِ جہاں "تاج"
سیماب کہاں؟ منظرِ داعجاز کہاں ہیں

آوارگیٔ فکر، نہ عیاشیٔ جذبات
عنبر ترے اشعار کہ بوڑھے نہ جواں ہیں

صادق اندوری

شبنم شعلہ بن جاتی ہے شعلے شبنم ہو جاتے ہیں
جب اُن سے نظریں ملتی ہیں جذبے مدغم ہو جاتے ہیں

اُن کی نظر سے میرے دل تک ظاہر میں دُوری ہے بہت
لیکن وہ بھی وقت آتا ہے فاصلے خود کم ہو جاتے ہیں

چلتی نبضیں رُک جاتی ہیں عالم غیر سا ہو جاتا ہے
جب اُن کے گلگوں عارض پر گیسو برہم ہو جاتے ہیں

شہنائی رس کھو دیتی ہے غم کے بادل چھا جانے پر
نغمے آہوں میں ڈھل ڈھل کر آخر ماتم ہو جاتے ہیں

طنز کناں ہیں جامہ دری پر جتنی اکثر اہلِ دانش
پیراہن اُن دیوانوں کے اک دن پرچم ہو جاتے ہیں

دل کی بات نہ لا ہونٹوں پر ورنہ رُسوا ہو جائیگا
جانتا ہے دیوار و در بھی اکثر محرم ہو جاتے ہیں

صادق مجھ کو خاص تعلق مدت گزری اُس در سے ہے
سرکش انسانوں کے سر بھی جس در پر خم ہو جاتے ہیں

ماشی پٹیالوی

نظر میں نور کتنا اور دل میں روشنی کتنی
رچھلک دی جا رسو اک ناہ وش نے چاندنی کتنی

محبت کرنے والے دل ہی کر سکتے ہیں اندازہ
محبت کی بدولت ہے دلوں میں روشنی کتنی

کہاں کے غیر اپنوں پر بھروسہ ہو نہیں سکتا
لٹائی دوستوں نے آبروئے دوستی کتنی

نگاہِ کامیابِ عاشقی کو دیکھنا یہ ہے
بجائے دوست سے دل کو ہوئی وابستگی کتنی

خدا معلوم ابھی کس کس بلا کا سامنا ہوگا
سزا جینے کی پائے گی نہ جانے زندگی کتنی

محبت آنسوؤں میں ڈوب کر بھی مسکراتی ہے
کوئی دیکھے میسر ہے غمِ دل کو خوشی کتنی

بہاروں کے خزانے لوٹ کر بھی دل نہیں کھلتے
چمن زارِ محبت کو ملی افسردگی کتنی

جسے بے نام ہونا تھا بالآخر خاک میں مل کر
عزیزِ جاں رہی وہ کیمیائے زندگی کتنی

کرم آرائیاں اُن کی کبھی تو غور فرمائیں
ہمیں برباد ہونے کے لئے فرصت ملی کتنی

رہی محرومِ نظارہ رنگین جلووں کے دامن میں
لئے بیٹھی تھی اُمیدیں نگاہِ آگہی کتنی

جلیل عرشی

○

زمانے کی ستمگاری تو دیکھو
ہماری اُن سے بیزاری تو دیکھو

دل آزاری کی باتیں کر رہے ہیں
یہ غمخواروں کی غمخواری تو دیکھو

جُھکی جاتی ہیں الزامِ وفا پر
نگاہوں کی طرفداری تو دیکھو

بُرا ہے حال ناموسِ وفا کا
حسینوں کی ستمگاری تو دیکھو

اُٹھاتے ہیں ہم اُن کے نازِ بیجا
ہماری ناز برداری تو دیکھو

بہاریں چاکِ داماں پہ تصدق
جنوں کی میرے گُلکاری تو دیکھو

بڑا ہی عیب ہے معصوم ہونا
محبت کی گنہگاری تو دیکھو

ہوا جاتا ہے دل پامال عرشی
کسی کی شوخ رفتاری تو دیکھو

خلش بڑودوی

○

فضائے میکدہ کیا خوش گوار ملتی ہے
طبیعتوں کی خزاں کو بہار ملتی ہے

ہے شاید اپنی تو منزل ہی آستاں تیرا
جدھر بھی جائیں تری رہگذار ملتی ہے

نہیں ہیں قائلِ گلشن مکینِ کوچۂ یار
یہاں تو کوئی بھی رت ہو بہار ملتی ہے

نگاہ ملتی ہے یوں تو ہر ایک سے لیکن
جب اُن سے ملتی ہے دیوانہ وار ملتی ہے

جنوں نے کر دیئے آسان مرحلے دل کے
جو راہ ملتی ہے اب اُستوار ملتی ہے

حیات کا کوئی اک رُخ نہیں زمانے میں
کبھی سکوں ہے کبھی بے قرار ملتی ہے

ملا نہ چین ہمیں کوئے یار میں بھی خلش
یہاں بھی گردشِ لیل و نہار ملتی ہے

شاہین الہ آبادی

○

(اعجاز صدیقی کی غزل سے متاثر ہوکر)

دھرتی کے ایک نگر میں گورے ہوں یا کالے لوگ
جیسے بھی ہوں ٹھیک ہیں سب ہی لیکن ہوں دل والے لوگ

اس سے بہتر موقع ملنا کشتی کو دشوار ہے، دیکھ
طوفانوں سے ٹکراتے ہیں طوفانوں کے پالے لوگ

نظمِ چمن کے دامن کا کچھ اور ہوا ہے گہرا داغ
جب بھی پہنچے ہیں کانٹوں تک پھولوں کے متوالے لوگ

ہم تو سچی بات کہیں گے رکھ کر ڈر بالائے طاق
جتنا بھی جی چاہیں ڈالیں خاموشی کے تالے لوگ

پھر کھولی ہیں بھیس بدل کر رات کے جادو نے آنکھیں
ننگے ہو کر ناچ رہے ہیں سر کا بوجھ سنبھالے لوگ

تیری محفل نور بکف ہے، تیرے جلوے صہبا ریز
ایسے حال میں توڑ نہ دیں کیوں اپنے خالی پیالے لوگ

چلتے چلتے جب بھی ہوا ہے دوریِ منزل کا احساس
خود ہی توڑ کے بیٹھ گئے ہیں اپنے پاؤں کے چھالے لوگ

ہر سو موت کا جال بچھائے، تیری لامحدود اڑان
شاہیں تجھ سے چھین رہے ہیں آفت کے پرکالے لوگ

مہدی پرتاپگڑھی

○

جس نے ہم کو کانٹے بخشے اُس پر پھول نثار کیا
ہم نے اس دنیا میں قائم چاہت کا معیار کیا

جوشِ جنوں پابند نہیں ہے شام و سحر کی گردش کا
دَورِ خزاں میں خونِ جگر سے ہم نے جشنِ بہار کیا

رسمِ وفا کچھ ایسی مٹی ہے مکر و دغا کی دنیا سے
جس کو میں نے اپنا سمجھا، دل پہ اُسی نے وار کیا

جاہ و جلال و ثروت سے ہم دیوانوں کا رشتہ کیا
مدت گذری اپنے جنوں نے اس سرحد کو پار کیا

ہم سے دیوانوں سے ہوا ہے عشق کا ہر معیار بلند
ہم نے فرازِ دار پہ رہ کر ذکرِ لب و رخسار کیا

مجھ کو اُسی نے دشمن سمجھا، دل کو اُسی نے زخم دیئے
زیست کی پیچیدہ راہوں کو جس کے لئے ہموار کیا

عشق کو شوریدہ سر دیکھا، حسن کو بھی پایا مغموم
پھر بھی میں نے "نذرِ محبت" دامن کا ہر تار کیا

غم کی فراوانی نے بخشی ایسی لذت اے مہدی
میں نے اپنے شہرِ دل میں غم کا کاروبار کیا

یک منظری تمثیل

اظہر افسر

تنگ شیروانی

افراد:۔

جمیل — حامد
انور — رشید
سلمیٰ — رضیہ

اور

نوکر (کریم)

(خوشحال گھرانے کا ایک خوبصورت کمرہ، وسط میں تخت بچھے ہوئے ہیں جس پر اُجلا چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکیے رکھے ہیں ایک طرف عطردان اور پانوں کی تھالی ہے۔ درمیان میں جمیل، حامد، انور اور رشید عید کے رنگ برنگے کپڑے پہنے تاش کھیل رہے ہیں، رشید کچھ بے کل بے کل سا لگتا ہے۔

—— پردہ اُٹھتا ہے: جمیل حامد اور انور قہقہے لگا رہے ہیں)

رشید۔ اچھا اچھا بہت قہقہے لگا چکے آپ جناب انور صاحب اب پتہ پھینکئے۔

انور:۔ سب سے زیادہ لطف تو اُس وقت آیا ہے جب رشید بھابی سے میں نے کہا چلو بھابی کوئی بڑا پتہ چلو تو پتہ ہے کیا فرماتی ہیں۔

جمیل:۔ کیا؟

انور:۔ سبھی کا بڑا تو ایک سا ہوتا ہے بھائی صاحب کو تنگ ہو رہی ہے۔

(قہقہے بلند ہوتے ہیں)

رشید:۔ چلئے چلئے اپنی چال چلئے۔ اب ہارنے لگے تو لگے گپیں ہانکنے، اس قدر عمدہ کھیلتی ہیں ہماری بیگم کہ میں خود کئی مرتبہ ہار چکا ہوں۔

انور:۔ اور ہار کی جھینپ چھپانے کیلئے گپیں ہانکنے لگا ہوں۔

جمیل:۔ (قہقہہ لگاتا ہے) خوب۔ بھئی ابھی تک چائے نہیں آئی نا چائے منگواؤ۔

حامد۔ آرہی ہے آرہی ہے، معلوم ہوگیا ہے کہ تم آئے ہو، بھلا تم آؤ اور گھر والے چائے کی تیاری نہ شروع کردیں۔

جمیل:۔ پھر بھی ذرا تقاضہ تو کردو، شاید عید کی گڑبڑ میں بھابی ہماری لت ہی بھول جائیں۔

حامد:۔ (بلند آواز سے) بھئی سُننا یہ لوگ، اب جانتے معلوم نہیں ہوتے چائے بنانی ہی پڑے گی۔

سلمیٰ:۔ (کہیں دُور سے) چائے؟ کون مانگ رہا ہے چائے۔

رشید:۔ م۔ میرا نام بھی لے دیجئے۔

حامد۔ یہ جمیل صاحب اور رشید صاحب ہیں۔

سلمیٰ:۔ (وہیں سے) کہیئے آج عید کا دن ہے چائے نہیں ملے گی، شیر خرمہ کے بعد دُودھ نہیں بچا۔

حامد:۔ سُن لیا آپ حضرات نے یا میرے دُہرانے کی ضرورت ہے

رشید:۔ (لمبا سانس لیتا ہے) سُن لیا صاحب، مگر وہ سوتیاں اور شیر خرمہ۔

سلمیٰ:۔ سوئیوں کا میٹھا اور شیر خرمہ ضرور ملے گا۔

رشید:۔ واہ واہ یہ بات ہوئی نا۔ بھابی زندہ باد کیا خوشخبری سُنائی ہے آپ نے۔
جمیل:۔ اُونھ اب دروازے ہی کی طرف دیکھتے رہوگے یا چال چلوگے۔
رشید:۔ ٹھہرو تو کوئی آرہا ہے۔
انور:۔ کریم ہے اور کوئی نہیں۔
(کریم ایک بڑی سی سینی لئے داخل ہوتا ہے جس میں کئی پیالے اور رکابیاں ہیں)
کریم:۔ بی بی ——
سلمیٰ:۔ چلو تم آگے آگے چلو۔
(سُرخ کپڑوں میں ملبوس لُس لُس کرتی سلمیٰ داخل ہوتی ہے)
حامد:۔ لیجئے صاحب عید کی تو اصل چلی آرہی ہے۔
انور:۔ آداب عرض ہے سلمیٰ بھابی۔
جمیل:۔ آداب عرض ہے بھابی، عید مبارک۔
رشید:۔ آداب عرض ہے بھابی، عید مبارک۔
سلمیٰ:۔ آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔ آپ سب حضرات کو بھی عید مبارک ہو۔ اوہو رشید صاحب کے تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ آج تو ایسا لگتا ہے عید ہے تو رشید صاحب کی، کیا بھڑک دار شیروانی ہے۔
رشید:۔ آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔
انور:۔ کیا آپ نے کوئی شعر پڑھا تھا جس کے جواب میں آپ اِس طرح جُھک جُھک کر تسلیمات بجالارہے ہیں۔
رشید:۔ جی نہیں میں سلمیٰ بہن کی تعریف کا شکریہ ادا کررہا تھا، آپ فرمائیں تو شعر بھی عرض کروں۔
(تان لیتا ہے) اوں۔ ناخدا . . . . . .
سلمیٰ:۔ بس بس خدا کے لئے رہنے دیجئے اِس ناخدا کو وہیں۔
رشید:۔ کیوں سلمیٰ بہن کیا ہمارے شعر اتنے بُرے ہوتے ہیں۔ دیکھئے رات ہی ہوئی ہے یہ غزل۔
سلمیٰ:۔ رشید صاحب آپ ہماری مانئے۔ غزل وزل ابھی رہنے دیجئے اِس وقت تو کچھ کھانے کی فکر کیجئے۔

جمیل:۔ میاں اب مُنہ کیا دیکھ رہے ہو کاغذ تہہ کرکے احتیاطاً سے جیب میں رکھو اور چال چلو۔
سلمیٰ:۔ نہیں اب چال وال بھی ختم کیجئے، غضب خدا کا کب سے کھیل رہے ہیں آپ لوگ۔ اب تک جی نہیں بھرا۔ ذرا جگہ بنائیے۔ کریم سینی رکھو۔
انور:۔ ارے بھابی آپ نے تو اچھا خاصا تکلف کر ڈالا۔
حامد:۔ تکلف کہاں ہے بھئی۔
جمیل:۔ یہ تکلف نہیں تو اور کیا ہے۔
سلمیٰ:۔ (ہنستی ہے) یہ — یہ تو شیر خرمہ ہے۔ لیجئے لیجئے پیالہ آگے بڑھائیے۔ رشید صاحب سویاں لیجئے۔
(انور کی طرف دیکھ کر) لیجئے۔
(کریم سب کے آگے پیالے اور چمچے رکھتا ہے حامد تاش کے پتے سمیٹ کر ایک طرف کر دیتا ہے)
انور:۔ جمیل میاں تو بغیر نمکین کھائے میٹھے کو بچا نہیں سکتے۔
حامد:۔ میاں آج کا دن عید کا ہے، آج میٹھا نہیں کھاؤگے تو پھر کب کھاؤگے۔
سلمیٰ:۔ جمیل صاحب آپ گھبرائیے مت، میں نے آپ کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔
جمیل:۔ خُوب خُوب۔ واہ بھائی۔
سلمیٰ:۔ کریم لاؤ پلاؤ لاؤ۔ اور تین پلیٹیں بھی۔
رشید:۔ سچ۔ چار منگوائیے۔
سلمیٰ:۔ (ہنستی ہے) ہاں بھئی چار لاؤ۔
(کریم چلا جاتا ہے)
جمیل:۔ واہ بھابی کیا سوتیوں کا میٹھا بنایا ہے۔ واہ۔
(چٹخارہ لیتا ہے)
سلمیٰ:۔ (حامد سے) کیوں بھئی شیر خُرمہ کیسا ہے۔
حامد:۔ بہت عمدہ ہے، واہ ——
سلمیٰ:۔ لیجئے جمیل صاحب پلاؤ بھی آگیا۔ اب آپ کو چھت کی کڑیاں گننی نہیں پڑیں گی۔
(کریم ایک قاب اور کچھ پلیٹیں لاکر رکھ دیتا ہے)
حامد:۔ رشید صاحب بسم اللہ۔

رشید:۔ بھئی واہ آپ نے تو اچھی خاصی دعوت کر ڈالی عید
کی ملاقات نہ ہوئی باقاعدہ دعوت ہوگئی۔
حامد:۔ دعوت تو ماننے ہوتا۔ آپ لوگوں کا بڑا تقاضا تھا کہ
نیا گھر بن گیا۔ ترقی مل گئی لیکن دعوت نہیں ملی شکر
ہے آج میں نے آپ لوگوں کا یہ تقاضہ بھی پورا کردیا۔
انور:۔ جناب یہ تو اضع تو بھابی کی طرف سے ہے، آپ ہماری
دو دعوتیں کیوں ہضم کرنے کی فکر میں ہیں۔
حامد:۔ خیر صاحب مزید فرمائش بھی پوری کردیں گے
اس وقت تو ہاتھ نہ کھینچئے۔
سلمیٰ:۔ لیجئے رشید صاحب۔
رشید:۔ نہیں بھابی بہت کھا چکا۔
سلمیٰ:۔ جناب انور صاحب۔
انور:۔ نہیں بھابی شکریہ۔
سلمیٰ:۔ جمیل صاحب۔
جمیل:۔ بھابی میں تو سمجھتا ہوں شاید میرے پیٹ میں
اب پانی کی بھی گنجائش نہیں رہی۔
رشید:۔ کریم ذرا سا پانی دیدو۔
سلمیٰ:۔ لاؤ سب کے لئے گلاسوں میں پانی رکھو۔
انور:۔ رشید صاحب کچھ بے چین نظر آرہے ہیں۔
جمیل:۔ میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ یہ دعوت ہے۔
رشید:۔ کیا بتائیں بھابی کیا سویاں کیا شیر خرمہ اور کیا
پلاؤ، آپ نے ہر چیز ایسی بنائی ہے کہ آدمی اپنے
پیٹ سے کچھ زیادہ ہی کھانے پر تل جائے۔
(کریم پیالے اور سینی ہٹاتا ہے)
سلمیٰ:۔ آپ کی شیروانی کا کپڑا بہت عمدہ ہے رشید صاحب۔
رشید:۔ جی ہاں وہ۔
جمیل:۔ کیسے لیا رشید صاحب آپ نے یہ۔
رشید:۔ سینتالیس روپے گز کا کپڑا ہے۔
انور:۔ کافی مہنگا ہے مگر ہے بہت عمدہ۔
حامد:۔ کہاں سے لیا ہے رشید صاحب آپ نے یہ۔
رشید:۔ کیا کریں گے صاحب آپ پوچھ کر، دوکان کا پتہ

اور نام میں بتادوں تب بھی آپ کو نہیں ملے گا۔
جمیل:۔ اچھا — وہ کیوں؟
رشید:۔ بس جب میں پہنچا ہوں تو صرف اِس ایک
شیروانی کا رہ گیا تھا۔
حامد:۔ ہوں مگر یہ شیروانی آپ کے کسی قدر تنگ معلوم
ہوتی ہے۔
سلمیٰ:۔ کسی قدر کیا خاصی تنگ ہے۔ جانے دُھلنے پر کیا
حشر ہو۔
رشید:۔ اب آپ ہی ملاحظہ فرمائیے دو مرتبہ ٹرائل دیا
ہے، میں نے درزی کو۔ اب جلدی کا موقع عید
کی نماز سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے تو مل سکی ہے
جناب شیروانی۔
انور:۔ نماز سے آدھ گھنٹہ پہلے؟
رشید:۔ جی پھر کوئی دُگنی اُجرت ادا کرنے پر۔
سلمیٰ:۔ کالر بے حد تنگ ہے کیوں؟
حامد:۔ کالر تنگ ہے؟ کالر کا تنگ ہونا تو بے حد
خطرناک ہے۔ آیئے میں آپ کو ایک قصہ سناؤں۔
انور:۔ ضرور ضرور۔
حامد:۔ دروغ برگردنِ راوی، کہتے ہیں بنگلور میں ایک
بڑا تاجر تھا اُس کی عمر ہوگی کوئی... رشید صاحب جتنی۔
رشید:۔ میری جتنی؟
حامد:۔ جی ہاں اور صاحب ایک دن اُسے اچانک یہ
محسوس ہوا جیسے اُس کے کان بجنے لگے ہیں،
آنکھیں باہر نکل پڑنے والی ہیں۔ ایسے سارے
آثار پیدا ہوگئے جیسے وہ بلڈ پریشر کا مریض ہو
بس جناب اُس نے فوراً اپنے خاندانی ڈاکٹر سے
ملاقات کی۔
رشید:۔ کیا کہا ڈاکٹر نے؟
حامد:۔ ڈاکٹر کو معائنہ کے بعد کچھ نہ سوجھا تو اُس نے
اسپیشلسٹ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ تاجر
اسپیشلسٹ کے پاس پہنچا۔ اُس نے بتایا آپ کے

گلے کے غدود بڑھ گئے ہیں اور تاجر کو فوراً اپنے اسپتال میں داخل کر لیا۔

جمیل:۔ اسپتال میں داخل کر لیا؟

حامد:۔ جی ہاں اور آپریشن کے بعد تاجر کے غدود نکال دئے۔

سلمیٰ:۔ اور آپریشن کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا؟

حامد:۔ ہاں نسبتاً اُس کی حالت بہتر ہو گئی لیکن جیسے ہی وہ اپنی فرم پر پہنچا اُسکے گلے کے عوارض پھر لوٹ آئے۔

انور:۔ خوب۔

حامد:۔ وہ دوبارہ ایک مشہور اسپیشلسٹ کے پاس پہنچا۔ اسپیشلسٹ نے بغور معائنہ کرنے کے بعد سر ہلا کر کہا اوہوں بات خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ میجر آپریشن کرنا پڑے گا۔

سلمیٰ:۔ میجر آپریشن؟

حامد:۔ ہاں آپریشن پھر کیا گیا اور وہ تاجر بظاہر تندرست ہو گیا۔

جمیل:۔ یعنی اب بھی بظاہر ہی۔

حامد:۔ جی ہاں بظاہر کیونکہ جیسے ہی وہ دوبارہ کام پر واپس ہوا اُسکی ساری تکلیفیں جوں کی توں لوٹ آئیں۔

رشید:۔ پھر؟

حامد:۔ اُس نے پھر اپنے آپ کو ڈاکٹروں کے بورڈ کے آگے پیش کیا۔ بورڈ نے دیر تک بغور معائنہ کرنے کے بعد علاج بتایا کہ وہ کلکتہ جائے اور اپنا علاج کرائے یہاں تو ممکن نہیں ہے۔

سلمیٰ:۔ کلکتے؟

حامد:۔ ہاں، صحت وسلامتی کی خاطر وہ کلکتہ پہنچا، کلکتہ میں اُسے دو ہفتے نہایت احتیاط سے رکھا گیا پھر معائنہ کیا گیا معائنہ کے بعد فیصلہ سُنا دیا گیا۔

انور:۔ کیا فیصلہ سُنا دیا گیا۔

حامد:۔ فیصلہ تھا کہ اب تک اتنے علاج کئے جا چکے ہیں کہ اب کوئی اور علاج ممکن نہیں ہے مریض صرف چھ مہینے زندہ رہ سکتا ہے۔

جمیل:۔ چھ مہینے؟

رشید:۔ چھ مہینے؟

حامد:۔ بھئی۔ اِس فیصلہ کو سُنتے ہی مریض کو ایک دھکا سا لگا مگر وہ سنبھل گیا اُس نے سوچا مجھے اب صرف چھ مہینے ہی تو زندہ رہنا ہے کیوں نہ میں بے فکری اور عیش کی زندگی بسر کروں، اُس نے بنگلور واپس پہنچ کر اپنا سارا کاروبار فروخت کر کے نقد روپیہ فراہم کر لیا۔ اور پانچ مہینوں تک مختلف مقامات کی سیر کرتا رہا۔

انور:۔ پانچ مہینوں تک۔

حامد:۔ جی ہاں ان پانچ مہینوں میں اس نے جو جی چاہا کھایا، جہاں جی چاہا گھوما، اور وقت گزرتا گیا آخر بتائی ہوئی مدّت کے ختم ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا، ایک دن وہ کسی مشہور کپڑے کی دوکان کے آگے سے گزر رہا تھا کہ شوکیس میں رکھا ایک کپڑا اُسے بہت پسند آیا۔

جمیل:۔ ایسے ہی جیسے رشید صاحب کی شیروانی کا یہ کپڑا انہیں بے حد پسند آیا ہے۔

حامد:۔ جی ہاں بالکل۔ اُس نے دل میں سوچا اب مرنا تو ہے ہی آخری آرزو دل میں کیوں رکھوں، کیوں نہ اِس کپڑے کی ایک شیروانی سلوالوں، یہ سوچ کر وہ کپڑے کی دوکان میں داخل ہوا۔ مالک دوکان سے اس نے کہا کہ بھئی کل شام مجھے شیروانی مل سکتی ہو تو اِس کپڑے کی ایک شیروانی سلوادیجئے کپڑے کے دام تم جو چاہو لو اور سلائی کی اُجرت میں دُگنی دینے کو تیار ہوں۔

رشید:۔ اوہ۔

حامد:۔ دوکان کے مالک نے کہا کل شام آپ کو شیروانی ضرور مل جائے گی آئیے اپنا ناپ دیدیجئے۔ دو آدمیوں نے ناپ لینا شروع کیا۔ ایک بولتا جاتا تھا دوسرا لکھتا جاتا تھا۔ جب گردن کے ناپ کا نمبر آیا تو ناپنے والے نے...

انور:۔ یعنی گردن ناپنے والے نے ــــــــــــ

حامد:۔ (ہنستا ہے) جی ہاں گردن ناپنے والے نے کہا ۱۴ انچ۔ تاجر نے فوراً ٹوکا نہیں نہیں میرے کالر کا ناپ

پندرہ انچ ہے سولہ نہیں ہے۔ میں ہمیشہ پندرہ انچ
کا کالر استعمال کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

سلمیٰ:۔ پندرہ انچ کا کالر؟

حامد:۔ ہاں۔ آدمی نے پھر سے گردن ناپی اور کہا نہیں صاحب
ایسا نہیں ہوسکتا، کالر سولہ انچ ہی آئے گا۔ تاجر نے
پھر کہا۔ ہرگز نہیں کالر پندرہ انچ رہے گا۔ ناپنے
والے آدمی نے فیتہ رکھ کر کہا صاحب آپ کی مرضی۔
کالر پندرہ انچ رہے گا تو آپ کے کان بجنے لگیں گے،
آنکھیں باہر اُبل پڑیں گی، دَورانِ سر شروع ہو جائیگا
اور ساری شکایتیں آپ بلڈ پریشر کی سی محسوس کرنے
لگیں گے۔ اتنا سُنتے ہی ایسا معلوم ہوا تاجر کے ذہن
سے سارے پردے ایک ایک کرکے اُٹھتے چلے جا رہے
ہیں، اتنے دنوں ڈاکٹروں کے ہیر پھیر میں پھنسنے اور
مہینوں مرض کے چکر میں مُبتلا رہنے کی وجہ [illegible]
تنگ کالر تھا۔۔۔۔

(سب قہقہے لگاتے ہیں)

سلمیٰ:۔ اور میں نے کہا آپ کی نئی شیروانی کب آئیگی۔ اب تو
عید بھی ہوگئی عبدل درزی سے تقاضہ کیجئے نا۔

حامد:۔ مل جائے گی ایک آدھ ہفتہ میں، میں نے خود عبدل
کو تاکید کی تھی کہ جلدی میں تم شیروانی خراب کردوگے،
عید پر میں کسی اور شیروانی سے کام چلا لونگا، اطمینان
سے سیو اور نہایت عمدہ تیار کرکے دو۔

سلمیٰ:۔ کہیں آپ کا کالر پندرہ انچ نہ ہو جائے۔۔۔۔

حامد:۔ سچی بات تو یہ ہے سلمیٰ کہ میں اپنا کالر پندرہ انچ ہی
رکھوانے پر بضد تھا، جب عبدل نے مجھے . . . .

سلمیٰ:۔ عبدل نے؟

حامد:۔ جب عبدل نے یہ کہانی سُنائی تو میں نے فوراً
اپنا ارادہ بدل دیا۔

(قہقہے پھوٹ پڑتے ہیں)

(ساتھ ہی دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

سلمیٰ:۔ دیکھو کریم کون ہے۔ (کریم جاتا ہے)

سلمیٰ:۔ رشید صاحب آپ فوراً اپنا کالر درست کروائیے۔

کریم:۔ (باہر سے) رضیہ بی بی ہیں، رشید صاحب کی بیگم صاحبہ۔

سلمیٰ:۔ بھئی رضیہ اِدھر آجاؤ، اِس طرف۔۔۔۔

(رضیہ ہرے کپڑوں میں ملبوس داخل ہوتی ہے)

رشید:۔ لیجئے سُرخ مرچ موجود تھی ہری بھی آگئی۔

انور:۔ چُپ رہو یار۔ رضیہ بہن عید مبارک۔

رضیہ:۔ آداب عرض ہے۔ انور صاحب اور جمیل صاحب عید مبارک۔

حامد، جمیل:۔ عید مبارک بھئی عید مبارک۔

رضیہ:۔ آپ عجیب ہیں یہاں آکر بیٹھ رہے۔

رشید:۔ مجھ سے کہہ رہی ہو؟

رضیہ:۔ اور [illegible] سے کہہ رہی ہوں۔

رشید:۔ کیوں کہ کیا [illegible]؟

رضیہ:۔ [illegible] آپ کا انتظار کر رہا ہے اور آپ . . .

رشید:۔ [illegible] ٹھیک ہے، چلو چلو۔

سلمیٰ:۔ [illegible] رضیہ بہن بیٹھو تو، سویّاں
اور شیر خرمہ تو چکھتی جاؤ۔

رضیہ:۔ پھر آتی ہوں بہن، اِس وقت تو انہیں بلانے آئی ہوں
میرے چھوٹے بھائی سرور کو تو تم جانتی ہو نا۔۔۔

سلمیٰ:۔ ہاں ہاں . .

رضیہ:۔ وہ عید ملنے آیا تھا۔ کھانا کھا کر سو رہا تو یہ اُسکی
شیروانی ڈانٹ کر یہاں چلے آئے۔

رشید:۔ بیگم بیگم کیا کر رہی ہو۔

رضیہ:۔ اب وہ جانے کے لئے تیار ہے آپ یہاں گپیں
ہانک رہے ہیں، چلئے۔

(رضیہ رشید کا بازو پکڑ کر لے جاتی ہے)

رشید:۔ (چہرہ احباب کی طرف ہے) اچھا بھئی دوستو
خدا حافظ عید مبارک۔

رضیہ:۔ چلو چلو، بہت عید مبارک ہو چکی۔

جمیل، انور:۔ عید مبارک، عید مبارک۔

(سب قہقہے لگاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

شاعر بمبئی

مکتوبات

ضیا حسنی ——— فتحپور (یوپی)

"شاعر" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔

"شاعر" جلد آئے یا بتاخیر، میں اُسے رسالوں کے درمیان امتیازی درجہ دیتا ہوں۔ اُس کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔

آپ نے "تجربات" کا اختتام اپنے جس شعر سے کیا ہے اُس نے مجھے کافی متاثر کیا۔ کاش! آپ اسقدر جہدِ مُسلسل کے بعد "شاعر" کی طرف سے یکسو ہوتے۔ اُس کی بقا اور تحفظ کے متعلق سوچنا بہت ضروری ہے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کا خطبۂ صدارت پسند آیا۔ علامہؒ مرحوم کے دوسرے خطبات بھی شاملِ اشاعت کرتے رہیے تاکہ اِن مفید اور معرکہ آرا خطبات کو پڑھنے کا موقع مِل جائے۔ سیماب کا یہ ارشاد غور طلب ہے۔

"اب ہر شاعر اپنی جگہ سوچے کہ اُسے خس و خاشاک کی طرح مٹ جانا ہے یا مِٹتی ہوئی دنیا کو سنبھالنا اور باقیاتِ انقلاب کے ساتھ دنیا میں باقی رہنا ہے۔ اُردو شاعری کے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ شاعر کی آواز، وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہو۔"

دوسرے مقالات بھی اچھے ہیں۔ "جرائم کی چند عبرتناک داستانیں" دلچسپی کے ساتھ پڑھیں۔ "نظام حصّہ" کافی خوبصورت ہے۔ کرشن چندر، کوثر چاندپوری، گوربچن سنگھ اور اکرام جاوید کی کہانیاں خاص طور پر پسند آئیں۔

امیر چند بہار ——— لُدھیانہ

دسمبر ۱۹۶۳ء کے "شاعر" میں "نسیم مغرب" پر آپ کا تبصرہ باعثِ مسرّت ہوا تھا۔ میرے لئے یہ بات باعثِ صد افتخار ہے کہ آپ جیسے صاحبِ نظر، سخن فہم اور نکتہ شناس نے میری کاوشوں کو سراہا۔ میں یہ کہنے کے لئے معافی چاہوں گا کہ میں آپ کی پیش کردہ تمام تجاویز سے پُوری طرح متفق نہیں ہوں۔

"میں بھی تری طرح ہی سرِ پُرغرور ہوں"

تعقیدِ لفظی سے بچنے کے لئے آپ نے تجویز کیا ہے کہ "تیری ہی طرح" ہونا چاہیئے۔ اِس صُورت میں مصرع یوں ہوگا ؎

میں بھی تری ہی طرح سرِ پُرغرور ہوں

میں اپنے اُستادِ مکرم ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "طرح" کا یہ تلفظ غلط سمجھتا ہوں۔ مثالیں تو دونوں قسم کی مِل جائیں گی لیکن "رے" متحرک ہی فصیح ہے۔ بول چال میں سب "رے" کو متحرک بولتے ہیں نیز "رے" ساکن ہو تو طرح کے معنی بنیاد ہیں۔ اصل مصرعے میں "ہی" بظاہر بے ضرورت معلوم ہوتا ہے، مگر بے محل نہیں، ایسے حشو کہنا مشکل ہے۔

اِسی طرح آپ نے نظم "آرام طلب" سے اِس شعر کا حوالہ دیا ہے ؎

ہر چیز کو جب ہوتا ہے آرام میسّر
انسان پریشاں ہی کیوں رہتا ہے اکثر

پہلے مصرع میں "ہوتا ہے" کے بعد "جب" لانے سے مصرع زیادہ چُست معلوم ہوتا ہے تو آپ کے ذوق پر اعتماد کرتے ہوئے میں یہ خفیف تبدیلی کرنے کو تیار ہوں۔ مگر جب آپ فرماتے ہیں کہ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیئے ؎

انساں ہی پریشان یہ کیوں رہتا ہے اکثر

تو یہ تبدیلی کھٹکتی ہے۔ کیونکہ اس سے دو سُقم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ترکیبی صورت کے بغیر انسان میں نون کا اعلان ہونا چاہیئے کیونکہ بول چال میں نون کا اعلان ہوا کرتا ہے۔ دوسرے پریشان کے بعد "یہ" سراسر بیکار، نہایت بے محل اور مضحکہ خیز ہے۔ یہ حشوِ قبیح ہے۔ اِن فنی نکات سے قطع نظر یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اصل انگریزی نظم میں ٹینی سن نے لفظ ALONE کا استعمال TOIL کے بعد کیا ہے نہ کہ MAN کے ساتھ۔ اصل سطر یوں ہے۔

When all things rest, why should man toil alone.

میں نے بھی ترجمے میں "آرام" کے مقابلہ میں "پریشان" پر زور دینے

کی غرض سے 'ہی' کا استعمال پریشان کے بعد کیا ہے۔ میں تعقیدِ معنوی کو سقم سمجھتا ہوں، جب شاعر برمحل الفاظ میں مفہوم واضح کرنے سے قاصر رہ جائے۔ آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ علامہ اقبال کے اِس شعر میں 'تو' کا استعمال برمحل نہیں ہے۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

یہاں گفتار اور کردار کا تقابل ہے۔ لہٰذا "گفتار کا تو یہ غازی بنا" ہونا چاہیے تھا۔

خاور بانکوٹی ——— رتنا گری

سالنامہ ۶۵ء ——— "شاعر" کی گزشتہ خاص اشاعتوں کے مقابلے میں بعض اعتبارات سے منفرد ہے۔ قبلہ مرحوم علامہ سیماب کا خطبہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ علامہ نے اب سے پچیس ۲۵ سال پہلے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ آج بھی "وقت کی آواز" معلوم ہو رہا ہے۔

اِس بار مقالات معمول سے زیادہ جاندار اور وزنی ہیں۔ نظمیں اور غزلیں سب کی سب پڑھ لی ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئی جسے "دوسرے درجے" سے کم میں رکھا جا سکے۔ افسانے ہنوز زیرِ مطالعہ ہیں ــ کرشن جی کا "جامن کا پیڑ" ــــ جسے میں نے اب تک چھ بار پڑھا ہے ــــ مجھے یقین ہے کہ دوسرے رسائل و جرائد میں کثرت سے نقل کیا جائے گا۔ کرشن جی کس رسالے کے لئے نہیں لکھتے مگر ابھی سب سے تیکھی کہانیاں "شاعر" کے خاص شماروں ہی میں زیادہ نکلتی ہیں ــ اور یہ۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست"

آزاد (جگن ناتھ) نے اپنی نظم "اقبال" میں "عظمت سے منکر ہونا" اور "دولت سے منکر ہونا" لکھا ہے۔ مجھے اِس سے شدید اختلاف ہے ــ "کا منکر ہونا" فصیح ہے۔ آزاد بڑی آسانی کے ساتھ "سے" کی جگہ "کے" رکھ سکتے تھے۔ اُن کی نظم کے تیسرے بند میں "آنسوئے گردوں" ــــ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

شاعری

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

میری حدیثِ عمرِ گریزاں

از — آنند نرائن ملّا

ادھر آنند نرائن ملّا کا [illegible]

اس گوشے کا بڑا [illegible] ہی
ہے۔ ویسے اُن کے چیف جسٹس [illegible]
شاعرانہ قدر کی وجہ سے بھی اُن کی قدر و منزلت ہوتی ہے [illegible] اُردو
دوستی اور اُردو شخصیت کی ایک دلنواز [illegible]
کے لئے [illegible]

ایک عمر کی مسلسل ریاضت [illegible] عظمت کے اعتراف
پر مجبور کرتی ہے۔ اُردو کے موجودہ [illegible]
[illegible] متجاوز ہے [illegible]
اپنے طویل [illegible]
اقدار کے درمیان اُن کے فکر و شعور نے جو بالیدگی اور حقیقت
پسندی اختیار کی، [illegible] اُن کی
شاعری [illegible]
جیسی کہ [illegible] لکھنؤ اسکول کے [illegible]
[illegible]
اسکول سے قریب کر دیتی ہے۔ [illegible] اپنے
ہی دَور کی نمائندگی کرتا ہے۔

اُن کا پہلا مجموعۂ کلام [illegible] کچھ
تارے اور یہ تیسرا مجموعہ میری حدیثِ عمرِ گریزاں [illegible]
پچھلے دونوں مجموعوں کا انتخاب بھی [illegible]
اس تازہ مجموعۂ کلام سے اُن کے شاعرانہ [illegible]
ہے مجموعے [illegible]
نثریہ لکھا ہے اس سے اُن کی [illegible] نظریات کو سمجھنے
میں تو آسانی ہوتی ہے لیکن [illegible] کے امکانات بھی
پیدا ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کی جس منزل پر پہنچ چکے ہیں، وہاں تو
فیصلہ قاری ہی کر سکتا ہے۔ جو نظریاتی بحثیں اُنھوں نے اُٹھائی
ہیں اُن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر اتنا ہی لکھ دیتے کہ
میں نے [illegible] حقائق سے محبت کی ہے۔ یا "میری شاعری میں
ایک دردِ مشترک ہے" تو کافی تھا۔

"میری تابانیِ کردار و عمل باقی ہے" سے کون انکار کر سکتا تھا۔ "کچھ
اپنا غم، کچھ غمِ جہاں ہے" کا پتہ چلانا بھی دوسروں ہی کا کام ہے۔
آج کے زمانے میں "مرعوبیت" کی دعوت قبول کرنے کے لئے کوئی
تیار نہیں ہو سکتا۔

ملّا صاحب اُردو کے مُسلّم الثبوت شاعر ہیں۔ جس شاعری
سے حال و مستقبل کی روشنی پھوٹنے لگے، جو حیات و کائنات کے
سائنس کو اپنے اندر سمو لینے کی قوت پیدا کر لے، اُسے کہاں تک
فراموش کیا جا سکتا ہے؟! ۔ بہرحال "میری حدیثِ عمرِ گریزاں"
ایک قابلِ قدر مجموعۂ کلام ہے۔ ملّا صاحب نظمیں بھی کہتے ہیں اور
اس مجموعے میں نظمیں غزلیں دونوں شامل ہیں۔

ملّا صاحب کی شاعری کا اہم پہلو وہ ہے، جہاں اُن کا انداز
مسائلی ہو جاتا ہے۔ اُردو غزل کی گھسی پٹی ڈگر پر چلنے والے
شعراء میں اُن ہی کو امتیاز حاصل ہے جو اپنے دَور کے حقائق
کو محسوس بنا کر پیش کر رہے ہیں، پوری فنی احتیاط اور چابکدستی
کے ساتھ ۔

نعرۂ انقلاب گرم میں نے بھی یہاں سُنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن ہے دُور دُور

پھولوں میں نہیں وہ خندہ لبی، نکہت نفسی، شبنم دہنی
وہ دورِ سموم و برق آیا تہذیبِ گلستاں بھول گئے

دیکھئے بہ کسی کا نہ اس میں تصور تھا
دو دوستوں کا مل کے بچھڑنا ضرور تھا

زیست کی تیرگی میں شمع کوئی — دل سے تابندہ تر نہیں ملتی

ہر جہلِ گذشتہ کی ہے مِٹا مُتلاشی
دانائیِ امروز سے گھبرائی ہوئی سی

انتظارِ فصلِ گُل میں کھو چلے آنکھوں کا نُور
اور بہارِ باغ لیتی ہی نہیں آنے کا نام

تھے گرفتارِ قفس، اب ہیں اسیرِ آشیاں
شاید آزادی ہے بس زنداں بدل جانے کا نام

سمجھ میں کچھ نہیں آتا، بھلا کیا ہے بُرا کیا ہے
بدل لے دَورِ نو قدریں، مگر پہچان نہ دے

تاریخِ بشر بس اتنی ہے ہر دَور میں پُوجے اِس نے صنم
جب آئے نئے بُت پیشِ نظر، اصنام پُرانے بھُول گئے

آزاد جہاں میں کوئی نہیں، سب قیدی ہیں بس فرق یہ ہے
کس نے کتنے اِس زنداں کی دیوار میں روزن چھوڑ دیئے

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہِ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیئے

گردوں کے ستارے بجھنے دو، دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذرّوں سے شعاعیں پُھوٹیں گی، مٹی کی خدائی باقی ہے

سرسری طور پر یہ چند اشعار انتخاب کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ "میری حدیثِ عمرِ گُریزاں" میں کثرت سے اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔
جہاں تک مُلّا صاحب کے اسلوب کا تعلق ہے وہ اُن کا اپنا تو ہے لیکن ہر جگہ یکساں طور پر دلنشیں نہیں کہیں وہ "سحر" بن جاتا ہے اور کہیں سخت اُکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ نہایت معمولی اسلوبِ فکر کے اشعار بھی مجموعے میں مل جاتے ہیں۔ ایسے اشعار کو نظری کر دینا ہی مناسب تھا۔

مُلّا صاحب کی نظمیہ شاعری ایک گہری تنقیدی نظر چاہتی ہے اور اُس پر شرح و بسط کے ساتھ لکھنا ضروری ہے۔ در اصل اُنکی نظموں کا مجموعہ الگ ہی چھپنا چاہیے تھا۔ اِس مجموعہ میں اُن کی کئی معرکہ آرا نظمیں شامل ہیں جو غزلوں سے کہیں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ آخری تین نظمیں "بُوڑھا مانجھی" "اور اک دن انسان جاگے گا" "لہو کا ٹیکہ" اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔
مُلّا صاحب ایک رجائیت پرست پختہ مشق شاعر ہیں۔ بلکہ بیحد دیرینہ مشق بھی۔ ظاہر ہے فن پر اُن کی نظر گہری ہونی چاہیئے اور ایسا ہی ہے۔ پھر بھی بعض مصرعوں، ترکیبوں اور لفظوں کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ کہنے کی گنجائش نکلتی ہے۔ اگر اِس گنجائش کو مُلّا صاحب اپنی توجہ سے خود ہی ختم کر دیتے تو اچھا تھا۔ اُن کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

طُوفانِ دل ہے اب آرمیدہ — لے آئے فصلِ خزاں و دیدہ

اِس بحر میں ذیل کے مصرعے محلِ نظر ہیں۔

(۱) بے حرف و بے صوت پیغامِ اُلفت
(۲) توڑی گئیں کتنی کلیاں، کھلا تب
(۳) کیا جانے کب ٹوٹ جائے یہ تارا
(۴) شب تک گماں صبح کا ہر عقیدہ

اُمید کہ مُلّا صاحب اِس گذارش کا بُرا نہ مانیں گے۔ وہ چونکہ خود فن کا احترام کرتے ہیں اِس لئے یہ بات عرض کی گئی ہے۔
"میری حدیثِ عمرِ گُریزاں" نہایت دیدہ زیب طبع ہوئی ہے بڑا سائز ہے۔ آلِ احمد سرُور اور سیّد احتشام حسین کی مختصر رائیں بھی اِس میں شامل ہیں۔ اِس مجموعہ کو ساہتیہ اکیڈمی اور اُتر پردیش کی طرف سے انعامات ملے ہیں۔
۳۶۰ صفحات۔ قیمت دس روپیہ پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ۲۔ چینا بازار مارکیٹ۔ لکھنؤ (یو۔پی)

نُزہتِ دل

از ——— قہر مہسلائی

قہر مہسلائی سے بیرونی ادبی حلقے زیادہ واقف نہیں ہیں لیکن بمبئی اور کوکن کے علاقوں میں وہ کافی معروف ہیں۔ مہسلہ ضلع قلابہ کا ایک مقام ہے۔ قہر صاحب وہیں پیدا ہوئے۔ ایک ممتاز علمی اور دینی ذوق رکھنے والے خاندان میں پرورش پائی نتیجے میں علم کی دولت اور دین کی نعمتوں سے سرافراز ہوئے۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک اعلیٰ عہدے تک پہنچے اور دینی لگاؤ نے وہ مجد و شرف بخشا جو انسان کو انسانیت کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔
نُزہتِ دل اُن کے کلام کا مجموعہ ہے اور اُن کے ذوق و کردار کا

آئینہ دار۔ شاعری سے قطع نظر اُن کے افکار و خیالات کی پاکیزگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ نزہتِ دل ۳۴۴ صفحات کا مجموعہ ہے۔ اس میں حمد و نعت۔ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ ابتدا میں حمدیہ کلام ہے۔ پھر ۱۴ نعتیں ہیں۔ نعتیہ کلام کے یہ منتخب اشعار ارادت و عقیدت اور شاعری ہر اعتبار سے اچھے ہیں ؎

بڑے مرتبے کی زمیں ہے مدینہ زمیں پر بہشتِ بریں ہے مدینہ

عرب کی خاک پر کرتے ہیں سجدے آسماں والے
یہ محبوبِ دو عالم کی گلی معلوم ہوتی ہے

جو الفقر فخری کا پیغامبر ہے غلامی پہ اُس کی فدا بادشاہی

اسی در پہ آتے ہیں بگڑی بنانے زمانے کے ٹھکرائے، قسمت کے مارے

دو عالم کے ہادی دو عالم کے رہبر دو عالم کے سرور محمدؐ ہمارے

پھر چشمِ تمنا کو ہے سُرمہ کی ضرورت
لا بادِ صبا گردِ مدینہ کی گلی سے

قاب قوسین کے یہ معنی ہیں جلوت اُنکی ہے خلوت اُنکی ہے

موت کیا ہے ایک موجِ سلسبیل زندگی کیا ہے خس و خاشاک ہے

دردِ دل، حُسنِ عمل، شانِ خلوص مردِ مومن کی یہی املاک ہے

مہر نعتِ جانفزا اصلِ علیٰ
ہر نفس گویا درودِ پاک ہے

غزلوں کی تعداد اکیاسی ہے اور غالباً ان میں نئی پرانی، ابتدائی سب ہی غزلیں شامل ہیں۔ اِن کا انتخاب بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اِن تمام غزلوں کے مطالعہ کے بعد مہر صاحب کے جو اچھے اشعار سامنے آئے وہ ہدیۂ قارئین ہیں۔

یہ شبنم اور یہ سُورج کی کرنیں عجب سرمایۂ تابندگی ہے

اے مہر اپنی اپنی طبیعت کی بات ہے
وہ خوش ہیں اپنی جیت میں، میں اپنی ہار میں

تخریب ہی تو اے دل تعمیر کی بنا ہے
وقفِ دوام ہو جا ہستی مٹا مٹا کے

معمول ہے گلزاروں کا جاتی ہے بہار آتی ہے خزاں
موسم کی طرح ہر موسم میں جذبات بدلتے رہتے ہیں

گر گر کے سنبھلنے والوں کو خطرہ نہیں باقی گرنے کا
تخریب کی ٹھوکر کھانے میں تعمیر کے ساماں ملتے ہیں

میسّر ہوا مہر کو بعدِ یدوش مگر شب کے تاریک پردے اُلٹ کے

نہیں مسافرِ ہستی کو اذنِ منزل کا
کہ رہگذر ہے یہ دُنیا قیام گاہ نہیں

ہم اپنی ہر اک بھول پہ اِس واسطے خوش ہیں
ہر بھول سے وابستہ ہے اک حسین یاد

آئینہ کائنات کا دیکھا صورتِ آدمی نظر آئی

نکھرتی جا رہی ہے زندگانی مصیبت ہوگئی شاداب شاید

کب ہے خوشی کا مستحق جس کو کوئی الم نہیں

آدمیت نہیں کچھ اس کے سوا آدمی آدمی کے کام آئے

خزاں بھی ہے تمہیدِ فصلِ بہاری مصائب ہیں بامِ ترقی کے زینے

حیات و موت جدا ہے لئے ہیں دو راہیں
یہ سلسلہ ہے رسائی و نارسائی کا

گلوں کا فرش، عنادل کے گیت، رقصِ نسیم
بہار کیا ہے خزاں کی وداع کے جلسے

دینے والے نے ہاتھ روک لیا دیکھ کر میری تنگ دامانی

حیاتِ دو روزہ سفر ہی سفر ہے وہیں جا رہے ہیں چلے تھے جہاں سے

یہ اشعار تجربے، مشاہدے اور فکر کے حامل ہیں۔ فن کے اعتبار سے بھی اُنھیں بھرپور کہا جا سکتا ہے۔ اگر غزلوں کے تمام اشعار اسی نوع کے ہوتے تو بہت اچھا تھا۔

آخری حصے میں اہم طویل و مختصر نظمیں ہیں، جن کی حیثیت بیانیہ ہے۔ ان میں مہر صاحب نے یہ التزام بھی رکھا ہے کہ ہر نظم کے آخر شعر میں اُن کا تخلص آئے۔ عام طور پر نظموں میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ساقی دائرے۔ بچوں کی مناجات۔ کاغذ کے پھول اچھی نظمیں ہیں اور سب سے اچھی نظم شہادت ہے۔ اِس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ کوکن کے شعرا میں مہر صاحب ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ فن اور اُس کے اظہار پر مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ ابتدائی صفحات میں مہر صاحب نے اپنی زندگی کی کہانی پیش کی ہے۔ "نزہتِ دل" کا دیباچہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے لکھا ہے۔

کتاب مجلّد ہے اور صاف ستھری چھپی ہے۔ قیمت چار روپیہ۔
ملنے کا پتہ۔ ایس۔ آئی قادری۔ فاطمہ منزل ۲۵ اجپل روڈ۔ بمبئی ۹

ادارہ

محفل اپنی

تازہ شمارہ

سالنامہ "شاعر" کے بعد تازہ عام شمارہ حاضر ہے۔ اِس میں کئی ایسے مضامین، نظم و نثر شامل ہیں جو سالنامہ میں شریک نہ ہوسکے تھے۔ ابھی اِس سلسلے کی کئی چیزیں شائع ہونے سے باقی رہ گئی ہیں جو آئندہ شمارہ میں پیش کی جائیں گی۔ "شاعر" کے معیار کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اُس کے نئے اور پُرانے قلمکار اُس کے معیار کی ضمانت ہیں۔ عرض نہیں کیا جا سکتا کہ کیسی اچھی اچھی تخلیقات کافی بڑی تعداد میں جمع ہیں۔ سوال "شاعر" کے حجم کا ہے۔ موجودہ قیمت میں اِس سے زیادہ صفحات نہیں دئے جا سکتے۔ اِس وقت "شاعر" کے صُوری حُسن میں اضافہ ہونا چاہئے، اُس کے کچھ صفحات بالتصویر آفسٹ پر چھپنے چاہئیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُسے پابندیٔ وقت کے ساتھ مارکیٹ میں آنا چاہئے۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح ہو؟ "شاعر" سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ایسے وسائل پیدا کردیں تو یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اِس سلسلے میں ایک اپیل تو کی جارہی ہے۔ دیکھئے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

سالنامہ کی مقبولیت

نہایت تاخیر سے نکلنے کے باوجود سالنامہ اُسی طرح مقبول ہوا جس طرح اِس سے پہلے اُس کے خاص نمبر ہو چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اِس بار وی پی معمول سے زیادہ واپس آئے اور "شاعر" کو کافی نقصان پہنچا۔ اِسے "شاعر دوستی" تو نہیں کہا جا سکتا۔!!

ایک نہایت ضروری تردید

ماہنامہ "شمعِ ادب" سُلطان پور "شفا نمبر" کے صفحہ ۱۹۴ پر ایک قطعہ شائع ہوا ہے۔ جس سے ہند و پاک کے تمام تلامذۂ علامہ سیماب اکبرآبادی کی سخت توہین ہوتی ہے۔ چونکہ وہ قطعہ میرے مضمون کے آخر میں درج ہے اور اُس پر قطعہ نگار کا نام نہیں ہے، اِس لئے مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ میں واضح طور پر یہ تردید کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ قطعہ ہرگز میرا نہیں ہے۔ شفا گوالیاری کا تو سوال ہی کیا، میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی قصیدہ خوانی نہیں کی اور نہ ایسی مہمل اور مُبالغہ آمیز شاعری کی مجھ سے توقع کی جا سکتی ہے۔ میرے رنگ و آہنگ کو اہلِ علم اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ میں تلامذۂ سیماب کی اِس توہین پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ شفا گوالیاری اور ادارۂ "شمعِ ادب" کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ قطعہ نگار کا نام ظاہر کریں۔

اعجاز صدیقی

رفتار ـــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

نریش کمار شاد کی کتاب پر ایک ہزار انعام

چنڈی گڑھ۔ پنجاب کی زبانوں سے متعلق محکمے نے اُردو کے مشہور شاعر نریش کمار شاد کی کتاب "مطالعے" کو اس سال کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے اُس پر ایک ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان کیا ہے۔

یو۔ پی اسمبلی کے دو سو ممبران اُردو کے حق میں

لکھنؤ۔ ۵ مئی۔ پچھلے دنوں پارلیمنٹ کے ایک سو چار ممبران نے اُردو کے حق میں ایک یادداشت وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اب تازہ اطلاع یہ ہے کہ یو۔ پی اسمبلی کے دو سو ممبران کی طرف سے ایک یادداشت صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو پیش کی جائے گی۔ اس یادداشت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اُردو کو یو۔ پی کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اس یادداشت پر کانگریس۔ پی۔ ایس۔ پی، جن سنگھ۔ ری پبلکن۔ کمیونسٹ، سوتنتر پارٹی، سن یکت سوشلسٹ اور آزاد ممبرانِ اسمبلی کے دستخط ہیں۔

کوثر چاندپوری بھوپال سے دہلی چلے گئے

اُردو کے نہایت مقبول و مشہور ادیب، افسانہ نگار کوثر چاندپوری جالیس سال تک بھوپال میں مقیم رہنے کے بعد اب مستقل طور پر دہلی چلے گئے ہیں۔ آپکی طبی خدمات ہمدرد ریسرچ لیبارٹیریز دہلی کے لئے حاصل کر لی گئی ہیں اور آپ کو اس کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا ہے۔ بھوپال میں آپ کی روانگی کے سلسلے میں کئی الوداعی جلسے ہوئے۔ ایک جلسہ میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے بھی شرکت کی، اور آپ کی علمی و ادبی اور طبی خدمات کو سراہا۔ واضح رہے کہ کوثر چاندپوری مدھیہ پردیش انجمنِ ترقیٔ اُردو کے صدر بھی تھے۔

ادیبوں کی شادیاں

○ پچھلے دنوں مدیرِ "پیکر" اعظم راہی کی شادی مدیرۂ "پیکر" بادیہ شبنم کے ساتھ بہت سادہ طریقہ سے انجام پائی۔ شادی میں دوست احباب کے علاوہ مقامی ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی۔ مدیرۂ "پیکر" اعظم راہی شادی کے بعد بمبئی منتقل ہو گئے ہیں۔ اب ماہنامہ "پیکر" بمبئی سے شائع ہوا کرے گا۔ توقع ہے کہ ستمبر ۶۵ء کے پہلے ہفتہ میں "پیکر" نئے انتظامات کے ساتھ شائع ہو جائے گا۔

○ علی حیدر ملک ایم اے (رکن ادارۂ مورچہ گیا) کی شادی ڈاکٹر غلام قادر صاحب موضع ہرکھو ضلع پٹنہ کی صاحبزادی کے ساتھ ۲۲ مئی ۱۹۶۵ء کو نہایت اہتمام سے ہوئی۔ بہار کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے شادی میں شرکت کی۔

ادیبوں کو صدمات

مرزاپور۔ ۶ مئی ۱۹۶۵ء بروز جمعرات شام کو پانچ بجے بیت حرمت الاکرام کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔ اُسی دن شب میں مرحومہ کی تدفین عمل میں آئی۔

۱۴ مئی کو ظرافت قریشی جھنڈاروی کے چھ سالہ تندرست بچے ممتاز احسن کا صرف دو دن انفلوئنزا میں مبتلا رہ کر انتقال ہو گیا۔

ادارۂ "شاعر" دونوں ادیبوں کے غم میں برابر کا شریک ہے اور اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔

شہزادہ داراشکوہ کی لائبریری کا نیلام

آگرہ۔ ۱۹ مئی۔ شہنشاہ شاہجہاں کے بڑے صاحبزادے داراشکوہ کی طرف سے جس مکان کو بطور لائبریری استعمال کیا جاتا تھا۔ اب اُسے فروخت کیا جانے والا ہے۔ یہ مکان ساحل جمنا پر واقع ہے اور فی الحال یہاں میونسپلٹی کے دفاتر ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس مکان کے تقریباً دس لاکھ روپیہ حاصل ہوں گے۔

پرنٹر پبلشر و مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل تائن آرٹ لیتھو پریس ۳۳۔ بلوردھی اسٹریٹ بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

The "SHAIR" Bombay 8
(36 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیر غم	(عزائی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر ، شاعـــر ، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸

Printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

اردو کا چھتیس ۳۶ سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جولائی ۱۹۶۵ء

بمبئی

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالک غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپیہ	۱۶ شلنگ	۱۰ آنے (۶۲ پیسے)

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی نمبر ۸ - بی سی

صافی
سے خون بھی صاف
اور جلد بھی صاف
ہمدرد
دہلی — کانپور — پٹنہ

ترتیب

شاعر بمبئی

جولائی ۶۵ء

افکار ادارہ

مقالات

نظمیں

افسانے

غزلیں

مکتوبات

جلد ۳۶ ——— شمارہ ۵-۶-۷

ایک اپیل

"شاعر" کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت

ہندستانی زبانوں کے جرائد ایک نئے موڑ سے گذر رہے ہیں ـــــ
پرانے طریقے دم توڑ چکے ہیں۔ اُردو کے جرائد بھی ایک نیا
حُسن و معیار چاہتے ہیں

"شاعر" کا مسلسل چھتیس سالہ سفر اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی طویل علمی و ادبی خدمات کا سب ہی کو اعتراف ہے۔ "شاعر" اب ایک قومی مقصد بن چکا ہے اور اُردو زبان کے لئے وجہِ فخر و نازش ہے۔ اِس کی ترقی و بقا کے لئے وہ سب کچھ ہونا چاہیئے۔ جس کی ایک قومی ادارے کو ضرورت ہوتی ہے۔

اِس وقت اُردو کے تقریباً سب ہی جرائد اپنی قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں
لیکن ہم نہیں چاہتے کہ "شاعر" کی قیمت بڑھا کر اُس کے حلقے کو محدود کیا جائے۔
صحت مند ادب کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی سعی کرنا ہمارا مطمحِ نظر ہے۔

اِس عظیم مقصد اور "شاعر" کو نیا حُسن و معیار دینے کے لئے ہم دردمندانِ اُردو سے صرف دس ہزار روپے کی فراہمی کی درخواست کرتے ہیں۔ اپنے قدیم خدمت گذار اداروں کیلئے اِس قسم کی اعانتیں عام طور پر کی جاتی رہی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ "شاعر" کے لئے اُردو دوست آگے نہ بڑھیں۔

"شاعر" کے پڑھنے اور پسند کرنے والوں میں ایسے مُخَیّر اور ادب نواز حضرات موجود ہیں، جو اِس رقم کا انتظام فرما سکتے ہیں۔ یہ رقم ایک شخص بھی دے سکتا ہے اور دس حضرات مل کر بھی اِس کارِ ادب میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ بہرحال یہ "شاعر نوازی" تاریخِ ادبِ اُردو میں اُن کے نام کو زندہ رکھے گی۔ اور "شاعر" کی بنیادوں کو استحکام عطا کرے گی۔

کم رقمی اعانتیں

بعض احباب کا مشورہ ہے کہ "شاعر" کے لئے کم رقمی اعانتیں بھی قبول کی جائیں۔ چنانچہ کم سے کم اعانت کی رقم ڈھائی سو روپے مقرر کی گئی ہے۔

اعجاز صدیقی
مدیر شاعر

جُرعات:۔

یہ عرضداشتیں ـــ!!

اُردو تحریک اب ایک ایسے نُقطہ پر پہنچ گئی ہے، جہاں کوئی تحریک عوامی دلچسپیوں کو اپنے گرد جمع کرلیتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ حقیقتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس سے پہلے یہ صورتِ حال کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اُردو کی حق طلبی کی کوشش تو مُسلسل سترہ سال سے کی جاتی رہی ہے لیکن وہ ہمدردیاں جو اِسے اب مِل رہی ہیں، پہلے نہ مل سکی تھیں۔ آج مُلک کی تقریباً سب ہی چھوٹی بڑی سیاسی جماعتیں، مختلف مذاہب اور فرقوں کے ممتاز لوگ اُردو کے ساتھ کی گئی حق تلفیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں ہمارے ساتھ ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اِس غیر جمہوری رویّے کی سب ہی مذمت کر رہے ہیں۔ اب عام طور پر انگریزی اخبارات میں بھی اُردو کی حمایت اور اُس کے مقدمے پر لکھا جانے لگا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ لسانی آمریت میں اُردو زبان کو دبانے اور نقصان پہنچانے کی شعوری کوششوں کا اِس مُلک کے جمہوریت پسند احساس رکھتے ہیں۔ وہ اُردو کی قدر و قیمت، اُس کی خدمات، مزاج اور اہمیت کو جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ماضی میں اُردو ہی اِس برِ عظیم میں اتحاد و اتفاق کا سبب بنی تھی اور حال و مستقبل میں بھی اِس سے قومی یکجہتی کا زبردست کام لیا جا سکتا ہے۔ اِس لئے کہ پُورے ہندوستان میں اِس وقت بھی رابطہ کی یہی ایک زبان ہے جسے ہر زبان کا جاننے والا بہ آسانی سمجھ لیتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک سو چار میمبرانِ پارلیمنٹ نے اُردو کے لئے آواز اُٹھائی اور اپنے دستخطوں سے وزیرِ اعظم کی خدمت میں عرضداشت پیش کی۔ دستخط کرنے والوں میں رہنمائے اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن محترمہ وجے لکشمی پنڈت بھی شامل تھیں۔ دہلی میں آل پارٹیز اُردو کنونشن ہوا۔ پھر یو۔ پی کے دو سو میمبرانِ اسمبلی نے اپنے دستخطوں سے ایک یادداشت صدرِ جمہوریۂ ہند اور وزیرِ اعظم کی خدمت میں پیش کی۔ یو۔ پی کے کئی وفود نے وہاں کے وزیرِ اعلیٰ کو اُردو کا جائز مقام دئے جانے کے سلسلے میں عرضداشتیں پیش کیں۔ حال ہی میں میرٹھ میں ایک بڑا آل پارٹیز اُردو کنونشن ہوا ہے اور اب یو۔ پی کے مجاہدینِ اُردو نے صاف صاف یہ بات کہدی ہے کہ اگر یو۔ پی میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ نہ دیا گیا تو وہ راست اقدام (DIRECT ACTION) سے کام لیں گے۔ بنگال کے اُردو دوستوں نے بھی وہاں کے وزیرِ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی عرضداشت پیش کی ہے۔ میسور کی اُردو و لسانی اقلیتیں بھی میدان میں آگئی ہیں اور وزیرِ اعلیٰ میسور کو ایک میمورنڈم پیش کر چکی ہیں۔ کئی مہینے پہلے صوبۂ بہار میں ایک ہنگامی اُردو کنونشن ہوا تھا۔ راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بھی اِسی نوع کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو ہند، ادیبوں اور شاعروں سے ایک یادداشت پر دستخط لے رہی ہے، یہ یادداشت صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ بمبئی اور دہلی کے ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے بھی ایک اہم قدم اُٹھ چکا ہے۔

مانا کہ اِس تمام سعیِ کار اور ہنگامۂ جبر و اختیار کا ہنوز کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں بھی ہمیں کچھ مایوسی ہو، لیکن یہ طے ہے کہ لسانی آمریت کا بُت ایک دن ٹوٹ کر رہے گا۔ ہندی زبان کی آڑ میں سنسکرت زبان اور اُس کی تہذیب کا احیاء چاہنے والا جو گروہ اُردو زبان کو نقصان پہنچا رہا ہے، مُلک کی دوسری بڑی زبانوں کو کچل رہا ہے، اُس گروہ کو آخر آخر مُنہ کی کھانا پڑے گی۔ مُلک میں لسانی مسئلہ حد درجہ پیچیدہ ہو چکا ہے اور اِس کے انتہائی ناخوشگوار اثرات مُلک و قوم پر پڑ رہے ہیں۔ اب شدّت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ کہیں یہ جھگڑا مُلک کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دے۔ اُردو دوستوں کو جادۂ عزم و عمل سے کسی حال میں نہیں ہٹنا ہے۔ رائے عامّہ کافی حد تک بیدار ہو چکی ہے، جس دن یہ پُوری طرح بیدار ہو جائے گی، اُردو کو اُس کا حق مِل جائے گا۔

بجھے نہ مشعلِ اُمیدِ تشنگانِ شب
یہ ایک رات گذر جائے تو سویرا ہے

اعجاز صدیقی

ڈاکٹر گیان چند

زبان ــــ کا ــــ مسئلہ

ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر بجا طور پر برّصغیر کہا گیا ہے۔ رُوس کو چھوڑ کر یورپ کا رقبہ تقریباً اتنا ہی ہے۔ وہاں جس قدر زبانیں بولی جاتی ہیں اِس برّصغیر میں اُس سے کم نہ ہوں گی۔ ہماری ریاستیں (صوبے) رقبے اور آبادی میں یورپ کے ممالک کی ہمسری کرتی ہیں۔

زمانۂ ماقبل تاریخ میں جہاں تک ہم جھانک سکے ہیں اِس برّصغیر میں سب سے پہلے والی نسل نیگریٹو (NEGRITTO) تھی۔ اِس نسل کی کچھ نشانیاں انڈمان کے غیر متمدّن قبائل میں ملتی ہیں۔ ان کے بعد آسٹرک نسل نے اِس برّصغیر کو آباد کیا۔ چھوٹا ناگپور کے آدی واسی اِسی نسل کے ہیں۔ اِس خاندان کی زبانوں میں منڈا گروہ سب سے اہم ہے۔ گنگا آسٹرک زبان کا لفظ ہے۔ آسٹرکوں کے بعد دراوڑ اس برّعظیم میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بڑی تہذیب کے مالک تھے۔ بعد میں آریوں نے انھیں جنوب کی طرف ڈھکیل دیا۔ آریہ ہندوستان میں اِس طرح داخل ہوئے کہ وہی یہاں کے مالک بن بیٹھے۔ ہندوستان کی اکثر زبانیں ہند آریائی ہیں۔ آریوں کے بعد عرب افغان اور مغل حملہ آور آئے۔ ان کی تہذیب اور زبان نے ہندوستان کی بوقلمونی میں اضافہ کیا۔ اُنھوں نے ہندوستان کو قندِ پارسی سے آشنا کیا۔ آخری قابلِ ذکر بیرونی فاتح انگریز تھے جنھوں نے ملک کو انگریزی زبان دی۔

جس قدیم زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا دَور دَورہ تھا اُس وقت مفتوحین یعنی دراوڑ تو اپنی زبانیں بولتے ہی تھے تمام آریہ ایک ہی زبان کا استعمال کرتے ہوں یہ قرینِ قیاس نہیں۔ پیشاور سے بنگال تک ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ اُس زمانے میں رسل و رسائل کے وسیلے آج کل کے سے تو تھے نہیں اِس لئے یہ ممکن نہیں کہ کئی صدیوں کی مدت میں اتنے بڑے علاقے میں بول چال کی مختلف بولیاں نہ ہو گئی ہوں۔ علمار کا خیال ہے کہ آج کی طرح اُس دَور میں بھی کئی دیسی بولیاں تھیں۔ سنسکرت ایک مرصّع ادبی زبان تھی جو اُس زمانے کی بول چال کی زبان کی نمائندگی نہیں کرتی۔ سرکاری زبان کمیشن (آفیشیل لینگویج کمیشن) کی رائے[1] ہے کہ "کلاسکل سنسکرت کبھی جمہور کی زبان نہ تھی۔"

نیچی ذات والوں کو سنسکرت سیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جو مشہور ہے کہ شودروں کے لئے سنسکرت سننے پر بھی قدغن تھا، یہ قابلِ عمل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ راجاؤں کے محل میں داس داسیاں تو ہوتے ہی تھے کیا ان کے سامنے ان کے آقا

---

[1] آفیشیل لینگویج کمیشن رپورٹ ص ۲۱

آپس میں بولتے چالتے نہ ہوں گے۔ اُس زمانے کی دیسی بولیوں کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ کئی صدیوں کے بعد جب پراکرتوں کی تشکیل ہوئی تو سنسکرت ڈراموں میں طبقۂ بالا کے افراد سنسکرت میں گفتگو کرتے ہیں اور عوام پراکرتوں میں۔ اکثریت سے مغائرت بڑھنے زیادہ مرصّع ہونے اور قواعد میں جکڑ بند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچسو سال قبل مسیح کے لگ بھگ سنسکرت بول چال کی زبان کے طور پر ترک ہو گئی اور اس کی جگہ پہلے پالی نے لی پھر پراکرت نے اور پھر اپ بھرنش نے لیکن اس زمانے میں بھی سنسکرت حکومت، تہذیب اور ادب کی زبان کی حیثیت سے چھائی رہی۔ پانسو قبل مسیح سے بارہویں صدی تک ہندوؤں کے راج میں سرکاری زبان کے طور پر ہمیشہ سنسکرت استعمال ہوا کی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن سنسکرت ہر ایک کو قبول تھی۔ حد تو یہ ہے کہ دراوڑوں نے بھی سنسکرت کو اُسی طرح پڑھنا لکھنا شروع کیا جس طرح شمال کے آریوں نے۔ اسلامی دَورِ حکومت میں جب سرکاری زبان فارسی ہو گئی تو شمال میں سنسکرت کا چراغ گل ہو گیا لیکن اہلِ دکن نے اس کی لَو کو ویسے ہی فروزاں رکھا چنانچہ بیسویں صدی میں بھی شمال کی نسبت دکن میں سنسکرت کا زیادہ رواج ہے۔ اس علاقے میں سنسکرت کے بڑے بڑے علماء ہوئے ہیں۔

اسلامی دورِ حکومت میں دربار اور امراء کی مجلسوں پر فارسی کا عمل دخل رہا۔ چند بیرونی علماء کے علاوہ یہ کبھی عوام کی زبان نہ تھی لیکن یہ بھی ملک کی تہذیبی اور ادبی زبان بن گئی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کمپنی نے فارسی کو ترک کر کے عدالتوں اور دفتروں کی نچلی سطح پر اُردو کا چلن کر دیا اور اُوپری سطح پر انگریزی رائج کی۔ ہندوستان اور پاکستان کی مرکزی حکومتوں کا کام آج بھی زیادہ تر انگریزی میں ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ صاف نظر آتا ہے کہ ۵۰۰ ق م سے آج تک یعنی پچھلے دو ہزار سال میں بدنصیب ہندوستان کی مرکزی حکومت کا کام کبھی جنتا کی بھاشا میں نہیں ہوا۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف زبانوں کا دیس ہے۔ یہ اختلافات ہی کیا کم تھے کہ مذاہب اپنے اپنے جنگی نعروں کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔ جس ملک میں اتنے سارے اختلافات ہوں اُس کا ایک قوم کے شیرازے میں منسلک ہونا آسان کام نہ تھا۔ پھوٹ ڈالنے والی طاقتوں میں مذہب سب سے زیادہ مہلک ثابت ہوا، اور اس کے نام پر ملک تقسیم ہو گیا۔ آزادی سے قبل زبان کا مسئلہ بھی اسی سیاست میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اُس وقت نہ ہندی تامل کا جھگڑا تھا نہ ہندی پنجابی کا بلکہ تمام افتراقات ہندی اُردو پر مرکوز ہو گئے تھے۔

آزادی سے پہلے کے ہندی اُردو نزاع کی داستان اتنی تلخ ہے کہ اس کے سُننے کی تاب کم ہی لوگ لا سکتے ہیں۔ ذیل میں اختلافی امور سے قطع نظر کر کے چند اشاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

• ہندی نے برج، بندیلی، اودھی، بھوجپوری، میتھلی، چھتیس گڑھی اور راجستھانی وغیرہ کو اپنے دامن میں لے لیا۔ اُردو نے محض کھڑی بولی سے سروکار رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کی پشت پر افراد کی جتنی بڑی تعداد ہے اُردو کے پیچھے نہیں۔ مغربی یوپی کے علاوہ بقیہ علاقوں میں کھڑی بولی کا چلن محض شہروں میں تھا۔ گیارہویں صدی سے اُنیسویں صدی تک ہندی کھڑی بولی میں کہیں کہیں اکا دکا کوئی تحریر مل جاتی ہے لیکن یہ ایک مضبوط روایت نہ بنی تھی۔ اُردو میں کھڑی بولی کی مقبولیت دیکھ کر ہندی نے بھی کھڑی بولی کی طرف توجہ کی اور اس میں تیزی سے ادب کی تخلیق ہونے لگی یہاں تک کہ بیسویں صدی میں نئی ہندی کی دوکان میں ایک وسیع سرمایہ جمع ہو گیا۔ کچھ ہی سال بعد یہ ہوا کہ ہندی نے اُردو کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ملک میں ہندی کی کتابیں اُردو سے دوگنی چھپتی تھیں اور یوپی میں تو یہ اُردو کے مقابلے میں سات آٹھ گنی ہوتی تھیں۔ مولوی عبدالحق نے ایک[1] خطبے میں یوپی کی ہندی اُردو مطبوعات کی تقابلی تعداد دی ہے۔

---

[1] خطبات عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل ص ۱۰۹

شاعری

سال	ہندی	اُردو
۱۹۳۱ء	۱۷۵۹	۳۸۷
۳۲ء	۲۰۹۰	۴۰۱
۳۳ء	۲۲۳۲	۳۷۵
۳۵ء	۲۰۹۶	۳۰۶
۳۶ء	۲۰۹۸	۲۵۴
۳۸ء	۱۷۸۵	۱۸۲
۴۰ء کے نو مہینے	۱۰۷۷	۱۵۹
۴۱ء	۱۲۹۰	۱۹۸

ان حالات میں دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ اُردو ہندی سے مفاہمت کرکے ساتھ ساتھ جینے کی کوشش کرتی لیکن ہندی کی طرح اُردو تحریک بھی بلا شرکت غیرے اس ملک کی واحد قومی زبان بننا چاہتی تھی۔ مولوی عبدالحق کا دعویٰ تھا:

"اس ملک میں[1] جہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔"

"تمام ملک[2] ہندوستان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اکثر صوبوں میں بلکہ تقریباً ملک کے ہر علاقہ میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور مُلکی یا قومی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔"

ملک کی تقسیم نے ہندی اُردو ہندوستانی کا قضیہ طے کر دیا۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان بنی، ہندی ہندوستان کی۔ روایت کی جاتی ہے کہ مجلسِ آئین ساز کی کانگریس اسمبلی پارٹی میں بحث اُٹھی تھی کہ ملک کی زبان ہندی ہو کہ ہندوستانی، فیصلہ ہندی کے حق میں ہوا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد پاکستان کے جارحانہ رویّے کی ہیبت اس طرح دلوں میں طاری تھی کہ آئین ساز اسمبلی نے اتفاق رائے سے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا، ریاستوں کے حصّے میں علاقائی زبانیں آئیں۔ دستور میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ۱۵ سال تک مرکز اور ریاستوں میں انگریزی کا چلن رہے گا لیکن ساتھ ہی ہندی اور علاقائی زبانیں آہستہ آہستہ کام کاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں گی یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں انگریزی کو بالکل ہٹا دیا جائے گا۔ اگر اس میں کوئی دِقت ہو تو پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں قانون بنا کر انگریزی کے استعمال کی مُدت میں توسیع کر سکتی ہیں۔ پانچ سال بعد ایک سرکاری زبان کمیشن مقرر ہوگا جو یہ دیکھے گا کہ انگریزی کی جگہ ہندی کو استعمال میں لانے کی رفتار کیسی ہے اور اس کے لئے مزید کیا کرنا چاہیے۔

دستور کے آٹھویں گوشوارے میں ملک کی ۱۴ زبانوں کی فہرست دی گئی ہے۔ وہاں ایک عجیب مذاق یہ کیا گیا ہے کہ سنسکرت کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سنسکرت کی عظمت مسلّم لیکن سنسکرت اب تو کسی کی زبان نہیں۔ میں اپنے مرحوم پردادا کا لاکھ احترام کروں لیکن مردم شماری کے وقت اپنے اہلِ خانہ کے سلسلے میں ان کا نام تو نہیں لکھا سکتا۔ اگر ہندوستان کی تمام زندہ مردہ زبانوں کا شمار کرنا تھا تو سنسکرت اور نئی زبانوں کی درمیانی کڑیوں کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ پالی اہم پراکرتوں اور خاص خاص اپ بھرنشوں کے نام بھی کیوں نہ ٹانک دئے گئے۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے تو کوئی سنسکرت

---

[1] خطبات عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۱۸۷

کا بولنے والا نہیں، لیکن چند سرپھروں نے مردم شماری میں اسی کو اپنی زبان لکھا دیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی تعداد ۵۵۵ تھی، ۱۹۷۱ء میں ۲۵۴۴ ہوگئی۔ کوئی پانچ گنی۔ معلوم ہوتا ہے سنسکرت والوں میں تخلیق کی صلاحیت معمول سے کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ضبطِ تولید کا پرچار ہونا چاہیے۔

سنسکرت میں اخبار اور رسالے نہیں نکلتے۔ ادبی تخلیق نہیں ہوتی لیکن علاقائی زبانوں میں جگہ پاجانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساہتیہ اکاڈمی کی جانب سے ہر سال اس کی کتاب کو بھی پانچ ہزار کا انعام دیا جاتا ہے حالانکہ اس میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد بھی کتنی ہوتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت یو پی سرکار نے اس کو بھی گھسیٹ لیا ہے۔ غرض زندہ زبانوں کو جو حق ملتے ہیں ان میں برابری کا بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر ساجھا مانگنے کو یہ بھی سامنے آموجود ہوتی ہے۔ اگر مُلک کی تہذیب میں اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو لیا گیا ہے تو انگریزی کو کیوں نہیں لیا گیا۔ اِس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہماری روزانہ زندگی اور ہماری نئی تہذیب میں انگریزی سنسکرت سے کہیں زیادہ رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ تو ہندستانیوں کے ایک طبقے کی مادری زبان بھی ہے۔ اینگلو انڈین اسکولوں کے مقدمے میں فیصلہ دیتے ہوئے بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس چھاگلا نے اعلان کیا۔

"آئینی اعتبار سے آج انگریزی بھی اِسی طرح آئین سے مسلّمہ ہندوستانی زبان ہے اور اِسی طرح تحفّظ کی مستحق ہے جس طرح اِس مُلک کے اور کسی گروہ یا طبقے کی زبان ہو۔"

جب ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ چکا چوند اور بوکھلاہٹ دُور ہوئی اور حواس ٹھکانے آئے تو علاقائی زبان بولنے والوں کو احساس ہوا کہ ہندی کے سرکاری زبان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ تمام اُونچی ملازمتوں میں جہاں مدراسی اور بنگالی چھائے ہوئے تھے، ہندی کے آنے کے بعد نقشہ ہی بدل جائے گا۔ اب کیا کیا جائے۔ کوئی یہ تو کہنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ ہماری زبان تامل یا بنگلہ کو مرکزی زبان بنادو۔ ڈوبتے کو انگریزی تنکے کا سہارا ملا۔ مطالبہ یہ کیا گیا کہ ہندی بہت پچھڑی ہوئی زبان ہے، ابھی انگریزی کو چلنے دو۔ ادھر ہندی والے سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمیں مُلک کا راج مل گیا۔ انھیں جلدی تھی کہ انگریزی کو دیس نکالا دیکر ہندی کو سنگھاسن پر براجمان کردیا جائے۔ اِس طرح سے ہندوستان میں زبان کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

دنیا میں اور بھی ملک ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانوں کے بولنے والے کافی تعداد میں ہیں، سوئٹزرلینڈ، کناڈا، اور بلجیم لیکن ان میں دو تین زبانوں کا مسئلہ ہے اور عام طور سے ہر باشندہ دونوں تینوں اہم زبانوں کو جانتا ہے۔ ہندوستان کی سی لسانی کثرت کہیں ہے تو رُوس میں یہاں دو سو زبانیں اور بولیاں ہیں جن میں سے ۱۶ اہم ہیں۔ ۸ اکروڑ کی کُل آبادی میں سے دس کروڑ کی مادری زبان روسی ہے۔ تین کروڑ ۶۵ لاکھ کی یوکرینی بقیہ میں بائیلوروسی۔ ازبک اور تاتار وغیرہ ہیں۔ مرکزی حکومت کا کام روسی میں ہوتا ہے لیکن سب قانون اور گزٹ سولہ زبانوں میں چھپتے ہیں۔ روس کئی جمہوریتوں کا وفاق ہے۔ وہاں ہر ریاست نے اپنی زبان کے لئے روسی رسم الخط اختیار کرلیا ہے اور روسی پڑھنا اگرچہ لازمی نہیں لیکن ہر ریاست میں ہر شخص اپنی "مرضی" سے رُوسی زبان پڑھتا ہے اِس لئے مشترکہ زبان کے سلسلے میں کوئی دِقت نہیں۔ روس کے نظام میں تو ہر شخص کی مرضی ایک ہی جہت میں چل سکتی ہے مشکل ہے تو ہندوستان میں جہاں ہر فرد کو بہت کچھ آزادی دی گئی ہے لیکن ہم روس کی اِس بات کی تعریف کرینگے کہ وہاں ہر چھوٹی سے چھوٹی علاقائی زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اُس میں تخلیقِ ادب کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔

ہندی کو ملک کی سرکاری زبان اس لئے بنایا گیا کہ اس کے بولنے والے دوسرے کسی بھی زبان کے بولنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن بڑی کمی یہ ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ کم از کم دو زبانوں بنگلہ اور تامل سے پیچھے بھی ہے اور عمر میں بھی کم تر۔ مراٹھی کا ادب بھی ہندی سے کم نہیں۔ بنگال اور مدراس وہ علاقے ہیں جن کا سب سے پہلے انگریزوں سے ملنا جلنا ہوا اور جس کی وجہ سے اُنھوں نے سب سے پہلے انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ ایک صدی کی پہل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علوم میں بقیہ صوبوں سے آگے بڑھ گئے اُن کی زبانیں زیادہ ترقی کر گئیں۔ انگریز مستشرقین کلکتہ میں سنسکرت کالج کے قیام پر زور دیتے تھے لیکن راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں حکومت سے احتجاج کیا کہ انگریزی تعلیم دیں۔

" اگر برطانوی پارلیمنٹ کا منشا ہندوستان کو جہالت میں مبتلا رکھنا ہو تو سنسکرتی نظامِ تعلیم اس مقصد کی تکمیل کے لئے بہترین آلہ تھا لیکن چونکہ مقصد ہندوستانی آبادی کی اصلاح ہے اس لئے اسے جدید اور ترقی یافتہ نظامِ تعلیم جاری کرنا چاہیئے۔"

مجلسِ تعلیماتِ عامہ کی دسمبر ۱۸۳۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قدیم مشرقی تعلیم رائج کرنے میں کتنی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہر طرف انگریزی تعلیم کی مانگ تھی

ہندی علاقے سب سے بعد میں انگریزی عملداری میں آئے اس لئے وہ جدید تعلیم کے باب میں سب سے پیچھے رہے۔ ہندی اُردو بولنے والے دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس وجہ سے بھی انگریزی میں کم مہارت رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں مختلف زبانیں بولنے والوں کو دو مشترکہ زبانیں مہیا ہیں انگریزی اور ہندوستانی۔ دوسری زبان والے اپنی ضرورت اکثر انگریزی سے پوری کرتے ہیں لیکن ہندوستانی بولنے والا ہر جگہ ہندوستانی سے کام چلا لیتا ہے۔

ہندی صوبوں کے بعد ہندی کے معاملے میں صوبۂ بمبئی نے (جو اُس وقت مہاراشٹر اور گجرات میں تقسیم نہ ہوا تھا) سب سے زیادہ جوش دکھایا لیکن اس کے ذہن میں ہندی کا جو نقشہ ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ بمبئی گورنمنٹ نے ۱۹۴۹ء میں گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی کو اپنی زبان قرار دے لیا تھا لیکن جب دستور ساز اسمبلی میں اس سوال پر غور کیا گیا تو بمبئی گورنمنٹ نے اپنا فیصلہ معطل کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں بمبئی گورنمنٹ کی ہندی ٹیچنگ کمیٹی نے رپورٹ دی جس میں ایک وسیع ہندی کی سفارش کی گئی۔ اس سلسلے میں آئین کی دفعہ ۳۵۱ کی طرف دھیان دلایا گیا۔

It shall be the duty of the union to promote the spread of the Hindi language, to develop it so that it may serve as a medium of expression for all the elements of composite culture of India and to secure its enrichment by assimilating without interfering with its genius the forms, style and expression used in Hindustani and in the other languages of India specified in the Eighth schedule

چونکہ آٹھویں گوشوارے میں ہندی زبان بھی ہے اس لئے دلیل کی گئی کہ دفعہ ۳۵۱ میں مذکور مرکزی ہندی کو منجملہ اور زبانوں کے ہندوستانی اور خود علاقائی ہندی سے بھی استفادہ کرنا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی ہندی

---

۱ و ۲ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۵۴ از عبداللہ یوسف علی

علاقائی ہندی سے مختلف ہوگی۔ساولنکر (جو بعد میں لوک سبھا کے اسپیکر ہوئے) نے پشچم بھارت راشٹر بھاشا سمیلن میں ۵۰ء میں کہا "حالانکہ قومی زبان کا نام ہندی رکھا گیا ہے تو بھی یہ یوپی یا راجستھان میں جیسے بولی جاتی ہے ویسا مانا بڑی بھول ہوگی، اس پر مختلف صوبوں کی زبانوں کا اثر ہوگا اور شاید مختلف صوبوں میں اس کا رنگ مختلف ہوگا"
۱۹۵۱ء میں بی جی کھیر نے (جو بعد میں سرکاری زبان کمیشن کے صدر ہوئے) کہا کہ دستور میں جو ہندی ہے وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوگی اور یہ یوپی یا بہار یا مدھیہ پردیش کی ہندی نہیں بلکہ گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی ہوگی، سی پی اسمبلی کے اسپیکر گھنشیام سنگھ گپتا نے بھی یہی کہا کہ قومی ہندی دلی، لکھنؤ، الہ آباد یا رائے پور کی ہندی نہ ہوگی۔ کاکا کالیلکر، مہامہو پادھیائے پوتدار، ہریجن کے ایڈیٹر مگن بھائی دیسائی سب کے ذہن میں ملکی ہندی کا یہی تصور تھا۔خود کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپریل ۵۴ء میں علاقائی ہندی[1] اور قومی ہندی کا ذکر کیا۔اس کے بعد پنڈت نہرو نے کانگریس[2] پارلیمنٹری کمیٹی کے بند اجلاس میں یہی کہا کہ علاقائی اور ملکی ہندی دو طرح کی ہوں گی۔سرکاری زبان کمیشن کے ممبر مگن بھائی دیسائی نے ایک اختلافی نوٹ میں اسی وسیع ہندی کی مانگ کی ہے۔اس سال ۱۹۶۵ء میں این وی گیڈگل اور مہاراشٹر کے سابق وزیر صنعت ایس جی باروے نے[3] اسی ہندی کا ذکر کیا ہے۔

بمبئی گورنمنٹ نے ۵۴ء میں طے کیا کہ ۵۵ء سے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے۔مدراس کے اخبار "ہندو" نے ۵ مارچ ۵۴ء کے اداریے میں اس فیصلے کی سخت نکتہ چینی کی۔ اپریل ۵۴ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ شروع سے آخر تک پوری تعلیم علاقائی زبان میں ہوگی۔ اِدھر لسانی صوبوں کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تو بمبئی نے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ تعطل میں رکھا۔

علاقائی زبانوں کے بجائے ہندی میں کام کاج ہو تو عوام کو وہی دشواری باقی رہے گی جو انگریزی کے ہوتے ہے، اس لئے مہاتما گاندھی نے ہمیشہ اس کی وکالت کی کہ صوبوں کی سطح پر وہاں کی زبان سرکاری زبان ہوگی۔ دفتروں میں جو زبان استعمال ہوگی تعلیم یافتہ جوانوں کو اسی میں مہارت لے کر نکلنا چاہیئے اس لئے یہ بھی لازم ہوا کہ مختلف صوبوں میں شروع سے آخر تک تعلیم علاقائی زبان میں ہو۔ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں یونیورسٹی تعلیمی کمیشن دونوں نے علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی۔

اُردو نے دیکھا کہ نئے ہندوستان میں اس کے لئے تو کوئی جگہ ہی نہیں چنانچہ یو، پی میں اُردو کے لئے دستخطی مہم جاری کی گئی۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۳ء کو A I C C کی گشتی چٹھی[4] جاری ہوئی کہ علاقائی زبانوں کو بڑھاوا دینا ہے اُردو کو بھی مناسب مقام ملنا چاہیئے۔ یوپی کانگریس کی ایکزیکیوٹو کمیٹی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یوپی میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ دستخطی مہم کی حیرت انگیز کامیابی پر جھنجھلا کر لوک سبھا میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس یہاں تک کہہ گئے کہ "اُردو بیرونی زبان ہے۔ اگر اس کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ ہندوستانی کلچر کو مجروح کرے گی"[5] اِس لغو بیانی پر تبصرہ کرکے میں اپنا اور قارئین کا وقت برباد نہ کروں گا۔

ہندی کے پیر مغاں ٹنڈن جی کی یہ خواہش تھی کہ انگریزی کی جگہ ہندی لے لے یعنی دوسری زبانوں کے علاقوں میں بھی ہندی حاکم اور وہ زبانیں محکوم رہیں۔ ۲۹ فروری ۵۲ء کو گورکھپور جن پد ساہتیہ سمیلن سے خطاب کرتے ہوئے کہا

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۹۳ [2] ایضاً ص ۳۹۴

[3] One Language Problem از ایم پی دیسائی ص ۱۸۲ [4] ایضاً ص ۱۴۱

"ملک کے بعض حلقوں میں علاقائی زبانوں یا انگریزی کے لئے آوازیں اُٹھائی گئی ہیں۔ ہندی ہماری لازمی زبان ہونی چاہیئے اور مراٹھی، بنگالی، گجراتی اور دوسری زبانیں ثانوی زبان کے طور پر پڑھائی جائیں۔ کسی صورت میں انگریزی کو ہماری لازمی زبان نہ ہونا چاہیئے۔"

تو یہ تھے ہندی کے اصل ارادے کہ وہ سارے دیس کی پٹ رانی بن جائے۔ اس پر علاقائی زبانوں میں احتجاج کیا گیا۔ آج کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ مختلف صوبوں میں ہندی کو اوّل اور علاقائی زبانوں کو ثانوی حیثیت دیجائے۔

انگریز ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا گئے لیکن وہ ہمیں کچھ دے کر بھی گئے "پارلیمانی طرزِ حکومت، اعلیٰ نظامِ انصاف یعنی قانون کا راج اور انگریزی زبان۔ انگریزی، ملک کے تمام پڑھے لکھوں کی واحد مشترکہ زبان ہے ملک ہی کیا اب تو یہ دنیا بھر کی بین الاقوامی زبان ہوگئی ہے۔ دوسری زبان کے طور پر یہ دنیا کے اکثر ملکوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ سے ذیل کی معلومات ہوتی ہیں۔

رُوس میں کم از کم ۴۰ فی صدی اسکولوں میں انگریزی پڑھانے کا انتظام ہے جن میں ایک کروڑ بچے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ مشرقی یورپ کے ملکوں میں رُوسی کے بعد انگریزی کا سب سے زیادہ مطالعہ ہو رہا ہے۔ فرانس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے اور اسکینڈے نیویا کے ملکوں میں دوسری جنگ کے بعد سے انگریزی دوسری خاص زبان ہوگئی ہے۔ اٹلی، اسپین اور پرتگال میں گو فرنچ بہت مقبول ہے لیکن اب انگریزی بھی کافی بڑھتی جا رہی ہے۔ بحیرۂ روم کے کنارے کے دوسرے ملکوں مثلاً یونان، ترکی، مصر، لیبیا اور دوسرے ملکوں میں اب فرنچ کی جگہ انگریزی کا چلن ہوتا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا میں ڈچ زبان کی جگہ ہائی اسکول میں انگریزی لازمی کردی گئی ہے۔ جاپان میں یونیورسٹی کے پہلے دو سالوں میں انگریزی لازمی ہے۔

دنیا کے دوسرے ملک انگریزی کو خاص بیرونی زبان کی حیثیت سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ہم کیا اپنے قبضے میں آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیں۔ ہندوستان کے حصے میں جدید مغربی علوم سے جو کچھ آیا وہ محض انگریزی کے ذریعے سے۔ زبان کا ارتقا سماجی ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جو تہذیب جتنی ترقی یافتہ ہوگی اس کی زبان بھی ویسی ہی ہوگی۔ ہندوستان جب تک معاشی اعتبار سے پچھڑا رہے گا اس کی زبانیں بھی پس ماندہ رہیں گی۔ انگلستان اور امریکہ کی مادی ترقی کے باعث انگریزی زبان بھی دنیا کی سب سے متموّل زبان ہوگئی۔ ہم انگریزی زبان کے ذریعے دنیا کی کسی زبان کے ادب کا مطالعہ کرسکتے ہیں خصوصاً سائنس اور دوسرے تکنکی علوم کی ترقی کی ایک جھلک ہم انگریزی کی کھڑکی ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ رُوسی زبان جاننے والے تو ہمارے ملک میں نہ کوئی خاص ہیں نہ ہونے کا امکان ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کو مدراس سرکار نے جو یادداشت دی تھی اس میں ہندی پر انگریزی کو ترجیح دینے کی وجہ لکھی تھی۔

English provides and Hindi can not provide direct access to creative modern thought-

ہندی والے انگریزی کی تحقیر کے لئے کہتے ہیں کہ (۱) ہندوستان میں انگریزی جاننے والے ایک مغرور ذات بن گئے ہیں جو عوام کے سامنے احساسِ برتری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (۲) ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی انگریزی صرف ۲ فی صدی لوگوں کو آئی اس لئے اسے فوراً ہٹا دینا چاہیئے۔

جہاں تک احساسِ برتری کا سوال ہے ہندی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی اس نشے میں انگریزی والے سے کچھ کم نہیں۔ اس کا تجربہ اور کسی کو ہو کہ نہ ہو ہندی علاقے کے اُردو والوں کو دن رات ہوتا رہتا ہے۔ جہاں تک تعداد کا سوال ہے ۲ فیصدی

انگریزی جاننے والوں میں صرف وہی حضرات شمار کئے گئے ہیں جو ہائی اسکول پاس ہیں جبکہ ہندی کے پڑھے لکھوں میں ہر طفلِ مکتب کو گن لیا گیا ہے۔ جانتے ہو کہ تعداد کی کمی کا طعنہ دے کر تم کس طبقے کو گرا رہے ہو۔ یہی تو ہندوستان کے فکر و فن کے امین ہیں۔ پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں، ماہرِ معاشیات، وکیل، جج، سرکاری ملازم، سیاسی رہنما، صحافی، بڑے ادیب، شاعر، مصوّر وغیرہ انھیں دو فی صدی میں ہیں۔

یہی نہیں ہندوستانی زبانوں کے جتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں وہ سب انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی پیداوار ہیں۔ وہ اسی دو فیصدی کا حصہ ہیں۔ انگریزی اداروں کے باہر ہندی، اُردو، مراٹھی، گجراتی کی اعلیٰ تعلیم ہوتی کہاں ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کا جتنا جدید ادب ہے وہ چند مستثنیات کے علاوہ سب انگریزی دانوں کا دیا ہوا ہے۔ ہر ہندوستانی ادب پر مغرب کی گہری چھاپ ہے۔ آج اُردو کے شعرا، نقّادوں، صحافیوں، افسانہ نگاروں پر نظر ڈالئے دو چار کے سوا سب انگریزی میں اچھا دخل رکھتے ہیں۔ مشرق کی کلاسکی زبانوں سے ہمیں جو ملنا تھا وہ مل چکا۔ اب مغرب کے بحرِ بے پایاں سے ہمیں اپنی جھولی بھرنی ہے۔ اگر ہم انگریزی کو چھوڑ دیں تو بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔

ہندی والوں کی ہمیشہ یہ مانگ رہی ہے کہ فوراً ہر جگہ بغیر سوچے سمجھے ہندی کو لے آؤ۔ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ پر غور کرنے کے لئے جو پارلیمنٹری کمیٹی بنی اس کی رپورٹ میں ڈاکٹر رگھو ویر، پرشوتم داس ٹنڈن، سیٹھ گووند داس وغیرہ نے اختلافی نوٹ لگائے۔ ان بزرگواروں کی مانگ تھی کہ فوراً آج ہی سے ہائی کورٹ، سپریم کورٹ، مرکزی ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں، ہندی ریاستوں کے دفتروں وغیرہ میں ہندی میں کام کرنا شروع کر دو۔ ان حضرات کے لئے ہندی ایک مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں خود مقصود بن کر رہ گئی ہے۔ کے، ایم منشی جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے ہیں، اُنھوں نے سرکاری زبان کمیشن کو ایک یادداشت دی اس میں ایسے ہی لوگوں کو نظر میں رکھ کر جو کچھ کہا وہ انہیں کے الفاظ میں سُنئے[1]

"Movements are afoot to eliminate English rapidly from several spheres of life; Hindi can not take its place with equal speed. By an over-enthusiastic effort at removing English from its place, Hindi has not gained; it has not lost. Though to the ordinary mind the elimination of English appears to be a highly patriotic performance, the greatest danger to day is militant regional linguism."

"If India has to stand competition with the world in intellectual equipment, it can not do only a second class linguistic instrument which is yet in the process of making"

سرکاری زبان کمیشن رپورٹ میں دو ممبروں ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی اور پی سبّاراین نے اختلافی نوٹ دئے ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ممبران پارلیمنٹ کی جو کمیٹی مقرر کی گئی اس کی رپورٹ میں فرینک انتھونی کا اختلافی نوٹ

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۲۱

قابلِ ذکر ہے۔ ان تینوں رپورٹوں کو پڑھئے تو غیر ہندی لوگوں کے دلوں کی دھڑکن، اپنی زبان سے والہانہ عشق اور ہندی پر جھنجھلاہٹ کا اندازہ ہوگا۔ کمیشن اور پارلیمنٹری کمیٹی دونوں میں اُردو کا ایک ایک نمائندہ تھا۔ افسوس ہے کہ اُنھوں نے کوئی اختلافی نوٹ نہ دیا۔ وہ اُردو کے جذبات کی نمائندگی نہ کرسکے۔ گورنمنٹ کے صرفے پر اُردو کے کیس کی کتنی اچھی اشاعت ہوجاتی۔ ان سے تو بہتر اغیار ہیں جنھوں نے اُردو کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی نے یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ ہندی انیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے ربع میں اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکال کر بنی ہے نیز یہ کہ مغربی اُتر پردیش کی زبان اُردو ہے ہندی نہیں۔ فرینک انتھونی نے جے پال سنگھ کا قول نقل کیا ہے کہ" آدی واسیوں کی منڈاری زبان کے بولنے والے کشمیری آسامی اور ساگری سے زیادہ ہیں لیکن اسے دستور میں جگہ نہیں دی گئی۔ سو سال سے یہ رومن میں لکھی جاتی ہے لیکن حکومت بہار نے حکم دیا ہے کہ ناگری میں لکھی جائے۔" انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ ابھی ہندی اینگلو انڈینوں، مسلمانوں، سکھوں اور آدی واسیوں کی زبانوں (انگریزی، اُردو، پنجابی اور منڈا) کے خلاف ہے جب اس میں توانائی آجائے گی تو دوسروں کی زبانوں کے بھی خلاف ہوجائے گی۔

۱۹۵۶ء میں لسانی صوبے بنائے گئے لیکن مراٹھی، گجراتی اور پنجابی کو علیحدہ صوبے نہیں دیے گئے۔ مہاراشٹرا اور گجرات نے تو لڑ بھڑ کر اپنے صوبے حاصل کر لیے، پنجابی ابھی تک ہندی کی گرفت میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس اصول پر سب زبانوں کا علیحدہ صوبہ بن گیا اُس اصول پر پنجابی کو اپنا صوبہ کیوں نہ دیا گیا۔ لسانی صوبے اس لئے بنائے گئے کہ ان میں دفتری کام اور تعلیم اپنی علاقائی زبان میں ہوسکے۔ اس سے لسانی اقلیتوں کا مسئلہ سامنے آگیا۔ صوبائی تنظیم کمیشن نے طے کیا کہ اگر کسی ریاست میں ۳۰ فی صدی یا اس سے زیادہ دوسری زبان کے بولنے والے ہوں گے تو وہ دولسانی ریاست قرار دی جائے گی۔ نیز یہ کہ اگر کسی ضلع میں ۷۰ فی صدی یا اس سے زیادہ اشخاص ریاستی زبان سے مختلف زبان کے ہوں گے تو ان کی زبان کو ضلع کی سرکاری زبان مانا جائے گا۔

کمیشن کی تعریف کے مطابق صرف پنجاب ہی دولسانی ریاست قرار دی جاسکتی ہے۔ یو پی میں اُردو بولنے والے محض دس فی صدی ہیں؟ اس لئے حکومت اور ہندی والے اُردو کو وہاں کی ثانوی زبان ماننے سے انکار کررہے ہیں۔ ملک میں شاید ہی کوئی ایسا ضلع ہو جہاں کی ستر فی صدی آبادی اُردو بولنے والی ہو۔ اس طرح اُردو کی حد تک یہ سفارشیں بے سود ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ کے بعد دستور میں ایک نئی دفعہ 350A شامل کی گئی جس میں ہر ریاست اور میونسپلٹی وغیرہ کو ہدایت دی گئی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم اُن کی مادری زبان میں دی جائے۔ اُردو کے معاملے میں اس پر کہاں تک عمل ہورہا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔

زبان کا مسئلہ سب سے واشگاف حالت میں دو میدانوں میں سامنے آتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی زبان اور سرکاری دفتروں کی کام کاج کی زبان۔ سرکاری زبان کمیشن نے جو ہندی کے شیدائیوں سے لبریز تھا ہندی اور علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی لیکن ساتھ ہی انگریزی کی اہمیت کا اعتراف یوں کیا۔

---

[۱] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۸۷ [۲] ایضاً ص ۲۸۹

[۳] 94 Report of the Committee of Parliament on Official Language.

[۴] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۴۵ [۵] ایضاً ص ۷۷

"ہمارے ذہن[1] میں یہ بات صاف ہے کہ جب ہماری یونیورسٹیوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے گی تب بھی ایک عرصۂ دراز تک ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے گریجویٹ بالخصوص [illegible] کے مضامین والے انگریزی پر عبور لیکر نکلیں تاکہ ان کی رسائی علم کے اُس مخزن تک ہوسکے جو ابھی ہندوستانی زبانوں میں میسر نہیں۔ ہمیں اس پر خاص دھیان رکھنا چاہیئے کہ تعلیمی معیار گرنے نہ پائے۔"

"یونیورسٹی[2] گریجویٹ کو اگر انگریزی کی اچھی معلومات لے کر نکلنا ہے تو سیکنڈری اسکول اسٹیج میں اچھی انگریزی سیکھ کر یونیورسٹی میں آئے۔"

آزادی کے بعد کے ۱۸ سالوں میں تعلیم کا معیار یقیناً گرا ہے اور اس کی خاص وجہ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم دینا ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم رکھنے پر یہ ایک بجا اعتراض تھا کہ ہمارے دس بارہ برس انگریزی سیکھنے میں صرف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہم دوسرے مضامین کو خاطر خواہ وقت نہیں دے سکتے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ہٹا دیا گیا لیکن انگریزی زبان بی اے تک پہلے کی طرح لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو انگریزی نہیں آتی۔ بی اے کا طالب علم انگریزی میں کلاس لیکچر نہیں سمجھ سکتا۔ انگریزی کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ کم از کم ہندی علاقوں کا تو یہی حال ہے۔ راقم الحروف نے دو سال لسانیات کے موسم گرما اسکول میں شرکت کی۔ وہاں تجربہ ہوا کہ ہندی بولنے والے طلبہ علمی حیثیت سے سب سے پچھڑے ہوئے تھے جب کہ اہلِ دکن مراٹھے اور بنگالی ان سے کہیں آگے تھے۔ یہ فرق صرف انگریزی کی بدولت تھا۔

ہماری لائبریری کی زبان انگریزی ہے۔ ہندی میں اعلیٰ درجے کی کتابیں میسر نہیں، کچھ گھٹیا سے بازاری ترجمے ہیں جنھیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیا جاتا ہے۔ اِس لئے معیار گرتا جا رہا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ جب تک ہندی اور علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے گا ان میں اچھی کتابیں وجود میں نہیں آئیں گی۔ دس پندرہ سال کے عرصے میں ان کتابوں کا کسی قدر ذخیرہ بن سکے گا، اِس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاقائی زبانیں اختیار کرکے ہمیں دس پندرہ سال تک نکلنے والے طلبہ کے پست معیار کی قربانی دینی ہوگی۔ کتنا خسارہ ہے لیکن اِس سے مفر نہیں۔

سائنس کے معاملے میں اور بھی مشکل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ نے سائنسی اصطلاحوں کا بورڈ (بورڈ آف سائنٹفک ٹرمنالوجی) مقرر کیا تھا۔ اس کی سفارش[3] یہ ہے

"بورڈ یونیورسٹی کمیشن اور سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی رائے سے متفق ہے کہ ہندی اور دوسری خاص ہندوستانی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں میں حتی الامکان بین الاقوامی سائنسی اور تکنکی اصطلاحیں استعمال کی جائیں۔ تکنکی لغات میں بین الاقوامی اصطلاحوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی رقم کر دیا جائے۔"

۱۹۵۳ء میں پُونا میں ہونے والی All India Language Development Conference نے اِس فیصلے میں ترمیم کرکے کہا کہ بین الاقوامی اصطلاحوں، فارمولوں اور سائنسی بیانات کو عام طور سے سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کیا جائے لیکن اگر وہ مناسب طریقے پر ترجمہ نہ ہو سکیں تو انھیں برقرار رکھا جائے۔ سرکاری زبان کمیشن بھی ترجمے کے حق میں ہے۔ ابھی دہرہ دون میں مرکزی نائب وزیر تعلیم بھگت درشن نے بتایا کہ ہم ۲۰ سے ۲۵ فی صدی تک بین الاقوامی اصطلاحیں لیتے ہیں۔ ۲۰ فی صدی ہندوستانی زبانوں کی چالو اصطلاحوں کو

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۷۷ [2] ایضاً ص ۷۹ [3] ایضاً ص ۶۲

دیا گیا ہے اور ۵۰ فی صدی سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کی جا رہی ہیں۔
اِن چیستانوں کو کون سمجھے گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربے سے سبق لینا چاہیئے۔ وہاں کی اُردو اصطلاحیں انگریزی اصطلاحوں
سے زیادہ ناقابلِ فہم تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۸ء تک اُردو کے ذریعے سے دی ہوئی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری کو انڈین میڈیکل
کونسل نے تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ ساقط المعیار تھی۔ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی یہی حشر ہوگا۔ آج ہندی
علاقے کے کسی سائنس، ڈاکٹری یا انجینیری کے پروفیسر سے پوچھیئے، وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو کسی بھاؤ پر چھوڑنے کو
تیار نہیں۔ انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کے مطابق ۱۹۵۸ء میں ہم باہر سے ہر مہینے ۶۰۰ سائنسی اور تکنیکی
ماہنامے اور ہر سال بارہ سے تیرہ ہزار تک کتابیں منگاتے تھے۔ ان کا ہندی میں کہاں تک ترجمہ کیا جائے گا۔ ہم مترجموں
کی قوم بن کر رہ جائیں گے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سائنس کی تعلیم کے لئے اگر ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں آسان
صوتیاتی رسم الخط یعنی اصلاح شدہ رومن خط میں لکھی جائیں تو بآسانی انگریزی اصطلاحیں برقرار رکھی جا سکتی ہیں۔
ہندی کے ساتھ تو وہ میل کھاتی نہیں۔

دفتروں کا کام کاج اپنے علاقے کی زبان میں کیا جانا چاہیئے۔ ہندی علاقے ہی کو لیجئے اگر ہندی میں بولنا
انگریزی کی نسبت سہل ہے تو لکھنا بھی سہل ہونا چاہیئے لیکن ہندی کون سی؟ اُردو اور انگریزی الفاظ سے دامن
بچانے والی نہیں بلکہ اُردو اور انگریزی کے تمام مروجہ الفاظ کو برقرار رکھنے والی۔ زبان کا واحد مقصد ترسیل ہے۔
مشہور ماہرِ زبان لیپرسن نے کہا ہے۔

"وہ زبان بہترین ہے جو ہر نقطے پر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔"

لیکن حالت یہ ہے کہ سرکاری سطح پر بجلی کو وِدیوت، پولیس کو آرکشتا، دُودھ کو دُگدھ کہا جا رہا ہے۔
سنٹرل ریلوے کے ہندی ٹائم ٹیبل میں तीन शायकावाले शयनयान کا عنوان ہے۔ آخری دو لفظوں کے
معنی ہندی والوں سے پوچھیے وہ بھی بغلیں جھانکنے لگے۔ کون سمجھے کہ یہ "تین تختوں والے سونے کے ڈبّے" سے مراد
ہے۔ بنیادی انگریزی کے ساڑھے آٹھ سو الفاظ میں صرف ۳۵۲ اینگلو سیکسن اصل کے ہیں بقیہ نصف سے زیادہ
دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ ہندی کو بھی اُردو اور انگریزی الفاظ لینے سے نہ جھجکنا چاہیئے۔

ہندی کے انتہا پسند وکیل کہتے ہیں کہ ہندی کو اِس لئے سنسکرت زدہ ہونا چاہیئے کہ جنوبی ہند والے مشترک
الفاظ کی بنا پر اسے سمجھ سکیں۔ اب ان سے یہ کون کہے کہ شمالی ہند میں جہاں اسے دن رات استعمال کیا جاتا ہے
اگر وہاں ہی کوئی نہ سمجھ سکا تو دکنیوں کے سمجھنے سے کیا تشفی ہوگی، اور اب تو یہ بھرم بھی جاتا رہا ہے۔ اہلِ دکن
ہندی کے کیوں خلاف ہیں؟ کیونکہ یہ شمالی ہند کے غلبے اور آریہ تہذیب کی نشانی ہے۔ اسی وجہ سے وہ سنسکرت
سے بھی چڑنے لگے ہیں۔ تامل علاقے میں گزشتہ سال زبانی فارمولے کے تحت پچاس ہزار طلبہ نے ہندی لی۔
دو ہزار نے سنسکرت اور دو سو نے تیلگو، تامل والوں کو یہی تو شکایت ہے کہ ہندی کے پردے میں ہم پر سنسکرت
اور ویدک کلچر لادا جا رہا ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے سابق صدر کے ایم منشی نے سرکاری زبان کمیشن کو
دئے گئے میمورنڈم میں کہا ہے

what I wish to struggle is the fashion of putting culture at the service of politics, no matter what-politics. Probably the most-glaring illustration of this reactionary process

is the incredible and tragic story of Hindi in the making. Only the most childish argument against use of the spoken word — arguments which the most elementary text-book on linguistics would refute are solemnly trotted out. How can any one be free if his tongue is tied.

آج سے بہت پہلے گریرسن کو بھی ہندی کی سنسکرت زدگی کھٹکتی تھی۔ اُنھوں[1] نے لکھا ہے

"ہندی سنسکرت کے مہلک سائے میں آگئی ہے۔ ہندی کے پاس اپنا ذخیرۂ الفاظ اتنا وافر ہے کہ سنسکرت سے لئے جانے والے الفاظ بے ضرورت اور ناقابلِ فہم ہیں۔"

"ایسا ذخیرۂ الفاظ ہونے کے باوجود سنسکرت الفاظ استعمال کرنا فیشن ہو گیا ہے اس لئے نہیں کہ لاکھوں آدمی اُنھیں سمجھ سکیں بلکہ چند لوگوں پر مصنّف کے علم کی دھاک بیٹھ سکے۔"

دستور کی دفعہ (3) 344 میں سرکاری زبان کمیشن سے کہا گیا ہے کہ ہندی کے رُوپ رنگ اور روز افزوں استعمال کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے کمیشن ملک کی صنعتی، تہذیبی اور سائنسی ترقی کی طرف واجب دھیان دے گا۔

صنعتی اور سائنسی ترقی کے لئے ایک خاص قسم کے ذہن اور ذہنیت کی ضرورت ہے۔ یہ جدید روشن ذہن انگریزی کے لگاؤ سے پیدا ہو سکتا ہے سنسکرت سے نہیں۔ سنسکرت سے ماضی پرستی اور احیائیت کے سوا کچھ ملنے والا نہیں۔

ریاستوں کی حد تک زبان کا مسئلہ صاف ہے۔ گتھی پڑتی ہے مرکز میں آکر۔ مرکز کی زبان اگر ہندی ہوتی ہے تو ہندی والوں کو دوسروں کی نسبت یقیناً بہت بڑا فائدہ ہوگا لیکن پالیسی یہ کہی جاتی ہے کہ زبان کی تبدیلی اس طرح ہونی چاہیئے کہ کسی کو خلافِ معمول فائدہ یا نقصان نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں۔ اہلِ ہندی نفع میں رہیں گے ہی۔ غیر ہندی زبانوں والے چاہتے ہیں کہ (۱) جب تک ہندی کافی ترقی نہ کرلے اسے انگریزی کی جگہ نہیں دینی چاہیئے (۲) جب تک وہ لوگ ہندی پر عبور نہ کرلیں اُس وقت تک مرکز کا کام انگریزی میں ہونا چاہیئے۔

پنڈت نہرو کی یقین دہانی بھی تو تھی کہ جب تک غیر ہندی علاقے آمادہ نہ ہوں گے ہم انگریزی کو برقرار رکھیں گے حل یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ انگریزی اور ہندی بہ یک وقت مرکز میں استعمال ہوں۔ اس دو زبانیت BILINGUALISM کے کیا معنی ہیں؟ کیا سارا کام دونوں زبانوں میں ہوگا یا سرکاری ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ کوئی سی ایک استعمال کرے۔ گزٹ، قانون، اعلان، رپورٹیں وغیرہ تو دو زبانوں میں ہو سکتی ہیں لیکن دفتر میں فائل پر ایک ہی زبان میں لکھا جائے گا۔ کیا ہر ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنا نوٹنگ حسبِ منشا انگریزی یا ہندی میں کرے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ملازم انگریزی اور ہندی دونوں میں ماہر ہو۔ اگر یہی ہونا ہے تو انگریزی اور ہندی میں سے ایک زبان کا علم اور استعمال خواہ مخواہ کا اضافہ ہی ہوا۔

ریاستوں سے کس زبان میں مراسلت ہوگی؟ ہندی، مراٹھی، گجراتی صوبوں سے ہندی میں اور بقیہ سے

---

[1] لسانی جائزۂ ہند جلد ۹ ص ۵۵

انگریزی میں، لیکن مرکز کے ہر محکمے کو ریاستوں سے مراسلت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہوئے کہ ہر مرکزی نوکر کو انگریزی اور ہندی دونوں جانتی ہوں گی لیکن گارنٹی تو یہ دی جاتی ہے کہ کسی کو ہندی نہ جاننے کی وجہ سے ملازمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔ اگر محض انگریزی مرکزی ملازمت کے لئے کافی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکز کا کام محض انگریزی میں ہوگا دونوں زبانوں میں نہیں۔ ہندی کا استعمال صرف ہندی ریاستوں سے مراسلت کے لئے ہوگا۔ پھر مشکل آتی ہے۔ یوجنا کمیشن کو ریاستوں سے بہت سابقہ پڑتا ہے یا تو اس کے ہر ملازم کو ہندی بھی جاننی چاہیئے یا ہندی ریاستوں کے متعلقہ دفتروں میں مرکز سے انگریزی میں کاغذات وصول کئے جائیں اور انگریزی میں جواب اور رپورٹیں بھیجی جائیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ مرکز سے انگریزی میں کوئی رپورٹ آتی ہے تو صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں اسے چاک کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مرکزی دفتروں کی زبان انگریزی رہے گی۔ دو زبانوں کی بات خود فریبی ہے۔

ایک اہم مسئلہ ہے مرکزی ملازمتوں کے ذریعۂ امتحان کا۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کیونکہ اس کا تعلق نہ صرف روٹی سے بلکہ اقتدار سے بھی ہے۔ ظاہر ا انگریزی کی جگہ ہندی کو دلانے کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی ذریعۂ امتحان بنا دیا جائے اور ہندی والا یہی مانگتا ہے لیکن اس طرح ہندی والوں کو بے جا سہولت مل جائے گی۔ ہار کر یہ تجویز کیا گیا کہ سب زبانوں کو ذریعۂ امتحان بنا دیا جائے۔ آج یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شگوفہ جنوبیوں نے چھوڑا ہے لیکن در اصل بمبئی میں آگ لگانے والی جمالو کانگریس ورکنگ کمیٹی ہے۔ ۴-۵ اپریل ۵۴ء کو ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ یہ امتحان ہندی، انگریزی اور دوسری خاص زبانوں میں ہوں گے۔ یہاں سے اشارہ پاکر مدراس لیجسلیٹو کونسل نے ستمبر ۱۹۵۵ء میں رزولیوشن پاس کیا کہ "یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں انصاف برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دستور میں درج کی ہوئی تمام زبانوں میں امتحان ہوں اور ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اسامیوں کی تعداد (کوٹہ) مقرر کر دی جائے۔" چونکہ ہم مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے پرچوں کو ایک معیار سے پرکھنے کا کوئی طریقہ نہیں اس لئے یہ ضروری ہوا کہ زبان وار یا ریاست وار حصہ مقرر کر دیا جائے۔ کوٹہ مقرر کرنے پر ہندی والوں کو بھی اعتراض نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بہ صورتِ موجودہ ہندی والے اپنی تعداد سے کم منتخب ہو پاتے ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ ملازمتوں میں حصہ مقرر کرنے کے بعد فوج میں بھی کوٹہ کی بات کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ اس لئے مرکزی حکومت بجا طور پر ان دونوں قاتل تجویزوں کو مسترد کر رہی ہے۔

رفتہ رفتہ مختلف ہائی کورٹوں کا کام بھی علاقائی زبانوں میں ہوگا۔ اس طرح ہمارا بیش بہا نظامِ انصاف بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ کچھ ہندی ریاستیں اپنے ہائی کورٹ کا کام ہندی میں شروع کرنا چاہتی تھیں۔ سرِ دست مرکز نے ان کی جلد بازی کو لگام دے دی ہے۔

یہ علاقائیت ملک کو پاش پاش کر کے چھوڑے گی۔ پندرہ بیس سال بعد ہندوستان کا کیا نقشہ ہوگا۔ ہر ریاست کی تعلیمی درسگاہوں، دفتروں، عدالتوں میں علاقائی زبان میں کام ہوگا۔ ملک بارہ آب بند خانوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ مینارِ بابل کی طرح ایک کی بات دوسرا نہ سمجھے گا۔ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں پروفیسر یا ریسرچ اسکالر نہ جا سکیں گے۔ ہر شخص کی تعلیم، تصنیف، تحقیق اپنی زبان کی حدود میں بند رہ جائے گی۔ ملک گیر اخبار ختم ہو جائیں گے۔ وکیل بحث کے دوران دوسرے ہائی کورٹوں کے فیصلوں کی نظیر پیش نہ کر سکیں گے۔ ابھی ایک قاعدہ ہے کہ ہر ریاست میں آئی اے ایس افسروں اور ہائی کورٹ ججوں کی ایک مقررہ تعداد باہر کی ریاستوں سے لی جاتی ہے دس پندرہ سال بعد یہ کیونکر ممکن ہوگا۔

لے On Language problem از ایم۔ پی۔ دیسائی ص ۱۰۹ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۶۲

ملک کی وحدت اور سالمیت کے لئے ضروری ہے کہ ایک منسلک کرنے والی زبان (LINK LANGUAGE) ہو۔ دوسری زبان والوں کو اس مشترک زبان کا معمولی کام چلاؤ علم کافی نہیں بلکہ اس پر اتنا عبور ضروری ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کر سکیں۔ ابھی ایسی زبان انگریزی ہے۔ بعد میں ہندی کو اس کی جگہ لینا چاہیئے۔ انگریزی ابد الآباد تک تو ہندوستان کی مشترک زبان رہ نہیں سکتی۔ ہندی کے لئے ملک کے بہت سے حصے تیار نہیں۔

شروع سال میں ہندی کے برائے نام مرکزی زبان کردینے پر تامل علاقے میں کتنا شدید ردِّ عمل ہوا۔ کئی سال پہلے آسام میں بنگالیوں کے خلاف بڑا فساد ہوا تھا۔ تامل علاقے میں سات جوانوں نے ہندی بیزاری ظاہر کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی دیدی۔ پولیس کی گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ ہمیں خودکشی کرنے والوں سے ہمدردی ہے لیکن ہم لسانی جنون کی تائید نہیں کرسکتے۔ مدراسیوں کی دیکھادیکھی کیرالا، میسور، آندھرا، بنگال اور آسام سب نے واضح کردیا کہ وہ عرصے تک انگریزی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور ہندی نہیں چاہتے۔ پنجابی بولنے والے سکھ، کشمیری اور اُردو والے ظاہر ہے کہ ہندی کے بڑے شیدائی نہیں۔ مئی ۱۹۶۵ء میں پنجاب کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی جو بیٹھک ہوئی اس میں یہی طے پایا کہ ابھی انگریزی کا چلن رہنا چاہیئے۔ اُڑیسہ غیر جانبدار ہے۔

مدراس میں ہندی کی اتنی مخالفت ہے کہ سہ زبانی فارمولے کے تحت کبھی بھی ہندی کو لازمی نہیں کیا جاسکا، اور موجودہ حالت میں کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ اپنی مرضی سے ہندی پڑھنے والوں کی تعداد حوصلہ افزا ہے۔ زبردستی کی گئی تو وہ بھی چھوڑ دینگے۔ بہتر ہے کہ ابھی انگریزی کو چلنے دیا جائے۔

ہمیں شکر کرنا چاہیئے کہ غیر ہندی علاقوں کے لوگ تامل یا کنڑ یا بنگالی کو ہندی کے ساتھ مرکزی زبان بنانے کی مانگ نہیں کررہے ہیں، صرف انگریزی کا چلن چاہتے ہیں۔ انگریزی سے ہم بھی واقف ہیں اور ہمیں بھی اس کو سیکھتے رہنا ہے۔ ملک کی سالمیت کے لئے یہ کتنی تھوڑی قیمت ہے، لیکن ہندی والا اسے بھی دینے کو تیار نہیں۔ وہ جوابی کارروائی کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا وہ اتنی جلد بھول گیا کہ ۱۸ سال پہلے مذہب کے نام پر ملک تقسیم ہوا۔ ایسی نوبت نہ آنی چاہیئے کہ کوئی زبان کے نام پر بھی مطالبہ کرے۔ ہندی کے شاعر اور سرکاری زبان کمیشن کے ممبر رام دھاری سنگھ ڈنکر نے کیا خوب کہا تھا۔

"جمہوری نظام میں عموماً اکثریت حکومت کرتی ہے لیکن زبان، مذہب اور کلچر جیسے بنیادی سوالوں پر اکثریت نہ صرف اقلیتوں سے سمجھوتہ کرتی ہے بلکہ ان کو اپنی ترقی کا پورا موقع دیتی ہے۔"[1]

اہلِ دکن تیزی سے ہندی پڑھ رہے ہیں۔ انھیں نہ چھیڑو۔ بیس پچیس سال میں خود ہی مان جائیں گے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ ع "ذرا آہستہ لے چل کاروانِ عشق و مستی کو" ملک کی وحدت اور ہندی میں تصادم ہو تو ہندی کو دوسری جگہ لینی ہوگی۔

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۹۵

ڈاکٹر خلیق انجم

لہر لہر ندیا گہری

(ایک مطالعہ)

آزادی کے بعد سے ہم نے تحقیقی اور تنقیدی میدان میں بہت سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ خاص طور پر سائنٹفک تحقیق کا تو آغاز ہی پچھلے دس برسوں میں ہوا۔ لیکن کسی زبان کی ترقی کی رفتار دیکھنے کے لئے اُس کے تحقیقی اور تنقیدی نہیں بلکہ تخلیقی کارناموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں فارسی کا بہترین تحقیقی کام ہوا ہے۔ بیشتر مستند لغات اسی زمانے میں تالیف ہوئی ہیں لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب اوّل تو کیا دوسرے اور تیسرے درجہ کے شاعر اور ادیب بھی پیدا ہونا بند ہوگئے تھے۔ یہی حال اب اُردو ادب کا ہے۔ اگر ۴۷ء سے ۶۴ء تک کی اوّل درجے کی تصنیفات کی فہرست بنائیں تو یہ بہت مختصر ہوگی۔ اور دوسرے اس میں نوّے فیصدی کتابیں اُن لوگوں کی ہیں جو آزادی سے بہت قبل میدان میں آچکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اچھا خاصا کلام آزادی سے قبل کا کہا ہوا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُردو میں نئے شاعر اور ادیب پیدا ہونا بند ہوگئے ہیں۔ گویا ادب کی رگوں میں تازہ خون نہیں پہنچ رہا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو پھر کبھی ہوگی، مختصر یہ ہے کہ

۱۔ نئی نسل کو وہ ادبی ماحول نہیں ملا، جو اُن کے پیشروؤں کو نصیب تھا۔

۲۔ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو زبان کی مقبولیت تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ نوجوان دوسری زبانوں کی طرف متوجہ ہیں۔

۳۔ مشاعرے نئی نسل کے شاعروں کی بہترین درس گاہ تھے، اور اب وہ تربیت گاہوں کے بجائے سستی قسم کی تفریح گاہیں ہیں۔

۴۔ کوئی ایک ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جو ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کرتا ہو، اور انھیں اُردو داں طبقے سے روشناس کراتا ہو، بالفاظِ دیگر اُن کی آواز دوسروں تک پہنچانے کا کوئی موثر ذریعہ نہیں ہے۔ زبیر رضوی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں غلط نہیں لکھا کہ "نئی نسل کو یہ بھی شکوہ ہے کہ اسکی آمد پر محفلِ ادب میں نہ صدائے تحسین بلند ہوئی اور نہ ہی اہلِ نظر نے ان کی راہوں میں حوصلہ افزائیوں اور قدردانیوں کے پھول نچھاور کئے۔"

۵۔ ایک طرف شاعر کو شہرت اور مقبولیت نصیب نہیں ہوتی اور دوسری طرف کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا۔

۶۔ اُردو پبلشرز کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ اکثر شاعر اپنا مجموعۂ کلام خود شائع کراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

ایسے ادبی ماحول میں زبیر رضوی کی لہر لہر ندیا گہری "نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ پچھلے سترہ برسوں میں جوان نسل کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں، ان کی کتنی ہی مختصر فہرست بنائیے آپ اس کتاب کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔

زبیر نئی نسل کے حساس اور ذہین شاعر ہیں۔ وہ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کے شکار رہے ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کو جس طرح دیکھا اور سمجھا ہے اسے الفاظ کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ اندازِ فکر اور طرزِ بیان کی جدت نے انکے فن پاروں کو تازگی اور شگفتگی بخشی ہے۔ اس مجموعے میں زبیر کی نظمیں، غزلیں، گیت اور دوہے شامل ہیں۔ سب سے پہلی نظم بیکراں ہے جو خیال اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے اُن کی بہترین نظموں میں ہے۔ مرکزی خیال صرف یہ ہے کہ شاعر سرگرمِ سفر رہنا چاہتا ہے، وہ راستوں اور منزلوں سے بے نیاز ہے۔ اُسے نہیں پتہ کہ وہ کہاں سے چلا تھا، وہ بے خبر ہے کہ اُسے کہاں پہنچنا ہے۔ لوگ اُس سے سوال کرتے ہیں تم کون ہو؟ کہاں جارہے ہو؟ کون سا شہرِ تمنّا تمہاری منزل ہے؟ شاعر کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ بقولِ زبیر

سوالوں کو مرے شوقِ سفر کی آگہی دیتے
نظر اُٹھتی، خلا کی وسعتوں میں ڈوب کر کہتی
اُفق کے پار، سُورج کے سنہری بام سے آگے
زمین و آسماں کی سرحدیں جس جا پہ ملتی ہیں
مرا شہرِ تمنّا ہے وہیں تک مجھ کو جانا ہے
یہ دنیا مجھ کو دیوانہ سمجھ کر مجھ پہ ہنستی ہے

اِس نظم میں ماورائیت نہیں۔ یہ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار نہیں، بلکہ زمین پر رہتے ہوئے آسمان کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کی تمنّا ہے۔ انسانیت کے لئے کوئی غیر معمولی کام کرنے کی آرزو ہے۔ اس تمنّا نے ہر دور کے ذہین لوگوں کے دماغ و دل کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری نظم "تبدیلی" ہے جس میں شاعر صبح کے وقت ننھے بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جو گردن میں بستے لٹکائے ایک دوسرے کی اُنگلیاں پکڑے رقص کرتے اور گنگناتے اسکول کی طرف جارہے ہوتے ہیں۔ یہ منظر شاعر کی دیرینہ آرزو کو جگادیتا ہے۔ اور اس کا جی چاہتا ہے

ایک ننھے کی اُنگلی پکڑ کر کہوں
مجھ کو بھی اپنے اسکول لیتے چلو
تاکہ یہ تشنۂ آرزو زندگی
پھر سے آغازِ شوقِ سفر کرسکے

ناکامیٔ محبت کی داستانیں سب ہی شاعروں نے سُنائی ہیں۔ اُن میں بعض شاعروں نے اپنی کہانیاں بیان کی ہیں۔ اور بعض نے محض رسمی مضامین باندھے ہیں۔ زبیر کے ہاں اس موضوع پر اچھی خاصی نظمیں ہیں، لیکن اُن میں درد، کسک اور سوز و گداز کے ساتھ ساتھ جو واقعیت ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محض رسمی باتیں نہیں۔ شاعر کی قلبی واردات ہیں۔ اُس نے عشق میں دل و گریباں دونوں چاک کئے ہیں۔ اور بقولِ زبیر:۔

ہم وہ آوارۂ منزل کہ جہاں سے گذرے
اُنگلیاں اُٹھی ہیں، چرچے ہوئے، افسانے بنے

اس سلسلے میں نقشِ فریادی۔ گریزپا۔ اندیشے، شکست، سراب اور مصالحت قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ ان تمام نظموں میں

شاعر ہیں

حسنِ بیان نے دلکشی پیدا کی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال دوں گا۔ "سراب" نظم میں جب کوئی مائل بہ کرم تھا۔ اور

اُفق کے پار بہت دیر سے کوئی آنچل
اُڑا رہا تھا کہ دستِ اُمیدوار بڑھے
کچھ ایسا پیار جھلکتا تھا اُن نگاہوں میں
کہ شہرِ دل میں وفاؤں کا اعتبار بڑھے

وہ ایک صبح کہ آئے تھے میری راہوں میں
ہزار غم کہ ہمیں کس پہ چھوڑے جاتے ہو
یہ دل کے ساز یہ نغمے یہ قول یہ وعدے
قصور کیا ہے جو تم ان کو توڑے جاتے ہو

مجھے بلاتی رہیں بے شمار آوازیں
قدم قدم مرے دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
مگر وہ آنکھ جو اپنی طرف بلاتی رہی
ہر ایک راہ پہ جو فرشِ گل بچھاتی رہی

اُس آنکھ کے جادو نے شاعر کو اِس طرح مست اور بے خود کیا کہ تمام رکاوٹوں کے باوجود اُس کے قدم والہانہ آگے بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا۔

یہ ایک صبح کہ میں دُور افق کے پار کھڑا
لُٹا کے اپنی متاعِ وفا پشیماں ہوں
ہر ایک شخص کا دامن پکڑ کے کہتا ہوں
میں ایک طفل جو رنگینیوں میں میلے کی
کچھ ایسا کھویا کہ ساتھی بچھڑ گئے میرے
جو ہو سکے تو مجھے اُن کے پاس پہنچا دو
غریبِ شہر ہوں راہوں کے موڑ سمجھا دو

زبیر نے نظموں میں ایک خاص افسانوی انداز پیدا کیا ہے۔ وہ پوری نظم میں کوئی خیال یا واقعہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن آخری مصرع، شعر یا بند سے بات بالکل بدل جاتی ہے۔ پڑھنے والے کے دماغ کو جھٹکا لگتا ہے اور وہ چونک اُٹھتا ہے۔ "نیا جنم" کا پہلا بند ہے ۔

اجنبی جان کے اک شخص نے یوں مجھ سے کہا
وہ مکاں، نیم کا وہ پیڑ کھڑا ہے جس میں
کھڑکیاں جس کی کئی سال سے لب بستہ ہیں
جس کے دروازے کی زنجیر کو حسرت ہی رہی

شاعر ہمیں

کوئی آئے تو وہ ہاتھوں میں مچل کر رہ جائے
شورِ بے ربطیٔ آہنگ میں ڈھل کر رہ جائے

وہ شخص اجنبی کو قصہ سُناتا ہے کہ اس مکان میں ایک مہتاب صفت شہزادہ رہتا تھا، جو چاندنی راتوں میں اشعار کہا کرتا تھا۔ جس پر بستی کے تمام خوبرو جان و دل سے واری تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک رات کو ایک پری تختِ سُلیمانی پر آئی، اور شہزادے کو اُڑا کر لے گئی۔ اِس طرح بستی کے لوگ اپنے شاعر سے محروم ہو گئے اور خوب رُویوں کا جانِ وفا چلا گیا۔ اس کے بعد آخری شعر کا دوسرا مصرع پڑھنے والے کو چونکا دیتا ہے۔ اور پُوری نظم کا تاثر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔۔ وہ شعر یہ ہے

اجنبی جان کے اک شخص نے یوں مجھ سے کہا
میں مگر سوچ رہا تھا کوئی پہچان نہ لے

اگر نظم کے شروع ہی میں یہ بتا دیا جاتا کہ اجنبی وہی شہزادہ تھا، تو یقیناً یہ نظم اپنے تاثر کے لحاظ سے اتنی کامیاب نہ ہوتی۔ "خود فریبی" کے پہلے بند میں شاعر "جواں رات" کی دلکشی اور رعنائی بیان کرتا ہے۔ دوسرے بند میں وہ کسی حسینہ کو رقص کی دعوت دیتا ہے ؎

آؤ پھر آج پگھل جاؤ مری باہوں میں
اور اک رات مچل جاؤ مری باہوں میں
تم امانت ہو کسی "شوق" کسی "ارماں" کی
تم سدا وقت کے ہاتھوں میں نہ رہ پاؤ گی
اور اک رقص کریں ساعتِ دلدار کے ساتھ
اور اک رات کٹے کاکل و رخسار کے ساتھ

اس بند کے بعد شاعر صرف ایک شعر سے پُوری نظم کا تاثر بدل دیتا ہے۔

کل کسی شخص سے یہ راز چھپانا ہے تمہیں
تم نے ماضی میں کسی مرد کو اپنایا ہے

اسی طرح "ستم ناآشنا" میں شاعر ایک بھولی بھالی سیدھی سادی لڑکی کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا ہے۔ قدم قدم پر اُس جال سے خبردار کرتا ہے جو ہوس کی عیّاریوں اور مکّاریوں نے پھیلا رکھے ہیں۔ نظم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

تم بہت سادا بہت بھولی بہت سیدھی ہو
اور کچھ دُور ابھی تم مرے ہمراہ چلو
راستے شہرِ تمنا کے ہیں پُر پیچ بہت
خود کو یوں تیزیٔ رفتار پہ مائل نہ کرو

پانچ بندوں میں شاعر اُس معصوم حسینہ کو بتاتا ہے کہ زندگی مصر کا بازار ہے۔ جہاں بغداد کے لٹیرے، کھوٹے سکوں میں کھرا مال چکا لیتے ہیں۔ یہاں ہر قدم پر خضر ملتے ہیں جو قافلے والوں کو گمراہ بنا دیتے ہیں۔ یہاں "شیخ" اور "شاہ" رہا کرتے ہیں۔ جن کے ایوانِ طرب ہر رات عیش و عشرت کے نئے سامان مانگتے ہیں۔ شاعر اسی طرح

سمجھا تا چلا جاتا ہے، اور اچانک غیر متوقع طور پر آخری بند میں بات بدل جاتی ہے۔

تم بہت سادہ بہت بھولی بہت سیدھی ہو
یوں مجھے چھوڑ کے تنہا نہ تمہیں جانا تھا
زندگی مصر کا بازار ہے جس کے تاجر
حسنِ بے مثل کو بے دام اُٹھا دیتے ہیں

اسی نوعیت کی افسانوی نظموں میں "غمگسار" اور "عشقِ ستم پیشہ" بڑی خوبصورت نظمیں ہیں۔

زبیر برسوں سے دہلی میں ہیں۔ لیکن اُن کا وطن یو، پی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں کے لوگ ابھی وہ عیّاری اور مکاری نہیں سیکھ پائے ہیں جو شہروں میں عام ہے۔ جہاں ابھی انسان اتنا خود غرض نہیں ہوا کہ کسی کے دُکھ درد میں شریک نہ ہو سکے۔ جہاں ابھی تک سادگی اور سچائی باقی ہے، زندگی نے جھوٹ اور خود فریبی کا فن نہیں سیکھا ہے۔ تصنّع اور بناوٹ کی نقاب چہرے پر نہیں ڈالی ہے۔ زبیر کو اس زندگی سے نفرت ہے۔ جس کا اظہار بہت سی نظموں میں ہوا ہے۔ "سوگند" اور "زندگی" اِن دونوں "یہ دونوں نظمیں اسی موضوع پر ہیں۔" پس منظر" کا ایک بند یہ بھی ہے

یہ دوکانیں، یہ تصاویر، یہ فلمیں، یہ کلب
راک اینڈ رول کے بولوں پہ تھرکتے ہوئے لب
درسگاہیں، یہ کتابیں، یہ رسائل، یہ ادب
اُن سے پوچھے کوئی نوخیز نگاہوں کی طلب
فکر و فن، ذہن و خرد اب کہاں بازاروں میں
جنس اور جسم کا سودا ہے خریداروں میں

ایک غزل کی ردیف ہی "شہروں میں" ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں۔

سچّے مال کی گٹھڑی لیکر یوں نہ چلو بازاروں میں
آگے پیچھے گھات لگائے لُوٹ کھڑی ہے شہروں میں
ہائے یہ اپنی سادہ مزاجی، ایٹم کے اس دور میں بھی
اگلے وقتوں کی سی شرافت ڈھونڈ رہی ہے شہروں میں

دیہی زندگی کی محبت ہی نے زبیر سے "برہن" جیسی نظم لکھوائی ہے۔ جس میں اس زندگی کے ایک پہلو کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ اسی محبت نے اُن سے گیت لکھوائے ہیں جن پر اُردو ادب فخر کر سکتا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم گذرے ہوئے گیت کاروں کے حالات زندگی جاننے کے لئے سخت محنت اور تحقیق و تدقیق سے کام لیتے ہیں۔ انکے گیت مرتب کرتے ہیں۔ اور خود اپنے عہد کے اُن شاعروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو گیت لکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے اُردو میں گیتوں کی اتنی کمی ہے۔ زبیر کو یہ احساس ہے کہ گیت لکھنے والوں کی اُردو ادب میں وہ عزت و توقیر نہیں جو غزل گو شعرا کو حاصل ہے۔ تبھی تو کتاب کے دیباچے میں اُنھیں لکھنا پڑا "گیتوں کے اس مختصر سے سرمائے کو پیش کرتے ہوئے مجھے غیر معمولی خود اعتمادی کا احساس ہو رہا ہے اور اگر آپ میری اس خود اعتمادی کو سندِ قبول نہ بھی عطا کریں تو مجھے دُکھ نہ ہوگا۔"

زبیر کے بعض گیتوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ پچھلے چھ سات سال سے جب بھی کسی مشاعرے میں وہ مائک پر آتے ہیں، سامعین اُن سے گیتوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ خاص طور پر "یہ ہے میرا ہندوستان" اور "کسان راجہ" تو انھیں سیکڑوں بار

مشاعروں میں پڑھنے پڑے ہیں۔ زبیر کے اچھے گیتوں میں سوا گت، میت مو ہے ناہی ملن میلے میں، کون سا گیت سناؤں سجنی کون سی لے میں گاؤں، اور "یوں نہ برس او کاری بدریا" ہیں۔ انھوں نے نیلا پرچم، کورس، اور جاگ اے انسان، جیسے گیت بھی لکھے ہیں۔ جن میں صرف وہی باتیں کہی ہیں۔ جو ایک زمانے میں تمام ترقی پسند شاعروں کو کہنی ضروری تھیں۔ ان گیتوں میں کوئی خاص بات نہیں کہی گئی۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر کو مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی ہے۔ اس کا اظہار بہتر طریقہ سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

کتاب کے آخر میں "کبیر رنگ" کے عنوان سے کچھ منتخب "چوپائیاں" ہیں جنھیں زبیر نے دوہوں کی ٹیکنک کے مطابق اپنایا ہے۔ ان چوپائیوں کا حسن ان کی زبان ہے۔ ہندی الفاظ کے برجستہ استعمال نے ہر چوپائی میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ "کبیر رنگ" میں مندرجہ ذیل خیالات سنئے

(۱)

بھور بھئے پنگھٹ آئی ہوں قدم قدم کو تول
ساجن میرے پاس ہیں کاگا دھیرے دھیرے بول
ڈر لاگے مو ہے بول نہ اٹھے گاگر، رسی، ڈول
بند پڑی ہے جیون پستک کھائے نہ کوئی کھول

(۲)

بگیا، کھیت، منڈیا، جنگل، پنگھٹ، ندیا، گھاٹ
چھوٹ گئے سب پیار میں تیرے بھول گئی سب ٹھاٹ
ٹوٹ گئے سب رشتے ناطے نیندیں ہوئیں اچاٹ
لوٹ کے آجا بیرن منوا دیکھوں تیری باٹ

(۳)

سن ری سکھی میں تجھ کو بتاؤں کون مرا من میت
روپ سلونا اس کے گلے میں جھرنوں کا سنگیت
اردو میں وہ نظمیں لکھے اور ہندی میں گیت
بوجھ سکھی کیا نام ہے اس کا کون میرا من میت

زبیر نوجوان شاعر ہیں۔ انہیں محفلِ ادب میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، لیکن اس مختصر سے زمانے میں انھوں نے پڑھنے والوں اور مشاعرہ سننے والوں دونوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنالی ہے۔ ان کی فکر میں جو گیرائی اور گہرائی ہے اور انکے طرزِ بیان میں جو بانکپن کے ساتھ پختگی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان میں جن فنکاروں کے ہاتھ میں اردو کا مستقبل ہے ان میں وہ بھی ایک ہیں۔

ظفر احمد نظامی

باسط بھوپالی کی غزل میں جدید رجحانات

باسط مرحوم مالوہ کے اُس خطہ کی پیداوار تھے جسے علم و ادب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ جہاں سرسبز و شاداب لہلہاتی ہوئی فضائیں رُوح پرور قدرتی نغمات بکھیر کر زندگی میں رُومانی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ جہاں خوب صُورت پہاڑیوں کی بلندیاں اور تالابوں کی گہرائیاں ذہنِ انسانی کے فکر و شعور کو نکھار کر شعر و ادب کی تخلیق پر اُکساتی ہیں۔ جہاں کی حسین صبح اور خوب صُورت شام کی طلائی کرنیں فنکار کے احساس کو اُبھار کر پختہ بناتی ہیں اور جہاں کی راتیں "شبِ مالوہ" سے خنکیاں جذب کر کے فکر و شعور میں کنول کھلاتی ہیں۔ کون ہے جو اِن رُومان پرور فضاؤں سے متاثر نہ ہو؟ یہی وجہ ہے کہ خطۂ بھوپال کا ہر شاعر غزل کا دلدادہ ہوا اور اِسی لئے حضرت باسط مرحوم بھی اڑتیس ۳۸ سال تک لیلیٰ غزل کی زلفیں سنوارنے میں مصروف و منہمک رہے۔ وہ زندگی کی تڑپ سے آشنا تھے اور اُن کے ذہن میں جذبہ کی گرمی تھی۔ وہ جگر مرحوم کی طرح ایک اچھے انسان تھے اِسی لئے اچھے اشعار کہہ سکے۔ اُن کے نزدیک "شعر ایک ایسا آئینہ رہا جس میں شاعر کے کردار کی پُوری پُوری تصویر منعکس ہو کر فریب کے پردے خود بخود چاک کر دیتی تھی"۔ اور اس کی مثال خود ان کا وجود تھا۔ وہ اپنی غزل میں ایک خوب صورت انفرادیت پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ ان کے یہاں بلند خیالی اور فکر و تجسس کا حسین امتزاج ہے۔

غزل کی خوب صورت اور رنگین فضا میں بھی اُنھوں نے اپنے دَور میں رُونما ہونے والے حادثات و واقعات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ وہ اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اُن کی غزل داخلی اور خارجی کیفیتوں کا آئینہ ہے۔ اُنھوں نے سہل پسندی پر دشوار پسندی کو ترجیح دی اور شاعری کو "شر" کے مقابلہ میں "خیر" کے لئے استعمال کیا۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

میری دشوار پسندی کے لئے کیسی مشکل ہو جو مشکل نہ رہے

اُنھوں نے میر، غالب، مومن، نسیم، اقبال، حسرت، سہا، اصغر اور فانی کے کلام کا تاثر قبول کیا اور ان کی لَے میں لَے ملانے کی سعی کی۔ غالب کا اندازِ بیان ان کی اپنی شخصیت کا تابع ہے، باسط نے اُسے اپنانے کی کوشش ضرور کی مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اِس کوشش میں وہ حسبِ منشاء کامیاب ہوئے۔

باسط زمانہ اور اہلِ زمانہ کے سلوک کے شاکی رہے اور ناقدر شناسی سے ملول بھی۔ ہندوستان کے عوام مُردہ پرستی کے شکار رہے ہیں، فنکار کا مقام اس کی وفات کے بعد ہی متعیّن کرتے ہیں، زندگی میں اس کی پروا بہت کم کرتے ہیں، ایسے ہی حالات نے باسط کو بھی اہلِ وطن سے یہ کہنے پر مجبور کیا ؎

اب آئیں اہلِ وطن تبصرے کریں مجھ پر
خود اپنی بزم میں بیٹھا ہوں اجنبی کی طرح

افسوس کہ اہلِ جہاں انسان کو دولت کی میزان میں تولتے ہیں اسی لئے اربابِ علم و فن کی ناقدری ہوتی ہے۔ باسط مرحوم کو

بھی اسی کا صدمۂ عظیم رہا اور اُنھوں نے کہہ ڈالا ؎

میرے خالی ہاتھ پہ ہنسنے والوں سے یہ کون کہے　　ہاتھ میں میرے گہری گہری علم کی ریکھا آج بھی ہے

اہلِ وطن سے اُن کا خطاب ہمیشہ مایوسانہ ہی رہا جس کا اظہار اُنھوں نے جا بجا اپنے کلام میں کیا ہے۔ حضرت تنہا مجددی کی وفات پر کہے گئے مرثیہ میں اپنے اس خیال کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دل مرا خاکِ وطن سے خوش بھی ہے ناخوش بھی ہے　　جتنی مردم خیز ہے اتنی ہی مردم کُش بھی ہے

اُنھوں نے اپنی زندگی کے اڑتیس سال شعر و ادب کی نذر کیے، وہ اپنے اشعار سے اہلِ وطن کو محظوظ کرتے رہے مگر اُن کی سرد مہری سے ان کے دل پر ضرب کاری پڑی اور اُنھیں کہنا پڑا ؎

جو نہ سمجھیں درد کیا ہے درد کا احساس کیا　　کب تک اُن کے واسطے باسطؔ غزلخواں ہائے ہائے

وہ زمانہ کی ناقدری کے باعث خوشی اور اطمینان کی زندگی کو بھی اپنے مزاج کے مطابق نہ بنا سکے، اور یہ دورِ انبساط بھی انھیں راس نہ آیا جس کا اظہار کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا ہے ؎

خوشی کے دور بھی دیکھے ہیں ہم نے اے باسطؔ　　مگر یہ دور مجھے سازگار کم آئے

غزل داخلی صنفِ سخن ہے۔ غزل کا شاعر داخلیت کے حصار میں بند اور دُروں بینی کا شکار ہو جاتا ہے مگر باسطؔ نے خارجی کیفیات کی عکاسی اور ترجمانی بھی کی ہے چنانچہ میں ان کی غزل کے اسی پہلو پر روشنی ڈالوں گا جس میں اپنی ہی کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے اور حوادث و آلامِ زمانہ کا ذکر ہے۔

وطن ہزارہا مصائب سہنے اور لگاتار جد و جہد کرنے کے بعد انگریزی سامراج کے آہنی شکنجوں سے آزاد ہوا، آزادی ملی تو نئے نئے رہبر بھی منظرِ عام پر آئے، سب نے اندھیروں میں تیر اندازی شروع کی، انھیں رہنماؤں سے باسطؔ کو شکایت رہی جن سے مسائل تک حل نہ ہو سکے۔ رہنماؤں کی غلط روی اور کسی خاص منزل کے متعین نہ ہو سکنے کا انھیں شدید احساس تھا اور اسی پر اُنھوں نے اظہارِ افسوس بھی کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہر قدم نئے رہبر، ہر نظر نئی منزل　　کارواں یہی ہے تو ہائے کارواں اپنا

ایک اور شعر میں کہا ہے ؎

راہزن ہی وہ نکلا بالآخر　　رہنما جس کو اپنا بنایا

ماضی کے سنہرے اوراق نظر کے سامنے پھرنے لگے اور حال کی مصیبت زدگی اور پریشانی نے مستقبل کے چہرے پر غم کی گرد پھیلا دی، حالات اور گردشِ زمانہ نے انسان کا رُخ موڑ دیا، باسطؔ تحیر خیزی سے اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اس دارِ فتن میں بھی یارب یہ دورِ فتن پہلے تو نہ تھا　　عبرت بہ لحد عبرت بہ کفن دنیا کا چلن پہلے تو نہ تھا

اپنے وطن کی خوب صورت فضاؤں پر چھائی ہوئی آلام و مصائب کی گھٹاؤں کو دیکھ کر کہتے ہیں ؎

ادبار و ہلاکت کا بادل یوں سایہ فگن پہلے تو نہ تھا　　ہر آنکھ سے سیلِ اشک رواں ہائے گنگ و جمن پہلے تو نہ تھا

ہیہم طرفِ دل چشمِ کرم ہر لحظہ ستم بالائے ستم　　ہاتھوں میں لیے اک دشنۂ غم ہر اہلِ وطن پہلے تو نہ تھا

رحمن کی عظمت اور شیطنت سے نفرت کا جذبہ قدیم ترین ہے باسطؔ نے دورِ حاضر کے انسان کے خیالات کا صحیح نقشہ کتنے اچھے پیرایہ میں کھینچا ہے۔ کہتے ہیں ؎

شیطان تھا لیکن شیطاں کی عظمت کے ترانے لب پہ نہ تھے　　انساں کے لہو سے آلودہ دامانِ وطن پہلے تو نہ تھا

شاعرعجبی

اس درجہ ہلاکت خیز نہ تھے تہذیبِ خرد کے دیوانے　　لاشہ کبھی انسانیت کا بے گور وکفن پہلے تو نہ تھا

جنگ کے ہولناک شعلے متوقع تھے، ہر طرف شرارے اُڑنے لگے تھے، زمین پر انسانوں کی نگاہِ حرص پڑنے لگی، ایک مُلک دوسرے ملک پر نظریں جما کر ہٹلر اور مسولینی کی طرح سامراجیت کے خواب دیکھنے لگا۔ بہت پہلے شاعرِ اعظم ٹیگور نے غلام ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھ کر اپنے وطن کے تابناک مستقبل کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے اہلِ دنیا کو وطن کا نیا مفہوم سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

where the world has not been broken up
into narrow domestic walls;

ایسے ہی خیال کی ترجمانی باسطؔ نے بھی کی ہے ؎

ہر سمت زمیں پر جنگ نہ تھی اللہ کی دنیا تنگ نہ تھی　　انساں کے تصوّر میں کوئی مفہومِ وطن پہلے تو نہ تھا

فرق صرف اتنا ہے کہ ٹیگور نے مستقبل کے لئے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا اور باسطؔ نے ماضی کی تاریخ کا ورق پلٹا ہے۔

"امن" جو ہر اچھّے فنکار کا نصب العین رہا ہے وہی باسطؔ کی اُمید کا بھی مرکز رہا۔ مگر وہ اس دَور کے ظلم و استبداد کو پسند نہ کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

عروسِ دہر کو غازہ بھی چاہیئے لیکن　　غبارِ جادۂ امن و اماں نہیں ملتا

اور پھر ستم رانوں کو بڑی جرأت سے مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

گُلشن گُلشن صحرا صحرا، پربت پربت، دریا دریا　　امن کو غارت کرنے والو، امن کا چرچا آج بھی ہے

باسطؔ نے دوشیزۂ امن کی عصمت کا بڑا الحاظ کیا ہے، وہ اس کی زُلفیں بریدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور ماہ و انجم والی دنیا کو سنوارنے کی جگہ اپنی ہی دنیا کو فردوس بنا دینا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

تو نے عقبیٰ کو فردوس بخشی　　ہم نے دنیا کو جنّت بنایا

وہ اپنی دنیا کے نظّاروں کی دل کشی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں ؎

حُسن یہیں ہے، عشق یہیں ہے، یہ بھی یہیں ہے طور یہیں　　روضۂ رضواں کچھ بھی ہو لیکن جنّتِ دنیا کیا کہیئے

اسی دنیا کے نکھار کے لئے وہ کوشاں رہے اس سائنس زدہ ایٹمی دَور میں اُنھوں نے انسان کی علمی و دماغی بلندی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کی پستی پر تنبیہ بھی کی ہے ؎

اے اہلِ خرد شرم، یہ کیا جہلِ خرد ہے　　دنیا کی تباہی پہ تُلے بیٹھے ہیں ذرّات

شاعر کے لئے جہانِ ماہ و انجم بلند ترین مقام سہی مگر دنیا کے جھمیلوں سے منھ موڑ کر وقتی و عارضی طور سے وہ اسی کے حسین تصوّر میں فرار اختیار کرتا ہے۔ باسطؔ ایسے شاعر کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سائنس زدہ دَور میں فلک پر انسانی پرواز کو برداشت کر سکتے اسی لئے کہتے ہیں ؎

ہزاروں عالمِ انوار ہیں پنہائے فطرت میں　　مہ و انجم کی دنیا منزلِ اہلِ نظر کیوں ہو؟

وہ اس ذہنی و سائنسی ارتقا سے مطمئن نہیں تھے، وہ خود ایک اچھے انسان تھے اسی لئے ایک مکمل انسان کی تخلیق چاہتے تھے ؎

تسخیرِ کائنات ہوئی بھی تو کیا ہوا　　جو خود ہو کائنات وہ انساں بنائیے

دنیا کی اس تباہ کن حالت سے پریشان ہو کر وہ جواب طلب کرتے ہیں ؎

کہاں ہیں کار پردازانِ عالم　　یہ دنیا کیوں جہنّم ہو گئی ہے

اس طرح موجودہ دنیا اور زندگی کی تباہ حالیاں دیکھ کر انھیں یقین نہیں آتا کہ یہ وہی دنیا ہے جہاں امن و سکون کی حکمرانی تھی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُن کے لئے وہ حیرت انگیز ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات ان سے کہلواتے ہیں ؎

دیکھ رہا ہوں اس طرح واقعۂ حیات کو
عالمِ خواب میں رہے جیسے خیال، خواب کا

ان کے نزدیک "زندگی" انتہائی اہم ہے۔ وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی اور زندگی کی تڑپ ہے وہ اس کی اہمیت اور ابدیت کا اعتراف کرتے ہیں ؎

یہ ہے تحقیق مرے دَور کے انسانوں کی
زندگی کی ابدیت کو نہ جھٹلا واعظ

اُنھوں نے انقلاب کو ایک نیا مفہوم دیا ہے جسے دورِ حاضر میں قابلِ اعتنا سمجھا جانا چاہیے ؎

انقلاب کچھ نہیں اتحاد کے سوا
اختلاف مٹ گیا، انقلاب ہو گیا

اسی طرح ایک اور جگہ کہا ہے ؎

کون حریف ہے مری منزلِ انقلاب کا
انجم و ماہ و آفتاب، قطرہ و موجہ و حباب

زندگی کی صعوبتوں اور مصیبتوں سے تنگ آکر اُنھوں نے دعا مانگی ہے ؎

اے خدا ان کے لئے اور زمیں پیدا کر
یہ جہاں قابلِ اربابِ تمنا نہ رہا

وہ تخریب میں بھی تعمیر کا پہلو تلاش کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ؎

نوائے قلب میں پیدا کر اضطرابِ تمام
شکستِ ساز سے تنظیمِ ساز کرتا جا

مُسلسل عزم اور جد و جہد پر اُنھیں پورا اعتماد ہے ؎

ہمواری رہ کے ضامن ہیں، ہموار نظر ہموار قدم
چلنے کا سلیقہ ہے جن کو ہر حال میں چلتے جائیں گے

مستقبل کے بارے میں اُنھوں نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی نظروں میں فن کی عظمت کا احساس و اعتراف ظاہر ہے ؎

لازم ہے نظامِ نو کے لئے نقاش نئے، فنکار نئے
تصویر یقیناً بدلے گی جب ہاتھ بدلتے جائیں گے

وہ اس دَورِ طمع میں بھی خلوص کی عظمت کے قائل ہیں اور ہر شئے میں اسی کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں ؎

سب کو درکار ہے اک روشنیٔ شمعِ خلوص
صبح کعبہ کی ہو یا شام صنم خانوں کی

بہرحال ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ باسط مرحوم غزل کے ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزل میں عصری شعور نمایاں طور پر کارفرما ہے۔
(یومِ باسط بھوپال کے ادبی جلسہ میں پڑھا گیا)

رفعت نواز

شام اور سائے

(تاثرات)

شام آتی ہے اپنے جلو میں لئے مختلف احساسات، جذبات، خیالات اور یادیں۔ ہر انسان کی زندگی میں شام ایسے ہی جذبات جگاتی ہوئی آتی ہے۔ مگر ہم اپنی مادّی اور معاشی اُلجھنوں میں ایسے اُلجھے رہتے ہیں کہ شام کا حقیقی لطف اُٹھا نہیں سکتے۔ شام ہوتے ہی جو خیالوں کے، یادوں کے، اور احساسات کے سائے پھیلتے ہیں اُن کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ حقیقت میں یہی وقت ہوتا ہے جب ہم کُنجِ تنہائی میں بیٹھ کر ان سایوں سے محوِ کلام ہوں، اور دن بھر کے اچھے بُرے کاموں کا محاسبہ کریں۔ ہم اُن بے شمار جذبات کو، لطیف احساسات کو بیان نہیں کر سکتے جو شام ہوتے ہی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ پریشان کرتے ہیں اور کچھ کہنے کے لئے اُکساتے ہیں۔ یہ کام ہمارے شاعر و مصنّف کرتے ہیں۔ ، ہم سب کی طرف سے نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ہمارے فرصت کے لمحات کو رنگین بناتے ہیں۔ اُن کیفیات کو، جذبات کو اور خیالات کو خوبصورت الفاظ میں گوندھ کر ہمیں ہی تحفے میں پیش کرتے ہیں۔ کتنا بڑا کام، کتنی بڑی خدمت شاعر و ادیب کرتے ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ آلائشِ دُنیا میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں اِس اہم خدمت کی طرف سنجیدگی سے دھیان ہی نہیں دیتے۔

ایسی ہی بڑی خدمت وزیر آغا نے بھی سر انجام دی ہے۔ اور ہمیں لطیف، خوبصورت، کیفیاتی اور تاثراتی نظموں کا ایک جاندار تحفہ پیش کیا ہے "شام اور سائے"۔

وزیر آغا اُردو ادب میں کئی حیثیتوں سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اور ہر حیثیت اُن کی منفرد ہے۔ بحیثیت نقّاد انھوں نے "اُردو ادب میں طنز و مزاح" اور "نظمِ جدید کی کروٹیں" یہ دو کتابیں پیش کر کے اپنی اہمیت بحیثیت نقّاد منوالی ہے۔ خیال پارے اُن کے انشائیوں کا مجموعہ ہے اور بلاشُبہ وہ منفرد انشائیہ نگار ہیں۔

اب اُن کی بکھری ہوئی نظموں کا مجموعہ "شام اور سائے" چھپ کر آیا ہے اور شعر و ادب کے دلدادگان سے داد حاصل کر رہا ہے۔ ویسے یہ بات بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرے اور دادِ سخن بھی پائے۔ اکثر کے ساتھ اِس مشہور مقولہ کا اطلاق ہوتا ہے کہ JACK OF ALL MASTER OF NON مگر وزیر آغا کی انفرادیت ہر اُس صنف میں جس پر اُنھوں نے طبع آزمائی کی ہے، قائم ہے۔ اور اِن تینوں اصناف میں وزیر آغا کی کتابیں ان کی ذہنی صلاحیتوں کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں۔

"شام اور سائے" کا شاعر صحیح معنوں میں جذبات، احساسات، کیفیات اور علامات کا شاعر ہے۔ اُن کیفیات اور تاثرات کا شاعر جو کسی خارجی واقعہ سے متاثر ہو کر سوچتا ہے۔

وزیر آغا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات، احساسات، کیفیات اور تاثرات کا راست اظہار نہیں کرتے بلکہ اُن کو مختلف علامتوں یا مناظر کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں وزیر آغا SYMBOLIST شاعروں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ خوبی ہے کہ ان کی نظمیں اپنے بہت سارے ساتھیوں کی طرح گنجلک اور بے معنی نہیں ہونے پاتیں۔

وزیر آغا نے فطرت اور فرد کے رشتے کو اپنی شاعری کا اہم موضوع بنایا ہے۔ شاید وہ ورڈز ورتھ کی طرح مادی دنیا کی ناہمواریوں سے پناہ حاصل کرنے فطرت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ مگر اس پناہ میں فراریت کا جذبہ غالب نہیں بلکہ وقتی ردِ عمل کارفرما ہے۔ مشورہ۔ ملاقات اور سفرنامی نظمیں اس رُجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "سفر" میں بادل کا ٹکڑا خود شاعر کی علامت بن گیا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے مختلف جذبات کو ایک مادی شکل دے دی ہے۔ وہ کسی جذبے (جیسے خوشی یا غم وغیرہ) کا تاثر کسی مناسب وموزوں منظر کے ذریعے اُبھارنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بعض نظمیں بہت ہی کامیاب ہیں مثلاً بات، مسرت اور دُکھ وغیرہ۔

وزیر آغا ایک سلجھے ہوئے ذہن کے مالک ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے ادب بلکہ بیرونی ادب اور اُسکی پوری تحریکوں کے سرچشمہ سے واقف ہیں، اس لئے اُن کے یہاں وہ افراط تفریط نہیں ملتی جو بہت سارے فیشن زدہ شاعروں میں پائی جاتی ہے۔ وزیر آغا کی پیچیدہ سے پیچیدہ نظم بھی ایک اوسط درجے کے پڑھے لکھے قاری (اور ایسے قاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا) پر پوری طرح نہ سہی بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وزیر آغا کے نزدیک اظہار کے ساتھ ساتھ ابلاغ کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی وزیر آغا ذہنی اعتبار سے اتنے گنجلک اور FRUSTRATED نہیں جتنے اُن کے بعض ہمعصر ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ (اور بلاشبہ ہے) اُنھوں نے فرد اور سماج، فرد اور فطرت، اور خود فرد کے اندرونی رشتوں کو زیادہ واضح انداز میں سمجھا ہے، ان کے نزدیک شاعری کی پوری دنیا صرف کافی ہاؤس، چائے خانے، یا دو تین سو صفحات کے خوبصورت رسالے میں سمٹ نہیں آتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے رشتے، پہاڑوں، جنگلوں، بادلوں سے لیکر ننھے مزدوروں، اور عام لوگوں تک استوار کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نظمیں پڑھتے وقت کھُلی فضا میں سانس لینے کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس آج کے فیشن زدہ برخود غلط، بزعمِ خود ہوشیار شعرا کے یہاں ہمیں نہیں ملتا ہے۔

آسماں، میدان جس میں ہو نہ گھاس
چاند جیسے کوئی پُردا یا اُداس
پھیکا پھیکا سا تبسّم شب کے پاس
(اکیلا)

حسین ابر پارو
بکھر گئے ہوئے تم سدھارو
کسی سینہ تانے ہوئے کوہ کی چوٹیوں کو!
جواں کوہسارو!
ذرا کھول دو اپنا آغوش امشب

شاعر بھی

یہ کچھ ابر پارے مصیبت کے مارے
جنھیں ریگِ صحرا نے ٹھکرا دیا ہے
بسر رات کرنے چلے آرہے ہیں

(دائرہ)

آسمان ہے اک ردائے نیلگوں
اک ردائے نیلگوں اور ابر کے ٹکڑے ہزار
ابر کے ٹکڑوں کے نیچے، اک اکیلا کوہسار
مہر بلب — سوگوار

(عکس)

مختلف نظموں کے ان مختلف ٹکڑوں کو پڑھنے سے جو تاثر ذہن پر مرتسم ہوتا ہے وہ شاعر کے وسیع VISION اور زندگی کے مثبت پہلو پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ابر پارے، کوہسار اور صحرا اپنے اندر ایک وسیع کائنات چھپائے ہوئے رکھتے ہیں۔ یہ منظر کشی صرف منظر کشی ہی نہیں بلکہ یہ مناظر شاعر کے، کائنات کے، اور شاعر کے اندر کی دنیا کی علامتیں بن کر ابھرتے ہیں۔ اِن سے ایک تو شاعر و فطرت کی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے اور دوسرے شاعر کی قدرتِ بیان کا اظہار کہ کوئی علامت مبہم یا بے معنی نہیں ہونے پاتی۔ اگر وزیر آغا کی دوسری شاعرانہ خصوصیات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے (ویسے ایک سلجھے ہوئے قاری کے لئے یہ ممکن نہیں) تو یہی ایک خصوصیت ان کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز اور منفرد کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

شاعری

نصیر پرواز

دُعائیہ
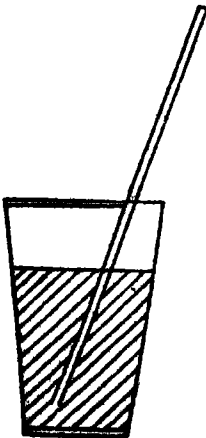
اے ربِ ازل میرے
گیتوں کو سجل کر دے
ہر رنگ کے پھولوں سے
گلشن کو مرے مہکا

بجھتی ہو دھڑکن کو
ہمدوشِ غزل کر دے
دم توڑتی چنگاری
شعلے کی طرح دہکا

ٹیگور کا جادو دے
اقبال کی بیباکی
جذبات کے پیکر کو
سرمستِ جُنوں کر دے

تُلسی کی عقیدت دے
اور میر کی غمناکی
ہر خواب کے سینے میں
اِک سوزِ دروں بھر دے

خیام کے ساغر سے
سرشار نظر کر دے
ناکامِ تمنا ہوں
پھر بھی ترا بندا ہوں

شیراز کی مے دے کر
پیمانہ مرا بھر دے
محفل گہہ عشرت میں
نالوں کو ترستا ہوں

شیلے کا فسوں دیدے
ملٹن کی ثنا خوانی
ٹوٹی ہوئی اُمیدیں
اُجڑی ہوئی فریادیں

کالی کا تصور دے
غالب کی زباں دانی
بربادِ محبت کی
بیکار سی رُودادیں

ذرّے کو دکھا جلوا
آئینۂ یزداں کر
شعلوں کی طرح دن ہیں
شبنم کی طرح راتیں

اعجازِ مسیحائی
اور رنگِ سلیماں کر
خاموش نگاہوں میں
روتی ہیں مُناجاتیں

وہ نورِ بصیرت جو
موسیٰ کو دکھایا تھا
فرہاد کو جس شے نے
دیوانہ بنایا تھا

پُر نور بنا راتیں
سنان کا جلوا دے
احساس کے ہونٹوں پر
رقصِ گُل نغمہ دے

گھبرا کے ہر اِک غم سے
دل تجھ سے سوالی ہے
مجھ پر بھی کرم فرما
دامن مرا خالی ہے

ظفر حمیدی

تارِ عنکبوت

وقت کے صحرا میں اِک تاریک غار
ہے نظر کے سامنے محوِ سکوت
جس میں تہذیبِ کہن کے شاہکار
مُنہ چھپائے موت کی آغوش میں
سو رہے ہیں اِس طرح جیسے کہیں
اَپسرائیں قید ہوں پاتال میں

غار کی تاریکیوں سے کچھ پَرے
ہے دہانہ اُس کا مُنہ کھولے ہوئے
اور دہانے کے سرے پر پیرِ سال
ایک مکڑا خود پرست و خود نگر
بُن چکا ہے جال چاروں سمت سے!

جال کا ہر تار ہے زربفت کا
تار کا ہر پیچ ہے گنجِ طلسم
جیسے ہو پھیلا ہوا دامِ فرنگ!
جال کے ہر تار میں خاموش ہے
اک صدائے دعوتِ حرص و ہوس
سامراجی طاقتوں کا سحرِ نطق
ریڈیو پر جیسے ہو گونجا ہوا

جال پر رقصاں ہیں رنگیں تتلیاں
جو مشینی دَور کی ایجاد ہیں
جو ہری قوت کے بل پر جن کا جسم
ناچتا ہے رات دن تھکتا نہیں
تتلیوں کی برق آسا روشنی
"ریڈئیم" سے بہرہ ور ہوتی ہوئی
بھولے بھالے کتنے پروانوں کے پَر
جانے کب سے بس جھلستی آئی ہے
تتلیوں کی بھنبھناہٹ میں عیاں
کارخانوں کی صدائے بازگشت
تتلیوں کے جسم سے آتی ہوئی
ہر طرف ایتھر کی بُو پھیلی ہوئی
جس سے فطرت بھی ہے کچھ سہمی ہوئی
خندہ زن ہے غار کا مبہم سکوت
ٹوٹتا ہے کب یہ تارِ عنکبوت

شاعری

اے مرے شہر!

ناظر انصاری

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن
اے چمن زارِ حسیں، رشکِ غزالانِ ختن
وہ نگارانِ حسیں، ماہوش و غنچہ دہن
آہ وہ کاکلِ شب رنگ، وہ ماتھوں کی شکن

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

جب گھٹا چھاتی ہے لہراتی ہے رنگین دھنک
یاد آجاتی ہے اک پیکرِ رعنا کی لچک
وہ خم و پیچ، وہ زلفوں کی سیاہی، وہ مہک
آدمی کیا ہے فرشتوں کے بھی دل جائیں بہک

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

جب فضاؤں میں تری چلتی ہے مدماتی پون
یاد آتا ہے کوئی لالہ رُخ و سیم بدن
لہلہاتا تھا کبھی جس سے امیدوں کا چمن
ذہن میں اب بھی ہے اُس دستِ حنائی کی چبھن

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

یاد آتی ہیں وہ خلوت کی ملاقاتیں بھی
بن کے ناگن مجھے ڈستی ہیں سیہ راتیں بھی
کام آتی نہیں اُس وقت مناجاتیں بھی
پر تصور ترا لاتا تو ہے سوغاتیں بھی

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

وہ تمہارے گُلِ رخسار کے یاد آتے ہیں
یادِ جاناں میں دلِ زار کو تڑپاتے ہیں
ایک سوغاتِ حسیں سامنے پھر لاتے ہیں
یادِ ماضی کو مرے درد سے ٹکراتے ہیں

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

تیری گلیوں ترے کوچوں کی جوانی تو ہے
رنگ و نکہت کی وہی بزم سہانی تو ہے!
یادِ جاناں کی کسک، دل کی کہانی تو ہے!
تیرے بخشے ہوئے زخموں کی نشانی تو ہے!

اے مرے شہر! مرے عشق و محبت کے چمن

رونق نعیم

تبدیلی

آج پردیس سے لوٹا ہوں کئی سال کے بعد
اب بھی آنکھوں میں تھرکتا ہے وہ بچپن تیرا
غالباً اِس میں نہیں میری اِن آنکھوں کا قصور

وہی چھوٹا سا ٹکٹ گھر ہے وہی اسٹیشن
وہی انجان مسافر، وہی منزل کی لگن
وہی آکاش پہ اُڑتا ہوا کالا آنچل
وہی پوکھر کی اُداسی، وہی گم سم سے کنول
ٹیڑھی میڑھی سی وہی سہمی ہوئی پگڈنڈی
وہی احساس کا سینہ، وہی غربت کی چھُری
وہی کھلیان کی خواہش وہی کھیتوں کی پکار
وہی رستہ، وہی خاموش درختوں کی قطار
بھیڑ بکری کا وہی جھنڈ، وہی چرواہے
وہی بے نام کہانی، وہی گونگے سائے
وہی زُلفوں کے اندھیرے سے اُلجھنے کا سوال
وہی ہونٹوں کی تمنّا وہی مکھڑوں کا خیال
وہی گھونگھٹ کے اشارے، وہی چوپال کی بات
وہی مدقوق اندھیرا، وہی بیمار سی رات
وہی ہر گھر کے مسائل، وہی معصوم سے لوگ
وہی ہر صبح کا ماتم، وہی ہر شام کا سوگ
وہی مٹی کی ہیں دیواریں، وہی پھوس کے گھر
وہی موسم، وہی رُت ہے وہی سب کچھ ہے مگر

ہیں تری مانگ پہ ہیں دیکھ رہا ہوں سیندور
اب بھی آنکھوں میں تھرکتا ہے وہ بچپن تیرا
آج پردیس سے لوٹا ہوں کئی سال کے بعد

شاعر بھی

ساحل مونگیری

"خلا کے مسافر سے"

طویل و پُر ہول شاہراہوں پہ چلنے والے خبر ہے تجھکو
چمکتے سورج کی آرزو میں سیاہ راتوں کا ساتھ ہوگا
جو تیری گردن پہ رکھ کے خنجر خراج لے گا تباہیوں کا
وہ تجھ کو راہیں دکھانے والے عظیم رہبر کا ہاتھ ہوگا

خلا کی وسعت پکارتی ہے زمیں کے باشی اِدھر تو آنا
ترس رہے ہیں ستارے کتنے تری رفاقت کی آرزو میں
تری نگاہیں پہنچ چکی ہیں بجائے ناہید کے جہاں تک
فریب کھاتا بھی ہے ضروری مگر ستاروں کی جستجو میں

ہوا کا کوئی شریر جھونکا ترے عزائم کو چھیڑ دے گا
بلندیوں کی حسین پریاں تجھے سلائیں گی گیت گا کر
یہ بادلوں کی جھیل وادی میں بہنے والی صداقتیں ہیں
بٹھا کے پہلو میں دلبری سے تجھے رُلائیں گی گدگدا کر

کبھی تو ایسا بھی ہوگا تجھکو مسرتوں کا فریب دے کر
اتھاہ غم کی اُداسیوں کے مہیب گھیرے میں ڈال دیں گی
محبتوں سے جو جھومتی ہیں گداز باہوں میں تجھ کو بھر کر
ہنسا کے بزمِ طرب سے اپنی فضا میں تنہا اُچھال دیں گی

یہ بادلوں کی حسین دُنیا جو تیرا مسکن بنی ہوئی ہے
ترے عزائم پہ بار ہوگی ترے ارادوں پہ تنگ ہوگی
ابھی سے حالات کہہ رہے ہیں بنام امن و اماں یہاں بھی
ترے پیامِ عمل کوشش کر، بڑی ہی شدّت کی جنگ ہوگی

مگر تو ہر دم یہاں کی دُنیا کو آشتی کا پیام دینا
زمیں کی عظمت کا رفعتوں کو بصد عقیدت سلام کہنا

شاہکار

غلام الثقلین نقوی

دیوار

میں اور لطیف لنگوٹیے تھے!

ہم ایک ہی گندی گلی میں پروان چڑھے تھے۔ اِس گلی کی نالیوں میں کیچڑ تھا اور کیچڑ میں زنگا رنگ کیڑے کُلبلاتے تھے۔ ہم اِس گندی گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ گلی اکثر نالی میں گر جاتی۔ گلی کو نکالنے کے لئے کبھی میرے اور کبھی اُس کے ہاتھ بدبودار کیچڑ میں سَن جاتے تھے۔

اِنھیں سَنے ہوئے ہاتھوں سے طیفا گھر سے گُڑ کی ڈیلی لے آتا۔ اِس ڈیلی میں ایک دانت میرا گڑا ہوتا تو دوسرا طیفے کا۔ چھینا جھپٹی میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ساری ڈیلی طیفے کے مُنھ میں چلی جاتی۔ طیفا لعاب میں لتھڑی ہوئی ڈیلی کو مُنھ سے نکال کر کہتا۔

"لوگے اپنا حصہ پیچھے؟"

"واہ! تو ساری تم ہی کھا جاؤگے کیا؟"

طیفا دانتوں سے کاٹ کر ڈیلی کے دو ٹکڑے کرتا۔ اپنے اپنے حصّوں کا گُڑ کھا کر ہم پھر گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جاتے۔ شام ہو جاتی تو ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ میں ماں کے سامنے جانے سے پہلے نل پر ہاتھ دھو لیتا۔

ایک سہ پہر کو ہم کیچڑ میں سے گلی تلاش کر رہے تھے کہ طیفے کا باپ آگیا۔ وہ منڈی میں پلے داری کرتا تھا۔ اُس کے دُبلے پتلے جسم میں بلا کی تیزی تھی۔ اُس کے مُنھ پر آٹے اور نہ جانے کس کس چیز کی گرد ہوتی، اور اکثر اُس کی مونچھیں آٹے کے سفید سفید غبار میں اَٹی ہوتیں۔ یہ مونچھیں جو لبوں کے گوشوں پر لٹکی رہتیں، مجھے کچھ عجیب سی لگتیں۔ میں اُنھیں دیکھ کر بے اختیار ہنس دیتا اور طیفا بھی۔

ہمارے بازو کہنیوں تک کیچڑ میں لتھڑ چکے تھے!

طیفے کے باپ کی بغل میں ڈھیروں سگنے تھے۔ ہمیں گلی مل گئی۔ ہم دونوں اُس کی طرف لپکے تو اُس نے کہا۔ "نہیں طیفے! گھر چلو۔ مُنھ ہاتھ دھو کر آؤ تو گنا ملے گا۔"

"اور بھیا؟" طیفے نے پوچھا۔

"تم بھی آؤ بیٹے! بابو جی تمہیں اِس حالت میں دیکھ لیں تو کیا کہیں۔" طیفے کے باپ نے مُسکرا کر کہا۔ اُس کی لٹکی ہوئی مونچھیں بھی مُسکرانے لگیں۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑا اور طیفا بھی۔

"طیفے کس بات پر ہنس رہے ہو تم؟"

"تیری مونچھوں پر باپو۔"

"میری مونچھوں پر۔۔؟" طیفے کے باپ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھیا ہنستا ہے تو میں بھی ہنس پڑتا ہوں۔"

اور وہ مونچھیں جھینپ کر مسکرائیں تو ہم پھر ہنس پڑے۔

ہم ہاتھ منہ دھو کر طیفے کے مکان کے سامنے کی پلی پر آ بیٹھے اور شُرر شُرر گنتے چوسنے لگے۔ ایک..... دو..... تین . . .
گلی کی دھوپ سمٹ کر چھتوں پر جا پہنچی اور پھر ٹمٹما کر بجھ گئی تو اندر سے طیفے کی ماں کی آواز آئی۔ "طیفے کھانا کھالو۔"

"پیجے! تم بھی آؤ۔"

"نہیں طیفے! اماں جی غصہ ہو جائیں گی۔"

"وہ کیوں؟"

میں ابھی کچھ جواب نہ دے سکا تھا کہ طیفے کی ماں پھر اندر سے پکاریں۔ "طیفے! پیجے کو بھی ساتھ لے آؤ۔"

طیفے کے مکان کا صرف ایک کمرہ تھا۔ اُس کی چھت دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی۔ اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اور طیفا چولھے کے پاس جا بیٹھے۔ طیفے کی ماں نے ایک تھالی میں گوبھی گوشت ڈالا اور ہمارے آگے سرکا دی۔ ایک چنگیر میں روٹیاں تھیں۔ گوبھی گوشت بہت لذیذ تھا۔ میری آنکھوں میں دھواں بھر چکا تھا۔ پر میں نے پیٹ بھر کھایا اور جب گھر آیا تو اماں کے خوف سے پھر کھانا کھانا پڑا لیکن طیفے کے گھر کے کھانے کی سی لذت محسوس نہ ہوئی۔

ایک دن پھر ہماری گلی نالی میں گر گئی تھی۔
ہم آستین چڑھا کر نالی کا کیچڑ کھنگال رہے تھے کہ اچانک اباجی آ پہنچے۔ وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

"پرویز! کیا کر رہے ہو تم؟"

"جی! کچھ بھی نہیں۔ تلی گالی میں . . ."

"تلی . . . ہوں . . . گلی . . . گلی کس کی تھی؟"

"میری ہے جی!" طیفے نے نالی پر جھکے جھکے کہا۔

"طیفے۔!" میرے اباجی نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "تم تو موری کے کیڑے ہو۔ میرے بیٹے پرویز کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبو گے۔ چلو پرویز!"

میں نے اباجی کے چہرے کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ سُرخ تھا اور اُوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھوں کی نوکیں غیظ و غضب سے تھرتھرا رہی تھیں۔ میں سہم کر اُن کے ساتھ ہو لیا۔

"مجھ سے دُور دُور چلو پرویز!"

"مل گئی! . . . پیجے گلی مل گئی۔"

طیفا کیچڑ میں لتھڑی ہوئی گلی لے کر میری طرف لپکا تو اباجی سے ٹکرا گیا۔ اباجی کا کوٹ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے اپنے کوٹ کی طرف تکتے رہے۔ دوسرے لمحے زن کی آواز آئی اور طیفا اپنا گال سہلانے لگا۔ طیفے کے گال پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ طیفے نے ایک نظر میرے اباجی پر ڈالی اور دوسری مجھ پر۔ اِس نظر میں شکایت تھی، حیرت تھی۔

"چلو پرویز!" اباجی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اباجی! آپ نے طیفے کو کیوں مارا؟"

"دیکھتے نہیں ہو اُس نے میرے کوٹ کا ستیاناس کر دیا ہے اور پرویز! مجھے اِس کا بھی افسوس نہ ہوتا، لیکن تمہیں طیفے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔"

"پھر آپ مجھے مارتے ابا۔ طیفے کو کیوں مارا آپ نے؟"

"چپ رہو پرویز!"

میں چپ چاپ ہو کر اُن کے آگے آگے چل پڑا۔ پر میں مڑ مڑ کے طیفے کو دیکھتا رہا۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ ڈرا ڈرا سا اور حیران۔ میں دو قدم دُور نکل گیا تو اُس نے پکار کر کہا۔ "اپنی باری نہیں لوگے پیجے ؟"

"نہیں !" میرے ابا جی نے گرج کر کہا۔

ڈیوڑھی کی دہلیز پر میں نے رُک کر دیکھا۔ طیفا گلی ہاتھ میں لئے گم سُم کھڑا تھا۔ اُس کے گالوں پر آنسو لڑھک رہے تھے۔ چپ چاپ سے آنسو !

میں ابا جی کی فہمائش پر کاربند نہ رہ سکا۔

ہم بدستور گلی ڈنڈا کھیلتے رہے لیکن ابا کے آنے سے پہلے پہلے کھیل ختم کر دیتے۔ ایک دن طیفے کو میں اپنے گھر لے آیا۔ اُس دن ہمارے گھر میں مرغ پلاؤ پکا تھا۔ میں طیفے کو باورچی خانے میں لے آیا تو میری ماں حیران رہ گئیں۔

انہوں نے کہا۔ "طیفے، تم اب جاؤ اپنے گھر۔ دیکھو تو شام پڑ چکی ہے۔"

طیفا جانے لگا تو میں نے اُسے روک لیا۔ "اماں ! طیفا اور میں آج اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

"نہیں !" اماں نے ایک تھالی میں تھوڑا سا پلاؤ ڈال کر کہا۔ "طیفے یہ لے جاؤ اپنے گھر۔"

"نہیں اماں جی ! طیفا میرے ساتھ کھانا کھائے گا۔" میں نے ٹھنک کر کہا۔

"نہیں پگلے !" میری اماں غصے سے بولیں۔ "جاؤ طیفے۔"

"طیفے نے پلاؤ کی تھالی پر نظر نہ ڈالی اور باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ دہلیز میں کھڑے ہو کر اُس نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ اس نظر میں حیرت نہیں تھی ایک شکایت تھی اور میں رو پڑا۔

میں دیر تک روتا رہا اور اماں میرا سر سہلاتی رہیں۔

پھر وہ بولیں۔ "پرویز، بیٹا ! یہ دُنیا کا دستور ہے۔ شریف اور رذیل ایک ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتے۔"

"اماں !" میں نے روتے روتے پوچھا۔ "ہم دونوں میں سے شریف کون ہے اور رذیل کون ؟"

"تم شریف ہو۔ تمہارا باپ شریف ہے۔ تم شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور طیفا رذیل ہے کیونکہ ..."

میں نے ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

اور پھر یہ گلی پکی ہو گئی، جہاں طیفا اور میں چھپے چوری گلی ڈنڈا کھیلتے رہے۔ اب اُس پر اینٹوں کا فرش تھا اور فرش پر ہر روز جھاڑو پھرتی تھی اور نالیاں صاف رہتی تھیں۔ پکے فرش پر گلی ڈنڈا کھیلنے کا مزا نہ آتا۔ اور گلی نالی میں گرتی تو اُس کے اُجلے پانی میں تیرنے لگتی۔

ایک دن گلی نالی میں گر گئی۔ ایک مکان کا نل کھلا اور پانی کا ریلا آیا۔ گلی تیرتے تیرتے دُور نکل گئی۔ ہم گلی کے ساتھ ساتھ دوڑے۔ ہمارا بچپن بھی ساتھ ساتھ دوڑا۔ ہم اُن کا پیچھا کرتے رہے۔ دوڑتے رہے۔ ہانپ گئے پر ہم تیرتی ہوئی گلی اور بھاگتے ہوئے بچپن کو پکڑ نہ سکے۔

اور یکایک گلی جوان ہو گئی۔

اور بسنت آ گئی۔ طیفے کے ہاتھ میں ڈور تھی۔ پتنگ اُڑ رہی تھی۔ نیلے آسمان کو چھو رہی تھی۔ نیلے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ دھوپ میں خنکی بھی تھی اور گرمی بھی۔ میں پتنگ کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا تھا۔ میری پرواز میں ایک عجیب سی رفعت تھی۔ ایک بلندی کا احساس، جیسے جوانی چھٹا چھٹا نغمہ بن کر فضاؤں میں اُڑ گئی ہو۔ اونچا۔ اور اونچا۔

اور اچانک گلی میں ہیجڑا آ گئی۔

شاماں بھی

اُس کے سر پر نیلے رنگ کی اوڑھنی تھی۔ اُس نے پھولدار چھینٹ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اُس کے پاؤں میں ٹھبک سی جوتی تھی اور اُس کی چال میں لجاہٹ تھی۔ اور لجاہٹ میں بانکپن۔ اُس کے آگے آگے طیفے کا باپ چل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔

طیفے نے کہا۔ "بابا آگیا!" اور اُس نے پتنگ کی ڈور میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"تمہارے بابا کے ساتھ کون ہے طیفے؟"

"شاماں۔" اور شاماں کا نام زبان پر آتے ہی طیفا شرما گیا۔ اُس کے گال سُرخ ہو گئے۔

"شاماں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے چچا کی لڑکی ہے۔ چچا اور چچی مر گئے ہیں۔ بابا اِسے ساتھ لے آیا ہے۔ اب یہ ہمارے ہاں رہے گی۔" "بابا" طیفے نے پچکار کر کہا۔

طیفے کا باپ رُک گیا اور شاماں بھی!

شاماں نے ذرا گھوم کر ہمیں دیکھا۔ اُس کی ناک میں چاندی کی کیل تھی۔ چاندی کی کیل شبنم کی بوند کی طرح چمکی اور میرا وجود شبنم کی بوند کے ساتھ دُھلی دُھلی نکھری نکھری فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میں پتنگ کے ساتھ اُڑا اور ہوا کے ہلکوروں کے ساتھ رقص کرنے لگا۔

"چھجے! پتنگ کا کیا ہوا؟"

میں نے دیکھا تو میرے ہاتھ میں خالی ڈور تھی۔

میں نے کہا۔ "پتنگ تو کٹ گئی طیفے۔"

"کٹ گئی!" طیفا ذرا دیر کے لئے حیران ہوا۔

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "لو بھئی چھجے! آج ہم ہار ہی گئے۔ ماجھے کو پتنگ کاٹنے کا موقع مل ہی گیا۔"

"نہیں.... ماجھے نے پتنگ نہیں کاٹی۔"

"پھر کس نے کاٹی؟"

"کس نے؟ نجانے کس نے؟"

میں یکایک عرش سے گر کر فرش پر آ گیا۔

"کیا پتہ۔ ماجھے ہی نے کاٹ لی ہو گی۔"

"چھجے! جو جیتتے ہیں وہی کبھی کبھی ہار بھی جاتے ہیں۔"

طیفے نے اگلے دن ماجھے کی پتنگ کاٹ کر پھر جیتنا سیکھ لیا۔

طیفا باپ کے ساتھ پلے داری کرنے لگا۔ سہ پہر کو وہ مالش کر کے اکھاڑے میں کود جاتا اور کشتی لڑتا رہتا۔ میں اکھاڑے کے کنارے پر کھڑا طیفے کے گٹھے ہوئے خوبصورت جسم کے کس بل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔ میں نے ایک ڈنڈ بھی نہ مارا اور کالج میں پڑھتا رہا اور لشٹم پشٹم ہر جماعت میں پاس ہوتا رہا اور میں نے طیفے کے ساتھ دوستی نبھائی۔

جب میں بی۔ اے کے آخری سال میں تھا اور میرا امتحان نزدیک تھا تو ایک دن اباجی نے علیحدہ بُلا کر مجھ سے کہا۔ "مجھے تمہاری شرافت پر ناز ہے۔ لیکن ایک بات میرے جی میں کھٹکتی رہتی ہے۔"

"کہیئے ابا جان!" میں نے نیازمندانہ انداز میں سر جھکا کر کہا۔

"تم طیفے سے ملتے ہو۔"

"وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ ابا جان۔"

شمع بجھی

"تمہارے حلقۂ احباب میں طیفا کچھ سجتا نہیں ہے پرویز! وہ پڑھا لکھا نہیں۔ پھر وہ کسی شریف خاندان سے بھی تعلق نہیں رکھتا۔"

"نہیں آبا جان! طیفا میرے حلقۂ احباب کا سب سے شریف فرد ہے۔"

میرے لہجے کے پُرزور احتجاج سے ابا جان چڑ گئے۔

"پرویز! تم طیفے کے ساتھ رہ کر موری کے کیڑے بن گئے ہو۔ تمہیں شرافت کا احساس تک نہیں رہا۔ میں نے اب تمہیں طیفے سے ملتے دیکھا تو مجھ سے... مجھ سے..." ابا جان غصے کی وجہ سے بات پوری نہ کر سکے۔

میں نے سوچا۔ "میں طیفے سے ملنا چھوڑ دوں گا اور شاماں سے بھی..."

شاماں سے بھی؟

کاش میں طیفے کی طرح موری کا کیڑا ہوتا۔

کاش مجھے شاماں نہ ملتی۔

میں طیفے سے ملنے جایا کرتا تھا تو شاماں کی ایک جھلک بھی پا لیا کرتا تھا۔ شاماں جو طیفے کی منگیتر تھی۔ میں ایک نظر سے آگے نہ بڑھا اور یہ نگاہ بڑی پاکیزہ تھی۔ پھر میں نے طیفے سے ملنا چھوڑ دیا۔ اچھا ہوا کہ میں نے ایسا کیا۔ میں گوشت پوست کا انسان ہوں میں کب تک اِس نظر کی پاکیزگی کی حفاظت کرتا۔ پاکیزگی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے اور دوستی کا رشتہ اس سے بھی نازک تر اور شاماں طیفے کی منگیتر تھی

ہمارے گھر کے سامنے گلی کے نکڑ پر جو سونی اور سنسان تھی اور جہاں میونسپلٹی کی گدلی روشنی پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی تھی، میں نے ایک سائے کو دیکھا، جس کے اِرد گرد خوف کے اندھیارے ناچ رہے تھے۔ میں کانپ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"شاماں!"

"شاماں! تم یہاں کیوں آئیں؟"

شاماں کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اِس سوال کا جواب میرے اپنے دل میں تھا۔ مجھے اپنے سوال پر شرمندگی محسوس ہوئی! "شاماں! تم چلی جاؤ۔ دیکھو! اندھیرے کی آڑ لے کر جو لوگ دوسروں سے ملنے کے لئے آیا کرتے ہیں، اُنھیں دُنیا چور سمجھتی ہے۔"

شاماں چلی گئی۔ اُس نے مُنھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پر میں نے اندھیروں کے دامن کو بھیگتے ہوئے دیکھا۔ یہ شاماں کے آنسو تھے جو اندھیاروں کے دامن بھگو کر میرے دامن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک طوفانی لہر کی طرح۔ میں نے اپنا دامن بچانا چاہا۔ مگر میں گرم گرم آنسوؤں کے ریلے میں سر سے لے کر پاؤں تک ڈوب گیا۔

اور گلی کے اِسی نکڑ پر شاماں شاخِ گُل کی طرح لچک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ میرا وجود شبنم کی بوند کی طرح جھلمل جھلمل لرز اٹھا پھر شاماں کے وجود میں یوں تحلیل ہو کر رہ گیا جیسے شاماں سورج کی ایک کرن ہو۔

"چھوٹے! تم ہمارے گھر نہیں آتے؟"

"طیفے! میرے اور تیرے گھر کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ شرافت کی آہنی دیوار۔ میرا بچپن اس دیوار سے ناآشنا رہا اور دیکھے بنا پھلانگتا رہا۔ کیونکہ بچپن بزدل نہیں ہوتا۔ پر میری جوانی شکست کھا گئی ہے طیفے!"

طیفے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی گمبھیر آواز میں بولا۔ "مرد بنو چھوٹے! مردوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہوتا ہے۔ تم ایک بودی لڑکھڑاتی دیوار کو توڑ نہیں سکتے۔

شاماں

ایک دن میں نے اِس دیوار کو ایک ٹھوکر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔
میں کتنا جری مرد تھا!
طیفے کا آنگن خالی خالی سا تھا۔
میں دہلیز سے اندر قدم رکھتے ہی پکار اُٹھا "دیکھ طیفے! میری مردانگی نے شکست قبول نہیں کی۔"
"شاباش ہے تیری مردانگی کو۔" میرے دل کے چور نے سرگوشی کی۔ "پر تم جانتے تھے کہ طیفا گھر پر نہیں ہے۔ وہ تو کہیں رات گئے گھر آتا ہے۔"
"خاموش رہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔
"طیفے! تم کہاں ہو؟" میں نے پھر پکارا۔
"تم جانتے تھے طیفا تو کیا اُس کے ماں باپ بھی گھر میں نہیں ہیں، تم نے صبح صبح اُنھیں گھر سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ تمہارے پوچھنے پر اُس کے باپ نے بتایا تھا۔ وہ اپنے گاؤں ایک شادی پر جا رہے ہیں۔"
"چُپ رہو شیطان۔ تو..."
"طیفا گھر نہیں ہے۔"
"یہ تم ہو شاماں۔ طیفا کب آئے گا؟"
"جانے کب؟ وہ تو بہت دیر سے آتا ہے۔"
شاماں چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ ابھی تک اُس کے رخساروں میں شعلے لہرا رہے تھے
میں نے کہا۔ "میں طیفے سے ملنے آیا تھا۔"
شاماں نہ بولی۔ اُس کی آنکھوں کے ستاروں نے چمک کر کہا۔ "جھوٹ نہ بولو بیجے! تم تو مجھ سے ملنے آئے ہو۔"
اور شاماں کا دہکا ہوا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اُٹھا۔
میں کھاٹ پر بیٹھ گیا۔
شاماں نے کھرّے بان کی کھاٹ کی طرف یوں دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو "مجھے پہلے سندیسہ بھیج دیتے تم۔ تو میں اس پلنگ پر پھولوں کی سیج بچھاتی۔ پر اب تو یہی سمجھو۔ میرے کنوارے ارمانوں کے پھول اِس سیج پر بچھے ہوئے ہیں۔ تجھے اِن کی مہکی ہوئی پَون مست نہیں کر رہی بیجے!"
اور شاماں سامنے کھڑی تھی!
اُس کی جوانی کی آگ دہک رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر سورج چمک رہا تھا، وہ خود ایک لپکتا ہوا ہیولیٰ تھی کہ جس سے چنگاریاں برس رہی تھیں..... اور ساری دنیا سوکھے پتوں کا ڈھیر تھی..... جو اس پر ایک چنگاری گر گئی تو..... نہیں.....
یہ آگ ہر چیز کو بھسم کر ڈالے گی..... یہ آگ جو آگ نہیں تھی..... ایک آتشیں گھٹا تھی، جو تلی کھڑی تھی۔ اس سے جوانی کی پگھلی ہوئی آگ لپک رہی تھی..... اور شاماں کے اُوپر کے ہونٹ پر پسینہ تھا۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔ رخساروں کے شعلے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ اُس کے کھلے گریبان میں سے اُس کے سینے کی مرمریں عریانی بھیگ گئی تھی۔ اور نہ جانے کس ہاتھ نے شاماں کا دامن کھینچ لیا اور وہ کون سی آنکھ تھی، جس نے شاماں کو ایک اجنبی کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے دیکھا، اور یہ اجنبی کون تھا جو شاماں کے گداز جسم کے ایک لمس سے جنت اور جہنم کی ہر حد کو پھاند گیا تھا۔
اور یکایک تلی ہوئی گھٹا تڑا تڑ برس پڑی۔
اساڑھ کی پہلی بوچھاڑ کرتی ہوئی دھرتی کے ننگے جسم سے پسینہ پھوٹ بہا تھا اور کنوارپنے کی سوندھی سوندھی گرم گرم خوشبو

کا ایک ریلا آیا... ایک ہوائی پون کا ایک جھونکا اور کسی کی جوانی آسودہ ہو کر نیند میں سرشار بچے کی طرح سو گئی... اور جب جوانی جاگی تو اجنبی بھی جاگ اٹھا اور میں نے سوچا۔ "میں کون ہوں اور وہ اجنبی کہاں گیا۔؟"

شاماں چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی پشت میری طرف تھی۔ اُس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ کیا اُن نگاہوں میں خفگی تھی؟... نہیں.... نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا۔ سرشار محبت کا ایک مدھ بھرا خمار، جیسے جوانی نے آبِ حیات کے دو گھونٹ پی لئے ہوں۔ آبِ حیات کے دو گھونٹ، جو جسم اور روح کے دھاروں کے سنگم پر مدت سے اِن پیاسی آنکھوں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ منہ سے نہ بولی پر مدھ ماتی آنکھوں نے کہا۔ "آج میرے اور تیرے پریم کی سنگت ہو گئی ہے نا؟"

"ہاں!" میں نے زیرِ لب کہا لیکن نجانے کیوں میری آنکھیں جھک گئیں۔

دوسرے لمحے طیفا میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

اُس نے پوچھا۔ "تم یہاں ہو پیجے!"

"ہاں طیفے!"

طیفے نے کبھی میری آنکھوں میں جھانکا۔ کبھی شاماں کی اور پھر اُس نے شاماں کی دُھلی دُھلی آنکھوں کا راز پا لیا تھا شاید کہ وہ کانپ گیا۔

"طیفے! میں نے شرافت کی لڑکھڑاتی دیوار کو ایک ہی ٹھوکر سے..."

"نہیں۔" طیفا ایک عجیب سے لہجے میں بولا۔ "ابھی تو نے دیوار میں ننھا سا شگاف کر کے رستہ بنایا ہے پیجے!"

"مردوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہوتا ہے طیفے!"

طیفا مسکرایا۔ "وقت گزرنے پر تیری جواں مردی کا پتہ معلوم ہوگا پیجے!"

مسکراتے ہوئے طیفے کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے ایک لرزش میں چھن کی آواز سُنی، جیسے کوئی شیشہ ٹوٹ گیا ہو اور کرچیں بکھر گئی ہوں اور مجھے اپنے آپ پر شبہ ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "تو نے کسی کی شرافت کی دیوار میں سیندھ تو نہیں لگائی کمینے۔"

دوسرے دن میں نے ایک عجیب خبر سُنی کہ طیفے نے شاماں کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن میں حیران نہ ہوا میں نے دل ہی دل میں طیفے کی جواں مردی کی داد دی۔ کتنا شیر دل ہے اُس کا! ایک دوست کے لئے اتنی بڑی قربانی۔ اب بے دھڑک طیفے سے ملنے لگا۔ مجھے زمانے کی پرواہ نہیں تھی اور شاماں میری زندگی پر یوں چھا کر رہ گئی تھی کہ سارا زمانہ میری ایک ٹھوکر کا انتظار کر رہا تھا۔ مرد کی ایک ٹھوکر کہ دنیا روئی کے ایک گالے کی طرح اُڑ جائے گی۔

میری اور شاماں کی محبت خوشبو کا ایک ریلا بن کر آئی اور شرافت کی دیوار کو پار کر کے میرے گھر کے آنگن میں پہنچ گئی۔

"دیکھو پرویز! یہ ہے رذیلوں کی صحبت میں بیٹھنے کا نتیجہ۔ میں جانتا ہوں تمہارے اُجلے دامن پہ ایک داغ بھی نہیں پر لوگوں کو زبان کھولنے کا موقع تو مل گیا۔"

"ابا جان! میں شاماں سے..."

"مجھے یقین ہے بیٹا! تمہارا شاماں سے کوئی تعلق نہیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے ابا جان۔"

"کیا مطلب؟"

"ابا جان! یہ شرافت کی دیوار ہمارے اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہے یہ ہاتھ چاہیں تو اسے توڑ پھوڑ بھی سکتے ہیں۔ میں شاماں سے شادی..."

"نہیں پرویز!" — ابا جی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا — "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں — میں جانتا ہوں تم لیا

نہیں کروگے۔ ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کرنا۔"

ابا جی ناراض نہ ہوئے۔ اتنی سی بات کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اُنہوں نے نہ مجھے عاق کر دینے کی دھمکی دی، نہ گھر سے نکالا۔ نہ جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھاننے کا ڈراوا دیا۔ نہ سردی گرمی بھوک پیاس کا کوئی بھیانک منظر دکھایا۔ بس مجھے ٹھنڈے دل سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور سوچ مجھے اُس منزل پر لے آئی، جہاں حال مستقبل کو جنم دے کر دم توڑ دیتا ہے اور مستقبل نے دیوار کے اُس پار کی صرف ایک جھلک دکھائی۔ دیوار سے اُس پار جنگل تھے، بیابان تھے، خاروخس تھے۔ آبلہ پائی تھی۔ کڑکڑاتی دھوپ اور چلّے کے جاڑے تھے۔ پیڑی جمے پیاسے ہونٹ تھے اور بھوک تھی۔ . . .

اور میں نے طیفے سے کہا۔" ہاں! طیفے میں شادی نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنے ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ میری مردانگی نے شکست تسلیم کر لی ہے۔"

"پر شاماں کا کیا بنے گا؟" اُس نے بڑی دھیمی آواز سے پوچھا۔

"شاماں! میں اُسے بھول جاؤں گا۔ اُس سے کہو وہ بھی مجھے بھول جائے۔"

"پیجے! شاماں اب بھولنے کی منزل سے آگے گذر گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ بھی نہیں . . . تم نہیں سمجھو گے۔ شریف آدمی بہت کچھ بھول جایا کرتے ہیں۔"

"طیفے!" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دہکتا ہوا جہنم کروٹیں لینے لگا۔ میں نے جانا اگر میں ایک قدم آگے بڑھا تو ان شعلوں میں جھلس کر رہ جاؤں گا۔ طیفے کا انگ انگ زخمی شیر کی طرح غصّے سے تھر تھرا رہا تھا اور اُس کے شیر کے سے پنجے بھینچ بھینچ کر کھل رہے تھے۔ یہ ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھنا چاہتے تھے، اور جو میری گردن اِن ہاتھوں کی گرفت میں آگئی تو . . . ایک خوف لپک کر آیا۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ "مم . . . مم . . . میں تیرا دوست ہوں طیفے . . . بچپن کا ساتھی . . ."

طیفے کے بڑھے ہوئے ہاتھ بے حس ہو گئے۔

اُس نے کہا۔ "پیجے! تو نے دوستی کا واسطہ دیا ہے . . . جا! اپنی شرافت کی دیوار کے پیچھے چھپ جا . . . میں نے تجھے معاف کیا . . . میں دوست کی امانت کو سینے سے لگائے پھروں گا۔ یہ ہاتھ نہ تجھ پر اُٹھ سکتے ہیں نہ شاماں پر۔ میں اِن ہاتھوں سے اپنی غیرت کا گلا گھونٹ دوں گا۔ پر میں شاماں کی ممتا پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"شاماں کی ممتا!" اور میں لڑکھڑا کر گلی کے فرش پر گر پڑا۔

اور جب میں جاگا تو بستر پر تھا۔

میری اماں نے پوچھا۔ "پرویز! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے اماں۔" اماں مطمئن ہو گئیں۔ "طیفا تو نہیں آیا تھا مجھ سے ملنے کے لئے۔؟"

"نہیں تو . . . تو . . ."

"طیفے کو بلاؤ ماں۔"

"پرویز بیٹا! میں طیفے کو کیسے بلاؤں۔ طیفا چلا گیا۔"

"کہاں؟ . . . کیوں؟ . . ."

"نجانے کہاں۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں پرویز! وہ شاماں کو لے کر۔"

"اماں ـ"

(باقی صفحہ ۱۰۶ پر دیکھئے)

موہن یاور

دو فرشتے

یہ بازار شہر کی جان ہے اور اس بازار کی روح ہیں یہ دو عظیم شخصیتیں، ایک دائیں طرف مسجد کے باہر بیٹھ کر اللہ کے نام پر اپنا حق مانگتا ہے اور دوسرا بائیں طرف، مندر کے باہر کرشنا پان اسٹال میں بھگوان کے نام پر گلچھرّے اُڑاتا ہے۔

یہ دو عظیم شخصیتیں، اس بازار کا دل اور دماغ، رحیم جو اور گنگا رام۔

رحیم جو لنگڑا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ پاؤں بھی ٹیڑھے میڑھے، اور اس پر ظلم یہ کہ ایک آنکھ بڑی اور دوسری آنکھ چھوٹی، اُونٹ رے اُونٹ تیری کونسی کل سیدھی کے مصداق، سراپا ٹیڑھی لکیر بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اس بازار کی جان ہے یعنی کہ دل ہے۔

اس بازار میں اللہ والے بستے ہیں اور اس لئے رحیم جو کی روٹی چلتی ہے۔ جب روٹی چل جائے تو آدمی حسین دنیا میں ڈوب جاتا ہے، اچھی اچھی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے گھر کے لئے، اپنے بچّوں کے لئے، اپنی بیوی کے لئے۔

لیکن رحیم جو جس کا نہ کوئی گھر، نہ بیوی نہ بچے، پھر بھی اُمید پر جئے جا رہا ہے کہ اس کی بھی شادی ہوگی، اُس کا بھی اپنا ایک گھر ہوگا۔ بیوی ہوگی، بچے ہوں گے۔

وہ ہمیشہ ایسی ہی جیتی جاگتی دنیا کے خواب دیکھنے لگتا۔ لنگڑا رحیم جو۔

پھٹے پُرانے اور غلیظ شلوار قمیص میں ملبوس رحیم جو تہذیب نام کی شے سے بخوبی واقف ہے۔ وہ ہمیشہ فٹ پاتھ پر آنے سے پہلے بازار والوں کو سلام کرتا اور جانے سے پہلے بھی سلام کرنا نہیں بھولتا۔

وہ کہاں جاتا ہے؟ کہاں رہتا ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں، بس صبح کی روشنی کے ساتھ ہی وہ طلوع ہوجاتا اور روشنی کے غروب کے ساتھ وہ بھی غروب ہوجاتا۔ رحیم جو جس کی زندگی صرف روشنی تھی، اندھیرے میں جی نہیں سکتا تھا، اور نہ کوئی اُسے جینے دیتا، روشنی کا مینار، رحیم جو، اللہ کے لوگوں کا پیارا، اور بھگوان کا دُلارا، گنگا رام۔

اور گنگا رام ہر صبح نئے دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر، نئی صبح کی طرح ترو تازہ ہو کر مندر کے باہر کرشنا پان اسٹال میں آجاتا۔ گرم گرم خوشبودار چائے کے گھونٹ بھرتا، بڑھیا سگریٹ پھونکتا، گولڈ فلیک کبھی کبھی اور عام طور پر کیپسٹن، پھر کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر غائب ہوجاتا۔ وہ جاتا کہاں ہے۔ اور کیا کرتا ہے۔ یہ گورکھ دھندا تھا۔

جب رحیم جو دیکھتا کہ وہ صبح سے لیکر شام تک اللہ کا نام لے لے کر اور زندگی کی دعائیں دے دے کر صرف تین کم تین سو پیسے کما سکا ہے اور یہ گنگا رام جو تازہ تازہ کمل لانڈری سے دُھل کر آتا ہے، چائے پیتا ہے، سگریٹ پھونکتا ہے، پھر ساتھ والی گراموفون اور ریڈیو کی دکان سے کسی نہ کسی کو فون کرتا ہے اور پھر ہنستا ہے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے اور

شاعر جی

جب ایک یا دو گھنٹے کے بعد واپس آتا ہے تو جھوم جھوم کر مست ہاتھی کی طرح، اور ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے، کبھی پھلوں کا لفافہ، کبھی تیل صابن، اور کبھی قمیص یا پتلون کا کپڑا، اور کبھی گولڈ فلیک کا ٹن، اور اس وقت اگر کوئی واقف کار یہ کہہ دے

"گنگا رام بھئی۔ کیا حال ہے ؟"

تو اُسے ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے اُسے بہت بڑی گالی دے دی ہے۔

وہ فوراً غصہ میں لال پیلا ہو جائے گا۔ اور گرج کر کہے گا

"میرا نام جی رام ہے ۔ جی رام ۔"

تب بازار میں پھلجھڑیاں چھوٹ جاتیں اور دُور دُور تک قہقہے بکھر جاتے۔

ایک شام رحیم جُو نے گنگا رام سے سرگوشانہ انداز میں پوچھا۔

"صاحب۔ آپ نے تو اپنا نام گنگا رام سے بدل کر جی رام رکھ لیا ہے۔ کیا آپ میرا نام رحیم جُو کے بجائے کچھ اور نہیں ڈھونڈ سکتے۔"

گنگا رام نے کہا۔

"پیارے! کیوں نہیں۔ تمہارا نام تو میرے ذہن میں ہے۔"

رحیم جُو نے جلدی سے پُوچھا۔ جیسے ریل چھوٹی جا رہی ہو۔

"کیا ؟"

"رحیم جُو ـــــ رحیم جُو ـــــ یہ آر جُو کیسا رہے گا" گنگا رام نے پُوچھا۔

"ونڈر فل ـــــــ" رحیم جُو یعنی کہ آر جُو چیخا۔

اور رحیم جُو کو رحیم کے بجائے یہ آر بہت پسند آیا۔ لیکن بازار کے لوگ پھر بھی اُسے رحیم جُو ہی کہہ کر پکارتے رہے۔ اُس نے لاکھ چاہا کہ سبھی اُسے آر جُو کہہ کر پکاریں، لیکن گنگا رام کے سوا دوسرا کوئی اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ کر سکا۔

جب گنگا رام اُسے آر جُو کہہ کر بلاتا تو رحیم جُو خوشی میں پھولا نہ سماتا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خدا کا کوئی بندہ تو ہے جو اُسے ٹیڑھی لکیر نہ سمجھ کر ایک پُوری اکائی سمجھتا ہے۔ اِس لئے رحیم جو بھی گنگا رام کو مسٹر جی رام کہہ کر پکارنے لگا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکراتے۔ اور رحیم جُو اپنے بوسیدہ اور میلے کچیلے لباس پر نزاکت کے ساتھ ہاتھ پھیرنے لگتا اور گنگا رام اپنی چمکیلی اور سفید قمیص پتلون پر۔

اور پھر رحیم جُو اللہ کے نام پر پیسہ مانگنے لگتا اور گنگا رام اپنی چرب زبانی اور دماغ کی طراوت کے بل بُوتے پر کوئی نیا گاہک ڈھونڈتا، اس کے گاہک بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے، چار سو بیس، مکار، چور بازاری کے سوداگر، ناجائز ہو پار کرنے والے، رشوت خور افسر، اور وہ ایسے ہی فنکاروں کی تلاش میں صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ جب اس کا داؤ چل جاتا، چاندی ہو جاتی۔

اِدھر اگر گنگا رام کے پَو بارے تھے تو اُدھر رحیم جُو کے بھی وارے نیارے تھے۔

رحیم جُو آہستہ آہستہ گنگا رام کو سمجھنے لگا۔ کہ گنگا رام کا پیشہ کیا ہے؟ اور وہ کس طرح روپیہ کماتا ہے، چھچھورے اُڑاتا ہے، چائے پیتا ہے، سگریٹ پھونکتا ہے، ٹیکسی میں بیٹھ کر امارت دکھاتا ہے، نشہ کرتا ہے، اچھا کھانا کھاتا ہے، پھل خریدتا ہے۔ خوشبودار تیل، خوشبودار صابن، خوشبودار پاؤڈر استعمال کرتا ہے۔

اور گنگارام ایک خوشبو بن کر رحیم جو کے دماغ میں بس گیا تھا۔

اور یہ بات رحیم جو کے دماغ میں بیٹھ گئی کہ یہ سب کمال سفید دھلے ہوئے کپڑوں کی بدولت ہے۔ اگر وہ سفید براق کپڑے پہن کر نکل آئے تو اس کی مارکیٹ ویلیو گنگارام سے دُگنی ہو جائے۔ وہ گنگارام سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ زیادہ تجربہ کار، زیادہ ہوشیار، اُس میں کون سی کمی ہے۔

رحیم جو کے دل میں برابر ایک کانٹا چبھنے لگا۔ گنگارام، گنگارام کا بچہ۔ بڑا آیا مسٹر جی رام۔ اَخ تھو۔"

اور پھر رحیم جو قہقہے بکھیرنے لگا۔

ایک واقف کار نے پوچھا۔

"رحیم جو۔ کیا بات ہے۔ بڑے خوش نظر آ رہے ہو، کیا کہیں شادی کی بات پکی ہو گئی؟"

"شادی بھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ دیکھئے۔" رحیم جو نے کرشنائی اسٹال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ۔ گنگارام کہتا ہے، مجھے جی رام کہا کرو۔ واہ رے میرے بھکاری دوست۔ لاکھ پردے اوڑھو۔ لیکن بھکاری کی آنکھ بھکاری کو پہچاننے میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

اور رحیم جو کی اَخ تھو کافی دیر تک فضا میں تیرتی رہی، تیرتی رہی۔

——— اور عید کی صبح اللہ کے نیک بندوں نے دیکھا کہ رحیم جو نے نئے فیشن کی حجامت اور کلین شیو کے ساتھ ساتھ لانڈری کے دھلے ہوئے سفید براق شلوار قمیص میں ملبوس، اور پاؤں میں نیا سیاہ جوتا، ساتھ ہی جراب پہنے، پان چبا چبا کر آنے جانے والوں سے لہک لہک کر باتیں کر رہا ہے۔ جیسے کہ وہ گنگارام ہو۔

آج وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا نہیں بلکہ گنگارام کے سے انداز میں کھڑا تھا، اور سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ بناتا رہا۔

جب گنگارام نے رحیم جو کو سفید براق لباس میں دیکھا تو اُس نے خوش ہو کر کہا۔

"مسٹر آر جو عید مبارک!"

"عید مبارک ———" اور آر جو نے گنگارام کی طرف الائچی اور مصری بڑھا دی۔

"شکریہ۔"

اور جب شام کے سائے ماند پڑنے لگے تو گنگارام جھومتا جھامتا آیا اور اُس نے مسجد کے باہر فٹ پاتھ خالی دیکھا، اُجڑا اُجڑا سا ویران، فٹ پاتھ کا بادشاہ چلا گیا تھا ——— وقت سے پہلے۔

کرشنائی اسٹال کا مالک سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے بولا۔

"آج بے چارے کی عید جاتی رہی۔"

"مطلب؟" گنگارام نے پوچھا۔

جواب ملا۔ "سارے دن میں بیس پیسے کما سکا۔ بے چارا بہت اُداس تھا۔ کہتا تھا ایسا بے کیف دن زندگی میں پہلی بار دیکھنا نصیب ہوا۔"

گنگارام اپنے رحیم جو کے دکھ میں شریک ہونے کے لئے کسی شراب خانے میں چلا گیا۔ تاکہ غم غلط ہو سکے۔ اور وہ بھول جائے کہ آج عید تھی، اور اس کا دوست مجبور کا رہا۔ کاش وہ مل جاتا تو اس کی پریشانی تو دور کر دیتا ——— رحیم جو نجانے کہاں چلا گیا۔ صبح جب گنگارام بن ٹھن کر بھرے بازار میں آیا تو اُس نے پھر رحیم جو کو میلے کچیلے لباس میں ملبوس دیکھا، تو اُسے بہت

(بقیہ صفحہ ۷۱ پر دیکھئے)

شاعر بھی

شیام کنول

فرشتوں کی شکست

ڈاکٹر داس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ شنکر ایک آوارہ گرد، لاابالی اور ناقابلِ اعتبار شخص ہے، اُسے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ شنکر کو پرائیویٹ سکریٹری کے نئے منصب پر فائز کرنے کی کوئی تُک بھی نہ تھی۔ کیونکہ عموماً ڈاکٹر کے لئے پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ اگر ضرورتاً رکھا بھی جائے تو وہ کوئی مہذب اور خاصہ تعلیم یافتہ ہونا لازمی نہ سہی ضروری تو ہوتا ہی ہے۔ چہ جائیکہ شنکر۔۔ جس کے بارے میں کوئی بات اس کے سوا یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ ایک آوارہ منش ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ شنکر کے اچانک انتخاب پر ڈاکٹر کے ملنے جلنے والوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن ڈاکٹر جب ایک فیصلہ کرلے تو پھر اُس کا بدلنا محال ہوتا۔ چنانچہ سب تھک ہار کر چُپ ہو رہے۔

ادھر شنکر اپنے مختصر اسباب کے ساتھ ڈاکٹر کی کوٹھی میں اُس کے لئے مختص کردہ کمرے میں منتقل ہو گیا۔ خود شنکر بھی تا حال حیران تھا کہ یہ سب کیونکر ہو گیا۔ اس پر ڈاکٹر کی پدرانہ شفقت اُس کے لئے مزید اُلجھن کا باعث تھی۔

شنکر کا انتخاب بھی عجیب حالات میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی ملازمت میں آنے سے ایک ہفتہ قبل وہ شدید نزلے اور بخار کا شکار ہو گیا تھا۔ اُن دنوں اُس کی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ علاج کرا سکتا۔ مرض جب بڑھتا ہی گیا تو چار و ناچار ڈاکٹر داس کی ڈسپنسری جا پہنچا۔ اُسے علم تھا کہ ڈاکٹر داس ایک فرشتہ صفت، رحم دل اور انسان دوست ڈاکٹر ہے۔ عموماً وہ غریب اور نادار لوگوں کا مفت علاج کیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر داس نے اُس کا معائنہ کرنے کے بعد مرض تشخیص کرتے ہوئے نسخہ لکھ دیا۔ چِٹ پر نام لکھنے کے لئے سوالیہ انداز میں ڈاکٹر کی نگاہ اُٹھی تو اُس کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ شنکر کی آنکھوں میں کرب کی بے پناہ لہریں مچل رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" ڈاکٹر اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ "جی .... کچھ .... کچھ نہیں۔" "تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" "جی ہاں۔" شنکر کا چہرا مرجھا گیا۔ نگاہ جھک گئی۔ "کہو۔" "ڈاکٹر صاحب! اِس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ دو چار دن میں آپ کے تمام پیسے لوٹا دوں گا۔ تب تک کے لئے ...." وہ رُک گیا۔ اُس کی جھکی ہوئی نگاہ ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لینے کے لئے اُٹھی جو خموشی سے اُسے تکے جا رہا تھا......

"آپ کی کوٹھی کے بالکل ہی قریب رہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، کمپاؤنڈر مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔" شنکر نے بات آگے بڑھائی۔ "اچھا تم دوا لے لو، میں لکھ دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نسخے پر کچھ لکھنے لگا۔ "تم نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا؟" ڈاکٹر نے لکھتے لکھتے نگاہ اُٹھا کر سوال کیا۔ اور شنکر کا پورا وجود لرز گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے

لرزتی آواز میں کہا "شنکر" ڈاکٹر نام لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر جیسے کچھ یاد کر کے چونک پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے پھر اُس کی نگاہ شنکر کے چہرے کی طرف اُٹھی اور وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑانے لگا۔

اُس شام جب کمپاؤنڈر آیا تو ڈاکٹر سے دبے لہجے میں کہہ رہا تھا "سر آپ نے شنکر کو دوا کریڈٹ پر دینے کے لئے لکھا ہے۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ بالکل آوارہ ٹائپ کا آدمی ہے۔ کوئی اُسے نوکری نہیں دیتا۔ شریف آدمی تو اُس کے سائے تک سے گھبراتے ہیں۔ وہ ہمیشہ آوارہ اور بدمعاش قسم کے لوگوں میں رہتا اور فٹ پاتھوں پر زندگی گزارتا ہے" ڈاکٹر خاموش سر جھکائے سنتا رہا۔ جب کمپاؤنڈر روم لینے کے لئے رُکا تو ڈاکٹر نے پوچھا "مسٹر حیدر! شنکر مجھے ایسا کوئی بھیانک آدمی تو نظر نہیں آتا۔ پھر لوگ اُس سے کیوں کتراتے ہیں؟ کیا وہ کوئی مجرم ہے؟ ڈاکو ہے؟" "وہ..... وہ سر" کمپاؤنڈر بوکھلا گیا۔ "پتہ نہیں سر کیا بات ہے۔ بس میں تو اتنا جانتا ہوں کہ لوگ اُس سے ربط رکھنا، ملنا جلنا تو دور کی بات ہے۔ اپنے گھر کے دروازے پر اُس کا پھٹکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایک بات ضرور ہے سر۔ اُسے کہیں نوکری نہیں ملتی، پھر بھی خرچ اور کھانے پینے کے لئے پیسے آجاتے ہیں۔ یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ یہ چوروں کے کسی گروہ کا مخبر ہے جو معاوضے میں اُسے کافی رقم دیتا ہے۔" کمپاؤنڈر اپنی بات ختم کر چکا تو ڈاکٹر ایک لمبی "ہوں" کے بعد خموشی میں ڈوب گیا۔

دوسرے دن جب شنکر آیا تو ڈاکٹر نے اُسے بغور دیکھا۔ چوڑی پیشانی، اُداس آنکھیں، مرجھایا چہرہ اور مضبوط جسم۔ ڈاکٹر دزدیدہ نگاہوں سے اُس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ لیکن اُس کی کوئی حرکت مشکوک نظر نہ آئی۔ تمام وقت اُس کی نظر میں جھکی اور پیشانی پر بے شمار سلوٹیں پڑی رہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے ڈاکٹر کے پاس کتنے مریض آئے اور کتنے گئے لیکن اُس کے خیالات کا تانا بانا نہ ٹوٹا۔ ڈاکٹر اُس کی اس محویت کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ بالآخر ڈاکٹر ہی نے اُسے چونکایا تو وہ اپنا معائنہ کرا کے دوا لیکر چلا گیا۔ لیکن ڈاکٹر داس کے ذہن پر اُس کی شخصیت کے گہرے نقوش ثبت ہو گئے۔ اور اُس رات ڈاکٹر داس نے اپنی لیبریٹری میں بیٹھے ہی بیٹھے ایک فیصلہ کیا۔ شنکر کے تعلق سے اور وہ اپنے اس فیصلہ پر خود ہی مسکرا پڑا۔

ڈاکٹر داس ایک بہترین سائنٹسٹ، ہمدرد معالج اور قابلِ قدر موجد ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرِ نفسیات بھی تھا۔ اب تک وہ نفسیات پر کئی اہم مقالے لکھ چکا تھا۔ جن کی وجہ سے اسے نفسیات پر اتھارٹی تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ لیکن تمام خصوصیات کے ساتھ وہ ایک رحم دل، سادگی پسند اور ملنسار انسان تھا۔ اس کی اپنی الگ لیبریٹری بھی تھی اور یہ ڈاکٹر کی خصوصیت تھی کہ لیبریٹری میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کی اپنی بیٹی کو بھی۔

چار دن میں شنکر بڑی حد تک صحت یاب ہو گیا۔ پھر بھی ڈاکٹر کے مشورے پر اُس نے اپنا علاج جاری رکھا۔ پانچویں دن جب وہ آیا تو نسخہ دکھانے کے بعد اُس نے آہستہ سے ڈاکٹر کی میز پر دس کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب! ایک ایسے وقت جب کہ موت مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ آپ نے جس طرح مجھے بچایا اور جو احسان مجھ پر کیا وہ میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز بھرا گئی۔ ڈاکٹر نے ایک نظر میز پر پڑے دس کے نوٹ پر ڈالی اور پھر مسکراتے ہوئے شنکر سے مخاطب ہوا۔ "تو تمہیں پیسے مل گئے؟" "جی ہاں ڈاکٹر صاحب! آج ہی ابھی ابھی" شنکر نے مسرور لہجے میں کہا۔ اُس کی آنکھیں کسی دبی ہوئی مسرت سے چمک رہی تھیں۔ "شنکر تم کام کیا کرتے ہو؟" ڈاکٹر نے

اچانک سوال کیا۔ "کام!" اُس کی آنکھوں کے روشن دیے بجھ گئے۔ چہرہ مرجھا گیا۔ "کام کچھ نہیں کرتا ڈاکٹر صاحب!" اُس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ اُس کی بجھی بجھی سی نگاہ ڈاکٹر کے چہرے پر مرکوز ہوگئی۔ "تو پھر یہ پیسے؟" ڈاکٹر کی سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر پیوست تھیں۔ چند لمحوں تک وہ ڈاکٹر کی نظروں کا مقابلہ کرتا رہا پھر اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔ "یہی ایک سوال ہے ڈاکٹر جس کا میں جواب نہیں دے سکتا۔" اور پھر وہ اپنے جواب کا تاثر جانے بغیر ہی تیزی سے ڈاکٹر کے کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر اُسے پکارتا ہی رہ گیا۔

ڈاکٹر دو تین دن تک اُس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آیا۔ بالآخر ڈاکٹر نے پیغام بھیج کر اُسے بلوایا۔ جب وہ آیا تو ڈاکٹر اپنی کوٹھی کے لان پر موجود تھا۔ پاس بیٹھی ایک نوجوان لڑکی چائے تیار کر رہی تھی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "آؤ شنکر! شاید کمپاؤنڈر نے میرا پیغام پہنچا دیا۔" ڈاکٹر نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ جھجکتا سمٹتا بیٹھ گیا۔ "جی ہاں ڈاکٹر صاحب! اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں۔" "بمل، شنکر کے لئے بھی چائے بناؤ۔" ڈاکٹر نے لڑکی کو ہدایت کی۔ شنکر نے ایک لمحہ کے لئے دزدیدہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا، پھر اُس کی نگاہ زمیں بوس ہوگئی۔ پھر بھی اُس کی یہ حرکت ڈاکٹر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ "شنکر! یہ میری بیٹی بملا ہے۔ اس گھر میں میری بیٹی اور دو نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔ تجوری زیورات اور نوٹوں سے بھری پڑی ہے۔ کوٹھی ہے، جائداد ہے، دو کاریں ہیں اور یہ سب کچھ صرف بملا کی ملکیت ہے کیونکہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" ڈاکٹر کہتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتوں کی رو میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن درحقیقت ڈاکٹر کی نگاہیں اِس دوران میں شنکر کے چہرے پر پیدا ہونے والے ہلکے سے تغیر کو بھی پا لینے کی کوشش میں تھیں۔ شنکر کی ایک ایک حرکت ڈاکٹر کی نظروں کی زد میں تھی۔ شنکر کو مخاطب کرتے کرتے ڈاکٹر اچانک بملا سے مخاطب ہوا۔ "بمل! یہ شنکر ہے۔ یہیں اِسی بستی میں رہتا ہے۔ بیچارہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بیکار ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شنکر کو پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھوں۔ کل سے یہ اپنی ہی کوٹھی میں رہے گا۔ کیوں بملا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر نے بملا کی رائے جاننی چاہی۔ لیکن اُس کی نگاہ شنکر کے چہرے پر ہی مرکوز تھی جو اس احسان پر اُسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ "آپ نے جب یہ فیصلہ کیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہے پتا جی" بملا کی آواز اُبھری۔ اُس کے لہجے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کے فیصلے کے بعد کچھ کہنا بے سود ہی ہے۔ "کیوں شنکر! تمھارا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب مجھے..... میں تو سمجھ ہی نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟" "بھئی سیدھی سی بات یہ ہے کہ مجھے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ ڈسپنسری کے لئے نہیں، پرائیویٹ کاموں کے لئے۔ تم بے کار ہو، پڑھے لکھے ہو۔ اس طرح دونوں کا کام نکل جائے گا۔ مجھے پرائیویٹ سکریٹری مل جائے گا اور تمھیں نوکری کے ساتھ رہنے کے لئے جگہ۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" "لیکن ڈاکٹر صاحب....." "بھئی اب اعتراض کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہو سکے تو رات یہاں پہنچ جانا یا پھر کل صبح کسی صورت بھی آجانا۔ بملا تمھیں کمرہ دکھا دے گی۔" ڈاکٹر اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ شاید میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" شنکر کا لہجہ سنجیدہ اور وزنی تھا۔ "ہاں ہاں، جلدی کیا ہے۔ جان لوں گا آہستہ آہستہ۔ تم فکر نہ کرو۔ ایسے تمھاری چائے رکھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چائے تو پی لو۔" شنکر چند لمحوں تک ڈاکٹر کو گھورتا رہا۔ پھر چائے پینے میں مشغول ہوگیا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اسے گھر کی تفصیلات، اپنی اور بملا کی عادات اور خود اُس کے فرائض کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس تمام عرصہ میں شنکر نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کا لہجہ ایسا ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو گھر کے حالات بتاتے ہوئے کوئی نصیحت کر رہا ہو۔ ڈاکٹر کا لہجہ، اُس کا برتاؤ اور غیر متوقع طور پر نوکری کی پیشکش

شنکر کے لئے بعید از فہم تھی۔ پھر بھی وہ ڈاکٹر کے کسی بھی فیصلہ سے انکار نہ کر سکا۔ دوسرے دن جب وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ ڈاکٹر کی کوٹھی پر پہنچا تو بملا اُس کی رہنمائی کے لئے منتظر بیٹھی تھی۔

شنکر ڈاکٹر کی کوٹھی میں آگیا۔ ڈاکٹر نے اُسے کچھ ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر ان معمولی کاموں کے لئے ڈاکٹر نے ایک ملازم کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ پھر اُس کا انتخاب؟ لیکن وہ اِس گتھی کو سلجھا نہ سکا۔ وہ بڑی خوشی سے ڈاکٹر کے احکامات کی تعمیل کرتا۔ اُس کے مقالوں کے مسوّدے صاف کرتا، اُس کے تجربوں کے اندراجات کو ترتیب دیتا۔ تمام حساب کتاب دیکھتا اور فرصت کے لمحات میں بیٹھا بملا سے باتیں کرتا یا پھر کچھ لکھنے میں محو رہتا۔

اُس شام بملا کہیں باہر گئی ہوئی تھی اور ڈاکٹر اپنی لائبریری میں بیٹھا کسی کتاب میں غرق تھا۔ شنکر تنہا لان میں بیٹھا جاتی بہاروں کا سوگوار حسن دیکھ رہا تھا۔ سبز پتے کمھلائے جا رہے تھے۔ کچھ کھلے ہوئے پھولوں کی پتیاں جھڑ جھڑ کر زیرِ خاک ہو رہی تھیں اور کچھ ادھ کھلی کلیاں کھل کر مسکرانے سے قبل ہی زرد پڑ گئی تھیں۔ شنکر اِس منظر میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اُسے ڈاکٹر کی آمد کا بھی پتہ نہ چلا۔ وہ تو اُس وقت چونکا جب ڈاکٹر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیوں شنکر یہاں تنہا بیٹھے کیا کر رہے ہو؟" ڈاکٹر کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہلکی زرد چاندنی میں ڈاکٹر نے اُس کے چہرے پر چھائے ہوئے حزن و ملال کے نقوش دیکھے۔ آنکھوں میں پنہاں درد کی انجانی کہانی پڑھی اور خموشی سے اُس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹھو نا!! اس طرح کھڑے کیوں ہو گئے۔" اور شنکر بیٹھ گیا۔ "تم کچھ اُداس نظر آ رہے ہو؟ ایک بات بتاؤ شنکر! تم ہمیشہ کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟" ڈاکٹر کا یہ سوال اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ جو ڈاکٹر کی آمد سے پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا اِس غیر متوقع سوال سے اور گھبرا گیا۔ "سر...... وہ" "شنکر دیکھو شنکر! ایک بات کہوں۔ اگر تم مجھے "سر" یا "ڈاکٹر" کے بجائے "انکل" کہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں تمہیں نوکر نہیں، اپنے بیٹے کی طرح رکھنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر کے لہجے میں حد درجہ محبت اور شفقت تھی۔ ایک لمحہ کے لئے شنکر سکتے میں آگیا۔ پھر اُس کے گلے سے بھرّائی ہوئی آواز نکلی "جی انکل" ڈاکٹر کی متجسس نگاہ جو اس کے چہرے پر عیاں ہونے والے تغیرات کا مشاہدہ کر رہی تھی یہ کیسے نہ محسوس کرتی کہ وہ اُمڈے ہوئے آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنائیت اور خلوص کے چھوٹے سے مظاہرے پر جو دل بھر آئے وہ انسانیت سے بعید حرکات کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے سوچا۔ شنکر سماج کی نظروں میں بُرا کیوں ہے؟ کیوں اُسے ناقابلِ اعتبار، آوارہ اور بدچلن کہا جاتا ہے؟ ڈاکٹر کے ذہن نے ایک ماہرِ نفسیات سے سوال کیا۔ لیکن وہ ابھی اس قابل نہ تھا کہ ان سوالوں کا جواب دیتا۔ اسی انداز میں سوچتا ہوا ڈاکٹر جذبات کے دھارے میں بہت دور تک چلا گیا۔ پھر وہ چونک پڑا۔ شنکر اب بھی خاموش اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ لیکن وہ اُمڈتے ہوئے جذبات پر قابو پا چکا تھا۔ "شنکر ایک بات بتاؤ گے؟" "پوچھئے" "تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" "ماں باپ" شنکر زیرِ لب بڑبڑایا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس کی نگاہ پائیں باغ سے جاتی بہار کے نقوش پر مرکوز ہو گئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "انکل میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں انکل! جب میں نے ہوش سنبھالا تو لامحدود آسمان اور نفرت کرتے ہوئے انسانوں کے سمندر کے سوا مجھے کچھ اور نظر نہیں آیا۔ میری زندگی شہر کے فٹ پاتھوں پر پروان چڑھی۔ میری تعلیم میری ہی جد و جہد کا ثمر ہے۔ انکل میں نے بھوکے پیٹ، ننگے تن رہ کر مسرت کی تلاش کی، محبت کی جستجو کی، دو میٹھے بول اور دو گھڑی کی محبت کے لئے زندگی کا داؤ لگایا لیکن انکل...... یہ دنیا بڑی ذلیل ہے۔ انتہائی ذلیل۔ یہ خوش پوش لٹیرے، خدا کے

رشتوں کی دہائی دینے والے، دوستی کے دعویدار، انسانیت سماج اور سوسائٹی کی بہبود کا راگ الاپنے والے یہ سب ..... یہ سب دولت اور شہرت کے بھوکے بھیڑیئے ہیں۔ ننگِ انسانیت ہیں۔ انھیں صرف اور صرف دولت کی طلب ہے اور مجھے ایسے بھوکے بھیڑیوں سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ میں نے ہمیشہ اپنی اس نفرت کا کھل کر اظہار کیا جس کے عوض مجھے اس ننگِ انساں سوسائٹی نے نفرت دی۔ ذلیل کیا۔ مجھے ... مجھے ....» اور شنکر کی آواز جذبات میں ڈوب گئی۔ ڈاکٹر کا ذہن اُس کے ایک ایک لفظ کو تول رہا تھا۔ شنکر کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اُس کے ماضی کی گرہ کھول رہا تھا۔ اُس کی شخصیت کو اُبھار رہا تھا۔ شنکر خاموش تھا اور ڈاکٹر سوچ رہا تھا کہ جذبات میں طوفانی ہلچل ہے، اور اس وقت ان طوفانی لہروں پر اس کے ماضی کے اوراق آسانی سے اُلٹے جا سکتے ہیں۔ "شنکر تمھارا وطن کون سا ہے؟" "وطن!" شنکر کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اتنی تلخ اور چبھتی ہوئی کہ ڈاکٹر کو اپنی نظر جھکا لینی پڑی۔ ڈاکٹر کو پہلی بار احساس ہوا کہ اگر شنکر کے جذبات بیدار ہوں، اس کے اندر کا مجروح انسان برسرِ پیکار ہو تو اس کی نگاہوں کا مقابلہ محال ہوتا ہے۔ "انکل فٹ پاتھوں پر پروان چڑھنے والی زندگیوں کا نہ کوئی وطن ہوتا ہے، نہ قومیت، نہ اُن کا کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل۔ اُن کا صرف حال ہوتا ہے اور وہ حال جس سے دنیا نفرت کرتی ہے۔ جسے اپنانے اور پناہ دینے میں سوسائٹی اپنی ذلت محسوس کرتی ہے۔" شنکر کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ ڈاکٹر کو کوئی اور سوال کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

رات آدھی ڈھل چکی تھی۔ ڈاکٹر داس نیند اچاٹ ہو جانے کے باعث بڑی دیر سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بالآخر وہ بستر سے اُٹھ گیا۔ ڈریسنگ گاؤن پہن کر وہ لان پر ٹہلنے کی نیت سے باہر نکلا اور جوں ہی اُس کی نظر شنکر کے کمرے پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے کمرے میں روشنی تھی۔ ڈاکٹر کی نظر گھڑی کی طرف گئی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اتنی رات گئے تک شنکر کے کمرے میں روشنی؟ ایک سوال ڈاکٹر کے ذہن میں اُبھرا۔ اور اس کے قدم شنکر کے کمرے کی سمت اُٹھنے لگے۔ دروازہ کھلا تھا اور شنکر میز کے پاس بیٹھا ہوا کچھ لکھنے میں محو تھا۔ ڈاکٹر کی جستجو بڑھتی گئی۔ وہ اپنے قدموں کی چاپ دبائے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا، لیکن شنکر کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح خیالات میں غرق لکھتا رہا۔ کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ ڈاکٹر کو احساس نہ ہوا۔ وہ تو اس وقت سنبھلا جب کہ شنکر نے قلم رکھ کر تمام صفحے اکٹھے کیے اور صفحۂ اول کی پیشانی پر کچھ لکھنے لگا۔ ڈاکٹر کے لبوں پر ہلکا سا تبسّم بکھر گیا۔ دھیرے دھیرے شنکر کی زندگی پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے جا رہے تھے۔ لیکن — یہ کیا! ڈاکٹر کو اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے چند لمحوں تک بڑی جد وجہد کرنی پڑی۔ پھر جب شنکر اپنا قلم بند کر چکا تو ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ "مبارک ہو مسٹر پال" شنکر کو جیسے بجلی چھو گئی۔ وہ اس طرح اُچھل پڑا کہ کرسی اُلٹ گئی اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈاکٹر کو گھورنے لگا۔ ڈاکٹر نے پھر اپنا جملہ دُہرایا۔ "انکل" شنکر کی بھرّائی ہوئی آواز اُبھری اور اُس کی نگاہ جھک گئی۔ "مجھے علم نہ تھا کہ میرے گھر میں اپنے ملک کا ایک نامور مصنّف بسیرا کیے ہوئے ہے۔ لیکن مسٹر پال، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس طرح آپ اپنی زندگی پر پردہ کیوں ڈالے ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر کے لہجے میں بے پناہ حیرت و استعجاب تھا۔ "انکل" آپ مجھے پال نہ کہیے۔ میری زندگی پال کی نہیں شنکر کی ہے۔ پال کی زندگی، اُس کی عزّت، احترام سب کچھ ان کاغذ کے پرزوں کی حد تک محدود ہے۔" "لیکن کیوں؟ آخر تم اپنی زندگی کو چھپانے پر مصر کیوں ہو؟" "اس لئے انکل کہ پال کی زندگی شنکر کی مرہونِ منّت ہے۔ پال کا جنم شنکر کے جنم کے بہت بعد ہوا۔ پال کے وجود و تشکیل اور اُس کی زندگی کو نکھارنے سنوارنے میں شنکر کی زندگی کو افضلیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پال کا، ایک ادیب کا وجود شنکر کی وجہ سے۔ اُس

انسان کی بدولت جو ٹھکرا دیا گیا۔ عمل میں آیا۔ ورنہ ایک ادیب، ایک پال کبھی وجود میں نہ آتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا شنکر سے نفرت کرتی ہے۔" شنکر کی زندگی میں پنہاں پال، ایک ادیب کی آواز بڑی دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"اور تم اس نفرت کو برقرار رکھنا چاہتے ہو؟" ایک ماہر نفسیات نے سوال کیا۔ "میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا انکل۔ اگر آج دنیا یہ جان لے کہ پال اور شنکر ایک ہی ہستی کے دو رُوپ ہیں تو آپ جانتے ہیں۔ کیا ہوگا؟ وہ لوگ جو آج پال کا نام احترام سے لیتے ہیں اُس کے نظریوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ جان کر کہ وہ جس کی تخلیقات، جس کے نظریات کا اس قدر احترام کرتے رہے وہ فٹ پاتھ پر رینگنے والے ایک گندے کیڑے کے، ایک بدنام کے ہیں تو پھر وہ نفرت و حقارت سے پال کو بھی ٹھکرا دیں گے۔ انکل اگر پال کے چہرے سے نقاب اُتر جائے تو دو باتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ لوگ مجھے پال کی حیثیت سے جان لینے کے بعد اپنی زندگی کے اُس رخ کو چھپانے کی کوشش کریں گے جس میں خود غرضی، لالچ، نفرت اور انسانیت سوز خیالات ہیں جس سے میں زندگی کے اُس رُوپ کو دیکھنے سے محروم ہو جاؤں گا۔ یا پھر پال کی حیثیت سے شنکر کے خیالات کی جو قدر ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے گی اور اس کا مطلب پال کی موت ہے۔ اور مجھے یہ دونوں صورتیں پسند نہیں۔ انکل میری التجا ہے کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔" شنکر جذبات سے مغلوب ڈاکٹر کے قدموں پر جھک گیا اور ڈاکٹر نے اُسے اٹھا کر لپٹا لیا۔

ڈاکٹر داس نے جو شنکر کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتے تھے، محسوس کیا کہ اُس کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ لیکن اس کھلی کتاب پر ایک ایسی سوالیہ علامت تھی جس کا ڈاکٹر داس اب تک تجزیہ نہ کر سکا تھا۔ اور وہ سوالیہ علامت ——— ! شنکر کی ادھوری زندگی۔ شنکر ادیب پال۔ پال اور شنکر۔ دونوں ہی کسی چیز کی کھوج میں تھے روح کی تسکین اور زندگی و انسانیت کی معراج کے لئے یا ——— ؟ وہ کسی ایسی شے کی تلاش میں تھے جس میں ہونے والی ناکامی مایوسی کی حدوں کو چھونے لگی تھی اور ڈاکٹر اس سوال کا حل تلاش کر رہا تھا۔

ڈاکٹر داس شنکر سے اور شنکر ڈاکٹر داس سے متعلق تھے اور بملا خاموش نگاہوں سے اس سنجوگ کو تکتی رہتی۔ پھر زندگی نے کروٹ لی۔ شنکر کو بملا کی نگاہوں سے ایک پیام ملنے لگا۔ شنکر کی جوانی نے اُسے لبیک کہنا چاہا۔ لیکن اُس کی زندگی نے بے اعتنائی برتی۔ پھر اس پیغام کو ڈاکٹر داس کی نگاہ نے بھی پا لیا اور ڈاکٹر کہانی کے اس نئے موڑ کا بڑی توجہ اور دلچسپی سے مطالعہ کرنے لگا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ اگر یہ چمک بڑھ کر شنکر کی آنکھوں کو بھی منور کر دے تو ——— ! وہ سوال حل ہو جائے جو شنکر کی زندگی کی کھلی کتاب پر ایک مہیب شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر نے سوچا۔ لیکن شنکر کی آنکھوں میں کوئی دیپ نہ جلا۔ کوئی روشنی نہ ہوئی۔ وہ اُسی طرح ویران اور اُداس رہیں اور ڈاکٹر داس ویرانوں میں بھٹکتا رہا۔ اس کا ذہن الجھتا رہا۔

وہ گرمیوں کی ایک رات تھی۔ ڈاکٹر لائبریری سے نکل کر اپنے کمرے کی سمت بڑھا تو شنکر کے کمرے سے اُبھرنے والی سسکیوں کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "کیا زندگی کی منزل کھو جانے والا زندگی ہی سے مایوس ہو گیا ہے؟ ایک سوال اُبھرا۔ لیکن نہیں۔ یہ آواز شنکر کی نہیں۔ تو پھر؟ اور ڈاکٹر کے قدم شنکر کی خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر کو رک جانا پڑا۔ بملا شنکر کے زانو پر سر رکھے سسکیاں لے رہی تھی اور شنکر بُت بنا خلا میں گھور رہا تھا۔ "تم بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنا دامن وا کئے سر بسجود تھا اور محبت سے تہی زندگی حیران کہ اُس کے دامن میں ڈالے تو کیا؟ شنکر... شنکر اب میں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ اب مجھ میں طاقت نہیں کہ اور اس آگ میں جلوں۔ مجھے اپنا لو

میری ادھوری زندگی ....." آنسوؤں میں ڈوبی بملا کی آواز اُبھری جسے کاٹتے ہوئے شنکر نے کہا۔ "تم نہیں جانتی ہو بملا کہ تم کیا کہہ رہی ہو اور کیا کرنے جا رہی ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ جانا محبت نہیں پاگل پن ہے۔ اور پھر.... میں کیا ہوں ؟" ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ شنکر کی آواز کھوکھلی ہے۔ یہ آواز روح کی گہرائیوں سے نہیں اُبھر رہی ہے۔ یہ آواز جذبات سے ہم آہنگ نہیں۔ "تم کیا ہو ؟" بملا بپھر گئی۔ اُس نے سر اٹھا کر اپنی نظر شنکر کی نظر سے ملانی چاہی۔ تب ہی اُ سے احساس ہوا کہ ایک سایہ کھڑکی کے پاس سے ہٹا ہے۔ پہلے وہ ٹھٹکی پھر بلند آواز سے کہنے لگی۔ "تم کیا ہو یہ میں خوب جانتی ہوں۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ اگر تم پتا سے میرا ہاتھ مانگو تو وہ انکار کر دیں گے ؟ لیکن بملا میں پتا سے ایسے پاگل پن کی بات کہہ نہیں سکتا۔ تو پھر میں کہتی ہوں ۔" "نہیں بملا۔" شنکر لرز گیا۔ "تم ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں یہ برداشت نہ کر سکوں گا۔" "آخر کیوں ؟" بملا بضد ہوئی۔ اُس کی دُزدیدہ نگاہیں اب بھی اُس سائے کو دیکھ رہی تھیں جو کھڑکی کے قریب ساکت کھڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سایہ کس کا ہے۔ "اِس لئے کہ مجھے ڈاکٹر کی عزت عزیز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر میری یا تمھاری خواہش کو ٹھکرائیں گے نہیں۔ لیکن اِس خواہش کا انجام ؟ کل سر بازار دنیا کہے گی کہ ڈاکٹر نے ایک آوارہ کو اپنے گھر پناہ دے کر اپنی لڑکی کی عزت نیلام کی اور میں یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں سکتا۔" "تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے محبت نہیں۔" بملا کی آنکھوں سے پھر آنسو اُمڈ پڑے۔ "میں نے تم سے کبھی اقرار محبت نہیں کیا بملا۔ لیکن آج جبکہ تم یہ سوال کر رہی ہو تو یہ کہے بنا نہ رہ سکوں گا بملا کہ میں بھی اُس دن سے تمھیں چاہتا ہوں، تمہاری پرستش کر رہا ہوں جس دن سے تمھیں دیکھا ہے۔ لیکن میری محبت جواب کی طالب نہیں۔ میری زندگی اُس دیئے کی طرح ہے جو رات بھر خموشی سے جلتا اور سحر کے جھونکوں سے بجھ جاتا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ لیکن بملا میری یہ محبت میرے ساتھ میرے دل کی گہرائیوں میں دفن ہو جائے گی۔ کبھی اس کا اظہار نہ ہو سکے گا۔ کبھی میں اس کا ذکر نہ چاہوں گا۔" شنکر کی مدھم ڈوبی ڈوبی سی آواز ڈاکٹر کے کانوں سے ٹکراتی رہی اور اُس کے لبوں پر رنگین مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

"اگر تم پتا سے نہیں کہہ سکتے تو پھر ایک راستہ اور ہے۔" بملا کی آواز اُبھری۔ "وہ کیا ؟" ڈاکٹر واپس شنکر کے استفسار پر بملا کے آہستہ آہستہ ہلتے ہونٹوں کو چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اپنی خوابگاہ کی طرف چل پڑا۔

دوسری شام جب ڈاکٹر واپس آیا تو شنکر نظر نہ آیا۔ استفسار پر بملا نے بتایا کہ وہ پکچر دیکھنے گیا ہے۔ "پکچر" ڈاکٹر کو حیرت ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ڈاکٹر سے اجازت لئے بغیر کہیں گیا تھا۔ "اُس نے مجھ سے تو نہیں کہا تھا۔" ڈاکٹر بڑبڑایا۔ "بس یوں ہی بیٹھا بیٹھا چلا گیا۔ کہتا تھا کچھ طبیعت اُلجھی ہوئی ہے۔" "ہاں یہ بات آج میں نے بھی نوٹ کی تھی۔" ڈاکٹر کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری۔ بملا اس مسکراہٹ کا مطلب جانتی تھی۔ اُس کی نظریں جھک گئیں۔ "تم کیوں نہ چلی گئیں ساتھ۔" "شنکر ہی نے منع کیا۔ کہتا تھا پتہ نہیں انکل کو کب کس چیز کی ضرورت پڑ جائے کسی ایک کا رہنا ضروری ہے۔" بملا منہ بسورتی ہوئی بولی۔ "نادان کہیں کا۔ مجھے بچہ سمجھتا ہے اور تم بھی !" ڈاکٹر نے بملا کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا اور لائبریری کی طرف چل پڑا۔

ڈاکٹر کی وہ رات چین سے کٹی لیکن صبح ـــــ : شدید ذہنی ہیجان لے کر آئی تھی۔ بملا اور شنکر دونوں غائب تھے۔ تجوری کھلی پڑی تھی۔ تمام نقدی اور زیور غائب تھے۔ بملا کے ڈریسنگ ٹیبل پر ڈاکٹر کے نام ایک چٹھی رکھی تھی جس میں درج تھا۔ "پتا مجھے شنکر سے پیار ہے

آپ کی اس دنیا سے بہت دُور، ہمیں تلاش نہ کرنا۔" آپ کی بملا۔ ڈاکٹر کے اعتماد کو شدید صدمہ پہنچنا لازمی امر تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ شنکر کوئی ایسا قدم اُٹھائے گا لیکن حقیقت سامنے تھی۔ بہت دیر تک وہ بُت بنا کھڑا رہا۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی۔ جب چونکا تو سب سے پہلے اُس نے فرض کی تکمیل میں پولیس کو اِس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور پھر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا: "بے وقوف بچّو! آج تم نے کتنی بڑی نادانی کی ہے۔ تمھاری اِس نادانی نے مجھے شرمسار کر دیا۔" ڈاکٹر زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر پولیس آئی۔ تمام حالات سے آگاہ ہونے کے بعد انسپکٹر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ "مجھے حیرت ہے ڈاکٹر کہ ایک ایسے آدمی کو جس کی شخصیت مشتبہ تھی آپ نے ملازم کیوں رکھا اور اُس پر اِس قدر اعتماد؟" "آپ کی حیرت بجا ہے انسپکٹر! لیکن میں شنکر پر کوئی الزام عائد نہیں کرنا چاہتا۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ دونوں کا پتہ مل جائے۔ شنکر اتنا بُرا نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔" ڈاکٹر نے بجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اِس کے باوجود کہ وہ ....." حیرت زدہ انسپکٹر نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ "ہاں انسپکٹر! بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک عام فہم آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اِس کے بعد انسپکٹر اُسی طرح حیرت زدہ لوٹ گیا۔ بملا کا خط انسپکٹر اپنی تحویل میں لے چکا۔

تیسرے دن ڈاکٹر داس کو ایک اور شدید صدمہ اُس وقت پہنچا۔ جب پولیس نے بملا کی لاش ملنے کی اطلاع دی۔ بمبئی جانے والی ٹرین میں ڈراؤنڈ، پونا اسٹیشنوں کے درمیان ایک سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے مسافروں نے ایک عورت کی لاش دریافت کی جسے قتل کیا گیا تھا۔ اور یہ لاش بملا کی تھی۔ بملا کی لاش کے ساتھ اس کے مُردہ جسم پر لپٹے ملبوسات کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔ جس کا مطلب یہ اخذ کیا گیا کہ قاتل نے نقدی اور زیور کے لیے جرم کیا۔ اِس کے ایک ہفتہ بعد شنکر کو ایک مقامی ہوٹل سے گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش شروع ہوئی۔ شنکر نے پہلے الزامات منسوبہ سے انکار کیا۔ لیکن جب انسپکٹر نے بملا کی چٹھی دکھائی تو اُس نے تمام الزامات قبول کر لیے۔ اس کے باوجود اس کے پاس سے نقدی یا زیور برآمد نہ کیے جا سکے۔ ڈاکٹر داس نے شنکر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن اُس نے انکار کر دیا۔

مقدمہ چلا اور شنکر کو پھانسی کی سزا ملی۔ اُسے پھانسی ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر داس کا ضمیر مطمئن نہ تھا۔ بار بار کوئی چیز اس کے دل و دماغ میں کچوکے لگاتی رہتی۔ بار بار ڈاکٹر کو شنکر کی آخری خواہش یاد آتی۔ جو اُس نے تختۂ دار پر کی تھی۔ کتنی انوکھی تھی وہ خواہش اور کتنی پُر معنی! پھانسی کے تختے پر جب اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے جیلر کے معصوم بچّے کے رخسار کو چومنے کی خواہش ظاہر کی۔ جسے وہ کبھی جیلر کے ساتھ راؤنڈ پر دیکھ چکا تھا۔ اُس کی اِس خواہش پر سب مبہوت سے رہ گئے۔ لیکن ڈاکٹر داس ——— !!

ڈاکٹر داس نے کئی کئی طریقوں سے اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پھانس نہ نکل سکی۔ جو شنکر کی زندگی اور موت کے درمیان پھنس گئی تھی۔ ڈاکٹر داس کو بملا سے زیادہ شنکر کی زندگی کا قلق تھا۔ اس خلش اور الجھن نے ڈاکٹر داس کو ناکارہ کر کے رکھ دیا۔ اُس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔

اُس شام وہ ڈسپنسری نہ جا سکا۔ طبیعت مضمحل تھی۔ شام ڈھل رہی تھی اور ڈاکٹر ان ہی خیالوں میں غرق بیٹھا تھا۔ سامنے رکھی چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی۔ معاً وہ چونک پڑا۔ کسی کے قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔ نگاہ اٹھی اور اُس کے لبوں پر سوگوار تبسّم پھیل گیا۔ آنے والا ڈاکٹر کا پڑوسی نوجوان نریندر تھا۔ "ہیلو ڈاکٹر" وہ قریب آ گیا۔ "ہیلو نریندر، آؤ بیٹھو۔ کب آئے —؟" ڈاکٹر نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا اور نوکر کو دوسری چائے لانے کا حکم دیا۔ "یہ جان کر افسوس ہوا ڈاکٹر کہ بملا قتل کر دی گئی۔" نریندر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نریندر کے لہجے کی بے دردی پر چونک پڑا۔ لیکن وہ

کچھ کہہ نہ سکا۔ نظریں جھکائے بیٹھا سوچتا رہا۔ "آپ کو افسوس ہوگا ڈاکٹر کہ شنکر جیسے آوارہ شخص کو پناہ دیکر آپ نے غلطی کی۔" نریندر نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ "ہوں"۔ ڈاکٹر چونک کر پر خیال نظروں سے نریندر کو دیکھنے لگا۔ "لیکن ڈاکٹر! شنکر نہ صرف شریف بلکہ بے گناہ بھی ہے۔" "وہ کیسے"؟ ڈاکٹر پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اُس کی نگاہ ایک ماہر نفسیات کی نگاہ بن گئی۔ اُس کا ذہن تیز رفتاری سے کام کرنے لگا۔ "اس لئے ڈاکٹر کہ کملا کا قاتل کوئی اور ہے۔ وہ جو شریف ہے، مہذب ہے۔ یعنی شریف اور مہذب کہلاتا ہے۔ اونچی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن کا مالک ہے۔ میں نہیں جانتا ڈاکٹر آپ اسے خوبی کہیں گے یا خامی! بہرحال یہ بات ہے کہ وہ لوگ شریف کہلاتے ہیں۔ انسانیت کے دشمن ہونے کے باوجود بدترین مجرم اور قاتل ہونے پر بھی کسی کی نظر اُن کی طرف صرف اس لئے نہیں اُٹھتی کہ وہ ——— مسلّمہ شریف ہوتے ہیں اور بعض لوگ ——— اُن کی شخصیت صرف اس لئے مشکوک ہوتی ہے کہ وہ اپنی شرافت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ صرف اس لئے تختۂ دار تک پہنچ جاتے ہیں کہ وہ کسی کی آن پر حرف نہ آنے دینے کی تمنا رکھتے ہیں۔"

"تم نے نہیں بتایا کہ کملا کا قاتل کون ہے؟" ڈاکٹر نے نریندر کے طویل لیکچر پر غیر متاثر لہجے میں سوال کیا۔ "کیا اب بھی بتانا پڑے گا ڈاکٹر؟" نریندر کے لہجے میں تیکھا طنز تھا۔ "نریندر" ڈاکٹر چیخ اُٹھا۔ "چلاؤ نہیں ڈاکٹر یہ مزدوری نہ تھا کہ میں تمہیں یہ بات بتانے آؤں۔ لیکن تمہاری حالت اور ذہنی اُلجھن کو دیکھ کر مجھے تم پر ترس آگیا۔" "مگر مجھے تم پر ترس نہیں آئے گا۔ قاتل اور انسانیت کے دشمن پر ترس کھانا میں نے نہیں سیکھا ہے نریندر۔" ڈاکٹر کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "ہاں ڈاکٹر میں قاتل ہوں اور انسانیت کا دشمن بھی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود تم، تمہاری یہ سوسائٹی، سماج اور تمہارا قانون اب میرا کچھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ——— ایک قاتل سزا پاچکا ہے۔" نریندر نے اُسی طنزیہ لہجہ میں کہا اور پھر وہ اُٹھ گیا۔ ڈاکٹر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ دُور تک نریندر کے قدموں کی چاپ گونجتی رہی۔ پھر وہ تاریکیوں میں گم ہوگیا۔

——— بقیہ افسانہ "دیوار"، صفحہ ۴۸ ———

"رذیلوں کے ایسے ہی کام ہوتے ہیں۔"

"رذیل کون ہے اماں؟"

"وہی تیرا دوست لطیفے . . ."

"نہیں ماں . . ."

معاً شرافت کی آہنی دیوار بلند ہوئی۔ اُس سے پرے لطیفے کا گھر تھا۔ میں نے اُس دیوار میں سیندھ لگائی تھی۔ لیکن یہ دیوار کس کی تھی؟ میری شرافت کی یا لطیفے کی عزت کی . . . .

"نہیں اماں۔ لطیفا رذیل نہیں۔ رذیل میں ہوں۔"

اور اماں حیران ہوکر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

ماہر القادری

(فکرِ تازہ)

ساقی بھی، دورِ جام بھی، بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کئے ہوئے

اُن کو غرورِ حسن ہے، مجھ کو سرورِ عشق
وہ بھی نشے میں چور ہیں، میں بھی پئے ہوئے

صیّاد نے اجازتِ فریاد دی تو ہے
میں پھر بھی ڈر رہا ہوں زباں کھولتے ہوئے

عارض کی سرخیوں میں جھلکتی ہوئی حیا
لوگوں کے دیکھنے کی شکایت لئے ہوئے

اُس محفلِ نشاط میں، اُس بزمِ ناز میں
اے موجِ بادِ صبح! مجھے بھی لئے ہوئے

اُن کو ہوائے تند تھی موجِ نسیم بھی
شاخوں پہ رہ گئے تھے جو تنکے جلے ہوئے

وہ کر رہے ہیں پرسشِ احوال اِس طرح
آنکھوں میں رنگِ طنز، ہنسی رکتے ہوئے

نقشِ قدم پہ دوست کے سجدوں کے ساتھ ساتھ
آنکھوں سے چن رہا ہوں ستارے گرے ہوئے

یہ حال ہو گیا ہے کہ جھونکے نسیم کے
آتے ہیں اب قفس میں سب مجھے چھیڑتے ہوئے

میں خود پہل کروں کہ اُدھر سے ہو ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے

شاید اب اِس کے بعد قیامت نہ آئیگی
ماہر! وہ دل کا حال وطن چھوڑتے ہوئے

مجیبؔ خیرآبادی

ابھی تو اپنی جولانی فضائے بیکراں تک ہے
جنوں سامانیوں کا سلسلہ جانے کہاں تک ہے

قفس میں کم سے کم تسکین کی تانیں تو اُڑتی تھیں
یہاں برہم چمن تو کیا، مزاجِ باغباں تک ہے

رفیقانِ سفر بھی موردِ الزام ہیں لیکن
شریکِ جرمِ گمراہی امیرِ کارواں تک ہے

ہماری دسترس میں نظمِ میخانہ تو آنے دو
یہ بے کیفی نگاہِ ساقیٔ نامہرباں تک ہے

مجیبؔ اس دور میں دُنیا کے غم اپنائے بیٹھے ہیں
حریفوں کا سخن جب صرف "دو مونہی" زباں تک تھے

قیصرؔ قلندر

صبح کی دہلیز تک آیا ہوں، تارے کی طرح
جل رہا تھا عرصۂ شب میں شرارے کی طرح

اُن تغافل کیش آنکھوں میں توجہ کی کرن
ڈوبتے ارماں کو تنکے کے سہارے کی طرح

ساعتوں کے سب مسافر چھوڑ کر تنہا، گئے
مضطرب ہوں، وقت کی وسعت میں پارے کی طرح

جی بہت ہلکا ہوا ہے، مطلعِ دل صاف ہے
بہہ گئے اشکوں کے بادل تیز دھارے کی طرح

تیرے لب، تیرا تبسم، تیری چھب، تیرا بدن
دامنِ دل کھینچتے ہیں، استعارے کی طرح

تو نے بخشا سخت لمحوں کو گدازِ حسنِ تحمل
یاد کی محراب میں ہے خوش گوارے کی طرح

اُن گھنی پلکوں کے پیچھے پیار کی شفاف جھیل
ڈھونڈتا ہوں جس کی لہروں پر شکارے[1] کی طرح

رات ماضی کے دریچوں میں بہت جھانکا کیے
دُور تک حسرت بھری آنکھوں سے نظارے کی طرح

دَرد نے قیصرؔ کے شعروں میں بالآخر لی پناہ
ہمہموں سے دور بھاگے غم کے مارے کی طرح

[1] شکارہ کشمیری زبان کا لفظ ہے، عام طور پر چھوٹی سی کشتی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اُردو والوں نے بھی اسے اپنا لیا ہے۔ قیصرؔ

(شاعر بھی)

محمد منشاء الرحمٰن خان منشاء

کشاکشِ حیات سے فرار ڈھونڈتے رہے
سکوں کہیں نہ مل سکا ہزار ڈھونڈتے رہے

ہم اپنے داغہائے دل کی مشعلیں لئے ہوئے
تمام عمر صورتِ قرار ڈھونڈتے رہے

اسے فریبِ جستجو نہیں کہیں تو کیا کہیں
گلوں کی آرزو میں لوگ خار ڈھونڈتے رہے

ذرا ہماری سادگی کی انتہا تو دیکھئے
رخِ خزاں پہ زینتِ بہار ڈھونڈتے رہے

بصد ادائے دلبری جو درپئے ستم رہی
ہم اُس نظر کی جنبشوں میں پیار ڈھونڈتے رہے

نکلنے والے منزلوں سے بھی پرے نکل گئے
شکستہ پا نشانِ رہگزار ڈھونڈتے رہے

فضیل جعفری

اشکوں کو روکئے کبھی دل کو سنبھالئے
کس کس طرح سے دردِ محبت کو ٹالئے

حسرت سے دیکھتے ہیں، درختوں کو راہ میں
فرصت کہاں کہ بیٹھ کے حسرت نکالئے

ہم سے بھی اے صبا کبھی پل بھر ہو گفتگو
پھرتے ہیں ہم بھی دولتِ زخمِ وفا لئے

ہر بات دوسروں کے لئے اک سوال ہے
محفل میں بات، سوچ سمجھ کر نکالئے

ہر شخص کے خلوص پہ کیجے نہ اعتبار
سانچے میں اپنے جعفری سب کو نہ ڈھالئے

محسن زیدی

دل میں اک شورشِ طوفاں ہے نہ جانے کب سے
موج ساحل سے گریزاں ہے نہ جانے کب سے

صبح گر صبحِ خزاں ہے تو ہر اک شام اپنی
صورتِ شامِ غریباں ہے نہ جانے کب سے

ابتدا اپنے جنوں کی ہمیں کچھ یاد نہیں
چاک دل چاک گریباں ہے نہ جانے کب سے

قیمتیں بڑھ گئیں ہر شے کی بجز قدرِ وفا
ہے یہی شے جو پشیماں ہے نہ جانے کب سے

راستے گرد ہوئے قافلے تھک ہار گئے
منزلِ شوق کہ پنہاں ہے نہ جانے کب سے

کتنے عیسیٰ ہوئے مصلوب پئے امن مگر
خون انسان کا ارزاں ہے نہ جانے کب سے

نہ کوئی نقش، نہ پرتو ہے، نہ تصویر، نہ عکس
زیست اِک خوابِ پریشاں ہے نہ جانے کب سے

کتنے صحرا ہوئے شادابِ بہاراں محسنؔ
اپنا دل ہے کہ بیاباں ہے نہ جانے کب سے

مظفر حنفی

حالانکہ محتسب سے سبھی پی نہ جائے گی
مے پھر بھی بوند بوند ہمیں دی نہ جائے گی

ہم سوچنے لگے ہیں کہ پینا ہی چھوڑ دیں
طے ہے کہ بد مزاجیٔ ساقی نہ جائے گی

جی چاہتا ہے اس کو لگاتار دیکھئے
پھر بار بار تو یہ خطا کی نہ جائے گی

دنیا کو آپ میری نظر سے نہ دیکھئے
میں عرض کر چکا ہوں کہ دیکھی نہ جائے گی

وہ مائلِ عتاب ہے ہر بے گناہ پر
اپنی خطا پہ اس کی نظر ہی نہ جائے گی

اِس بار اور ہی ہے ارادہ بہار کا
یعنی چمن میں اس کی بلا بھی نہ جائے گی

صیاد و باغباں کی کہانی نہ پوچھئے
یہ داستاں چھڑی تو سمیٹی نہ جائے گی

نیند آئے گی نہ "شاعرِ رجعت پسند کو"
جب تک کسی کی زلف بکھیری نہ جائے گی

تم نے ہر ایک پھول پہ پہرے بٹھا دئے
لیکن نسیمِ صبح تو باندھی نہ جائے گی

دنیا بھی تلخ تر ہے مظفرؔ کے واسطے
اس کی غزل سے طنز کی تلخی نہ جائے گی

اکفیلؔ آذر

شہرِ اصنام سے پیغامبری مانگے ہے
زخم ہی زخم نسیمِ سحری مانگے ہے

کوئی دیکھے تو سہی شوقِ اذیت اپنا
اک قفس اور یہ بے بال و پری مانگے ہے

رنگ و بو، رات، فضا، پھول، ستارے، پیکر
جانے کیا کیا مری آشفتہ سری مانگے ہے

پھر بہت دن سے نہیں دستِ جنوں کو جنبش
پھر بہاروں کا پتہ بخیہ گری مانگے ہے

اپنی بے جان روایات کے پہرے دارو
زندگی آج وقارِ بشری مانگے ہے

تم کو اُس دل پہ خدا جانے ترس کب آئے
جو دعاؤں کے لئے بے اثری مانگے ہے

میں نے ہر موڑ پہ نقشِ کفِ پا چھوڑا ہے
کارواں خضر سے کیوں راہبری مانگے ہے

آج کے دَور میں کس طرح جیو گے آذرؔ!
آج کا دَور تو صاحب نظری مانگے ہے

راہیؔ قریشی

وفا کی خیر مناؤ کہ وقت نازک ہے
دلوں کے زخم چھپاؤ کہ وقت نازک ہے

سُلگ رہی ہیں بہاریں جُھلس رہی ہیں چمن
خوشی کے گیت نہ گاؤ، کہ وقت نازک ہے

حیات حشر کا میدان ہو چکی کب کی!
حساب اپنا چکاؤ کہ وقت نازک ہے

حریفِ نُور ہے اب تیرگی زمانے میں
کوئی دِیا نہ بُجھاؤ کہ وقت نازک ہے

ٹپک رہا ہے جو آنکھوں سے اشک بن بن کر
وہ درد دل میں چھپاؤ کہ وقت نازک ہے

کرو نہ ذکرِ سکوں، فکرِ آشیاں چھوڑو
چمن کی آگ بجھاؤ کہ وقت نازک ہے

خلوصِ دل کو، محبت کو، آدمیت کو
بہر طریق بچاؤ کہ وقت نازک ہے

سسک رہی ہے جو تہذیب مر نہ جائے کہیں
بچاؤ! اِس کو بچاؤ کہ وقت نازک ہے

لباسِ راہبری میں ہے رہزنی راہیؔ
کوئی فریب نہ کھاؤ کہ وقت نازک ہے

مکتوبات

کنول پرشاد کنول ——— حیدرآباد (دکن)

"شاعر" کا سالنامہ بہت خوب ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ جس توجہ سے آپ پرچہ نکالتے ہیں وہ لائق صد تحسین ہے۔

ماہر القادری ——— کراچی

سالنامہ ۶۵ء مضامین کے تنوع اور ترتیب و تزئین، غرض ہر اعتبار سے خوب ہے۔ حیرت ہے کہ آپ گوناگوں مشکلات کے ہجوم میں اتنے شاندار خاص نمبر مرتب فرما لیتے ہیں — !

اطہر افسر ——— حیدرآباد

"شاعر" کا سالنامہ ملا۔ سب سے پہلے میں نے کرشن چندر اور کرتار سنگھ دُگل کے افسانے پڑھے۔ پھر آپ کی غزل پڑھی۔ مقالوں میں "شاعری دورِ انقلاب میں" اور "اُردو کے صوفی شعرا" بہت عمدہ ہیں۔

بیک نظر تو نظموں سے غزلوں کا معیار بلند محسوس ہو رہا ہے۔ محروم۔ ملا۔ میکش اکبرآبادی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور تاباں صاحبان کی غزلوں نے عجیب سرور بخشا۔ آپ کی غزل کے گیارہویں بارہویں اور تیرہویں شعر کو میں نے بار بار پڑھا ہے۔

سید حرمت الاکرام ——— مرزاپور

سالنامہ ملا۔ کیا کہنا! مواد کی طرح نیا سرورق بھی کافی حسین ہے اور مقالات کا حصہ بڑا بھرپور۔ افسانوں، نظموں، غزلوں اور طنز و مزاح کے ابواب بھی اپنی جگہ کم دلکش نہیں، لیکن اس مرتبہ کتابت کی جتنی اور جس نوعیت کی غلطیاں سامنے آئیں، وہ "شاعر" کی روایت کو مجروح کرتی ہیں۔ خود میری نظم میں کئی اغلاط موجود ہیں۔ صحیح مصرعے یہ ہیں:—

آ، یہ شہر کار مری قدرتِ تعمیر کے دیکھ (پہلا بند)
جھلملا بھی نہ سکے پلکوں پہ جس کے آنسو (دوسرا بند)
زندگی میری دلآرا، مرے خوابوں کی ہیں (پانچواں بند)

آپ کی غزل اہلِ نظر کے لئے سالِ نَو کی دلنواز شاعرانہ سوغات ہے۔ کاش آپ کا مجموعۂ کلام جلد شائع ہو سکے۔!

اکرام جاوید ——— حیدرآباد

سالنامہ مضامینِ نظم و نثر کے اعتبار سے نہایت معیاری اور قابلِ قدر پیشکش ہے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اُردو اور اُس کے ادب کے لئے وقف کر دی ہے۔ آپ کی خدمات مثالی اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ مقالات کے حصے میں مجھے "شاعری دَورِ انقلاب میں" "معاصرانہ تنقید" "گیت کیا ہے" اور "قومی یکجہتی کا تاریخی پس منظر" بطورِ خاص پسند آئے۔ "جرائم کی چند عبرتناک داستانیں" دلچسپ مضمون ہے۔

نظمیں تقریباً سب ہی پُراثر ہیں اور غزلیں منتخب۔ آپ کی غزل کے تو ہر شعر نے متاثر کیا ہے۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، انور عنایت اللہ، جوگندر پال، گوربچن سنگھ اور آمنہ ابوالحسن کے افسانے پسند آئے۔ طنز و مزاح کے حصے کا مطالعہ وہ مسرت نہیں دے سکا جو اِسے دینی چاہیئے تھی۔ بحیثیتِ مجموعی سالنامہ ایک خوبصورت ادبی تحفہ ہے۔

علقمہ شبلی ——— کلکتہ

کافی انتظار کے بعد "شاعر" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ مندرجات پر ایک نظر ڈالتے ہی انتظار کی ساری کوفت دُور ہو گئی۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کا خطبۂ صدارت نئے شاعروں کے لئے بھی بہت سے کام کے اشارے رکھتا ہے۔ ندا فاضلی نے ہندی کی نئی نظموں کا جائزہ لیکر اُردو والوں کو تقابلی مطالعے کا موقع دیا ہے۔ "گیت کیا ہے؟" میں ڈاکٹر وزیر آغا نے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے مگر تشنگی کا احساس بہرحال رہتا ہے۔ بیشتر نظمیں اور غزلیں دورِ جدید کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کرشن چندر کا "جامن کا پیڑ" موجودہ دفتری تساہل اور Red - tapeism پر بھرپور طنز ہے۔ کوثر چاندپوری کا "بازیگر" ہمارے معاشرے کے ایک ایسے کردار کی نقاب کشائی کرتا ہے جو آجکل ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ "ایک سنسنی خیز چوری" کی

وجہِ اشاعت میری سمجھ میں نہ آسکی۔

اُردو زبان و ادب کے لئے اب فضا سازگار ہو رہی ہے۔ روز بہ روز بدلیاں چھٹ رہی ہیں اِس سلسلے میں آپ کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ——— اخبارات میں آپ نے مغربی بنگال کے "اُردو ہفتہ" کی خبر پڑھی ہوگی۔

مسعود قمر تاباں ——— بھوپال

"شاعر" کے سالنامہ ۶۵ء کی تخلیقات کا انتخاب اور ترتیب شاعر کی دیرینہ ادبی روایات کے مطابق ہے خصوصیت کے ساتھ علامہ سیماب کا خطبۂ صدارت اور سید احتشام حسین صاحب کے علاوہ ندا فاضلی کے مضامین بصیرت افروز اور معلومات سے پُر ہیں۔ تاریخ و تحقیق کے ذیل میں سید نقی احمد ارشاد کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ نظموں میں علامہ جمیل مظہری، شمیم کرہانی اور نازش پرتاب گڈھی کی نظموں نے کافی متاثر کیا۔ دوسری نظمیں بھی پسندیدہ ہیں۔ افسانوں میں کوثر چاند پوری جوگندر پال، اکرام جاوید، آمنہ ابوالحسن اور مہندر ناتھ کے افسانے خاص نمبر میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے افسانے "جامن کا پیڑ" کے ذریعہ جمہوریت کے انتظامیہ پر اپنے مخصوص انداز میں بھرپور طنز کیا ہے۔ غزلوں میں میکش اکبر آبادی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شفا گوالیاری، ماہر القادری، منظر صدیقی، طرفہ قریشی، خاور باشکوٹی، واحد بریلی اور آپ کی غزل بہت زیادہ پسند آئیں۔ طنز و مزاح میں کنھیا لال کپور اور عظیم احمد فر نے اپنے قارئین کی وہ توقعات پوری نہیں کیں جو اُن سے وابستہ رہی ہیں۔

عمیق حنفی صاحب کا مکتوب پڑھ کر تعجب ہوا موصوف نے تخلیق اور تنقید کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اُسے اگر انکشاف کہا جائے تو غیر صحیح نہ ہوگا۔ تخلیق اور تنقید کو دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ دیا جائے تو صحتمند ادب کی تخلیق ناممکن ہو جائے گی۔

اس مسئلہ پر تمام قابل ذکر نقاد متفق ہیں کہ تخلیق تنقید کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی بھی فن کا خالق مروجہ تنقیدی اصولوں کی روشنی ہی میں فن کی تخلیق کرتا ہے۔ تنقید، فن کی کسوٹی ہے جس پر پرکھے بغیر کھرے کھوٹے کا امتیاز مشکل ہے فنکار کا ناقد یا تنقید سے گریز خود اُس کے اپنے حق میں نقصان دہ ہو سکتا ہے نہ کہ ناقد کے حق میں۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ بعض لوگوں میں اِس قسم کا رجحان کچھ عام سا ہو گیا ہے خصوصاً "انفرادیت پرست" عناصر اس جذبے کا شکار ہیں۔

رحمت امروہوی ——— احمد آباد

"شاعر" کا سالنامہ دیکھا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا، مقالات سب کے سب بھرپور اور وزن دار ہیں۔ علامہ سیماب کا خطبۂ صدارت، احتشام حسین کا صوفی شعرا خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، جرائم کی داستانیں۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ کافی دلچسپ ہے۔ اس کے دوسرے باب بھی ممکن ہو تو شائع فرمائیے گا۔

افسانے ابھی تمام نہیں پڑھ پایا ہوں صرف کرشن چندر کا افسانہ "جامن کا پیڑ" پڑھا جو مجھے زیادہ پسند آیا۔ اس میں بھرپور طنز ہے۔ نظموں کا معیار بھی کافی اُونچا ہے طنز و مزاح میں جمال پاشا۔ کنھیا لال اور فرقت کاکوروی ایسا معلوم ہوتا ہے ان تینوں حضرات نے مدیر شاعر کو خوش کرنے کے لئے زبردستی قلم اُٹھایا ہے۔ غزلوں میں خاص طور سے بڑے شعرا نے مایوس کیا ہے۔ ماہر القادری کی غزل بھی ہلکی ہے۔ ویسے یہ غزل مئی کے "فاران" میں گلہائے تازہ کے عنوان سے پورے صفحے کے چوکھٹے میں شائع ہوئی ہے[1]۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل آج سے تقریباً تین چار ماہ قبل "عکسِ لطیف" (پاکستان) میں شائع ہو چکی ہے۔ بڑے لوگوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ مطبوعہ تخلیقات "شاعر" کو روانہ کریں پھر بھی مندرجہ ذیل اشعار پسند آئے:۔

نئی تنظیمِ چمن غم کا مداوا نہ ہوئی
یہ بھی رسمِ قفس و دام سے آگے نہ بڑھی

آنند نرائن ملا

---

[1] ماہر صاحب اِس سلسلے میں بے قصور ہیں سالنامہ کا انتظار کر کے اُنھوں نے فاران کو غزل اشاعت کے لئے دے دی تھی۔ (مدیر)

[illegible] کی یاد اُن کو آ ہی جاتی ہے (میکش اکبرآبادی)
[illegible] چھ دیر یہ پاس بجز آ ہی جاتے ہیں
[illegible] کو کوئی خفا ؤں سے درگذر کب تک

حیات لغزش پیہم سہی مگر کب تک
قدم قدم پہ سنا کر نوید منزل کی
فریب دو گے مسافر کو رہ گذر کب تک

(غلام ربانی تاباں)

جو ملا پیار سے ہم نے اُسے مخلص سمجھا
اب اگر پیار بھی دھوکا ہے، تو ایسا ہی سہی
(زیدی جعفر رضا)

صبح نو کی راہوں میں دور تک اُداسی ہے
مشغل فقط اپنے بام و در نہیں یارو
خاور رانکوٹی

سب سے بڑا یہ سانحہ میخانہ ہے
پیالے ٹکرا جائیں پیمانوں سے
جاگ گیا ہے شاید ظرف بادہ کشاں
شور یہ اُٹھا ہے کیسا میخانوں سے
قاتل ہیں ایک ایسی زباں کے در پئے قتل
جس نے رشتہ جوڑ دیا انسانوں سے
(اعجاز صدیقی)

مظفر حنفی ——— سیہور (بھوپال)

سالنامۂ "شاعر" حسب روایت بلند ترین معیار کا حامل ہے۔ سالنامہ میں اپنے مضمون "نئی اور پرانی تنقید" سے متعلق حضرات طرفہ قریشی، کرشن موہن اور عمیق حنفی کے خطوط دیکھے۔ ان حضرات کا شکر گذار ہوں کہ کسی نہ کسی طور پر اس مضمون پر اظہار خیال کی زحمت گوارہ فرمائی۔ محترم طرفہ قریشی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ زیر بحث مضمون ناموں کی فہرست سے ہٹ کر چند دوسرے اہم معاملات پر اُن کی توجہ چاہتا ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے میں نے ہر اسکول کے نمائندہ فنکاروں کے نام اس میں شامل کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

جہاں تک عمیق حنفی صاحب کے خط کا تعلق ہے چونکہ وہ ایک ذاتی رائے کا حامل ہے اس لئے زیادہ کھل کر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ تنقید [illegible] ہے کہ اس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے [illegible] نہیں ہو سکا کہ تنقید تخلیق کی پیرو ہے یا تخلیق تنقید کی۔ میرے اپنے خیال میں ہر دو اصناف کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں متوازی چلتی ہیں۔ یہ بات بھی برسبیل تذکرہ کہہ رہا ہوں ورنہ اصل مضمون سے اس بحث کا کوئی تعلق نہیں۔

دراصل ادھر جدید ترین نسل اور اُس کے حامیوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب کوئی کام کی بحث چلتی ہے تو صاف بات کرنے کے بجائے اُسے ضمنی باتوں میں اُلجھا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہرگز نہیں ہے کہ فنکاروں کو ناقدین سے توقعات رکھنی چاہئیں یا نہیں۔ عرض صرف اتنی ہے کہ جب ایک بالکل "نابالغ نسل" اپنے حق سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے "واویلا" مچا رہی ہے اور کہیں مصلحتوں کے تحت کچھ لوگ اُس کی حمایت بھی کر رہے ہیں تو کیوں نہ یہ مطالبہ واقعی ایسے لوگوں کی جانب سے سامنے رکھا جائے جنھیں طویل اور موثر خدمات کے باوجود اُن کے حقوق سے واقعی محروم رکھا گیا ہے۔

عمیق صاحب نے ایک بات بالکل غلط کہی ہے کہ وہ ہمیشہ ناقدین سے بے نیاز رہے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی اُنھوں نے اپنی نظم "سندباد" پر اظہار خیال کے لئے فرداً فرداً ظ انصاری، قرۃ العین حیدر، بلراج کومل، شہریار اور دوسرے کئی حضرات سے درخواست کی تھی۔ راقم الحروف کو بھی اسی قسم کا حکم ہوا تھا جس کی تعمیل نہ کی جا سکی۔ اسی پر بس نہیں، نظم کی اشاعت کے بعد اُس کے رد عمل پر شہریار صاحب سے ایک مضمون بطور خاص منگوا کر "ہر رنگ" مئو میں شائع کیا گیا اور اس مضمون سے بھی تسکین نہ ہوئی تو عمیق صاحب نے باقاعدہ تین صفحات کا مضمون اس کے فٹ نوٹ کے طور پر شائع کیا۔ اگر ناقدین سے عدم توجہی کا طریقہ یہی ہے تو مجھے ڈر ہے کہ حقیقی فنکاروں کی خودداری شاید اس سطح پر آنا پسند نہ کرے۔

چنانچہ عمیق صاحب! جدید ترین نسل کی شیشہ [illegible] سے متعلق لوگوں کو کھل کر بات کرنے دیجئے [illegible]

کرکے بات کو اُلجھا دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ اور اگر یہ طریقہ پسند نہیں تو پھر اُسے بلند و بانگ دعوے کرنے سے روکئے ورنہ شیشے کے گھروں سے سنگباری کرنے والوں کا انجام معلوم۔

رشی پٹیالوی ——— چندی گڑھ

شاعر کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ نہایت سادہ ٹائٹل کی جمالی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دیدہ زیبی کے زاویے سے نظر ڈالیں تو "سادگی اور پُرکاری" کی داد دینی پڑتی ہے۔ ظاہری حُسن کی طرح صحت مند ادب سے بھرپور باطنی حُسن بھی خُوب بلکہ خوب تر ہے۔ مضامین نظم و نثر سب معیاری اور خیال انگیز ہیں۔ ہاں! ایک چیز کی کمی محسوس ہوئی ہے، تبرک کے طور پر علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی کوئی غزل یا نظم پرچے میں ضرور ہونی چاہیئے تھی۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ اسے "تبرّا پیکنڈے" کا نام دیتے بہرحال چند ایک مجھ ایسے جو اساتذہ کے کلام سے روشنی حاصل کرتے ہیں ضرور فیضیاب ہوتے۔ گو "شاعری دَورِ انقلاب میں" کے عنوان سے علامہ مرحوم کے خطبۂ صدارت نے حصۂ نثر کی تکمیل کا حق ادا کردیا لیکن حصۂ نظم تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ خیر

ایسا اچھا سالنامہ ترتیب دینے پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نامی انصاری ——— کانپور

"شاعر" کا سالنامہ ۷ مئی کو ملا۔ آج تازہ شمارہ نمبر ۳،۴ بھی موصول ہوا۔ کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ سالنامہ پڑھ چکا ہوں۔ بڑی گراں قدر پیشکش ہے، مضامین معیاری ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی خوب ہیں مگر پتہ نہیں کیوں شعری تخلیقات میں جوش اور اُمنگ کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ غزلوں میں بھی دل پر اثر کرنے والی بات کم ہی کم نظر آتی ہے۔ میں یہاں صرف سالنامۂ شاعر کی بات نہیں کررہا ہوں بلکہ اِدھر کچھ دنوں سے مجھے ہر جگہ یہی رجحان کارفرما نظر آرہا ہے۔ ممکن ہے یہ نتیجہ ہو سماج میں پھیلی ہوئی ایک عام بے چینی اور افراتفری کا جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن اور دل کچھ اُچاٹ اُچاٹ سے ہوگئے ہیں۔

تازہ شمارہ میں آپ کی غزل بہت عمدہ ہے

زخموں نے جوڑ رکھا ہے اپنا عجیب حال
کچھ دوستی کے زخم ہیں کچھ دشمنی کے زخم
جس کو بہت عزیز رہی گردِ اعتبار
لو دے اُٹھے ہیں آج یکایک اُسی کے زخم

ان اشعار میں چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز صاف صاف محسوس ہوتی ہے۔

جناب پیام فتحپوری کا یہ شعر بیت الغزل ہے ؎

پھر روبرو ہے معرکۂ جہدِ زندگی
گر راہ میں ہے سایۂ دیوار کیا کریں

میری غزل کے آخری قطعے میں پہلا مصرعہ کتابت کی غلطی کا شکار ہوگیا ہے۔ اصل مصرع یوں ہے ؎

"کرتے رہے ستائشِ حُسنِ چمن بزاں"

"میری حدیثِ عمرِ گریزاں" (یہ نام بھی شاید مُلّا صاحب کے "بڑے شاعرانہ قد" کا مظہر ہے) پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کو "چیف جسٹس" لکھدیا گیا ہے، حالانکہ وہ صرف جج تھے۔ چیف جسٹس نہیں تھے۔ بہرحال یہ سہو بہت معمولی ہے اور آپ چاہیں تو قطعاً نظرانداز کرسکتے ہیں۔

اس مرتبہ غزلوں کی کتابت بڑی خوبصورت ہوئی ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی کتابت کا یہ معیار برقرار رہے گا۔

بدیع الزّماں خاور (بالکونی) ——— [illegible]

"تازہ شاعر" میں نے تمام و کمال پڑھ لیا ہے۔

اس بار آپ نے "جرعات" بے پناہ جرأت و ہمت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ آپ کی صداقت پسندی قابلِ تحسین ہے ——— "شاعر" اب اردو تحریک کی جان بن چکا ہے۔ مگر اسی کے استحکام کے لئے آپ کو اُردو والوں سے اپیل کرنی پڑتی ہے۔ "شاعر" کی اقتصادی بدحالی کو میں اُردو والوں کی غفلت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ اور اگر اب بھی اس کی بقا و ترقی کے لئے کچھ نہ کیا گیا تو یہ اُردو والوں کی سب سے بڑی فرض ناشناسی ہوگی۔

قمر صاحب کے مجموعۂ کلام "ذرّیت دل" پر آپ کا تبصرہ

دیدہ ور لازمی ہے۔ غالباً شاعر ہی وہ پہلا رسالہ ہے جس میں کوکن کے کسی شاعر کی تصنیف پر غیر جانبداری کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کوکن کو نظر انداز کرنا حقیقت میں ادبی اور صحافتی دُنیا کی غلطی ہے۔ اِس غیر اُردو علاقے سے نہ صرف اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں بلکہ یہاں کثرت سے ایسے ابتدائی اور ثانوی مدارس کھل رہے ہیں جہاں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور اُردو کے سلسلے میں سب سے بڑا تعمیری کام یہی ہے کہ اُردو بولنے، پڑھنے اور سمجھنے والے زیادہ سے زیادہ تیار کئے جائیں۔

طرفہ قریشی ــــــــ ناگپور

تعزیت نامہ کے بعد آج "شاعر" کا تازہ شمارہ بھی موصول ہوا۔ آپ کی تازہ غزل "دوستی کے زخم" پڑھ کر نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گُذری۔ یہ وہ زخم ہیں جو اِس دنیا نے کم و بیش سب کو دئے ہیں۔ ایسے زخم تو اپنوں ہی سے نصیب ہوتے ہیں۔ یہ دنیا ہے۔!! غزل کی "زمین" اور "مقطع" کی تخصیص آپ کے کسی تازہ زخم کا پتہ دیتی ہے......'

زیدی جعفر رضا ــــــــ علیگڈھ

سالنامے کے ساتھ ہی شاعر کا تازہ شمارہ بھی ملا۔ مجھے یقین ہے کہ اتنا شاندار اور کامیاب سالنامہ پیش کرکے آپ نے ادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سالناموں کے بعد کا شمارہ کچھ بےجان سا ہوتا ہے۔ مدیر صاحبان اپنی تمام صلاحیتیں سالنامے کی ہی نذر کر دیتے ہیں لیکن شاعر کا تازہ شمارہ ایک انفرادی کردار کا حامل ہے۔ معیاری مضامین اور منظومات کا یہ خوبصورت گلدستہ اپنی جگہ پر ایک سالنامہ سے کم نہیں ہے۔ کاش شاعر کے آئندہ کے شمارے بھی اس معیار کو قائم رکھیں۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کار لائقہ کے لئے لکھیں مسرت ہوگی۔ شاعر کے آئندہ اداریہ میں کیا آپ یونیورسٹی کے حالیہ ہنگامے سے متعلق کچھ لکھنا پسند کریں گے۔

شیام کنول ــــــــ دیگلور (مہاراشٹر)

سالنامۂ "شاعر" حقیقتاً اِس سال کا ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے۔ علامۂ سیماب کا خطبۂ صدارت آج سے تیس ۳۰ سال قبل لکھے جانے کے باوجود وقت کی آواز معلوم ہوتا ہے اور آج کے دانشوروں کے لئے ایک للکار کا درجہ رکھتا ہے۔ علامہ کے اس اہم ترین خطبہ کی اشاعت آپ نے موزوں ترین وقت پر کی ہے۔ سالنامہ میں مقالات کا حصہ بہت جاندار ہے۔ شعری حصہ بھی اپنی برتری منواتا ہے۔ افسانوں میں مہندر ناتھ۔ گوربچن سنگھ۔ انور عنایت اللہ اور آمنہ ابوالحسن کے افسانے خوب ہیں۔ تاریخ و تحقیق کے حصے میں "خاندانِ مہابت جنگ کی ادبی صحبتیں" یادگار چیز ہے۔ سالنامۂ "شاعر" نے ایک بار پھر "شاعر" کی برتری اور انفرادیت کو منوا لیا ہے۔

ابھی سالنامہ ختم بھی نہ ہو پایا تھا کہ "شاعر" کا عام شمارہ بھی آپ کی جہدِ مسلسل کا درد لیکر ہمدست ہوا۔ سالنامہ کی اشاعت کے فوری بعد عام شمارے کی اشاعت سے حیرت اور مسرت ہوئی۔ "جُرعات" میں "آل پارٹیز اُردو کنونشن" دہلی کے لئے آپ کی تحریر کردہ تقریر دیکھی۔ جس بیباکی سے آپ نے حقائق کا اظہار کیا ہے اور وقت کے "دیوتاؤں" کو چیلنج کیا ہے وہ بیحد قابلِ توجہ ہے۔ اگر اُردو دوست اور اُردو دشمن اِس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو واقعی بات بن سکتی ہے۔

دیگلور سے پچاس ساٹھ میل دُور ایک اور تعلقہ میں انجمن کی نئی شاخ کے قیام اور وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے کل مجھے مرہٹواڑہ کے علاقائی سکریٹری کے ساتھ جانا پڑا۔ بڑا مصروف اور کامیاب پروگرام رہا۔ وہاں کے ایک رُکن کو آپ کی وہ تقریر جو "شاعر" میں چھپی ہے، اس قدر بھائی کہ اجازت لیکر اُنہوں نے مجلسِ عاملہ کی میٹنگ میں پڑھ کر سُنائی۔

"شاعر" کے لئے آپ نے جو اپیل شائع فرمائی ہے۔ اُس پر اُردو دوستوں کو لبیک کہنا چاہئیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسے اُردو زبان کی بدبختی کہا جائے گا۔

اِس شمارہ میں شریک آپ کی غزل آپ کے دل کے زخموں کی آئینہ دار ہے......'

ادارہ

محفل اپنی...!

یہ تازہ شمارہ

"شاعر" کے اس تازہ شمارہ میں زبان کے مسئلہ پر ڈاکٹر گیان چند کا ایک نہایت اہم اور طویل مقالہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں لسانی مسئلہ کا یہ ایک مربوط اور حقیقت پسندانہ تاریخی جائزہ ہے۔ اُمید کہ دوسرے رسائل و اخبارات بھی اسے شائع کریں گے۔ اس اشاعت کے بقیہ تینوں مقالات بھی نقد و نظر کا اچھا نمونہ ہیں۔

پہلی بار پاکستان کے مشہور افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کا ایک بہترین افسانہ "دیوار" شاعر میں شائع ہو رہا ہے۔ موہن یادور اور شیام کنول کی کہانیاں "دو فرشتے" اور "فرشتوں کی شکست" کو بھی پسند کیا جائے گا۔ اس شمارہ کی تینوں کہانیاں اچھی ہیں۔ افسانوں، مقالوں اور مکتوبات کی طوالت نے حصۂ نظم کو متاثر کیا ہے۔ ہر چند نظمیں اور غزلیں تعداد میں کم ہیں لیکن ان کا معیار بلند ہے۔

جگہ کی قلت کی وجہ سے اس شمارہ میں "دو عبرتناک ادبی چوریوں" کا انکشاف ہونے سے رہ گیا۔ آئندہ شمارہ میں یہ ذکر ضرور ہو گا۔ آئندہ شمارہ اور بھی بہت سی دلچسپیوں کا حامل ہو گا۔

ایک جست!!

اس تازہ شمارہ پر "جولائی" کا مہینہ دیکھ کر خریداروں اور ایجنٹوں کو یک گونہ حیرت اور مسرت ہو گی۔ سالنامہ ۶۵ء تو قاعدے کے مطابق "جنوری فروری" دو ماہ کی اشاعتوں پر مشتمل تھا اور اُس کا حجم "شاعر" کے تین عام شماروں کے برابر تھا۔ اُس کے بعد عام شمارہ "مارچ اپریل" کا مشترک شمارہ کر دیا گیا تھا اور اب "مئی جون" کا مشترک شمارہ ہونا چاہیے تھا۔ پھر کہیں جولائی کا "شاعر" اگست میں نکلتا۔ اس طرح تاخیر کا تکلیف دہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ بہت غور و خوض کے بعد براہِ راست "جولائی" کا شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہاں سلسلہ کی کڑی ملانے کے لئے اسے "مئی۔ جون۔ جولائی" تین ماہ کا سمجھا جا سکتا ہے لیکن خریداروں کے حساب میں یہ ایک ہی مہینہ کا محسوب ہو گا۔ ہم کسی طرح خریدارانِ شاعر کا نقصان نہیں چاہتے۔ تمام خریداروں کی مدتِ خریداری میں تین ماہ کا اضافہ کرکے اس کمی کا ازالہ کیا جا رہا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس سال ۶۵ء دسمبر تک جتنے بھی چندے ختم ہوں گے اُن سے آئندہ سال کے لئے سات روپیہ کے بجائے صرف پانچ روپیہ آٹھ آنے سالانہ چندہ لیا جائے گا۔

جو خریدار بطور "شاعر نوازی" ایک روپیہ آٹھ آنے واپس نہ لینا چاہیں وہ ایک خط کے ذریعہ اطلاع دے دیں۔ ہم تمام خریداران "شاعر" کی توجہ اس نوٹ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں اور سب کے جواب کے منتظر رہیں گے۔

بقیہ افسانہ "دو فرشتے" صفحہ ۵۱

دُکھ ہُوا۔ وہ فوراً رحیم جُو کے پاس چلا گیا۔

"مسٹر آر جُو" گنگا رام نے پوچھا۔ "آج پھر تم نے پُرانی ڈگر اپنا لی۔ سفیدی کہاں گئی؟"

رحیم جُو ہنس کر کہنے لگا۔ "مسٹر جی رام۔ میرا نام رحیم جُو ہے۔ آر جُو تو مر گیا۔ اور سفیدی۔"

"آہاہاہا" پھر رحیم جُو نے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ "سفیدی آپ کو مبارک۔ آپ کو۔ آپ نئے ہیں۔ نئے زمانے کے مطابق، میں پُرانا ہوں۔ میری باتیں بھی پُرانی ہیں۔ پُرانی باتیں نئی باتوں سے کیا ٹکرائیں گی۔ سفیدی کو اپنا لیتا تو بھوکوں مر جاتا۔ مسٹر جی رام۔ آپ کو اپنا انداز مبارک۔ اور مجھ کو اپنا طریقہ۔"

اور گنگا رام کو ایسا محسوس ہوا کہ رحیم جُو ایک آئینہ ہے۔ جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔

مُدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری ماہ ۱۹۶۵ء میں ختم ہو گیا ہے چونکہ تین ماہ (اپریل، مئی، جون) کے شمارے شائع نہ ہو سکے، اس لئے ان کی قیمت وضع کر کے سات روپیہ سالانہ چندہ کے بجائے آپکی خدمت میں آئندہ ماہ اگست کی اشاعتِ خاص کا وی۔ پی صرف پانچ روپیہ آٹھ آنے کا بھیجا جائے گا۔ یا آپ یہ تخفیف شدہ رقم (Rs 5/50) ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔

اس تخفیف شدہ چندے ہی میں اب آئندہ پورے سال ۱۹۶۶ء تک ماہ بماہ "شاعر" آپ کے نام بدستور بھیجا جاتا رہے گا۔ یہ اطلاع آپ کی بھرپور توجہ چاہتی ہے۔ — منیجر

ادارہ

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

حیدر آباد کے ادیب

مرتبہ ——— زینت ساجدہ

آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے اُردو میں نہایت مفید اور اہم کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا اور کئی ضخیم کتابیں اُس کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ "حیدر آباد کے ادیب" دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں جلدیں شائع تو کئی سال پہلے ہوئی تھیں لیکن تبصرہ کے لئے اب بھیجی گئی ہیں۔ پہلا حصہ بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا چار سو چھتیس صفحات پر۔ ایک جلد کی قیمت برائے نام چار روپیہ ہے۔

اِن دونوں حصّوں میں حیدر آباد کے معروف نثر نگاروں کی ایک ایک تخلیق منتخب کی گئی ہے۔ پہلے حصّہ میں ۵۳ قلم کار شامل ہیں اور دوسرے میں ۵۷۔ ہر قلم کار کی تخلیق سے پہلے ایک صفحہ پر اُس کے حالاتِ زندگی دئے گئے ہیں۔ پہلی جلد میں سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک کے لکھنے والے شامل ہیں اور دوسری میں سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۶۲ء تک کے۔

اِن دونوں جلدوں کو زینت ساجدہ نے مرتب کیا ہے جو خود حیدر آباد کی معروف ادیبہ ہیں۔ اُنہوں نے ادیبوں کے حالات شگفتہ انداز میں لکھے ہیں اور تخلیقات کے انتخاب میں بھی بلند ذوقی سے کام لیا ہے۔ اِن کتابوں کی ترتیب و تدوین میں دوسرے حضرات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوا کہ بیک وقت ایک سو دس نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی اور اُن کے نثری منتخبات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اِن دونوں جلدوں میں مقالات۔ تراجم۔ افسانوں۔ ناولوں۔ ڈراموں۔ طنز و مزاح۔ آرٹ۔ آثار اور صحافت کے انتخابات ہیں۔

مرتبہ نے قریب قریب تمام قابلِ ذکر لوگوں کو "حیدر آباد کے ادیب" میں لینے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ یقیناً رہ گئے ہوں گے۔ مثلاً شفقت رضوی جنھوں نے اپنے زمانہ میں کافی اچھا لکھا۔ ۱۹۶۲ء تک اکرام جاوید اور آمنہ ابوالحسن کا بھی ادبی مقام متعین ہو چکا تھا۔ بہرحال مرتبہ کا یہ کام لائقِ ستائش ہے۔ اور کتابیں اپنے مطالعہ کے لئے خود اپنی سفارش ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی۔ بکل کنٹہ۔ حیدر آباد (آندھرا پردیش)

نیرنگِ معانی

از ——— تلوک چند محروم

حالی کے بعد اُردو نظم نگاری میں جن شعرا کو امتیاز حاصل ہُوا اُن میں اقبال۔ چکبست۔ سیماب۔ ظفر علیخاں۔ جوش۔ علی اختر اور تلوک چند محروم کے نام سرِفہرست آتے ہیں۔ پچھلے دَور کے یہ بڑے نظم نگار شعرا اپنی بعض دوسری خصوصیات، اسالیب اور اندازِ فکر کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ یا اُونچے نیچے ہو جائیں تو یہ دوسری بات ہے لیکن ان میں جو چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ اِن کا صحیح میلانِ نظم نگاری ہے وہ گرانقدر سرمایۂ نظم ہے جو اِنہوں نے اپنی تخلیق کی صورت میں اُردو زبان کو دیا اور آنے والی نسل میں نظم نگاری کا ذوق پیدا کیا۔

تلوک چند محروم بھی اُن ہی بزرگ نظم نگار شعرا میں ہیں۔ یوں اُنہوں نے غزلیں اور رُباعیاں بھی کہی ہیں۔ اُن کے قطعات بھی مِل جاتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ ایک نظم نگار شاعر ہیں۔ اُنہوں نے بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ اُردو کی قومی شاعری میں وہ ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ بچوّں کے لئے بھی اُنہوں نے کافی نظمیں لکھی ہیں۔ اُن کی نظموں کا اندازہ بیانیہ ہوتا ہے لیکن موضوعات

ہیں ختم اور خیالات میں ترفع ملتا ہے۔ وہ پرانے دبستانِ شاعری سے تعلق رکھنے کے باوجود کہیں کہیں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

نیرنگِ معانی میں تلوک چند محروم کی ۱۰۰ نظمیں ہیں۔ ابتدائی چار نظمیں حمدیہ ہیں۔ اس کے بعد چراغِ راہ کے باب میں ۱۳ نظمیں مذہبی پیشواؤں پر مختلف انداز و اسلوب میں ہیں۔ جہاں انھوں نے ہندو مذہب کے پیرو کی حیثیت سے سری کرشن، بھرت اور رامچندر جی، سوامی رام تیرتھ، مہاتما بدھ، مہاتما گاندھی، جنم اشٹمی اور دسہرہ وغیرہ پر نظمیں کہی ہیں، وہیں اپنے روادارانہ مسلک اور شاعرانہ وسیع النظری کی بنا پر، سیرتِ نبویؐ۔ شہادتِ حسینؓ۔ کربلا۔ حضرتِ علیؓ، حضرتِ مسیحؑ اور گرو نانک پر بھی نظمیں کہی ہیں۔
تیسرا طویل باب "جذباتِ فطرت" کا ہے جس میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ اس میں مناظرِ فطرت کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس باب کی کئی نظمیں بڑی سادہ اور پُرتاثیر ہیں۔ یہ باب ابتدائی ابواب سے زیادہ وزنی ہے۔

اُردو والوں کو ایک بزرگ نظم نگار شاعر کے اس مجموعۂ نظم کی قدر کرنا چاہیے۔ کتاب دو سو صفحات کی ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

افکار کا "فیض نمبر"

مُرتبۂ ــــــ صہبا لکھنوی، کشش صدیقی

پاکستان کے ادبی رسائل میں ماہنامہ "افکار" کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گذشتہ تین چار سال میں "افکار" نے شخصیتوں پر بڑے وقیع نمبر پیش کئے ہیں۔ جوش نمبر اور حفیظ نمبر کے بعد اب اس نے اپنا نہایت شاندار اور پچھلے شخصیت نمبروں سے زیادہ ضخیم "فیض نمبر" شائع کیا ہے۔ جو فیض احمد فیض کی شاعرانہ شخصیت ہی کی طرح بھاری بھرکم ہے۔ بڑے آٹھ سو صفحات کا یہ نمبر اپنے اندازِ پیشکش کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ اس میں مرتبین نے بڑی جگرکاوی سے کام لیا ہے۔ ہر باب کو سلیقے سے سجایا اور بنایا ہے چھوٹی سے چھوٹی بات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور خود فیض کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے [illegible]

شخصیتوں پر جتنے نمبر بھی نکلے ہیں اُن میں عام طور پر یہ خامی ہے کہ بڑے ادیبوں اور مسلم الثبوت نقادوں نے کھل کر بات کرنے یا جم کر تنقید کرنے سے گریز کیا ہے۔ "فیض نمبر" میں بھی یہ بات نمایاں ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے، لیکن بدقسمتی سے ہوتا ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زندہ شخصیتوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ فیض کی شخصیت تو بن چکی ہے، وہ اپنے اسلوب اور فکر کی انفرادیت منوا چکے ہیں، پھر ڈر اور خوف کیسا؟ جوش ملیح آبادی اور رشید احمد صدیقی اپنے چند سطری نوٹ میں فیض کے "فن اور زبان" کے سلسلے میں صرف ایک اشارہ کر دیا ہے۔ کیا اس موضوع پر کھل کر مثالوں کے ساتھ تنقیدی انداز میں مضامین نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ تاکہ فیض کو بھی اپنی زبان و فن کی کمزوریوں سے آگاہی ہوتی۔ اسی طرح اُن کے دھیمے لہجے، اُن کی دلسوزی یا رومانی صداقتوں پر بھی متعدد بھرپور مضامین ہونے چاہئے تھے۔ صرف اُردو ہی کے انشا پردازوں سے فیض پر لکھوایا گیا ہے۔ اگر بیرونی دنیا کے کچھ مختلف زبانوں کے ادیب بھی اُن کی شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کرتے تو اچھا تھا۔ پھر بھی فیض پر لکھنے والوں نے جتنا اچھا اظہارِ خیال کیا ہے، اب تک دوسرے شخصیت نمبروں میں ظاہر ہوا تھا۔ "فیض نمبر" میں خود فیض کا جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سرمایۂ نظم و نثر انتخابی شکل میں دیا گیا ہے وہ کافی اچھا ہے۔ اس کے بعض حصے خود فیض کے اپنے رسم الخط میں شائع کئے گئے ہیں، اسی طرح بعض اکابر ادبا اور شعراء کے خطوط اور اُن کی رایوں کو بھی اُن ہی کے اندازِ تحریر میں نقل کیا گیا ہے۔ فیض کی سوانح حیات بڑی خوبصورتی سے مرتب کی گئی ہے۔

پورے نمبر کو جانِ مضمون (نادر و یادگار تحریریں، غیر مطبوعہ کلام) غیر مطبوعہ عکسی خطوط، موضوعِ سخن۔ محبوب نظر۔ ذکرِ یار۔ بارشِ سنگ۔ تذکرہ و تبصرہ۔ فیض اور نئی نسل۔ لوح و قلم۔ حرفِ سادہ۔ روشنیوں کا شہر کے ابوابی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ فیض خبریں، عکسِ دیانت کے تحت ۲۸ صفحات پر فوٹوگرافس کے ذریعہ جو تصاویر شائع کی گئی ہیں وہ بھی خوب ہیں۔

"فیض نامہ" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اُن کتب و رسائل و اخبارات کی وہ فہرست ہے جن میں فیض پر اب تک مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مع مصنف، کتاب رسالہ اور اخبار کے نام، عنوان، مہینہ اور سنہ۔ اس "کتابیات" سے فیض پر آئندہ لکھنے پڑھنے والوں کو بڑی آسانی ہوگی۔

غرض "فیض نمبر" ایک مکمل شخصیت نمبر ہے جس کی تعریف نہ کرنا کھلی ہوئی بدمذاقی ہوگا۔ کتابت و طباعت بھی کافی اچھی ہے۔ اتنا ضخیم نمبر نکالنا آسان کام نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ پاکستانی رسائل کو اس طرح کے وسائل مل جاتے ہیں۔

"فیض نمبر" کی قیمت بارہ روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:-
ماہنامہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی (پاکستان)

آجکل کی کہانیاں

ماہنامہ "آجکل" اُردو کا نہایت اچھا اور معیاری ماہنامہ ہے جو مرکزی حکومت کی طرف سے نکلتا ہے اور جس میں سبھی صفِ اوّل کے قلم کار لکھتے ہیں۔ یہ کتاب "آجکل کی کہانیاں" اُن ہی کہانیوں پر مشتمل ہے جو "آجکل" میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب کی سب نمائندہ اور منتخب کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیاں جو پڑھنے والوں سے پسندیدگی کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ یہ منتخب کہانیاں کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ علی عباس حسینی۔ حیات اللہ انصاری۔ خواجہ احمد عباس۔ سہیل عظیم آبادی۔ اوپندر ناتھ اشک۔ کوثر چاند پوری۔ کنھیا لال کپور۔ بلونت سنگھ۔ رام لعل۔ جوگیندر پال جیسے ۲۱ بڑے افسانہ نگاروں کی ہیں۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حجم ۲۶۴ صفحات۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:- ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔

اگست ۱۹۶۵ء کی
اشاعتِ خاص ضرور دیکھئے

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

شعر

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

اردو کا چھتیس ۳۶ سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپیہ	۱۶ شلنگ	ایک روپیہ

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۳۹۲۵ بمبئی نمبر ۱ بی سی

جاری کردہ

ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن گورنمنٹ آف گجرات۔ سچیوالیہ - احمد آباد ۱۵ (گجرات)
اسسٹینٹ ڈائرکٹر آف انفارمیشن۔ گورنمنٹ آف گجرات - دھن راج محل - اپالو بندر بمبئی ۱
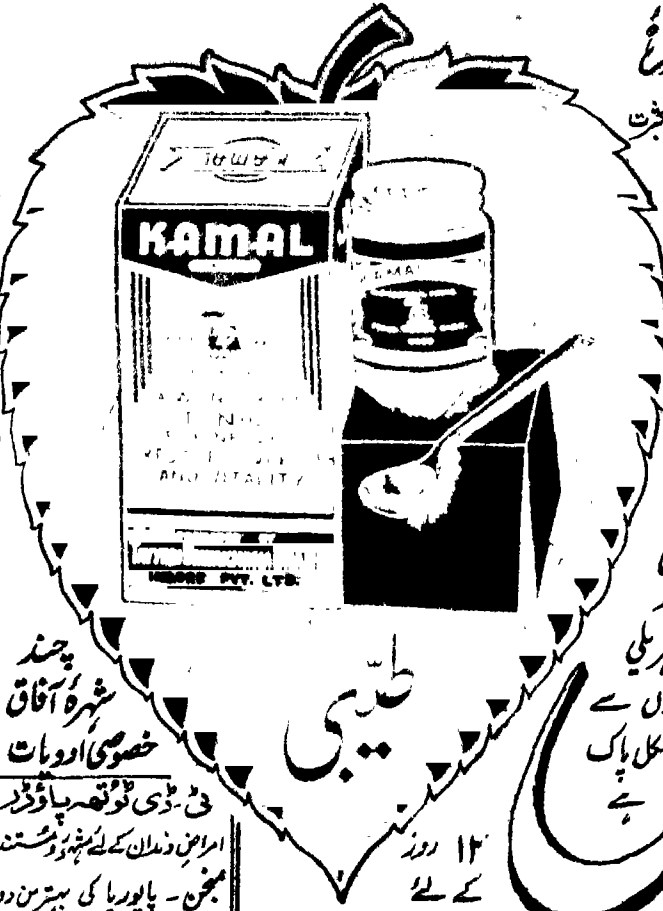
طیبی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹیڈ
کی نمائندہ ایجاد
جسم کے تمام غددوں کو تقویت دے کر بکثرت
خونِ صالح پیدا کرتا ہے۔ بدرجۂ اعلیٰ
مقوّیِ اعصاب ہے
دل و دماغ
اور خصوصاً قوائے جسمانی کو طاقت
دیتا ہے
KAMAL
طیبی
کمال
منشی
اور
زہریلی
دواؤں سے
بالکل پاک
ہے
مکمل کورس ۲۴ روز
کے لیے
۲۲ روپیے
۱۲ روز
کے لیے
۱۱ روپیے
چند
شہرۂ آفاق
خصوصی ادویات
ٹی۔ڈی ٹوتھ پاؤڈر
امراضِ دندان کے لیے مشہور و مستند
منجن۔ پایوریا کی بہترین دوا
اور عام روزانہ استعمال کیلئے بہترین منجن
بڑی شیشی ۱/۵۰
چھوٹی شیشی صرف -/۵۰
عرقِ ماء اللحم
کھوئی ہوئی قوت کی بحالی کے لیے
نفیس مرکب
موسم سرما کی جان
پوری بوتل قسم اعلیٰ ۱۳/۷۵
آدھی بوتل ۷/۱۴
ملنے کا پتہ
طیبی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹیڈ
۵۱۔ بوہرہ بازار اندور سٹی (ایم۔ پی)
فون:۔ ۶۳۳۴
برانچ
چوک بازار اجین
طیبی دواخانہ یونانی
لبوب کبیر
طبِ یونانی کا مشہور مرکب بہترین صحیح
اجزاء سے تیار کیا گیا
قسم اعلیٰ (دس گرام) ۵۰ پیسے
بڑھاپی پلز
فالج، لقوہ، کھانسی اور بچوں کے
امراض کے لیے اکسیری گولیاں
شیشی کلاں ۳/۲۵
" خورد ۱/۶۲
شاہی
کمزور مردوں
عورتوں اور بچوں کے لیے بہترین ٹانک
مکمل کورس -/۹ روپیے
۱۲ روز کے لیے ۲/۲۵

آئیے ہم للکار کا مقابلہ کریں

غذائی صورتِ حال آج ہمارے لئے ایک للکار ہے
آئیے، ہم اِس کا ہر طرح سے برابر کا مقابلہ کریں، ایک دوسرے کی مدد کرکے اور اپنے بوجھ آپس میں بانٹ کر۔
غلّہ ضائع نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ جمع نہ ہو، اور ہماری تمام کوششیں سب کے لئے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے میں صرف ہوں۔

یومِ آزادی

۱۹۶۵ء

ڈائرکٹر آف پبلسٹی۔ گورنمنٹ مہاراشٹر۔ بمبئی

ترتیب

○

اشاعتِ خاص

۱۹۶۵ء

جلد ۳۶ ——— شمارہ ۸

جرعات :-

نیا وعدہ

حال ہی میں مرکزی انجمن ترقی اُردو کا ایک وفد جس میں صدرِ انجمن پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کے علاوہ انجمن کے کئی دوسرے معتمد اراکین بھی شامل تھے، وزیر اعظم لال بہادر شاستری سے ملا اور اُن کے سامنے اُردو کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے یو۔پی۔ بہار۔ دہلی اور پنجاب میں اُردو کو علاقائی درجہ دیے جانے کا پھر ایک بار مطالبہ کیا اور وزیر اعظم نے نہایت ہمدردی کے ساتھ اِس مطالبہ پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔

وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر آنے کے بعد سے اب تک جناب لال بہادر شاستری اُردو زبان کے سلسلے میں ہمیشہ اچھے خیالات کا اظہار فرماتے رہے ہیں اور اُن سے کئی گنا زیادہ ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ اُن کے پیش رو وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے وعدے کرتے رہے تھے اور آزادی کے بعد سے اپنی وفات تک اُنھوں نے اِس زبان کے لئے جس درجہ حقیقت پسندانہ بیانات دیئے اگر وہ تمام بیانات ایک جگہ جمع کر لئے جائیں تو ایک نہایت معتبر دستاویز کا کام دیں اور ہندوستان کے لسانی انتشار کی تاریخ کا اہم باب ہوں۔ پنڈت نہرو بے روک ٹوک بات کہنے والوں میں سے تھے، اُن کا سا محبوب انسان بھی اِس ملک میں نہیں ہوا۔ وہ بے شمار ملکی معاملات میں ایک خود مختار کی حیثیت رکھتے تھے لیکن یہ المیہ بھی اپنی جگہ قابلِ غور ہے کہ پنڈت جی کی ذہنی ہمدردیوں کے باوجود اُردو زبان کے عملِ عام میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ اور یو۔پی میں تو کم از کم اُس کی تعلیم اور اُس کا چلن ختم ہی ہو کر رہا۔ کتنی کانفرنسیں ہوئیں کتنے کنونشن بلائے گئے۔ کیسے احتجاج ہوئے! ۔ اُردو زبان کو اُس کا جائز حق نہ یوں ملا، نہ صدر مملکت آنجہانی راجندر پرشاد (جو خود اُردو فارسی کے ماہر تھے) دلا سکے، نہ پنڈت جواہر لال نہرو۔ آج کا سیاسی، معاشی اور اقتصادی بحران، نوابی دور اور ریاستوں کے زمانہ سے کہیں زیادہ آگے نکل چکا ہے۔ تعصب اور فرقہ پرستی کے بھوت جو اُن کی شخصیتوں کے خوف سے زیادہ سر نہ اُٹھا سکتے تھے اب کھلے بندوں ننگا ناچ رہے ہیں۔ خود کانگریس پارٹی میں شدید اختلافات ہیں۔ ہمارے نہایت قابلِ تعظیم صدر مملکت ڈاکٹر رادھا کرشنن کو تو اُردو زبان کے مسئلے سے وہ دلچسپی بھی نہیں جو راجندر بابو کو تھی اور نائب صدر حکومت عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، جو اُردو کی خود بہت بڑی شخصیت ہیں اور ملک کی تعلیمی اصلاحات میں جن کے زبردست احسانات ہیں، وہ بھی بے بس ہیں کہ اُردو کی حق یابی کے سلسلے میں اُردو والوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اُردو والوں کو مسز اندرا گاندھی سے بھی بڑی اُمیدیں تھیں لیکن اُن کے دور میں یہ بھی نہ ہوا کہ ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں میں اُردو زبان کے لئے کچھ وقت بڑھا دیا جاتا (ایک اطلاع کے مطابق پٹنہ ریڈیو کو اُردو کے سلسلے میں کچھ مراعات دی گئی ہیں) یا کم از کم آل انڈیا ریڈیو سے خبریں ہی سیدھی سادی زبان میں نشر ہونے لگتیں۔ مگر یہ بھی نہ ہوا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت کی بنیادی پالیسی ابھی تک اُردو کے خلاف ہے اور جب تک اِس میں کوئی ترمیم نہیں کی جاتی ہے، سترہ سال تو کیا ستّر برس ہم اسی طرح چیخے چلاتے رہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہمارے یہاں جمہوری نظام ہے اور ایک جمہوری ملک کے وزیر اعظم کو ہر فرقے اور ہر زبان کے مطالبات کو اِسی طرح ہمدردی کے ساتھ سُننا بھی چاہیئے۔ اگر وہ بعض معاملات میں سچے دل سے تعاون کرنا بھی چاہیں تو بعض مجبوریاں اُنھیں روکے رہیں گی۔ سو سے زیادہ ممبرانِ پارلیمنٹ اپنے دستخطوں سے میمورنڈم پیش کریں اور اُس میں پنڈت نہرو کی عزیز ترین بہن وجے لکشمی پنڈت کے بھی دستخط ہوں اور پھر بھی کوئی نتیجہ نہ نکلے تو اِس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟!

اِس وقت کسی تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے اور نہ اُردو کے سلسلے میں اب تک کئے گئے وعدوں کو دہرانا ہے۔ بس اتنی ہی تمنا اور دعا ہے کہ ہمارے وزیر اعظم نے انجمن کے وفد سے جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو۔ صدرِ حکومت اور وزیر اعظم کے نام گزشتہ چند ماہ میں بے شمار خطوط اور تار بھی پہنچ چکے ہیں کئی ذیلی وفود بھی مل چکے ہیں۔ اگر اب بھی یہ سب کچھ بے نتیجہ ثابت ہوا تو اُردو والوں کو یقین کر ہی لینا چاہئے کہ اُن کی زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے اور وہ ہمیشہ اسی طرح وعدوں میں بہلائے جاتے رہیں گے۔

۱۲ اگست ۱۹۶۵ء

اعجاز صدیقی

(مقالہ)

رشید منظر

شعرائے اردو کا جذبۂ وطن دوستی

اُردو کا چمن ہر دور میں شاداب رہا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ زمانہ کی مخالف اور جھلسا دینے والی ہواؤں کے باوجود اُس کی روشوں میں جہاں گلاب کی خوشبو مشامِ جان کو فرحت بخشتی ہے وہاں نسرین و نسترن کی تر و تازگی بھی دل کو لبھائے لیتی ہے۔ چمن کا مقابلہ چمن سے کرنا تو ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہاں! باغبانوں کا ذوقِ چمن بندی قابلِ تعریف یا تحقیر ضرور ہوا کرتا ہے۔ جس طرح دُنیا کی انتہائی ترقی یافتہ انگریزی زبان کے شاعروں کا دل جذبۂ حُبِّ الوطنی سے سرشار نظر آتا ہے، اُسی طرح شعرائے اردو بھی مئے حُبِّ وطن پی کر سرمست نظر آتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ شعرائے فرنگ وطنیت کے محدود نظریہ کے قائل تھے برخلاف اس کے اردو شاعری کا دامن اِس تنگ نظری سے پاک ہے کیوں کہ یہ وطنیت کے آفاقی تصوّر کی حامل رہی ہے۔

علامۂ اقبالؔ نے وطن کو ایک سیاسی تصوّر کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "وہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی" کیونکہ "اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے" جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقوام میں مخلوقِ خدا بٹ جاتی ہے اور انجام جنگ و جدل کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اپنے وطن پر جان نثاری کا جذبہ، اپنے ہم وطنوں سے محبّت کی خواہش فطرتِ انسانی کا جُزوِ لاینفک ہے اور اس کا نہ ہونا دلیلِ گمرہی ہے۔ یہ مقامِ مسرّت ہے کہ شعرائے اُردو نے اہنسا کے اصولوں کو اپنا کر جس کا عرصہ سے پرچار ہوتا رہا ہے، حسینۂ وطن کو نکھارنے اور سجانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا ہے اور جس میں ذرا بھی تنگ نظری کے عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا۔

اُردو شاعری میں شروع ہی سے وطن دوستی کا جذبہ کارفرما رہا ہے لیکن شروع میں نظموں کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا واضح تصوّر نہیں ملتا۔ جا بجا غزلوں کے اشعار میں اس جذبے کی جھلک ضرور مل جاتی ہے۔ لیکن غدر کے بعد جب ہندوستانیوں کو تلخ تجربات و حادثات سے دوچار ہونا پڑا تو ذہنوں کے سانچے بھی بکھر رہے اور نیا فکر و آہنگ پیدا ہوا۔

قومیات قبل میں وطنی اور قومی یکجہتی کی شاعری کا احیا حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ سے ہوتا ہے۔ اسی وقت نظموں کی شکل میں خیالات کو تسلسل کے ساتھ رقم کرنے کا رواج بھی پیدا ہوا۔ آج جس زور و شور سے قومی یکجہتی کی اہمیت محسوس کی جا رہی ہے اس کا بہت پہلے وجود مولانا حالیؔ کی شاعری میں ملتا ہے۔ انھوں نے اِس کی اہمیت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے جس کی مثال ہندوستان کی دوسری کوئی زبان نہیں پیش کر سکتی۔ اپنی مثنوی "حُبِّ وطن" میں جہاں وہ افرادِ قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو عیسائی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پُتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

یہ اشعار ان کے پُرخلوص جذبات اور محبتِ قوم و وطن کے آئینہ دار ہیں۔ انہی احساسات و جذبات کا عکس جوش ملیح آبادی، مولانا ظفر علی خاں، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، چکبست، سیماب اکبرآبادی، اکبر الہ آبادی اور اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ ان میں ہر شخص فدائے محبتِ وطن نظر آتا ہے۔ کہیں سرمدِ حبِ وطن کا ترانہ گا کر نازکشانِ محفل کو دعوت دیتے ہیں ؎

پھر جوشِ حبِ قومی اٹھا اُمنگ ہو کر — آئی وطن کی الفت دل میں ترنگ ہو کر
مل مل کے ہم ترانے محبتِ وطن کے گائیں — بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

تو کہیں شاد جیسا شاعرِ دل گداز وطن کے ذرّے ذرّے کو جنتِ نظر بنا تا ہے۔ آئیے اس باغِ ارم کی بہار دیکھیں ؎

عظمت میں کنشت سے فزوں تر — خوبی میں بہشت سے فزوں تر
ہر گوشۂ زمیں کا رشکِ گلشن — جس نخل کو دیکھئے وہ چندن
بازارِ عدن وہاں کے رستے — پانی کے عوض گہر برستے
جس پھول کو سونگھئے وہ خوشبو — جس نخل کو دیکھئے وہ دلجو

ابھی اس جنتِ ارضی کی سیر مکمل بھی نہیں ہوئی کہ کہیں دور سے بربطِ نوائے چکبست کے نغمے مضراب بن کر سازِ دل کو چھیڑنے لگے ؎

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا — تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

وہیں کسی گوشے سے یکجہتی کے اس پیغام کی بازگشت سنائی دینے لگی جسے پہلے اسی شاعرِ دل نواز نے دیا تھا ؎

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

اسی سے ملتی جلتی ایک اور آواز کانوں میں رس گھولتی ہے جس کا خالق اقبال ہے ؎

"خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے"

اور ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غرض جس کی طرف نگاہ اٹھایئے وہ سرشارِ مئے محبتِ وطن نظر آتا ہے اور جاں نثاری کے لئے ہمہ تن تیار۔ اس راہ میں نہ کسی سود و زیاں کا خوف ہے، نہ شہرت اور دنیا داری کی ہوس۔ ہر شاعر ایک پیکرِ خلوص و محبت نظر آ رہا ہے۔ جس طرح فارسی میں فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایرانی تہذیب کو زندہ کیا اور قوم و وطن کی بے انتہا خدمت کی اسی طرح یہاں بھی سرور کابری مینائی نے شاہنامۂ ہند لکھ کر ایک گراں بہا خدمت انجام دی۔ اب جب یہ حال ہمارے بزرگوں کا ہو تو یقین ہے کہ بعد کی نسل بھی انہیں تصوّرات و خیالات کی حامل ہوگی کیونکہ مثل مشہور ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے شمع خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔

علی سردار جعفری کا "استعفا" بھی قابلِ مبارک باد ہے ؎

وہ نام لب پہ کھلا تھا جو پھول بن کے کبھی
مہک اُٹھا تھا جو سینے میں آرزو بن کے
ٹپک رہا ہے خلوصِ وفا کے زخموں سے
شکست خوردہ تمناؤں کا لہو بن کے
رفیق سامنے آئے ہیں اب عدو بن کے

مگر خوش نصیب کہ حوصلے اب بھی جوان ہیں ؎

رہیں قفس کے اندھیرے میں یا نشیمن میں
ہر ایک حال میں ہم دل کے گیت گائیں گے
وطن کی خاک تو زنداں میں بھی ہے گھر میں بھی
وطن کی خاک کو سجدوں سے ہم سجائیں گے
وطن کی خاک کو ہم آسماں بنائیں گے

اور سرکار کے یہ حوصلے جوان کیوں نہ ہوں جبکہ ساغر نظامی کا یہ "عہد" ؎

جب مجھے صحراؤں میں پیڑوں سے باندھا جائے گا
جب مجھے میداں میں توپوں سے اُڑایا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
گرم لوہے سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
اے وطن اُس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا
اے وطن اُس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

اور روش صدیقی کا یہ "عزمِ محکم" بھی ساتھ ساتھ ہے ؎

امن کے ہم ہیں نگہدار تو خوددار بھی ہیں
رزم اور بزم کے ہم محرمِ اسرار بھی ہیں
خانۂ گل ریز بھی ہیں تیغِ شرربار بھی ہیں
اپنی سرحد سے ہم اے چین ہٹا دیں گے تجھے
عزم و ہمت کے یہ طوفان بہا دیں گے تجھے

ممکن ہے اس عزمِ محکم میں کچھ کمی رہ گئی ہو کیونکہ فہیم کرانی اپنی جنت کے دروازے پر ابھی تک دستک محسوس کر رہے ہیں ؎

یہ جنت امن و آسائش کی جنت ہے مگر سن لو
ہر اک گل ہے یہاں وقت ضرورت اک تیز شعلہ لو
یہ جنت دوستوں کے حق میں پیمانہ ہے شبنم ہے
عدو کے واسطے لیکن یہی جنت جہنم ہے
یہاں کے بادہ کش صہبائے الفت پی کے جیتے ہیں
مگر جب وقت پڑتا ہے تو خونِ دشمن کا پیتے ہیں
نہیں رکتا وطن جب ہاتھ میں تلوار لیتا ہے
مری جنت کے دروازے پہ دستک کون دیتا ہے

اور ساحر "ہوشیار ہو جاؤ" کا نعرہ لگا رہے ہیں ؎

وطن کی آبرو خطرے میں ہے، ہشیار ہو جاؤ
ہمارے امتحاں کا وقت ہے، تیار ہو جاؤ
وہ جن کو سادگی میں ہم نے آنکھوں پر بٹھایا تھا
وہ جن کو بھائی کہہ کر ہم نے سینے سے لگایا تھا
وہ جن کی گردنوں میں ہار بانہوں کا پہنایا تھا
اب اُن کی گردنوں کے واسطے تلوار ہو جاؤ

نہ ہم اس وقت ہندو ہیں، نہ مسلم ہیں، نہ عیسائی
اگر کچھ ہیں تو ہیں اِس دیس، اِس دھرتی کے شیدائی
اسی کو زندگی دیں گے، اسی سے زندگی پائی

لہو کے رنگ میں لکھا ہوا اقرار ہو جاؤ

یہ لیجئے جاں نثار اختر بھی تیار ہو چکے ہیں اور آواز دے رہے ہیں کہ ہم ایک ہیں ؎

یہ ہے ہمارا کی زمیں، تاج و اجنتا کی زمیں ۔۔۔ سنگم ہماری آن ہے، چتوڑ اپنی شان ہے
گلمرگ کا مہکا چمن، جمنا کا تٹ، گوکل کا بن ۔۔۔ گنگا کے دھارے اپنے ہیں یہ سب ہمارے اپنے ہیں
کہہ دو کوئی دشمن نظر اٹھے نہ بھولے سے ادھر ۔۔۔ کہہ دو کہ ہم بیدار ہیں، کہہ دو کہ ہم تیار ہیں
آواز دو ہم ایک ہیں

کسی گوشے سے اعجاز صدیقی بھی نقدِ جاں لیکر وطن کی نذر کو بڑھ رہے ہیں ؎

جنھیں ہوتا ہے جہنم کو بجھانا مقصود ۔۔۔ وہ شراروں کی طرف ہاتھ بڑھا دیتے ہیں
شمع کی لَو پہ فدا ہوتے ہیں جب پروانے ۔۔۔ اپنی لاشوں کا اک انبار لگا دیتے ہیں
جن کو ہوتا ہے گلستاں کی فضاؤں سے لگاؤ ۔۔۔ برق کی زد پہ نشیمن وہ بنا دیتے ہیں
نقدِ جاں لے کے بڑھو نذرِ وطن کی خاطر ۔۔۔ یہ نہ سوچو، صلۂ جاں ہمیں کیا دیتے ہیں
جب کسی قوم کے ناموس پہ حرف آتا ہے ۔۔۔ دل ہی کیا، دولتِ کونین لٹا دیتے ہیں
اسے سمجھو کہ نہ سمجھو، یہ ہے تم پر موقوف ۔۔۔ ہم تو بس ایک فقیرانہ صدا دیتے ہیں

آگے آگے علی جواد زیدی بھی ہمنوائی کا دم بھر رہے ہیں ؎

لب کشائی کی ضرورت نہیں اے جانِ وطن ۔۔۔ پڑھ لیا ہم نے تری آنکھوں کا خاموش سوال
پاک آنچل پہ ترے ہاتھ بڑھائے گر دشمن ۔۔۔ اور تماشائی رہیں تیرے پجاری ترے لال
جیتے جی یہ تو کبھی ہونے نہیں پائے گا
ملک جاگا ہے تو اب سونے نہیں پائے گا

دیکھئے کسی صف میں نریش کمار شاد بھی وطن کی محبت کا راگ الاپ رہے ہیں ؎

بے شک اخلاص میں عظمت ہے ہمالہ کی سی ۔۔۔ اور فطرت میں ہے پاکیزگیٔ گنگ و جمن
لیکن اب تجھ کو یہ احساس بھی ہو جائے گا ۔۔۔ شاخِ گل ہی نہیں تلوار بھی ہے میرا وطن

یہ نوجوان شاعر شبیر کاظم کاظمی بھی کچھ پریشان سا ہے۔ ایک طرف وطن کی الفت اُسے کھینچ رہی ہے اور دوسری طرف محبوبہ کا پیار اُسے اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اُس کی باہوں میں آرام کرے جس نے شکایت کی ہے کہ اب اس کے محبوب کی محبت میں وہ پہلی جیسی حرارت نہیں ہے۔ لیکن شاعر اپنے فرض کو پہچان گیا ہے اور اپنی نظم "فرض کی پکار" میں کہتا ہے ؎

ایسے بدلے ہوئے حالات میں اے جانِ نشاط ۔۔۔ کیسے کھیلوں میں ترے گیسوئے خمدار کے ساتھ
میں بھی ٹیپو کی طرح ہند کا اک بیٹا ہوں ۔۔۔ اس کا بھی پیار ہے کچھ دل میں ترے پیار کے ساتھ

اپنی اس ماں کے تقدس کی حفاظت کے لئے ۔۔۔ آج ہر ہندو و مسلم کو جگانا ہے مجھے
اِن کی ادوار سے عظمت کے پرستاروں کو ۔۔۔ اُن کے جھکتے ہوئے قدموں پہ جھکانا ہے مجھے

انتہا یہ ہے کہ عیسائیانِ وطن بھی اپنے سپاہیوں کو عزم و استقلال کا پیغام سنانے میں پیش پیش ہیں۔ یہاں کہنے کو تو یہ ایک شعری تکنیک ہے لیکن موقع آ جائے تو جذبہ بیدار بھی بن سکتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے نیلو فر ناہید کس طرح نوجوانوں سے خطاب کرتی ہیں ؎

قسم ہے تجھے اپنے تاجِ حسیں کی — تقدس میں ڈوبی ہوئی سرزمیں کی
قسم ہے ایلورا کے غاروں کی تم کو — ہمالہ کے پاک آبشاروں کی تم کو

مرے نوجوانو، مرے سرفروشو
وطن کے لئے جان کی بازی لگا دو

اردو ہندوستان کی کہنہ مشق شاعرہ سیدہ اختر کا اظہارِ عقیدت بھی قابلِ احترام ہے ؎

اختر ہمارا حسنِ تعارف یہی ہے بس — ہندوستاں ہمارا ہے، ہندوستاں سے ہم

غرض اس موقع سے متاثر ہو کر کہی جانے والی نظموں کا اردو میں ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جن میں سے پنڈت آنند نرائن ملا کی "مادرِ ہندوستان"، بسمل سعیدی ٹونکی کی "جنگ و امن"، زائر عظیم آبادی مرحوم کی "حملہ آور چین کی آخر میں ہو جائے گی ہار"، مخمور سعیدی کی "ہمالہ سے خطاب"، اختر اورینوی کی "ہندوستان"، انور صابری کی "مکاں میں چین میسر نہیں مکینوں کو"، جوش ملسیانی کی "اہلِ چین سے"، امجد نجمی کی "عزم"، رضا نقوی واہی کی "چاؤ ماؤ اسکیم"، سپاہی معصوم رضا کی "قیمتِ عہدِ وفا"، نازش پرتاب گڈھی کی "پیغامِ اگست"، "دوستو، ساتھیو" اور "ہندوستان جاگ اٹھا"، شبنم کاظمی کی "وقت کی تلوار"، وفا ملک پوری کی "معذرت" اور "تحفہ"، مظہر امام کی "برف پگھلی ہے"، سید حرمت الاکرام کی "تم کو انسان کی عظمت کی قسم ہے اٹھو"، ڈاکٹر ظفر حمیدی کی "شاعر کی للکار" اور "ہمالہ کی للکار"، نذیر بنارسی کی "توانائی"، ہوش عظیم آبادی کی "اہنسا اور تلوار"، مسعود اختر جمال کی "چین کی مراجعت"، اکرام شبنم کی "تقاضہ"، شباب للت کی "سپاہی کی رخصتی"، رمز عظیم آبادی کی "برف کا شعلہ"، انیس امام کی "وادیاں جاگ اٹھیں"، ظہیر ناشاد دربھنگوی کی "سرحد"، شہاب شمسی کی "انقلابِ نو"، طرفہ قریشی کی "جنتِ ہندوستان"، قمر اعظم ہاشمی کی "ننگِ آدم ــ چین"، ظہیر صدیقی کی "جنگ و امن"، محمد نیاز کی "خنجرِ جبریل" قابلِ ذکر نظمیں ہیں جو متذکرہ شعرائے کرام کے وطنی اور قومی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں اور افادیت کے لحاظ سے گراں بہا تخلیقات ہیں۔

راقم السطور نے بھی اس موقع سے متاثر ہو کر "ماں کا پیغام بیٹے کے نام" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جو میرے وطنی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ ماں نے اپنے بیٹے کو وطن دوستی کا جو پیغام دیا ہے اُس کو شعر کی زبان میں اس طرح سے ادا کیا گیا ہے ؎

میری ماں! تو نے یہ کس پیار سے لکھا ہے مجھے — "فرض ہے تجھ پہ بھی اُس ماں کی محبت بیٹا
جس کی آغوش میں ہم دونوں پلے ہیں اب تک — آج کرنا ہے تجھے اُس کی رفاقت بیٹا"

پھر وہ اپنے اُس دودھ کا واسطہ دے کر جو بیٹے کے جوان جسم میں خون بن کر رواں ہے کہتی ہے کہ تجھے بھی عزم و ثبات میں کچھ کارِ نمایاں کر کے نازشِ مفخرِ وطن بننا ہے اور راہِ وفا پر چل کر اپنے اسلاف کی شانِ عزم و شجاعت کو زندہ کرنا ہے ؎

میری جاں! تجھ کو بھی اس راہِ وفا پر چل کے — داستاں عزم کی اک اور سنانی ہوگی
بخش دوں گی تجھے دودھ اپنا مگر شرط یہ ہے — پہلے کچھ دودھ کی قیمت بھی چکانی ہوگی

سیماب اکبرآبادی مرحوم

غزل

زہرابِ غم کو جذبِ رگِ جاں کئے ہوئے
خود زندگی ہے موت کا ساماں کئے ہوئے

آجا، نئی حیات کے ساماں کئے ہوئے
ہر عشوے کو بہشت و بہاراں کئے ہوئے

جو آج کل ہے رحم کو ارزاں کئے ہوئے
انساں کا خون ہے یہی انساں کئے ہوئے

یہ پیشگی اثر ہے وُرودِ بہار کا
وحشی کھڑے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

خوابِ شباب، آہِ سحر، رنگِ شامِ غم
یہ سب ہیں ایک اُن کے پریشاں کئے ہوئے

صحرا ہیں جگنوؤں سے، ستاروں سے چرخ پر
فطرت ہے دُور دُور چراغاں کئے ہوئے

محشر تک آگیا ہے مرا عالمِ جنوں
شیرازۂ دو کون پریشاں کئے ہوئے

اے سائل! اُن کے در پہ نہ مانگ، اُن سے چل کے مانگ
بڑھ جا، درازِ گوشۂ داماں کئے ہوئے

پھر ہو، کہیں طلوع کہ صدیاں گذر گئیں
ہستی کی وادیوں کو درخشاں کئے ہوئے

آمادۂ خرابیٔ عالم ہے ارتقا
قطرے کو بحر، بحر کو طوفاں کئے ہوئے

رکھنا تبرکات میں، زنجیر کو مری
یہ بھی ہے سجدۂ درِ زنداں کئے ہوئے

پھر التفات کر کہ زمانہ گذر گیا
تجدیدِ عہد و زحمتِ پیماں کئے ہوئے

ہاں کفر بار ہو نگہِ مست سے، مگر
اندازۂ نزاکتِ ایماں کئے ہوئے

فطرت کے تیوروں میں ہیں پھر کچھ نئے شکن
ایک اور انقلاب کا ساماں کئے ہوئے

سیماب ایک سادہ ورق ہی حیات تھا
مدت گذر گئی کوئی ارماں کئے ہوئے

(کراچی)

افسانہ

جوگندر پال

داڑھی

میری نئی فلم کی شوٹنگ آج سے شروع تھی، جس میں اپنی دوسری ان گنت فلموں کی طرح مجھے ہیرو کا رول ادا کرنا تھا۔
"آپ آج شیو نہ کرکے آتے تو اچھا رہتا۔" میک اپ مین کے رازدارانہ لہجہ سے میں چڑ سا گیا۔
لیکن سوچا میں نے بھی یہی تھا کہ آج شیو نہیں کروں گا۔ بات یہ تھی کہ فلم کے مسودے میں نوجوان ہیرو نے ابتدا ہی میں عشق میں گرفتار ہو کر اپنا حلیہ بگاڑ رکھا تھا، اور ظاہر ہے کہ چہرے کی فطری کیفیت سے جو بات بنتی ہے وہ بات میک اپ میں کہاں؟ مگر میری داڑھی کے تین چوتھائی بال سفید ہو چکے تھے اور صبح میں بستر سے اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو لاشعوری طور پر حسب عادت سب سے پہلے چہرے میں کھبے ہوئے ان سفید سفید کانٹوں ہی کو صاف کرنے کی سوجھی۔
"لمویت کا بھوت سر پر سوار ہو۔" ہمارا میک اپ مین بڑا کھرا اور تیکھا تھا۔ "تو آشک کی بڑھی بڑھی سفید داڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بس یوں جیسے نوجوان ہیرو ایک ہی دن میں اشک کی مار سے سفید پڑ گیا ہو۔"
"شٹ اپ!" مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ در اصل میں خود بھی اپنی بے چارگی پر کئی بار ہنس چکا تھا لیکن کچھ اس طرح سے کہ خود مجھے بھی خبر نہ ہو کہ میں اپنا مذاق اڑا رہا ہوں۔ میری عمر اب پینتالیس سے اوپر ہونے کو آئی ہے۔ کیا اس عمر میں کوئی چھوکروں کی طرح محبت میں لوٹ لوٹ جاتا ہے؟ کیا میرا مسئلہ اب محبت ہے یا پائیوریا؟ —— مجھے اپنے ڈینٹل سرجن کا مشورہ یاد آیا کہ آپ سب دانت نکلوا کر مصنوعی سیٹ فٹ کرا لیں۔
"شٹ اپ!" میک اپ مین کی آواز پہ کان دھرے بغیر میں نے اچانک دہرایا۔
"میں تو یہ کہہ رہا ہوں سرکار کہ آج بھی آپ سو جوانوں میں کھڑے ہو جائیں تو آپ ہی کی انگلی آپ ہی کی طرف اٹھے گی۔"
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا میں ذرا خوش ہو کر آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگا۔
"ہاں، ٹھیک ہی تو ہے اب بھی —— اب بھی میں کسی سے کیا کم ہوں؟ ——" میں گویا اپنے ساتھ کام کرتی ہوئی کسی نوعمر ہیروئن کی طرح ایکٹ کر کے اپنی صورت پر فریفتہ ہونے لگا۔ "وہ پوپلا سالا دیو کمار! بیس بائیس برس کا ہے تو کیا؟ شکل سے تو یوں ہی لگتا ہے کہ پچپن برس کی عمر ماں کے پیٹ میں ہی کاٹ کر آیا ہوگا، اور بوڑھے کے رول میں کمالات بھی کیا کیا دکھاتا ہے۔ میرا باپ بنتا ہے تو میں سچ مچ کا باپ بھول جاتا ہوں اور اس چھوکرے کے بڑھاپے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔" میں نے ایک بار پھر آئینے میں دیکھا۔ "کئی لوگ سدا بہار ہوتے ہیں۔ ان کی عمر سدا ایک سی رہتی ہے، پچیس برس۔ میں آج بھی پچیس برس کا ہوں، ویسے ہی، جیسے بیس برس پہلے تھا۔ میرے ہزاروں لاکھوں فینز کے دلوں میں آج بھی میری وہی شبیہ ہے۔ میں وہی ہوں! ——"
خوشی میں مجھے اپنے بائیں بالائی ہونٹ کے قریب وہ واضح جھری بھی نظر نہ آئی جسے دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب [illegible] سا بےبس سا احساس طاری ہونے لگتا تھا، گویا میں کوئی نوعمر ہیرو نہیں بلکہ اس کا باپ ہوں یا دادا، جس کا [illegible]

پیٹ کو ٹیک ساہ سے جھٹکا جا پاکر اسندیادہ بڑھ گیا ہو، لیکن پھر بھی وہ جھرّی نظر نہیں آرہی تھی، پر نظر نے عکس بتا رہا ہے؟ وہ جھرّی تو میرے دل پر بھی پڑ چکی تھی، میں آئینے کے سامنے نہ بھی ہوتا، وہ جھرّی مجھے ہمیشہ دکھائی دیتی رہتی۔ میں اپنے آپ کو لاکھ سمجھاتا کہ ابھی تو میں جوان ہوں، مگر میں جوان تھا تو نہیں، مجھے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا دباؤ مسلسل محسوس ہوتا رہتا۔ میں واقعی بوڑھا ہو رہا تھا۔ جب ڈیویکٹر میرا بوڑھا باپ بن کر کسی فلم میں مجھے ہدایت کر رہا ہوتا کہ رمبھا کے عشق سے تمہیں دستبردار ہو جانا چاہیئے تو میرا جی چاہتا کہ اس سے صاف صاف کہہ دوں کہ میرے عزیز، میری شکایت عشق نہیں، تمہیں ٹرائیکلس ہے، پائیوریا ہے ————

"دیکھئے ..." میک اپ مین میرے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بالوں کو ڈائی کریں تو ذرا کم دوائی استعمال کیا کریں ..."

میرے بال واقعی بے حد سیاہ لگ رہے تھے، اتنے سیاہ کہ صاف نظر آتا تھا کہ خضاب لگا ہوا ہے۔

میک اپ مین میرے بالوں کی سیاہی مدہم کرنے لگا اور میں آئینے میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر اپنے ذہن میں اُن ہیروئنوں کی شکل دیکھنے لگا جو مختلف اوقات میں میرے ساتھ کام کرتی رہیں۔

۱۹۴۱ء میں جب میری پہلی فلم تیار ہوئی تو میری ہیروئن بڑی بڑی آنکھوں والی ایک نہایت دلکش، نندہ گد سی لڑکی تھی۔ سیٹس پر اس سے فلمی محبت کرتے ہوئے میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا کہ مجھے سچ مچ اُس سے محبت ہے۔ جب میں اُسے شادی کا پروپوزل پیش کرنے کی سوچ رہا تھا تو مجھے خبر ملی کہ وہ ہمارے اسٹوڈیوز کے فوٹوگرافر کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے، اور پھر سُنینتا آئی۔ سُنینتا کے بال کیا تھے، اُمڈی اُمڈی گھٹائیں تھیں، جدھر جدھر سے گزر جاتی وہاں برسات کا سماں بندھ جاتا۔ اور پھر پریتا آئی، پھر رانی، چنبیلی ———— چنبیلی نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُس سے شادی نہ کی تو وہ زہر کھالے گی، جیسے وہ ہم دونوں کی ایک فلم 'جیون نہ مانے' کے آخر میں زہر کھا کر مر گئی تھی، لیکن ہوا یہ کہ اُس نے ایک دن چپکے سے چمڑے کے ایک بہت بڑے کارخانہ دار سے شادی کر لی ———— ہا ہا ہا ————!

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟" میک اپ مین حیرت سے میری جانب دیکھ رہا تھا

"یونہی ..."

لیکن میں اِس لئے ہنس رہا تھا کہ آج مجھے اپنی نئی فلم کے پہلے سین ہی میں اپنی ہیروئن کو یہی دھمکی دینا تھی کہ اگر اُس نے میری محبت قبول نہ کی تو میں زہر کھالوں گا۔ ایک بار مجھے فوڈ پائیزننگ ہو گیا تھا تو میں نے بوکھلاہٹ میں ایک ہی دن میں پندرہ ڈاکٹروں سے طبی مشورہ لیا تھا۔ کیا ہمارے فینز واقعی اتنے سادہ لوح ہیں کہ ہماری آئیں بائیں شائیں پر جھٹ ایمان لے آتے ہیں؟ ایک دفعہ میں نے اپنے پروڈیوسر خان سے کہا تھا کہ کوئی ایسی فلم بنا ئیے جس سے ہماری زندگی کے اصل مسائل کا نشان ملے۔

"ارے بھئی ..." پروڈیوسر خان کہنے لگا۔ "جنہیں زندگی کے اصل مسائل درپیش ہوتے ہیں، اُنھیں اتنی فرصت ہی کہاں کہ تمھاری فلم دیکھنے چلے آئیں ..."

"لیکن خان صاحب، ہم یہ جھوٹ موٹ کی محبت کے افسانے کب تک پیش کرتے رہیں گے؟"

"تم بڑے احمق ہوتے جا رہے ہو بھائی، ارے لوگ یہ جھوٹ موٹ کی محبت کرنے کے لئے جوان بھی تو ہو رہے ہیں ..." پروڈیوسر خان ایک کائیاں تھا۔ "تمھاری مارکیٹ جوانی اور محبت کے اسی احمقانہ بھرم پر ٹکی ہوئی ہے کہ سو جب تک سونے کی چمک دمک باقی ہے اپنی گھاس سکھانے سے کام رکھو۔"

ہاں، مجھے کیا پڑی ہے کہ احمقوں کو اُن کی محبت سے باہر گھسیٹ لانے کا جتن کروں، اور اپنے حال پر خوش اور

معلوم ہیں، اپنی جگہ میں محفوظ پڑے ہیں اور میری دانش مندی اسی میں ہے کہ اُن کی حماقتوں میں شریک ہو کر چین سے ہنستا کھیلتا رہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ سوچوں؟ سوچنے سے میرے چہرے پر اور جھرّیاں آجائیں گی، جیسے اُس کہانی کار کا چہرہ جھرّیوں سے لدا ہوا تھا۔ وہ ہماری فلم کمپنی کے لئے سوچ سوچ کر کہانیاں لکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہاں روز روز بھی نئی کہانی کا اپنا نسخہ ٹھیک ہے، بس ہنستے ہنستے، باتیں کرتے، پان چباتے کھڑے کھڑے ہمارا مکالمہ لکھ کر ہمیں تھما دیتا ہے۔ فلم کے دھندے میں سوچ وچار سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنا جی بہلے گا تو اوروں کا بھی بہل جائے گا۔

"جلدی کرو بھئی۔" میں نے میک اپ مین سے کہا اور اپنے بائیں بالائی ہونٹ کے قریب انگلی پھیر پھیر کر آئینے میں دیکھنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں۔" وہ بولا۔ "بس اپن کا کمال دیکھتے جائیں۔ یہ جھرّی وُرّی چہرے سے اُڑ جائے گی۔"

میں سوچنے لگا کہ ذرا کام ہلکا ہو لے، یہ سیزن گزرنے پر میں جرمنی جا کر اپنے سارے چہرے کی پلاسٹک سرجری ہی کرالوں گا۔ آجکل جوانی بڑھاپے کا کیا سوال؟ جو چاہے وہ جوان ہے اور جو چاہے وہ بوڑھا۔

"ساب! ساب!" کمرے میں جی ہوائے وارد ہوا۔ "ڈارکٹر صاحب بولتا جالدی آؤ۔"

"جاؤ، اپنے ڈائریکٹر صاحب سے بولو، ابھی ہمیں دیر ہے۔" مجھے ڈائریکٹر پر غصّہ آنے لگا کہ ہوائے کو بھیج کر بلاتا ہے۔ چار قدم چل کر خود ہی کیوں نہیں چلا آیا۔

جی ہوائے ابھی دروازے پر ہی پہنچا ہوگا کہ ڈائریکٹر بھی چلا آیا۔

"یہ تو بات ہوئی نا۔" میں نے اپنی انا کی پیٹھ ٹھونک کر سوچا۔ "ورنہ میں آج شوٹنگ میں شریک ہوئے بغیر لوٹ جاتا۔"

"ریڈی، ہیرو صاحب۔" وہ پوچھنے لگا۔

"ریڈی!" میں ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیوٹی فل!" ڈائریکٹر نے میرا جائزہ لے کر کہا۔ "اِس وقت اگر آپ بالی وُڈ کی وہ نئی لڑکی ——— کیا نام ہے اُس کا؟ ———" وہ ہندوستانی فلمیں بناتا تھا اور انگریزی اور امریکی فلموں کو سراہتا تھا۔ "چلئے چھوڑیئے۔ آپ کو ایک خوش خبری سُناؤں؟ ہیروئن کا پارٹنر اینس کا تھا نا! اُس کی کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بچّہ ———" اُس نے اپنے پیٹ کے اردگرد دائرہ بنا کے کہا۔ "کوئی بچے وچے کا معاملہ ہے۔ اسپتال میں داخل ہو گئی ہے۔ اچھا ہی ہوا ———"

"تو پھر اب ———"

"تو پھر اب کیا! یہی تو خوش خبری ہے۔ میں نے اِن چوبیس گھنٹوں میں دوڑ دھوپ کر وہ ہاتھ مارا ہے کہ بس پوچھئے نہیں۔ تھنڈر! آرتھو کو یک! کیا بیوٹی ہے! کیا گریس ہے! بالی عمر، بالکل جیسی ہمیں چاہیئے۔"

میں نے ارادہ کر لیا کہ میں ضرور جرمنی جاؤں گا، مجھے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری اب کروا ہی لینی چاہئے۔

"پر ہے کون؟"

"آیئے، دیکھئے! آج کی شوٹنگ کے لئے اپنا سارا پارٹ اُس نے یاد کر لیا ہے۔ آیئے!"

ہم باہر نکلے تو دیو کمار بھی اِدھر ہی آرہا تھا۔

"نمستے ہردیپ جی۔"

میں نے جواب میں سر ہلا کر سگریٹ سلگانے کے لئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"یا اتنے پڑے پڑے کیوں لگ رہے ہو دیو۔"

"ہردیپ جی، میری ڈاڑھی کھو گئی ہے اور ___"

"ارے بھئی، تم تو داڑھی کے بغیر بھی ہمارے باپ ہی نظر آتے ہو۔"

ڈائریکٹر ہنسنے لگا۔

"نظر آنے سے کیا ہوتا ہے ہردیپ جی۔ اصل باپ تو ہمارے آپ ہی ہیں نا۔"

ڈائریکٹر کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ہنسنا چاہ رہا ہے لیکن خاموش ہے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ ہی ہمارے مائی باپ ہیں۔"

دیو شاید اب بات کو بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ جیسا فن کار یہاں ہے کون، ہردیپ جی؟ سارے دیش میں آپ کا بول بالا ہے۔"

میں اپنا تاوان وصول کر کے خوش ہو گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔ "پر ایک بات ہے بھئی دیو، بوڑھے کے رول میں تمہارا ابھی کوئی ثانی نہیں۔"

"ہے تو بوڑھے کا رول ہی آخر، ہردیپ جی۔" اُس نے بڑی ڈھیلی آواز میں کہا۔ "یہی پارٹ ادا کر کے ہم ایک دن سچ مچ بوڑھے ہو جائیں گے اور پھر بوڑھے کے پارٹ کے لئے بھی ناکارہ ہو جائیں گے، پر ہردیپ جی، ہیرو کا پارٹ آپ ہی کا حصّہ ہے۔"

"کہیں دیو کمار یہ تو نہیں کہنا چاہ رہا" مجھے شک ہونے لگا۔ "کہ میں بوڑھا ہو کر بھی نوجوان کا رول سنبھالے ہوا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہردیپ جی، کہ ہم چھوٹے آدمیوں کا کیا ہے؟ اصل کام آپ جیسے بڑے فن کاروں کا ہوتا ہے۔"

"چلیں؟" ڈائریکٹر نے گویا وہاں سے چلنے کے لئے میری اجازت طلب کی۔

"چلئے۔"

"دیو، تم اسٹوڈیو میں جاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "آئیے ہردیپ صاحب، مِس کامنی کا میک اپ بھی تیار ہے۔ وہ دفتر میں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

"اُس کا نام کامنی ہے؟"

"ہاں، تھنڈر! آئی سے، اے۔ ری آل تھنڈر، ہردیپ صاحب! آپ اور کامنی!" چلتے چلتے وہ ٹھہر گیا۔ "ذرا ٹھہرئیے!" وہ میری طرف دیکھنے لگا اور پھر میرے بائیں پہلو کی خالی جگہ کو دیکھنے لگا گویا کامنی کو۔ "کامنی اور آپ!" وہ ہمارے نشے کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اُس کی شُندرتا، کوملتا، چنچلتا اور آپ کا فن، وقار اور ___ اور ___"

اُسے رُکا رُکا پاکر مجھے غصّہ آنے لگا کہ شاید وہ میرے بائیں بالائی ہونٹ کے قریب جھرّی دیکھ رہا ہے۔

"اور آپ کی یہ وجاہت!"

میں نے اپنے چہرے پر مشفقانہ مسکراہٹ محسوس کر کے سر ہلایا۔

آپ کے چہرے کا یہ بھرپور مردانہ تاثر اور ___ اور اُس کی نوعمر نسوانیت! ہردیپ صاحب، میری ___ یہ آپ کی جوڑی ایک یادگار جوڑی ثابت ہوگی۔ آئیے!

(بقیہ صفحہ ۔۔۔ پر دیکھئے)

فراقؔ گورکھپوری

غزل

ہستی کو ہم عدم کریں گے — خود کو اپنی قسم کریں گے
کیا گذرے گی صنم کدوں پر — جب ہم قصدِ حرم کریں گے
کہتے ہیں ابد کی شام جس کو — اُس شام کی صبح ہم کریں گے
چشمانِ سیہ میں آتنی وحشت! — آہوئے تتار رم کریں گے
جب عشق کیا تو دیکھ لیں گے — جو کچھ وہ کرم ستم کریں گے
کچھ دل کی دوا خوشی نے کی ہے — کچھ رنج و غم و الم کریں گے
تیری ہی خوشی رہے گی اے دوست — اب اپنی خوشی نہ ہم کریں گے
اس درجہ ثواب کی تمنّا! — کیا کوئی گناہ ہم کریں گے؟
جو چاہے کرے تو اے مشیّت — آگے ترے سر نہ خم کریں گے
ہر عالمِ ظاہری کو اے عشق — اک عالمِ راز ہم کریں گے
پہونچیں گے یونہی لامکاں تک — اپنے اندر ہی رم کریں گے
ٹوٹا نہ سکوتِ ناز جس کا — اُس بت سے کلام ہم کریں گے

اے دل شبِ زندگی کی تشریح — وہ گیسوئے خم بہ خم کریں گے
پھر تو نہ رہوں گا میں کہیں کا — کیا جور بھی آپ کم کریں گے
ہم آئینۂ جہاں نما ہوں — اُن آنسوؤں کو بہم کریں گے
رہ رہ جائیں گے بیخودی میں — دُنیا کا خیال کم کریں گے

میرؔ و غالبؔ کے بعد یارو
اب ذکرِ فراقؔ ہم کریں گے

فراق

(مقالہ)

مسعود قمر تاباں

عظیم بیگ چغتائی ——— بحیثیت مزاح نگار

(عظیم بیگ چغتائی پر لکھے گئے تحقیقی مقالے کا ایک باب)

اُردو ناولوں میں ہمیشہ سے ظرافت کا عنصر شامل رہا ہے۔ ظرافت کے بغیر کسی بھی قصّہ کو دلچسپ نہیں بنایا جا سکتا اور جب کوئی قصّہ دلچسپ ہی نہ ہوگا تو اُسے قبولِ عام کی سند بھی نہیں مل سکتی۔ شرر کے ناولوں کو اسی عنصر کی کمی نے روکھا پھیکا اور خشک بنا دیا لیکن سرشار نے اِسی عنصر کی بدولت شہرتِ دوام حاصل کر لی۔

منشی سجاد حسین نے پہلی بار اُردو میں ایک مکمل ظریف ناول لکھ کر ایک نئی روایت کی بُنیاد ڈالی۔ منشی سجاد حسین کی یہ روایت چراغ سے چراغ جلنے کے مصداق ایک نحیف و نزار مصنّف کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اُردو مزاح نگاری ایک طویل عرصے سے جس مزاح نگار کی منتظر تھی وہ عظیم بیگ چغتائی کے رُوپ میں ظاہر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے اپنی ظریفانہ تصانیف سے اُردو ادب میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

عظیم بیگ چغتائی کے ظریف ناولوں اور قہقہوں سے بھرپور افسانوں نے اُردو کے مزاحیہ لٹریچر کو وہ سب کچھ دے دیا جس کے لئے ایک زمانہ درکار تھا۔ اگر ہم عظیم بیگ کی مختلف تصانیف پر نظر ڈالیں تو چکی، کمزوری، فلِ بوٹ، کھرپا بہادر، خطوط کا ختم ظریفی، سوانہ کی روحیں اور ویمپائر جیسے ناولوں سے لے کر خانم اور چغتائی کے دوسرے افسانوں تک مزاح کا ایک جہانِ رنگ و بُو آباد نظر آتا ہے جس کی سیر کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ مزاح کا کون سا گلِ شگفتہ ایسا ہے جس کی مہک اُن کی تخلیقات میں موجود نہیں۔ عظیم بیگ نے مزاح نگاری کے تمام حربے بڑی چابکدستی سے استعمال کئے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو آورد ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویروں کا جائزہ لیتے ہیں اور اِن واقعات کو کچھ اِس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ مزاح نگاری اُن کا قلم چومنے لگتی ہے۔

مزاحیہ صورتِ واقعہ (HIMOUROUS SITUATION) ایک مزاح نگار کا بہترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ عظیم بیگ نے اس ہتھیار سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِس ضمن میں "لفٹیننٹ" میں جب ڈاکٹر صاحب کے لفٹیننٹ ہونے کا تار آتا ہے تو اُن کی بیگم اُس کو اپنے بھائی کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی خوشخبری سمجھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی ہیں لیکن جب حقیقت ظاہر ہوتی ہے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہیں۔ اِس موقع پر عظیم بیگ نے وہ مزاحیہ صورتِ واقعہ پیدا کی ہے کہ قارئین کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال "خطوط کی ختم ظریفی" کا ہے۔ اِس ناول میں چغتائی ایک کھلنڈرے مزاح نگار کے رُوپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک مالدار فلم ایکٹرس کی خوبصورت لڑکی کی شادی کا فرضی اشتہار دے کر پھر سیکڑوں ہزاروں امیدواروں میں سے دو اُمیدواروں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملانا کہ ہر ایک خود کو اُمیدوار اور دوسرے کو لڑکی کا ماموں سمجھتا ہے۔ اِس موقع پر چغتائی کے قلم نے ظرافت کی وہ گُلکاریاں کی ہیں کہ بے ساختہ قہقہے چھوٹ پڑتے ہیں۔

زبان و بیان کی بذلہ سنجی سے مزاح پیدا کرنا بھی مزاح نگاری کا کامیاب ہتھیار ہے۔ عظیم بیگ نے اس حربے کو بھی

کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ "خطوط کی ستم ظریفی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:-

"شادی کی پہلی ناکام کوشش کے بعد تو یہی دل چاہتا تھا کہ عمرِ شیریں تجرد میں گزار دیں لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے شاعر دل والے ہاتفِ غیبی نے یہ صدا دی ؎

اگر پہلے حملے میں شادی نہ ہو   کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"پھر مجھ بوڑھے بھائی بہن کے رشتے کی بے چارگی "کمزوری" کی طرف توجہ دلا کر قافیوں کی اِن "چنگیزی" کارگزاریوں کا ذکر کیا جو عموماً دور رشتے کے بہن بھائیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور پھر مفصل کیفیت ان مذبوحی حرکات کی بیان کی جو ناظرین پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح ایک "جزئنگی" قاضی نے دو چچاؤں کی اولاد کو جو بہن بھائی کہلاتے تھے "بہ یک جنبشِ ریش" "گڈ مڈ" کر دیا۔"

عظیم بیگ فطرتاً مزاح نگار تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کے اصلاحی اور محزونیہ فضا میں لکھے گئے ناول اور افسانوں میں بھی مزاح کی چاشنی مزید موجود ہے۔ "تفویض" اُن کا ایک خالص اصلاحی افسانہ ہے، لیکن دلچسپی کے اعتبار سے کسی بھی اچھے مزاحیہ افسانے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے، وہ "تفویض" کو اگر خالص اصلاحی بنا دیتے تو شاید کوئی پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کرتا لیکن عظیم بیگ نے اصلاح کی کونین کو بقول غلام احمد فرقت قہقہے کی شکر میں لپیٹ کر دیا ہے، جس سے منھ بھی کڑوا نہیں ہو پاتا اور فائدہ بھی خاطر خواہ ہو جاتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی نے سرشار یا امتیاز علی کی طرح کسی مخصوص مزاحیہ کردار کی تخلیق نہیں کی، لیکن اُن کے تخلیق کیے ہوئے رنگا رنگ کردار ہماری آپ کی طرح اِسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ اُن کی کردار نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فطرت سے بہت قریب ہیں جن میں کوٹ کوٹ کر زندگی بھری ہوئی ہے۔ "فل بوٹ" کا ہیرو عظیم بیگ کے وضع کیے ہوئے کرداروں میں   ایک ممتاز خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ ایک آئیڈیل مرد ہے جو اپنے سینے میں عاشق کا دل رکھنے کے ساتھ ساتھ عقل و شعور بھی رکھتا ہے۔ عقل و عشق کی لڑائی میں عقل کی فتح ہونا اُس کے تدبّر اور ذہانت کی کھلی ہوئی دلیل ہے "کمزوری" میں عظیم بیگ نے رانی شفقت جہاں کا کردار وضع کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُن کو کردار نگاری پر کتنا عبور حاصل ہے اور وہ عورت کی نفسیات سے کس حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ "سوانہ کی روحیں" ایک خالص تخیلی ناول ہے لیکن اس کے تمام کردار زندگی سے اِتنے ہی قریب ہیں جتنے کہ ہم اور آپ۔ "تفویض" میں عظیم بیگ نے ایک مولوی کا کردار وضع کیا ہے اور صرف دو جملوں میں اُس کے کردار کے تمام پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے:- مولوی صاحب اپنی بیوی سے کہتے ہیں:-

"آپ میری منکوحہ بیوی ہیں پانچ وقت کی نماز پڑھواؤں گا بلکہ مارے نفلوں کے گھٹنے تڑوا دوں گا۔"

مولوی صاحب کے کردار کا دوسرا رُخ بھی دیکھیے:-

"یاد رکھیو اگر تو نے پھر اس قسم کی باتیں کیں تو کفر کا فتویٰ دے کر اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

خانم کے کردار کو اُردو دُنیا مشکل ہی سے فراموش کر سکے گی۔ خانم جو ہمہ صفت ہے اور جس کی زندگی کے مختلف پہلو اُن کے مسلسل افسانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خانم کی زندگی کا ہر رُخ اُس کے کردار کی مخصوص نفسیات کو پیش کرتا ہے۔

عظیم بیگ کے ذہنی اور جذباتی مزاح کا پس منظر ہمیشہ اصلاح ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کے یہاں طنز سے زیادہ ظرافت ہے، لیکن جہاں اُنھوں نے معاشرے پر طنز کیا ہے تو ایک مصلح یا واعظ بن کر نہیں بلکہ ایک مزاح نگار کے ہتھکنڈوں سے اور یہی اُن کے طنز کا کمال بھی ہے کہ وہ گہری سے گہری چوٹ کر جاتے ہیں لیکن کوئی اُس پر ناگواری محسوس نہیں کرتا۔

عظیم بیگ کو مشرق سے محبت ہے، یہاں کے رسم و رواج سے اُن کو عشق ہے، لیکن یہ عشق دیوانگی کی سرحدوں کو نہیں چھوتا۔ اُن کی ظرافت میں زہرناکی کی جگہ ایک معتدل لب و لہجہ اور ہلکا پھلکا مزاحیہ انداز ہے۔ "خانم" ہلکے پھلکے مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ "خانم" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"تین چار روز تک خانم سے سخت ترین جنگ رہی یعنی خاموش جنگ اُدھر بھی چپ اِدھر بھی چپ ... ۔۔ خاموش جنگ سے خدا محفوظ رکھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے گیس کی لڑائی ہو رہی ہو۔ غنیم کا گیس دم گھونٹے دیتا تھا .... چھ دن گزر گئے اور اب میں جنگِ مغلوبہ لڑ رہا تھا، بہت کوشش کی مگر ہار گیا۔ شرائط بھی بہت خراب تھیں۔ شاید معاہدۂ ورسیلز جس طرح ترکوں کے لئے ناقابلِ پزیرائی تھا اسی طرح میرے لئے بھی۔ مگر بقول کسے بزورِ شمشیر و بنوکِ سنگین مجھ کو مجبوراً صلحنامہ پر دستخط کرنا پڑے۔"

عظیم بیگ فطرتاً مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی شگفتہ طبیعت کے مالک تھے جس کے باعث اُنھوں نے ایک مختصر عرصہ ہی میں اُردو ادب میں اپنے لئے وہ جگہ بنالی تھی جو اتنی کم مدت میں کسی خوش نصیب ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ آج بھی اُن کی بیشتر تصانیف کے نئے نئے ایڈیشن برابر شائع ہو رہے ہیں۔ جس سے اُن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل عظیم بیگ نے کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں لکھا بلکہ اُن کی تمام تخلیقات ہمارے سماج کے ہر طبقہ کے لئے یکساں طور پر تفریحی، اصلاحی اور افادی نقطۂ نظر کی حامل نظر آتی ہیں۔

عظیم بیگ کی تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اُنھوں نے فن کی ترقی اور فنی روایات کے مغربی رجحانات کے دور میں جس طرح اپنے ادبی سرمائے سے اُردو ادب کی خدمت کی ہے وہ متعدد لکھنے والے مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ اِس حیثیت سے عظیم بیگ ادبی دُنیا میں اپنی ذات سے ایک انجمن نظر آتے ہیں۔ وہ زمانہ جب بقول ملا رموزی "رونے والے تو بہت تھے مگر روتوں کو ہنسانے والے آٹے میں نمک کے برابر تھے"۔ عظیم بیگ چغتائی نے اپنے ناولوں، کہانیوں اور مضامین سے پسورتے ہوئے لوگوں کو باقاعدہ قہقہے لگانے پر مجبور کیا اور اپنے مخصوص اسلوبِ بیان کے ذریعے مزاح پیدا کر کے اُردو ادب کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا۔ وہ خود ہنسوڑ اور شوخ طبیعت کے مالک تھے اور اُن کی یہی شوخی اُن کی تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے۔ عظیم بیگ کا مطمحِ نظر صرف ہنسنا ہنسانا ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے سماج کی اصلاح کے بھی متمنی تھے۔ چنانچہ اُن کے مزاح کا محور سماج اور اُس کی اصلاح ہے۔ یہ اُن کا کمال تھا کہ اُنھوں نے مقصد کی قربان گاہ پر کبھی اپنے فن کو بھینٹ نہیں چڑھایا۔

حالانکہ عظیم بیگ چغتائی ظرافت کے میدان میں بہت بعد میں آئے مگر اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ملکی ادب پر بڑی جلدی چھا گئے۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین ناول اور افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے جہاں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا تھا وہاں اُردو کو ایک ایسی روایت بھی عطا کی جس نے اُردو میں طنز و مزاح کے روشن مستقبل کی نوید سنائی۔ آج کے اکثر مزاح نگاروں کی تخلیقات میں ہم چغتائی کے پرتو کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

مزاح نگاری سے قطعِ نظر عظیم بیگ چغتائی نے اُردو ناول اور افسانے کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا اور اُن فرسودہ رنگوں سے چھٹکارا دلایا جو داستانی ادب کی دین تھی۔ اِس حیثیت سے عظیم بیگ کا شمار اُن گنے چنے ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اُردو ناول اور افسانہ نگاری کو ایک نئی ڈگر پر چلانے کے لئے زمین ہموار کی۔

سردار جعفری

جرعہ جرعہ، قطرہ قطرہ

انجم و مہتاب کے سائے میں پھر آئے گی رات
نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائے گی رات
مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح
آنچلوں کی ریشمی شکنوں میں لہرائے گی رات
مطربِ رنگیں نوا کے ساتھ ہو گی نغمہ سنج
ساقیٔ کافر ادا کے ساتھ اٹھلائے گی رات
شعلہ پیکر قامتوں کے حلقۂ آغوش میں
کہکشاں کے پیرہن میں رقص فرمائے گی رات
عشق کے لب سے پئے گی جرعۂ آبِ حیات
حسن کے پیمانۂ سیمیں کو چھلکائے گی رات
ہنس کے گائے گی جواں برسوں میں بازیوں کے گیت
ساعدوں کی شمعِ کافوری میں جل جائے گی رات
چشمِ ساقی ہی میں ٹھہرے گی نہ زلفِ بادہ میں
ساغر و مینا کے سینے سے ابل جائے گی رات
جرعہ جرعہ کر کے ذوقِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کر کے پیمانوں میں ڈھل جائے گی رات
رنگِ خونِ آرزو بن کر سحر ہو گی طلوع
دردِ دل بن کر مگر سینے میں رہ جائے گی رات
رنگ و بو کا کارواں، غنچوں کی آوازِ جرس
دور بادِ صبح کی صورت نکل جائے گی رات

ہم نہ ہوں گے پر قدح خوارانِ بزمِ نو کے ساتھ
بھر کے صہبائے طرب کے جام پھر آئے گی رات

طنز و مزاح:-

یوسف ناظم

بستی بسنا کھیل نہیں .....

کالونی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زیرِ تعمیر رہتی ہے (دُنیا کی ترقی کا راز اسی میں ہے) اگر کالونی کی عمارتیں ابتداء میں تین منزلہ بنائی گئی تھیں تو چند سال گذرنے کے بعد جب نیچے کی منزلیں کمزور ہوجائیں تو ان عمارتوں کو چار منزلہ بنادیا جاتا ہے اور ان عمارتوں میں رہنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کرایہ دار نہیں بلکہ وہ مزدور ہیں جو تعمیراتی کام کے دوران میں عمارت کے کسی گوشہ میں اپنی رہائش کا انتظام کرلیتے ہیں۔ یوں بھی دنیا مسافر خانہ ہے اور آدمی کو کبھی پاؤں پسار کر نہیں سونا چاہیئے، پتہ نہیں کس وقت کوچ کا حکم آجائے۔ عمارتوں کی اِس کایا کلپ کے زمانہ میں، کرایہ داروں کو وہی لُطف آتا ہے جو ٹورسٹوں کو ہل اسٹیشن پر بارش کے موسم میں بڑی تمناؤں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ بارش کے موسم میں، بارش صرف کالونی ہی میں نہیں، کالونی کے مکانوں کے اندر بھی ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں تو بغیر بارش کے موسم کے بھی، مکانوں میں پانی برستا رہتا ہے اور کمروں کے اندر اِس قدر پانی بھر جاتا ہے کہ مائیں اپنے چھوٹے بچّوں کو گود میں لیکر اُونچے اسٹولوں پر بیٹھ جاتی ہیں اور یوں نظر آتی ہیں جیسے ٹائپسٹ لڑکیاں، اپنے اپنے ٹائپ رائٹر لئے بیٹھی ہوں۔ اور باپ نیکر پہن کر بالٹی سے پانی باہر پھینکتے ہیں۔ اگر کالونی کے رہنے والے یہ نہ کریں تو ان کا کھانا ہضم نہ ہو اور ان کے معدے خراب ہوجائیں۔ عمدہ پلاننگ اِسے ہی کہتے ہیں۔

اگر کالونی بنانے والوں کو کسی ذریعے سے یہ علم ہوجاتا ہے کہ کسی بلڈنگ کے رہنے والے کرایہ دار امن وسکون سے زندگی گذار رہے ہیں تو پھر کالونی بنانے والوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں اور اُنھیں سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اِس بلڈنگ کی چھت توڑ کر اِس پر ایک اور منزل بنائی جائے، یا فی الوقت صرف روشندانوں کے شیشے نکال کر ان میں لکڑی کے ٹکڑے ٹھونک دیئے جائیں۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرسکتے ہوں تو ضرور سیڑھیوں پر جلنے والے بلب نکال لیجائیں گے یا دن میں دو چار بار پانی کی ٹانکی بند کردیں گے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ تعطّل نہ پیدا ہونے پائے۔ کچھ نہیں تو ایک نالی بند کرکے دوسری نالی کھود دی جائے گی اور پھر تھوڑے دنوں بعد دوسری نالی بند کرکے پہلی نالی کو زندہ کیا جائے گا۔

کالونی میں مکانات حتی الامکان اِس طرح بنائے جاتے ہیں کہ ان کے اندر ہوا نہ آنے پائے بلکہ بارش پوری آئے۔ یہ نئی تکنیک ہے جو سبھوں کے بس کی بات نہیں۔ بلڈنگ کی کسی ایک دیوار میں خم آنا یا کمرہ کی دیواروں میں پانی اُتر جانا بھی فنِ تعمیر کا اچھوتا پن ہے۔ کالونی کے قریب مچھروں کی افزائش اور چوہوں کی نشو ونما کا بھی معقول انتظام کیا جاتا ہے ـــــ کالونی میں اِس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی سڑک سیدھی نہ ہو۔ کسی بڑے انجینیئر نے کہا تھا کہ پیچ وخم والی سڑکیں بڑی خوبصورت لگتی ہیں اور ان کی طرف دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی ندیاں

بَل کھاتی ہوئی فراز کوہ سے چلی آرہی ہیں۔ کالونی کی سڑکوں پر مختلف نسخے آزمائے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو یوں سمجھئے کہ ابتداء میں کالونی میں سڑکیں ہوتی ہی نہیں۔ کالونی میں رہنے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنا راستہ خود بنائیں۔ جب ایسی کئی پگڈنڈیاں بن جاتی ہیں تو کالونی بنانے والے جان لیتے ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں کو کون سے راستے پسند ہیں، اور انہی پگڈنڈیوں کو مٹی کی سڑکوں کا رُوپ دے دیا جاتا ہے۔ اِن سے ہٹ کر کوئی سڑک بنانا جمہوریت کی نفی کرنا ہے۔ جب مٹی کی سڑکوں کی خاک ہوا ہو کر انسانی جسموں میں منتقل ہوجاتی ہے تو ان سڑکوں پر ٹیڑھے میڑھے پتھر بچھا دئے جاتے ہیں اور کالونی والے ان سڑکوں پر یوں سنبھل سنبھل کر چلتے ہیں، جیسے سرکس دکھانے والے رسّی پر چلتے ہیں۔ جب یہ پتھر شریف آدمیوں کی طرح بالکل دب جاتے ہیں تب کہیں پردۂ غیب سے رولر انجن نمودار ہوتا ہے۔ رولر انجن کا جلد آنا ممکن بھی نہیں، یہ ہمیشہ ٹہلتا ہوا آتا ہے اور بالعموم اُس وقت پہنچتا ہے جب اُس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ہاں دو چار حادثوں کے لئے رولر ضروری ہے۔ رولر اگر سڑک پر کھڑا رہے تو اِسے سوائے اس کے ڈرائیور کے ہر شخص چلا سکتا ہے کیونکہ یہ قوم کی ملکیت ہوتا ہے۔ پتھر اور کنکریٹ کی سڑک کے تجربہ کے بعد کالونی والے پھر ٹار روڈ کی اسکیم بناتے ہیں۔ اگر اتنے سارے تجربے نہ ہوں تو پھر روپیہ کیونکر خرچ ہو۔ روپیہ خرچ کرنا بھی ایک فن ہے اور یہ فن ہر ایرے غیرے کو نہیں آتا۔ روپیہ جمع کرنا، روپیہ خرچ کرنے سے نسبتاً آسان کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ روپیہ ہر شخص آسانی سے جمع کر لیتا ہے، نوٹوں کا فرش بچھا کر اُن پر ایرانی قالین بچھا دیتا ہے، یا چھت کے اندر ایک اور چھت بنوا کر روپیہ کو اُس کے اندر چھپا دیتا ہے، مٹکوں اور گلدانوں کے اندر دبا دیتا ہے۔ روپیہ جمع کرنے والا سب کچھ کر سکتا ہے لیکن خرچ نہیں کر سکتا۔ خرچ صرف کالونی بنانے والے کر سکتے ہیں۔ پروگرام اصل میں یہ ہوتا ہے کہ سڑکوں کے دونوں طرف درخت بھی لگائے جائیں گے۔ جب سڑکیں نہیں بنتیں یہ درخت لگا دئے جاتے ہیں۔ ان درختوں کی حفاظت کے لئے اینٹوں کا جالی دار کٹہرہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اِن درختوں اور ان کے جالی دار کٹہروں پر بکثرت روپیہ بھی خرچ کیا جاتا ہے۔ کچھ درخت، جانوروں اور انسانوں کی آنکھ بچا کر بڑے بھی ہونا شروع کر دیتے ہیں، لیکن اتنے عرصہ میں یہ طے ہوتا ہے کہ سڑک بنتی ہی ہے تو کیوں نہ اور چوڑی بنائی جائے۔ اِس خیال کے آتے ہی فوراً یہ درخت مع اپنے کٹہروں کے ضائع کردئے جاتے ہیں۔ اِن درختوں کے ضائع ہونے کے بعد، درختوں سے محبت کرنے والے لوگوں کی ایک انجمن بنا دی جاتی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کالونی صرف کالونی کی غرض سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے ادب برائے ادب ہُوا کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح کالونی کی تعمیر برائے تعمیر ہوتی ہے۔ اِس کالونی کے مکان کسی کو الاٹ نہیں کئے جاتے۔ کیونکہ اگر مکان رہائش کی غرض سے لوگوں کو دے دئے جائیں تو خواہ مخواہ اِن کا کرایہ وصول کرنا پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ کرایہ داروں کی وجہ سے کالونی کی خوبصورتی بھی متاثر ہوگی۔ کالونی بن جانے کے بعد، مکان الاٹ کرنے کے قواعد و ضوابط البتہ ضرور بننے چاہئیں۔ اور قبل اس کے کہ ان پر عمل ہو، ان قواعد میں ترمیم کرنی چاہئے۔ قواعد و ضوابط بنانے کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک کہ کالونی بوسیدہ نہ ہوجائے۔ اِس بات کی بھی احتیاط ہونی چاہئے کہ ان قواعد کی وجہ سے کہیں کنواروں کو مکان نہ مل جائے۔ کنوارے لوگ مکانوں میں رہنے کے قابل نہیں ہوا کرتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کوئی کنوارا کسی مکان میں رہا وہ زیادہ دن کنوارا نہ رہ سکا۔ کالونی بنانے والے جانتے ہیں کہ دنیا کی آبادی کو قابو میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کنواروں کی رہائش کا انتظام نہ ہونے پائے۔ پاؤں پھیلانے کی جگہ ملنے کے بعد پہلی بات جو کنوارا سوچتا ہے وہ شادی ہے۔ اور شادی کا نتیجہ خانہ آبادی ہے۔ اور خانہ آبادی ہی تو فساد کی جڑ ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر دیکھئے)

شمیم کرہانی

بیچارگی

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

آنکھ بیتاب کہ دنیائے حسیں کو دیکھوں
نقرئی رات میں اِس زہرہ جبیں کو دیکھوں
میں بھی باشندہ زمیں کا ہوں زمیں کو دیکھوں
لیکن اِک حسنِ نظارہ بھی نگاہوں میں نہیں
جس قدر دیپ ہیں محلوں میں ہیں راہوں میں نہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

دل کا اصرار کہ رنگین گھٹا چھا جائے
نرم آنچل مرے افکار پہ لہرا جائے
تیرے گیسو کی گھنی چھاؤں میں نیند آ جائے
لیکن آلامِ جہاں چین کہاں دیتے ہیں
نیند آئے بھی تو پلکوں سے چرا لیتے ہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

شیشۂ دل سے جو محفل کو سجاتا ہوں کبھی
اپنے ماحول کو رنگین بناتا ہوں کبھی
جام ترسے ہوئے ہونٹوں سے لگاتا ہوں کبھی
زخم کھائے ہوئے پہلو نظر آتے ہیں مجھے
جام میں آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں مجھے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

پھینک دیتا ہوں بھرا جام کہ پینا ہے گناہ
بزم پیاسی ہو تو پھر لذتِ مینا ہے گناہ
یہ تو وہ دور ہے جس دور میں جینا ہے گناہ
اہلِ زر جام پہ جام اپنے بھرے جاتے ہیں
جن کا مینا نہ ہے پیاسے ہی مرے جاتے ہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

جم گیا ہے لبِ جمہور پہ فریاد کا شور
کچھ سیہ کاروں نے انساں کو کیا ہے لبِ گور
یہی دھرتی کے ہیں ڈاکو یہی خوشیوں کے ہیں چور
بیچتے پھرتے ہیں عفت کی مسرت یہ لوگ
اپنی ناموس کی کرتے ہیں تجارت یہ لوگ
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

ایسے عالم میں بھلا سوئے چمن کیا دیکھوں
باغ کی لاش، بہاروں کا کفن کیا دیکھوں
چاندنی ہے نہ کہیں چاند ۔ گگن کیا دیکھوں
دل پہ ہر دل کی اداسی سے چھری چلتی ہے
کچھ جو چہروں پہ چمک ہے وہ بری لگتی ہے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تکا کرتا ہوں

شمیم کرہانی

تحقیق:- نقی احمد ارشاد

تذکرۂ شورش کی تاریخی خامیاں

میں نے اپنے کسی مضمون میں لکھا ہے کہ شاید ہی کوئی تذکرہ ایسا ہو جو تاریخی اغلاط سے پاک ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نویس تحقیق اور چھان بین سے کام نہیں لیتے، بلکہ سُنی سُنائی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ اُن کا مقصد صرف کسی شاعر کے کلام کا پیش کرنا ہوتا ہے اور بہ سبیل تذکرہ کچھ مختصر حال لکھ دیتے ہیں۔ لہٰذا جب کسی تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں تو غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ایسی غلطیاں ہم عہد شعرا کے حال میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

جعفر خاں راغب خلف ہدایت اللہ خاں خلفِ دوم نواب لطف اللہ خاں صادق وزیر محمد شاہ و نائب سلطنتِ ہند کا حال لکھتے ہوئے شورش تحریر کرتے ہیں۔

"سلسلۂ نسب جدی ایشاں بحضرت برگزیدۂ جناب باری خواجہ عبداللہ انصاری ہروی رحمۃ اللہ علیہ می رسد"

جعفر خاں راغب کے حقیقی چھوٹے بھائی محمد علی خاں انصاری عاصی تخلص مؤلفِ تاریخ مظفری، تاریخ محمدی و بحر مواج تھے۔ اُن دونوں کے حقیقی چچا عنایت خاں راسخ خلف الرشید نواب لطف اللہ خاں صادق اور نواب شاکر خاں مؤلفِ گلشنِ صادق[1] تھے۔ لطف اللہ خاں کی اولادوں میں عنایت خاں راسخ اور شاکر خاں کے نام سیر المتاخرین اور مآثر الامرا میں ملتے ہیں۔

الغرض تینوں کتابوں بالخصوص گلشنِ صادق میں نواب لطف اللہ خاں صادق کا سلسلۂ نسب درج ہے۔ تعجب ہے کہ میر غلام علی شورش نے باوجود جعفر خاں راغب کے ہم عہد ہوتے ہوئے بھی، کچھ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ آگے تحریر ہے۔

"خواجہ ملک علی علیہ الرحمۃ بہ سبب ہنگامۂ ہلاکو خاں نبیرۂ چنگیز خاں از شہر ہرات مع توابع و لواحق از انجا بہ خواستۂ ہندوستان رسیدہ غریقِ لجۂ رحمت شُد"

مندرجۂ بالا تحریر میں یہ غلطی ہے کہ ہلاکو خاں کا حملۂ ایران، خواجہ ملک علی کے تقریباً سو سال پہلے ہوا تھا۔ شاد نے گیارہ تاریخوں

---

[1] گلشنِ صادق کی صرف پہلی جلد پٹنہ خدا بخش خاں کی لائبریری میں موجود ہے۔ خدا بخش خاں مرحوم نے یہ کتاب صرف پانچ روپے میں عمدہ جان ممنوعہ عورت جلال الدین حسین خاں تاثیر سب جج ضلع پورنیہ (شاد کے حقیقی ماموں) سے خریدی تھی۔ جلال الدین حسین خاں تاثیر کی شادی مرشد زمانی بیگم، نواب منیر الدولہ کی پوتی سے ہوئی تھی۔ بیوی کے بطن سے اُن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ زمانہ کے رواج کے مطابق کئی عورتیں اُن کی حویلی میں تھیں، جن میں عمدہ جان بھی تھی۔ بعد انتقالِ تاثیر، شاد کی والدہ سے اس عورت سے جائداد کے متعلق جو مقدمہ ہوا تھا اُس کا حال یادگارِ شاد میں ملاحظہ ہو۔ ارشاد

اور فرمانوں کی مدد سے اپنے جدی و مادری بزرگوں کا فارسی میں ایک تذکرہ "تذکرۃ الاسلاف" کے نام سے شائع کیا تھا۔ چنانچہ خاندانِ لطف اللہ خاں صادق اور اُن کے بزرگوں کے نام سلسلہ وار اِس میں موجود ہیں۔

شاد کی نجی فاطمہ بیگم، نوابِ شاکر خاں کی پرپوتی اور نواب عیسیٰ خاں رفعت کی صاحبزادی تھیں۔ نواب عیسیٰ خاں رفعت کا حال مع کلامِ اُردو تذکرہ عشق ص۲۷۳ مطبوعہ میں موجود ہے۔ شاد کی والدہ عارفہ بیگم بنت مہدی علیخاں نواب عنایت خاں راسخ مؤلف "عنایت نامہ" کی پرپوتی تھیں۔ اِس کے علاوہ، شاد کے دادا سید تفضل علی عرف میرن صاحب تحصیلدار الہ آباد اور نواب عیسیٰ خاں رفعت آپس میں ہم زُلف اور سالے بہنوئی بھی تھے۔ دونوں کی بیویاں حقیقی بہنیں اور سید زین الدین علی خاں عرف میر زینا (سادات بارہہ) کی اولاد تھیں، میر زینا، قطب الملک عبداللہ خاں وزیر فرخ سیر کے بھائی تھے اور سید نجم الدین علی خاں کے ہم بطن تھے۔ سید نجم الدین علی خاں کی ایک صاحبزادی کی شادی، شیر افگن خاں فوجدار الہ آباد برادرِ سوم لطف اللہ خاں صادق کے صاحبزادے سے دہلی میں ہوئی تھی، مختصر نسب نامہ درج ذیل ہے

میر زینا
نصیر الدین علی خاں
سید اولاد علی اَولیٰ (تذکرہ عشق ص۶۰)

میر صفدر علی معروف بادشاہ علی (تذکرۃ الاسلاف) — کمانی بیگم زوجہ قنبر علی (شاد کے پردادا)

صاحب بیگم زوجہ تفضل علی — الہٰی بیگم زوجہ نواب عیسیٰ خاں رفعت — سید تفضل علی

محسن (شوہر فاطمہ بیگم) — عباس — فاطمہ بیگم زوجہ محسن — عباس

شاد — شاد

تذکرۃ الاسلاف میں ہدایت اللہ خاں خلف لطف اللہ خاں صادق کا نام موجود ہے۔

شاد کی روایت کے مطابق جعفر خاں راغب کا سلسلۂ نسب یوں ہوتا ہے ۱؎ حضرت ابو ایوب انصاری (صحابیٔ رسولؐ جن کا مزار قسطنطنیہ کی سرحد پر ہے) ۲؎ ابو منصور مست ۳؎ جعفر ۴؎ احمد ۵؎ محمد ۶؎ علی ۷؎ ابو محمد ۸؎ شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری (جن کا ذکر تذکرہ شورش میں آیا) ۹؎ محمد ۱۰؎ نصیر ۱۱؎ محمد ۱۲؎ عبداللہ انصاری ۱۳؎ فضل اللہ آق خواجہ کلاں ۱۴؎ محمد امیر شیخ ابو اسحٰق ۱۵؎ آق خواجہ اکجو ۱۶؎ ابو طاہر ۱۷؎ سہیل ۱۸؎ علی ۱۹؎ عثمان ۲۰؎ ابراہیم ۲۱؎ عمر ۲۲؎ مسعود ۲۳؎ میرک شیخ ۲۴؎ قاضی خواجہ ملک علی علیہ الرحمۃ (جو بہ روایت شورش و شاد ہندوستان آئے)

گویا حضرت ابو ایوبؓ کے بعد چوبیسویں پشت میں خواجہ ملک علی تھے اور شیخ ابو اسحاق، امیر شیراز کے بعد دسویں پشت میں خواجہ ملک علی تھے۔ شاہ شیخ ابو اسحاق کا وہی عہد تھا جو خواجہ حافظ شیرازی کا۔ چنانچہ دیوانِ حافظ میں بہت سے اشعار شاہ شیخ ابو اسحاق کی مدح میں ہیں۔

خدایگانِ سلاطینِ مغرب و مشرق — خدیوِ کشورِ عفو و کرم بہ استحقاق
سپہرِ علم و حیا آفتابِ جاہ و جلال — جمالِ دنیا و دیں شاہ شیخ ابو اسحاق

به عهدِ سلطنت شاه شیخ ابو اسحاق به پنج شخص عجب ملکِ فارس بود آباد

اس خاندان کے دو افراد بادشاہِ شیراز ہوئے۔ ابو اسحاق اور آق خواجہ انجو۔ گلشن صادق میں نواب شاہ کرخاں نے حضرت آدمؑ سے لیکر خود تک مسلسل نسب نامہ دیا ہے جو فضول ہے، لہذا حضرت ابو ایوبؓ سے خواجہ ملک علی تک کا نسب نامہ دے دینے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔

آق خواجہ انجو کی شہادت اور خاندانِ انصار شیراز کی تباہی کے بعد سید حسین شاہ فیروزی حکومت شیراز پر نظر آتے ہیں۔ جب تیمور لنگ نے شیراز پر حملہ کیا تو وہاں کا تخت حکومت خالی تھا۔ امرائے ایران، چنگیز، ہلاکو اور رضا بندہ کے حملے دیکھ چکے تھے۔ اسی لئے جب بھی سمرقند کی طرف سے حملہ ہوتا تھا ایران کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں حملے کے پہلے ہی اپنے حکمرانوں سے خالی ہو جاتی تھیں۔

دولت شاہ کے مطابق، تیمور لنگ نے شیراز میں حافظ کو بلوایا اور کہا "کیوں جی! جس سمرقند و بخارا کو میں نے سیکڑوں شہروں کو اُجاڑ کے آباد کیا ہے، تم اس کو اپنے معشوق کے گال کے تل پر نثار کرتے ہو ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ نے نہایت انکسار سے جواب دیا، "جہاں پناہ! حافظ کی غربت اسی سے آشکارا ہے۔" یہ ۱۳۹۲ء کا واقعہ ہے اور تیمور لنگ اس کے چند سال بعد مر گیا۔

تیمور لنگ سے کئی پشت اُوپر ہلاکو خاں تھا جو کافر اور ملحد تھا۔ تاریخ فارس مؤلفہ سائکس کے مطابق ہلاکو خاں

لہ تاریخ فارس سائکس (SYKES) مطبوعہ ۱۹۱۵ء لندن پریس ص۱۹۵ کے مطابق خاندانِ مظفریہ ہرات نے اس خاندان کا کئی لڑائیوں کے بعد ۱۳۵۲ء / ۷۵۴ھ میں خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد امیر مظفر کے بیٹے نے حکومت شیراز سید حسین شاہ فیروزی کو تفویض کر دی (روضۃ الصفا) حافظ کی ایک غزل کا یہ شعر اُن کی مدح میں ہے ؎

بالیقیں خاتمِ فیروزۂ شاہنشاہی خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

حافظ کے مطبوعہ اور قلمی دیوانوں میں اس شعر کے پہلے مصرعہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو اُوپر تحریر کی گئی۔ دوم ؎ راستی خاتمِ فیروزہ بو اسحاقی جناب قاضی عبدالودود صاحب کو شعر کے پہلے مصرعہ ؎ بالیقیں خاتمِ فیروزہ۔ الخ کو اس صورت میں ماننے میں تکلف ہے (رسالہ صبح دہلی ۱۹۶۲ء) یہ صحیح ہے کہ حافظ کے مختلف قلمی دیوانوں میں اُس کے بعض شعروں کی صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔ مگر ایک بات غور طلب ہے کہ شاہ شیخ ابو اسحاق نے کافی زمانے تک حکومت کی۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے آق خواجہ انجو نے حکومت کی۔ ایسا خاندان جس میں دو بادشاہ ہوئے اُسکو "دولتِ مستعجل" کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ دوم حافظ نے تمام تر قصائد میں شاہ ابو اسحاق کی مدح کی ہے اور یہ شعر حافظ کی ایک غزل کا ہے، جس کا مطلع ہے ؎

یاد باد آں کہ سر کوئے توام منزل بود دیدہ را روشنی از خاکِ درت حاصل بود

شعر مذکور اس غزل کا آخری شعر ہے اور اس کے بعد مقطع ہے ؎

دیدی آں قہقہۂ کبکِ خراماں حافظ کہ سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود

اس سے زیادہ "دولتِ مستعجل" کی وضاحت اور کیا ہوگی۔ بے شک "روضۃ الصفا" مؤلفہ آخوند میر (عہد بابر) کی عبارت اگر قابلِ اعتماد نہیں ہے تو قاضی صاحب کا اعتراض درست ہے۔ اس "روضۃ الصفا" کے مطابق جب بعد "خدا بندہ" اس کے بیٹے ابو سعید شہنشاہ مغل ایران کے زمانے میں افرا تفری پھیلی اور امیر ہرات خاندانِ مظفریہ نے فارس و شیراز کی باجگذار حکومتوں کو تہس نہس کر کے اپنے اپنے باجگذار امیر مقرر کئے تو مغل شہنشاہیت کا اقتدار قائم کرنے کے لئے تیمور لنگ نے خاندانِ مظفریہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ سید حسین شاہ فیروزی اسی خاندانِ مظفریہ کے تابع حکمرانِ شیراز تھے اور تیمور لنگ کے حملے کے کچھ پہلے تک اُن کی حکومت قائم تھی۔ ارشاد

کا پہلا حملہ ایران پر ۶۵۲ھ/۱۲۵۲ء میں ہوا۔ بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کی ہلاکت ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں ہوئی۔ یہی سال روضۃ الصفا مؤلفہ آخوند میر میں درج ہے۔ یہ زمانہ شعرائے شیراز میں شیخ سعدیؒ کا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے مستعصم باللہ کے حال کا ایک مرثیہ بھی نظم کیا تھا ؎

آسماں راحق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں

ہلاکو خاں کا وہی زمانہ تھا، جو شیراز میں شیخ سعدی کا اور ہندوستان میں خواجہ امیر خسرو کا۔ اس زمانہ میں سلاطینِ دہلی میں غیاث الدین بلبن تھا۔

چنگیز خاں کا وہی زمانہ تھا جو ہندوستان میں شمس الدین التمش کا۔ چنانچہ طبقاتِ اکبری مطبوعہ نول کشور ص۲۵ کی عبارت ہے۔

"در سنہ ثمان عشر و ستمائۃ سُلطان جلال الدین خوارزم شاہ، از پیش چنگیز خاں منہزم گشتہ بطرفِ لاہور آمدہ، سلطان شمس الدین با لشکرِ بسیار در مقابل رفت۔ سلطان جلال الدین تاب نیاوردہ، بطرف ہندوستان رفتہ"

قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں بنیاد ڈالی۔ وہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں چوگان کھیلتے ہوئے مرگیا۔ اس کے بعد ۱؎ آرام شاہ پسر قطب الدین ۲؎ شمس الدین التمش ۳؎ رکن الدین فیروز شاہ ۴؎ سلطانہ رضیہ ۵؎ معز الدین بہرام شاہ ۶؎ جلال الدین بن مسعود شاہ ۷؎ ناصر الدین ۸؎ غیاث الدین بلبن (یہی ہلاکو خاں کا زمانہ تھا) غیاث الدین بلبن کے بیٹے محمد سلطان نے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، مگر بقولِ صاحبِ طبقات اکبری شیخ نے آنے سے انکار کیا۔

"شیخ بواسطۂ ضعفِ پیری نتوانست آمد و عذرِ نا آمدن و سفارشِ امیر خسرو ضمیمۂ آں ساخت"

۹؎ معز الدین کیقباد۔ (اس کے عہد میں امیر خسرو کی وہ مشہور مثنوی کہی گئی تھی "قران السعدین") ۱۰؎ خاندان خلجی۔ جلال الدین خلجی ۱۱؎ علاء الدین خلجی ۱۲؎ شہاب الدین خلجی ۱۳؎ مبارک خلجی (اس کے عہد میں خواجہ امیر خسرو کی دوسری مشہور مثنوی "نُہ سپہر" تصنیف کی گئی تھی) ۱۴؎ خاندانِ تغلق۔ غیاث الدین تغلق ۱۵؎ محمد تغلق ۱۶؎ فیروز تغلق۔ (اس بادشاہ کے عہد میں تیمور لنگ کا ایران اور افغانستان کے علاقوں پر حملہ ہوا تھا۔ یہ زمانہ شعرائے شیراز میں حافظ شیرازی کا تھا) شورش کی عبارت ہے "خواجہ ملک علی بہ سبب ہنگامۂ ہلاکو خاں۔ الخ" اور شاد کی تذکرۃ الاسلاف میں عبارت ہے۔

"چوں نوبت بہ قاضی ملک علی رسید، در زمانِ سلطنتِ غیاث الدین بلبن پائے اقامت بہ زمینِ ہند کشید"

اوپر عرض کیا گیا کہ ہلاکو خاں اور غیاث الدین بلبن کا ایک ہی زمانہ ہے۔ لہٰذا دونوں تحریریں تاریخ کے خلاف ہیں۔

غیاث الدین بلبن کا وہی زمانہ ہے، جس زمانہ میں ہلاکو خاں ایران و بغداد کو تہس نہس کر رہا تھا۔ مغلوں کے حملے ہندوستان پر بھی ہو رہے تھے۔ چنانچہ غیاث الدین بلبن کا بڑا لڑکا محمد سلطان مغلوں کے حملے میں کام آیا تھا، اُس کی شہادت کا ایک مؤثر مرثیہ خواجہ امیر حسن سنجری نے لکھ کر بلبن کے پاس بھیجا تھا۔ طبقاتِ اکبری مطبوعہ نول کشور ص۴۲ کی عبارت ہے۔

"خواجہ امیر حسن ایں مرثیہ را نوشتہ بدہلی فرستاد"

امیر تیمور لنگ کا وہی زمانہ تھا جو ہندوستان میں فیروز تغلق کا۱؎۔ لہٰذا خواجہ ملک علی اگر غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان چلے آئے بقولِ شاد، یا بقولِ شورش اگر ہلاکو خاں کے ڈر سے بھاگ کر ہندوستان چلے آئے، تو وہ امیر ابو اسحاق بادشاہِ شیراز کے بعد ان کی دسویں پُشت میں کیونکر پیدا ہوئے۔ جبکہ شیخ ابو اسحاق کا وہی زمانہ ہے جو مغل سلاطین

۱؎ صاحب قرانی تیمور لنگ کا ملتان اور لاہور پر حملہ سلطان محمود شاہ کے عہد میں ہوا۔ ارشاد

میں امیر تیمور لنگ، شعرائے شیراز میں حافظ کا اور پٹھان سلاطینِ ہند میں فیروز تغلق سے لیکر محمود شاہ تک کا۔
یا تو گلشنِ صادق کا نسب نامہ غلط ہے اور اگر صحیح ہے تو خواجہ ملک علی ہرگز ہرگز بلاکو خاں کے زمانہ میں لدفیات الدین
بلبن کے عہد میں ہندوستان نہیں آئے۔ یا تو خواجہ ملک علی، شاہ شیخ ابو اسحاق کی اولادوں میں نہ تھے اور اگر تھے تو وہ
یقیناً فیروز تغلق کے بعد، سید، لودی یا بابر کسی کے وقت میں آئے۔ بقول صاحبِ طبقاتِ اکبری، تیمور لنگ کا حملہ
لاہور و دہلی پر محمود شاہ کے عہد میں ہوا (ص ۱۲۸ ط)

لطف بالائے لطف یہ ہے کہ جہاں شاد نے درحقیقت غلطیاں کی ہیں، اُنکی گرفت جناب قاضی عبدالودود صاحب نے
اپنے تبصرہ (شاد کی کہانی مطبوعہ رسالہ صبح دہلی ۱۹۶۲ء) میں نہیں کی ہے اور جہاں غلطیاں نہیں ہیں وہاں اعتراضات
وارد کئے ہیں، اس پر ایک الگ سے طویل مقالہ سپردِ قلم کر چکا ہوں۔ تاہم دلچسپی کے لئے ایک تاریخی فرد کے متعلق جو قاضی
صاحب نے غلط اعتراض کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

میر مردان علی کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب کی تحریریں ہیں۔
"سیر المتاخرین میں سید مردان علی متوسل شوکت جنگ کے باپ کا نام سید رستم علی خواہرزادہ خواجہ معتصم
(برادرِ صمصام الدولہ) مرقوم ہے اور اسکے علاوہ کوئی بات ان کے بارے میں اس کتاب میں نہیں ہے" (رسالہ صبح ص ۸۳)
"مردان علی یا مردان علی خاں نام کا کوئی شخص سپہ سالارِ بنگالہ نہ تھا" (رسالہ صبح ص ۸۴)
شاد نے تذکرۃ الاسلاف ص ۷ میں وہی لکھا ہے جو سیر المتاخرین میں تحریر ہے۔ سیر المتاخرین کا انگریزی میں پہلی بار
۱۷۸۹ء میں توتا مائنس فرانسیسی نے ترجمہ کیا تھا۔ اس کی عبارت جلد دوم ص ۲۰۸ پر ملاحظہ ہو۔

SEIR VOL. II, PAGE 208 (Published 1789)

"Shaocat dgung شوکت جنگ remained himself in the spot within which he had brought a number of gentlemen on horse-back and also some corps on which he most trusted, such as that of MIR MERDAN-- AALY, a relation of QHAN Ò DOR AN خان دوراں, the minister of state at Delhi. He commanded the body guards and had distinguished himself an ensign of cloth of gold. The other crops were commanded by Mitan Lal Diwan

PAGE 213 — "MIR MERDAN AALY who commanded his body-guards and MITAN LAL who commanded the foot guards turned about with Mirza Ramzani, brother to the Pnika".

رہا میر رستم علی، تو جب ۱۸۱۱ء میں فرانسیسی سیاح بکنن نے پٹنہ عظیم آباد کا معاصر نقشہ بنایا تو اس نقشہ
میں بھی "کوچۂ میر رستم علی" درمیان پادری کی حویلی اور گورہٹہ کے دکھایا ہے۔ یعنی پادری کی حویلی کے پچھم میں۔
یہ نقشہ بکنن کے سفرنامہ کے ساتھ پرنسپل جیکسن پٹنہ کالج نے ۱۹۲۴ء میں شائع کرا دیا ہے۔ اس کی ایک کاپی مظفرپور
کلکٹری کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔
کیا سراج الدولہ اور شوکت جنگ کی فوجیں، علی وردی خاں مہابت جنگ کے لشکرِ عظیم کی دو شاخیں نہ تھیں۔؟

علی جواد زیدی

ہجر کی رات

گرم آنسو پلک پہ تھرّایا
اور ہلکی سی ٹیس دل میں اٹھی
ہجر کی کشمکش کا سرمایا!

ایک میٹھے سے درد کی کروٹ
جیسے مجروح ذہن نے پائی
چھبتی یادوں کے چلنے کی آہٹ

کتنے ہنگامہائے عشق و جنوں
کتنے افسانہائے عقل و خرد
بن گئے یاد، ہو گئے افسوں!

کتنے ہی غنچے کھل کے پھول بنے
اے شبِ ہجر! تیرے دامن میں
اور پھر پھول بن کے مرجھائے

مسکراہٹ کے پھول بکھرا کر
کتنے گل رنگ لب خموش ہوئے
جیسے محفل کے سازِ وقتِ سحر،

کتنی زلفیں حسین شانوں پر
پیچ و خم کھا کے بن گئیں آہیں
دل میں ٹوٹے اُمید کے نشتر

کتنے پیمانہائے خسرو و جم
کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے جامِ سفال
گرم اشکوں میں ہو گئے مدغم

درد ہی عشق، درد ہی ہے جمال
درد کیا ہے؟ حیات کی کاوش
درد ہی ہجر، درد ہی ہے وصال

اب تو سنتا ہوں آخری ہے یہ شب
ہجر کی شمع تھرتھراتی ہے
جاگ، اے بزمِ انبساط و طرب

علی جواد زیدی

(افسانہ)

اکرام جاوید

ہیرے کا جگر

وہ گرمیوں کی ایک نہایت حسین اور خوشگوار چاندنی رات تھی جب سانولے سلونے دراز قد انور نے انتہائی پُر شوق لہجے میں اپنی جوان اور حسین و جمیل بیوی رضیہ سے کہا

"رضو۔ آج پورے چاند کی رات ہے اور سارا گاؤں سو چکا ہے۔ حویلی میں بھی کوئی بیدار نہیں ہے۔ چلو اوپر چھت پر چلیں۔ بے ابر و بیکراں نیلگوں آسمان کے زیر سایہ جادو بھری چاندنی رات کا نغمہ سنیں، فطرت کے حسن کا چاندنی میں نظارہ کریں اور دل کی زبان میں باتیں کریں۔"

"مجھے چاند ستاروں اور تمہاری ان بے تکی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" رضیہ نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ "دنیا کے لوگ ترقی کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اور جناب دو سو روپلی ماہوار ہی کی کھونٹی سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس پہ مزہ یہ کہ چاند ستاروں اور پھولوں سے عشق کرتے ہیں۔"

"تم پھر میری شخصیت کی توہین کر رہی ہو"۔ انور تڑپ کر بولا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں دولت کے پیچھے بھاگ نہیں سکتا۔ روپیہ کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ روپے سے سچی خوشی اور آسودگی نہیں مل سکتی۔"

"اور سچی خوشی صرف شاعری سے ملتی ہے؟" رضیہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ "مجھے تمہاری اس سوچ سے سخت نفرت ہے۔ کاش تم شاعر نہ ہوتے یا پھر تم سے میری شادی نہ ہوتی"۔ وہ رُک کر تلخی سے بولی۔ "آج پورے ایک مہینے کے بعد شہر سے آئے ہو اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ کل شمو کی منگنی ہو رہی ہے۔ جگہ جگہ سے مہمان آ رہے ہیں۔ اور میرے پاس نہ کوئی نیا کپڑا ہے اور نہ کوئی نیا زیور۔ میری سبکی اور بے عزتی کا تو کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ میں سوچ سوچ کر مری جا رہی ہوں۔ اور جناب کو چاندنی کی سیر سوجھی ہے۔"

انور کو غصہ تو بہت آیا مگر غصے کے زہر کو امرت کی طرح پی کر اس نے کہا۔ "رضو۔ تم روپے، لباس اور زیور کی اصطلاحوں میں سوچنا چھوڑ دو۔ اس لئے کہ تم خود اتنی حسین ہو کہ تمہارے حسن کے سونے کو زیور کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ سچی اور لازوال محبت۔ میں نے اپنی کائناتِ دل تمہارے قدموں پر رکھ دی ہے۔"

"تمہارے یہ حسین الفاظ اب مجھے فریب نہیں دے سکتے۔" وہ جھلا کر بولی۔ "مجھے نہیں چاہئے تمہاری کائناتِ دل۔ اس شاعری سے میں تنگ آ چکی ہوں۔" وہ سنگ دلی کا بدترین مظاہرہ کرتی ہوئی بولی۔ "خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم چاند ستاروں کا نظارہ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے اوپر چھت پر چلے جاؤ۔"

"اور تم ساتھ نہیں چلوگی؟" انور نے بجھی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"ایک بار کہہ دیا نہیں۔ سو بار کہتی ہوں، نہیں چلوں گی، نہیں چلوں گی۔" وہ غصہ سے چیخ کر بولی۔ "اب تم میرا پیچھا چھوڑو۔"

ایک لمحے کے لئے انور سہم گیا۔ اور دوسرے ہی لمحہ اُس کے دل میں ایک تیز شعلہ سا بھڑک اُٹھا اور وہ انتہائی تیز لہجے میں بولا۔
"تم محض بکواس کرتی ہو۔ سنگدل عورت۔ تمہیں میرے دل اور میری خوشی کا رتی برابر بھی خیال نہیں۔ تم ہمیشہ میرے جذبات اور احساسات کو پامال کرتی رہی ہو۔ میں اِس طرزِ عمل کو برداشت نہیں کر سکتا۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے صحن میں آگیا۔ اُسے توقع تھی کہ رضیہ اُس کے پیچھے اُسے منانے آئے گی۔ مگر رضیہ نہیں آئی۔ بلکہ اُس نے کمرے کی روشنی گل کر دی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح کچھ دیر صحن میں کھڑا رہا اور پھر اُوپر چھت پر چلا گیا۔ اور سیمنٹ کی بنی ہوئی ایک نشست پر دل شکستہ اور اُداس سا بیٹھ گیا۔

سُرخ پتھر کی بنی ہوئی بلند و بالا حویلی کی چھت پر سے وہ چاروں طرف دُور دُور تک دیکھ سکتا تھا۔ اُوپر آسمان صاف شفاف اور روشن تھا۔ نیلی نشیلی جوش کھاتی ہوئی آسمان کی گہرائیوں میں چاند ستارے جگمگا رہے تھے۔ نیچے زمین پر ہر طرف چاندنی کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ فضا میں ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ خوشگوار موسم اور صاف اُجلی چاندنی نے مناظر کو خوابوں جیسا حسین بنا دیا تھا۔ سارا گاؤں ہی چاندنی کی چادر اوڑھے محوِ خواب تھا۔ گلیوں اور بازار میں کھمبوں پر لگے بجلی کے قمقمے اُونگھ رہے تھے۔ گاؤں کی زندگی میں اِس تمام عرصے میں انقلابی تبدیلیاں رُونما ہوئی تھیں۔ گاؤں میں بجلی کی روشنی تک آگئی تھی۔ مگر اُونچی حویلی والوں کا مزاج نہیں بدلا تھا۔ جاگیرداری اور زمینداری کے خاتمے کے باوجود، سونے چاندی کی بہتی ہوئی ندیوں کے خشک ہو جانے کے بعد بھی اُونچی حویلی کا غرور اور گھمنڈ ختم نہیں ہوا تھا۔ زمانہ بدل گیا تھا لیکن لوگ وہی پرانے تھے۔ ظلم اور جبر وہی تھا، ظلم اور جبر کے انداز بدل گئے تھے۔ انور کا اِس اُونچی حویلی والوں سے خونی رشتہ تھا۔ اور اِسی رشتے کی اساس پر اُس نے رضیہ سے شادی کی تھی۔ انور خوبرو تھا، صحت مند اور بھرپور جوان تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے اُس کی شہرت ملک بھر میں مشک کی خوشبو کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ ایک خانگی فرم میں جو بڑے پیمانے پر کتابوں کی اشاعت اور نکاسی کا کاروبار کرتی تھی، ملازم بھی تھا۔ اِس طرح شادی کے بازار میں اُس کی خاصی قیمت تھی۔ لیکن اُس نے خود کو بیچنا گوارا نہ کیا۔ اور رضیہ کے والد کو وہ جوڑے اور جہیز کے بغیر بے دام مل گیا۔ اُس زمانے میں رضیہ کے والد کی مالی حالت کافی گر چکی تھی۔ اور رضیہ پر جوانی کی بہار چھائی ہوئی تھی۔ اونچی حویلی والے ایک جوان لڑکی کو جو نہایت حسین و جمیل بھی تھی عرصے تک گھر میں بٹھا کر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اِس لئے انور کو اُنھوں نے قبول کر لیا۔ اور جب رضیہ کے والد کا کاروبار جم گیا۔ اور اونچی حویلی میں سونے چاندی کی ندیاں پھر سے بہنے لگیں تو انور حویلی والوں کی نظروں سے گر گیا۔ ہیرے سے پتھر بن گیا۔ اُونچی حویلی والے اُس کی انفرادیت، شخصی عزت، خودداری اور آزادی کے دُشمن بن گئے۔ شخصی عزت، خودداری اور آزادی جس کی حفاظت اُس نے بچپن کی یتیمی اور طالب علمی کے سخت تاریک ترین زمانے سے اب تک کی تھی، اُسے اب رضیہ کے خاندان والوں کا غرور اور خود پسندی تباہ کرنے کے درپے تھے۔ اُن لوگوں کی نظروں میں اُس کی حیثیت اور وقعت اِس لئے بھی نہیں رہی تھی کہ وہ دولت مند بننے کے بجائے پھولوں، چاند ستاروں کے حُسن، اور انسان کی ترقی اور بقا کے خوابوں پر جان دیتا تھا۔ وہ لوگ اُسے گھر کا داماد نہیں بلکہ ایک خانگی فرم کا دو سو روپے ماہوار کمانے والا معمولی ملازم سمجھتے تھے۔ انور کو ان لوگوں کی مطلق پرواہ نہ تھی، وہ بھی اُن لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر غم تھا تو یہی کہ رضیہ اُس کی بیوی، محبوبہ اور رفیقِ حیات اُسے اب تک سمجھ نہیں سکی تھی۔ اُس نے صندلی رنگ کی دراز قد اور گلبدن رضیہ سے دل و جان کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ پیار کیا تھا۔ تکونیلو کی مانند پُرکشش چہرے اور جادو بھری آنکھوں والی اِس حسینہ پر اُس نے اپنی متاعِ قلب و نظر نچھاور کر دی تھی۔ اُس کی خوشی کے لئے اپنی ہر خوشی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ پھر بھی وہ رضیہ کی محبت اور اُنس کے التفات سے محروم ہی رہا۔ رضیہ اُس کی ہم مذاق و ہم خیال نہ بن سکی۔ وہ دولت، لباس، زیور، بنگلہ اور موٹر کی

اصطلاحوں میں سوچتی تھی، اُسے بُھولوں، چاند ستاروں اور قلب و نظر کے لطیف و نازک معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی ہمدرد، غمخوار اور وفادار تھی۔ اور اُن ہی کے انداز میں سوچتی تھی۔ رضیہ جو چاہتی تھی وہی کرتی تھی۔ اور وہ جو چاہتا تھا نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لئے کہ وہ بیسویں صدی کی اس قلوپطرہ سے مارک انطونی کی طرح عشق کرتا تھا۔ وہ رضیہ کا دل نہیں توڑ سکتا تھا۔ اور اُس کا دل توڑنا رضیہ کی عادت تھی۔ اونچی حویلی والوں کی سرد مہری، بے التفاتی اور رعونت انور کے لئے ناقابلِ برداشت ستم تھے۔ وہ اِن لوگوں سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ وہ کئی بار عہد کر چکا تھا کہ کبھی اس اونچی حویلی میں قدم نہیں رکھے گا جہاں اُس کی کوئی عزّت و وقعت نہیں ہے۔ لیکن رضیہ کی خوشی کے لیے، رضیہ کی خاطر اُسے ہر بار اپنا عہد توڑنا پڑا تھا — !

اب کی بار گرمیوں میں رضیہ اُس کی مرضی کے خلاف شہر سے گاؤں آئی تھی۔ کل اُس کی چھوٹی بہن کی منگنی لوہے اور فولاد کے ایک کروڑپتی تاجر کے اکلوتے لڑکے سے ہونے والی تھی۔ انور اِس تقریب میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اِس اونچی حویلی میں قدم رکھتے ہوئے اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی۔ لیکن رضیہ کی خوشی کے لئے اُسے گاؤں آنا پڑا تھا۔ اپنی عزّت اور خودداری کو خاک میں ملانے کے لیے — وہ رضیہ کی خاطر شہر سے گاؤں آیا تھا اور رضیہ اُس کی خاطر نیچے سے اُوپر چھت تک نہ آ سکی۔ وہ کتنی ظالم ہے، کس قدر بے حِس — پتھر کی اِس مُورتی کے سینے میں دل نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں جو اُس کے لئے دھڑک سکے۔ وہ دیوانہ ہے، سودائی جو ایک مغرور اور وفا ناآشنا عورت کو اپنی زندگی، اپنی منزل سمجھے ہوئے ہے۔ رضیہ کبھی اُسے نہ سمجھ سکے گی۔ کبھی نہیں —" شدّتِ احساس سے انور کا دم گھٹنے لگا۔ پُونم کی حسین چاندنی رات میں وہ کسی خشک چَنار کے درخت کی طرح جل رہا تھا۔

صبح کے قریب جب چاند ستاروں نے آنکھیں مُوند لیں تو وہ بھی حویلی کی چھت پر، سیمنٹ کی سخت نشست ہی پر سو گیا ———— !

جب اُس کی آنکھ کھلی تو سُورج کافی بلند اور تیز ہو چکا تھا۔ اور وہ دھوپ میں سیمنٹ کی بنی ہوئی نشست پر پڑا ہوا تھا۔ اتنی بڑی حویلی میں اتنے آدمیوں اور نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی کسی کو اُس کا خیال نہیں آیا۔ رضیہ نے بھی اُسے نہیں دیکھا۔ اگر رضیہ کو اُس سے ذرّہ برابر بھی محبت ہوتی تو وہ رات ہی میں آ کر اُسے منا لیتی۔ یا چھت پر ہی اُس کے لئے بستر لگوا دیتی۔ یا کم از کم صبح میں اُوپر آ جاتی — بے عزّتی اور شخصی توہین کے شدید احساس سے انور کا خون کھولنے لگا۔ غیض و غضب کے ہیجانی عالم میں وہ چھت سے اُتر کر نیچے آیا۔ خود ہی آواز دے کر ملازمہ کو بلا لیا۔ اور نہا دھو کر جب وہ کمرے میں آیا تو ملازمہ نے دسترخوان پر ناشتہ چُن دیا تھا۔ رضیہ اب بھی نہیں آئی تھی۔ اُس نے بے حیا بن کر رضیہ کو بلا بھیجا۔ لیکن رضیہ نہیں آئی۔ باہر ہی سے پکار کر کہہ دیا "آج کام کا دن ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔ کہہ دو ناشتہ کر لیں۔"

انور کو غصّہ تو بے حد آیا مگر جلد ہی اِس غصّے پر اُس کا بے پناہ فطری شرافت اور والہانہ محبّت غالب آ گئی۔ وہ ہمیشہ سے رضیہ کو معاف کرتا رہا تھا۔ اب کی بار بھی اُس نے درگزر سے کام لیا۔ جلدی سے دو چار نوالے زہر مار کئے۔ اور اُٹھ کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ وہ اکیلے کمرے میں بند نہیں رہنا چاہتا تھا اور گاؤں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اونچی حویلی والوں کے پاس وقت نہیں تھا جو اُس سے سیدھے مُنہ بات کرتے یا تقریب کے انتظامات کے سلسلے میں اُس سے مشورہ یا مدد لینا چاہتے۔ اُن لوگوں کے نزدیک اُس کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر تھے۔ انور کو لیکن اب بھی رضیہ کے جذبات کا احساس تھا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے رضیہ کے جذبات مجروح ہوں۔ اِس لئے اُس نے طے کیا کہ دن بھر گاؤں کے کھیتوں اور امرائیوں میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر شام کو گھر واپس آئے گا۔ اور تقریب میں شریک ہو کر صبح سویرے شہر واپس چلا جائے گا۔ ابھی وہ لباس تبدیل ہی کر رہا تھا کہ رضیہ دندناتی ہوئی کمرے میں

داخل ہوئی اور غضبیلی آواز میں چیخ کر بولی۔ "آخر یہ کیا پاگل پن ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟"

انور کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اور وہ اپنے غصّہ پر قابو نہ پا سکا۔

"میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ جہاں جی چاہے جا سکتا ہوں۔"

"اگر یوں نخرے دکھانا تھا تو یہاں آئے ہی کیوں تھے۔؟" رضیہ نے تیز آواز میں کہا۔ "بہتر تھا یہاں نہ آتے۔"

"ہاں قصور ہو گیا جو یہاں آیا۔ اب چلا جاؤں گا۔" فرطِ غضب سے اُس کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

"تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں۔ جاؤ فوراً چلے جاؤ۔" رضیہ نے پاگلوں کی طرح چیخ کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

انور پر پے در پے بے شمار بجلیاں ٹوٹ گریں۔ وہ غم و غضب سے دیوانہ ہو گیا اور اُسی وقت گاؤں سے شہر واپس آگیا ——————— !

شہر آنے کے بعد ناقابلِ برداشت ذہنی اور روحانی کشمکش کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر انور نے فیصلہ کیا کہ وہ ذلّت اور بےبسی کے ساتھ ملنے والی رضیہ کی قربت اور رفاقت پر اُس سے باعزّت جُدائی کو ترجیح دے گا۔ محبّت میں اپنی خودی اور خودداری کا سودا نہیں کرے گا — رضیہ اُس کے پاس رہتے ہوئے بھی کبھی پاس نہیں رہی۔ سچی رفیق تو وہ محبّت تھی جو ہمیشہ اُس کے دل میں رہی اور اب بھی ہے۔ وہ اِس محبّت کے شعلے کو اور تیز کرے گا۔ اُس کی روشنی میں انسان کی دائمی مسرّت اور آسودگی کی تلاش کرے گا۔ اُس کا فن اب بھی اُس کا وفادار اور مہربان ساتھی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اب بھی پناہ لے سکتا ہے۔ وہ رضیہ کو بھول سکتا ہے۔ اُسے رضیہ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اب اُس کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ابتدائی چند ہفتوں تک رضیہ کی سنگ دلی اور بے مہری کا احساس ایک تیز جلتے ہوئے شعلے کی طرح اُس کے دل میں فروزاں رہا۔ غم و غصّہ اور نفرت کی دہکی ہوئی آگ میں وہ مسلسل جلتا رہا۔ پھر اُس نے رضیہ کے بارے میں سوچنا کم کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتا گیا۔ اور چند دن کے بعد روزمرّہ کے کام اور مشاغل اُس کی ذہنی ابتری، بےچینی اور روحانی کرب پر غالب آگئے۔!

موسمِ گرما ختم ہوا اور برسات کا موسم شروع ہوا تو دل میں سوئے ہوئے درد، غم اور غضب کے طوفان جاگ گئے۔ وہ رضیہ کو بھول نہیں سکتا تھا۔ اور رضیہ کی یاد اُسے اندر ہی اندر جلائے جا رہی تھی۔ اُسے رضیہ پر بے پناہ غصّہ آیا۔ کہ وہ اب بھی خاموش اور انجان تھی۔ گاؤں سے وہ انتہائی آبرو ہو کر شہر آیا تھا اور رضیہ کو اِس کا احساس تک نہ تھا۔ وہ اب تک شہر نہیں کوئی تھی۔ گاؤں سے ایک خط تک نہیں لکھا تھا اُس نے —— وہ نادم اور شرمندہ نہیں تھی۔ وہ اُس کی پرواہ ہی نہیں کرتی۔ وہ کتنی مغرور، ضدی اور سنگ دل عورت ہے۔ پتھّر کی ایک مورت۔ اور وہ کیوں اُس کے لئے گوشت پوست کا حسّاس آدمی بنا رہے۔ جب وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اِس قدر سختی اور سنگ دلی سے قائم رہ سکتی ہے تو پھر اُسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ بھی پتھّر کا ایک بُت کیوں نہیں بن جاتا —!

اور پورے تین ماہ بعد جب رضیہ گاؤں سے شہر واپس آئی تو وہ پتھّر کا ایک بُت بن چکا تھا۔ اُس دن وہ ابھی دفتر ہی میں تھا جب اُسے رضیہ کی آمد کی اطلاع ملی۔ اور وہ غم و غضب سے کانپ کانپ گیا۔ اُس کے دل میں انتقام کی تیز آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ رضیہ سے اپنی توہین اور بےعزّتی کا پورا بدلہ لے گا۔ اُس کو بتا دے گا کہ وہ اُس کی ذرّہ برابر بھی اہمیت محسوس نہیں کرتا۔ وہ کہہ دے گا کہ اب اُسے اُس کی صورت تک سے نفرت ہے۔ رضیہ کو اب اُس کی بے پناہ نفرت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب اُسے اُس کے وجود، اُس کی شخصیت اور حیثیت کا احساس ہوگا۔ وہ رضیہ کے غرور اور گھمنڈ کو خاک میں ملا دے گا۔

شاید وہ ان ہی طوفانی خیالوں میں کھویا رہا - اور قریب تھا کہ جب غم، غصہ اور نفرت کی آگ میں جلتا، کھولتا اور ابلتا ہوا وہ گھر واپس آیا تو آسمان پر برسات کی گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں۔ وہ بھی گھٹاؤں کی طرح گرج گرج کر برسنا چاہتا تھا۔ لیکن رضیہ کو دیکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ آسمانی رنگ کے ریشمی لباس میں رضیہ کے حسن کا شعلہ تیز لو میں جل رہا تھا ۔ رضیہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ رضیہ کے حسن کے جلووں میں کھو کر رہ گیا - اور اپنے بے پناہ غم، غضب اور نفرت کے جذبات سے بے خبر اور بے پرواہ ہو کر حیرت اور خوشی سے چیخ کر بولا۔ "ارے رضو تم --- تم آگئیں --- کم از کم خط تو لکھا ہوتا - میں تمھیں لینے لسبیلا سگنڈ پر آجاتا"

اور جواب میں رضیہ کے خوبصورت چہرے پر غم اور غضب کی بدلیاں چھا گئیں - اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں دہکا ہوا جہری اور اُسی طرح کا غرور اُبھر آیا - وہ بے حد نادم تھی، روٹھی ہوئی، نالاں اور بے زار سی کھڑی تھی -

"پرانی باتوں کو بھول جاؤ رضو - مجھے معاف کردو - مجھ سے یوں خفا مت ہو - میرے دل اور میری محبت کو سمجھنے کی کوشش کرو - سچ کہتا ہوں - میں تمھارے بغیر زندہ نہیں سکتا --"

انور اُس کو منا رہا تھا - اُس کے آگے گڑگڑا رہا تھا - اور اپنے طرزِ عمل پر شرمندہ اور نادم ہو رہا تھا - اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا...... ساتھ ہی اپنی مجبوری اور بے بسی پر دل ہی دل میں کڑھ بھی رہا تھا - وہ اپنے دل اور اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور تھا - اور محبت کے بے پناہ سیلاب میں اُس کی خودی، خودداری اور شخصی عزت کا خیال خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا - اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ کبھی رضیہ کی طرح پتھر کا بُت نہیں بن سکتا --!

بقیہ افسانہ "وہ ھی" صفحہ ۲۱

ہم اُس کے کمرے کے قریب پہنچے تو مِس کامنی ہمارے قدموں کی آواز سُن کر باہر آگئی -

" یہ ہیں مس کامنی اور یہ ---------- "

" انھیں کون نہیں جانتا -" وہ بولی

ہمارے ڈائریکٹر کی یہ دریافت واقعی تھنڈر سے کم نہ تھی -

" میری ماتا جی بھی آپ کے ساتھ کام کر چکی ہیں انکل -" وہ مجھ سے مخاطب تھی - " چنبیلی ! "

بقیہ "بستی بسنا کھیل نہیں" صفحہ ۲۸

کالونی کی طرزِ تعمیر میں کالونی کے نقشے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نقشہ میں ہر وہ چیز ہوا کرتی ہے جو کالونی میں نہیں ہوتی، مثلاً سوئمنگ پول - اوپن ایر تھیٹر - اسٹیڈیم وغیرہ وغیرہ - سوئمنگ پول - تھیٹر اور اسٹیڈیم وغیرہ کی جگہ چھوڑ کر نقشہ میں جہاں بھی جگہ باقی ہو، مکانات کھڑے کر دئے جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ مکان ایک قطار میں نہ بنیں۔ کہیں وہ مربع کی شکل میں ہوں تو کہیں مستطیل کی شکل میں۔ کسی جگہ وہ ایک دائرے میں ہوں تو کسی اور جگہ گھوڑے کی نعل کی شکل میں۔ مکانوں کے لئے مثلث کا نمونہ بھی اچھا مانا گیا ہے۔ کالونی کے نقشہ کو ہمیشہ ایسی جگہ لگایا جاتا ہے جہاں آمد و رفت بہت کم ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔ طرزِ تعمیر کے بارے میں کالونی بنانے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ایک مکان کے اندر سے دوسرے مکان کے اندر پوری طرح دیکھا جا سکے۔ اس طرح یکجہتی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور زندگی بے تکلف ہو جاتی ہے۔

یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ کالونی میں پہلے جانور رہنے آتے ہیں یا آدمی -- کالونی میں بہرحال یہ مساوی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

الطاف مشہدی

غزل

دل کھول کر جلاؤ، میں آتش پرست ہوں
اے میرے ہمنواؤ، میں آتش پرست ہوں

کس درجہ دلفریب تھی میٹھی ہنسی کی آنچ
وہ آنچ پھر جلاؤ، میں آتش پرست ہوں

سجدے کا کوئی داغ جبیں پر کہیں نہیں
لیکن مرے خداؤ، میں آتش پرست ہوں

پھولوں کی آگ پی کے بھی تسکیں نہیں ملی
چتون کی لو پلاؤ، میں آتش پرست ہوں

شمعوں میں میرا خون جلاؤ، کہ بجھ سکے
یہ تیرگی کا گھاؤ، میں آتش پرست ہوں

جلتا رہا ہوں، جلتا ہوں، جلنے کا ہے خیال
مجھ سے مجھے بچاؤ، میں آتش پرست ہوں

آتش پرست ہوں، مرا مسکن چمن نہیں
خوشبو لدی ہواؤ! میں آتش پرست ہوں

شعلوں کو گھول دوں گا لہو کی شراب میں
تم میکدہ سجاؤ، میں آتش پرست ہوں

بہتا ہے، تھرکتا رہے، ناچتا رہے
اک عنبریں الاؤ، میں آتش پرست ہوں

تا نذرِ کر سکوں تمہیں بے چینیوں کی آگ
آؤ، کبھی تو آؤ، میں آتش پرست ہوں

جلتا ہے کتنا آتشِ رنگیں سرشت سے
الطاف کا سبھاؤ، میں آتش پرست ہوں

شہاب جعفری

غزل

گلِ نو کے ہاتھ سے دم بدم جو صبا نکلتی چلی گئی
تو چمن چمن تھی وہ تشنگی کہ بہار جلتی چلی گئی

میں مسافرِ رہِ درد تھا، ہر امید دستِ سوال تھی
یہ حیات موجِ سراب تھی، مرے ساتھ چلتی چلی گئی

تری یاد گلشنِ خواب تھی کہ مری نواؤں کے دشت میں
یہ بہارِ شمعِ خیال تھی سرِ شاخ جلتی چلی گئی

تری آرزو تو نہ تھی مگر تو کہاں ہے میرے نگار سُن
تری جستجو کے بغیر بھی رہِ دل بدلتی چلی گئی

ترے گیسوؤں کی کہانیاں جو سُنیں تو نیند سی آ چلی
سفرِ حیات میں سخت تھی مری رات ڈھلتی چلی گئی

نظر آئی منزلِ آرزو تو ہر اک نشیب و فراز پہ
یہ قدم بہکتے چلے گئے، وہ نظر سنبھلتی چلی گئی

انجم عظیمی

جمیل مظہری — شخصیت اور شاعری

علامہ جمیل مظہری کی شخصیت سے متعلق بہت سی داستانیں اور حکایتیں مشہور ہیں۔ جنھیں سُن کر مجھے اُن سے ملنے کا اشتیاق رہا۔ لیکن ایک عرصۂ دراز تک میں اُن سے نہ مل سکا۔ ہاں اُن کی شاعری کا مطالعہ میرا محبوب مشغلہ رہا۔ ۱۹۶۰ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد جب پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کے پہلے سال میں داخلہ لیا تو ان کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن نہ جانے کیوں شروع میں اُن سے مل کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ ان کی شخصیت کا جو نقشہ میں نے اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا۔ انھیں دیکھنے کے بعد یہ خیال ذہن میں پیدا ہوا کہ "کاش میں انھیں نہ دیکھتا تو اچھا تھا۔" لیکن آج جب میں یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں تو سوچتا ہوں کہ "اگر میں نے انھیں نہ دیکھا ہوتا تو؟ اور اگر میں نے ان کے سرچشمۂ علم و فن سے کچھ قطرے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے مستعار نہ لیے ہوتے تو؟ اور اگر...." اور اس اگر کے بعد ایک لامتناہی خلا اور ایک سوالیہ نشان۔ حقیقت یہ ہے کہ جمیل مظہری کی شخصیت اِس قدر پیاری اور معصوم ہے کہ کبھی کبھی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ وہ اِس قدر معصوم کیوں ہیں۔ انھیں دوست اور دشمن کی تمیز کیوں نہیں ہے۔ وہ دنیا کو سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ اُن کی معصومیت کی وجہ سے بہت سے لوگ اُن سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں اور جب کوئی اِس جانب ان کی توجہ مبذول کراتا ہے تو وہ اک شانِ بے نیازی سے ٹال جاتے ہیں اور کہنے والا شرمسار ہو جاتا ہے۔

بہت کم ایسے فن کار ہیں جن کی زندگی اُن کے فن سے مطابقت رکھتی ہو۔ لیکن جہاں تک جمیل مظہری کا تعلق ہے ہم اُن کی شاعری کے ایوان میں بغیر اُن کی شخصیت کو جانے ہوئے داخل ہو ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ اُن کا فن اُن کی زندگی، اُن کے تجربات اور اُن کے نظریات کا بھرپور عکس ہے، یا یوں کہیے کہ اُن کا فن اُن کی زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ اِس لئے بھی ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر نقاب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کا کردار، ان کا مزاج اور اُن کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے کوئی بھی شخص بہ آسانی پڑھ سکتا ہے۔

جمیل مظہری کی خفگی بھی بڑی پیاری اور معصوم ہوا کرتی ہے اور اس سے وہ حضرات بخوبی واقف ہوں گے جنھیں ایم اے کے دو سال اُن کی شاگردی میں رہنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن کتنا خلوص ہوتا ہے اِس خفگی میں، کتنا پیار اور کتنی محبت کا احساس ہوتا ہے جب وہ خفا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تمام طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح پیار اور محبت دیتے ہیں اور جس طرح ایک باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ راتوں رات اپنے بچے کو اپنا سارا علم دیدے۔ اور جب بچے کا ناپختہ ذہن اُسے قبول نہیں کرتا تو وہ جھنجھلا اُٹھتا ہے، اُسے مارتا ہے اور اکثر اوقات اس کی کتابیں اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ کچھ یہی حال اُن کا بھی ہے۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے شاگرد اُن کے علم کو چند ساعت کے اندر اپنے سینوں میں منتقل کر لیں اور جب انھیں

مایوسی ہوتی ہے تو وہ جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ ایک بار میں کچھ دیر سے کلاس میں پہنچا، تمام لڑکے خاموشی سے بیٹھے تھے اور علامہ کے تیور بتا رہے تھے کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ میں آداب کر کے نشست پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اُنھوں نے سوال کیا۔

"کتاب لائے؟" اب یہاں کس کمبخت کو یاد کہ وہ کس کتاب کی بات کر رہے ہیں۔ اور یہ کمبخت کس کتاب کی ہے۔ پڑھائی کے معاملے میں تَیں یوں بھی کچھ لاپروا سا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھ کر کمزور سی آواز میں کہنے لگا "سر..... وہ ..... سر... کتاب"

"تو گویا آپ بھی اِن ہی لوگوں کے ساتھیوں میں نکلے؟" اُنھوں نے سارے کلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اُن کا ہر لفظ ہتھوڑے کی طرح دل پر لگ رہا تھا۔ کنکھیوں سے جو اِدھر اُدھر دیکھا تو تمام ساتھیوں کی گردنیں شرم اور احساسِ ندامت کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔

"بیٹھ جائیے" حکم ہوا اور میں بے جان سا اپنی نشست پر سر جھکائے بیٹھ گیا۔ اُس وقت اُن سے نظر ملانے کی تاب خود میں نہیں پا رہا تھا اور تقریباً تمام ساتھیوں کی یہی کیفیت تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے کہا۔

"بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ لوگوں کے جیسا جاہل آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ آپ لوگ جاہل بھی ہیں اور بدذوق بھی۔ بعض آدمی اگر جاہل ہوتا ہے تو بدذوق نہیں اور بدذوق ہوتا ہے تو جاہل نہیں لیکن یہ دونوں صفتیں آپ لوگوں میں موجود ہیں اس لئے برائے کرم آئندہ سے ہماری کلاس میں تشریف لانے کی زحمت گوارہ نہ کریں۔" یہ کہہ کر اُٹھے اور اختر اورینوی صاحب کے پاس گئے۔ اختر اورینوی علامہ کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اُنھیں ایک بزرگ اور بڑے بھائی کی طرح مانتے ہیں۔ اُن کی معصومیت اور خلوص کی دل سے قدر کرتے ہیں اور جب بھی علامہ ان کے کمرے میں تشریف لاتے ہیں۔ اختر صاحب کھڑے ہو جاتے ہیں اور بہت تعظیم و تکریم کے ساتھ اُنھیں بٹھاتے ہیں۔ اختر صاحب اس وقت کوئی کلاس لے رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا تو فوراً کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کیا، آرام کرسی پر جگہ دی اور دریافت کیا۔

"کہئے جمیل بھائی...." ابھی اختر صاحب نے اپنا جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ علامہ نے اُن کی بات کاٹ کر کہا۔ "اختر صاحب میرا استعفا لے لیجئے۔" اختر صاحب سمجھ گئے کہ ہم لوگوں کی نااہلیوں نے انھیں کبیدہ خاطر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی دریافت کیا۔

"کیوں خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت کیا اب میں ان جاہلوں اور نااہلوں کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ کسی میں بھی اتنی توفیق نہیں کہ دو روپے کی کتاب خرید لے۔" علامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جیسے رو پڑیں گے۔ اختر صاحب نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم لوگوں کی نااہلی پر ایک لکچر دے ڈالا۔

"ابھی میں اِن مردودوں کو بلواتا ہوں۔ بڑی نالائق ہے جمیل بھائی یہ قوم، اب ہم لوگوں کو ضرورت ہے کہ یونیورسٹی میں بھی اِن نالائقوں کے لئے چھڑی رکھیں کیونکہ بغیر اس کے یہ نامعقول سدھرنے والے نہیں اور نہ جانے کیا کیا۔ پھر ایک صاحب کو بھیجا کہ ہم لوگوں کو بلا لائیں۔ ہم لوگ جب اختر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو جمیل مظہری کی برہمی ایک حد تک ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اختر صاحب ظاہرا طور پر زیادہ برہم نظر آئے۔ ہم لوگوں کے آتے ہی اختر صاحب نے کہا۔

"آپ لوگوں کے لئے اب چھڑی کا انتظام ہوگا اور جو صاحب کتاب وغیرہ نہیں لانے کی نامعقول حرکت کریں گے اُن کی گُندی ہوگی۔ آپ لوگ جمیل بھائی سے معافی مانگئے اور فوراً یہاں سے دفع ہو جائیے۔" ہم لوگوں نے معافی بھی مانگی اور دفع بھی ہوئے لیکن دروازے کے باہر کھڑے ہو کر جب ہم لوگوں نے سنا تو علامہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"کیا کروں اختر صاحب میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔

میں انھیں اپنا بچہ سمجھتا ہوں ہے۔ یہ سُن کر یقیناً اختر صاحب کی آنکھیں بھی بھر آئی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے دیکھا تو ہمارے تمام دوست دم بخود کھڑے تھے اور سب کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور سب اپنے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے اِس واقعہ کا کوئی اثر نہیں لیا۔ حالانکہ سب دھوکے میں تھے۔ سب کمزور تھے۔ کسی میں برداشت کی قوت نہیں تھی۔ یہ تھی جمیل مظہری کے خلوص اور محبت کی ایک ہلکی سی جھلک۔ ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ جنھیں پیش کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ اِس صنعتی اور مشینی دور میں جب اخلاقی قدریں محض کتابوں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں، جہاں سماجی اور معاشی افراتفری نے انسان کو انسان سے الگ کر دیا ہے، اُن کے درمیان خود غرضی اور چاپلوسی کی دیوار حائل کر دی ہے جمیل مظہری کی یہ بے لوث محبت، خلوص اور ایثار ہمارے لئے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں تو ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پایا ہوں کہ علامہ عظیم ہیں یا اُن کا فن لیکن مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ یہ دونوں چیزیں عظیم ہیں۔ جمیل مظہری کی شخصیت اُن کے فن میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم اُن کے فن میں اُن کی زندگی کو متحرک اور رواں دواں دیکھتے ہیں۔ علامہ کا دل دوسروں کی تکلیف اور مصائب کو دیکھ کر رو پڑتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کا دُکھ اپنے اندر جذب کر لیں۔ وہ وشنو کی طرح زندگی کے سارے زہر کو اپنے حلق میں اُتار لینا چاہتے ہیں تاکہ دوسروں کو امرت مل سکے۔ وشنو نے تو صرف ایک بار زہر پیا تھا۔ لیکن وہ اب تک نہ جانے زہر کے کتنے پیالے اپنے حلق سے اُتار چکے ہیں۔ مگر یہ دنیا اب بھی اُنھیں زہر کا تلخ جام دیتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اُن کی زندگی بھی ایثار اور قربانی سے بنی ہے۔ قدم قدم پر اُنھوں نے ایثار اور قربانی سے کام لیا۔ انھیں اگر شکوہ ہے تو خدا سے جس نے دنیا میں اس قدر دُکھ، درد اور مصائب کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کی صرف ایک غلطی کی سزا اتنی سخت دی ہے

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیلؔ اپنے خدا سے
منکر میں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا

دنیا کے آلام و مصائب، نا انصافیاں اور جبر و اختیار کو دیکھ کر وہ انکار اور اقرار کی کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

بچہ ترا نزع میں سسکتا ہوتا
پھر اس نے بلک بلک کے مانگا ہوتا
اُس وقت غرورِ کبریائی تیرا
تخلیق کی لعنتوں کو سمجھا ہوتا

میں یہ نہیں کہتا کہ سویرا کر دے
دو کام میں ایک کام میرا کر دے
یا روشنی تیز کر کہ کچھ دیکھ سکیں
یا اور بھی گھنگھور اندھیرا کر دے

کیسا پہ وہ جمیلؔ کیسا جلوا
دیتا رہا تیرگی کو دھوکا جلوا
گہرے ہوتے گئے حجاباتِ فریب
چِلّاتی رہی نظر کہ جلوا جلوا

یہ وہ منزل ہے جسے ہم تشکیک کی منزل کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے اِس تشکیک کے بعد یقین کی منزل آئے لیکن انھیں تو اپنی گمرہی پر ناز ہے کیونکہ یہی اُنھیں منزل تک پہنچاتی ہے، جہاں ان کا ہر نقشِ پا ایک تاریخ مرتب کرتا جاتا ہے

گمراہیوں سے ہو کر ہے راستہ ہمارا
تاریخ بن رہا ہے ہر نقشِ پا ہمارا

اُنھوں نے رنگ و بو کے فریب بھی کھائے ہیں اور سراب کی پرستش بھی کی ہے لیکن اِس فریبِ رنگ و بو اور پرستشِ سراب نے اُنھیں منزل سے قریب بھی کیا ہے

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے، سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آ رہا ہوں

جمیل مظہری کی شاعری مشاہدات و تصورات کی حسین ہم آہنگی ہے۔ جہاں پہنچ کر اُن کی نگاہوں میں دونوں جہان کی وسعتیں بھی تنگ ہو جاتی ہیں۔ ان کی عقل

ہم پرستش قیود کو اٹھا چکا ہے۔ جہاں پہنچ کر اُن کا فن روح کی ایک کیفیت بن کر نکھر آتا ہے ؎

میری نظر میں شاعری روح کی ایک کیفیت
تیری نظر میں شاعری لفظوں کے کچھ تکلفات
میرے لئے خودی کی موت عشق کا جذبۂ ذلیل
تیرے لئے خدا کا بھید کوئے بتاں کے واردات
شورشِ روح اور ہے کیفِ شباب اور ہے
میری شراب اور ہے تیری شراب اور ہے

تیرگی سے محبت اُن کی فطرت نہیں بلکہ پروانوں کے انجام نے انھیں الفتِ تیرگی پر مجبور کیا ؎

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے
خود انھیں سے بناتی ہے زندگی کے مزاج
وہ تجربے جو میسر ہیں گمرہی سے مجھے

جمیلؔ مظہری کی شاعری میں ہمیں عزم اور تلقینِ عزم کا بھی احساس ہوتا ہے جہاں وہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں ؎

مزدور کے نغموں سے سنکتی ہیں ہوائیں
تیشے سے رجز کے جو نکلتی ہیں صدائیں
بلتی ہیں فضائیں
ساتھ ان کے دھڑکتا ہے دلِ کون و مکاں چل
اے مردِ جواں چل
عالم کی ہوا آج جنوں خیز ہے تجھ سے
تاریخ کی رفتار کہیں تیز ہے تجھ سے
مہمیز ہے تجھ سے
لے عزم کے ہاتھوں میں زمانے کی عناں چل
اے مردِ جواں چل

یا پھر یہ ؎

سینوں میں طوفاں جو اٹھائے اک عزم بتیاب
بہہ جائیں جذبات کی رَو میں قلعوں کے گرداب
من کی گرتی اُٹھتی موجیں بن جائیں سیلاب
اور سیلاب کا بڑھتا پانی دنیا کو لے گھیر

وقت کا دھارا پھیرنے والے وقت کا دھارا پھیر

نئے ادب کی زبان میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے اُس سے اُردو کی جدید شاعری کے میلان کی نشان دہی ہوتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بہت اونچا غبارِ راہِ امکاں کر دیا ہم نے
بلندی کو قریبِ ذہنِ انساں کر دیا ہم نے
شبِ غم کی سیاہی سے فسانہ لکھ کے ہستی کا
تمنائے سحر کو زیبِ عنواں کر دیا ہم نے
حقائق کے صنم گر گر پڑے طاقِ توہم سے
خرد کے سارے بت خانوں کو ویراں کر دیا ہم نے

رجعت پرست ذہنیت جن توہمات اور فرسودگی میں مبتلا تھی وہ ادب اور فن کو پستی کی جانب لے جا رہی تھی۔ لیکن جدید اور ترقی پسند ذہن نے اسے اس فرسودگی سے نکالا اور نئی منزل کی راہ دکھائی۔ جمیلؔ مظہری کی شاعری بھی اس فرسودگی، روایت پرستی اور توہمات کے خلاف ایک جنگ ہے اور اس جنگ میں فتح بھی اُن کی ہوئی۔

جمیلؔ مظہری کی شاعری میں جس رومانی اور جمالیاتی کیفیت کو حسین اور فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اُس کی مثال اُردو کی جدید شاعری میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ جمیلؔ کا ذہن شباب و رومان کے سرچشموں سے سرشار نظر آتا ہے ؎

سرکتی ہیں چہرے سے زلفیں کسی کی
ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی
کہیں دل نے چھیڑا ہے سازِ محبت
سنو آ رہی ہے صدا بانسری کی
جو بُو تیری زلفوں کی آتی نہیں ہے
چمن میں کلی مسکراتی نہیں ہے
تری جستجو میں ہیں گنگا کی موجیں
کہ تو آب نہانے کو آتی نہیں ہے
سامنے آئینہ ہے اور محوِ خود آرائی ہیں
خود تماشا بھی ہیں اور خود ہی تماشائی ہیں
دل ہے آئینہ کا اور مشقِ جفا عید کے دن
زلف پُر پیچ ہے شانے سے جدا عید کے دن

"یہ کیا ہوا تم کو" اور "ڈرو خدا سے ڈرو" جمیل مظہری کی شاہکار نظمیں ہیں۔ جن میں انھوں نے دل کی انتہائی کشمکش کو فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ اردو کی رومانی شاعری میں اِن دو نظموں کا مقام سب سے بلند ہے۔ کیونکہ ان میں جن تجربات اور کیفیات کو پیش کیا گیا ہے وہ اندرونی محسوسات کی بہترین ترجمان ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کا اپنا دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

یہ کیا ہوا مری عذرا یہ کیا ہُوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدارا یہ کیا ہُوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو۔ یہ کیا ہوا تم کو

تمھاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بیدلی ٹپکتی ہے
رُخِ اسعرف ہے مگر بیرخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے کہ جو پاکر نہ پا سکا تم کو۔ یہ کیا ہوا تم کو

یہ کیا عتاب ہے اشکِ جفا تو کرنے دو
خلوصِ عشق کے سجدے ادا تو کرنے دو
گناہگارِ دفا کو وفا تو کرنے دو
پر لئے درد کا احساس دے خدا تم کو۔ یہ کیا ہوا تم

لبوں پہ مُہر سہی ابروؤں سے کام تو لو
میں جا رہا ہوں مرا آخری سلام تو لو
ان آنسوؤں میں جو غلطاں ہے وہ پیام تو لو
مسافروں سے کدورت نہیں روا تم کو۔ یہ کیا ہوا تم کو

پھر تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے ؎

سُنو جمیل سُنو تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سو نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
یلے جنوں نہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

یہ تم جو مجھکو تصور میں پیار کرتے رہو
جو نام لیکے مرا آہ سرد بھرتے ہو
تمھیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ گزرتے ہو
نہ جذبِ دل کو بڑھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

محبت کی نفسیات کی کس قدر اچھوتی اور متحرک تصویر ملتی ہے اس بند میں دیکھئے ؎

اِدھر اُدھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

ہندوستانی مسلمان گھرانے کی کتنی دلفریب اور سچی تصویر ملتی ہے ملاحظہ کیجئے ؎

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دِوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

اور یہاں تو جذبات نگاری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے ؎

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمھیں خدا کی قسم
شکستہ حالیِ عذرا تجھے میوفا کی قسم
جو جل رہی ہو ستارہ کہ اس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

اِن دو نظموں نے اردو کی رومانی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو نظمیں اردو کی رومانی شاعری کی آبرو ہیں۔

جمیل مظہری کی شاعری میں عام ترقی پسند شاعروں کی طرح پروپگنڈے بازی نہیں ملتی اور نہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کسی سیاسی مسلک ہی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں جنھیں اپنے فن سے خلوص ہے اور جو سارے بنی نوعِ انسان کی فلاح کے متمنی ہیں۔ ان کے یہاں جو انقلاب کی گونج ہے اس میں بھی ہمیں انسانی دل کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں۔ جہاں وہ کاروانِ حیات کو سرگرمِ عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی رومانی شاعری میں بھی ہمیں اُن کے دل کی کسک ملتی ہے جو جذبے کی تیز آنچ پاکر اور نکھر آتی ہے۔ جذبات کی تصویر کشی جس فن کارانہ انداز میں انھوں نے کی ہے اردو کے بہت کم شاعر اس تک پہنچ سکے ہیں۔ اُن کی شاعری کی جان اُن کا فلسفیانہ شعور ہے

[illegible] فلسفی نہیں کہتے۔ لیکن حیات کو جس نظر سے انھوں نے دیکھا ہے اور زندگی کی تفسیر جس طور پر انھوں نے کی ہے وہ ان کے فلسفیانہ شعور کا احساس دلانے کے لئے کافی ہے۔ خدا کا جو تصور ہمیں سب سے پہلے غالب کے یہاں نظر آتا ہے وہی تصور زیادہ واضح طور پر جمیل مظہری کی شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو ایک عرصہ سے خوف اور لالچ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا اُسے سب سے پہلے غالب نے اُٹھانے کی جرأت کی اور اقبال نے غالب سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا ؎

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

لیکن جمیل مظہری نے یہ کہہ کر ایک اور جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے ؎

بچہ ترا نزع میں سسکتا ہوتا
کچھ اُس نے بلک بلک کے مانگا ہوتا
اُس وقت غرورِ کبریائی تیرا
تخلیق کی لعنتوں کو سمجھا ہوتا

اور پھر یہ کہ ؎

مضراب سے تیری حالتِ زار سنی
شیشے سے صدائے سنگ انداز سنی
ٹوٹا جو مرا ساغرِ مے کل رات
میں نے اک قہقہے کی آواز سنی

جمیل مظہری کی سادگی میں خودی کا زبردست جذبہ کارفرما ہے ؎

جس در پہ محبت جھکتی ہے لے چلئے جمیل اس در پہ مجھے
جس در پہ ضرورت جھکتی ہو اُس در پہ سجدا کون کرے

اور اس کی انتہا دیکھئے ؎

لئے پھرتے ہیں جمیل اپنی جبیں میں سجدے
ایک بُت بھی نہیں ایسا کہ خدا جس کو کہیں

جمیل مظہری کی شاعری میں جو رچا ہوا فلسفیانہ شعور ملتا ہے وہ جدید دور کے شعراء میں کمیاب ہے۔ انھوں نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے وہ اُن کا منفرد اندازِ نظر ہے۔ جہاں ہمیں کہیں روحانیت کی لطیف چاشنی ملتی ہے اور کہیں اضطراب کی ہلکی ہلکی تپش، کہیں فلسفیانہ اندازِ نظر ہے تو کہیں تشنگی کا زبردست احساس۔ کہیں عقل و عشق کی معرکہ آرائی ہے تو کہیں حُسن کی دلآویزی۔ گویا جمیل مظہری کی شاعری ایک چمنستانِ ہزار رنگ ہے۔ جس میں مختلف قسم کے پھولوں کی حسین اور دلفریب روشیں سجائی گئی ہیں اور جب کوئی اس چمنستانِ ہزار رنگ کی جانب سیر کرنے کو نکل جاتا ہے تو اس کی طبیعت نہیں بھرتی اور یہ سیرِ گلستاں اُس کی تشنگی کو اور بڑھا دیتی ہے۔

اعجاز صدیقی

اپنی دھرتی اپنے گیت

(آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ۱۴؍ اگست ۱۹۷۵ء کی شب میں نشر کی گئی)

(۱)

ہاتھ اپنے ہیں، زمین اپنی ہے، قبضہ اپنا
وادیاں اپنی ہیں، باغ اپنے ہیں، بَن اپنے ہیں
آبشاروں کے مدھر راگ ہیں اپنے ہی لئے
گنگناتے ہوئے یہ گنگ و جمن اپنے ہیں
ڈالی ڈالی پہ ہیں اپنی ہی بہاریں رقصاں
اپنے ہی غنچہ و گل، سرو و سمن اپنے ہیں
اب کسی کی ہمیں تقلید گوارا کیوں ہو؟
ریت اپنی ہے، ڈگر اپنی، چلن اپنے ہیں
کوئی پہرہ بھی نہیں نطق و بیاں پر اب تو
قلم اپنے ہیں، زباں اپنی، سخن اپنے ہیں
میکدے اپنے ہیں، جام اپنے، صراحی اپنی
اور سب بادہ گسارانِ وطن اپنے ہیں
قوم کی قوم ہے سرشارِ مئے آزادی!

(۲)

پھول کی چاہ میں، کانٹوں پہ زبانیں رکھ دیں
باغ کے عشق میں، زنداں سے نہ ہم گھبرائے
اپنی دھرتی سے دیا ہے وہ محبت کا ثبوت
سینہ چاکانِ وفا، دہر میں ہم کہلائے
مسکراتے ہوئے ہم دار و رسن تک پہنچے
تیر زہر آب میں ڈوبے ہوئے ہم نے کھائے
موڑ کر پنجۂ شاہی کو رہے بالآخر
ظلم ہوتے ہی رہے اور ستم ڈھائے
نہ کسی جبر سے خوابوں کا تسلسل ٹوٹا
نہ تشدد نے ارادوں کے قدم پلٹائے
پتھروں پر جو پڑیں آکے، تو پس کر رہ جائیں
آسماں جن کو اٹھالے تو زمیں بن جائے
سختیاں ہم نے وہ جھیلی ہیں، تب آزادی!

(۳)

یہ وطن، جس کو غلامی سے دلائی تھی نجات
آج اسی کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں ہم
اختلافات کے باوصف، رہے یک جہتی!
ایک ہی ساز سے نکلی ہوئی آواز ہیں ہم
ہر اندھیرے کو اجالے سے بدل ڈالیں گے
ہم ہیں وہ نور کے خالق، وہ سحر ساز ہیں ہم
وجہِ نازش ہے ہمارے لئے یہ ارضِ وطن
اور اس کے لئے خود باعثِ صد ناز ہیں ہم
یہ نہ سمجھے کوئی، پیچھے ہیں کسی سے ہم لوگ
ارتقا کی ہے خبر، مائلِ پرواز ہیں ہم
کل بھی تحریکِ قومی کا صلہ پائیں گے
آج بھی اس سے اثر گیر و سرافراز ہیں ہم
لے کر آئی تھی جو انعام بہت، آزادی!

(افسانہ)

شہاب اثروی

پرانا اور نیا ہندوستان

اپنے دفتر سے نکل کر چونگی کے قریب بس اسٹینڈ پر لالہ جی چھتری بغل میں دبائے، اپنی آنکھوں پر چشمہ اور جسم کو لونگ کوٹ میں چھپائے ہوئے بس کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کے قریب سے تین لڑکیاں سرسراتی ہوئی گزر کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور پھر اُن میں سے ایک نے کسی قدر تیز آواز میں ناشپاتی کی طرح پھوٹتے ہوئے کہا۔

"پرانا ہندوستان ——"

معًا لالہ جی کی نگاہیں پلٹ کے اُس سہ منزلہ عمارت کی طرف منتقل ہوگئیں جو شیر شاہ سوری کے عہدِ حکومت میں کسی نواب نے اپنی داشتہ کے لئے بنوائی تھی اور جو اب خستہ ہو کے کھنڈر بن رہی تھی ——

"عمارت پر نصب کی ہوئی دوربین بڑی شاندار ہے ——" دوسری کھلکھلا اُٹھی، اور یکایک لالہ جی کا پختہ دماغ حالات کی گہرائیوں میں اُتر کے ٹھہر گیا۔ اُترتی اور گھومتی ہوئی نگاہیں اُن لڑکیوں کو حلقے میں لے کر ٹھہر گئیں، ذہن میں اُن کے ایک شعلہ سا لپکا اور اُن کا چہرہ اُس شعلے کی حدت سے لہک اُٹھا ——

"مجھے تو وہ آدمی ہی دکھائی نہیں پڑتا ——" تیسری نے کہا۔

"تو پھر وہ ہے کیا بلا؟ ——" پہلی نے پوچھا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکیاں اُس کے متعلق مزید اظہارِ خیال کرتیں اسٹینڈ پر بس آکر رُک گئی، لالہ جی جوں ہی اپنے خیال سے اُبھر کر بس میں سوار ہونے کے لئے بڑھے، وہ تینوں لڑکیاں بار بار اُن کی طرف بڑھیں اور لالہ جی کا ہاتھ جو کہ بس کے ہینڈل کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اُن کے ریلے سے چھوٹ گیا اور وہ تینوں بس میں سوار ہو کے بڑی سنجیدگی سے ایک زبان ہو کے بولیں۔

"پرانا ہندوستان ——"

لالہ جی ٹائم بم کی طرح یکایک پھٹ پڑے۔

"پرانا ہندوستان بہرصورت بہت اچھا تھا، شرافت تھی، تمیز تھی، غیرت تھی، حیا تھی، انسانیت تھی ——"

"کیا تنہا سے باتیں کر رہے ہو لالہ جی؟ ——" اُن کے بچپن کے ساتھی مرزا جی نے اُن کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —— "پہلی بس چھوٹ گئی؟ ——"

"ہاں چھوٹ گئی ——" لالہ جی جھلائے ہوئے تھے۔

"آج تو خیر، بارش بھی ہوئی ہے اور ہوائیں بھی سرد چل رہی ہیں۔ پھر تم گرم کیوں ہو؟ ——" مرزا جی نے پوچھا۔

گرم کیا ہو گیا ہوں ۔۔" لالہ جی نے [illegible] انداز میں کہا ۔" تم ایمان داری سے جواب دو کہ کیا میں کچھ نابینا سا دکھائی دیتا ہوں ۔۔"

مرزا جی ہنس پڑے ۔
"میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں ۔۔"
"پھر بات کیا ہوئی ۔۔"

"یہی تو بات ہے کہ کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور پرانی ہوا کی نئی بیٹیوں نے مجھ پر پرانے ہندوستان کا لیبل لگا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے بس میں سوار ہونے بھی نہیں دیا ۔"

اور ابھی مرزا جی کچھ کہنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری بس آگئی اور وہ دونوں بس میں سوار ہو کے پارک سرکس پہنچ گئے ۔ مرزا جی کو اپنے ساتھی افضل بیگ سے ملنا تھا ۔ اور جب وہ جانے لگے تو انھوں نے لالہ جی سے کہا ۔

"افضل بیگ کو تو تم بھی جانتے ہو، ساتھ کیوں نہیں چلتے ۔"
"دیر ہو جائے گی، اور ناحق تمہاری بھابی پریشان ہوں گی ۔۔"
"صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ اب تک تم بھابی سے ڈرتے ہو ۔" مرزا جی مسکرائے ۔
"صرف تمہاری بھابی سے نہیں، آج سے ہر عورت سے ڈرنے لگا ہوں ۔۔" لالہ جی نے کہا ۔ "خیر چلو، افضل بیگ سے مل لیا جائے ۔۔"

اور جب وہ دونوں افضل بیگ کے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئے تو پائیں باغ کے متصل افضل بیگ کی لڑکیاں اور اُن کی سہیلیاں اسپورٹس شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں، لالہ جی نے دُور ہی سے دیکھ کے مرزا جی سے پوچھا ۔

"افضل بیگ بڑھاپے میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں کیا ؟ ۔۔"
"نہیں بھئی، ان کی لڑکیاں کھیل رہی ہیں ۔۔"
"کیا مذاق کرتے ہو، تم سمجھتے ہو کہ مجھے دُور سے بالکل نہیں دکھائی دیتا، ہاں یہ ضروری ہے کہ صاف دکھائی نہیں دیتا مگر میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی پینٹ اور اسپورٹس شرٹ پہنے بیڈمنٹن کھیل رہا ہے اور وہ لڑکیاں نہیں ہو سکتیں ۔۔"

"لڑکیاں کیوں نہیں ہو سکتیں ؟ ۔۔"
"لڑکیاں ہو سکتی ہیں پر ہندوستانی نہیں ۔" لالہ جی چل کے جب کچھ اور قریب پہنچ گئے تو بڑبڑائے ۔" ہاں بھئی لڑکیاں بھی ہیں اور ہندوستانی بھی ۔۔"
"پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہوئی ؟ ۔"
"عجیب ہو مرزا جی، تمہارا دماغ بھی شاید ایرپورٹ پر رہنے کی وجہ سے بدیشی ہواؤں کی لہروں سے بہت ایڈوانس ہو گیا ہے ۔۔" لالہ جی نے کہا ۔" یہ کھلی ہوئی رانیں، لہراتے ہوئے بال، بازوؤں کے حلقے، اور کیا کہوں، آگے بے ادبی ہے، کہیں ایسا ہم نے پرانی مشرقی تہذیب کے گہوارے میں پلی ہوئی عورتوں میں دیکھا تھا یا کتابوں میں تذکرہ ہی پڑھا تھا ۔۔"
"پھر برائی کیا ہوئی اِن میں ؟ ۔۔"
"بظاہر تو کچھ نہیں، پر اگر غور کرو تو ہزاروں ہیں ۔۔" لالہ جی نے کہا ۔" میں سمجھتا ہوں کہ حیا کے بغیر عورت

مٹی کے کھلونے کے سوا کچھ بھی نہیں —"

لالہ جی جب پیڈ منٹن کورٹ کے کچھ اور قریب پہنچ گئے تو یکا یک تقریباً اچھل سے پڑے اور مرزا جی کا بازو زور زور سے تھامتے ہوئے بولے۔

"بالکل وہی، سو فی صدی وہی —"

"کیا وہی؟ —"

"پرانے ہندوستان پر نئی عمارتیں —"

"کیا یہ وہی لڑکیاں ہیں؟ —"

"نہیں جی، یہ لڑکیاں کب ہیں، یہ تو عالیشان عمارتیں ہیں، ایسی عمارتیں ہیں کہ ان پر جب چاہو جیسا رنگ چڑھا لو۔"

"دھیرے بولو لالہ، کہیں وہ سن نہ لیں —" مرزا نے ٹوکا۔

"عجیب تم احمق ہو، دیکھتے نہیں کہ یہ آل پروف ہیں —" وہ مسکرائے پھر دھیرے دھیرے مرزا جی کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کے افضل بیگ کے قریب پہنچ گئے۔ صوفے پر دھنس کے جب باتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو افضل بیگ نے لالہ جی سے پوچھا۔

"تمھاری لڑکیاں پڑھ رہی ہیں نا؟ —"

"جی ہاں، اُن کی ماں روز انھیں رامائن اور گیتا کا پاٹھ پڑھاتی ہیں —"

"اسکول اور کالج میں تم نے تعلیم نہیں دلائی —"

"جی نہیں —"

"کیوں —؟"

"میں اور میری بیوی دونوں پرانے خیالات کے ہیں اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کو گھرداری کی تعلیم دینا کالج اور اسکول کی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے۔"

"وہ تو میں مانتا ہوں لیکن کالج اور اسکول کی تعلیم کے بغیر لڑکیاں اپنے حقوق اور فرائض سے پوچھو تو غافل رہتی ہیں۔" افضل بیگ نے کہا۔ "میں تو گھرداری کی تعلیم کے ساتھ اسکول اور کالج کی تعلیم بھی لڑکیوں کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔"

لالہ جی اپنے نظریئے کی وضاحت میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ سکے اور کچھ دیر تک خاموش بیٹھے کے جب وہ واپس ہونے والے ہی تھے کہ وہ چاروں لڑکیاں پیڈ منٹن کے ریکیٹوں کو جھلاتی ہوئی برآمدے میں آئیں اور اُن میں سے ایک نے افضل بیگ کے قریب پہنچ کر بڑی بے باکی سے لالہ جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ حضرت ضرور میری شکایت کرنے آئے ہیں، پر ڈیڈی آپ ہی انصاف سے کہئے کہ یہ اپنی موجودہ ہیئت سے کیا پرانا ہندوستان دکھائی نہیں دیتے ہیں؟ —"

"تمھیں تو پرانا ہندوستان ہی دکھائی دیتے ہیں اور میں تو انھیں دلّی کا پرانا قلعہ سمجھتا ہوں۔" مرزا جی نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں اور وضع قطع ایسی بنائے رکھتے ہیں جیسے کسی نواب کے دادا کے وقت کے پٹواری ہوں —"

لالہ جی نے بڑے غور سے مرزا جی کو دیکھا۔

"کہاں ملازم ہیں؟"

"اُس دفتر میں جہاں روپے برستے ہیں —" مرزا جی نے کہا — "کسٹم دفتر کے یہ بڑے بابو ہیں۔"

"تب تو لالہ جی آپ کی تو پرانی جان پہچان ہے —" لڑکی نے کہا — "اس سماجی رشتے سے میں آپ کی عزیز ہوئی نا —"

"بے شک، بے شک —" لالہ جی نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟ —"

"ایک کیا ہزار پوچھو؟ —"

"ماہانہ آپ کتنا کما لیتے ہیں؟ —"

"جو تم جاننا چاہتی ہو وہ وضاحت سے میں تمہیں بتاتا ہوں —" لالہ جی کہنے لگے — "تم مجھے پرانا ہندوستان سمجھ یا پرانا قلعہ پر سچ کہتا ہوں کہ آج سے سترہ سال قبل یہ لونگ کوٹ میں نے بنوایا تھا جبکہ میرے دو بچے تھے اور میں ماہانہ دو سو روپے پاتا تھا۔ آج میں چار سو روپے ماہانہ پا رہا ہوں، پر حد درجہ تنگ حال ہوں، حتیٰ کہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں دشواریاں حائل ہیں۔ اب تم سوچو گی کہ جب تم کے دفتر میں سونا برستا ہے تو میں مزید فیض یاب ہوتا ہوں گا۔ پر سچ کہتا ہوں کہ میں سب کچھ دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں پر فیض یاب نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ نہیں کہ فیض یاب ہونے کا اہل نہیں، اہل بھی ہوں پر کیا کروں کہ پرانے وقتوں کا ہوں، اس دور کا جب کہ حرام کی کمائی کو سب سے بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا —"

"آپ جب پاپ سمجھتے ہیں تو اس پاپ کو روکتے کیوں نہیں؟ —"

"عجیب بات کرتی ہو تم بھی بیٹی —" لالہ جی نے کہا — "کیا نوکری چھوڑ دوں؟ —"

"میں نوکری چھوڑنے کے لئے کب کہتی ہوں —"

"بات ایک ہی ہوئی —" لالہ جی نے کہا — "اب ہر شخص پر نئے ہندوستان کا رنگ چڑھا ہوا ہے، خواہ وہ معمولی کلرک ہو یا بڑا افسر۔ ایک بار اس پاپ کو جب میں نے اپنے دفتر سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی تو جانتی ہو کیا ہوا تھا؟ —"

"کیا ہوا تھا؟ —"

"بڑے افسر کے رویے میں یکایک انقلاب آگیا تھا۔ بات بات پر مجھ سے جھلانے لگا، الجھنے لگا۔ میں نے بہت غور کیا، سب کام حسبِ معمول ہو رہا تھا۔ صرف پاپ بند ہو گیا تھا اور میرے خیال سے یہ بڑی اچھی بات ہوئی تھی، میں نے لاکھ اپنی غلطی پر غور کیا، پر کچھ سمجھ نہیں آیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کئی دنوں کے بعد جب دفتر کے چند ساتھی مجھ سے ملے تو افسر کے جھلانے کی وجہ اور اپنی غلطی سمجھ میں آگئی —"

"کیا غلطی آپ نے کی تھی؟ —"

"سونے کا برسنا جو بند کر دیا تھا —" لالہ جی نے کہا — "میں نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں، افسر بھی خوش ہو گیا، ساتھی بھی نہال ہو گئے، یہ ہے تمہارا ترقی یافتہ نیا ہندوستان بیٹی جہاں سب کچھ ہے پر ایمان داری نہیں ہے اور ہمارے پرانے ہندوستان میں کچھ نہیں تھا پر ایمانداری عام تھی بیٹی —"

"نئے ہندوستان کو پرانے ہندوستان کی ایمانداری اپنانی ہی ہو گی —" روحی نے کہا — "کل میں آپ کے دفتر میں بڑے افسر کا چارج لوں گی —"

"سچ، تم چارج لو گی؟ —" لالہ جی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں لالہ جی —" افضل بیگ نے کہا — "روحی کی وہیں پوسٹنگ ہوئی ہے —"

"تب تو سب چوپٹ ہو گیا —" لالہ جی افسردگی سے بولے — "بات بات پر پرانا ہندوستان سُن کے تو شاید میں پاگل ہو جاؤں گا —" اور لالہ جی کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"میں تو پرانے ہندوستان کی ایمانداری کے آگے سر جھکا لوں گی —" روحی نے کہا۔

"تب یقین کرو کہ کل سے ہمارے دفتر میں سونا برسنا بند ہو جائے گا اور وہ سونا نکل کر تجوری میں بند ہو کے نئے ہندوستان کا [illegible]

عبدالکریم شمس

غزل

ترے التفات سے جانِ جاں، ترا درد مجھ کو عزیز ہے
تری ذات ہے بڑی محترم تو بڑے پیار کی چیز ہے

ترے آستاں کی تلاش میں تری رہگذر پہ پہنچ گیا
کہ مری جبینِ نیاز کو ترا نقشِ پا بھی عزیز ہے

یہ نوا و نکہت و رنگ و بو ترے در کے ادنیٰ غلام ہیں
یہ نسیمِ گل بھی شہِ چمن، ترے آستاں کی کنیز ہے

میں حرم کا جادہ شناس ہوں مری راہ میں ہیں صنم کدے
تو خرامِ ناز کا معترف مجھے نیک و بد کی تمیز ہے

سنو سرو و گل کے محافظو، یہاں دشت بھی ہیں سموم بھی
مرے آبلوں کو مگر ابھی رہِ خارزار عزیز ہے

یہ صعوبتیں، یہ اذیتیں، یہ رقابتیں، یہ کدورتیں
کبھی آشکار نہ ہو سکیں کہ دوئی کا پردہ دبیز ہے

یہ دل و نگاہ کی خستگی، یہ گُل و شجر کی فسردگی
ہے کشادگی مرے ظرف میں کہ یہی دیار کی چیز ہے

علیمہ اختر مظفرنگری

غزل

(مسلسل)

یاد آئی ہے تو کیا بادہ بہ جام آئی ہے
لے کے اُن مست نگاہوں کا سلام آئی ہے

ناز و انداز میں کیفیتِ تمکین و حیا
بن کے آغازِ محبت کا پیام آئی ہے

خلوتِ شوق میں اک صبحِ مسرت بن کر
زلف بردوش کوئی لیلیٰ شام آئی ہے

ایک اک انداز میں ہے جلوۂ صد رنگ حجاب
لے کے اک دعوتِ نظارۂ عام آئی ہے

کبھی گیتوں کا ترنم، کبھی آہنگِ غزل
بن کے اک کیفیتِ شوقِ تمام آئی ہے

جیسے رادھا کے مدھر راگ کی لے گیت کی تان
لے کے گوکل سے کنہیا کا پیام آئی ہے

گدگداتی ہوئی ہر راہ گذر کو گذری
شوخیاں کرتی ہوئی گام بہ گام آئی ہے

اُن کی بے خواب نگاہوں سے اُٹھا کر نیندیں
لے کے اک خواب کا تحفہ مرے نام آئی ہے

نازشِ انجمنِ ناز سے نسبت پا کر
مشک بو، عطر فشاں جانِ مشام آئی ہے

بڑھ کے لیتی ہے قدم رہگذرِ دل اختر
کیا دبے پاؤں کوئی مست خرام آئی ہے

احمد جمال پاشا

خوشامد میں آمد

جب قابلیت اور شرافت بھی کام نہ آئی اور اکڑ کے بھی دیکھ لیا کہ اس میں بھی سوائے مٹی پلید ہونے کے کچھ ہاتھ نہ آیا تو خوشامد پر اتر آئے۔ اس کے بعد تو ہم بھی مان گئے کہ سچ تو یہ ہے کہ ——————

خوشامد سے خدا بھی راضی ہے

کامیابی نے خود بڑھ کے ہمارے قدم چومے اور چاروں طرف ہم ہی ہم نظر آنے لگے۔

یہ سمجھ میں آنے کے بعد کہ خوشامد بھی ایک آرٹ ہے ہم نے طے کر لیا کہ اب ہم کو اس کا آرٹسٹ بلکہ خاص حالات میں کارٹونسٹ تک بننا ہے۔ آپ جانئے مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا۔ لہٰذا دو چار ہاتھ پیر مارنے کے بعد بحر خوشامد کے بہترین شناور اور غوطہ خور ہو گئے۔

کوئی کام بغیر محنت اور مستقل مزاجی کے نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا بھی اصول سمجھ میں آ گیا کہ محض اوپری دل سے خوشامد کرنے یا ایک آدھ بار للّو چپّو کرنے سے اسی طرح کام نہیں چلتا جس طرح سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ لہٰذا، میاں دنیا میں رہنا ہے تو سب سے جھک کر ملو، اس دنیا کو کنواں اور اپنے آپ کو پیاسا سمجھو، خود بہ نفس نفیس ہر کنوئیں تک پیاس بجھانے کے لئے جاؤ، جن لوگوں سے کام پڑ جائے ان کے پیچھے زمین کا گز بن جاؤ، بلکہ مستقل لگے رہو۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اگر خوشامد ہنر مندی سے نہ کی جائے تو ذلیل ہونے کی نوبت آ جاتی ہے اور لوگ خوشامدی ٹٹو سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے پیچھے بھی اگر برابر لگے رہو تو جلد ہی وہ آپ کی تمام خوبیاں مان لیتے ہیں۔ اور آپ میں ان کو دنیا کی اچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ خوشامد میں آمد کے لئے ہم نے بھی بڑی چلّہ کشی کی، گرگٹ کی طرح رنگ اور پیکیت کی طرح پینترے بدلے، ہمیشہ خیال رکھا کہ وار خالی نہ جانے پائے اور محنت میں بیٹھے بٹھائے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ جس کے لئے اصول بنایا کہ

خودی کو پست کر اتنا کہ ہر بندے سے خود آ کر
یہی پوچھا کرے ہر دم بتا تیری خوشی کیا ہے

یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے تو خودداری وغیرہ کے چکر میں پڑ کر بنا بنایا کیریر تباہ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ خوشامد میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب کہ بدتمیز سے بدتمیز، بدزبان سے بدزبان اور بددماغ سے بددماغ آدمی آخر میں آپ سے رام ہو کر آپ کا کلمہ پڑھنے لگے۔

اب اس سلسلے میں ہماری خوشامد میں کامیابی کا ایک واقعہ سننے کے بعد خود ہی انصاف سے کہیے کہ ہم اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔

[illegible] ایک اڈیٹر صاحب نئے نئے ہمارے اخبار پر نازل ہوئے۔ آدمی ایسے فرعون قسم کے صاحب بہادر کہ کبھی کوئی کام، کوئی بات پسند ہی نہ آئے، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑیں، ہر کام میں ہزاروں خامیاں نکالیں۔

ایک دن ہم سے بھی موصوف کا پالا پڑ گیا۔ چھوٹتے ہی بولے۔

"یہ حرام خوری ہو رہی ہے، ہمیشہ دیر سے آتے ہو، دفتر کو کلب بنا رکھا ہے، کام کے نام سے جان نکلتی ہے۔ نالائقی کی حد کر دی، ایک جملہ تک صحیح نہیں لکھ سکتے، خبریں بناتے ہو کہ گھاس چھیلتے ہو۔۔؟"

جب موصوف گرج برس چکے تو ہم نے چہرہ بھیگی بلی کی طرح مسکین بنا کر عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ انتہائی مؤدب ہو کر عرض کیا۔

"صاحب! اخبار کی قابلیت تو آپ پر ختم ہے۔" انھوں نے تقریباً آپے سے باہر ہوتے ہوئے گرج کر غضبناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے گھڑک کر کہا۔

"جی۔۔؟"

"جی ہاں! بڑے بڑے اڈیٹر دیکھے مگر یہ قابلیت کسی میں نہ پائی۔"

تقریباً دھتکارتے ہوئے کہا۔

"بس رہنے دو منھ دیکھی تعریف کو۔"

ہم نے سُنی اَن سُنی کر کے اُن پر سے قربان ہوتے ہوئے عرض کیا۔

"بس ایک بات دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اڈیٹر صاحب نے قہرناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ارشاد۔۔؟"

"حضور آپ کو ترجمہ کی باریکیوں پر حیرت انگیز حد تک عبور کیسے حاصل ہوا، واللہ لفظ نہیں لکھتے آپ نگینے جڑ دیتے ہیں۔ یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا۔؟ اِس میں تو صاحب آپ کا جواب نہیں۔"

اڈیٹر صاحب تقریباً شیشے میں اُترتے ہوئے اٹھلا کر بولے۔

"ایک ایک لفظ لکھنے کے لئے پوری پوری عبارت نہ جانے کتنی بار کاٹتا اور لکھتا تھا، الفاظ اور معنی کے سلسلے میں جانے کتنی ڈکشنریاں رٹیں تب کہیں یہ آرٹ آیا۔ بڑا ہم نے ریاض کیا ہے۔ قلم برداشتہ لکھنا مذاق نہیں۔۔"

ہم نے عمرِ عزیز مفت گنوانے پہ ماتم کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"بتائیے اب ہم اپنی جہالت کیسے دُور کریں، اگر شروع سے آپ کے نقشِ قدم پر چلے ہوتے تو آج آپ کی خدمت کے لائق ہوتے۔۔" بولے۔

"آپ کو ترجمہ کا فن سیکھنا چاہئے۔۔"

"حضور پھر آپ ہی فرمائیں کہ اس سلسلے میں اب کیا رُخ اختیار کیا جائے۔۔؟"

اُنھوں نے فوراً کچھ پیشہ ورانہ گُر اور بزنس آرٹ بتانے کے ساتھ بہت سی فنِ صحافت پر کتابیں اور ترجمہ کے سلسلے میں کچھ رسالے بتا دیئے۔

اب خوشامد کا یہ ٹھوس تیسری پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ہم نے وہ کتابیں اور رسالے اُسی دن چاٹ ڈالے۔ بلکہ گھول کر پی لئے۔

اس کے بعد اڈیٹر صاحب غیر ملکی دَورے پر جا رہے تھے۔ ہم نے بجائے ۵ پیسے کے گیارہ روپے کا ہار عنایت باندھ دیا۔

اور بیگم صاحبہ کی خیریت کے بہانے اُن کے گھر تحفے تحائف بھیجنا شروع کر دیے۔
موصوف جب دَورے سے واپس آئے تو ہمارا دَورہ دَورہ شروع ہو گیا۔ ہم پر اتنے مہربان ہو گئے تو پہلے تو ہم سے دفتر کے اہم معاملات میں مشورہ لینا شروع کیا، اُس کے بعد رفتہ رفتہ ایسے شیشے میں اُتر آئے کہ بغیر ہماری اجازت کے نہ قلم اُٹھاتے نہ کوئی حکم جاری کرتے۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے ہم اُن کی ناک کا بال ہو گئے۔
جب اڈیٹر صاحب پوری طور پر ہمارے قابو میں آ گئے تو ہم نے اُن سے بھی اُونچی پرواز کی، اور جن صاحب کے ہاتھ میں صاحب بہادر کی سزا اور جزا تھی اُن کو مٹھی میں لینا شروع کر دیا۔
بڑا صاحب پاگل آدمی، سوائے اکڑ فوں کے کچھ آتا نہ تھا۔ ایک دن ہمیں دیکھتے ہی بولا۔
"بتاؤ اِس وقت دن ہے یا رات؟"
عرض کیا۔
"جو حضور فرمادیں —"
بولے۔
"نہیں تم بتاؤ —"
"میری کیا مجال جو آپ کے سامنے زبان کھولوں —"
اِس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے صاحب کی رائے روز بروز ہمارے بارے میں بہتر اور ہمارے صاحب کے بارے میں بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن دفتری بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کی اُن رپورٹوں کی بنیاد پر جو ہم نے صاحب کے خلاف مع ثبوت بڑے صاحب کو فراہم کی تھیں اُن کی تنزلی اور ہماری ترقی ہو گئی۔
اب اپنے صاحب کے ہم صاحب ہیں اور وہ ہمارے ماتحت، لہٰذا ہم نہایت بے تکلفی سے اُنھیں گھُرکا کرتے ہیں اور وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف ہماری ڈانٹ ڈپٹ سُنتے ہیں بلکہ ہمارے مکھن بھی لگاتے ہیں تاکہ اِن کی بگڑی بنی رہے۔
وہ دن بھی اب دُور نہیں جب بڑے صاحب کے ہم صاحب ہوں گے اور وہ ہمارے ماتحت ہوں گے۔ اِسی طرح ہم خوشامد کی بدولت ترقی کے زینے طے کرتے رہیں گے۔
کبھی صاحب لوگ مُنھ کھولے، آنکھیں پھاڑے ہمیں ریشہ خطمی ہوتے دیکھا کرتے تھے اور آج ہم اِن کا، کارٹون دیکھا کرتے ہیں۔
اِس عظیم الشان کامیابی کے بعد اب ہمارا ارادہ، اِس فن پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ہے جو ہماری زندگی بھر کی مکھن بازی کے عملی تجربات کا نچوڑ ہوگی۔ اِس میں ہم دلائل و براہین سے ثابت کریں گے کہ دُنیا کا یہی دستور ہے کہ بغیر چکنی چپڑی باتیں بنائے کام نہیں چلتا، ہر جی روح کچھ نہ کچھ ٹیڑھا ضرور ہوتا ہے۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ سنک لازمی ہوتی ہے۔ مگر ایسے تمام آڑے ترچھے لوگ خوشامد سے بالکل سیدھے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر دُنیا میں کسی کو کچھ کرنا ہے تو اُسے اوّل نمبر کا حرام خور، کام چور، نوالہ حاضر، خوشامدی، لیچڑ، مصاحب، لیموں نچوڑ، جی حضوریا، مکھن لگانے اور روغنِ قاز ملنے کا بہترین ماہر ہونا چاہئے اور اُسے اُس وقت تک خوشامد میں انتہائی ثابت قدمی سے لگا رہنا چاہئے جب تک کہ موصوف پگھل کر پانی نہ ہو جائیں۔
ہمارے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے مطابق خوشامد کا سب پر اثر ہوتا ہے اور بالکل ایٹم بم کی طرح ہوتا ہے۔ یہی اُس کا کمال اور کلیہ کامیابی ہے۔ (بقیہ صفحہ ۹۳ پر دیکھئے)

نازش پرتاپگڈھی

چاندنی

یہ جھلاجھل سی فضائیں، یہ چھما چھم چاندنی
آہٹ آہٹ نغمگی ہے، عالم عالم چاندنی

تیز ہے جتنی خلش، اتنی ہی مدھم چاندنی
جانے کس جانب چلی لے کر مرا غم چاندنی

بے سبب احساس گرداں، بے ارادہ چاندنی
کتنا رنگیں ہے تخیّل، کتنی سادہ چاندنی

یہ فضا ہے جامِ رنگیں، جس میں بادہ چاندنی
کم ہوئی جاتی ہیں نظریں اور زیادہ چاندنی

دھیرے دھیرے جاگتا ہے جس طرح کوئی خیال
پھیلتی جاتی ہے یوں ہی رفتہ رفتہ چاندنی

منتظر نظروں میں آیا جانے کس کا جمال
ہوگئے تارے مؤدّب، دست بستہ چاندنی

رنگ روپ اپنا بدلتی جا رہی ہے چاندنی
سوزِ دل سے جیسے گلتی جا رہی ہے چاندنی

ایک سنّاٹا دیارِ روح میں پاتا ہوں میں
جانے کس کے پاس رکھ آئی ہے چھاگل چاندنی

سرسراہٹ، جھلملاہٹ، رنگ و نکہت۔ کچھ نہیں
ہوگئی ہو جیسے اِک بیوہ کا آنچل چاندنی

بھیک مانگوں بھی تو میں کس سے سکونِ زیست کی
اِک طرف بے چین دل، اک سمت بے کل چاندنی

کوئی آہٹ، کوئی نغمہ، کوئی پُراسرار لَے
کس کو یہ مقسوم ہوگا، کس کی یہ تقدیر ہے

میں، مرا احساسِ نازک اور مری تنہائیاں
ایک رنگیں جام۔ لیکن زہر ہے جس میں نہ مے

دھیرے دھیرے گم ہوا جاتا ہو جیسے رُوئے دوست
یوں سمٹتی جا رہی ہے رفتہ رفتہ چاندنی

جیسے درماندہ مسافر سوئے منزل ہو رَواں
اِس طرح طے کر رہی ہے اپنا رستہ چاندنی

چاند تھرّاتا ہے پیلے بادلوں سے کچھ اُدھر
صبح کے تارے سے لپٹی رو رہی ہے چاندنی
جلتے جاتے اور کچھ گہری ہوئی جاتی ہے رات
چلتے چلتے اور بھی بے بس ہو رہی ہے چاندنی

(افسانہ)

نسیم مظفرپوری

طوفان کے بعد

رامو سوچ رہا تھا کہ آج بھی اُس کے گھر روٹی نہ بنی ہوگی اور ہری کچھ کھائے بغیر لالٹین کی زرد روشنی میں اپنے اسکول کا سبق یاد کر رہا ہوگا۔ اور اُس کی بیوی دھنیا ٹپکتے ہوئے چھپر والے اُسارے کے ٹوٹے ہوئے کھمبے سے ٹکی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہوگی۔ اور سارے گھر میں پھیلا ہوا گھپ اندھیرا اپنی فتح پر پھولا نہ سما رہا ہوگا۔

رات کی تاریکی کو سیاہ اور مہیب بادلوں نے اور گھرا کر ڈالا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بادل گرجتا، بجلی چمکتی اور دُور دُور تک روشنی پھیل جاتی۔ مگر یہ روشنی کتنی لمحاتی تھی۔ پلک جھپکتے آئی اور ختم ہو گئی۔ رامو بھیگ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بھیگنا تو اُس کی قسمت میں لکھا ہے۔ ابھی مسلسل آٹھ گھنٹہ جب وہ پسینہ میں بھیگ کر کارخانے کے باہر نکلا تھا تو اُسے امید تھی کہ گھر پہنچتے پہنچتے سارا پسینہ خشک ہو جائے گا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی بارش ہونے لگی تھی اور ایک بار پھر وہ بھیگ رہا تھا۔

فاصلے طے ہو گئے۔ منزل آ گئی۔ اور رامو کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ لوگ کہتے ہیں غریبوں کی ہر بات غلط ہوتی ہے۔ سارے خواب جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ مگر رامو کی ہر بات کہاں غلط ہوتی ہے؟ سارے خواب کہاں جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ رامو نے ہمیشہ اُلٹی بات ہی سوچی۔ جو ہمیشہ سچ ہوئی۔ اُسے اپنی باتوں کی سچائی اور اپنے اندازوں کے صحیح ہونے کا یقین تو اُسی وقت ہو چلا تھا جب اُس کے چہرے پر بڑھاپے کی شکن تک نہ تھی۔ وہ جوان تھا۔ لمبا تڑنگا مضبوط بدن والا۔ بیس برس ہو گئے۔ مگر اب بھی گزرے ہوئے واقعات ذہن کے دریچے سے جھانک جھانک کر اُسے اُس زمانے کی یاد دلا رہے ہیں ——— وہ ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ بادلوں کے شور میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ اسی طرح بھیگتا ہوا جا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت وہ دوڑ رہا تھا اور اِس وقت ——— اِس وقت اُس نے دوڑنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ جب زندگی کی ہر دوڑ میں شکست ہی نصیب ہو تو دوڑنے سے حاصل ——؟ مگر اُس وقت اُسے اتنی سمجھ نہ تھی۔ وہ دوڑ رہا تھا اور اُس کے ہاتھ میں دوا کی شیشی تھی۔ اور اُس کے دل میں ایک چور چھپا بیٹھا تھا۔ اُس کا باپ مر جائے گا ——— اور جب وہ گھر پہنچا تھا۔ اُس کے باپ نے خون تھوک کر سسکتی بلکتی زندگی کو ایک بھرپور ٹھوکر مار دی۔ اور تب ہی سے رامو کے اندازے صحیح ثابت ہونے لگے۔ اُس نے سوچا اُس کا مکان بک جائے گا تو واقعی اُس کا مکان بک گیا۔ اُس نے سوچا اُس کی زمین بک جائے گی، ہل بیل بک جائیں گے اور اُسے تیز دھوپ میں سڑک پر بیٹھ کر پتھر کوٹنا ہوگا، یا کسی کارخانے میں بھاری بھاری لوہے اُٹھانے ہوں گے۔ اور یہ ساری باتیں سچ ہو گئیں۔ اسباب وہ گھر بیٹھا اینٹ کی بھٹی میں تیز آگ کے گرد بیٹھ کر لوہا پگھلانے والا ایک مزدور تھا جس نے سر چھپانے کے لئے پڑا نے قبرستان کے پیچھے گورکن کو متو دو پیسے رشوت دے کر ایک جھونپڑی کھڑی کر لی تھی۔ اِن شوروبوں کی بھی ایک کہانی ہے۔ [illegible] ؟ رامو کو اِس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ بُزدل ہے۔ اُس کے حوصلے پست ہیں [illegible]

یہ حالات تشدد کی ہمت نہیں۔ اور یہ احساس رامو کے دل میں آپ سے آپ نہ جاگا تھا۔ اس احساس کو جگانے والا تو اُس کا بیٹا ہری تھا۔ ہری۔ جس نے آنکھیں کھولتے ہی سرمایہ داری کے بے رحم شکنجے کو مفلسی کی نازک گردن پر بندھا ہوا پایا تھا۔

رامو جب بکھرے ہوئے دروازے کو ڈھکیل کر اندر داخل ہوا تو کھمبے سے ٹکی ہوئی دھنیا ہڑبڑا کر اُٹھ گئی اور اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

"ارے تم تو بھیگ گئے۔" رامو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دھنیا جلدی سے الگنی پر سے دھوتی اور کرتا اُٹھا لائی۔ اپنے آگے چنے کا ستو اور ہری مرچ دیکھ کر رامو کی بھوک بڑی تیزی سے جاگ گئی۔ اُس نے ہری کی طرف دیکھا جو بڑی تیزی سے کچھ لکھتا جا رہا تھا۔

"تم نے کھایا بیٹا — ؟"

"جی پتا جی — !"

"اور تم نے — ؟" رامو نے دھنیا سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ہم بھی کھا چکے۔ تم کھاؤ نا — !"

"تم دونوں جھوٹ بولتے ہو — ! چلو اس میں سے دونوں ماں بیٹے اپنے اپنے لئے نکال لو — !"

اور دھنیا کو اپنے پتی کی بات ماننی ہی پڑی۔

رامو کھا پی چکا تو دھنیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"روپیہ ملا — ؟"

"نہیں — !" رامو کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"پر پتا جی ! کل امتحان کی فیس جمع کرنے کی آخری تاریخ ہے۔ اگر میں نے فیس جمع نہ کی تو امتحان میں شریک نہ ہو سکوں گا"

رامو نے بڑی بے چارگی سے ہری کی طرف دیکھا، اپنی پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا پتا جی ! کہ آخر وہ لوگ روپیہ کیوں نہیں دیتے ہیں۔ آخر آپ نے محنت کی ہے۔ مہینہ بھر خون پسینہ ایک کیا ہے۔"

"تم نہیں سمجھ سکو گے بیٹا اِن باتوں کو —" رامو نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا۔

"نہیں پتا جی ! یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا نہ دیں۔ زمانہ بدل گیا۔ اب نہ کوئی مزدور ہے نہ سرمایہ والا۔ آخر یہ دباؤ کیوں ہے ؟ مجھے کہہ لینے دیجئے پتا جی کہ آج جو ہم ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہے ہیں اُس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ہمارے حوصلے پست ہیں۔ ہمارے اندر ہمت نہیں۔ ہم ازل سے سرمایہ داری سے ڈرتے آ رہے ہیں۔ مگر اب ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں برابری کا حق مانگنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ اور یہ حق اگر ہمیں یوں نہ ملے گا تو ہم اسے لڑ کر حاصل کریں گے۔"

رامو دل ہی دل میں ہری کے عزم اور حوصلے کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ سب ہو تو کیوں اور کیسے — ؟ بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے — ؟"

"تم نہیں جانتے بیٹا — ! ابھی پچھلے دنوں ہی کی تو بات ہے کہ اِسی روپے کے لئے آٹھ مزدور نوکری سے برطرف کر دئے گئے ہیں اور انھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اُن کا قصور کیا تھا ؟ صرف یہی نا کہ دو مہینے تک تنخواہ نہ ملنے کے سبب، بھوک کی تاب نہ لا کر انھوں نے اپنا حق مانگا تھا —"

"اور بس — !" ہری کے لہجے میں بے پناہ تلخی رچ بس گئی۔ "آٹھ مزدوروں کے جیل جانے ہی سے دوسروں نے میدان چھوڑ دیا۔ دراصل پتا جی حق حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ہمت ہار کر میدان چھوڑ دیا جائے۔ یہ تو اپنے حق کا سوال ہے۔ اس کے لئے لڑائی لڑنی ہی ہوگی۔ ورنہ سماج کے ان ٹھیکہ داروں کی من مانی بڑھتی ہی جائے گی۔ اور ہم غریب اُن کے ظلم کی چکّی میں پستے چلے جائیں گے۔ آپ کو تو یاد ہی ہوگا پتا جی! ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ چین کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے "روپیہ دو — سونا دو" کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ آپ کے کارخانے کے پندرہ سو مزدوروں کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ قومی دفاع کی خاطر کاٹ لیا گیا۔ مگر اخباروں میں کیا خبر شائع ہوئی — ؟ یہی نا کہ ککرا نیا اینڈ کمپنی کے ڈائرکٹر مسٹر ایم۔ ڈی ککرانیا نے قومی دفاعی فنڈ میں پانچ لاکھ روپے دئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ پانچ لاکھ روپے کیا اُنھوں نے اپنی جیب سے دئے تھے ——— ؟"

بولتے بولتے ہری خاموش ہو گیا۔ شدّتِ جذبات سے اُس کا چہرہ انگاروں کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ اور ایک عجیب جُرأت مندی سی اُس کے اندر سے پھوٹتی دکھائی دے رہی تھی۔ رامو کے دل میں ہری کی باتیں بیٹھ سی گئیں۔ اور اُس نے ٹھان لی کہ اب چاہے جان پر ہی کیوں نہ بن آئے مگر وہ ذلّت و رُسوائی کے اِس طوق کو اپنے گلے سے اُتار کر ہی دم لے گا ——— اور دوسرے دن جب وہ کارخانہ گیا تو اپنے اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ککرانیا جی کے پاس چلا گیا۔ ککرانیا جی نے اُوپر سے نیچے تک رامو کو کئی دفعہ گھُورا۔ پھر ایک کُرسی سے اُٹھ کر اپنا پھُولی ہوئی توند سنبھالتے ہوئے دوسری کُرسی میں ڈھیر ہو گئے۔

"کیا ہے —— ؟" اُنھوں نے کرخت لہجہ میں پوچھا۔

"سرکار وہ روپیہ ———"

"روپیہ —— روپیہ —— روپیہ ہے! میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ابھی روپیہ نہیں آیا ہے۔ آخر اتنے سارے مزدور جو یہاں کام کرتے ہیں، کیسے شانت ہیں — ؟"

رامو کا جی چاہا کہہ دے کہ اُن کی زبانیں تو خوف و ہراس کے تالوں نے بند کر رکھی ہیں، مگر وہ کہہ نہ سکا۔

"بابو جی میری پتنی بیمار ہے — میرے بیٹے کے امتحان کی فیس جمع کرنے کی آج آخری تاریخ ہے اور —"

"اِیڈیٹ —! نان سنس —! گٹ آؤٹ —" ککرانیا جی دھاڑے اور غصّے میں اُن کا ہاتھ Bell سے جا لگا۔ گھنٹی کی آواز سُنتے ہی فوراً ہی ایک چپراسی وہاں پہنچ گیا۔ مگر اِس سے پہلے کہ ککرانیا جی پیون کو کوئی حکم دیتے رامو نے اپنے اندر ہمّت پیدا کی اور کہا۔

"کیا اپنی محنت کا معاوضہ مانگنا کوئی جُرم ہے۔ میں آپ سے بھیک نہیں مانگتا۔ اپنا حق مانگتا ہوں —"

"حق کا بچہ —!" ککرانیا جی چیخے "ابے او سُندر رو! نکال باہر کر اِسے — حرامزادے۔ سالے ... کو سر پر چڑھا رکھا ہے کمینے نے —" اور اس سے پہلے کہ رامو اِن گالیوں کا جواب دینے کے لئے میز پر رکھا ہوا پیپر ویٹ اُٹھاتا، سُندر رو نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

وہ تو خیریت ہوئی کہ رامو نوکری سے برطرف نہ کیا گیا۔ ورنہ ککرانیا جی کا موڈ تو ذرا ذرا سی بات پر خراب ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُن کے موڈ کا بگڑنا تو قدرتی بات تھی — موڈ کسی لکھ پتی کا نہ بگڑے گا تو کیا رامو کا بگڑے گا —؟

رامو اپنے کام میں مشغول تھا اور سوچ رہا تھا۔ "اب ہری کا ایک سال برباد ہو جائے گا۔ وہ امتحان میں شریک نہ ہو سکے گا۔ اس کی بیوی اور وہ خود ایک دو ہفتے میں شاید فاقہ کی تاب نہ لا کر چل بسیں گے —" اُس نے وہ دن بڑی ہی بے چینی میں کاٹا۔ اور اب اِس وقت جب وہ کام ختم کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ککرانیا جی نے اُسے بُلا بھیجا۔ رامو سمجھ گیا کہ اسے نوکری سے برطرف کر دینے کی خبر

سننے کے لئے ہی اُسے بلایا گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ "یا سے وہ فال دین نوکری سے۔ اُس کے بچے تو رل جائیں گے، بھری امتحان میں بیٹھ کر میٹرک تو پاس کرے گا۔" مگر خلاف توقع گنگا اپنیا جی کو خوش گوار موڈ میں دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔

"بیٹھو۔" گنگا اپنیا جی نے رامو سے کہا۔ رامو نے زمین پر بیٹھنا چاہا۔

"وہاں نہیں یہاں بیٹھو۔" گنگا اپنیا جی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی۔ جی۔" رامو گھبرا گیا۔

"بیٹھو رامو۔" جب بار بار گنگا اپنیا جی نے کہا تو مجبوراً اُسے کرسی پر بیٹھنا ہی پڑا۔

"تم ہمارے کارخانے کے ایک اچھے مزدور ہو اس میں کوئی شک نہیں۔ تم اپنا کام محنت اور ایمان داری سے کرتے ہو اس سے بھی مجھے انکار نہیں۔ مگر تم بہت جلد خفا ہو جاتے ہو۔" اُنھوں نے میز کی دراز سے کئی نوٹ نکالے اور رامو کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو۔ تمہاری تنخواہ ہے۔ اور یہ بیس اور رکھ لو۔ تمہارے بیٹے کا امتحان ہے نا۔ رکھ لو کام آئیں گے۔ اور ہاں اپنا کام ایسی ہی لگن اور محنت سے کرتے رہو۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔"

رامو کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔ گنگا اپنیا جی میں پیدا ہونے والی حیرت انگیز تبدیلی نے اُسے بے حد خوش کیا تھا۔ رامو نے سوچا شاید اُن کے دل میں رحم کا جذبہ اُمڈ آیا ہے شاید وہ سمجھ گئے ہیں کہ مزدوروں کو بھی برابر کا حق ملنا چاہئے۔ رامو کا جی چاہا وہ جھک کر گنگا اپنیا جی کے پاؤں چوم لے۔ ایک دیوتا کے قدموں میں سر جھکا دے۔ اُس نے جھکنا چاہا تو گنگا اپنیا جی کے پاؤں پڑا ایک دیوتا کے پوتر چرنوں میں سازش کے زہریلے کیڑے رینگتے نظر آئے۔ اُس کی پوجا بھنگ ہو گئی اور اُس کے کانوں میں گنگا اپنیا جی کی آواز آئی۔

"ارے سنو رامو! ایک کام تو رہ ہی گیا۔ آٹھ مزدوروں کو جو برطرف کر دیا گیا تھا وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔؟" رامو نے اثبات میں سر ہلایا۔ گنگا اپنیا جی نے آگے کہا۔ "اُن لوگوں کو جیل بھی ہو گئی تھی۔ اب وہ لوگ رہا ہو چکے ہیں اور اُن لوگوں نے مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ تمھیں ایک کام کرنا ہے۔ میں نے تمھارا نام گواہوں کی فہرست میں لکھا دیا ہے۔ تمھیں صرف یہی کہنا ہے کہ اُن آٹھ مزدوروں نے تمھارے سامنے ہی مجھ پر حملہ کیا تھا۔ کل ہی مقدمہ کی تاریخ ہے۔ ذرا سویرے آجانا۔"

"تو یہ بات ہے۔" رامو نے دل میں سوچا۔ "اسی لئے جناب اتنے مہربان نظر آرہے ہیں۔" اُس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور دوسرے لمحہ دس دس کے دو نوٹ گنگا اپنیا جی کی میز پر پٹکتا ہوا بولا۔

"مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ آپ اپنے روپے رکھیں۔ میں اپنی تنخواہ لئے جا رہا ہوں۔"

اور جب وہ گنگا اپنیا جی کے کمرے سے باہر آیا تو اندھیروں کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ مگر دُور روشنی کی ایک تیز کرن بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

(بقیہ افسانہ صفحہ ۳۰ "پُرانا اور نیا ہندوستان")

تعمیر میں کام دے گا۔" لالہ جی نے کہا۔ "بے ایمانی اور رشوت بڑی لعنتیں ہیں اور انھیں ہر قیمت پر اب ختم کرنا ہی چاہئے، ورنہ ہندوستان نہ پُرانا ہندوستان رہے گا اور نہ نیا خوبصورت ہندوستان تشکیل پا سکے گا۔"

اور لالہ جی جب وہاں سے واپس ہوئے تو نندی کے متعلق اُن کے خیالات بدل چکے تھے۔

ادیب احمد دوراں

نظم

ویت نام

ہم نشیں دیکھ یہی خطۂ برباد ہے وہ
جس کے خوں گشتہ فسانے ہیں بہت درد بھرے
جس کے بربط کا ہر اک تار ہے زخمی اب تک
جس کی محفل کے ترانے ہیں بہت درد بھرے
جو اک آواز ہے اپنے ہی لہو میں ڈوبی

آہ! مقتل کی یہ لاشیں، یہ شہیدانِ وفا
کس سے پوچھیں انھیں کس جرم کی تعزیر ملی
دل میں آزادئ گلشن کی تڑپ کتنی تھی
جاں نثاروں کو مگر موت کی زنجیر ملی
جبر کے ہاتھ جب اُٹھے تو اماں مل نہ سکی

قاتلوں کو یہ جنوں ہے کہ فدایانِ جمال
حسن و آرائشِ محفل کا کبھی نام نہ لیں
قافلے گم رہیں تاریک بیابانوں میں
راہرو حسرتِ منزل کا کبھی نام نہ لیں
لالہ زاروں میں نہ ہو کچھ بھی شراروں کے سوا

ایک آندھی کہ جو منہ زور بھی، منحوس بھی ہے
در و دیوار کو مسمار کئے جاتی ہے
ایک بپھری ہوئی ڈائن ہے جو آنگن آنگن
بے گناہوں کا فقط خون پئے جاتی ہے
روح بیتاب ہے حرّیتِ انساں کی قسم
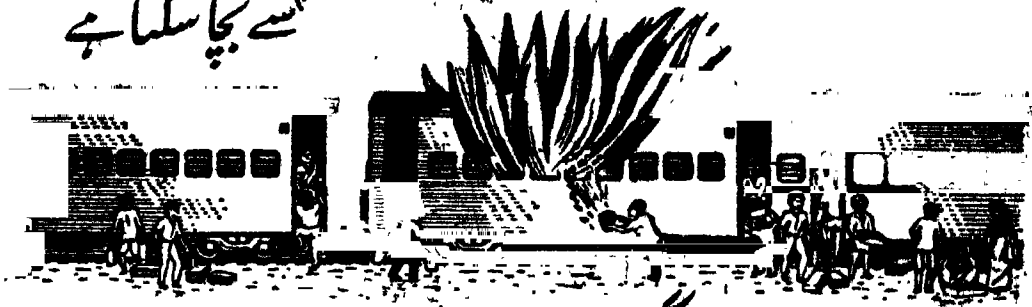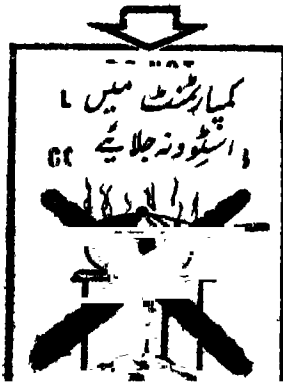
انٹرویو:- ظفر ادیب

میں اُن سے ملا

(اُردو کے مشہور افسانہ نگار جناب کشمیری لال ذاکر سے ایک گفتگو)

"اب آپ آئے ہیں، اپنے اصلی رُوپ میں" جب کشمیری لال ذاکر غسل فرما کے چادر اوڑھے ہوئے اور سر پر تولیہ لپیٹے کمرے میں تشریف لائے تو میں نے کہا۔

"خوب، یہ رُوپ ہے؟ جسے آپ میرا اصلی رُوپ سمجھتے ہیں، بھئی، آپ کی بات میں کتنی اصلیت ہے؟"

"یہ تو آپ جانیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں، اس کے بارے میں —— اگر آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اس میں اصلیت پاتے ہیں تو میں بھی مانے لیتا ہوں، یہ الزام آپ ہی پر رہے گا کہ میں نے قہراً یا جبراً مان لیا یا آپ کو خوش کرنے کے لئے۔" ذاکر صاحب نے خندہ پیشانی اور اپنے روایتی دھیمے پن سے کہا اور پھر وہ رفتہ رفتہ تھوڑا تھوڑا کر کے اصل سے نقل (بناوٹ) کی طرف لوٹے۔

چائے منتظر تھی اُن کی —— اور صابر دت انتظار کر رہے تھے، اس بات کا —— کہ میں ذاکر صاحب سے بات چیت شروع کروں اور اگر ہو سکے تو اُن کے دل میں جھانک کر دیکھوں شاید کوئی ایسی بات اُن کے فن یا کردار کے بارے میں سامنے آجائے، وہ (صابر دت) نہیں جانتے تھے کہ انٹرویو دونوں کے لئے نہایت صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے، انٹرویو لینے والے کیلئے بھی اور انٹرویو دینے والے کے لئے بھی۔ یہ تو ایک طرح کا امتحان ہوتا ہے، دماغوں (TALENTS) کا۔ اگر انٹرویو لینے والے وہی عام باتیں پوچھیں تو کوئی کمال نہ ہوا اور اگر انٹرویو دینے والے سرسری جوابات سے دامن چھڑانا چاہیں تو بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ بڑی چھیل چھبیلی صنفِ ادب ہے، اور اس کی اہمیت، اس کا حسن اور اس کی معنویت انٹرویو لینے اور انٹرویو دینے والے کی اعلیٰ و ارفع صلاحیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ادب کے لئے غضب، ستم اور ظلم یا اس سے بھی زیادہ کچھ کہہ لیجئے، واقع ہوا ہے، کچھ ایسا ہی حدر ہوگا جس کے لئے غالب نے کہا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ اور بات ہے کہ غالب نے یہ اپنے دَور کے متعلق یا کسی اور بات یا پہلو کے پیشِ نظر کہا ہو۔

جب میں نے ذاکر صاحب کو مستعد و آمادہ پایا اور صابر دت کے اشتیاق کو ہمہ چشم و ہمہ گوش، تو انسان کی تاریخ و ارتقاء پر حاوی ایک سوال کر ڈالا۔

○ اُردو افسانے کا ایک ایسا مختصر سا جائزہ پیش فرمائیے، جس سے افسانے کے تاریخی ارتقاء پر مناسب روشنی پڑے اور یہ سمجھا جا سکے کہ افسانہ کس آغاز سے کس انجام تک آ پہنچا ہے؟"

" اگرچہ افسانے کی عمر بہت لمبی ہے، لیکن آج کے افسانے کا آغاز پریم چند سے ہوا۔ افسانے کا سفر تو داستان ہی سے شروع ہوتا ہے لیکن اُس وقت یہ صرف تخیل کی بلند پروازیوں کا حامل تھا اور فوق الفطرت باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی اور تعلقات نے اس کے ارتقا کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔ صرف اُس وقت اس کی رفتار میں ذرا تغیر آیا جب یہ آتن کے سنگِ میل پر پہنچا۔ سرور نے بھی یک گونہ شائستگی سے لکھنؤ کی تہذیب کا خاکہ پیش کردیا، اگرچہ تعلقات کی بیڑیوں کو اس کا زیور بنائے رکھا، بلاشبہ سرشار کچھ واضح ہوئے اور بعض حقائق سے ہلکے پھلکے انداز میں نبرد آزما رہے، مختصر یہ کہ پریم چند تک آتے آتے اس کے لئے راستہ بہت کچھ ہموار ہو چکا تھا۔ یہ سب باتیں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہونگا کہ پریم چند نے جو کچھ لکھا وہ اُن کے زمانے اور اُن کے زمانے کی قدروں کے مطابق تھا۔ آج زندگی کے مسائل کہیں زیادہ اُلجھ گئے ہیں، اور ہمارا سیاسی شعور بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور تیکھا ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے نئی نئی راہیں ہیں، جنھیں ہمیں اپنے افسانوں میں پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔"

" کیا آپ اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے کہ بنیادی طور پر پریم چند کے افسانے اور جدید افسانے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟"

" میرے خیال میں پریم چند کے دَور تک افسانے میں کہانی پن پر زور رہا، اب افسانہ زندگی اور زندگی کے شعبوں کا ہر زاویہ سے واضح اسکیچ (SKETCH) اُتارتا ہے، اس کی زد سے کوئی نقطۂ نظر نہیں بچتا۔ کہیں نفسیاتی انداز ہوتا ہے، کہیں واقعاتی ڈھنگ اور کہیں سیاسی رنگ وغیرہ وغیرہ۔ اب افسانہ صرف افسانہ ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کا کوئی مسئلہ اور اس کا حل ہے، پچھلے دَور میں اس سائنسی انداز سے موضوعات کو احاطے میں نہیں لیا جاتا تھا اگرچہ واقعات، حقائق اور فطری روابط سے چشم پوشی نہیں کی جاتی تھی، لیکن آج کی طرح اُن سے ہاتھا پائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ آج تو افسانہ نگار پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی مسئلہ اُٹھائے اور اس کا حل اس طرح پیش کرے کہ اس کے افسانے کو پڑھنے والے کچھ نہ کچھ آسودگی کا احساس پائیں۔ یہ نہیں کہ وہ کام و دہن کی تلخی سے اُلجھتے ہوئے چھوڑ دیئے جائیں۔"

" میرے خیال میں افسانے نے پریم چند کی منزل سے عمودی ارتقاء کی جانب کوئی قدم نہیں بڑھایا، اس کا ارتقاء جو کچھ بھی ہوا ہے، اطراف و جوانب میں ہوا۔ اسی لئے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ افسانہ پریم چند کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ آپ اس سے کہاں تک متفق ہیں۔"

اب ذرا ذاکر صاحب سنبھلے اور اُنھوں نے ایک سگریٹ خود لیا اور دوسرا مجھے پیش کیا تاکہ اس سے اُنھیں اتنا وقفہ مل جائے کہ اس بارے میں وہ کچھ کہنے کے لئے سوچ لیں۔

" ارتقاء ضرور ہوا ہے، میں اس سے متفق نہیں کہ ارتقاء بالکل نہیں ہوا، خواہ وہ ارتقاء عمودی سمت میں نہ ہوا ہو، اطراف و جوانب میں ہوا ہو۔ لیکن وہ بھی تو ایک ارتقاء ہی ہے، آپ کہیں گے کہ وہ تو تزئین و آرائش ہے، کوئی بنیادی تبدیلی نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے کچھ حُسن نکھرا، کچھ خدوخال واضح ہوئے، کچھ چتون تیکھے بنے، یہ بھی تو ارتقاء ہی ہے، کیا آپ اسے ارتقاء نہیں کہیں گے۔"

میں دل میں کہہ رہا تھا ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اور ابھی وہ اس سوال کا جواب دیکر سنبھلے نہ تھے کہ میں نے ایک اور سوال کر دیا ۔" یہ تو عبوری دَور ہے جیسا کہ ہر زبان کے ادب کی تاریخ میں پیش آتا رہتا ہے، اور عبوری دَور میں کوئی ارتقاء نہیں ہوتا۔ یہ بھی غنیمت ہوتا ہے کہ پچھلے دَور کے ارتقاء کی بلندی اور اس کی قدروں کو برقرار رکھا جائے۔ پھر کوئی عہد آفریں شخصیت پیدا ہونے کا امکان

ہے تو ارتقاء کی نئی منزل سامنے آتی ہے۔ کیا آپ اِس دَور کو عبوری دَور نہیں مانتے؟ اور نہیں تو کم سے کم افسانے کے لئے تو یہ عبوری ہی ہے۔"

"یہ مان لینے کے باوجود کہ یہ عبوری دَور ہے، میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ ترقی کی طرف مائل ہے، نئے نئے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کی ایک کہانی کو عالمی مختصر افسانوی مقابلہ میں دوسرا انعام ملا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا، اس کہانی کا نام "سائیکلون" تھا۔"

(اِس مرحلے پر میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے وہ بھی کسی غیر مُلکی کہانی کا اثر ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو وہ اُردو کہانی تو نہیں تھی) اور ذاکر صاحب کہہ رہے تھے۔

"پھر عہد آفریں شخصیت اگر ہر دَور میں پیدا نہیں ہوتی تو منفرد ادیب تو پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی منفرد ادیب کسی کا اثر نہیں لیتا بلکہ اپنا راستہ خود نکالتا ہے اور دوسروں کو ایک الگ راستہ دیتا ہے، گو وہ ایک نئے دَور کا آغاز نہ کر سکے۔"

اب میں نے سوچا کہ کوئی اور سوال اِس سلسلے کا زیادتی ہوگی اِن سے بھی اور اِس موضوع سے بھی ــــ اِس لئے اپنے افسانے کی روش سے متعلق استفسار ضروری سمجھا۔ اور درحقیقت مقصد بھی یہی تھا۔

"آپ اپنی کہانیوں میں کن کن پہلوؤں پر خاص توجہ دیتے ہیں؟"

"پہلے تو میں یہ بتانا چاہونگا کہ میں اپنی کہانی کا پلاٹ چلتے پھرتے کسی آدمی کے فقرے سے بھی بعض اوقات لے لیتا ہوں۔ اِس طرح وہ واقعات بھی میری کہانیوں کے لئے مجھے پلاٹ دیتے ہیں جو آئے دن آنکھوں کے سامنے گذرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے انتخاب میں اور ان سے پلاٹ اور کہانی بننے کا تعلق میرے مزاج سے ہوتا ہے۔ اِس لئے میری کہانیاں کبھی کبھی پلاٹ (تھیم) وغیرہ پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ لیکن ان میں میری دوسری کہانیوں کی طرح نفسیاتی پہلو خاص طور پر پیشِ نظر رہتا ہے۔ آپ نے تو میری کہانیاں پڑھی ہیں اور آپ انھیں پسند بھی کرتے ہیں۔"

(میں دل میں کہہ رہا تھا کہ بات تو یہ درست ہی کہہ رہے ہیں۔ اور مجھے اُن کی کہانیاں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے بہت پسند بھی ہیں ــــ اب ذاکر صاحب فرما رہے تھے)

"میری کہانیاں کبھی ایک نفسیاتی شخص کی زندگی کے ایک لمحے، کبھی کسی پہلو کے نفسیاتی تجزیے اور کبھی میری اپنی زندگی، اپنے خیالات، اپنے احساسات اور اپنے جذبات کے کسی رُخ پر محمول ہوتی ہیں۔ اگرچہ میرا اپناپن کسی نہ کسی انداز سے ضرور میری ہر ادبی کاوش میں چھُپا نا ظاہر ہوتا ہے۔"

"آپ کی شاعری سے آپ کے افسانے کو کیا کوئی مدد ملتی ہے کہ آپ دل و جاں کا لہو اِس صنفِ ادب کو بھی پلاتے ہیں۔ آپ تو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی ہیں اور وہی آپ کی خاص صنفِ ادب ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں، شاید آپ بھی محسوس کرتے ہوں، کہ میری کہانیوں میں زبان خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کی خوبصورتی کا سرچشمہ دراصل میری شاعری ہی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میری شاعری ایسی نہیں کہ اِس سے مجھے بہت سے لوگ جانتے ہوں۔ اگرچہ کچھ لوگ اِس میں بھی کچھ حُسن و رنگ تلاش کر لیتے ہیں۔ اس سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے کہ میری کہانیوں میں ایک لطافت ہوتی ہے اور یہ لطافت میرے شاعرانہ ذوق ہی کی دین ہے۔ میں خوبصورتی اور لطافت کا دلدادہ ہوں۔ اور انہی دونوں عناصر کو اپنے ادب میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے آپ اسے مانیں گے یا نہیں۔"

"ہاں بھائی! یہ درست ہی ہے، پھر آپ ایک ایسے خطے کی آب و ہوا سے تعلق رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہی سب کچھ ہے۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کی کہانی کے اسلوب میں جو کیفیت اور ایک نرم رفتاری پائی جاتی ہے، کیا اس کا تعلق آپ کے مزاج سے ہے یا یہ آپ کی زندگی کے کسی خاص واقعے کی پیدا کردہ ہے؟"

میں فطرتاً دھیمی رفتار کا آدمی ہوں۔ میرے ایک دوست نے میرا کیریکٹر اسکیچ لکھا تھا "پھولوں کا لمس" [illegible] کو آپ جانتے ہیں۔ مدت سے آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ دھیمی رفتار کا میرے ادب میں پایا جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ آپ یقین رکھئے کہ میری زندگی کے کسی واقعہ نے مجھے ایسا نہیں بنایا ہے بلکہ میں فطری طور پر ہی کچھ ایسا ہوں۔"

"اگر آپ اس کے علاوہ کچھ اور کہنا چاہیں جس سے آپ کے کردار اور آپ کے ادب پر کچھ روشنی پڑے تو فرمایئے۔"

ذاکر صاحب نے اطمنان کا سانس لیتے ہوئے فرمایا۔ "ہاں بھائی! میں ایک بات ضرور کہنا چاہونگا وہ یہ کہ اِن دنوں میری طبیعت میں ایک جھنجھلاہٹ ایک جھلاّہٹ اور تھوڑی بہت ایک چیز کے کسی دفتری مصروفیت کی وجہ سے ادھورا رہ جانے سے احساسات وجذبات کی نزاعی کیفیت کا اثر آگیا ہے۔ اس کیفیت کو میں Irritation کا نام دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ نہایت موزوں لفظ ہے جسے میں اپنی طبیعت کے اُس رُخ کا صحیح ترجمان سمجھتا ہوں۔"

(یہ تو قریب قریب ہر ادیب کے ساتھ حادثہ پیش آتا رہتا ہے۔ ادیب بے چارہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ ایک طرح سے مجبور ہو تو اور بات ہے اس کی مجبوریاں تو ان گنت ہیں)

اب ہم اس ماحول سے نکل آئے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

زیدی جعفر رضا

سوچ

روزِ روشن کا وہ تابندہ و پُر نور سا جسم
زد میں آجانے سے بپھرے ہوئے طوفانوں کی
زرد و بے جان سا آتا ہے نظر
آفتاب اوڑھ کے سرتا بہ قدم
ایک میلی سی ردا
سو گیا ہے ابدی نیند نہ اُٹھے گا کبھی
دُور تک برف کے پھولوں کی حسیں چادر کا
صاف و شفاف سا ہے فرش بچھا
ساری دُنیا ہے کسی فکر میں غلطاں۔ خاموش
اور دُنیا سے الگ
ساری دُنیا کا خدا
تیسری جنگ کو آواز دیئے جاتا ہے
تاکہ پھر لوگ اُسے یاد کریں
اُس کی تسبیح میں مصروف رہیں

راج نرائن راز

فیصلہ

آنکھیں تک ہیں دید سے قاصر
کمرے میں کیسا یہ دھواں ہے
کتنی گھٹن ہے، دم گھٹتا ہے

نقش جو تھے، اک عمر کا حاصل
نقش جو تھے جینے کا بہانہ
اب ہیں مبہم، مدھم مدھم
زیست دوراہے پر ہے گم صم

اتنی گھٹن ہے، دم گھٹتا ہے

ایک دریچہ اب بھی وا ہے

آگے یادوں کی بستی ہے

کون دریچے میں سے پھاندے
کون یوں اپنا آپ گنوائے

ڈرامہ

رسول احمد

سانجھ بھئی چودیش

پردہ کھلتا ہے۔ لوگ آکر بیٹھتے جاتے ہیں۔ وقت مقررہ پر اسٹیج پر کچھ روشنی ہوتی ہے۔ بازار کی سڑک کے ایک حصے کا فٹ پاتھ۔ صبح کا وقت۔ دو ایک مزدور گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یا موٹر کے تیزی سے گذر جانے کی آواز بھی آجاتی ہے۔ اور پورے کھیل کے دوران میں اس قسم کی آوازیں وقتاً فوقتاً ابھرتی رہتی ہیں۔ ایک لڑکا جس کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال کی ہوگی، دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اُس کی بغل میں اخبارات کی گڈی ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کے تار کا ایک پنجرہ ہے جس میں دودھ کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ ایک جگہ پسند کرکے ایک میلا سا پھٹا ہوا کپڑا فٹ پاتھ پر بچھاتا ہے۔ اور اُس پر اخبارات ترتیب سے رکھتا ہے۔ اس اثنا میں دوسرے اخبار فروشوں کی آوازیں آتی ہوئی سُنائی دیتی ہیں۔

آوازیں:۔ آج کا چھاپا

"سندیش" آج کی تازہ خبریں

کانگریس اپنے اُمیدواروں کے ناموں کا اعلان

کرنے میں ناکامیاب

میونسپل الکشن کے سماچار

"گجرات سماچار"

مدراس ماں شیتل جھپا جھپی (مدراس میں

طوفان ہوئے)

دُودھ پارٹیوں کا سنگٹھن نہ ہو سکا۔

"جن ستا"

جنتا پریشد کے ناموں کا اعلان۔ وغیرہ وغیرہ۔

لڑکا اپنے اخبارات ترتیب دے چکا ہے۔ اور اُٹھنے لگتا ہے۔ تو ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ جسے لوگ "بابا" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ بابا بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ سر اور داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے ہیں۔

بابا:۔ مُنّے۔ یہ کیا ہو رہا ہے مُنّے

منّا:۔ (دُودھ کی بوتلوں کا پنجرہ اُٹھا کر) پرنام بابا۔ (ہنستے ہوئے) یہ میری دکان ہے۔

بابا:۔ دکان؟!

منّا:۔ مجھے دیر ہو رہی ہے بابا۔ میں پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ مجھے ابھی لوگوں کے گھر دودھ پہنچانا ہے۔ (بھاگ جاتا ہے)

(بابا پہلے تو اُسے پکارتا ہے۔ پھر ہنستے ہوئے جہاں اخبارات رکھے ہوئے ہیں، وہاں تک آتا ہے۔ اور ایک گتّے کے ٹکڑے پر منّا جو ہدایات لکھ کر گیا ہے، اُسے پڑھتا ہے)

بابا:۔ (پڑھتے ہوئے) "آپ اپنا اخبار لے لیجئے۔ اور قیمت رکھ دیجئے۔ مجھے آپ پر بھروسہ ہے"... بھروسہ (قہقہہ لگاتا ہے) بالکل ٹھیک ہے۔ ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ لوگ نہیں دیکھے۔

تمہیں ضرور بھروسہ ہوگا (قہقہہ)

دائیں جانب سے "شہر سماج سیوا منڈل" کا
ایک رکن جو کھدر پوش ہے۔ اور اپنے کندھے پر
کھادی کی جھولی لٹکائے ہوئے ہے۔ محکمہ صفائی
کے انسپکٹر کے ساتھ بڑی تیزی سے داخل ہوتا ہے۔
بائیں جانب دیکھتے ہوئے آواز لگاتا ہے "اے جیوا۔
اے جیوا" (بائیں جانب سے مہتر جیوا داخل ہوتا ہے۔
جس کی بغل میں جھاڑو ہے۔ جیوا نے خاکی قمیص۔
ٹوپی۔ اور نیلی نیکر پہن رکھی ہوئی ہے۔)

جیوا:۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) جی شاب۔

انسپکٹر:۔ سڑک بالکل صاف ہے وہاں تک جیوا۔

جیوا:۔ ہاں۔ شاب

انسپکٹر:۔ دیکھ اگر کہیں کچرا دچرا ہوا تو ——

جیوا:۔ نئی شاب

انسپکٹر:۔ اچھا جاؤ… (جیوا "سلام شاب" کہتے ہوئے
چلا جاتا ہے۔ انسپکٹر اور سماج سیوک اسی تیزی سے
دائیں جانب جانے لگتے ہیں۔ بائیں جانب سے ایک
کانسٹبل داخل ہوتا ہے)

کانسٹبل:۔ (اخباروں کی طرف اشارہ کرکے) یہ کیسی بھیڑ بھاڑ
ہے ادھر… (بابا سے مخاطب ہوتا ہے) اے یہ
دکان تیری ہے؟ (بابا انکار میں سر ہلاتا ہے) تو پھر
کس کی ہے؟

بابا:۔ (ہنستے ہوئے) ایک چھوٹے سپاہی کی۔

کانسٹبل:۔ سپائی کی —— (بابا قہقہہ لگاتے ہوئے اثبات
میں سر ہلاتا ہے) اے تو میری مسکری کرتا ہے۔ ایک
دو پئی (پائی) کا آدمی ہو کے سرکاری آدمی کے سامنے
بولتا ہے۔ پھر کوئی دن کچھ بولا تو بند ہی کر دونگا سمجھا

سماج سیوک:۔ (جو پولس کا چلانا سن کر بھاگتا ہوا آتا ہے)
کیا ہے بھئی… کیا ہے یہ

کانسٹبل:۔ اس سے پوچھو ساب (صاحب) میں نے پوچھا
یہ دکان کس نے لگائی ہے تو کہتا ہے ایک سپائی نے۔
ابھی اس کو کھبر (خبر) نئی ہے کا ئدا (قانون)

سماج سیوک:۔ (سمجھاتے ہوئے) بابا۔ اگر یہ دکان تمہاری
ہو تو تھوڑی دیر کے لئے اٹھا لو۔

بابا:۔ یہ دکان میری نہیں ہے صاحب۔ یہ ایک چھوٹے
سپاہی کی ہے۔ وہ ہاتھ جو جیون سنگرام میں ہر
وقت بر سر پیکار رہتے ہیں۔ جو زندگی کے راستے
میں آنے والی مشکلات اور کٹھنائیوں میں گھبرا کر
جھکتے نہیں۔ بھیک نہیں مانگتے۔ بلکہ محنت کرتے
ہیں، زندگی سنوارنے کے لئے، تو کیا وہ ایک سپاہی
کے ہاتھ نہیں ہیں؟ وہ تیرہ چودہ سال کا بچہ جو بوٹ
کے گھر دودھ پہنچاتا ہے۔ اور یہاں ایک دکان لگا کر
گیا ہے کہ دو چار پیسے یہاں سے بھی کما لے……
(سپاہی کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتا ہے) تو بولو
وہ کون ہے؟ وہ سپاہی ہے، اور ایسا سپاہی
ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے سر
بھی جھک جانے چاہئیں۔ اگر اس کا یہ ڈھنگ
مذاق ہے تو میں نے سچ مچ تمہارے ساتھ مذاق
کیا ہے۔

سماج سیوک:۔ بابا۔ سچ مچ وہ بڑا بہادر ہے۔ (تقریر
کے انداز میں) میں تو کہتا ہوں بھارت کو ایسے
ہی نوجوانوں کی ضرورت ——

(سپاہی چلا جاتا ہے)

بابا:۔ نوجوان نہیں۔ بچوں کی ضرورت ہے۔

سماج سیوک:۔ اوہ سمجھے بابا۔

(تھامس فوٹوگرافر داخل ہوتا ہے)

تھامس:۔ (سماج سیوک سے) ادھر کیا ہوا ہے سر

سماج سیوک:۔ اچھا ہوا مسٹر تھامس تم بھی آ گئے۔ تم
نے اس دکان کی تصویر لی ہے؟

تھامس:۔ نہیں۔

سماج سیوک:۔ تو پھر تم کیسے فوٹوگرافر ہو۔

تھامس:۔ اپن؟ یہ سر آپ کیا بولتا ہے۔ اپن انٹرنیشنل
فوٹوگرافر ہے۔ اپن کا فوٹو امریکہ۔ انگلینڈ
اور آسٹریلیا میں ایگزیبٹ EXHIBIT ہوتا ہے

اپن اس کا SNAP لینا منگتا ہے جس کا بیوٹی فل
بیک گراؤنڈ ہو۔ کوئی نیچرل سین ہو سر۔

بابا:۔ تو ایک کندھے پر کشمیر اور دوسرے پر تاج محل اٹھائے
اٹھائے پھرو، انٹرنیشنل فوٹو گرافر صاحب۔ اسکی
خوبصورتی دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئے۔

تھامس:۔ (بگڑ کر) اے مسٹر۔ تو کیا اپن کو اندھا سمجھائے۔

سماج سیوک:۔ (بابا سے) آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بابا۔
اس تصویر کو دیکھتے ہی لوگوں کی آنکھیں کھل جائینگی
کہ آزادی کے بعد بھارت نے کتنی ترقی کی ہے۔ یہ بھارت
کی اُنتی کی تصویر ہے۔ یہ ایک کہانی ہے بھارت دیش
کی ایمانداری، شرم اور سنگھرش کی۔

تھامس:۔ ونڈرفل آئیڈیا سر۔ اپن کو ایک تھیم مل گیا۔
(خوش ہو کر تصویر لینے لگتا ہے اور کیمرہ ٹھیک
کرنے کے بعد بابا سے مخاطب ہوتا ہے) اے مسٹر
ذرا بازو ہٹ جاؤ۔

سماج سیوک:۔ (بابا کے پاس جاکر) بابا۔ آپ ذرا
اُس طرف ہٹ جاؤ۔

بابا:۔ کیوں؟ کیا تمہارے بھارت کی ترقی پر بدنما
دھبہ لگ رہا ہے (قہقہہ)

(بابا ہٹ جاتا ہے۔ اور سماج سیوک صاحب
دکان کے نزدیک آجاتے ہیں تاکہ اُن کی تصویر
بھی آجائے۔ تھامس کیمرہ ٹھیک کرنے کے
بعد یکایک سماج سیوک سے مخاطب ہوتا ہے)

تھامس:۔ سر۔ اپن کو ایک ونڈرفل آئیڈیا سوجھا ہے۔

سماج سیوک:۔ جلدی کرو مسٹر تھامس۔ منسٹر صاحب ادھر
آرہے ہوں گے۔

تھامس:۔ (جاکر سماج سیوک صاحب کو ایک جگہ بتاتے ہوئے)
سر آپ ادھر کھڑا ہونا منگتا ہے۔ پھر ایک ہاتھ سے
COIN رکھنا منگتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے
نیوز پیپر لینا منگتا ہے۔ پھر دیکھو سر۔ جو بھی اس
فوٹو کو دیکھے گا بولے گا انڈیا کا لوگ کتنا
HONEST ہے۔

سماج سیوک:۔ (ہنستے ہوئے) اچھا اچھا۔ (اپنی جیبیں
ٹٹول کر) لیکن میرے پاس چھٹے پیسے نہیں ہیں۔

تھامس:۔ کوئی بات نہیں ہے سر۔ آپ خالی ایسا کرو۔ اپن
ایسا فوٹو بنائے گا کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوگا کہ آپنے
پیسہ رکھا یا نہیں ... (سماج سیوک صاحب تھامس
کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سماج
سیوک اخبار کو موڑ کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیتے ہیں۔
بابا قہقہہ لگاتا ہے)
..... اپن بیٹ بولتا ہے سر۔ اپن اس فوٹو کو
فوٹو ایکزیبیشن میں رکھے گا اور سالی گاڈ بولتا ہے
اسے فرسٹ پرائز ملے گا فرسٹ۔ اُدھر آپ ایکزیبیشن
کا ڈائرکٹر ہے۔ آپ اپن کو CONGRATULATION
بولے گا سر۔ پھر اپن اس فوٹو کو نیشنل فوٹو ایکزیبیشن
میں بھیجے گا اور پھر سر ——

بابا:۔ انٹرنیشنل کومپیٹیشن میں ——

تھامس:۔ اے مسٹر تم سمجھتا ہے اپن بلف کرتا ہے۔
(بابا ہنستا ہے) شٹ اپ۔

(سماج سیوک چلے جاتے ہیں، اُن کے پیچھے پیچھے تھامس
بھی چلا جاتا ہے۔ بابا بھی آہستہ آہستہ جانے لگتا ہے۔
ان سب کے جاتے ہی ایک جانب سے تین شخص داخل
ہوتے ہیں۔ تینوں کانگریسی ہیں۔ دو کے ہاتھوں میں
سوت کے ہار ہیں، جن میں ایک ایک گلاب کا پھول
لگا ہوا ہے۔ دوسری جانب سے منسٹر صاحب مع اپنے
ساتھیوں کے داخل ہوتے ہیں۔ فوٹو گرافر اور اخباری
نمائندے بھی ساتھ ہیں۔ تھامس جو تصویر کھینچنے کی
غرض سے اُلٹے قدموں سے چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ
وہ دونوں کانگریسیوں سے ٹکرا جاتا ہے) تھامس
"سوری" کہتا ہے۔ کانگریسی آگے بڑھتے ہیں اور ہاتھ
جوڑ کر خاموشی سے صاحب کا استقبال کرتے ہیں۔
منسٹر صاحب جواب میں ہاتھ جوڑ دیتے ہیں)

ایک کانگریسی:۔ (منسٹر کو ہار پہناتے ہوئے) شما کیجئے صاحب۔
ہم اس سے اَدھک کچھ نہ کرسکے۔

دوسرا کانگریسی:۔ (ہار پہنا کر ہنستے ہوئے) ورنہ صاحب ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کی عمر کے برابر ۵۰ پھولوں کا ہار آپ کو پہناتے۔

میئر:۔ اور میں نے کیا فیصلہ کیا ہے معلوم ہے۔

ایک کانگریسی:۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ آپ اپنا جنم دن بڑی سادگی سے منانا چاہتے ہیں۔

میئر:۔ تو پھر آپ نے "بیوت" نہیں پڑھا۔ اُس میں میرا بیان ہے۔

دونوں:۔ کیا؟

(ایک کانگریسی دوڑ کر اخبار کی دکان پر جاتا اور "بیوت" لے کر وہیں کھڑے کھڑے دیکھنے لگتا ہے)

میئر:۔ بڑا افسوس ہے۔ آپ اخبار نہیں پڑھتے (اُن دونوں کانگریسیوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ جنھوں نے ہار پہنائے تھے)

بابا:۔ (ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف جاتے ہوئے) اخبار سے سیاست نہیں چلتی۔ سیاست سے اخبار چلتے ہیں۔ اور لوگوں کی جہالت سے دونوں کامیاب ہوتے ہیں۔ (قہقہہ)

(اخبار دیکھنے والے کانگریسی کو میئر کا بیان مل چکا ہے۔ اور وہ وہیں سے چلاتا ہے "مل گیا مل گیا۔" دوڑ کر اپنے ساتھیوں کے پاس آتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے ... "میونسپل کارپوریشن کے میئر شری وجے کمار اپنے جنم دن پر ——

میئر:۔ (بات کاٹتے ہوئے) ٹھہرو۔ سُرلیش میرا بیان کیا تھا۔

سُرلیش:۔ (جو میئر کے ساتھ ہے۔ اور جس کے پاس ایک فائل ہے۔ آگے آتا ہے اور ڈرتے ڈرتے فائل کھولتا ہے) بیان ہے ..... "میونسپل کارپوریشن کے میئر، مل مالک ایسوسی ایشن کے پرمکھ، جونیئر چیمبرس کے اپ پرمکھ اور راشٹری کلب کے منتری سیٹھ شری ——

میئر:۔ (گرج کر) پھر اس میں یہ غلطی کیوں ہوئی۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ میں ایڈیٹر کو تمہارا بھائی سمجھ کر بیان بھی دیتا ہوں اور مل کے تمام اشتہارات بھی۔

سرلیش:۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں اُس کی خبر لیتا ہوں۔ ..... (اور سرلیش چلا جاتا ہے)

ایک کانگریسی:۔ یہ اخبار ہی بڑا ردّی ہے صاحب .....

(ساتھی اخبار موڑ کر بغل میں دبا لیتا ہے)

دوسرا کانگریسی:۔ لیکن آپ کا بیان کیا تھا صاحب۔

میئر:۔ یہی کہ میں ... میں اپنے جنم دن پر اپنی عمر کے برابر ۵۰ سڑکوں کی صفائی خود اپنے ہاتھ سے کروں گا۔

ایک اخباری نمائندہ:۔ کیا آپ اس حلقے سے انتخاب لڑ رہے ہیں۔

میئر:۔ جی ... لیکن میرے خیال میں اس شرم دان اور الکشن کا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ ہے۔

میئر:۔ ہے؟ کیا مطلب؟

اخباری نمائندہ:۔ شرم دان اور الکشن دونوں کوڑا کرکٹ صاف کرتے ہیں۔

ایک کانگریسی:۔ ستیہ ہے۔ بیلوں کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔

دوسرا کانگریسی:۔ ہمارے سامنے کون ٹھہرے گا صاحب۔ ہم نے مخالف پارٹی کے کچرے کو صاف کرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔

دوسرا اخباری نمائندہ:۔ (کانگریسیوں سے) اس چناؤ میں آپ کو کانگریس کا ٹکٹ ملنے کی تمکتیا ہے؟

ایک کانگریسی:۔ یہی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسرا:۔ آپ کی دعا ہو جائے (میئر کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے)

(ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ سب کو نمستے کرتا ہے۔ کوئی اُس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ وہ سیدھا اخبار کی دکان پر جاتا ہے۔ ایک اخبار اُٹھاتا ہے۔ اور ان لوگوں کی باتیں سننے لگتا ہے)

میئر :۔ (اخبار کے نمائندے سے) میرا خیال ہے۔ تم اس شرم یگن اور الکشن کا سمبندھ نہیں سمجھ سکے۔

اخبار کا نمائندہ :۔ جی میری بات بالکل صاف ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس شرم یگن اور الکشن دونوں بکھرے ہوئے کچرے کو ایک جگہ لا کر جمع کر دیتے ہیں۔

میئر :۔ کیا مطلب؟

اخبار کا نمائندہ :۔ میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے ــــــ

دوسرا اخبار کا نمائندہ :۔ آج کے اس شرم یگن میں آپ کو ایسا کوئی واقعہ پیش آیا جس نے ــــــــ

میئر :۔ (بات کاٹتے ہوئے) میرا یہ شرم یگن ہی کیا کم واقعہ ہے۔

اجنبی :۔ (جو اخبارات کی دکان پر کھڑا تھا، آگے آتے ہوئے) شرم شرم۔

(اجنبی شرم یگن ہی کہنا چاہتا تھا لیکن ہندی کے تلفظ ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکا۔ اس لئے میئر صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی گویا اُس نے میئر صاحب کے اس شرم یگن کو شرمناک بتایا ہے)

میئر :۔ (برافروختہ ہو کر) کیا کہا؟ کون ہے تو؟ (اجنبی "میں ... میں ــــ" اُسے کچھ بولنے کا موقع نہیں ملتا) وہ راستہ جو پوجیہ مہاتما گاندھی جی کا بنایا ہوا ہے اُس پر چلتے ہوئے تجھے شرم آتی ہے۔

کانگریسیوں کا ساتھی :۔ بول (اُسے دھکا دیتا ہے)

ایک کانگریسی :۔ یہ دیش دروہی ہے۔

دوسرا کانگریسی :۔ یہ کمیونسٹ ہے۔ دیکھو اس کے ہاتھ میں اخبار بھی کمیونسٹوں کا ہے۔ (وہ اخبار چھین لیتا ہے) اسے مارو۔ یہ سمجھتا کیا ہے۔

(دونوں کانگریسی اُسے پکڑ لیتے ہیں۔ دوسرے دو چار آدمی بھی آجاتے ہیں۔ اور اُسے پیٹنے لگتے ہیں۔ اجنبی کچھ بولتا ہے لیکن اسکی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ فوٹوگرافر تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور سب اُسے مارتے ہوئے دنگ سے باہر لے جاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کانگریسی واپس آتے ہیں۔ سب کے چہروں پر فاتحانہ مُسکراہٹ ہے۔ کوئی کہتا ہے "بے ایمان کہیں کا" ..... کوئی کہتا ہے "یہی دیش کا خطرہ ہے"..... "مہاتما جی کو بُرا بھلا کہتا ہے" وغیرہ وغیرہ

۲۔ اخبار کا نمائندہ :۔ (۲۔ کانگریسی سے) آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ (بابا داخل ہوتا ہے)

۲۔ کانگریسی :۔ مر بھی جاتا تو کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے آزادی کی جنگ میں حصّہ لیا۔ اور کانگریس کی خدمت کرتے ہوئے اُونچے اُونچے عہدوں پر پہنچے اور ــــــــ

۱۔ کانگریسی :۔ (بیچ میں بول اُٹھتا ہے) ہمارے بھاگیہ کہاں ایسے۔

۲۔ کانگریسی :۔ لیکن ایسے لوگوں سے لڑنا بھی جنگ آزادی میں حصّہ لینے سے کچھ کم نہیں ہے۔

میئر :۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ـــــ (بات ادھوری رہ جاتی ہے)

۱۔ کانگریسی } دونوں ایک ساتھ :۔ اسی لئے ہم اپنے پران تک نچھاور کرنے کو تیار ہیں
۲۔ کانگریسی } اسی لئے ہم کانگریس کی خدمت کرنا چاہتے ہیں

میئر :۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) ایسے ہی لوگ غدّار ہیں، جو گاندھی جی کے بتائے ہوئے مارگ شرم یگن کو نیچ کام جانتے ہیں۔ پُورے دیش میں اُونچ نیچ۔ ذات پات اور بھید بھاؤ کی دیواریں کھڑی کرنے والے یہی دیش دروہی ہیں۔ اور ــــــ

بابا :۔ (نزدیک آکر) اور اہنسا۔ اہنسا پرمو دھرم

میئر :۔ شاباش۔ دیکھو یہ بات ایک بھیک منگا بھی جانتا ہے (اپنی جیب سے پاکٹ نکال کر ایک روپیہ اُسکی طرف بڑھاتے ہیں۔ بابا قہقہہ لگاتا ہے)

۲۔ کانگریسی :۔ یہ بھکاری نہیں ہے صاحب۔

۱۔ کانگریسی :۔ جب سے صاحب حکومت "بھکاری شاہو دیو چھا" کا آرمبھ کیا ہے، ہم نے کئی بھکاریوں کو پکڑوا کر حکومت کے اس کاریہ میں بڑی سہائتا کی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک کوی کو پکڑوا دیا تھا۔ (زور سے ہنسنے لگتا ہے۔ لیکن میئر صاحب کو اپنی طرف متوجہ نہ پاکر اُسکی ہنسی یک لخت رک جاتی ہے)

میئر:- تو پھر یہ کون ہے۔

۲-کانگریسی:- یہ پاگل ہے صاحب۔ دن بھر اسی فٹ پاتھ پر چکر لگایا کرتا ہے۔

بابا:- تو پھر تمہاری حکومت "پاگل نابود یوجنا" کیوں نہیں بناتی۔ اور تمہاری سبھا سنا کی بھیک کیوں نہیں مانگتی۔ جانتے ہو اگر ایسا ہوا تو پورا بھارت پاگل خانہ بن جائے ..... (قہقہہ لگاتا ہے)

۲-کانگریسی:- ہے نا پاگل- میں پہلے ہی کہتا تھا۔

میئر:- (گھڑی دیکھتے ہوئے کہتے ہیں) اب آگیا دیجئے۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔

۲-اخباری نمائندہ:- آپنے آج کا "جنتا سا چار" پڑھا۔

میئر:- میں نے اُس اخبار میں کوئی بیان نہیں دیا۔

۲-اخباری نمائندہ:- (یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کے بنگلے کے نوکروں نے جو ہڑتال کی تھی ———

میئر:- اُس خبر کو شائع ہوئے دو تین روز ہو چکے ہیں . . . اور آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ دو روز سے ہیں اور میری فیملی کے تمام افراد بغیر نوکروں کے بڑے ہی اطمینان اور سکون سے رہتے ہیں۔ میں بغیر نوکروں کے چلا لوں گا۔ لیکن مزدور یونین کے بہکائے ہوئے نوکروں کے سامنے نہیں جھکوں گا (تقریر کا انداز) سمجھو۔ یہ صرف میرے ہی گھر کا سوال نہیں ہے۔ پورے دیش کا ہے۔ اگر ایک مرتبہ ہم اِن لوگوں کے سامنے جھک گئے تو یاد رکھو وہ دن دور نہ ہوگا جب ہمارا پورا دیش ان کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ ہمیں اِن لوگوں کے خلاف جنگ کرنی ہے۔ اور . . . اور . . . . . .

۲-اخباری نمائندہ:- معاف کیجئے صاحب۔ وہ خبر اس سے بالکل مختلف ہے۔

میئر:- کیا ہے اُس خبر میں۔ ہے آپ کے پاس اخبار . . . . (سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ گویا پوچھ رہے ہوں ہے کسی کے پاس اخبار؟)

بابا:- وہ رہی دکان جتنے چاہے اتنے اخبار اُٹھا لاؤ۔ پڑھو یا لڑکپن کا شوق پورا کرو۔ کاغذ کے طیارے اُڑا کر (قہقہہ)

ایک شخص دوڑ کر جاتا ہے۔ اور "جنتا سا چار" کی دو تین کاپیاں اُٹھا لاتا ہے۔ اور ایک کاپی میئر کو دیتا ہے۔ اور دوسری کاپی اخبار کے نمائندے کو۔ اور خود اُس اخبار کی ایک کاپی کھول کر اُس خبر کو تلاش کرتا ہے)

۳-اخبار کا نمائندہ:- (کھنکھارتے ہوئے) نگر پتی کے بنگلے پر نوکروں میں فساد۔ بنگلے کے نوکروں نے دو تین روز سے ہڑتال کر دی تھی۔ اس لئے بنگلے کی صفائی کے لئے باہر سے کچھ نوکر بلائے گئے تھے۔ لیکن ہڑتالیوں نے اُنہیں بنگلے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ اسی میں آخر خون خرابے تک نوبت پہنچ گئی۔ اور نگر پتی نے ———

میئر:- (خفگی سے چلاتے ہوئے) سب بکواس ہے۔ میں اِس پیلے پیپر اخبار کو بند کرا دوں گا۔ کون ہے اس کا ایڈیٹر—

۳-اخبار کا نمائندہ } ایک ساتھ:- مسٹر ڈیسائی
بابا } کوئی ہوگا گھر کا بھیدی

میئر:- لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ۔

بابا:- یہ جھوٹ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا کہ ہمیشہ چراغ تلے ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے نچوڑ۔ سڑکیں صاف کرنے کے بجائے ——— (بات ادھوری رہ جاتی ہے)

۳-اخبار کا نمائندہ:- اور آگے لکھا ہے:

میئر:- (جھٹکے سے اخبار چھین لیتے ہیں) یہ الکشن اسٹنٹ ہے میرے خلاف۔ کمیونسٹوں کی سازش ہے۔ لیکن آپ یاد رکھئے کہ اگر آپ نے مجھے ووٹ نہ دیا تو پورے کارپوریشن پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور .... اور .....

بابا:- آپ ہار جائیں گے۔

میئر:- (غصے میں) تم لوگ منہ کیا دیکھتے ہو میرا۔ نکالو اس غدار کو . . . . (جانے لگتے ہیں)

۱۔ کانگریسی:۔ (پیچھے جاتے ہوئے) لیکن وہ پاگل ہے۔

ممبر:۔ (چیخ کر) تم سب پاگل ہو ..... (اور سب چلے جاتے ہیں)

(اُن کے جاتے ہی ایک پارسی داخل ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ ایک نوکر۔ نوکر کے پاس دیواروں پر اشتہار لکھنے کا سامان ہے۔ نوکر بائیں طرف نکل جاتا ہے)

پارسی:۔ آئے توبی دریچہ گدھیرا (تو بھی ڈرتا ہے گدھے)
اے بیل چھے تو ہوں بی سینہ چھوں (وہ بیل ہے تو میں بھی شیر ہوں)
(پارسی شیر کی طرح ڈکارنے کی ناکام کوشش کرتا ہے)
جا چہاکے باجو لکھی دیجے (جا چاروں طرف لکھ دے)
تاں کاں لکیچہ (وہاں کہاں لکھتا ہے)
اور پارسی بھی اخبارات پر سے گذرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ دُور اخبار فروشوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔
"مدراس میں طوفان"

مولانا:۔ (جو پارسی کے جاتے ہی داخل ہوئے ہیں) طوفان۔ طوفان۔ خدا خیر کرے (اخباروں کی طرف جاتے ہوئے) انسان جانتا ہے کہ وہ فانی ہے پھر بھی کتنا سرکش ہے۔ ہر روز خون خرابے۔ طوفان فساد (ایک آہ بھر کر) سچ ہے لافانی تو صرف اُس کی ذاتِ وحدہٗ لاشریک ہے۔
(مولانا اخبار کی دکان سے ایک اُردو اخبار لیتے ہیں۔ اور پیسے نکالنے کے لئے جیبیں ٹٹولتے ہیں۔ کہ اُن کی نگاہیں اُن کے سامنے کھڑے ہوئے پنڈت جی سے چار ہوتی ہیں۔ پنڈت جی گذرتے ہوئے مولانا صاحب کی فانی اور لافانی پر خود کلامی سُن کر رُک جاتے ہیں)

پنڈت جی:۔ (جیسے ہی مولانا سے اُن کی نگاہیں ملتی ہیں) ادشیہ ادشیہ پُرش ادشیہ مُرتک ہے۔ جان پڑتا ہے آپ نے میرے لیکھ کا ادھین کیا ہے۔

مولانا:۔ کیا فرمایا آپ نے۔

پنڈت جی:۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے کے سولھویں اشلوک میں ہے (پنڈت جی سنسکرت میں پڑھتے ہیں جو مولانا کو بہت ناگوار گذرتا ہے)

مولانا:۔ آپ کیا فرماتے ہیں پنڈت جی۔ آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

پنڈت جی:۔ یہی ارتھ ہے۔ پُرش مرتک ہے۔ اور کیول بھگوان کو مرتیو نہیں ہے۔ گیتا کے انہیں وچاروں پر میں نے ایک لیکھ لکھا ہے۔ ٹھہرئے (پنڈت جی اپنے جھولے میں اخبار تلاش کرتے ہیں اور مایوس ہو جاتے ہیں) کہاں گیا وہ پتر... (اخبار کی دکان پر اُس اخبار کو دیکھ کر اُٹھا لاتے ہیں۔ اور مولانا کی طرف بڑھاتے ہوئے) پڑھئے۔ اس میں وہی سب وچار ہیں جو آپ کہہ رہے تھے۔

مولانا:۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ آپ کے ہوش ٹھکانے ہیں پنڈت جی۔ میں جو کچھ کہہ رہا تھا قرآن شریف فرقانِ حمید کی وہ آیتِ کریمہ ہے جس میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کی ذات فانی ہے اور لافانی صرف اُس کی ذاتِ اقدس ہے۔ آیا خیال شریف میں۔

پنڈت جی:۔ سمجھا سمجھا۔ کنتو پڑھئے تو سہی۔

مولانا:۔ لاحول ولا قوۃ۔ پنڈت جی یہ کونسی جناتی زبان آپ مجھے پڑھانا چاہتے ہیں۔

پنڈت:۔ ارتھ

پروفیسر رگھوناتھ:۔ (جو کچھ دیر پہلے آئے ہیں اور اخبار کی دکان سے اخبار اُٹھاتے ہوئے) ارتھ صاف ہے پنڈت جی۔ یہ لوگ اِس دیش کی راشٹر بھاشا کو راکششی زبان کہتے ہیں۔

پنڈت جی:۔ راکششی؟ ارتھات ہم راکشش ہوئے؟ اندھکار گھور اندھکار۔ کیا یگ ہے یہ۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ اسی کو کلجگ کہتے ہیں پنڈت جی۔ جن لوگوں نے اکھنڈ بھارت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا وہ اب بھی اِسی بھومی پر ہماری چھاتی پر مونگ دلے کو باقی ہیں۔

مولانا:۔ اگر کچھ بھی خوفِ خدا ہے تو اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو۔ کیا اس زمین پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔
یہ زمین ہماری ہے۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ (ہنستے ہوئے) یہ زمین تمہاری کہاں سے آئی۔ پہلے تو تم پکارا کرتے تھے یہ زمین خدا کی اور حکم بادشاہ کا۔ کہاں گئے وہ بادشاہ جو تیرہ سو برس پہلے سندھ پر تلواریں لئے ٹوٹ پڑے تھے۔

مولانا:۔ وہ بادشاہ نہیں تھے مجاہد تھے مجاہد۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ اور اسی لفظ کا سہارا لیکر تم لوگوں نے دوسروں پر حکومت کی ہے۔

مولانا:۔ یہ جھوٹ ہے۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ تاریخیں شہادت دیتی ہیں۔ میں ۲۰ سال سے تاریخ پڑھاتا ہوں۔ میں تاریخ کا پروفیسر ہوں پروفیسر۔ پروفیسر رگھوناتھ۔ سُنا ہے نام؟

ڈاکٹر فاروقی:۔ (کالی شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس۔ ابھی ابھی داخل ہوئے ہیں۔ اخبار لے رہے تھے کہ پروفیسر رگھوناتھ کا جواب دینے کے لئے آگے آگئے ہیں) تو پھر مسٹر رگھوناتھ۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ راجہ داہر نے محمد بن حارث جیسے مسلمانوں کے غدّار کو پناہ دی تھی۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے۔

ڈاکٹر فاروقی:۔ تو دیکھیئے نزہتُ الخواطر صفحہ نمبر ۱۱۔ اور ولید بن عبد الملک اور اُن کے ساتھ جو عورتیں اور بچے تھے۔ اُن کے ساتھ آپ کے سندھ والوں نے کیا سلوک کیا تھا۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ یہ آپ نے کسی ناول میں پڑھا ہوگا۔

ڈاکٹر فاروقی:۔ ناول میں نہیں جناب۔ میں بھی ۲۵ سال سے تاریخ پڑھاتا ہوں۔ ڈاکٹر شعیب ایاز فاروقی۔ صدر شعبۂ تاریخ۔

(چند لوگ جمع ہو چکے ہیں)

ایک تائید کرنے والا:۔ دو اِس کا جواب۔

دوسرا:۔ کب سے پروفیسر پروفیسر کرتا تھا۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ تم چپ رہو۔ میں ابھی جواب دونگا۔ یہ لوگ سندھ سے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں حکومت قائم کرلی۔ یہاں کے ہندوؤں کو غلام بنالیا۔ دھرم بھرشٹ کیا اور کئی مندر گرادئے۔

ڈاکٹر فاروقی:۔ یہ تم نہیں تمہاری دشمنی بول رہی ہے۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ دشمنی نہیں۔ اِتہاس بول رہا ہے۔ کیا اورنگ زیب نے مندر نہیں توڑے۔

ایک شخص:۔ نہیں۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ جتنا مندر جو سرش پور میں واقع تھا اُسے کس نے توڑا تھا۔ اگر یہ پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھو سر جدوناتھ سرکار کو۔

ڈاکٹر فاروقی:۔ وہ کیوں توڑے گئے معلوم ہے۔ اُس وقت مندر حکومت کے خلاف سازشوں کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ راجہ جے سنگھ نے کھمبایت میں ایک مسجد کو توڑا تھا اور ۸۰ مسلمانوں کو قتل کیا تھا جانتے ہو۔

ایک شخص:۔ اور سومناتھ کا مندر کس نے توڑا تھا۔

دوسرا شخص:۔ اب بولو۔ (شور ہوتا ہے)

پارسی:۔ (بھیڑ چیر کر پیچھے سے آتا ہے) بن آئے شو نچھو۔ آئے کیا ہے۔

پروفیسر رگھوناتھ:۔ دیکھو یہ ہے مسلمانوں کے ظلم کا ثبوت۔

پارسی:۔ ہوں؟ میں؟

پروفیسر رگھوناتھ:۔ آٹھویں صدی میں بیچارے ان لوگوں کو بھی خراسان سے مار کر نکال دیا تھا۔ اور ان لوگوں نے بھارت میں آکر پناہ لی تھی۔

پارسی:۔ آئے کوئی بات نتھی۔ روز مہاری وائف مو ہنے گھر سے نکال دیچھ۔ تو شوں کرو نچھ۔ کیا کرو نچھ بولو۔ اسی لئے کہو نچھ لڑائی جھگڑا چھوڑو۔ ابھی بھارت کو ضرورت چھے ایکتا کی۔ انے (اور) ایکتا کے لئے بھائیو اپنا اپنا ووٹ مو ہنے دو۔

(بابا قہقہہ لگاتا ہے۔ پارسی سر پکڑ لیتا ہے سب کا دھیان اُدھر ہو جاتا ہے)

بابا:۔ ٹھیک ہے میرے دوست ٹھیک ہے۔ یہ ملک بھی ناز

کرتیا کہ اِس دھرتی پر بہتی ہوئی گیان گنگا سے اُس کے سپوت اپنے خیالات اور جذبات کی تمام بُرائیاں ہر وقت دھوتے رہتے ہیں۔ تم پروفیسر صاحب بیس سال سے اتہاس پڑھاتے ہو۔ اور آپ ڈاکٹر صاحب ۲۵ سال سے تاریخ پڑھاتے ہیں۔ مجھے صِرف ایک بات کا جواب دو۔ تاریخ کے ہزارہا صفحات میں مُردہ واقعات کی لاشوں پر رینگتے ہوئے لاکھوں کروروں کیڑے مکوڑوں کے گھناؤنے جنگل میں محبّت کا کوئی پھُول بھی کھِلا ہے۔ اگر تمہارے ذہن غلاظت اور بدبُو سے بس چکے ہیں تو مجھ سے سنو۔ بھارت کی تہذیب کی بنیاد اِن لاشوں پر نہیں ہے۔ بلکہ پیار محبّت اور بھائی چارے کی مہک کے دوش پر ہے۔ کبھی یہاں کے گیانی سنسکرت کے صحیفے لیکر ایران وعرب گئے کبھی یہاں کسی ہندو راجہ نے قرآن پاک کا ترجمہ کروایا۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر بھارت کی نئی نسل کو اچھا سبق پڑھاتے ہو۔ اگر تمہارے پاس یہی علم، یہی اتہاس اور یہی کتابیں ہیں تو جُلادو انہیں۔ بھسم کر دو ایسے علم کو اور لوگوں کو جاہل ہی رہنے دو۔ اگر تمہارے مذہب بیر سکھاتے ہیں، تو انسان کو ایسے کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔ (ہنستا ہے)

(کئی لوگ گردنیں جھکائے چلے گئے ہیں۔ چلے جانے والوں میں پروفیسر صاحبان بھی ہیں اور ملّا اور پنڈت بھی)

پارسی:۔ آئی بی پاگل مانس ہے۔ بالکل پاگل۔ ہماری بات مانو اور ہمنے ووٹ دو۔ مارو (میرا) نشان چھے شیر۔

ایک شخص:۔ ہم تمہیں ووٹ نہیں دیں گے۔ تمہیں بھاشا اوپکار ہے۔

دوسرا شخص:۔ تم انگریزی کی حمایت کرتے ہو اِس لئے ہم تمہیں ووٹ نہیں دیں گے۔

نوجوان:۔ ہمیں انگریزی چاہئے۔

ایک مخالفت کرنے والا:۔ انگریزی نہیں چاہئے ہندی بھاشا

کچھ لوگ:۔ مُردہ باد۔

ایک آواز:۔ ہندی بھاشا۔

کچھ لوگ:۔ دور کرو۔

(ایک پولیس انسپکٹر دو تین سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے۔ اور لوگوں کو بکھر جانے کے لئے کہتا ہے۔ لوگ جانے لگتے ہیں۔ سب چلے جاتے ہیں۔ انسپکٹر بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ چلا جاتا ہے بابا وہیں کھڑا ہے۔ ہندی کے خلاف ایک جلوس نکلا ہے جس کے نعرے یہاں تک سُنائی دیتے ہیں۔ آواز نزدیک آتی جاتی ہے۔ جلوس کے دو تین آدمی یہاں آتے ہیں۔ ایک شخص اخبار کی دکان پر ہندی اخبار کی طرف اشارہ کرکے)

ایک شخص:۔ ہندی اخبار۔

دوسرا:۔ پھینک دو۔

(لوگ جمع ہو جاتے ہیں)

ایک شخص:۔ ہندی اخبار۔

دوسرا:۔ پھینک دو۔ (اخبار اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اُس لڑکے کی دکان کے تمام اخبارات لُوٹ رہے ہیں)

بابا:۔ ٹھہرو۔ اِس دکان کو مت لُوٹو۔ یہ ایک غریب کی دُکان ہے۔ وہ نہیں جانتا تمہاری سیاست۔ وہ تو جانتا ہے غریبی اور بھوک۔ اور اِسی لئے اُس نے چار پیسے کمانے کے لئے یہ دُکان لگائی ہے۔

(ایک شخص بابا کو دھکّا دیتا ہے۔ کچھ لوگ بابا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فسادی آگے بڑھ چکے ہیں۔ تمام اخبارات سڑک پر بکھرے پڑے ہیں۔ بابا سڑک پر گرا ہوا ہے۔ اُس کی بیساکھی دُور پڑی ہے۔ اُس کی پیشانی سے خون بہتا ہے۔ وہ اُٹھنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ لڑکا داخل ہوتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں خالی بوتلوں کا پنجرہ ہے)

مُنّا:۔ بابا۔ بابا۔ یہ کیا ہوا بابا۔

بابا:۔ گھبرا مت بیٹے۔ وہی ہوا ہے جو ہونا چاہئے تھا یہی دستور ہے اِس دنیا کا۔ اور یہی ہوتا آیا ہے۔

مُنّا:۔ لیکن یہ سب کِس نے کیا ہے؟

بابا:- کس نے نہیں کیا ہے پوچھ بیٹے ارمان اور حوصلوں کو کچلنے
والے معمولی لوگ نہیں تھے بیٹا، بڑے بڑے لوگ تھے۔
کوئی فنکار تھا تو کوئی مِل مالک۔ کوئی اہنسا کا پجاری
تھا تو کوئی ایکتا کا۔ کوئی دھرمی تھا تو کوئی عالم لیکن
کسی کے دل میں درد نہیں تھا سب بے رحم تھے۔ اندھے
خود غرض۔

منّا:- (روتے ہوئے) لیکن میں نے اُن کا کیا بگاڑا تھا بابا۔

بابا:- تو ہندی کے اخبار بیچ رہا تھا۔

منّا:- ہندی کے اخبار بیچنا کیا پاپ ہے بابا۔

بابا:- پاپ اور پُنیہ اب خود غرضی کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں۔
علم و مذہب کی روشنی میں اُن کو دیکھنا بیکار ہے۔ کوئی
ہندی کو اپنی زبان کہتا ہے۔ کوئی پرائی اور کوئی آکاشی۔
جیسے سب یہ بھول چکے ہیں کہ بھارت کی مشترکہ تہذیب کے
ابتدائی نقوش اسی زبان میں اُبھرے تھے ـــــ

(اسکول کے چار چھ بچے اپنے بستے لٹکائے ہوئے گذرتے ہیں)

ایک بچہ:- ایک تھال موتی سے بھرا۔

۲- بچہ:- سب کے سر پر اوندھا دھرا۔

۱- بچہ:- چاروں اور وہ تھال پھرے

۲- بچہ:- موتی اُس سے ایک نہ گرے (دونوں ایک ساتھ) بوجھو۔

۳- بچہ:- مکئی۔

دونوں:- نہیں۔

۴- بچہ:- آسمان۔ (اور سب ہنستے ہوئے گذر جاتے ہیں۔
بابا انہیں دیکھتے رہتے ہیں)

بابا:- (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) دیکھا ان معصوم ہونٹوں
پر آج بھی خسرو بانی ہے۔ لیکن جب سے اس زبان کے
ہاتھ میں حکومت نے "راشٹریہ" یا "قومی" ہتھیار
پکڑا دیا ہے، خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں اندھے
کی لاٹھی بن چکی ہے کہیں فساد ہوتے ہیں کہیں گولیاں
چلتی ہیں اور کہیں ہمارے خواب چکنا چور ہوتے ہیں۔
کوئی بات نہیں بیٹے کوئی بات نہیں۔ میری بیساکھی تو
لے آ۔ (منّا بیساکھی دیتا ہے۔ بابا کھڑا ہو جاتا ہے۔ تبھی
چار شخص شور مچاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اندر آنے

جلنے والوں سے دستخط لے رہے ہیں۔

ایک نوجوان:- سائن پلیز ـــ (ایک شخص دستخط کرتا ہے)

دوسرا نوجوان:- سائن پلیز۔ (دوسرا شخص دستخط کرتا ہے)

ایک راہگیر:- یہ کیا ہے صاحب۔

۳- نوجوان:- ہم HUMAN WELFARE SOCIETY
کی جانب سے عوام کے دستخط جمع کر رہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں
کے خلاف ... ایٹمی ہتھیار ہزاروں سال کی تہذیب و
ترقی اور نوعِ انسانی کے لئے زہرِ قاتل ہیں۔ اس لئے ہم
چاہتے ہیں کہ تمام دنیا کے لوگ "جیو اور جینے دو" پر
عمل کریں۔ ہم دنیا کے کسی گوشے کو ہیروشیما یا ناگاساکی
نہیں بننے دیں گے۔

راہگیر:- (دستخط کرتے ہوئے) بہت اچھے صاحب۔ بڑی
ضرورت ہے اس بات کی۔

بابا:- کیا میں بھی دستخط کر سکتا ہوں۔

۴- نوجوان:- جی ہاں بڑے شوق سے۔ آپ بھی انسان ہیں۔

بابا:- (طنزیہ ہنسی۔ اپنی پیشانی پر لگے ہوئے خون کو اپنے
انگوٹھے پر لیتے ہوئے) انسانیت کے پرستاروں کے نام۔
امن اور شانتی کے پیغمبروں کے نام۔ جنہیں آج تک دھرتی
کے حسین چہرے پر ہیروشیما اور ناگاساکی کے جلے ہوئے
داغ یاد ہیں۔ لیکن یہاں ہر روز خود غرضی اور مفاد
پرستی کے بم پھٹتے ہیں۔ نفرت کا دھواں اٹھتا ہے اور
ہر روز ایک معصوم دنیا جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

(کاغذ پر اُسی انگوٹھے کا نشان لگا دیتا ہے۔
سب اُسے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ وہ جانے لگتا
ہے۔ اسٹیج پر روشنی کم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص
ہاتھ میں ٹرانسسٹر لئے گذرتا ہے۔ نغمہ سنائی
دیتا ہے۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

(پردہ گر جاتا ہے)

مہدی پرتاب گڈھی

پندرہ اگست

رہِ طلب میں جو اہلِ جنوں کے پاؤں بڑھے
تو روک ہی نہ سکا اُن کو خوفِ دار و رسن
نہ جانے کتنے شگوفوں کی پائمالی سے
نکھر سکی ہے فضائے جمالِ صبحِ چمن

وہ جس کے خواب سجاتے رہے تھے مدت سے
لہو میں ڈوب کر آئی وہ آرزو کی سحر
گلوں پہ فصلِ بہاراں میں کتنا ظلم ہوا
چمن میں رہ کے بھی یہ آج تک ہیں خاک بسر

زمیں بٹ گئی، دِل بٹ گئے، نگاہ بٹی
ہوئی نہ ختم یہیں یہ حدیثِ زہر چکاں
لہو شفق کے گلابی لبوں سے رِس کے رہا
دلوں سے پھوٹ پڑا ایک نفرتوں کا دھواں

چمن میں آیا تو رنگ اور نُور کا موسم
مگر شگوفے کہاں، صرف زخمِ دل مہکے
خلوص و مہر و محبت کی بات کیا کیجیے؟
دِلوں میں بغض و کدورت کے داغ جلنے لگے

مقامِ فکر و نظر تو ملا ہمیں، لیکن!
علاج ہو نہ سکا اپنے سوزِ پنہاں کا
رہی حیات سے وابستہ تلخیٔ احساس
بھلایا جا نہ سکا، ہم سے دردِ انساں کا

مَنایا ہم نے کئی سال جشنِ آزادی
مگر بدل نہ سکے پھر بھی زندگی کا چلن
کبھی نہ سوچا کہ وابستہ ہیں اِسی دن سے
جہانِ امن و مسرت، نوائے فکر و سخن

یہ صرف جشنِ طرب ہی نہیں ہے، ہم وطنو!
کچھ اِس کے "درس" بھی ہیں اور کچھ "تقاضے" بھی
اِسی سے آج ہے زندہ وطن کی یک جہتی
"ضرورتیں" بھی کچھ اِس کی ہیں اور "ارادے" بھی

جہانِ حسنِ بصیرت اِسی سے ہے منسوب
اِسی کے دم سے ہے، ہر خواب "عہدِ زریں" کا
یہ صرف روزِ مسرت نہیں اک "عہد" بھی ہے
وہ "عہد" جس سے عبارت ہے عظمتِ فردا

یہ دن کہ جس سے ملی زندگی کو رعنائی
یہ ہم سے جذبِ وفا کا ثبوت مانگے ہے
جلا کے ذہن میں احساسِ فرض کی قندیل
چمن میں فکر و نظر کا ظہور ڈھونڈھے ہے

افسانہ:- اشتیاق نجم بدایونی

روشن راہیں

اُداس اور یاس انگیز رات کے مہیب سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اس کے دلِ حزیں کے نہاں خانوں میں غم و یاس، افسردگی اور مایوسی کے طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس نے سوچا کس قدر ناکام، نامراد اور مایوس کن ہے اسکی اپنی زندگی ـــــ کسی بھی عنوان اُسے سکون حاصل نہیں۔ وہ انتہائی بے چینی کی حالت میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا مختلف گتھیاں تھیں جن کی اُدھیڑ بُن میں اُس کا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔

"آج آپ اسقدر پریشان کیوں ہیں۔ تکلیف کچھ زیادہ ہے کیا؟" پاس ہی دوسرے پلنگ پر لیٹی ہوئی انجم سے اُس کی مضطرب حالت نہ دیکھی گئی تو وہ پُوچھنے پر مجبور ہو گئی۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں ابھی تک تم سوئی نہیں ہو؟" اُس نے موضوع بدلنے کی غرض سے فوراً سوال کر دیا۔

"ہاں آج نیند نہیں آ رہی ہے، دوپہر کچھ دیر سوئی تھی نا؟"

نجمی بخوبی جانتا تھا کہ انجم محض بات بنا رہی ہے۔ اُسکی مسلسل بیماری کی وجہ سے اُس کے روزمرّہ کے کاموں میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ گھر کے کام دھندوں سے بھلا اُسے فرصت ہی کہاں جو وہ سوئے۔ نیند سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں پُرسکون زندگی والے۔ ایک ایسی کشتی جو موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہو، بھلا اُسے سکون اور قرار کہاں!

انجم نے دبے دبے لہجے میں دریافت کیا "کیا آپ ڈاکٹر کے یہاں گئے تھے۔ کیا کہا اُس نے؟ ایکسرے اور خون کی رپورٹ ملی یا نہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر کے یہاں گیا تو تھا مگر ڈاکٹر ورما کے یہاں جانا نہ ہو سکا۔" وہ بُجھے بُجھے سے لہجے میں بولا۔

"پھر اتنی دیر کہاں لگا دی آپ نے؟" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

ویسے کچھ اُس کی جان میں جان آ گئی۔ ورنہ اس کا جی تو ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں ایکسرے اور بلڈ کی رپورٹ کیسی رہی، جو اسقدر ذہنی اُلجھن اور مایوسی کی شکنیں نجمی کی پیشانی پر اُبھر رہی ہیں۔ اسی وجہ سے اُس نے بات کرنا مناسب نہ سمجھی تھی۔

"کیوں خاموش کیوں ہیں بتاتے کیوں نہیں آپ؟" انجم کسی قدر غصّہ سے بولی۔ جو محض مصنوعی تھا۔

"میں ـــــ ہوں ـــــ انجم آج بلڈ بینک چلا گیا تھا تاکہ اپنا خون دے سکوں؟"

"ہیں تو ـــــ" وہ گھبرا کر بستر سے اُٹھ بیٹھی ـــــ "آخر یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ آپ کی یہ تو حالت ہے اور اُس پہ خون دینے کے لیے جا پہنچے۔" وہ بڑے اندوہگیں لہجے میں بولی۔

"تم نہیں جانتیں انجم۔ اب اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں رکھا ہی کیا ہے، دق کے مسلسل مرض نے ہڈیوں کا گودا چوس لیا ہے۔ خون کو پوری طرح جراثیم سے بھر دیا ہے ــ انجم ــــــ میں بھی کتنا بدنصیب ہوں کہ آج تک تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا۔ خود اپنے لئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ اپنے سماج، قوم اور ملک کے لئے کچھ نہ کر سکا ــــــ کس قدر بدنصیب ہوں میں انجم ــ! ــ اور آج جب یہ سوچا کہ اپنے خون ہی کو دیش کے چرنوں پر نچھاور کر دوں ــــــ تو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُف یہ ناکامیاں ــ جیسے سایہ بن کر میرے وجود پر چھا گئی ہیں ــ انجم ــ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ خون میں دق جیسے موذی مرض کے جراثیم پوری طرح سرایت کر گئے ہیں، میرا خون کسی طرح نہیں لیا جا سکتا ــ انجم ــــــ کاش یہ خون لینے والے ڈاکٹر خون کے دوسرے اجزا کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ خون میں دوڑتے ہوئے جذبۂ ہمت، جوش اور ولولے کو بھی دیکھ سکتے۔ مجھے یقین ہے انجم کہ اگر یہی میرا فاسد خون کسی ضرور تمند فوجی کی رگوں میں دوڑے، جو آج اپنی ماں، بہن اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر صرف دیش کی پکار پر دشوار گذار سرحدوں کی حفاظت کر رہا ہے، جس نے دیش اور قوم کی حفاظت کی قسم کھائی ہے، جس نے اپنے خون کے آخری قطرے کے بہہ جانے تک مادرِ وطن کے سہاگ کو قائم رکھنے کا عزم کیا ہے۔ جس نے اپنے خون سے دیش ماتا کے چرنوں کو دھونے کا تہیہ کر لیا ہے ــــــ یقیناً اس کے خون میں میرا یہ خون ایک نئی روح، نئی اُمنگ اور نیا جذبہ پھونک دیگا ــــــ نجمی پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی اور وہ جذبات کے تیز و تند دھارے پر بہہ رہا تھا۔

انجم سرتاپا کانپ اُٹھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ نجمی کے اس بھینچے بھینچے اور سکڑے سے سینے میں ایک حساس دل ہے ــ اُمنگوں، ولولوں اور عزائم سے بھرپور ــ وہ خوب سمجھتی تھی، کہ کوئی بھی بات جو نجمی کے شیشۂ دل سے ٹکرا جائے، وہ اُسے ہر قیمت پر کر گذرتا ہے۔ اسی لئے اُس نے بات کو اور آگے بڑھانے سے احتراز برتا۔ وہ خاموش ہو رہی ــــــ گم سُم ایک مرمریں بُت کے مانند!

وہ ذہنی طور پر قطعی تھک چکا تھا۔ مگر خیالات و افکار کا ایک بے پناہ ہجوم تھا جو اُمڈے ہی چلا آ رہا تھا۔ مختلف خیالات ذہن میں آتے۔ مگر عقل و دانش کی کرنوں سے جلا نہ پا کر خود بخود ہی جھلس جاتے، وہ سوچے جا رہا تھا اور برابر سوچے جا رہا تھا ــــــ ۔ آخر کار کافی کشمکش و پیچ کے بعد اس کے سوکھے سوکھے سے زرد سے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکان جاگ ہی اُٹھی۔

انجم کی غنودگی کا پردہ تار تار ہو گیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ــــــ متوحش نظروں سے اُس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا ــــــ نجمی اپنے بستر سے غائب تھا۔ وہ چپل گھسیٹتی ہوئی اُس کے کمرے میں جا پہنچی ــ

اور نجمی ــــــ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی تصویر کے نقوش بنانے اور سنوارنے میں پوری طرح منہمک تھا ــــــ وہ لرز اُٹھی۔ نجمی کچھ اس درجہ اپنے کام میں محو تھا کہ اُسے انجم کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی ــ

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ ــ اُف رات بھر ــــ یا خدا رحم کر ــــ آخر آپ سُنتے کیوں نہیں۔ اسی لاپروائی نے تو آپ کی یہ حالت کر دی ہے۔" وہ اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے چیخ اُٹھی ــ

"انجم تم جاؤ انجم ــــ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" وہ نیم پاگلوں کے سے انداز میں بولا ــ اُس نے انجم کی طرف دیکھنے تک کی زحمت گوارہ نہ کی ــ

"مگر سُنئے تو سہی ــ" انجم جذباتی ہو اُٹھی ــ جیسے بس اب وہ رو پڑے گی ــ

"انجم مجھے پریشان نہ کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں فطرتاً ایک فنکار ہوں ــ انہیں [illegible] کے پیچھے میں نے اپنی زندگی اور حیات کی بازی لگا دی ہے۔ یہ صرف میرا پیشہ ہی نہیں ہے میرا فن پسند [illegible]

میں کھینچ رہا تھا۔

"مگر . . . . مگر اپنی حالت کو تو دیکھئے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ جیسے الفاظ بہ مشکل تمام ادا ہو رہے ہوں۔

"اب ان باتوں کو رہنے دو انجم، میں جانتا ہوں کہ یہ میرا آخری وقت ہے، اب ان چند لمحوں کو اور مجھے دیدو۔ نادرہ کو انجم نہ روکو مجھے —— تم ہی تو میرے فن کی اصل محرک ہو۔ تم ہی نے تو میرے فن کو نئی زندگی دی ہے۔ نئی روح پھونکی ہے اس میں۔ ان بے ترتیب سے نقوش کو نکھار، جاذبیت اور ایک نئے حسن سے روشناس کرایا ہے —— انجم آج میں ایک ایسے نادر شاہکار کی تخلیق کر رہا ہوں جس پر نہ صرف مجھے فخر ہے، بلکہ ملک و قوم بھی جس کی عظمت و رفعت پہ ناز کریں گے۔" زرد زرد سی ایک شوخی مسکان نے اس کے ہونٹوں کو چوم چوم لیا۔

"مگر آپ کو آرام . . . . ."

وہ ایک بے جان سی ہنسی کا سہارا لیتا ہوا بولا۔ "ہاں ہاں انجم میں جانتا ہوں مجھے آرام کی اشد ضرورت ہے۔ جبھی تو میں اب مستقل آرام و سکون کی آماجگاہ کی جانب جا رہا ہوں۔ ایک ابدی سکون اور اطمینان کی منزل کی جانب۔ اب تم ان چند لمحوں میں آرام کی فکر نہ کرو۔ وقت بیحد کم رہ گیا ہے انجم، نہایت مختصر۔"

"اُف توبہ —— آج آپ یہ کیسی مایوس کن باتیں کر رہے ہیں۔" وہ بُری طرح برس پڑی۔ آنسوؤں نے اپنی راہیں ڈھونڈلی تھیں۔

"انجم خدا کے لئے اب جھوٹی تسلیاں نہ دو۔ مجھے اپنی حالت خوب معلوم ہے۔ جاؤ جاؤ یہاں سے، مجھے اپنا یہ آخری شاہکار مکمل کر لینے دو تاکہ کم از کم میں سکون سے تو مر سکوں۔" بخی کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

"اچھا۔ اچھا لیجئے میں جا رہی ہوں —— آپ بھلا کسی کا کہنا کہاں مانتے ہیں۔"

چند دبی دبی سی سسکیاں اور کچھ آنسو اُس کے ساتھی، ہمدم اور مونس و غمگسار تھے۔

انجم اپنے اچھوتے شاہکار کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے وہ ان بے ترتیب اور بکھرے بکھرے نقوش میں ایک نئی جان اور روح پھونک رہا تھا۔ نقوش پر بکھرے ہوئے رنگ ایک نہایت ہی غمگین، اندوہناک اور دلسوز منظر کو اُجاگر کر رہے تھے، تصویر میں سورج پر دبیز بادلوں کی ایک تہہ نظر آ رہی تھی۔ ایسے مہیب بادل جنھوں نے سورج کی آب و تاب اور روشنی کو اپنے دبیز پردوں تلے چھپا رکھا تھا۔ چاروں طرف اندھیاروں کا راج تھا جیسے نیکی، سچائی اور امن پر بدی، جھوٹ اور ظلم و تشدد کی چادر تن جائے۔ مگر روشنی کی تیز و تند کرنیں بادلوں کا سینہ چاک کر کے دھرتی کے آنچل پر پھیلنے کی بھرپور کوششیں کر رہی تھیں، اور انہیں روشنی کی مدھم سی کرنوں نے کھیتی اور مٹ میلے پہاڑوں کو کسی قدر سُرخی مائل کر دیا تھا۔ کچھ دُور پر چند خزاں رسیدہ پیڑوں تلے بال بکھرائے، ہراساں اور مایوس سی ایک عورت کھڑی تھی۔ جو ٹکٹکی باندھے پہاڑوں سے اُبلتے دریا کو بڑی حسرت و یاس سے تک رہی تھی۔ دریا جس کا پانی سُرخی مائل تھا۔ عورت کی نگاہیں مایوس نہ تھیں۔ اُن میں ایک مخصوص قسم کی چمک رقصاں تھی —— یہ چمک اور تابندگی واضح طور پر اِس امر کا انکشاف کر رہی تھی کہ وہ مایوسی کا شکار نہیں ہے۔ آشاؤں اور اُمیدوں کے دیپ اب بھی اس کی آنکھوں میں فروزاں تھے —— جیسے اُمید کی حسین دیوی اب بھی اس کے حوصلوں، ولولوں اور عزائم کو بڑھاوا دے رہی ہو —— یہ عورت دراصل بھارت ماتا کی نشاندہی کر رہی تھی۔ جس پر آج آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ دریا کی سُرخی اُس کے حوصلوں کو دُونا کر رہی تھی —— اُس کا سر فخر سے بلند تھا کہ اسکے سپوت آج بھی اپنے خونِ جگر سے اُس کے سہاگ کی پاسبانی کر رہے ہیں —— یہ پہاڑ اِسی طرح قائم رہیں گے۔ دریا کی بے پناہ روانی صدیوں تک اِسی طرح جاری و ساری رہے گی۔ اور خون کی آمیزش بتدریج اِسی طرح بڑھتی رہے گی ——

اور پھر جنگ و جدل کے اِس لالہ زار میں ایک ایسی تاریخی داستان جنم لیگی جو دنیا کی تاریخ میں ایک انمٹ اور اٹل حقیقت کا

رُوپ اختیار کر جائے گی، جس کی عظمت و رفعت کے آگے نہ صرف بھارت اور بھارت واسی ہی بلکہ تمام امن، آشتی اور سچائی
میں ایمان رکھنے والی انسانیت اپنا سر فخر سے بلند کر سکے گی۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ بہتا رہا۔ ساعتیں منٹ اور گھنٹوں میں تبدیل
ہوتی گئیں۔ اور پھر فنکار مُسکرا اُٹھا۔ گنگنا اُٹھا۔ اپنے فن کی معراج پر!

وہ مطمئن تھا، خوش، مسرور اور شاداں ——— اُس نے آج اپنے اِس فن پارے میں ایک جیتی جاگتی حقیقت کو ڈھال دیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب، تمدن اور پُوری قوم کے افکار و کردار، جذبات و خیالات کو مختلف نقوش اور رنگوں کی اِس ست رنگی دھنک میں سمو دیا تھا۔ مقید و محصور کر دیا تھا ——— اور اب وہ ہر ہر زاویۂ نگاہ سے اپنے اِس اچھوتے اور نادر شاہکار کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج اس نے اپنے زہریلے اور فاسد خون کی بھی پُوری قیمت وصول کر لی تھی، جسے دق کے موذی مرض نے بیکار کر کے رکھ دیا تھا۔

" انجم.... انجم.... انجم...." وہ نقاہت کے باوجود پُوری قوت کے ساتھ چیخا۔

انجم گھبرا کر دھڑ دھڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

موسم کی خنکی کے باوجود وہ بھی پسینے سے شرابور تھا۔ رات بھر کی تھکن، بخار کی تمازت اور خون کی کئی قے اپنا بھرپور وار کر چکی تھیں۔ انجم اُس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر گھبرا اُٹھی۔ جیسے تیسے سہارا دیکر اُسے پلنگ پر لٹایا۔

" انجم.... ہیں! کیا تم گھبرا رہی ہو — پگلی — تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ اب میں سکون کے ساتھ مر سکوں گا۔ انجم میں نے آج اپنے خون کی پُوری قیمت وصول کر لی ہے۔ دیکھو نہ دیکھو یہ شاہکار — تم دیکھ رہی ہو نا؟ اِسے میں نے اپنے خونِ جگر سے جلا بخشی ہے ——— یہ خون میں نہلائے پربت اور یہ پانی کی روانی میں سُرخی کی آمیزش! یقین جانو یہ کسی مصنوعی رنگ کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ اِسے میں نے اپنی رگوں کے حقیقی خون سے جاودانی بخشی ہے، تبھی تو اِس میں فطری پن اپنی بھرپور تابانیوں اور تمام تر جولانیوں کے ساتھ اُبھر آیا ہے۔" وہ اپنا بازو دکھاتے ہوئے بولا۔ جسے اب تک انجم محض قمیض پر لگا ہوا سُرخ رنگ سمجھ رہی تھی۔

"اُف میرے خدا۔ یہ آپ نے کیا کیا!" انجم دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

" نہ روؤ انجم نہ روؤ، تمہارے یہ آنسو دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک فنکار نے اپنی منزل پالی، عظمت و رفعت کے بام و در کو چھو لیا۔ لوگ مجھے ایک فنکار کی حیثیت سے بخوبی جانتے ہیں، تم اِسے اگلی نمائش میں فروخت کر دینا۔ مجھے یقین ہے انجم اِس کے اچھے دام لگیں گے۔ ہماری قوم حقیقت شناسی سے زیادہ روایت پرستی پر یقین رکھتی ہے۔ یہی تصویر جو میری زندگی میں سو دو سو روپیہ سے زیادہ میں فروخت نہ ہوتی، میری موت کے بعد پانچ چھ ہزار سے کسی طرح کم میں نہ بکے گی۔ تم اِن روپیوں کو قومی فنڈ میں دیدینا۔ انجم تم اِن سکوں کو حقیر نہ سمجھو، یہ میرے اپنے خون کی قیمت ہونگے۔ زندگی کا سودا۔ زندگی کا بدل۔ میرے جذبات، میرے احساسات اور میرے خیالات کی اُمنگوں سے بھرپور یہ سکے جب غذا، لباس اور گولیوں کی شکل اختیار کر لیں گے تو یہ ہمارے فوجیوں کے جذبات، ولولوں اور عزائم میں ایک نئی حرارت پیدا کر دیں گے، ایک ہلچل مچا دیں گے۔ اِن میں ہمت، بہادری اور جوش جیسے جذبات کی فراوانی ہوگی ——— پھر وہ ایک نہیں ایسے ایسے صد ہزار دشمنوں کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکیں گے۔ یقین جانو انجم اِسی طرح اگر اُن کے ولولے، بہادری، جوش اور شجاعت کے جذبات کو بڑھاوا ملتا رہا تو ایک کیا ایسے ایسے ہزاروں سرحدی لٹیرے ہمالہ کی برف پوش چٹانوں ہی پر منجمد ہو کر رہ جائیں گے۔ اپنی جارحیت، اپنے ظلم و استبداد، دغابازی، مکاری، فریب، جھوٹ اور عیاری کے آگے اپنا سر پٹک پٹک کر مر جائیں گے ——— دنیا میں امن پسندی، نیکی اور سچائی کبھی نہیں مر سکتی۔ دیر یا سویر نیکی سچائی

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

آمنہ لطافت حزیں

میں اُردو.....

ہر اک طرف سے یہ الزام ہے کہ "میں اُردو"
روایتوں کے دریچے میں پابہ جولاں ہوں
نہیں ہے مقصدِ تعمیر کا شعور مجھے
حکایتِ گل و رخسارِ مہ جبیناں ہوں
شراب و جام کی اِک بزم سی تجلّی ہوں
بہت بڑھی تو ثنا خوانیٔ گلستاں ہوں
وصال و ہجر کی افسوں گری سے ہوں مسحور
حیاتِ نَو کی جھلک سے جو تدرے گریزاں ہوں

سوادِ گنگ و جمن کی ہوں گرچہ پیداوار
نظر کا مرکزِ تقلید ہے مگر شیراز
سبُو و مئے و لب و خال و زُلف و ابروئے خم
ادائیں! حشر، کمر، تار، چشمکِ طنّاز
عطائے غیر سے پُر ہے مرا تہی دامن
رہینِ غیر ہے سب میرا جذب و سوز و گداز

بکا ولی کی زباں سے "دروغ گو" ہوں کہیں
تو زہرِ عشق کی صورت، کہیں ہوں "زہرِ حیات"
کہیں ہوں میر کے لب سے "تصورِ گویا"
کہیں ہوں داغ کے لہجے میں "شعرِ قند و نبات"
کہیں ہوں عمر کے آخر میں "کفر" مومن کا
کہیں ہوں ذوق کی "عمرِ شمع" کی "بین کرامات"

کہیں ہوں شعر میں غالب کے اِک "نہفتہ خیال"
"کلامِ یاس" ظفر کے لئے کہیں ہوں میں
تمام فلسفۂ کیف و کم تو ہوں لیکن
شریکِ مقصدِ اہلِ وطن نہیں ہوں میں

اسی پہ ہے لبِ گفتار کھولنا مجھ کو
ترے حضور! وطن، کچھ ہے بولنا مجھ کو

سَلف کے ساتھ گیا، وہ مرا مذاقِ قدیم
حیاتِ نَو کے تقاضوں کی اب امیں ہوں میں
نئی ادا ہے، نیا ذوق ہے، نئی تخئیل
بہ حسنِ ناخنِ تدبیر خوشہ چیں ہوں میں
حقیقتوں کی زمین ہے جہاں کھڑی ہوں آج
نوائے وقت کا اندازِ دل نشیں ہوں میں

غلط کہا، یہ کسی نے، فقط زباں ہوں میں
دلِ وطن میں لہو کی جگہ رواں ہوں میں

شریکِ ہر غم و راحت ہوں تیرے ساتھ وطن
رہِ ترقی میں تعاونِ مناسبت پھر بھی
زمینِ ہند و دشتِ شام تازہ ہے ہموار
میں کر رہی ہوں تیری معاونت پھر بھی

تمام صنفِ احساس پہ عزیزِ وطن
بڑی ہوئی ہے مرے گیسوئے وفا کی مہک

مرے خلوص کی بیتابیوں سے، میرے وطن!
ہر ایک ذرّے کو ملتی ہے زندگی کی چمک

مری مژہ پہ جو آتا ہے اشکِ خوں ڈھل کر
فلک پہ چاند ستاروں کا نام پاتا ہے
مرے لبوں پہ جو آتی ہے آہِ غم کھنچ کر
چمن! بہارِ طرب کا پیام پاتا ہے

جھلکتی ہے جو مرے دل میں آرزو کی بہار
گلوں پہ نرم تبسّم کے دیپ جلتے ہیں
وطن! زمیں تری لالہ زار بنتی ہے
حسین ننھی سی کلیوں کے دل مچلتے ہیں

یہ رودِ گنگ و جمن سیم آب بنتی ہے
یہ کوہسار حسینوں کے عزم بنتے ہیں
وطن! جو تیرے فلک پر اُمڈتے ہیں بادل
وہ زُلفِ ماہ جبیناں کا رُوپ بھرتے ہیں

میں آبشاروں کو کہتی ہوں قُلقُلِ مینا
اودھ کی شام کو میں اپنی زُلف کہتی ہوں
میں صبحِ کاشی کو کہتی ہوں اپنے رُخ کا فروغ
نثارِ چاکِ دلِ "پنج آب" رہتی ہوں

مرے خیال کا مرکز ہیں آج۔ دیکھ وطن!
شگوفے گندم و جَو کے، یہ دہقاں کی بالی
بجائے مانگ کی افشاں، ہے دھول کھیتوں کی
"گلال" عارض و لب کے لئے ہے اب لالی
نکل کے آج شبستانِ لفظ و معنیٰ سے
بنی ہوئی ہوں وطن! تیرے باغ کی مالی

سمور و اطلس و کمخواب کی جگہ، اے وطن
لباس تیرے غریبوں کے آج سیتی ہوں
نبیذ و بادۂ گلرنگِ کیف زا کی جگہ
میں آج "باندھوں" کا "نہروں" کا پانی پیتی ہوں

"قطب کی لاٹ" کو کہتی ہوں تیرے عزم کا تاج
میں لال قلعے کو کہتی ہوں تیری شانِ جمال
یہ "تاج" شاہجہاں کی نہیں فقط تعمیر
نکالے ہیں تری دھرتی نے "عشق کے پر و بال"

مرے سخن کا تو ہی آج مدّعا ہے، وطن
نہ وصل و ہجر۔ نہ قلبِ حبیب کی تسخیر
نہ جام و بادہ، نہ خالِ رُخ و قدِ شمشاد
ہے اب تو شعر کا موضوع تُو، رُخِ کشمیر

بھُلا دیا ہے تصوّر کو اُن حسینوں کے
وہ جن سے سجی تھی بزمِ خیالِ نظم و غزل
وہ استعارے، وہ فقرے، وہ نکتہ ہائے قدیم
بیان و ذکر کے وہ قمقموں سے شیش محل
وہ ذکرِ چاہِ زنخداں، وہ ابروئے خمدار
وہ عطر و غازہ، وہ مہندی، وہ "سرمہ، وہ کاجل"
شراب و جام و صراحی و ساقیٔ مہوش
وہ عندلیبوں کی باتیں، وہ "موسم اور بادل"

مری روش پہ جو یہ چھاؤں ہے حقیقت کی
پہن کے کوئی تصنّع کا میں لباسِ حریر

بہت دنوں سے ہے، کچھ آج کی نئی تو نہیں
نئے تقاضوں کے معیار پر گئی تو نہیں

مرے ہی بطن سے پیدا ہے لفظِ "زندہ باد"
مرے ہیں تجھ پہ جو، اُن کو "شہید" کس نے کہا
یہ لفظِ "ترکِ موالات" کس لُغت کا ہے؟
ہوں میں ہی فاتح، انجامِ جنگِ آزادی

مرا ہی نعرۂ پر جوش "انقلاب" بھی ہے
مرے حریف سے پوچھ اے وطن جواب بھی ہے
کہ جس سے صفحۂ تاریخ، جلوہ تاب بھی ہے
مجھی سے بعدِ فتح، سعیٔ اجتناب بھی ہے!

ہے امتیاز مرا، بر بنائے استعداد
زبان و نطق سے آگے، دِلوں کی سرحد تک

حدودِ ذہن سے آگے ہیں وسعتیں میری،
وطن میں اب بھی ہیں قائم حکومتیں میری!

اُٹھے ہیں پھر مجھے کرنے کو آج "دیش بدر"
وفا کے بدلے جفا ہو تو مان لوں ہے "رسم"

ترے سپوت، وطن دیکھ کیا تماشا ہے!
یہاں تو اصلِ رگِ زندگی پہ حملہ ہے

میں اعتمادِ وفا پر یقین رکھتی ہوں
یہ میرے پیار کی شمعیں جو آج روشن ہیں
مرا خلوص، رہا داد سے جو بیگانہ

کہا کرے کوئی بیزاریوں کے افسانے
اِنھیں بجھائیں گے کیا تیرگی کے پروانے
تو اپنا خود ہی بنائیں گے مجھ کو بیگانے

جو قلب و رُوح کی گہرائیوں میں پنہاں ہے
اِسی سے تجھ کو ملے گا دوامِ ہستیٔ تو

کوئی خلوص کی اُن گرمیوں کیا سمجھے
مرے عزیز وطن! میری آنکھ کے تارے

اِسی میں تپ کے سنور جائے گا ضمیر ترا
کہ جس سے وہم و تعصب کے سنگ پگھلیں گے

وطن! اِسی سے ملے گا تجھے وہ سوزِ گداز
کہ جس سے "جلوہ فگن" ہوگی "روحِ وحدتِ ساز"

مری جبیں پہ فروزاں ہے نورِ عزم و عمل
مرا خروش نئے دَور کا پیامی ہے
بہار "دستِ تمنّا" میں سمٹی آتی ہے
رچا بسا ہے لہو میں اب تجھ سے پیار کا رشتہ

تری نظر میں درخشندہ ہیں نجوم و قمر
ترے سرود سے پیدا ہیں نغمہ ہائے سحر
سوادِ شوق میں توسِ قزح کا ہے منظر
مرے حبیب! مرے دِل رُبا! مرے دل بر

تو مسکرا کے بجا امن و وفا کا عزم لئے
اُتر تی جائے مرے دل میں پیار کی تصویر
وطن! عزیز وطن، دیکھ میری آنکھوں میں
چمک رہی ہے ترے خوابِ شوق کی تعبیر

سید نصیر الدین ہاشمی مرحوم

کلامِ مہجور

مولوی سید نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اپنے انتقال سے دو ماہ پہلے "شاعر" کے لئے اپنے دو تحقیقی مضمون "کلام مہجور" اور "مثنوی ظفر نامۂ عشق (مہر وماہ) مصنفہ سید منظفر" بھیجے تھے۔ اُن کے ان دونوں مضامین میں بعض جملے اور الفاظ اُن سے دریافت طلب تھے اور جب انھیں خط لکھا گیا تو اُن کی صاحبزادی خدیجہ ہاشمی نے اطلاع دی کہ ابا سخت علیل ہو گئے ہیں اور اُن سے اِس عالم میں کچھ بھی دریافت نہیں کیا جا سکتا"۔ اِس کے چند دن بعد ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم کے مضامین عام طور پر یا تو ٹائپ شدہ ہوا کرتے تھے یا خود اُن کے قلم کے، لیکن اُن کے سہوِ نظر سے کچھ الفاظ اور جملے ایسے رہ جاتے تھے جو یا تو سیاق و سباق سے درست کرنے پڑتے تھے یا اُن ہی سے دریافت کرنے ہوتے تھے۔ اِس مضمون یا آئندہ شائع ہونے والے اُن کے دوسرے مضمون میں اگر کوئی لفظ یا جملہ محلِ نظر ہو تو قارئین اِسے ہماری مجبوری پر محمول فرمائیں ——— ادارہ

یہ ایک مخطوطہ ہے، جو کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم میں محفوظ ہے، اِس مخطوطہ میں نظم اور نثر فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کی مثنویاں، مکتوبات وغیرہ شامل ہیں، آغاز میں ایک فہرستِ اندراجات بھی ہے جو (۸۰) عنوانات پر مشتمل ہے، یہاں چند عنوانات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) مثنوی المسمیٰ بہ نان و نمک (۲) مکتوب از طرف محبوب بفارسی در نثر (۳) مکتوب از طرف مطلوب در نظم بزبانِ ہندی، (۴) مکتوب مطلوب بفارسی در نثر (۵) مکتوبِ مطلوب در نثر ہندی (۶) مثنوی المسمیٰ بقضا و قدر بہ ہندی (۷) مثنوی المسمیٰ بہ تحفۃ البیان بہ ہندی (۸) مثنوی المسمیٰ بہ مہر و ماہ در معجزہ (۹) مثنوی المسمیٰ بہ خرّم البیان (۱۰) مثنوی المسمیٰ با مجازِ عشق (۱۱) نامۂ معشوق جواب جرأت (۱۲) مثنوی المسمیٰ بہ مظہر الاعجاز (۱۳)

یہ مخطوطہ (۱۱ ½ × ۷ ½) سائز کے (۹۷) ورق یعنی (۱۹۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ قدیم شعراء میں مہجور تخلص دو شاعروں کا حال دستیاب ہوتا ہے ایک شیخ محمد بخش نام جو حکیم خیر اللہ کے فرزند تھے۔ مصحفی نے ان کا تذکرہ اپنی تصنیف "ریاض الفصحا" میں کیا ہے۔ اُن کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد بخش مہجور تخلص لکھنؤ میں رہا کرتے تھے ظریف الطبع اور خوش فکر شاعر تھے۔ جرأت سے تلمذ تھا۔ مصحفی سے بھی مراسم تھے۔ "ریاض الفصحاء" کی ترتیب کے وقت اُن کی عمر (۵۵) سال تھی۔

اِن کے علاوہ دوسرے مہجور کا نام صدر الدین تھا۔ دیوان مرتب کیا تھا۔ اِس کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ

میں محفوظ ہے۔

میرا خیال ہے، کتب خانۂ سالار جنگ کا نسخہ شیخ محمد بخش مہجور کی تصنیف ہے۔ یہ نسخہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ کو لکھا گیا ہے۔ یہ تاریخ ورق (۲۷) پر درج ہے، مگر اس کے بعد ایک فارسی کا شعر موجود ہے۔ فہرست کے لحاظ سے یہ "ترکیب الحبیب من محران فقر" ہے۔

کتاب کا آغاز جیسا کہ صراحت کی گئی ہے، مثنوی سے ہے اور اس مثنوی کو "نان و نمک" سے موسوم کیا گیا ہے۔ آغاز یہ ہے۔

کروں حمد و ثنا کیا اُس احد کی کہ کم ہے عقل یاں اہلِ خرد کی
وہی بے شبہ ہے معبودِ عالم وہی بالذّات ہے موجود و قائم
کیا ہے خلق اُس نے دو جہاں کو بنایا اُس نے ہے کون و مکاں کو

یہ طویل مثنوی ہے جو (۲۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ چار سو سے زیادہ شعر ہیں۔

اس مثنوی میں حضرت علیؑ کی مدح ہے اور آپ کے ایک مخالف شخص کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ چنانچہ حمد و نعت اور منقبتِ حضرت علیؑ کے بعد نفسِ مضمون کا آغاز اِس شعر سے ہوا ہے۔

بُرا کہتا ہے وہ آلِ نبی کو معاذ اللہ کہے ہے بد علیؑ کو

چند اور شعر اِس مثنوی کے ملاحظہ ہوں۔

خدا جانے تھا کیا سِرِّ الٰہی جو تھی آدم کو گندم کی تباہی
یہ ثابت سب ہے اوّل اور آخر کہ مجز نیکی خدا کرتا نہیں شر
سو اُس کی منع کرنے میں بھلا تھا خدا جانے کہ واں اسرار کیا تھا
دوم یہ وسوسہ ہے سُن اے ظالم کہ تھا خیر البشر جو فخرِ آدم
نہ دی داد اُس کو اور قتلِ آہ خدا جانے کہ کیا لکھا وہ ذی جاہ
کرے رد جو کوئی حکمِ پیمبر تو اُس نے رد کیا ہے حکمِ داور
نبی سے اور خدا سے ہے جو منکر مقرر دوزخی ہوگا وہ کافر
ہوئی ایمان داری تیری معلوم مسلماں آپ کو مت کہہ تُو او شوم

طویل مثنوی ہے۔ اتنا ہی اقتباس دینا کافی ہے۔

ایک دوسری مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں،

یہ تو کیوں کر کہوں خدا ہے عشق پر خدا سے نہیں جدا ہے عشق
عشق ہی چارہ سازِ اہلِ نیاز عشق خود ساز و عشق ہے خود ساز
عشق یوسف ہے۔ عشق ہے یعقوب عشق طالب ہے عشق ہے مطلوب
عشق شیریں ہے۔ عشق ہے فرہاد عشق ہی شاد، عشق ہی ناشاد
عشق خنجر ہے، عشق ہے تیشہ عشق ظالم ہے اور جفا پیشہ
عشق معشوق، عشق عاشق ہے عشق عذرا ہے، عشق وامق ہے
عشق لیلےٰ ہے، عشق ہے مجنوں عشق ہی نے کئے ہیں لاکھوں خوں
عشق ہے مظہرِ خدائے جہاں عشق کرتا ہے مشکلیں آساں

ہے کسی لب پہ آہِ سرد کے ساتھ ہے کسی دل میں آہِ درد کے ساتھ
برق ہے گاہ و گاہ خرمن ہے دوست ہے گاہ، گاہ دشمن ہے
عشق ہے شمع، عشق پروانہ عشق ہے عقل مند و دیوانہ

برگِ گل سے بھی تھی وہ نازک لب عقلِ شیریں ہو دیکھ جس کو سلب
رشکِ سلکِ گہر تھے وہ دندان جیسے آبِ گہر غلطان
پڑے جب تسکے دہن پہ نگاہ غنچہ ساں پھر ملے نہ بات کی راہ
کہوں کیا اُس زبان کی حرکات کرتی اک بات میں تھی سو سو بات
وہ بناگوش اور وہ اُس کے کان صبحِ عشرت کا گویا تھا سامان

طویل مثنوی ہے۔ معشوق کا سراپا بڑے مبالغہ سے نظم کیا ہے۔ اِس موقع پر مہجور کے ایک منظوم خط کا بھی مختصر نمونہ پیش کیا جاتا ہے ؎

اے مرہمِ زخمِ سینہ ریشاں وے عیسیِٔ درد، دردکیشاں
سرمایۂ عیش و زندگانی محبوبِ جہان و یارِ جانی
تو جب سے جدا ہوا نظر سے آنسو نہیں تھمتے چشمِ تر سے
سرگشتۂ وادیٔ جنوں ہوں میں قیس سے سو قدم فزوں ہوں
مجنوں کو نہیں ہے مجھ سے نسبت لے بھاگا ہے وہ تو مجھ سے وحشت
جتنے ہیں جہاں میں کوہ و ہامون ہیں آبلہ پا سے میرے گلگوں
کیسے کہوں جا کے حالتِ دل طاق ہوگئی اب تو طاقتِ دل
سب کہتے ہیں تم کو کیا ہوا جی کیوں درد کا مبتلا ہوا جی
کس روز تو مجھ سے آ ملے گا کب غنچۂ دل مرا کھلے گا
پوچھیو کسے کون نامہ بر ہے کس سے کہوں اُن کی کیا خبر ہے
نے اشک ہے چشمِ تر میں پیدا قاصد کی نہ شکل ہے ہویدا
نے پیکِ صبا کے کچھ ہیں آثار پوچھیو مجھے سخت تر ہے دشوار
جان اپنی اگر کروں روانہ مجھ سے جو کہے مرا فسانہ
پر وہ بھی تو سخت ناتواں ہے طاقت اُسے جانے کی کہاں ہے
بس مرگ ہی جی پہ آبنی ہے یہ زیست نہیں ہے جاں کنی ہے
اب دل کو نہیں ہے چین و آرام کس کام کی ایسی زیست ناکام

طویل خط ہے اختتام اِن اشعار پر ہوا ہے

یہ جو مجھے لکھے ہے خط آیا ایسے بہت اُس میں ہیں خطایا
خیر ایسی ہے مجھ غم گیں کو کیا کام میں صاف کروں اب اپنا ارقام
خط یہ جو لکھا ہے میں نے جانا تھا ہجر کا مختصر فسانہ
جب ہووے گی آپ سے ملاقات ہجراں کے بیان ہوں گے صد بات

اب ختم یہاں سے ہے یہ تحریر
اور خط کی ہے فارسی میں تدبیر

اِس مجموعہ میں مہجور کے چند سلام بھی ہیں ایک دو سلاموں کا نمونہ درج ہے،

جب ماہِ محرّم کا سلامی نظر آئے — لازم ہے کہ آنکھوں میں بھی اشک بھر آئے
جا لپٹی سکینہ وہیں شبیرؑ کے سر سے — جب حاکمِ بے دین کے آگے وہ سر آئے
شبیرؑ نے فرمایا جو اکبرؑ گئے رن میں — زندہ مرا اے خالق اکبر پسر آئے
اکبرؑ ہوا یوں شام کے اس ابر میں پنہاں — جس شکل سے ظلمت میں کہیں قمر آئے
کس طور نہ ہوں زیست سے مایوس شہِ دیں — بسمل جو نظر خاک پہ نورِ نظر آئے
زینبؑ یہ پکاری کہ عجب شان سے لوگو — تر خون میں اکبرؑ مرے سرتا کمر آئے
عابدؑ نے کہا شوق سے بیڑی میں اُسے گر — بے طوق مرے پاس جو بیمار اُدھر آئے
زینبؑ نے کہا شمر کو آتے جو میں دیکھا — یارب یہ سرِ شاہ نہ جائے اِدھر آئے

مرثیہ کے اٹھارہ اشعار ہیں۔

کس طرح مصیبت میں لکھوں شاہ کی مہجور
اب اشک مری چشمِ قلم میں بھی بھر آئے

ایک مکمل سلام ملاحظہ ہو،

مجرائی شہ پہ رحم ہی کھانا ضرور تھا — کیا ظالموں کو اُس کو ستانا ضرور تھا
کتنے ہی باری فوج عدو میں حسینؑ کے — لاشہ ہر اک کا کیونکر اُٹھانا ضرور تھا
بسمل کیا حسین کو پیاسا ہی ظالموں — پانی تو وقتِ ذبح پلانا ضرور تھا
کیونکر نہ روئیں لاش پہ سرور کی عابدین — آنسو غمِ پدر میں بہانا ضرور تھا
کس محنتوں سے مشک تھی عباسؑ نے بھری — کیا ظالموں کو اس کا بہانا ضرور تھا
صغرؑا نے خط میں شاہ کو لکھا کہ ایک بار — بیمار تک تو آپ کا آنا ضرور تھا
سجادؑ اپنے دل میں یہ کہتے تھے بار بار — اِس قید سے تو سر کا کٹانا ضرور تھا
سرلے گئے حسینؑ کا سجادؑ اس نے — تن سے سرِ حسینؑ ملانا ضرور تھا
اے چرخ گر حسینؑ کو لایا تھا تو تو پھر — اعدائے دیں کو راہ پہ لانا ضرور تھا
صغرؑا یہ دل سے کہتی تھی آخر کو پھو بھی ہم — بابا کے ساتھ پہلے ہی جانا ضرور تھا
اعدا کو قتل کرنا ہی منظور تھا تو پھر — کیا سبطِ مصطفےٰ کو ستانا ضرور تھا
صغرا پدر کی دوری میں کہتی تھی اے فلک — اک بار مجھ کو شہ کو دکھانا ضرور تھا
سوچ اپنے دل میں اے فلکِ کج خرام آہ — کیا وہ بدر حرم کا چھپانا ضرور تھا
قاسمؑ کی شکل دیکھ کے کہتی تھی یوں قضا — آج ہی بنا ہے اس کو مٹانا ضرور تھا

مجرئی اس کو کہتا تھا مہجور بے نصیب
خیمہ حسینؑ کا بھی جلانا ضرور تھا

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے اِس مجموعہ میں مہجور کی نظم کے علاوہ نثر بھی شامل ہے، مگر اُردو سے زیادہ فارسی نثر ہے

ایک مختصر نمونہ اُردو نثر کا یہاں پیش کیا جاتا ہے جس سے نیچوری کی نثر نویسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نثر معشوق کے نام خط ہے،

"گلِ گلستانِ لطافت، سروِ بوستانِ نزاکت، یارِ دل نواز سراپا ناز سلامت، گلدستہ سلام کا کہ خلاصہ کلام کا ہے اور تحفہ نیاز کا خاصہ دل محبت امتیاز کا ہے حوالۂ قاصد آزاد کر کے حال دلِ دردمند منزل کو رقم کرتا ہوں، جیسے ہم تم سے دور ہیں تمہاری جان سے دور زندہ درگور ہیں ایک گھڑی دل کو بے تمہارے آرام نہیں ہے بلکہ آرام سے کام نہیں ہے، ہجر کی رات کو عجب تڑپ تڑپ کے سحر کرتے ہیں تو پہروں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ تمام رات نیند نہیں آتی .... وصل، ہجر کی ہو تم مختار خط کا صاحب جو جواب تو لکھنا زیادہ شوقِ دیدار کو کیا اظہار کروں کہ اگر تمام عمر اپنی صرفِ تحریر کروں تو ہنوز ناگفتہ ہے۔ اب ختم یہاں سے ہے تحریر ـــ"

اِس تفصیل سے کتب خانۂ سالار جنگ کے ایک قلمی نسخہ کے متعلق کسی قدر علم ہو سکتا ہے۔ ریسرچ اسکالروں کو ضرورت ہو تو بہت کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵ "خوشامد میں آمد")

خوشامد کے لئے ضروری ہے کہ آپ علمِ مجلسی، داستان سرائی، تاریخ دانی، بذلہ سنجی، مزاج شناسی، حاضر جوابی، بیٹھک بازی اور پروپیگنڈے کی بنیادی قدروں، ترقی پسند رجحانات، سائنسی نظریات اور گروں سے بخوبی واقف ہوں۔ تاکہ اچھے بھلے آدمی کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیں۔

خوشامد ایسا جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے، اس سے خدا اور بندہ دونوں خوش رہتے ہیں۔

ہماری اس لافانی تصنیف کی بنیاد ـــ "مہاراج چوپٹ راج، ان کے ملازم اور بینگن کی ترکاری" کی سبق آموز حکایت پر ہوگی۔ جن کا ہر پڑھنے والا اس پر عمل کر کے بیک وقت انتہائی آسانی سے حاکم، محبوب، دربان، قیصر رئیس اور بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے قابو میں لے آئے گا۔ اِس کتاب میں خوشامد کے وہ تیر بہدف نسخے اور گُر ہوں گے۔ جن پر عمل کرنے کے بعد دولت اور کامیابی آپ کے قدم چومے گی اور آپ صدقِ دل سے اِس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ "خوشامد میں آمد"

بقیہ صفحہ ۴ "روشن راہیں"

امن اور شانتی ہی کی فتح ہوگی۔

"اچھا ـــ اچھا ـــ آپ اب تو آرام کر لیجیے۔" انجم گلوگیر لہجے میں بولی۔ اُس کی بوجھل اور غمگین آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارائیں اُسی طرح رواں تھیں۔

"ہاں ـــ ہاں انجم تم بے فکر رہو۔ اب تو میں ابدی سکون کے لئے جا رہا ہوں۔ ایک انجانی سی پُر سکون منزل کی جانب ـــ" مجمی خوابیدہ سے لہجے میں بولا۔ جیسے اُس کی آواز دُور کہیں بہت دُور سے اُبھر رہی ہو۔

اُس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی جا رہی تھیں ـــ شمع کی لَو تھرتھرا رہی تھی جیسے بُجھنے کو ہو۔ پھر کبھی روشن نہ ہونے کے لئے ـــ مگر بُجھتے بُجھتے بھی جس کی روشنی نے نہ جانے کتنی راہوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منوّر کر دیا تھا!!! فن اور فنکار ملک و قوم کے اندھیروں کا اُجالا ہوتے ہیں ـــ!

رؤف خلش

دھندلکے

شہر کے سب در و بام خاموش ہیں
ہر طرف چادرِ کہر پھیلی ہوئی!
شاہراہیں تفکّر میں ڈوبی ہوئی
جیسے ویراں کھنڈر کی ہو بوجھل فضا
اِک سراسیمگی، اِک شکستہ دِلی
بے اماں روز و شب میں تلاشِ سکوں
راہرو کی نگاہوں میں ہیجان ہے
ذرہ ذرہ یہاں کا پریشان ہے

ہم طلسمِ تمنا کے مارے ہوئے
طے تو کرلیں غم و درد کی منزلیں
وسعتوں کی مگر تنگ دامانیاں
ڈال دیتی ہیں زنجیر سی پاؤں میں

آہ! کس سے کریں میٹھی سرگوشیاں
کوئی سُنتا نہیں بانسری کی صدا!
مَن کے مدھو بَن میں رنگیں تماشا نہیں
ہے کنھیا، مگر کوئی رادھا نہیں
نوشگفتہ سی کلیوں کی رَعناہٹیں
دستِ گلچیں سے گھبرا کے سونے لگیں
کون جانے چھٹے کب یہ دھندلا غبار
ہر قدم پر سلاخوں کی دیوار ہے

مائلِ سرکشی ہیں حریفانِ گُل
بڑھ کے تاریک راتوں کا منھ نوچ لو
گلشنِ دل کی جانب بڑھاؤ قدم
اور ہونے دو سینوں کو عرفانِ غم
کارواں نکہتوں کے چلے آئیں گے
شہر سے یہ دُھندلکے بھی چھٹ جائیں گے

ہندی کہانی:-

شانی

ترجمہ:- ندا فاضلی

آنکھیں

سارے "ایڈلین گارڈن" میں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ درختوں کے جھرمٹ میں چھپی وہ بدنام عمارت اِس وقت پہلے سے بھی اُجاڑ اور ڈراؤنی لگ رہی تھی۔

پہلے خود مِہرا کو کئی بار شک ہوا تھا۔ خیال ہوا کہ بارہ دری میں کوئی چھپا نہ ہو۔ لیکن پھر وہ وہم اپنے آپ چھٹ بھی گیا۔ بھلا وہم کی کیا بنیاد؟ اور ویسے بھی کتنی رات ہوگئی تھی کہ.......

"وہاں چلیں؟" اُس نے ایک بار چاروں جانب دیکھ کر دیپتی سے پوچھا۔ دیپتی دو قدم پیچھے کچھ سہمی ہوئی کھڑی تھی.. ... کچھ سوچتے ہوئے اُس نے بھی اندھیرے گارڈن کی طرف دیکھا... آس پاس کو ایک اُچٹتی نگاہ سے ٹٹولا.... پھر بے پروائی دکھاتی ہوئی زور سے بولی.. "چھوڑو... وہیں جاکر کیا کریں گے!"

"اور یہاں بھی کیا کر رہے ہیں؟" دیپتی کی جانب دیکھ کر بھی اُس کی آنکھوں سے نظر بچاتا ہوا مِہرا جھلّا پڑا۔

"ہم بتائیں۔ فوراً بگڑتی بات کو سنبھالتے ہوئے دیپتی نرمی سے بولی۔ ہماری مانو تو واپس چلیں، لوٹ کر فوارے کے نزدیک والے اُسی لان پر بیٹھتے ہیں　　وہاں اتنی گھٹن بھی نہیں ہوگی .. ٹھنڈک ہوگی اور......"

مِہرا کے مُنہ میں کوئی گالی آتے آتے رہ گئی۔ جون کا وہ دن صبح سے آگ ہو رہا تھا۔ شام سے اتنی اُمس تھی کہ کہیں دو گھڑی ٹِک کر نہیں رہا جاتا تھا۔ پھر اُسے اچانک دھیان آگیا تھا کہ وہ چار دیواری میں بند، گھر پر نہیں، پبلک گارڈن میں ہے۔ حالانکہ باغ کا سب سے زیادہ شور اور بھیڑ بھاڑ والا حصہ چھوڑ کر وہ لوگ تنہائی میں چلے آئے تھے لیکن اِکّا دُکّا قدم رہ رہ کر اِدھر بھی بھٹک آتے تھے۔

اُس نے شکست خوردہ انداز سے دیپتی کو دیکھا، لیکن اِس طرح کہ اُس کی آنکھیں نہ مل جائیں...

سچ مچ وہاں بیٹھنے کے لئے نہ تو کوئی وجہ ہی تھی اور نہ موقع۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے گھر سے چلنے کے پہلے اُس عمارت کے بارے میں کوئی بات نہ ہوئی ہو، جیسے فوارے کے پاس سے اُٹھتے وقت دونوں میں کسی قسم کا کوئی غیر شعوری اور خاموش سمجھوتہ نہ ہوا ہو اور جیسے دونوں یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے آنکلے ہوں یا عمارت دیکھ کر ٹھہر گئے ہوں۔

"چلیں؟"

لوٹتے میں، اِس بار دیپتی نے پہل کی اور مِہرا کے جواب کا انتظار کئے بِنا آگے آگے چلنے لگی۔ چُپ چاپ اور مجبورانہ ڈھنگ سے دیپتی کی مخالفت کرتے ہوئے، اِس وقت مِہرا کو اپنا وجود ہی احمقانہ لگ رہا تھا۔ شاید گھٹن اچانک بڑھ گئی تھی۔ وہ دیپتی کی مخالفت کرنا چاہتا تھا لیکن وہاں رُکنا بھی ممکن نہ تھا... اُسے غصّہ بھی آرہا تھا اور نہیں بھی! آج اِسی لئے رہا تھا کہ جس ایڈوینچرس پروگرام کے محض خیال ہی سے ساری شام رُومانی ہو اُٹھی تھی اُس کا انجام یوں ہوا——

نہیں آرہا تھا۔۔۔ اِسے کس طرح ظاہر کیا جائے۔ یہ طے کرنا مشکل تھا۔۔۔۔ اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں آپ کرنا تو چاہتے ہیں ـــ اشاروں میں کہتے بھی ہیں لیکن جن کے بارے میں کھلے طور پر باتیں کرتے ہوئے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔

مہرا یا دیپتی دونوں میں سے، پہلے کس نے اشارہ کیا تھا۔ ان سب کے پس پُشت کون تھا۔۔ دیپتی یا مہرا؟ اگر کسی نے ان کا تعاقب بھی کیا ہو تو سوائے اس کے کیا جان سکتا ہے کہ دو فرد باغ میں آئے، فوآرے کے پاس بیٹھے، اچانک اُٹھ کر گھومنے رستے پر آئے، تھوڑی دیر اٹیلین گارڈن کے سامنے کھڑے رہے، اب سُنسان پگڈنڈی پر پڑے پتّوں کو الگ الگ روندتے ہوئے واپس لوٹ رہے ہیں اور وہ بدنام عمارت پیچھے چھوٹی جا رہی ہے۔

ـــ یوں ہی بنا کسی حوالے، بحث یا سوال کے مہرا نے خود وہ واقعہ سُنایا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر نہ تو اُس نے کپڑے بدلے تھے اور نا ہی ابھی اطمینان کی سانس لی تھی۔ دیپتی روز کی طرح کچن میں مصروف تھی۔ کُل دو افراد کا گھر۔ نہ کوئی بڑا بوڑھا اور نہ بچے کچے!

"ایک دلچسپ خبر ہے" جوتے سمیت باورچی خانے میں آکر مہرا نے کہا اور مُسکرانے لگا تھا۔

"کیا؟"

"اٹیلین گارڈن میں کل کچھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔" اُس نے بتایا، کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ شام کو نو ساڑھے نو بجے سیر گاہوں کو لوگ ایسے کاموں کے لئے بھی منتخب کر سکتے ہیں! وہ تو پتہ بھی نہ چلتا اگر ایک اخباری نمائندے کو شک نہ ہوا ہوتا۔ تم تو جانتی ہو نا، پھول باغ میں ہوتے ہوئے بھی اٹیلین گارڈن کتنی تنہائی میں پڑ جاتا ہے۔ بادشاہوں نے سوچا ہوگا کہ ادھر کون آئے گا، کافی اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی گرل فرینڈس کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے"۔۔۔۔ اور پھر وہ تفصیل کہ کیسے ایک جرنلسٹ پھول باغ کی بھیڑ بھاڑ سے گھبرا کر اٹیلین گارڈن کی سمت نکل گیا۔۔۔۔ کیسے بارہ دری کی چھت پر ایک لڑکی کا ہلتا ہوا سر دکھائی دیا۔۔۔ کس طرح خبر لگتے ہی لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی اور پکڑے جانے پر لڑکیاں کیسے گھبرا گئیں۔۔۔۔۔

"سُنا ہے تمہاری آبھا بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی!" مہرا نے کہا تو ایک دم چونک کر دیپتی بولی۔ "کون اپنی آبھا شُکلا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ محلّے میں رہتے تین سال ہو رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ بیچاری نے۔۔۔۔"

اور دیپتی کی بات ختم ہونے سے پہلے اُدھر سے تو مہرا زور سے ہنس پڑا تھا۔ لیکن اندر کا کوئی گوشہ اچانک اُس کا دھیان کھینچنے لگا تھا ـــ وہ کونا جس میں آبھا شکلا کی آنکھوں کا گھاؤ اب تک کافی بڑا ہو چکا تھا، آنکھوں میں بھی اتنی کشش ہوتی ہے اور یہ ہی نہیں اِس سے بلا وجہ گھاؤ بھی لگتے ہیں۔ یہ اُس نے پہلی بار جانا تھا، آبھا سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، عمر، حالات یا کسی بھی زاویے سے کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اُس کو دیکھنے کے بعد سے ہی دل میں دیپتی کی آنکھوں والی کسک کچھ گنا بڑھ گئی تھی۔ اسے احساس تو پہلے بھی تھا۔ لیکن آبھا کو دیکھ لینے کے بعد شدت سے محسوس کرنے لگا تھا کہ دیپتی کی آنکھیں بُری ہی نہیں، بجھے ہوئے کوئلے کی طرح ٹھنڈی، بے نور ہیں اور انہیں اَن دیکھا کر کے پیار جھیلے کر لو۔۔۔ دیکھتے ہی سارا ولولہ پارے کی رفتار سے ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

ـــ بیاہتا جیون کے آٹھ سال کم نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں اگر شوہر، بیوی ایک دوسرے کو پہچاننے لگے تو دونوں دوست ہو جاتے ہیں۔ درمیان میں غیریت یا پردہ جیسی چیز نہیں رہتی اور ایک دوسرے کی اچھائیوں، بُرائیوں سے بھی بخوبی متعارف ہو چکے ہوتے ہیں۔

مہرا اور دیپتی بھی کم و بیش اسی حالت میں تھے۔۔۔ بیاہتا جیون کے اتنے طویل عرصے میں بیو پاریوں کا نیا پن تو

کہاں، وہ بیچ کا رس بھی ختم ہو چکا تھا جو میاں بیوی کو اکثر آپس میں جوڑتا ہے۔ مہرا دہی مرد تھا اور دیپتی وہی عورت
کیا وہ دونوں اپنے آپ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس لگاتار چلنے والی یکسانیت کو توڑنے کے لئے خارجی تبدیلیاں از
ضروری ہیں۔ مثلاً کبھی سونے کا کمرہ بدل دینا... کبھی کمرے میں پلنگ کا رُخ بدل کر نیا پن محسوس کرنا.. کبھی پلنگ
چھوڑ کر فرش پر ہی آ رہنا اور نیند آنے سے پہلے دونوں کا چھت پر جا لیٹنا....

لیکن اس طریقے کو بھی ایک نہ ایک دن آخر پُرانا ہونا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ نُسخہ اتنا گِھس پٹ گیا کہ "نئے پن"
کا بُھلاوا دینے والی بات بے وقوفی لگنے لگی۔ جیسے باسی روٹی کو آنچ دیکر گرم تو کر لیا جائے لیکن کھانے کے دَوران تازگی،
کمی شدت سے محسوس ہونے لگے، اور سوچیں کہ باسی ہی کھانا ہے تو ٹھنڈی ہی کیا بُری ہے؟

کئی بار دیپتی سے زیادہ مہرا کو اور مہرا سے زیادہ دیپتی کو یہ بات کھلتی اور پھر اچانک دونوں اپنی اپنی جگہ اُداس ہو جاتے
اِدھر کئی دنوں سے اُداسی کی وہی حالت چل رہی تھی۔ ویسے بیچ میں اِس خاموش یکسانیت کو توڑنے کے لئے ایک دو
کوششیں مہرا کی طرف سے ضرور ہوئی تھیں.... ایک دن بازار کے فٹ پاتھ سے ایسی تصویروں والی کتاب گھر آ گئی جسے اکیلے
میں دیکھنا تو سبھی چاہتے ہیں، لیکن دوسرے کی آنکھوں کے سامنے جسے اکثر دیکھا نہیں جاتا...... وہ کتاب، ایک
سہارے کے رُوپ میں، کچھ دن اور کھینچ لے گئی... دیپتی ناواقف نہیں تھی... اُس میں بھی دل سے تعاون دینے کی لگن
ظاہر تھی۔ لیکن جو اثر پہلے دن تھا دوسرے دن نہیں رہا.. دوسرے دن کا اثر اگلے دن جاتا رہا اور پھر وہی گھٹن، تھکن اور
یکسانیت!!!

——— " اکیلی اُوب جاتی ہو گی کیوں"؟

شام کو دفتر سے لوٹنے پر مہرا اکثر یہ جُملہ دہراتا۔ دیپتی جواب میں کبھی چُپ رہتی کبھی پھیکے پن سے ہنس دیتی "جانے
کب تم لوگوں میں بیٹھنا اُٹھنا سیکھو گی" مہرا پُرانی شکایت دہراتا۔ آدمی اگر پاس پڑوس میں میل جول بڑھائے
تو وقت بھی کٹ جاتا ہے اور کسی کو شکایت بھی نہیں ہوتی۔

دیپتی آگے بڑھ کر مہرا کے ہاتھ سے کوٹ لے لیتی، واش بیسن کے پاس پانی کی بالٹی رکھتی یا گونجتی آواز میں جلتے" اسٹو"
کو پمپ کرنے لگتی۔ مہرا کی ان باتوں کا جواب برسوں پہلے دیا جا چکا ہے... یہ دونوں جانتے ہیں لیکن کچھ باتیں رسماً
کہی سُنی جاتی ہیں جن کے پیچھے درحقیقت نہ تو کچھ کہنا ہوتا ہے اور نہ سُننا۔

"کہو تو آج کہیں چلیں" چائے وائے کے بعد کچھ اطمینان آ جاتا تو مہرا کہتا!

"کہاں؟"

"کہیں بھی.... باڑے... پھول باغ یا جہاں بھی تم چاہو...."

"چھوڑو، بے پروائی کے ساتھ کچھ اَن مَنے انداز میں دیپتی کہتی "باہر بھیڑ بھاڑ میں بھی تو جی اُوب جاتا ہے!"
بس بات وہیں ٹوٹ جاتی یا مہرا کچھ سوچ کر چُپ ہو جاتا۔ بھیڑ بھاڑ سے جی اُوبنے والی بات میں یوں چاہے سچائی
نہ ہو پھر ایک زاویے سے وہ سچ ضرور تھی۔ باہر یا بازار جانے پر چیزیں بھی دکھائی دیتی تھیں اور لوگ بھی۔ دونوں
کی ایک نہیں کئی آنکھیں تھیں... دونوں کے درد سُلگنے لگتے تھے۔ اپنی اُداسی اور انفرادی خلاؤں کا شعور تیز
ہو جاتا اور خوش ہونے کے بدلے جی اور زیادہ اُداس ہو جاتا تھا۔

پھر دیپتی سے یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی کہ اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے مہرا کو کوئی تکلیف ضرور ہوتی ہے، کچھ
ویسی ہی تکلیف جیسی گھر والوں کے ذریعے طے شدہ شادی میں ملنے والی معمولی بیوی کو پا کر کسی مرد کو ہونے لگتی ہے۔
لیکن جس شام کو اٹلین گارڈن والا واقعہ سُنایا گیا.. اور دنوں والی ترتیب اچانک بدل گئی، مہرا اکثر سے پہلے آ

بڑی دیر تک دیپتی کے پاس ہی کھڑا رہا اور دونوں اُسی واقعہ پر بحث کرتے رہے۔ اُس شام چائے کے بعد مہرا باہر نہیں گیا۔ دیپتی کی آنکھوں کی سمت بھی اس کا دھیان نہیں گیا۔ رات کھانے کے بعد جب وہ لوگ پلنگ پر بیٹھے تو مہرا نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔ "سچ کہوں مجھے تو لگتا تھا کہ آبھا ابھی بچی ہی ہے ؟"

دیپتی اب پہلے کی طرح آبھا کی طرفداری کے بنا ہنسنے لگی تھی۔ ایسی ہنسی جس کے پیچھے تجربات کا شکم ہوتا ہے اور آگے آنے والی خوشی کی طرف روشن اشارہ . . . اور کئی دنوں بعد مہرا نے اُس رات دیپتی کے ہونٹ کس کر چومے تھے۔

——— "یہیں بیٹھیں"

فوارہ آنے کے کافی پہلے مہرا نے دیپتی کو روک لیا۔ پہلے وہ لوگ جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے کچھ بڑی بڑی طالبات نما لڑکیوں نے گھیر لیا تھا۔ اُن کے پاس ہی ایک نیا جوڑا آ بیٹھا تھا، کچھ دُور چار بچوں والا ایک مہاراشٹرین خاندان تھا، پھر کچھ نوجوانوں کا جُھنڈ . . . اور اس کے بعد اِکے دُکے لوگوں کا بے ترتیب پھیلاؤ . . . .

"اس سے زیادہ ٹھنڈک تو وہیں تھی" گھاس پر رُومال بچھا کر بیٹھتی ہوئی دیپتی بولی۔ سامنے والے لان پر کوئی اجنبی نوجوان بیٹھا ہوا تھا جو اُنھیں ایک بار دیکھ کر بے پروائی سے لیٹ گیا۔

"کہاں ؟" ایک لمحہ رُک کر مہرا نے پوچھا پھر دیپتی کی ہنسی کا مطلب سمجھ کر خود چُپ ہو رہا۔ اُسے لگا کہ دیپتی سب کچھ جانتی ہے۔ اُسے یہ بھی پتہ ہے کہ مہرا جو لوٹ کر فوارے والی پُرانی جگہ نہیں گیا اِس کی وجہ جگہ کا بھر جانا نہیں۔ لڑکیوں کا گروپ بھی نہیں، وہ نیا جوڑا اور وہ مہاراشٹرین خاندان بھی نہیں، وہ احساس کمتری تھا جو ایسے موقعوں پر اسے اکثر جکڑ لیتا ہے۔

"کتنے بج گئے ؟" مہرا کو اچانک چونکاتے ہوئے دیپتی نے پوچھا

"آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا" ؟

"اب گھر نہ لوٹ چلیں ؟" ٹٹولنے کے انداز میں دیپتی بولی "کافی گھومنا پھرنا ہو گیا اور پھر ابھی لوٹ کر کھانا بھی بنانا ہے . . . "

مہرا نے جواب نہیں دیا۔

دیپتی کی یہ عادت ہے۔ گھر سے نکلنے کے پہلے بھی اُس نے یہ ہی کہا تھا۔ جب مہرا نے اس کے سامنے پھول باغ چلنے کی تجویز رکھی تھی تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تجویز اور دنوں جیسی نہیں ہے اور اس کے پیچھے اٹیلین گارڈن والا واقعہ جُڑ گیا ہے۔ دیپتی بڑی دیر تک ہچکچاہٹ سی دکھاتی رہی تھی۔ اور جب تیار ہو کر نکل بھی آئی تو اپنے چہرے اور طور طریق سے یہ ہی ظاہر کرتی رہی جیسے مدتوں کے بعد باہر آنے کی اُسے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی ہے۔

اور یہ ہی بات پھول باغ پہونچنے کے بعد بھی ہوئی تھی۔ فوارے کے پاس پہونچ کر وہ لوگ رسماً بیٹھ گئے تھے صرف اس لئے کہ کچھ وقت کٹ جائے . . . آگے والے پروگرام کے لئے کچھ زمین تیار ہو جائے یا ایک کی کوشش کا دوسرے کو گمان بھی نہ ہونے پائے۔

"چلو تمہیں اٹیلین گارڈن دکھلا لاتے ہیں" آخر میں احسان کرنے کے انداز میں مہرا نے کہا تو دیپتی پھر انجان بن گئی تھی اور کافی دیر میں وہ ایک پیہم اصرار کے بعد وہاں سے اُٹھی تھی۔

پھول باغ اب پورے شباب پر آ چکا تھا۔ فوارے کے پاس والی بینچ کے علاوہ لان پر گلاب کی جھاڑیوں کے آس پاس

دُور دُور کے کونوں میں "یہاں وہاں" سب نہیں جتنے لوگ چھترے ہوئے تھے" اُن سے دو گنی بھیڑ تانگوں سے چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔ قلعے پر بنے سسنہ تھیا اسکول کی بتیاں جل چکی تھیں۔ اُمس ویسی ہی تھی۔

"کچھ کھاؤگی؟" دراصل پچھلی باتوں کی گھٹن سے اپنے آپ کو الگ کرنے کے لئے مہرا نے اچانک پُوچھا تھا۔

"کیا؟"

"کچھ بھی . . . " کہتے کہتے پھر ایک لمحے کو مہرا کی آنکھیں دیپتی کی آنکھوں سے ملیں۔ وہ جھٹ سے دوسری طرف گردن گھُما کر قلعے میں چمکتی بتیوں کو دیکھنے لگا۔ باغ کے کونے سے فلمی گیتوں کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی تھی اور اس بڑے شور میں چھوٹے چھوٹے بہت سے شور دب رہے تھے ــــــ لیمن سوڈا والوں کی پکار، خوانچے والوں کی آوازیں، نوجوان ٹولیوں کی دبی دبی ہنسی اور وہ سب جو ریکارڈنگ کے پہلے پھُول باغ کے آکاش میں گھُلا ہوا تھا۔

"ٹھہرو میں تمہارے لئے کچھ لے آؤں" کہہ کر اچانک مہرا اٹھا اور دیپتی کی ہاں، نہیں کا انتظار کئے بنا اُسے وہیں چھوڑ کر خوانچے والوں کی طرف بڑھا۔ باغ کے قوآرے والے حصّے میں جتنے لوگ آ رہے تھے، کم و بیش اتنے ہی باہر نکلتے بھی جا رہے تھے لیکن لگ رہا تھا جیسے بھیڑ کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔

لوٹتے میں جانے کیا ہوا کہ گلاب کی جھاڑی کے پاس ایک پَل رُک کر مہرا اپنی بیوی کی طرف اجنبی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ مان لو اگر وہ اس کی بیوی نہ ہو کر کسی اَور کی ہوتی تو اُس سے وہ کیسی لگتی؟

اور اُس کی آنکھوں کو وشواس ہی نہ ہوا جب اُس نے دیکھا کہ دیپتی سے کچھ دور جو اجنبی نوجوان لیٹا ہوا تھا وہ مہرا کی غیر حاضری میں اُٹھ بیٹھا ہے اور لگاتار ٹکٹکی باندھے اس کی بیوی کو گھُورے جا رہا ہے۔

بڑی دیر تک وہیں ٹھٹکا ہوا مہرا دیپتی کو دیکھتا رہا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اٹیلین گارڈن سے لوٹنے کے بعد جو گھٹن اندر اندر اُسے تنگ کر رہی تھی وہ اچانک ختم ہو گئی۔ ہوا میں پہلے جیسی اُمس بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے آپ ہی بھیڑ کے معنی اُس کے لئے بدل گئے ــــ لوگوں یا لڑکیوں میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ وہ صرف اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ دیپتی کو اُس اجنبی نوجوان کو جواب دیتے ہوئے خود دیکھے۔ من میں کہیں یہ وشواس دھیرے دھیرے جمتا جا رہا تھا کہ دیپتی کی آنکھوں کی سمت دیکھتے ہوئے اب اسے بالکل ڈر نہیں لگے گا!

واہی

خدمتِ ادب

جب تک "ادب برائے ادب" کا رہا خیال — ادبار و مفلسی سے رہے ہم شکستہ حال
سائے کی طرح ساتھ نحوست لگی رہی — اِک روگ بن کے جان سے عسرت لگی رہی
گو شاعری کا رنگ نکھرتا چلا گیا — شیرازۂ معاش بکھرتا چلا گیا
لیکن خدا بھلا کرے اک مہربان کا — جن کو "ادب برائے شکم" کا ہے تجربا
موصوف نے بتائی ہمیں وہ پتے کی بات — اب دن ہے روزِ عید تو شب ہے شبِ برات
"آل انڈیا مشاعرہ مجلس" کے نام سے — کھولا ہے اِک ادارۂ نو دھوم دھام سے
کرتے ہیں شاعری کے عوض اب مشاعرہ — اِس روزگار سے ہے ہمیں خوب فائدہ
ہر تین چار ماہ کے وقفے پہ بے خلل — اپنے پروگرام پہ کرتے ہیں ہم عمل
یعنی مشاعرے کا چلاتے ہیں کاروبار — چھپوا کے روزناموں میں جھوٹا یہ اشتہار
جوش و فراق و ساحر و مخدوم و جعفری — فیض و خلیل و جذبی و اعجاز و شاہدی
کرسی و عرش و لوح و قلم سب ہی آئیں گے — تازہ کلام اپنی زباں سے سنائیں گے
اِس اشتہار میں وہ کشش ہے کہ اہلِ ذوق — لیتے ہیں داخلے کا ٹکٹ دوڑ کر بہ شوق
سرکس میں جس طرح سے ہو خلقت کا اژدہام — یوں ہی مشاعرے میں پہنچتے ہیں خاص و عام
سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں فرشِ زمیں پہ جب — مائک پہ جا کے کرتے ہیں اعلان ہم یہ تب
افسوس ہے کہ آ نہ سکے جوش اور فراق — یہ ماسکو روانہ ہوئے وہ گئے عراق
جذبی کو اختلاج ہے اعجاز ہیں علیل — گاڑی ذرا سی چوک سے مس کر گئے خلیل
بھیجی ہے فیض و ساحر و مخدوم نے خبر — سیٹ اُن کو مل سکی نہ ہوائی جہاز پر
گو یہ خبر دلوں کو گزرتی ہے ناگوار — ہوتا ہے جلسہ گاہ میں تھوڑا سا انتشار
لے کر مگر ذہانتِ فکری سے کام ہم — دم بھر میں سامعین کو کرتے ہیں رام ہم
ڈائس پہ تُک فروشوں کا رہتا ہے اک ہجوم — فلمی دھنوں میں گانے کی جن کے بڑی ہے دھوم
جو خود ٹکٹ خرید کے آتے ہیں بزم میں — ہم اُن سے اپنا کام چلاتے ہیں بزم میں
لے لے کے گٹکری یہ سناتے ہیں وہ کلام — اُٹھتے ہیں واہ واہ کے نعرے [illegible]
بزمِ نشاط بنتا ہے سارا مشاعرہ — ہوتا ہے کامیاب ہمارا مشاعرہ
خوش خوش گھروں کو جاتے ہیں حضرات اک طرف — نوٹوں کا ہم لگاتے ہیں انبار اک طرف
بچ جاتی ہے کچھ اتنی رقم خرچ کاٹ کر — سیٹھوں کی طرح کرتے ہیں ہم زندگی بسر

یہ خدمتِ ادب کا طریقہ ہے لاجواب
پیشہ یہ وہ ہے جس میں منافع ہے بے حساب

مکتوبات

زیدی جعفر رضا ———— علیگڑھ

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند کا مقالہ ـ "زبان کا مسئلہ" بے حد جاندار، اہم اور قابلِ قدر ہے۔ موصوف نے جس خوبصورتی کے ساتھ ہندوستان کے لسانی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے وہ ہر بالغ نظر انسان کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر "شاعر" اور مقالہ نگار دونوں ہی قابلِ مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "لہر لہر ندیا گہری" کے عنوان سے زبیر رضوی کی شاعری کے محض ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ شاعری کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرنا بھی غالباً مناسب نہیں سمجھتے۔ مضمون کی کچھ سطروں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم ہندی عروض کا مطلق علم نہیں رکھتے۔ وہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں ـ "کتاب کے آخر میں کبیر رنگ کے عنوان سے کچھ منتخب چوپائیاں ہیں جنہیں زبیر نے دوہوں کی تکنیک کے مطابق اپنایا ہے" (شاعر ـ ماہ جولائی ۶۵ء صفحہ ۲۹)

ڈاکٹر خلیق انجم کی مندرجہ بالا سطروں کی روشنی میں یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو نہ تو چوپائیوں کی تعریف معلوم ہے اور نہ دوہوں کا تکنیک۔ تعجب ہے کہ اُردو والے ہندی سے اس قدر دُور دُور کیوں رہتے ہیں۔ چوپائی چار مصرعوں کی منظوم تخلیق کا نام نہیں اور دوہا محض دو ہم قافیہ مصرعوں کو نہیں کہتے۔ دوہے کے بارے میں عام طور پر اُردو داں حلقہ میں ایک مستقل غلط فہمی ہے۔ اُردو کے نئی نسل کے شعرا نے ہندی شاعری کی لطافت کا سہارا لیکر اپنے رومانی تاثرات نظم کرنے کے لئے دوہے کی تکنیک سے بالکل الگ ایک زمین نکال لی ہے اور اُردو جرائد دوہے کے نام سے عجیب و غریب چیزیں آئے دن شائع کرتے رہتے ہیں۔

دوہا ایک نہایت قدیم چھند ہے، جس کا ماخذ سنسکرت لفظ دوگدھک ہے۔ پراکرت پنگلم کا شرح نگار اس کی اصل "دوپدا" کا ملتا ہے۔ قدیم شعرا میں غالباً سب سے پہلے سدھ شاعر "سرہپا" نے اس چھند میں اپنے خیالات نظم کئے۔ یہ دو ہم وزن اور ہم قافیہ مصرعوں کا ایک ایسا چھند ہے جس کے ہر مصرعے میں ۲۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں ہی مصرعوں کے پہلے اور دوسرے جزو میں ماتراؤں کی ترتیب ۱۳ اور ۱۱ ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک عربی کا دوہا ملاحظہ کیجئے۔

یا من حار بقلبہ مشغوف الاموال
غدا علی اھل الھدی مفتخرا بالمال

اب اس دوہے کی ماتراؤں کا مطالعہ کیجئے

मशगूफ़ुल अमवालि । — या मन् हार बिक़ल्बिही
١ ١ ٢ ١ ١ ١ ١ ٢ ١ = (١١) = ٢٤ — ٢ ١ ١ ٢ ١ ١ ١ ٢ ٢ = (١٣)

मुफ़्तख़िरन् बिलमालि ॥ — ग़दा अला अहलिल हुदा
١ ١ ١ ١ ١ ١ ١ ١ ٢ ١ = (١١) = ٢٤ — ١ ٢ ١ ٢ ١ ١ ١ ١ ١ ٢ = (١٣)

اسی طرح فارسی کا یہ دوہا ـ

غرق نہ سازد چوب را — ہرگز آبِ لطیف
داند پروردہ خودش — ہمیں خواص شریف

اس دوہے کی ماترائیں بھی شمار کیجئے ـ

[illegible]
۱۲ ۱ ۲ ۱۱ ۲ ۱ ۲ = ۱۳

[illegible]
۱۱ ۱۱ ۲ ۱ ۱ ۲ ۱ = ۱۱ = ۲۴

[illegible]
۲ ۱۱ ۱۱ ۱ ۱ ۲ ۱ ۱ ۱ = ۱۳

[illegible]
۱۱۱ ۱۲ ۱ ۱۲ ۱ = ۱۱ = ۲۴

اسی طرح چوپائی ہندی شاعری کا نہایت ہر دلعزیز اور مقبول چھند ہے اس میں دو ہم قافیہ مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرعے میں ۱۶ ماترائیں ہوتی ہیں۔ آخر میں جگن اور تگن کو مانع قرار دیا جاتا ہے۔ تلسی داس نے ان اصولوں کو نہایت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ کبیر داس کی رمیتی دوہوں اور چوپائیوں کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے راقم الحروف کا مضمون معارف کے اگست ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ کبیر رنگ کے ذیل میں آنے والی زبیر رضوی کی تخلیقات کو اور جو نام چاہئے دے لیجے لیکن خدا کے لئے چوپائی مت کہئے اور اس میں دوہوں کی تکنیک تلاش کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔
پرچے میں منظومات کا حصہ بُرا نہیں ہے۔ افسانوں میں غلام الثقلین کا "دیوار" اور شیام کنول کا "فرشتوں کی شکست" پسند آئے۔

عمیق حنفی
اندور ——————

شاعر کا جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مسعود قمر تاباں اور مظفر حنفی کے خطوط بھی نہایت دلچسپی اور خلوص کے ساتھ پڑھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میرا خط (سالنامہ شاعر ۶۵ء) اسقدر حیرت انگیز اور سنسنی خیز ثابت ہوگا۔
مسعود قمر تاباں صاحب کو میرے جملوں نے انفرادیت پرستی کے خطروں کی طرف متوجہ کروا دیا' یہ بات میرے لئے واقعی تعجب کی ہے۔ میں اُن سے گذارش کروں گا کہ وہ میرے گذشتہ خط کی طرف پھر توجہ پھیریں اور اُسے مظفر حنفی صاحب کے اُس مضمون کی روشنی میں پڑھیں جس کے ردِّ عمل کے طور پر میں نے وہ خط لکھا تھا۔ میں نے اپنے مکتوب میں "ناقدوں کی عدم توجہی" اور "ناقدوں کی طرف سے عدم توجہی" کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں اپنی اس پُرخلوص خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ "میں ایک نئی جاندار، ہمعصر اور صحت مند تنقید اور اپنی راہ آپ بنانے والے غیر نصابی ناقدوں کے ظہور اور ورود کا متمنی ضرور ہوں۔" مظفر صاحب نے اپنے گرانقدر مضمون میں ان ناقدوں کا شکوہ بلند فرمایا ہے جو ایسے ادیبوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں جن کی خدمات طویل اور موثر ہوتی ہیں اور ان ناقدوں کی عدم توجہی کے باعث حقداروں کو اُن کا حق نہیں ملتا۔ انھوں نے ایسے ادیبوں کی جنہیں وہ ان ناقدوں کی عدم توجہی کا شکار مانتے ہیں ایک طویل فہرست بھی نہایت نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ مرتب کی ہے، اگر میں اپنے آپ کو مظلوم اور اس عدم توجہی کا شاکی نہیں سمجھتا تو تاباں صاحب اور مظفر صاحب کو کیا اعتراض ہے؟ تاباں صاحب تخلیق اور تنقید کے باہمی رشتے پر لکھتے ہوئے یہ قطعی بھول گئے کہ تنقیدی اصول اور معیارِ تخلیق کی عام رفتار، عوامل اور اسالیب کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ہی قائم کئے جاتے ہیں۔ بے شک جب ان عوامل اور اسالیب میں عمومیت اور یکسانیت آجاتی ہے اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے تب تخلیق مروجہ تنقیدی اصولوں کی روشنی ہی میں ظہور پذیر ہوتی ہے لیکن ادب اور فن کی تاریخ میں ایسے ادوار بھی آتے ہیں جب شعورِ حیات و کائنات فنکار میں ایک نیا احساس ایک کربِ تخلیق ایک تجرباتی اُمنگ پیدا کرتا ہے اور فنکار مروجہ راستوں سے ہٹ کر اپنی ڈگر بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس وقت تنقید پھر تخلیق کی تابع ہو جاتی ہے، بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں تخلیقات کے پس منظر اور معانی کا جائزہ لیتی ہے اور اُن نئی اقدار کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتی ہے جو ان نئی تخلیقات میں ان کے خالق پیش کرتے ہیں۔ ایسے تجرباتی اور عبوری ادوار میں نئی تخلیق اور پرانی تنقید میں شدید کشمکش ہوتی ہے۔ میں نے اپنی گذارش میں ایسی ہی تنقید کو اصلی تنقید کہا ہے۔ میری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ میں تنقید فن کی اہمیت سے انکاری نہیں بلکہ تنقید ہی سند حاصل کرنے کو مقصدِ تخلیق قرار نہیں دیتا۔ بہر حال میرے خطوں کو مظفر صاحب کے مضمون کے تاثر سے جدا کر کے پرکھنا غلط ہے۔
رہا مظفر حنفی صاحب کا خط۔ مظفر صاحب کی ذہنی قدر بھی اور ذاتی سطح پر اُتر کر خفگی کا اظہار اور ادب اور تہذیب

تبرک کی بازیافت کے لئے میں بہت پریشان تھا۔

حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم بھی ایک ایسا نایاب تبرک ہے جو قدر و قیمت کے تخمینہ سے بالا ہے۔

آپ نے اعانت کے لئے جو اپیل شائع فرمائی ہے، اُسے پڑھ کر اس لئے افسوس ہوا کہ اتنی دیرینہ خدمات کے بعد بھی آپ کو یہ اپیل شائع کرنے کی نوبت پیش آئی۔ کاش اُردو والوں کو "شاعر" کی دیرینہ روایات اور خدمات کا احساس ہو اور اُنہیں یہ اپیل اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ آپ نے اعانت کی رقم کی حد کم سے کم ڈھائی سو مقرر فرمائی ہے۔ اِس لئے عام لوگ —— اور مجھ جیسے چند خاص لوگ بھی اِس "کارِ خیر" میں شرکت کی توفیق حاصل کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ خوش حال اور متموّل لوگ اپنی زبان اور "شاعر" کے حق کو محسوس کریں تو مطلوبہ رقم کا انتظام مشکل نہیں۔ پھر بھی میری یہی درخواست ہے کہ آپ اِس حد میں اور کمی کریں تاکہ کچھ زیادہ لوگ اِس کام میں شریک ہونے کا حوصلہ کر سکیں۔

"شاعر" کے مارچ اپریل کے شمارہ میں آپکی غزل بار بار پڑھی، اُن شخصی، سماجی اور ادبی و علمی عوامل پر غور کرتا رہا، جنھوں نے آپ سے یہ غزل کہلوائی ہے۔ آپکی غزل کے بارے میں کچھ نہ کہنا بھی کُفر کے برابر ہے اور کچھ کہنا بھی سُورج کو چراغ دکھانے کے مماثل ہے۔ زخموں کی لذّت اور سعیِ اندمال میں ناکامی کی لذّت وہی سمجھتا ہے، جس نے اہلِ دنیا اور ابنائے زمانہ کے زخم کھائے ہیں۔ ہائے مخلص انسان اِس دنیا میں کیسے کیسے زخم کھاتے ہیں۔ سب ہی اشعار دل میں اُتر جانے والے ہیں ؎

جس کو بہت عزیز رہی گردِ اعتبار — لو دے اُٹھے ہیں آج یکایک اُسی کے زخم
اے سعیِ اندمال تری آبرو کی خیر — اتنے کبھی ہوئے تھے نہ رسوا کسی کے زخم
پھر سے سجا رہے ہیں اندھیروں کی انجمن — وہ تیرہ بخت، جن کو ملے روشنی کے زخم
ہر گام پائے راہ رَواں ہے لہو لُہاں — یہ رہزنی کے زخم ہیں یا رہبری کے زخم؟
محیطِ وفا میں کاش کبھی یوں بھی ہو سکے — ایک اجنبی کا ہاتھ ہو، ایک اجنبی کے زخم!

اِن نشتروں سے کون دل اثر لئے بغیر رہ سکتا ہے؟! ——

علی جواد زیدی کا مقالہ "سنسکرت میں فنی تکلفات" کافی معلومات آفریں ہے۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ کسی کو خوشتر گرامی کی طنز نگاری پر مضمون لکھنے کی توفیق تو ہوئی۔ میں نے اِس مضمون کو دلچسپی سے پڑھا۔ اِسی طرح اورنگ آباد کے نوجوان ادیب اختر فاروقی کی جوگندر پال سے "ادبی بات چیت"، کو بھی میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ جوگندر پال جتنے شریف اور مخلص انسان ہیں، اُسی صفائی، شرافت اور خلوص سے اُنھوں نے اپنی رائے بھی بعض ادبی اور تنقیدی مسائل پر ظاہر کی ہے۔ جس سے اختلاف ممکن ہے۔ مثلاً عوامی ادب والی بحث!! اِسی طرح کرشن چندر کے بارے میں خاص طور پر مجھے اُن کی رائے سے اختلاف ہے۔ نہ جانے "پڑھے لکھے لوگوں" سے جوگندر پال کی کیا مراد ہے لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ پڑھے لکھے لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ عرض کرونگا کہ کرشن چندر کے لہجے کی رومانیت ہی اُن کے اسلوب و اندازِ بیان کا حُسن ہے، جس نے اُنہیں ایک خاص قسم کی ہمہ گیری عطا کر دی ہے۔ کرشن چندر کے پاس جو منظر نگاری، جذبات آفرینی اور خیال انگیزی ہے، وہ موجودہ دَور میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ہاں اِدھر کچھ عرصہ سے بسیار نویسی کے باعث اُن کے فن میں کچھ انحطاط سا ضرور محسوس ہونے لگا ہے۔

"شاعر" کے تازہ شمارہ پر "جولائی" دیکھ کر واقعی مجھے بھی یک گونہ حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ اِس شمارہ میں ڈاکٹر گیان چند کا مقالہ "زبان کا مسئلہ" میں نے بڑی دلچسپی اور غور سے بغرضِ استفادہ پڑھا۔ مقالہ نہایت معلومات آفریں ہے اور بڑی عرق ریزی کے بعد لکھا گیا ہے۔ اِس میں جو تیکھا پن ہے اور "دانایانِ قوم" کی جو گرفت کی گئی ہے وہ ڈاکٹر گیان چند ہی کا حصّہ ہے۔ لیکن اُردو کی مشکلات کا حل اِس میں بھی پیش نہیں کیا گیا اور ایک بات کے بارے میں مطلوبہ خاص عرض کرنا ہے اور وہ اصطلاحوں کا مسئلہ ہے — خط طویل ہو گیا ہے۔ آئندہ اِس سلسلے میں تفصیل سے کچھ لکھوں گا۔

کہ گویا میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا کوئی خطرناک اور جھوٹا مجرم ہوں، کم از کم میری سمجھ میں نہ آیا۔ خلطِ مبحث کی یہ مثال واقعی افسوسناک ہے۔ "سندباد" میری طویل نظم ہے اس کا فارم اور اس کی تکنیک اِس درجہ تجرباتی اور نئی ہے کہ خود مجھے اس کی کامیابی کا اندازہ لگانے کی کسک ستاتی رہی۔ میں نے اپنے غیر جانبدار، ایماندار اور باشعور احباب اور ایسے ہی دیگر ادیبوں کو "سندباد" پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرنے کے لئے اپنے خطوط میں اشتیاقاً لکھا۔ اِس میں تنقیدی نیاز مندی یا تنقیدی سند حاصل کرنے کا سوال کہاں اُٹھتا ہے؟ ایسے بڑے اور اہم تجربے پر استصوابِ رائے کرنا دو وجہوں سے لازمی تھا۔ اِس لئے کہ اپنے قارئین اور ہمنوا و ہمخیال ادیبوں کے ردِ عمل کی روشنی میں خود اپنا اور اپنے اِس تجربے کا جائزہ لینا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ نظم کی کتابی صورت میں بعض تبدیلیاں آپ کو نظر آئیں گی جو اِنھیں رایوں کی روشنی میں کی گئی ہیں۔ دوسرے یہ اِس لئے بھی ضروری تھا کہ نظم کے قارئین کو اس کی حیثیت کا تعین کرنے اور نظم کو اچھی طرح سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہو۔ شہریار نے اپنی رائے نہایت تفصیل سے اور ایک مضمون کی صورت میں دی جسے وقار صاحب نے اپنے رسالے ہم رنگ میں میرے فٹ نوٹس کے ساتھ شائع کیا۔ نوٹس میں نے نظم کی مزید وضاحت کے لئے لکھے۔ اِس پُر خلوص اور بے غرض عمل پر مظفر صاحب کو میری خودداری کی سطح نیچی نظر آئی یہ بات بڑی دلچسپ ہے۔ اِس بات سے نہ میرے گذشتہ خط کی تردید ہوتی ہے اور نہ مظفر صاحب کی تائید۔ اور پھر میں نے اِس سلسلے میں کسی ایسے مقتدر ناقد یا کارساز ادیب کی رائے نہیں مانگی جو مجھے وہ حقوق دلا دیتا جن سے مظفر صاحب مجھے محروم قرار دیکر اپنے مضمون "نئی اور پُرانی تنقید" میں ہمدردی کا اظہار کر چکے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ایک ذاتی خط میں برسرِ راہ مظفر صاحب کی رائے گرامی اپنی نظم پر طلب کرنے کے بجائے کسی اور کے آگے دامن کشاں ہوتا کیونکہ خود مظفر صاحب اچھے ادیب اور میرے دوست ہی تو ہیں؟ وہ نہ مجھے دولت دلا سکتے ہیں نہ عزت نہ شہرت نہ اعزاز نہ انعام؟ یہ سب کرنے کے بعد بھی میں کسی تخلیق کو تنقیدی سند کا محتاج نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے عظیم ادیبوں کو ان کے اپنے دور میں تنقیدی سند اور اعزاز سے محروم رہنا پڑا اور بہت سے ادیب درباری سرپرستی اور تنقیدی سند حاصل کرنے کے باوصف تاریخِ ادب سے یوں مِٹ گئے جیسے حرفِ غلط تھے۔

اکرام جاوید ———— حیدر آباد دکن

"شاعر" کا تازہ شمارہ مضامینِ نظم و نثر کے اعتبار سے خاصا اہم اور بھاری بھرکم ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "زبان کا مسئلہ" کی ہندوستان بھر کے تمام پرچوں میں مختلف زبانوں میں اشاعت یقیناً اُردو کے مسئلے کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں مُمد و معاون ثابت ہوگی۔ تینوں ہی افسانے اچھے ہیں۔ موہن یاور کو عرصے کے بعد پڑھتے ہوئے ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھو گیا ہوں۔ شیام کنول کی تحریر میں پختگی اور شائستگی آچلی ہے۔

"جرعات" میں اُردو کے نہایت اہم مسائل پر بڑی سنجیدگی سے آپ فکر انگیز مواد پیش کرتے ہیں اور پُورے خلوص سے اُردو والوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر "شاعر" کے "جرعات" کتابی شکل میں چھپ جائیں اور کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ اُردو دوستوں، اور تحفظ و ترقئ اُردو کی تحریک کے کارکنوں تک پہنچ سکیں۔

خدا کرے "شاعر" کے لئے آپ کی اپیل کا اُردو والوں پر مُثبت قسم کا اثر پڑے اور وہ واقعی طور پر وہ اُردو دوستی کا ثبوت دے سکیں۔

متین سروش ———— پونہ

یہ زندگی کا جبر نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود اتنی طویل مدت کے بعد یہ عریضہ لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ حسینہ جمیلہ "سالنامہ" آیا۔ اُس کے بعد مارچ اپریل کا مشترک شمارہ ملا۔ (جس میں میری غزل بھی ہے) یہ شمارہ بھی دیدہ زیب ہے اور معیاری مضامینِ نظم و نثر کا حامل۔ اور ایک بات تو ایسی تھی کہ میں بے ساختہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ میرے نہایت عزیز دوست عزیز جہاں سے ایک طویل زمانے کے بعد ملاقات ہوئی، وہ بھی اِس حسنِ اہتمام کے ساتھ کہ اُن کی اور میری غزلیں ایک ہی صفحے پر نظر افروز ہیں۔

شیام کنول ———— دگلور ضلع ناندیڑ

مرہٹواڑہ کی ضلع پریشدوں نے ایسی قرارداد یں منظور کی ہیں کہ کسی بھی زبان کی نئی جماعت کے قیام کے مطالبہ کے ساتھ پانچ سو تا ایک ہزار روپیہ نقد جمع کیا جائے۔ ساتھ ہی کلاس چلانے کے لئے عمارت کی نشان دہی کی بھی شرط عائد کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی شرط ہے جس سے عام طور پر مرہٹواڑہ کے تعلقہ جات اور دیہات میں اُردو جماعتوں کا قیام مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگیا ہے۔ کیونکہ اُردو داں طبقے کی اکثریت انتہائی پسماندہ اور مالی طور پر پریشان حال ہے۔ اس شرط کے نتیجہ کے طور پر ایسے طلبا جن کی مادری زبان اُردو ہے، ابتداء ہی سے مرہٹی ذریعۂ تعلیم اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اس طرح غیر محسوس طریقہ پر آنے والی نسل تک اُردو کے خاتمہ کے (کم از کم مرہٹواڑہ میں) سامان پیدا کردئے گئے ہیں۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علاقائی انجمنِ ترقیٔ اُردو نے اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی دلچسپی نہیں لی اور نہ اب تک کوئی جدوجہد کی ہے۔ اُمید کہ "شاعر" اس سلسلے میں پہل کرے گا۔

"شاعر" کا تازہ شمارہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر گیان چند کا مقالہ اس شمارہ کو خصوصی نمبر کی حیثیت دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مقالہ کی تیاری میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور جو خیال انگیز اشارے فرمائے ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ آپ نے "جرعات" میں اُردو کے تعلق سے کچھ اُمید بندھائی ہے۔ آپ کا خیال برحق، لیکن میرے خیال میں اُردو کے تحفّظ کیلئے ایک منصوبہ بند عظیم تر عملی جدوجہد کی آج سخت ضرورت ہے۔ جس کا ابھی تک کوئی واضح تصوّر ہم نہیں کر پا رہے ہیں اور نہ ہی ایسے آثار نظر آرہے ہیں۔ ہم جو اُن لوگوں سے قربت رکھتے ہیں، جو اُردو بولتے ہیں اور بچّوں کو اُردو میں تعلیم دلانا چاہتے ہیں لیکن محض اس لئے نہیں دلاتے کہ اُردو تعلیم سے معقول ملازمت ناممکن ہو جائے گی۔ اُردو کے تحفّظ کے لئے آج ہم جس طرح جدوجہد کر رہے ہیں اور حکومت جو "فراخ دلانہ" رویّہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ سب اگر اسی طرح چلتا رہا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائینگے۔ اب بھی وقت ہے کہ اُردو والے سنبھل جائیں، غلط تصوّرات، غلط راہوں اور غلط وعدوں کے جال سے نکل کر کسی عظیم جدوجہد کا واضح پروگرام بنائیں اور عملی کام شروع کریں۔

محفلِ اپنی......!

اشاعتِ خاص ۱۹۶۰ء

"شاعر" پابندی کے ساتھ ہر سال ایک خاص نمبر اور ایک سالنامہ پیش کرتا رہا ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اِس بار اگست میں "خاص نمبر" پیش کرنے کا ارادہ نہ تھا لیکن بعد میں اِس خیال نے چٹکی لی کہ یہ دیرینہ روایت کیوں ٹوٹے؟ اور اب انتہائی کم وقت میں زیرِ نظر "اشاعتِ خاص" اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضخامت کمتر ہوتے ہوئے بھی اِس کی علمی و ادبی قیمت بہت زیادہ ہے۔ قارئین اِس "اشاعتِ خاص" کو دیکھ کر مسرور ہوں گے۔ ایک تو ہمیشہ کی طرح اِس بار مضامین نظم و نثر کی ابوابی تقسیم نہیں کی گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قارئین اُس ترتیب سے کچھ اُکتا سے گئے ہوں گے۔ دوسرے، ہمارے مشمولات کا تنوع ہے۔ ادبی مقالے، تحقیقی مضامین، طنز و مزاح، افسانہ، ڈرامہ، انٹرویو اور نظم و غزل، کون سی صنفِ ادب اِس میں نہیں ہے؟ ہمارے نقطۂ نظر سے کوئی تخلیق کم عیار و کم معیار نہیں ہے۔ بڑی خوبصورت اور کام کی چیزیں اِس میں شامل ہیں۔ یہ اشاعت ۱۵ اگست کے لگ بھگ نکل رہی ہے۔ "یومِ آزادی" کو ہماری قومی زندگی میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ اِس "اشاعتِ خاص" میں قومی موضوعات پر بہت کافی اور نہایت اچھے مضامینِ نظم و نثر جمع ہو گئے ہیں۔ شاید کسی بڑے سے بڑے "آزادی نمبر" میں بھی اتنی اچھی چیزیں نظر نہ آ سکیں۔ مقالات میں "شعرائے اُردو کا جذبۂ وطن دوستی"، افسانوں میں "پُرانا اور نیا ہندوستان"، "طوفان کے بعد روشن راہیں"۔ نظموں میں جُرعہ جُرعہ، قطرہ قطرہ۔ بے چارگی۔ ہجر کی سات۔ اپنی دھرتی اپنے گیت۔ ویت نام۔ پندرہ اگست۔ یَن اُر دو۔ دُھند لکے۔ طنز و مزاح میں "بستی لبنا کھیل نہیں" سے نہ صرف ماحول اور وقت کے تقاضوں کا احساس و شعور اُبھرتا ہے بلکہ صداقتوں، حقیقتوں اور اُمیدوں کی بھی قلب و ذہن اثر گیر ہوتے ہیں۔ زندہ ادب اِسی کا نام ہے اور اُردو زبان کو ایسا ادب پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ڈرامہ "سانحہ بمبئی چوویش" تو ایسا مکمل طربیہ اور المیہ ہے، جسے ہماری موجودہ قومی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ قارئین اِس سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔ شانی کی ہندی کہانی "آنکھیں" کے علاوہ "وہ ہی" اور "ہیرے کا جگر" یہ دونوں کہانیاں بھی اپنی نفسیات اور اندازِ پیش کش کے اعتبار سے خوب ہیں۔ مقالات میں عظیم بیگ چغتائی اور جمیل مظہری کی شخصیتوں اور اُن کے فنی تجربوں پر بڑی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں احمد جمال پاشا "خوش آمدید آمد" کا کارگر نسخہ لکھ کر عبرت ناک ہنسی کی دعوت دیتے ہیں، وہیں ہمارے ترّاہی صاحب "خدمتِ ادب" میں ایک ایسا طنزیہ وار کر رہے ہیں جو سہلائے بھی اور رُلائے بھی۔ ستارز کی نظم "چاندنی" بڑی رواں دواں اور خوبصورت نظم ہے۔ زیدی جعفر رضا اور رابع نزاہین راز کی مختصر نظمیں علامتی شاعری کا اچھا نمونہ ہیں۔ دونوں تحقیقی مقالے، تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید اور عام قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے ارشاداتِ عالیہ کے علاوہ حضرت فراق گورکھپوری، الطاف مشہدی۔ شہاب جعفری۔ عبدالکریم تمر اور حکیم مظفر نگری کی غزلیں تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہیں۔

اگر "شاعر" کی یہ چھوٹی سی خوبصورت "اشاعتِ خاص" آپ کو متاثر کرتی ہے تو اِسے دوسروں تک بھی پہنچائیے اور انھیں "شاعر" کی خریداری کی طرف مائل کیجئے۔ حقیقی داد یہی ہو سکتی ہے۔ محض خاموش تاثر یا تحریری داد سے "شاعر" کے مقاصد کو تقویت نہیں پہنچ سکتی۔

کرشن چندر نمبر

"کرشن چندر نمبر" کے کام زور شور سے شروع کر دئے گئے ہیں۔ ادارۂ "شاعر" کے اِس اہتمام پر ہر طرف سے اظہارِ مسرت کیا جا رہا ہے۔ اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد کو دعوتِ نگارش دی جا چکی ہے۔ اُمید کہ عنقریب یہ تمام قلمکار زیادہ سے زیادہ، اچھے سے اچھے مضامین بھیج دیں گے۔ "شاعر" کا "کرشن چندر نمبر" ہندو پاک کے دوسرے مقتدر رسائل کے اب تک نکالے ہوئے شخصیت نمبروں کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھائے گا بلکہ حتی المقدور اُسے مثالی بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ جو بہت ضخامت چاہے وہ ادب کے ہمہ گیر آفاقی افسانہ نگار کے فن اور اُس کی شخصیت کے تجزیے کی بھرپور انداز میں سعی کریں۔

ہاں بلکہ اگلے دس برس تک، آپ ہر مہینے سو رُوپے والا ایک دس سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ (اوّل اجرا) خریدتے ہیں۔ دس برس بعد ہر مہینے آپ کے ایک سرٹیفکیٹ کی میعاد پوری ہوگی ـــ ہر مہینے آپ کو ۲۱۸ رُوپے ملیں گے۔ یہ ماہانہ آمدنی بڑھاپے میں کسی نعمت سے کم نہ ہوگی، کیونکہ اس سے آپ کے لئے ایک مقرّرہ پنشن یقینی ہوجائے گی اگر آپ چاہیں تو سیونگز سرٹیفکیٹوں کی میعاد پوری ہونے پر بیاج اپنے پاس رکھ کر اصل رقم یعنی سو رُوپے پھر نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹوں میں لگا سکتے ہیں۔ اس سے آپ اور آپ کے متعلقین کو دوبارہ سرمایہ لگانے کی تاریخ سے دس برس بعد آئندہ دس برس کے لئے یقینی ماہانہ آمدنی ہوگی۔

یہ سرٹیفکیٹ رُوپیہ لگانے کا بہترین ذریعہ ہیں کیونکہ ان پر ۸ فی صد سالانہ سُود سادہ یا ۶۰۵ ، ۶ فی صد سالانہ سُود مرکّب ملتا ہے۔ اگر آپ ٹیکس دیتے ہیں تو آپ کو اس پر ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

قومی بچت آرگنائزیشن

(پرنٹر پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس [illegible] سے چھپوا کر [illegible])
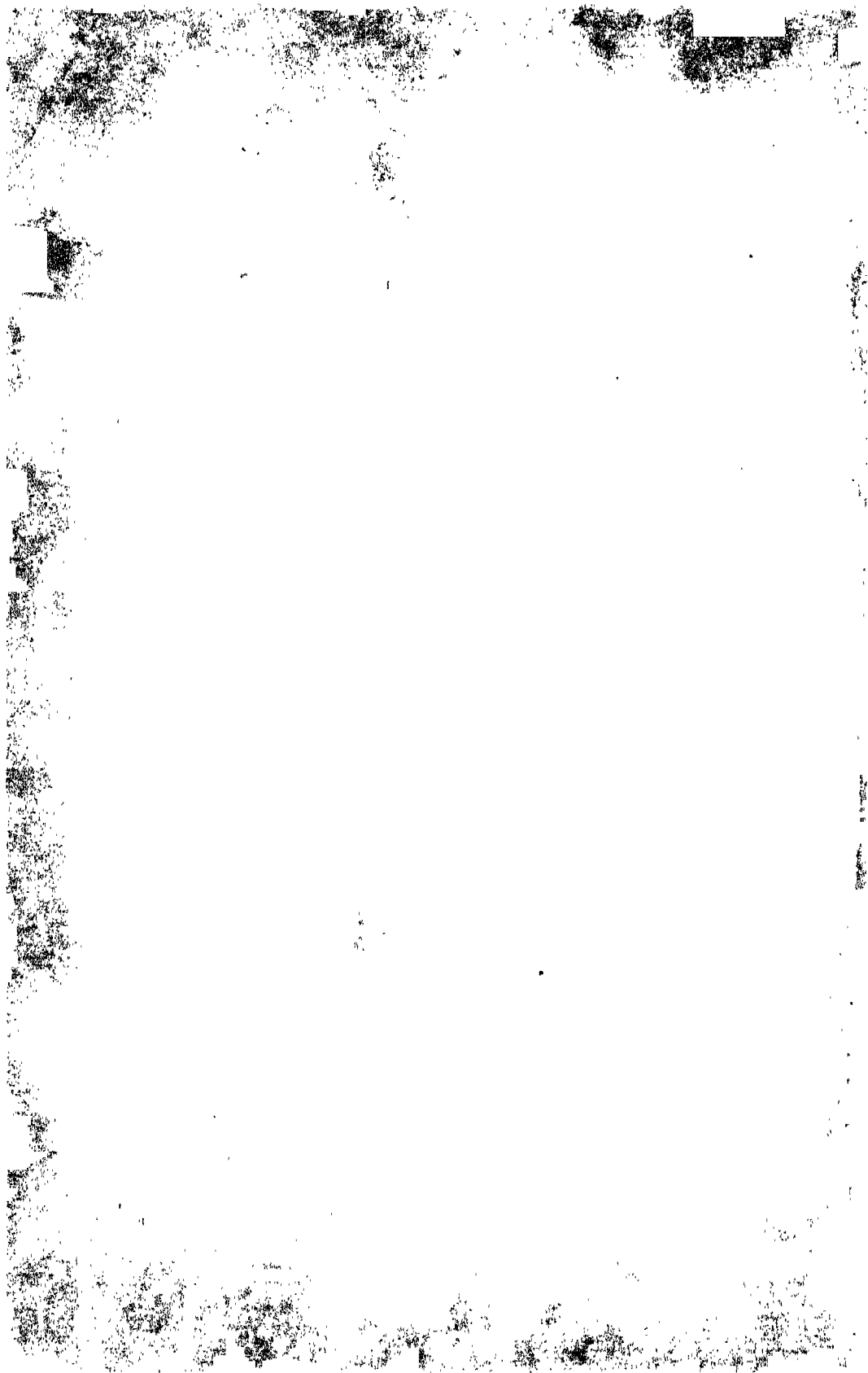
SPECIAL ISSUE AUGUST 1965

Regd. No. B. 6032

The "SHAIR" Bombay 8

(36 Years of Publication)

THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات آور تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیر غم (عزائی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر ، شاعر ، مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۵۲۶ بمبئی ۸

Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

شاعر
چاند پوری

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اردو کا چھتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ
ستمبر ۱۹۶۵ء
شاعر
بمبئی
ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ
زر سالانہ
سات روپے
زر ششماہی
چار روپے
ممالک غیر سے
۱۴ شلنگ
فی پرچہ
۱۰ آنے / ۶۲ پیسے
مکتبہ قصر الادب

منصوبہ بندی کے لئے آزادی

آزادی محض سیاسی نصب العین کا حصول نہیں۔ اس کا مطلب اپنی زندگی کو حسب منشا بنانے اور افلاس اور جمود سے نجات پانے کے لئے منصوبہ بندی کرنا بھی ہے۔

ہمارے آئین میں ملک کی ترقی کے اہم اصول درج ہیں۔ انہیں اصولوں کے پیش نظر پنج سالہ منصوبے بچتوں اور سائنس کو عوام کی روزی کا ذریعہ بنانے" کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

پچھلے تین پنج سالہ منصوبوں کی بدولت زرعی پیداوار — اناج اور نقدی فصلوں — کو فروغ ملا ہے۔ صنعتی پیداوار پہلے سے تین گنا اور بجلی کی سپلائی پانچ گنا ہو گئی ہے۔

تعلیمی سہولتوں میں عام سطحوں پر کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب لگ بھگ ۸۰ فی صد بچے (۶ سے ۱۱ عمر تک) پرائمری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں صرف ۴۰ فی صد بچے پرائمری اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ پہلے کی نسبت زیادہ طبی سہولتوں اور ملیریا جیسی بیماریوں کی روک تھام سے اوسط عمر ۳۲ برس سے بڑھ کر ۵۰ برس ہو گئی ہے۔

پلان سے خوشحالی

پلان کے لئے محنت کیجئے۔ پلان کے لئے بچت کیجئے

DA-65/229

انجمن کی چند اہم مطبوعات

شاعر بمبئی
ستمبر ۱۹۶۵ء

ترتیب

افکارِ ادارہ

مقالات

نظمیں

افسانے

غزلیں

مکتوبات

ادارہ
شاعر
مسرت کے ساتھ
اردو کی آٹھ
مایۂ ناز شخصیتوں پر
علی الترتیب
نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر
پیش کرنے کا ہنگامی اعلان کرتا ہے

- ۱۔ کرشن چندر نمبر
- ۲۔ سردار جعفری نمبر
- ۳۔ رشید احمد صدیقی نمبر
- ۴۔ راجندر سنگھ بیدی نمبر
- ۵۔ احتشام حسین نمبر
- ۶۔ خواجہ احمد عباس نمبر
- ۷۔ کنھیا لال کپور نمبر
- ۸۔ ساحر لدھیانوی نمبر

ان کے علاوہ
دیگر مشاہیر اردو پر بھی
"شاعر"
فقید المثال نمبر
پیش کرے گا

(۱)

اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار
کرشن چندر
کی منفرد شخصیت اور اس کے عظیم و ہمہ گیر فن پر
نہ صرف ہندو پاک کے مشہور قلمکاروں، بلکہ دنیا کے
کئی بڑے مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں

پیش کیے جائیں گے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ۔
اس کی عظمت کی کہانی۔ اس کی تصانیف کا جائزہ۔
اس کے زندہ اسلوب فکر اور شاہکار
افسانوں۔ ناولوں اور ڈراموں
پر تنقیدی نظر
عالمی ادب میں کرشن چندر کا مرتبہ

درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجیے

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

ایک پیغام

ہمارا ملک چاروں طرف سے جنگ کے ہولناک شعلوں میں یکایک گھِر گیا ہے۔ خدا کرے اِس شمارہ کے شائع ہوتے ہوتے حالات معمول پر آجائیں۔ ہماری بُنیادی پالیسی امن پسندی ہے۔ ہمارے مُلک نے دُنیا میں قیامِ امن کے لئے بے پناہ کوششیں کی ہیں، جن کا سب ہی کو اعتراف ہے لیکن پڑوسی ممالک کی طرف سے اگر ہم پر جنگ لاد دی جائے تو ظاہر ہے ہم اپنے بچاؤ کے لئے، تن من دھن سب کی بازی لگا دینے کے لئے مجبور ہیں۔ ہمیں اپنا مُلک عزیز ہے اور اُس کی حفاظت ہم پر فرض۔

مُلک پر اِس سے زیادہ سخت وقت نہیں آسکتا۔ اِس وقت مُلک کے تحفظ سے زیادہ ضروری اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم اپنے دوسرے مسائل بعد کو سُلجھا سکتے ہیں چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی، معاشی ہوں یا لسانی۔ اِس وقت ہمیں ذہن کو کسی دوسری طرف نہیں لے جانا ہے۔ ایک باہوش قوم ایسے موقع پر جو کچھ کر سکتی ہے، وہی کرنا چاہئے۔ اِس سے بڑا مجرم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ بعض لوگ اِس نازک گھڑی میں بھی اپنی مفاد پرستی اور اغراض سے چپٹے رہیں۔ ہماری جاں باز فوجوں کا کام لڑنا ہے اور شہریوں کا فرض اُن کو حوصلہ دلانا، اُن کی ضرورتوں کو پُورا کرنا۔ اُن کی ہر طرح مدد کرنا۔ یہ کام ہم اپنی ضرورتوں کو کم کر کے، اندرونِ ملک امن اور یکجہتی کی فضا قائم رکھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہندوستان مذاہب کا ایک گلدستہ ہے۔ یہ گلدستہ نہ بکھرنے پائے۔ عالمی سیاست کے انداز و رجحانات بڑے خطرناک ہوتے ہیں، اِن کا مقابلہ ہم یکجہتی ہی سے کر سکتے ہیں۔ جنگ مُلکوں کی ہوتی ہے، مذاہب کی نہیں۔ آج کوئی مُلک ایسا نہیں جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد نہ ہوں۔ اپنے مُلک سے لگاؤ اور وفاداری ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ فرقہ پرستی ایک مذموم فعل ہے۔

اُردو والے عوام کو اِس وقت تک جب تک جنگ کے بادل بالکل چھٹ نہ جائیں اور مُلکی حالات سکون پذیر نہ ہو جائیں، اُردو کا کوئی مسئلہ نہیں اُٹھانا ہے۔ ہاں جو کام ہمارے ذمّہ ہیں صرف اُنھیں انجام دیتے رہیں۔ اُردو کے ذریعے، اِس نازک گھڑی میں جو خدمت بھی اُردو عوام، مُلک و قوم کی کر سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ کریں۔ ہندوستان پر ماضی میں بھی بہت سے کٹھن وقت آچکے ہیں اور اُردو زبان نے اِن نازک موقعوں پر جس طرح ساتھ دیا، اُس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

آج بھی اُردو کے ادیب، شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس بیدار ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اِس وقت ایسا موثر ادب ڈھالیں گے جو مُلک کے تحفظ کے جذبات کو اُبھارے۔ ہمارے جوانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرے۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مقاصد کو تقویت پہنچائے۔ قطع نظر اِس سے کہ اُردو کی مسلسل حق تلفی ہوئی ہے، اُردو کے فن کار قومی ادب کی تخلیق اپنا سب سے مقدس فریضہ سمجھتے ہیں، قومی مفادات کی اہمیت کو اُنھوں نے پُوری طرح سمجھا ہے اور گوارا کیا ہے۔ آج بھی ہمارے کانوں میں وہ نغمے گونج رہے ہیں جو ماضی میں اُردو شعرا نے ڈھالے تھے۔ اُردو کے نغمات اِس وقت بھی روحِ حیات اور جانِ کامرانی بنیں گے۔ جنگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے مُلک کو عزم و استقلال اور استحکام بخشیں گے۔ اُردو کی طرف سے پہلا پیغام تو یہی ہے کہ

ساتھ پتوار نہ دے، شورشِ طوفاں نہ تھمے
کچھ بھی ہو، ہمسفرو پار اُترنا ہوگا

[illegible]

۸ ستمبر ۱۹۶۵ء

لڑائی دو فرقوں میں نہیں بلکہ دو ممالک کے درمیان ہے۔ — وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری

زرینہ ثانی

راز اور "نوائے راز"

"نوائے راز" میں راز چاندپوری کی ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۵ء تک کی منتخبہ غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ سن اور وقت سے واقفیت کی بنا پر ہمیں راز کی شاعری کے ارتقا کا پتہ لگانے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے ...... راز کے یہاں ابتدا ہی سے تصوف کی تجلیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۵ء تک کی غزلیں پاکیزہ خیالات۔ وسیع مشاہدے، بلند تخیل۔ عمدہ بین نگاہی اور صاف ستھری زبان کی شاہد ہیں۔ اُن کی اس دور کی غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حُسنِ لایزال کی کرشمہ زائیاں شاعر کے دل کی دنیا کو جگمگا رہی ہیں۔ اس پرتوِ حسن سے اُس کا شیشۂ دل چمک اُٹھتا ہے اور اس مقدس روشنی کو شاعر قلم کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اُسے ہر پھول مظہرِ حقیقت ذاتِ حق اور پرتوِ حسن نظر آتا ہے اور اس حسن کے احساس سے سرشار ہو کر وہ اپنے جذبات کو بڑے ہی رچے ہوئے انداز میں پیش کرتا ہے۔ شاعر کو ذاتِ خدا اور نبی کے ساتھ ساتھ ذاتِ انسانی کا بھی عرفان ہے اور یہی عرفان اس کے عشق کو جلا دیتا ہے اور وہ اس قسم کے اعلیٰ اشعار کی تخلیق کرتا ہے ؎

نیازِ عشق میں اتنا کمال پیدا کر | کہ نازِ حسن سراپا نیاز ہو جائے
کمالِ عشق ہے یہ، شانِ عاشقی ہے یہی | کہ سوزِ عشق مبدّل بہ ساز ہو جائے
پردۂ رخ اُٹھا دیا جلوہ مجھے دکھا دیا | اے مرے بختِ نارسا آج کمال ہو گیا
واقعہ ہے واقعہ اہلِ نظر سے پوچھئے | حُسن بھی حیرت میں ہے شانِ محبت دیکھ کر

زمانے کے ساتھ ساتھ یہ لے مدھم نہیں ہوتی بلکہ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ شاعر کے دل پر عشقِ حقیقت کا پرتو کچھ گہرا ہی ہوتا جاتا ہے۔

"ذکر و فکر" سحر و سحر" میں جو ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے اس قسم کے اشعار ملتے ہیں ؎

ترے جلووں نے فرصت ہی نہیں دی | میں نیرنگِ زمانہ دیکھتا کیا
مشاہداتِ رہِ دوست کیا کہوں ہمدم | قدم قدم پہ یہ سجدہ گزار پڑا ہوں میں
فکرِ این و آں ہے بے جا لے رفیقِ کوئے دوست | ہم کو تو اس راہ میں دیوانہ ہونا چاہئے

اِس قسم کے اشعار کی تاثر آفرینی سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر معرفت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کے لئے تجلیاتِ الٰہی کے سوا کسی شے کی اہمیت ہی نہیں ہے وہ اُس کے حسن میں خود کو گم گشتہ پا رہا ہے۔ کیونکہ شاعر کو شدید احساس ہے کہ انسان کبر و نخوت اور غرور و ہوس، خود غرضی اور خود پرستی کے جال میں گرفتار ہو کر رہِ معرفت طے نہیں کر سکتا اور نہ ہی منزلِ مقصود کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی ناصحانہ لہجہ اختیار کر کے کہتا ہے ؎

خود نمائی ہے رہبری تیری | مل چکا بس سراغ منزل کا

پھر ؎

کیوں گوش برصدا ہے وہ نغمہ یہاں کہاں | بزمِ خودی میں ذکرِ خدا کا گماں کہاں

اور کبھی نرم لہجہ میں کہتا ہے ؎

خدا ملتا ہے لیکن بے خودی سے آشنا ہو کر — حقیقت تک پہنچ سکتا نہیں تو خود نما ہو کر

وہ بادۂ عرفاں اور اِس محفل کے آداب سے بخوبی آگاہ ہے۔ دل کے آئینے میں تصویرِ جاناں دیکھ کر دیدۂ دل کا ممنون ہوتا ہے
اور اس کی عظمت و برتری کا اقرار بڑے احترام و خلوص سے کرتا ہے ؎

آئینہ ہے یہ حسینِ کامل کا — اللہ اللہ! یہ مرتبہ دل کا
آج اِس نے دکھا دیا اُس کو — میں ہوں ممنون دیدۂ دل کا

بارگاہ ناز کے آداب کو ملحوظ رکھتا ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں بے خودیٔ عشق میں کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو شانِ حسن کے خلاف ہو
اِس لئے اپنے جذبۂ شوق کو تازیانے لگاتا ہے ؎

دیکھ اے بے خودیٔ شوقِ پرستش ہشیار — حسنِ خوددار کو محفل میں نہ رسوا کرنا
اٹھ جائے جوشِ الفت اور یہ طرزِ سخن — حیف! تو آدابِ بزمِ ناز سے بیگانہ ہے
بجا ہے نازِ محبت بجا ہے فخرِ وفا — مگر ہے یہ حد و بے نیاز تک محدود

سچ پوچھئے تو ساز خود آگاہ اور خودشناس ہونے کے ساتھ ساتھ معراجِ انسانیت سے بھی واقف ہے ؎

وہ عہدِ ازل یاد ہے ہاں یاد ہے مجھکو — بندہ ہوں ترا عہد فراموش نہیں ہوں

اور اِس آگاہی اور معرفت نے اُس کی شاعری میں روح پھونک دی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو رچے ہوئے اندازِ بیان اور
خوبصورت اسلوب میں ڈھالنے کا گُر جانتے ہیں اور صوری و معنوی دونوں لحاظ سے اُن کا کلام بلند اور تاثر آفریں ہو جاتا ہے۔ ساز
کے یہاں تصوف کے نقوش اِس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ابتدا ہی سے اُن کی زندگی المیہ سے دوچار رہی۔ بچوں کی موت۔ وطن سے دوری۔
معاشی پریشانیاں۔ زندگی کی کشمکش اور آویزش۔ درد و کرب کی شدت نے اُن میں ایک فراری کیفیت پیدا کر دی تھی لیکن انھوں نے
فراریت کی بجائے تصوف کی گھنیری چھاؤں کو پناہ گاہ بنا لیا۔ اپنے دکھوں کا مداوا تصوف میں تلاش کیا۔ اور پھر اُس میں اِس طرح کھو گئے
کہ تصوف اُن کی شخصیت کا جزو بن گیا۔ اُن کے یہاں المیہ کا بھرپور حسن ملتا ہے۔ مسائلِ تصوف کا بیان کرتے وقت ساز کے لب و لہجہ میں متانت
اور سنجیدگی، شائستگی اور تہذیب کا گہرا شعور ملتا ہے۔ فن کی قدریں مجروح نہیں ہوئیں۔ وہ اُس انتہا پسندی کا سے گریز کرتے ہیں جو بعض
ترقی پسند شعراء کا طرۂ امتیاز بنا رہی۔ اُن کے اشارات میں ابہام اور ژولیدگی نہیں۔ بلکہ سادگی اور سلاست۔ ایک فن کارانہ احساس
اور معقولانہ چابک دستی ملتی ہے۔

ساز کا تصوف خانقاہی اور انفعالی قسم کا نہیں ہے جو صرف ذکر نیم شبی۔ مراقبے۔ سرود اور تخیلات کی دنیا تک محدود رہے۔ بلکہ یہ وہ
تصوف ہے جس سے "اسرارِ جہاں گیری" کھلتے ہیں۔

فن کار فن کی ریاضت کے وقت شعوری یا غیر شعوری طور سے اپنی روایت سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ کہیں یہ اثر صاف جھلکتا ہے
تو کہیں بڑا ہی مبہم سا اور غیر واضح۔ روایت کے صحیح احساس کے بغیر فن میں عظمت اور بلندی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ساز روایت پسندی کے
اِس راز سے واقف ہیں۔ وہ "بادۂ سخن قدیم" کے اثر کے معترف ہیں مگر انھوں نے روایت پرستی سے انحراف کیا ہے۔ اپنے ایک خط
میں (جو راقمہ کے نام ہے) فرماتے ہیں "اپنی افتادِ طبع کی بنا پر شخصیت پرستی اور تقلیدِ غیر سے ہمیشہ محترز رہا۔ بلا مبالغہ میر اور میرزا
سے لے کر حسرت اور جگر تک تمام مشاہیر کے کلام کا کم و بیش مطالعہ کیا۔ مگر شعوری طور سے کسی کی تقلید نہیں کی۔ تاہم مجھے اعتراف کرنا
چاہئے کہ فارسی میں خاص طور سے حافظ اور اردو میں غالب اور اقبال کے کلام کا مطالعہ میرے لئے بیش قیمت اور اور روح پرور
ثابت ہوا۔" اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ساز نے شعوری طور پر نہ کسی کی تقلید کی اور نہ ہی کسی کی بنائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہوئے
بلکہ اپنے لئے ایک علیحدہ راستہ بنانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ امتیازی شان کے آرزومند ہیں۔ لیکن غیر شعوری طور سے اقبال اور

غالب کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ ایسے عظیم، بلند اور مستند شعرا کے کلام کا اثر آنا فخر کی بات ہے ؎

میں اور شکوۂ بیجا کرم ہائے جہاں نواز ۔۔۔ اک بندۂ رضا کو سپاس زباں کہاں
فریب دے گا مجھے کیا طلسمِ رازِ شہود ۔۔۔ نگاہِ شوق میں ہے جلوۂ ہوالمعبود
اک نظر اور بھی اے ساقیٔ خوش کام ابھی ۔۔۔ عقلِ ناکام ہے سرگشتۂ اوہام ابھی
ننگِ ضبطِ عشق ہے کھلنا لبِ فریاد کا ۔۔۔ سوزِ دل کو بے نیازِ ساز ہونا چاہئے
آشنائے رمزِ کُنْ فیکوں ۔۔۔ رازِ ہستی سے باخبر ہو تم

آشنائے رازِ فطرت ۔ شرمندۂ افکارِ خام ۔ اسیرِ گیسوئے ماہ وشاں ۔ فریب خوردۂ رنگینیٔ جہاں ۔ حریفِ شیوۂ اربابِ گلستاں ۔ خرامِ نازآگیں ۔ ساقیٔ خوش کار ۔ اسیرِ نیرنگِ قسمت ۔ ادائے نازِ جاں وغیرہ قسم کی فارسی ترکیبیں غالب کا ماثلت دکھاتی ہیں اور بیدل کی یاد دلاتی ہیں اور راز کی فارسی دانی کے کمال کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

راز کی شاعری ہماری شاعری میں ایسی چیز نہیں جس سے غفلت برتی جائے۔ یا جسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں یہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ اس میں راز کے احساسات، جذبات، کیفیاتِ درون، تاثرات اور اعتقادات ہیں جن میں دردمندی، والہانہ اور انسانیت کی جھلک ملتی ہے۔ شعری صداقت کے ساتھ ساتھ جذبے کی صداقت دامن کھینچتی ہے۔ آج سے بہت عرصہ پیشتر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب "جدید شاعری" میں راز کے متعلق لکھا تھا "راز کی شاعری زیادہ تر داخلی ہے" اور زمانے کے ساتھ ساتھ یہ رنگ نیاز گہرا اور پختہ ہوتا چلا گیا۔ تغزل کے لئے داخلیت بمنزلہ روح کے ہے اس لئے اُن کی شاعری تغزل کا بہترین شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ اُن کی فکر و نظر وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور یہ وسعت مذہبی وابستگی کی حدود کو مسدود کر دیتی ہے۔ اس کی تان انسان دوستی پر ٹوٹتی ہے، جہاں شیخ و برہمن کے جھگڑے بے معنی اور لایعنی ہو کر رہ جاتے ہیں، اگر وہ کسی بلند جذبے کی تبلیغ کرتے ہیں تو خلوص اور بے غرضی کے ساتھ ؎

تکلفاتِ قیام و سجود ہیں بے سود ۔۔۔ کہاں خلوصِ محبت، کہاں رسوم و قیود
مطلعِ انوارِ وحدت ہے جبینِ برہمن ۔۔۔ سجدۂ بے لوث نے ناقص کو کامل کر دیا
کہاں ہیں غیر سب اپنے ہیں بزمِ فطرت میں ۔۔۔ کہ قیدِ مذہب و ملت نہیں محبت میں
کچھ شیخ و برہمن کی تخصیص نہیں اس جا ۔۔۔ آئے وہ جو آتا ہے یہ محفلِ رنداں ہے

زندگی نے اُنھیں بہت سے غم دئے۔ لیکن یہ شکوہ نہ کیا ؎

میری قسمت میں غم جو اتنے تھے ۔۔۔ دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

بلکہ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پوری دنیا کی قسمت ہی میں پریشانی ہے تو ایک سطر کا شکوہ کیا۔ اپنے ضبط و صبر، توازن و اعتدال، بلند ہمتی اور اعلیٰ ظرفی کا اعلان کیا۔ اُنھوں نے اپنے لئے المیہ کو گوارا بنالیا

دردِ فراقِ یار کی مجبوریاں بجا ۔۔۔ اتنا تو ہو نہ شور، قیامت کہیں جسے
جورِ فلک کا شکوہ وہ بھی مری زباں سے ۔۔۔ یہ حسنِ ظن ہے بے جا فطرت کے آشنا سے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی شاعری کے دامن میں نشاطیہ عناصر سموئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ المیہ ایک حسن ہے مگر ضبط و توازن میں۔ اُن کی عشقی زندگی کے درد کی جھلکیاں بھی ہیں، مگر شاعرانہ انداز میں، مبہم اور غیر واضح سی جیسے ؎

جینے میں مل رہا ہے مجھے لطفِ مرگ بھی ۔۔۔ حیران ہوں خدا سے میں اب کیا دعا کروں
گناہگارِ وفا کا نصیب کیا کہنا ۔۔۔ ہزار حسنِ عمل پر بھی کامیاب نہیں
نشترِ جفا و جور بھی ہے اک ادائے خاص ۔۔۔ حسنِ نگاہ و لطف سے میں بے خبر نہیں

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ دل کے بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔ مگر یہ صوفی تخیلات اور دل بہلاوا نہیں بلکہ اس کے پیچھے کچھ اور نظر آتے ہیں۔ راز کو اپنے جذبۂ ودروں اور صدق وفا پر اعتماد ہے، اس لئے وہ شوخ نظری کی تعلّی پیدا نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی تو وہ خود کہہ ستم ہو جاتے اور تڑپتے ہیں۔ پیہم کی بجائے عشق میں نیاز کا پابند ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جو لذت و سرور، کیف و سرخوشی نیاز عشق میں ہے وہ ناز و دل نوازی میں کہاں ؟

زندگی کی افراتفری، کشمکش اور آویزش سے عام طور سے کلام میں طنز پیدا ہو جاتا ہے۔ راز کی داخلی زندگی بھی اسی قسم کی گزری ہے، اس لئے اُن کے یہاں بھی طنز ہے ؎

وفاشعار ہیں سب، صرف بے وفا ہوں میں
بجا، درست، بہت خوب، مانتا ہوں میں

دوسرے مصرعے میں تیکھا پن و بیان کی تلخی اور احساس کی شدت دیکھئے۔ اسی طرح یہ شعر ہے ؎

قصوروار ہے بے شک، سزا کے لائق ہے
چمن پرست ہے بلبل چمن فروش نہیں

راز کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اُن کے خیالات و نظریات کے تضاد کو ظاہر کرتے ہیں جیسے ؎

بے خبر حسنِ عمل پر کس قدر مغرور ہے
کامیابی پردۂ تقدیر میں مستور ہے

تلخیِ آغاز سے بد دل نہ ہونا چاہئے
بادۂ حسنِ عمل خود صافیِ انجام ہے

کوششِ پیہم کا حاصل آہ اب میں کیا کہوں
آدمی مختار ہونے پر بھی تو مجبور ہے

ستم پرورا خدارا غور کر کچھ اس حقیقت پر
کہ ہر مجبور کو بھی کچھ نہ کچھ مقدور ہوتا ہے

لائقِ داد ہے پروانے کی ہمت ورنہ
کون جاتا ہے کسی شعلہ بداماں کے قریب

پروانے خود غرض تھے کہ خود جل کے مر گئے
احساسِ سوزِ شمعِ شبستاں نہ کر سکے

پہلے دو شعروں میں حسنِ عمل کے انجام میں تضاد ہے۔ دوسرے دو شعروں میں انسان کی مجبوری اور مقدوری کا اعلان ہے۔ تیسرے میں بھی یہی تضادیت ملتا ہے۔ پہلے تو پروانے کی ہمت کی داد دی گئی ہے، مگر دوسرے میں اُسے خود غرض کہا گیا ہے۔ ؎

انسان کے خیالات، جذبات اور احساسات ہر زمانے میں یکساں نہیں ہوتے بلکہ ماحول کے اثرات اور زندگی کے نئے نئے موڑوں کے تحت تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں تو راز کی "تضادیت" پر اعتراض کی کم گنجائش رہ جاتی ہے۔

الغرض "نوائے راز" کی غزلیں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی خصوصیات سے مزیّن و آراستہ ہیں۔ محاوروں کا صحیح استعمال، تخیل کی بلندی، فنکارانہ نزاکتیں، لب و لہجہ کی شائستگی، حقائق کا شعور، نظریۂ تصوف کی وضاحت، سماجی کشمکش، عصری رجحانات اور قدروں کی مبہم سی جھلکیاں وغیرہ اُن کی غزلوں کے عناصر ہیں اور غزل کی دنیا میں اُن کا ایک مقام متعین کرنے کے لئے ہمیں دعوت دیتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے نقادوں نے راز چاندپوری کی طرف توجہ نہ کی۔ ہمارے یہاں مشکل یہی ہے کہ جو خود اپنا پروپیگنڈا کر نا جانتا ہو اس کی طرف ہم لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ دیکھئے راز جیسے کیسے کیسے بلند پایہ ادیب و شاعر ایک عرصے سے نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔

راز چاندپوری تو ہماری خوش قسمتی سے ابھی زندہ ہیں اور اُن کی پیرانہ سالی کے باوجود خود اُن سے اُن کے متعلق بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور سے اُن کا قیام علی گڑھ میں ہے۔ کافی دن ہوئے "ہماری زبان" میں اُن پر ایک مضمون آیا تھا اور کسی میں اُن کے کلام کا کچھ انتخاب بھی تھا۔ اُن کی کتاب "نوائے راز" کو بہتر طریقے سے ایڈٹ کر کے شائع کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے حالاتِ زندگی فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ اگر راز چاندپوری کو قائم چاندپوری کا قائم مقام سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ کام اردو کے مشہور ادیب و افسانہ نگار رہبر کو شر چاندپوری بھی کر سکتے ہیں اور علی گڑھ کے دوسرے ادیب بھی۔ غزلوں کے علاوہ راز چاندپوری کی نظمیں بھی ملتی ہیں جو کافی خوبصورت، معنی آفریں اور تیکھی شاعری کا اعلیٰ نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ یہ بجا ہے کہ خود راز نے سالہا سال سے ادبی دنیا کو چھوڑ رکھا ہے، ورنہ رسائل میں نہ صرف اُن کی غزلیں اور نظمیں ہی چھپا کرتیں بلکہ

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر دیکھئے)

محی الدین احمد (رانچی)

فضلی "چشمِ غزال" کی روشنی میں

ہر اچھے فن کار کی انفرادیت اور شخصیت کی گہری چھاپ اس کی تخلیق پر پڑتی ہے چنانچہ ایک طرف اگر اس کی تخلیق میں اس کے صحیح خد و خال اُبھرتے ہیں تو دوسری طرف اُس میں اُس کے دھڑکتے ہوئے دل اور مچلتے ہوئے جذبات بھی صاف طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ جس کے سہارے ادب پارے کا پڑھنے والا فن کار کا ایک ذہنی پیکر تخلیق کر لینے کے ساتھ ساتھ اُس کے فضل و کمال کا صحیح مقام متعین کر لیتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ راہِ تنقید میں ناقدین از غلطِ خود گم کردہ ہو کر بھٹک جایا کرتے ہیں جس کی بنا پر بسا اوقات فن کار کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من   ۔   وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

مگر جب تنقید نگار غلو و تعصب سے بلند ہو کر اپنے دائرۂ فکر کو اس فضائے تخئیل تک محدود رکھتا ہے، جس میں فن کار کی پروازِ تخئیل کو پر و بال نصیب ہوئے ہیں، تو پھر اسرارِ درون کا پا لینا مشکل نہیں رہ جاتا بلکہ آسان ہو جاتا ہے۔

اُردو تنقید کی ہمیشہ سے ایک بڑی ستم ظریفی یہ بھی رہی ہے جیسا کہ مدیر "شاعر" اعجاز صدیقی نے سکندر علی وجد کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "یہ جنھیں اُچھالے گی اُنھیں اُچھالے ہی چلی جائے گی اور جنھیں نظر انداز کرنا شروع کرے گی ان تک مشکل سے نظر پہنچے گی، چاہے ان کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو" فضلی کے ساتھ بھی اب تک کم و بیش یہی ہوتا رہا ہے۔ اُردو کے موقر جرائد میں ان کی غزلیں یا نظمیں بمشکل کہیں نظر آتی ہیں۔ تنقیدی کتابوں میں ان کا تذکرہ تو شاید گناہ تصور کر لیا گیا ہے۔ وفا راشدی کی کتاب "بنگال کے اردو شعرا" میں ان کے بارے میں بس اس سے زیادہ نہیں کہ فضلِ احمد کریم فضلی الٰہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی تعلیم بی اے تک ہے۔ بی۔ آئی۔ سی ایس ہونے کے بعد سے بسلسلۂ ملازمت بنگال میں رہے اور تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور اب تک وہیں مقیم ہیں۔ اُن کے کلام پر نہ تنقید کی گئی ہے اور نہ اُن کا جائزہ ہی لیا گیا ہے "چشمِ غزال" کے دیباچے میں اس بے اعتنائی کے باعث وہ خود بھی رقم طراز ہیں "باوجودیکہ اپنے شعر کی وہ قیمت جو میری نظر میں تھی اب تک نہیں ملی (اور کسے ملتی ہے)" مگر چونکہ قارئین کرام کے حُسنِ ذوق پر اسے پورا اعتماد ہے اور اپنے کلام کے جاندار ہونے پر ایمان اس لئے غیر مطمئن اور مایوس نہیں ؎

مل ہی جائے گی یہیں اے فضلی   ۔   شعر کی اصل جو قیمت ہوگی۔

فضلی کا نام میں نے پہلی بار فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے سُنا تھا، دوسری بار مکالمہ نگار کے رُوپ میں دیکھا اور تیسری بار "چشمِ غزال" کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں نے فضلی کو نہ کبھو دیکھا اور نہ پرکھنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ زندگی" بھی اب تک نہیں پڑھ سکا ہوں۔ اِس لئے اُن کے کلام کے ارتقا کا اندازہ کرنے کے لئے اپنی ژرف بینی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ البتہ "چشمِ غزال" کی اندرونی شہادت سے فضلی کی انفرادیت، شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش میں نے ضرور کی ہے۔ بقول T.S. Eliot معیارِ تنقید یہی ہے۔

"ختم غزل" کے مطالعہ کے بعد آصف گوبندر دی کے نظریہ کے تحت میرے ذہن نے بھی فضلی کے بارے میں یہی رائے قائم کی کہ وہ بھی اپنے اشعار میں کچھ کچھ نمایاں ہوں گے۔ دیباچہ میں اُنھوں نے ایک ہلکا سا اشارہ اِس طرف بھی کیا ہے کہ "میری غزلیں ایک مجموعی تاثر کی حامل ہیں..... اگر اسے کوئی ایک نشست میں پڑھے تو پورے کلام کا ایک مجموعی تاثر لے کے اُٹھے گا۔

خیام کے متعلق جو نظریہ دنیا والوں نے قائم کر لیا ہے کہ خیام ایک بڑے حکیم اور ایک بڑے منجم بھی مگر جس چیز نے اُنھیں شہرت دوام بخشی ہے وہ اُن کی رباعیات ہیں۔ بعینہٖ فضلی کے بارے میں میرا عقیدہ ہے کہ فضلی خواہ کتنے ہی بڑے پروڈیوسر اور مکالمہ نگار ہو مگر جو شے اُنھیں حیاتِ جاوید بخشنے والی ہے، وہ اُن کی شاعری ہے، جس کا موضوع بھی محبت ہے۔ ؎

فضلی ترے اشعار میں یہ دل کی حکایت　　　یہ ہے وہ کہانی جو پُرانی نہیں ہوتی

دل کی حکایت ایسی حکایت ہے جو کبھی قدیم نہیں ہوتی بلکہ اُس کے برعکس جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی اپنے اندر پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ قدیم اور جدید تقاضوں سے یہی جذبۂ وابستگی واحترام فن کار کو ضیائے بزمِ جہاں کے باربار ماند ہونے کے باوجود حدیثِ شعلہ رُخاں پر رہ کر مجبور کرتا ہے۔ فضلی نئے ماحول میں پُرانے الفاظ و تشبیہات سے کام لے کر نئے جذبات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے ہیں اِس لئے جدید ہیں۔ حسن ان کے لئے عنوانِ حیات اور عشق کعبۂ دل بن گئے ہیں ؎

نورِ نظر مرا، مری نظروں سے چھپ گیا　　　لختِ جگر تھا داغِ جگر ہو کے رہ گیا

غرض حسن و عشق کے گرد اُن کی ذات اور شخصیت اُبھرتی ہے اور اُن کی شاعری کو محبوب سے محبوب تر بناتی چلی گئی ہے۔ وہ حاصلِ عمر کو راہِ محبوب میں نثار کر کے اپنی زندگی سے خوش نہیں ہونا چاہتے بلکہ اُس کے حضور میں سراپا بندگی کا پیکر ہو جانا اپنا جزوِ ایمان بنا لینا چاہتے ہیں اِس لئے کہ "خود اُن کے دل میں اُٹھ کے صنم خانے آ گئے" ہیں اور اُن کے دلِ مغموم کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ زندگانی کے اندھیرے میں اُجالا بس اُن کی محبوب ہے ؎

اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا ثبوتِ بندگی　　　میرے سارے جسم و جاں میں کارفرما آپ ہیں

چنانچہ اِسی خود سپردگی کی کارفرمائی ہے کہ ضبطِ غم میں اُنھیں جو مزہ ملتا ہے وہ آہ و فریاد میں نہیں، اِس لئے نااُمیدی کے عالم میں بھی وہ پُراُمید ہیں ؎

لذّتیں ضبطِ غم کی کیا کہیے　　　بھول جاتا ہوں لذّتِ فریاد
نااُمیدی پہ بھی اُمید یں ہیں　　　شکر صد شکر دل اُداس نہیں

اگر غم کا اظہار وہ کبھی کرتے بھی ہیں تو اِس میں ضبط و تحمّل کے ساتھ وقار و تجمّل بھی ہوتا ہے اور شوخی و مسکراہٹ کے ساتھ محبوب کا بے بسی کی ہلکی سی چاشنی بھی ؎

ہم خفا بھی تو نہیں ہو سکتے　　　ایسی مجبوری کو کیا کہتے ہیں
بے بسی اپنی کھلتی جاتی ہے　　　بے سبب ہی یہ ساختات نہیں

اُن کے احساسات و جذبات برسوں اِس قسم کے ماحول میں پرورش پانے کے بعد شعر و سخن کے سانچے میں ڈھلتے رہے ہیں ؎

جذبات جو اشعار کے سانچے میں ڈھلے ہیں　　　برسوں مری آغوشِ تخیّل میں پلے ہیں

اُنھوں نے ٹھیک کہا ہے کہ "غمِ دنیا ایک مدّت کے بعد غمِ جاناں بنتا ہے اور جب تک غمِ جاناں کی فراوانی نہیں ہوتی اُس وقت تک ؎

کشمکشِ اضطراب یہ ہے دل میں خلش　　　کوئی شاید ہوئے نوا ہی ہے غزل

والی بات نہیں پیدا ہوتی"۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے اشعار محض بے جان الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتے بلکہ خود شاعر کا دھڑکتا ہوا دل ہیں ؎

مرے کاغذ میں آتی ہے صدا تم بھی ذرا سُننا　　　مرے اشعار کے سینے میں دل میرا دھڑکتا ہے

جس میں ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، کے برعکس بس ایک ہی تمنّا اور ایک ہی آرزو ملتی ہے ؎

ہو تمنّا اور کیا جانِ تمنّا آپ ہیں — کیا کروں لگا کے دنیا میری دنیا آپ ہیں

اُن کی یہ وحدتِ تمنّا اُن کی شاعری کی جان ہے۔ وحدتِ تمنّا کا یہ احساس خواہ فریبِ نظر کا محض ایک دھوکا ہو یا سادگیٔ دل کی فقط ایک سادگی۔ مگر نہ تو وحدتِ تمنّا میں کبھی کوئی فرق پیدا ہوتا ہے اور نہ سادگیٔ دل میں کوئی تغیّر رونما ہوتا ہے۔ بلکہ وحدتِ تمنّا سے وابستگی کے باعث ہی دل کی وارفتگی بڑھتی جاتی ہے ؎

یہ کیسے مانوں کہ تو نہ کھائے گا اب کوئی پھر فریب اے دل — وہی مری سادگی ہے اب بھی جو تھی فریبِ نظر سے پہلے

اب تو پہروں شغل یہی ہے — اپنے آپ سے باتیں کرنا

تری یاد دل میں چھپائے رہے — یہاں تک کہ وارفتگی بن گئی

توجہ بظاہر گھٹی اس قدر — کہ در پردہ وابستگی بن گئی

وحدتِ تمنّا سے وارفتگی کی حدّت تک وابستگی کا یہ اثر ہے جس نے دل میں سوز و گداز پیدا کر کے نہ صرف زندگی کو زندگی بلکہ موت کو بھی حیات بنا دیا ہے ؎

ترے ہی لیے تھی، تری بن گئی — غرض زندگی کام کی بن گئی

شبِ فراق ہم نے دیکھے عشق کے یہ معجزے — ہزار بار موت آئی اور حیات بن گئی

غرض یہ عشق کا معجزہ تھا جس کے ذریعے دل میں حسین و لطیف احساسات و جذبات کے سوتے پھوٹ پڑے اور سبک اور سادہ الفاظ میں پانی کی طرح بہہ نکلے ؎

وہ روانی ہے تیرے شعروں میں — جیسے بہتا ہوا پانی فضلی

ان کا اشارہ اور دل کا تقاضا ہی تو تھا جس نے ان سے شعر کہلوائے۔ اُن کے نزدیک شاعری محض شاعری نہیں بلکہ ایک طرح کا الہام ہے ؎

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام — شعر بھی اک طرح کا ہے الہام

خلاصہ یہ کہ جمیل و لطیف احساسات، مچلتے اور مچلتے ہوئے جذبات، سبک و سادہ الفاظ اور رواں دواں مختصر بحروں نے ایک طرف ان کے ندرتِ بیان اور حسنِ اسلوب کو رنگ و آہنگ اور سلاست و حلاوت بخشا تو دوسری طرف اُن کے مشاہدات و تجربات اور انفرادیت و شخصیت نے اُن کی شاعری کو گیرائی اور گہرائی، تاثیر و ہم آہنگی عطا کی۔ جو "چشمِ غزال" کی طرح حسین بھی ہے اور شوخ بھی، معصوم بھی ہے اور مغموم بھی۔ جس میں گدازِ میرؔ، فکرِ غالبؔ اور جگرؔ کے بانکپن کے ہلکے عکس بھی جھلکتے ہیں اور اپنی شوخی و سادگی، ضبط و تحمّل اور وقار و تجمّل کے گہرے نقوش بھی۔ اسی لیے فضلی فضلی ہے، میرؔ و غالبؔ نہیں ؎

میرؔ و غالبؔ سے کیوں ملائیں مجھے — مجھ کو فضلی ہی رہنے دیں احباب

شبِ فراق ہو کہ وصالِ یار، محویتِ خیال ہو کہ بیداریٔ دل، گردشِ زمانہ ہو کہ خیالاتِ پریشاں، تمام احوال و کوائف میں اُن کے دستِ طلب اور پائے شوق نے خدا اور روح، کون و مکاں، کعبہ و بت خانہ، گلستاں و بیاباں، بہار و خزاں، گل و غنچہ، برق و آشیاں اور آزادی و قفس کی حقیقتیں واضح کر دی ہیں۔ ایک طرف اُن کے دل سے دوریٔ منزل اور عمرِ گریزاں کے احساس کو مٹا دیا ہے تو دوسری طرف محبوب کی ادائے دلبری اور خود اپنے کو نیاز عاشقانہ سے آشنا کر لیا ہے۔ ان کی باتیں اشعار بردوش ہوں یا نہ ہوں مگر کلام صاحبِ بردوش ضرور ہے اور سہلِ ممتنع بھی۔ بلکہ سہلِ ممتنع کہنے والوں میں فضلی کا مقام اوّل نہیں تو صفِ اوّل میں یقیناً ہوگا۔ اُن کے یہاں اُردو تنقید کی بے اعتنائی کے سبب خود ستائی اور تعلّی کے چند اشعار بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر نظموں کے مقابلے میں غزلیں اُن کی شاعری کی روح ہیں۔ یہی روح اُن کی نظم "نگہبانگِ اذاں" میں بھی پائی جاتی ہے۔ [illegible] اُن کے مجموعہ میں سب سے اچھی نظم [illegible]

اُن کی غزلوں سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جسے اُن کا معیارِ تغزل قرار دیا جا سکتا ہے۔

بات دل کی نہ کبھی ختم ہوئی　　بات میں بات نکلتی آئی
اُس نے اتنا دیا ہے بن مانگے　　شرم آتی ہے اب دعا کرتے
ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا　　اور عرض مدعا ہی رہ گیا
ایسی بھی قیامت کی تجلی نہیں ہوتی　　میں دیکھتا رہتا ہوں تسلی نہیں ہوتی
اُن کی محفل میں بہرحال مجھے جانا ہے　　دل کی خواہش ہی سہی اُن کا تقاضا نہ سہی
دلِ ناداں ہی پہ الزام تھا میری اسیری کا　　مگر اُن کی نگاہوں کی بھی کچھ سازش نکل آئی
مجھے ہر ہر قدم پر وہ سہارا دیتے جاتے ہیں　　بڑے ہی کام کی یہ پاؤں کی لغزش نکل آئی
کس نے بانٹا کس کا غم　　کہنے کو ہیں سب ہمدم
دل بھی سمجھا کچھ کا کچھ　　اُن کے اشارے تھے مبہم
نہ کوئی احتیاط ہے نہ کوئی اہتمام ہے　　نظر نظر کلام ہے نفس نفس پیام ہے
بس ایک تیری یاد ہے بس ایک تیرا نام ہے　　نہ اور کوئی ذکر ہے نہ اور کوئی کام ہے
بغیر تیرے صبح کیا، بغیر تیرے شام کیا　　نہ صبح میری صبح ہے نہ شام میری شام ہے
تمام برہمی سی ہے تمام کچھ کمی سی ہے　　ترے بغیر زندگی ہی جیسے ناتمام ہے
ہم یہ خود سوچتے ہیں بزم میں اُن کی جاکر　　آ گئے کیسے یہاں کوئی ارادہ تو نہ تھا
اُس نے پلٹ کر جب مجھے دیکھا　　رُک گئی جیسے عمرِ گریزاں
جھوٹے وعدوں سے دیا دل کو سہارا تم نے　　خیر اتنا تو کیا پاس ہمارا تم نے
غم نہیں یہ کہ مجھے غیر بُرا کہتا تھا　　غم تو یہ ہے کہ کیا کیسے گوارا تم نے
اُن کو پاتے ہی بس ہیں ہم تھے　　ہائے وہ لذتِ خود آگاہی
نقاب اُس نے رخ سے اُٹھائی تو لیکن　　حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں
فریبِ کرم اک تو اُن کا ہے اس پر　　ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں
گر تمنا نہیں تو حسرت ہے　　کب ہوا کاروبارِ شوق تمام
بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں　　ہماری تنگ دامانی کے دن ہیں
اُمنگوں پر اُمنگیں اٹھ رہی ہیں　　تمنا کی فراوانی کے دن ہیں
یہی دن ماحصل ہیں زندگی کے　　یہی جو دل کی نادانی کے دن ہیں
تو کہے جائے میں کچھ جاؤں　　مجھ سے کچھ اور التماس نہیں
اک ذرا ہی نیند آئی تھی کہ پھر جگا دیا　　تنگ ہم تو آ گئے اپنے دلِ بیدار سے
ہونٹوں پہ اُن کے آج ہنسی آ کے رہ گئی　　باتوں کا میری اُن پہ اثر ہو کے رہ گیا

غرض فضیل احمد کریم فضلی اردو کی نہایت سادہ مگر پُر وقار شاعری کے لئے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

مفتون کوٹوی

کرشن موہن کی جمالیاتی جدو کد

کرشن موہن شباب حسن اور حسنِ شباب دونوں کے بڑے رسیا ہیں۔ اُن کی فطرت میں شگفتگی و تازگی، شوخی و بشاشت ہے، اور تصور میں طہارت و پاکیزگی، نفاست و لطافت۔ لگا ہے حسن ہی کہتے ہیں، اور رید جمال میں، حسن کی مختلف اداؤں اور حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ — کرشن موہن ایک رمتا جوگی بھی ہے اور البیلا شاعر بھی۔ وہ کبھی جوگی کے روپ میں مناظرِ کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے اور کبھی موجودہ سماج کے ایک شوقین مزاج اور متمدن فرد کی حیثیت سے جدید تہذیب کی تماشا گاہوں میں گھومتا پھرتا ہے —— اُن کے گھومنے پھرنے کا تجزیہ اس انداز پر کیا جا سکتا ہے ؎

شاعر بھونرا
قدم قدم پہ کلی کلی سے
رُوپ کچھ مسکائے رس چُوسے، اُڑ جائے

(ہرجائی :- شبنم شبنم صفحہ ۸۹)

اِس گھومنے پھرنے میں دِن کی دھوپ بھی انھیں مانع نہیں آتی۔ وہ اِسے چاندنی سمجھتے ہیں اور کیفِ آوارگی حاصل کرتے ہیں ؎

دھوپ دن کی گراں نہیں ہو گی مانعِ عاشقاں نہیں ہو گی
دھوپ کو چاندنی سمجھتا ہوں کیفِ آوارگی کا شیدا ہوں
سادہ ہر اک حسیں کو دیتا ہوں لطف آوارگی کا لیتا ہوں (آوارگی — شبنم شبنم ۱۲۳)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :-

میرا دل تو ہے مری نازوں پلی آوارگی
میری رعنا شاعری
میرا جامِ انگبینِ سرمدی
(دور پیالہ عکسِ رخ) (.... تو یہ احساس ہوتا۔) شبنم شبنم ۱۰۷

اپنی نظم جیہوا (دلِ ناداں) میں اپنی شاعری کی ترجمانی دوسروں کی زبانی وہ اس طرح کرتے ہیں :-

پڑھنا پڑتا ہے جو بن، اُس کی ہر اک نظم میں، رنگیں خیالوں کا
کلام اُس کا تو گویا آئینہ ہے مہ رخوں کے سُرخ گالوں کا

مہ عریاں آستینوں، کشادہ سینوں، درخشاں رخساروں، رنگین وحسین اشاروں، نرم وحسین بازوؤں، کجے ابروؤں اور کوتاہ گیسوؤں سے بہت جلد اور بے حد متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہر طرف ہیں پرے حسینوں کے کیا ہیں انداز مہ جبینوں کے

لطفِ قامت، تناسبِ اعضا — یہ نزاکت، یہ بانکپن، یہ ادا
دیکھ کر نازکی فراوانی — شوخیٔ و دلبری کی طغیانی
ناصحوں کا بھی دل مچل جائے — مومنِ زہدِ خشک جل جائے
یہ سماں ہو کناٹ سرکس میں — تو بھلا کیسے دل رہے بس میں
جلوہ ساماں برہنہ بازو ہیں — حسرتوں کے لئے ترازو ہیں
نرم و رخشندہ بازوؤں کی قسم — وجد میں دل ہے آج کرب و الم
پاسباں ہیں دلی سفینوں کے — یہ سمندر کشادہ سینوں کے
کیفیت چشم ہائے میگوں کی — انتہا ہے طلسم و افسوں کی
یہ کٹے ابروؤں کا تیکھا پن — اور کوتاہ گیسوؤں کی پھبن
پیرہن سے جھلک رہا ہے بدن — رنگ رنگ، انگ انگ من موہن (آوارگی "شبنم شبنم")

کناٹ سرکس کے بعد "ریگل" کے طلسم آگیں مناظر سے اختلاط حاصل کیجئے :-

وہ ریگل کے طلسم آگیں مناظر
دہکتے گال شب افروز آنکھیں
لبوں کی جنبشِ رنگین و شیریں
تبسم، قہقہے، غمزے، اشارے
حسین نوخیز سینوں کا تلاطم
درخشاں، مرمریں، دلدوز بانہیں
سجیلے شاہدوں کا حسنِ عریاں
تمناؤں کی سرمستی کا عالم —— (ارے حسرتِ دل —— دلِ ناداں ۴۸)

ریستوران انہیں اہلِ طرب کی بستی نظر آتے ہیں، وہاں محفلِ حسن و عاشقی بھی ہوتی ہے۔ وہاں طلسم آگیں کشادہ سینے، حسین جبینوں کے آبگینے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی نظم "ریستوران" میں حسن و جمال کی ان جلوہ سامانیوں کا نقشہ بڑی شوخیوں اور رنگینیوں کے ساتھ کھینچا ہے۔ اس نظم کے آخری مصرعے یہ ہیں :-

نگاہیں تیز تر دشنہ و دشنہ
دل و جگر بھی ہیں تشنہ تشنہ
لباسِ ابریشمیں کی رنگیں برہنگی میں
نشاط آمیز ریستوراں میں زندگی رقص کر رہی ہے (ریستوران —— تماشائی ۱۰۲)

ایک مخصوص ریستوران میں "زمستان کی ایک شام" انہوں نے گزاری تھی، سنئے :-

زمستاں کی وہ شام رنگیں ہمارے ذہن میں رقص فرما رہی ہے
جو "گیلارڈ" میں تیرے لطفِ فراواں کی مرہونِ احساں ہوئی تھی
نگاہوں میں وہ ریستوراں کی سجیلی فضا گھومتی ہے
محبت کی ترسی ہوئی آرزو جھومتی ہے

...... مجھے کم سے کم ایک لمحے کو محسوس ہونے لگا تھا
حیاتِ بشر گفتگوئے حسیں کے سوا کچھ نہیں ہے

...... آپ نے ملاحظہ کیا ؎
گردشِ مومن کناٹ سرکس میں گھومنے میں بھی اک نشّہ ہے"

پھر "دِلّی" کا منظر آپ کو دکھایا۔ "گیلارڈ" کی حسن افروزیوں سے لطف اندوز کیا۔ لیکن یہ پھر بھی حد بندیاں ہیں اور پیا کے دل و دماغ کو لپکا ہے کوچہ گردی کا۔ چنانچہ شامِ دلی (تماشائی ۳۷) "جن پتھ کی رونق میں" — دیکھئے۔ جس پہ شامِ اودھ اور صبحِ بنارس بھی قرباں ہے،

یہ ہے وہ جلوۂ مستی جس میں
کاروانِ کیف و لطافت کے رواں رہتے ہیں
اہلِ دلی پور سفر اندازِ ادا سہتے ہیں

"سرما ہے" ایک نظم ہے اس میں اُن کی دیدہ وری اور حسن بینی مکمل نمایاں ہے۔

شربتی ہونٹ ہلے اور شرابی آنکھیں
مجھ سے کچھ کہنے لگیں
نیم خوابیدہ سے بے بس ارماں
کروٹیں لینے لگے
....
پلکوں کے سائے تلے
ایک پیمانِ وفا باندھا گیا،

اِسی موقع پر "کشیرن" کی عشوہ طرازیوں سے لطف اندوزی حاصل کیجئے ؎

طرفہ نازِ دوشیزۂ پُرفن
سوز و مستی میں غرق میرا من
جس پہ چھایا ہے منچلا جوبن
ساحرانہ ہوش، دلفریبی تن
روز و شب میکدوں میں رہتی ہے
ایک عشوہ طراز کشیرن

وہ حسنِ ظاہر پر ایسے شیفتہ ہیں کہ حُسنِ باطنی کی جھلک اور پاکدامنی کی چمک کو خاطر میں نہیں لاتے ؎

تری نگاہ میں ہے حُسنِ باطنی کی جھلک — [illegible]
مگر ہوں شیفتہ میں تو جمالِ ظاہر کا — فریفتہ ہوں کسی کی ادائے کافر کا
مری لطیف محبّت کی تو کفیل نہیں — خدا گواہ یہی ہے کہ تو جمیلہ نہیں

(حُسنِ ظاہر۔ دل نادان ۴۵)

وہ واضح طور پر اپنا نصب العین ہم پر ظاہر کرتے ہیں ؎
بدن کی آنچ اور بانہوں کے شعلے

(سائے)

[illegible] شام کے لوحِ گگن پر بنائے
[illegible] اپسرا کی پلکیں ہیں
[illegible] گالوں پہ آنسوؤں کی حسیں لکیریں
[illegible] ہے
[illegible] چھائے ہیں بادلوں کے

(ڈانس)

چاند جسم :—
[illegible] میں پنہاں نیم درخشاں ہے چاند
کتنا شوخ بدن
جھانکتا ہے ترے پیراہن سے

چاند اور روح :—
پیرہن گو ڈھکا ہے تیرا وجود
تیرے اعضا میں جھلکتی ہے تری روح کی رخشندہ نمود
جس طرح تاروں میں رخشاں ہو چاند

شباب و حسن کی رنگیں تصویریں اِن مصرعوں میں دیکھئے :-

محرمِ رازِ حیات، پیکرِ رقص و غنا
اے شبیہِ دلکشِ خونِ رواں
اے شرابِ ارغواں
اے نموئے شاخِ گل، اے تبسم،
اے سرودِ نکہتِ کون و مکاں، اے مرے حسنِ بیاں — مرمریں قصر کے تابندہ طرب خیز ستوں! محرمِ رازِ سکوں، خالقِ احساسِ جنوں!
ایک تعبیرِ طلسم و افسوں، یہ چمکتی ہوئی بانہوں کا رسیلا جوبن، یہ لچکتی ہوئی شاخوں کی دل آویز پھبن۔ یہ ترنم، یہ بہتی ہوئی ندی کا سہاگ
گاہ ہے ہیں ترے سینے کے کنول عیش کا راگ — یہ مچلتے ہوئے جذبات کی آگ۔ لطفِ قامت، تناسبِ اعضا۔ یہ نزاکت یہ بانکپن یہ ادا

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے صرف آزاد و معرا نظمیں اس مضمون کی ترتیب میں مدِ نظر رہی ہیں لیکن یہاں دو رباعیاں مزید درج کروں گا جن سے اس موضوع کی اور وضاحت ہو جائے گی۔

چہرہ دیکھیں تو چند کرنیں ٹھہریں — آنکھیں ہیں کہ روشنی کی چنچل نہریں
بانہیں ہیں کہ شوخ مچھلیاں لہرائیں — سینہ ہے کہ مارتا ہے ساگر لہریں

چہرہ ہے کہ چلتے ہوئے راہی ٹھہریں — باتیں کہ رواں شعر و غزل کی نہریں
انداز کہ افکار کی رعنا پرواز — رفتار کہ سنگیت کی نازک لہریں

[illegible] بیک وقت انگریزی شاعری کے فطری انداز و اسلوب اور ہندی شاعری کے رسیلے پن سے متاثر ہیں [illegible]
ہندی شاعری کا جمالیاتی شعور ملتا ہے وہیں وہ بسا اوقات اس موضوع کو بھی اپنے دور کے تقاضوں اور جذبات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

۱۹۶۶ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے اُردو ادب میں ایم اے کیا۔

س :۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟

ج :۔ میری شعر گوئی کا سلسلہ میٹرک ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں کہ پہلا شعر کب اور کیوں کہا۔ لیکن باضابطہ نظم گوئی میں نے انٹر کے زمانے سے شروع کی۔ میری ابتدائی نظمیں اورنگ آباد کالج کے میگزین 'نورس' اور بعد میں 'مجلۂ عثمانیہ' میں شائع ہوئیں نثر لکھنا البتہ میں نے بڑی دیر سے شروع کیا۔ یوں سمجھ لیجئے ایم اے کرنے کے بعد۔

س :۔ آپ پہلے شاعر ہیں یا ادیب؟

ج :۔ میں نے کہا نا کہ شعر کہنا میں نے پہلے شروع کیا لیکن میں اپنے آپ کو باضابطہ شاعر نہیں کہتا۔ سال میں ایک دو نظمیں کہہ لینا شاعر کہلانے کی رُسوائی کے لئے تو کافی ہے لیکن شاعر ہونے کے لئے کافی نہیں۔ میرا نثری سرمایہ مقدار میں یقیناً زیادہ ہے (پھر مُسکرا کر کہنے لگے) لیکن اس سے کیا ہوتا ہے میری نظم و نثر دونوں یونہی سی ہیں۔

میں نے پھر سوال کیا: کیا آپ نے غزل بھی کہی ہے؟

ج :۔ غزل شاید میں نے کبھی کہی ہی نہیں۔ اسکول کے زمانے کی شاعری کو تو میں خیر شاعری نہیں سمجھتا، اُسے رَف ورک سمجھ لیجئے۔

س :۔ شروع میں آپ کن کن شاعروں سے متاثر رہے؟

ج :۔ مجھے انیس اور اقبال ہمیشہ پسند رہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں نظم گوئی کی طرف راغب ہوا۔

س :۔ آپ نے سب سے پہلا جو مزاحیہ مضمون لکھا تھا کیا وہ کسی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔؟

ج :۔ مزاحیہ مضمون میں نے کبھی فرمائش پر نہیں لکھا۔ اور ہم ایسے خوش قسمت کہاں کے تھے جو ہم سے کوئی فرمائش کرتا؟

س :۔ خوب یاد آیا اہم سوال تو میں بھول ہی گیا۔ یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ کا پورا نام کیا ہے اور تخلص کیا؟

ج :۔ یہ سوال آپ نے خوب کیا۔ میں خود بھی اپنا پورا نام بھولتا جا رہا ہوں (مزاحیہ انداز میں کہنے لگے) میرا اصلی نام سید محمد یوسف ہے۔ ناظم تو میں نے بعد میں لگا لیا بطور تخلص اور اب شارٹ ہینڈ میں یوسف ناظم کہلاتا ہوں۔ غزل چونکہ کہتا نہیں اس لئے ناظم بس یونہی ڈیکوریشن کی چیز بنا ہوا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے یوسف ناظم نام شاندار ہے۔

میں بھی برجستہ کہہ اُٹھا نام تو واقعی شاندار ہے اور پھر میں نے انٹرویو کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ نئی نسل کے شعراء میں کس کس کو پسند کرتے ہیں ذرا ان کے نام تو بتا دیجئے؟

ج :۔ جدید شاعری میں اب تو جدید ترین شاعری بھی داخل ہوگئی ہے۔ بغیر فارم کی شاعری ایسی ہی ہے جیسے ٹوٹی ہوئی جلد کی کتاب۔ لیکن اس بحث میں مجھے نہ گھسیٹئے۔ یہ نئی نسل کی شاعری کیا بات ہوئی؟ بہرحال جن شاعروں کی طرف آپ کا اشارہ ہے اُن کی تعداد ابھی متعین نہیں ہوئی۔ جدید شاعری سے متعلق جتنے مضامین آج کل چھپتے ہیں اُن میں نئے شاعروں کی فہرست بھی ہوتی ہے اور ہر مضمون نگار اپنی پسند کے مطابق اُن کے نام گنواتا ہے۔ مجھ سے یہ نام نہ گنوائیے۔

س :۔ آپ مزاحیہ مضمون کیوں اور کیسے لکھتے ہیں؟

ج :۔ میں مزاحیہ مضامین کیوں لکھتا ہوں! یہ صرف سوال ہے نا، اعتراض تو نہیں۔؟

میں نے ہنستے ہوئے کہا بھلا مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا، یہ تو صرف سوال ہی ہے۔ یوسف ناظم مُسکرائے اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگے۔ مجھے مزاحیہ مضمون لکھنے میں لطف آتا ہے۔ مزاحیہ مضمون کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ لکھنے والا سوائے اپنی ذات کے ہر شخص کو بُرا بھلا کہہ سکتا ہے۔ رہا میں کیونکر لکھتا ہوں۔ تو اس کے لئے میں زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ کسی انٹرویو میں میں نے پڑھا تھا کہ وہ صاحب ایک خاص پنیترے سے بیٹھ کر مضمون لکھتے ہیں تکیہ کو دُہرا کرکے پیٹھ کے پیچھے رکھتے ہیں، تب کہیں جا کر اُن کا قلم چلتا ہے۔ اچانک کوئی موضوع میرے ذہن میں آجاتا ہے اور کوئی مناسب موقع تلاش کرکے میں مضمون لکھ ڈالتا ہوں [illegible]

مضمون کو مکمل کرنا یا کسی مضمون پر نظرِ ثانی کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

س :۔ ابتدا میں کیا آپ نے افسانہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی تھی ؟

ج :۔ افسانہ نگاری کی طرف میں نے مزید توجہ کی تھی لیکن دال کچھ گلی نہیں۔ لوگ البتّہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے ڈرامہ نگاری میں دخل دینا چاہئے آپ کی کیا رائے ہے ؟

اُن کے اِس سوال پر میں نے بھی بے تکلفی سے کہہ دیا کہ اگر ڈرامہ نگاری میں دال گلنے کی توقع ہو تو ضرور دخل دیجئے۔ ویسے بھی آپ کے لئے یہ کوئی مشکل کام تو نہیں اور پھر انہیں کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر میں نے سوال کیا۔

س :۔ مزاح نگاری میں آپ سب سے پہلے کن کن ادیبوں سے متاثر ہوئے ؟

ج :۔ مزاح نگاروں میں مجھے پطرس، رشید احمد صدّیقی، فرحت اللہ بیگ اور شاعروں میں اکبر الٰہ آبادی نے بے حد متاثر کیا۔ ظرافت میں اِن سب کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے یہاں قدم بہ قدم کی ظرافت نہیں ملتی لیکن اُن کی ظرافت میں برق کی چشمک زنی ہے۔ پطرس اور رشید احمد صدّیقی ذہانت اور بذلہ سنجی کی دولت سے مالا مال ہیں تو فرحت اللہ بیگ قلم کے دھنی ہیں۔ ان کی جیسی رواں تحریر اور کون لکھے گا۔ پتہ نہیں آپ نے مشتاق احمد یوسفی کا نام سنا ہے کہ نہیں۔ اِن کا قلم بھی بڑا جاندار ہے نئے لکھنے والوں میں مجھے یہی پسند ہیں۔ پھر یہ یوسفی بھی تو ہیں۔

س :۔ سُنا ہے کہ آپ نے اپنے مضمون "مرزا غالب کی صحتِ جسمانی" میں مرزا کی صحت کا جو جائزہ لیا ہے اُس سے خوش ہو کر جنّت سے مرزا غالب نے آپ کے نام ایک خط لکھ کر پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ آپ تک پہنچا دیں۔ کیا یہ اطلاع درست ہے ؟

ج :۔ پروفیسر فرقت کاکوروی سے میرا اب تک ملنا نہیں تھا، اُن سے پچھلے مہینہ بمبئی میں ملاقات ہوئی، اُنھوں نے کسی خط کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا یہ اطلاع غلط ہے۔

س :۔ انسان شاعر یا ادیب کب بنتا ہے ؟

ج :۔ انسان شاعر اُسی وقت بنتا ہے جب اُس پر کوئی افتاد پڑتی ہے۔ اس بات کا تصفیہ اب تک نہیں ہو سکا کہ شاعری بے کاری کا نتیجہ ہوتی ہے یا بے کاری شاعری کی پیداوار ہے۔ ادیب بننے میں البتّہ کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ آدمی ۲۴ گھنٹے ادیب نہیں رہ سکتا، شاعری میں لیکن یہ خطرہ ہے کہ آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو غیر شاعر نہیں سمجھتا۔

س :۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ادیب کسی نہ کسی ازم کا پرستار بھی ہو؟

ج :۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور یہ مسئلہ سنجیدگی سے طے پانا چاہئے۔ ادب اور شعر کا مقصد انسان دوستی اور معاشرہ کی تہذیب ہے۔ اور یہ کام بغیر کسی "ازم" کے بھی ہو سکتا ہے۔ ہر شاعر اور ہر ادیب کے سامنے کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے، بعض ادیب صرف جنس پر لکھتے ہیں، اُنہیں کسی اِزم کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر ادب اور عملی زندگی کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی 'ازم' کا پرستار صرف غزلیں ہی کہے، وہ بھی قدیم اسکول کی۔ اِس میں حرج کیا ہے۔ میرے خیال میں ادیب اور شاعر بننے کے لئے کسی 'ازم' کا پرستار ہونا ضروری نہیں ہے۔

س :۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا اُردو ادب واقعی جمود کا شکار رہا ہے ؟

ج :۔ ادب جیسا ہے اور جیسا ہو گا متحمل بھی نہیں ہوا کرتا۔ ادب کی ایک مقررہ رفتار ہے۔ ایک بڑا شاعر پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ڈھائی سو سال تک کسی شاعر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں جمود سے آپ کی کیا مُراد ہے۔ اگر ادب آگے نہیں بڑھ رہا ہے تو پیچھے ضرور ہٹ رہا ہے اور یہ جمود نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو بمقدارِ کثیر لکھنے یا شعر کہنے کی توفیق نہیں ہوتی اور اِس میں کوئی حرج نہیں۔ کسی چیز کی بہتات اُس چیز کی اچھائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ زیادہ مدّت میں ایک اچھی

غزل یا نظم کہنا یا ایک اچھا افسانہ لکھنا کم وقت میں کمتر درجے کے زیادہ لکھنے اور کہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

س :۔ آپ کے خیال میں کیا موجودہ مشاعرے اُردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مفید ہیں؟

ج :۔ مشاعرے ہمارے تہذیبی زندگی کا ایک حصہ ہیں اور اُن کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ صاف ستھرے مشاعرے اچھی تہذیب کا نشانی ہیں۔ اُردو کی ترویج و اشاعت میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ لیکن مشاعروں کی بہتات انارِ طرز کی طرح خطرناک بھی ہے!

س :۔ اب کچھ اُردو کے مستقبل کے بارے میں فرمایئے؟

ج :۔ اُردو کے مستقبل کو کیا ہوا؟ آپ نے دیکھا نہیں کہ اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد کم۔ لیکن اس کے ہمدردوں اور محسنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

س :۔ ناظم صاحب کیا آپ کا کوئی شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے؟

ج :۔ عروج صاحب میرا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا اور نہ اس کا امکان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تکمیلِ شوق کے لئے میں خود ہی ایسے چھپوا دوں اور دوستوں میں بلا قیمت بانٹ دوں۔ کوئی ناشر اُسے چھاپے گا نہیں اور اگر مروّتاً کوئی چھاپ بھی دے گا تو ردّی میں بیچے گا۔

س :۔ اب ذرا یہ بتا دیجئے کہ آپ بمبئی میں کیوں رہتے ہیں؟

ج :۔ یہ کیوں کی خوب رہی۔ ارے صاحب جی چاہتا ہے تو رہتے ہیں۔ ریسے میں بمبئی میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہوں۔ اور محنت مزدوری کے سلسلے کی باتوں کا فیصلہ کرتا ہوں۔ یعنی اسسٹینٹ لیبر کمشنر کی حیثیت سے سرکاری خدمات انجام دیتا ہوں۔ ریاست حیدرآباد کی تقسیم کے بعد میں بھی مہاراشٹر کے حصّے میں آیا اور اورنگ آباد اور جالنا گاؤں کے بعد اب بمبئی میں ہوں۔ ملازمت کرنے والوں کے پاؤں میں چکر ہوتا ہے (رُک کر) عروج صاحب آپ نے تو بہت کچھ پوچھ لیا۔

س :۔ کیوں آپ کچھ بور ہو رہے ہیں کیا؟

ج :۔ دراصل اتنا لمبا انٹرویو تو میں نے ملازمت کے سلسلے میں بھی نہیں دیا تھا۔

س :۔ معاف کیجیے گا۔ اچھا خدا حافظ!!

بقیہ "راز اور نوائے راز" صفحہ ۱۳

بلکہ اُن کے تراجم اور مضامین بھی آیا کرتے تھے۔ شعر و ادب کے اس ترک میں غالباً اُن کی دل شکستگی کو دخل ہے۔ لیکن ادھر انھوں نے ماہنامۂ "شاعر" میں جو "چند داستانیں" لکھی ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے اِس طرح کی اور داستانیں لکھوائی جائیں اور اُن کے نظم و نثر کے مجموعے مرتب کر کے شائع کئے جائیں۔ اُن کے کلام کا انتخاب اُردو شاعری کے لئے ایک ادبی تحفہ ہوگا اور ایک بزرگ شاعر کی خدمات کا اعتراف بھی۔
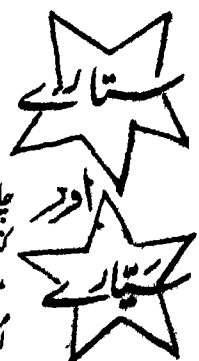
سلام مچھلی شہری

خراماں رہو میری گنگا کی لہرو ـــــ !

ـــــ بتاؤ مری پاک گنگا کی لہرو
کہ کچھ روز پہلے
کسی نے جو تازہ تریں پھول تم پر نچھاور کئے تھے
وہ کس حال میں ہیں ؟
مقدّس ہیں پھولوں کی نکہتیں ہند ساگر کے دامن میں تقسیم ہوں گی
مگر فکر یہ ہے
کہ ہندوستاں کے گلستاں کے نازک حسین اور شگفتہ تریں پھول
پامال کیوں ہیں ؟
بتاؤ مرے گاؤں کی کھیتیو !
جبکہ برسات بھی ہے
مری اپنی محبوب ساون کی یہ رس بھری رات بھی ہے
وہ خاکِ مقدّس
جو طیاروں سے، کچھ دنوں پہلے، تم پر نچھاور ہوئی تھی
کہاں کھو گئی ہے ـــــ ؟
میں محسوس کرتا ہوں گویا تمھاری نمو کی لطافت کہیں کھو گئی ہے؟!

بہر حال میں اس کا ادنیٰ تریں اک پجاری ہوں جو آج
ہم میں نہیں ہے ۔

وہ ہم میں نہیں ہے،
مگر اُس کے پیغام کی روشنی جگمگاتی ہے سینوں میں تو ہم نہیں ہے
اُسے ہم غریبوں سے سچّی محبت رہی ہے۔
ہمیں بھی عقیدت رہی ہے ـــــ رہے گی
مگر سوچتا ہوں
کہ اے میری گنگا کی پاکیزہ لہرو !
مرے گاؤں کی کھیتیو !
تم اُسی طرح کیوں ہو ـــــ ؟
تمھیں جانے والے نے تحفے دیے تھے
وہ تحفے کہاں ہیں،
وہ خاک
اور تازہ شگوفے کہاں ہیں ؟
تمھیں اُن کو پا کر نیا رُوپ لینا تھا
پر تم وہی ہو ـــــ !!؟
ـــــ خراماں رہو میری گنگا کی لہرو !
شگفتہ رہو اے مرے گاؤں کی کھیتیو !
تم مری زندگی ہو،
تم اہلِ وطن کے دلوں کے لئے
رحمتِ دائمی ہو ـــــ !!

تحریر: رونق دکنی سیمابی

فاصلے

رہِ شعور اندھیروں میں کھو گئی آخر
بجھے بجھے سے ہیں ہر موڑ پر چراغِ یقیں
فضائے صدق پہ باطل کے جھک گئے سائے
نوائے فکر خلاؤں میں سو گئی آخر

شعور و ذہن و نظر میں غبار آ ہی گیا
خبیث روحوں نے ہر چند قہقہے مارے
جو محوِ خواب تھے فتنے وہ پھر سے جاگ اٹھے
خلوصِ دیدہ و دل میں فتور آ ہی گیا

یہ تفرقات کے خالق، یہ قوم کے معمار
بساطِ امن پہ بیٹھے ہیں اپنے پھن کھولے
یہ ناگ روپ میں انساں کے آج ڈستے ہیں
انھیں کے دم سے ہے مسموم کوچہ و بازار

اٹھو جلائیں یقین و خلوص کی مشعل
محیط، جہل و تعصب کی ظلمتیں کب تک
دلِ غیور کو احساسِ کمتری کیوں ہو
نگاہ شدتِ احساس سے ہو کیوں بوجھل

نفاق و بغض میں پھر رنگِ دوستی بھر دیں
چھری سے سلسلۂ موج کٹ نہیں سکتا
وسیع تر ہوئے جاتے ہیں فاصلے دل کے
مسافتیں ہیں یہ بیجا نگاہ، اِن کو کم کر دیں

چلو یہ آہنی زنجیر کاٹ دیں مل کر
بڑھو! تمام خلیجوں کو پاٹ دیں مل کر

اسرار اکبر آبادی

میں پھر آواز دیتا ہوں

اکیلا ہوں، اکیلی ہے شبِ فرقت کی پرچھائیں
زمیں پر زندگی کا دیوتا بھی ہے تھکا ہارا
فضا تنہا سسکتی ہے، ہوا کی سانس مدھم ہے
فلک کے جال میں اُلجھا ہوا ہے آخری تارا

افق کے پاس ہی بکھرے ہوئے ہیں سرمئی سائے
پہاڑوں کی بلندی پر سحر ہونے ہی والی ہے
اُبھرتے آرہے ہیں نیند میں ڈوبے ہوئے منظر
میں جس وادی میں بیٹھا ہوں ابھی تک رات کالی ہے

تڑپتا ہوں تو لاکھوں ضبط پر الزام آتے ہیں
اگر خاموش رہتا ہوں تو دل کا زخم چھلتا ہے
نگاہیں اُڑ کے جاتی ہیں کسی سنسان رستے پر
مگر افسوس صد افسوس سناٹا ہی ملتا ہے

محبت پوچھتی ہے، وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟
ہمیں منزل کے رستوں پر سویرے ہی سے چلنا تھا
نئے نقشے بناتے، کچھ مٹاتے رات کی ملگجی
سحر ہونے سے پہلے ہی اگر ملتے تو اچھا تھا

ابھی کچھ رات باقی ہے پہاڑوں پر اندھیرا ہے
نظارے مانگتے ہیں تم ہی آن بھی جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو دن عرصۂ مقدم میں گذر جائے
میں پھر آواز دیتا ہوں چلے آؤ، چلے آؤ
اکیلا ہوں، اکیلی ہے شبِ فرقت کی پرچھائیں

بدیع الزماں خاور

پرواز

تیرِ صیّاد کا ہدف بن کر
جو فضا سے زمیں پہ آئے
توڑ دے دم کسی خرابے میں
اور کچھ روز بعد گل جائے
زندگی (میری چشمِ حیراں میں)
جیسے وہ سرگراں پرندہ ہے
جسم سے اس کے پر جدا ہو کر
اڑ رہے ہیں ہوا کے شانوں پہ
جن کی مجبور سرسراہٹ نے
آدمی کے جہانِ مُردہ میں
آج "پرواز" نام پایا ہے

ظفر احمد پرواز

کسبِ نور

شاعری کے حسیں تخیّل سے
ناولوں کے گداز مضموں تک
ہر کہانی کی ابتدا کے ساتھ
نغمہ گر کے لطیف نغموں تک

میرے دل کی صدا ہے ہر جانب
ہر طرف حُسن و قیس و محمل ہے
حُسن ہی سے ہے زندگی میں بہار
حُسن ہی کائنات کا دل ہے

جب کبھی مجھ کو خیال آتا ہے
عظمتِ حسن و قیس و محمل کا
تب مرے ذہن کے دھندلکوں میں
ایک تصویر سی اُبھرتی ہے
نور پا کر مرے تخیّل کا
خوب سے خوب تر نکھرتی ہے
اور میں اس حسیں تصوّر سے
زیست کا ساز جاں لیتا ہوں

چھوٹا کنبہ

خوشحال کنبہ ہوتا ہے
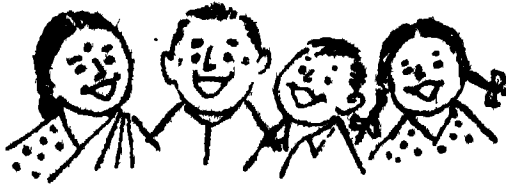
بچوں کو تعلیم ملنی چاہئے۔ اور اچھی خوراک بھی۔ اور اُن کے رہن سہن کے حالات بھی صحت مندانہ ہونا چاہئیں۔ لہٰذا سمجھدار والدین اِس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ اُن کے اُتنے ہی بچے ہوں جنکی وُہ دیکھ بھال اچھی طرح کر سکیں۔

برتھ کنٹرول کے کئی طریقے ہیں۔ اِن میں سے بالکل نیا طریقہ ہے — لوپ —

یہ سہل ہے اور برس بعد برس پوری طرح بچاؤ کرتا ہے۔ یہ مُفت مہیا کیا جاتا ہے۔

تربیت یافتہ ڈاکٹر سے **لوپ** کے بارے میں معلومات و مشورے حاصل کرنے کے لئے اپنے قریبی

فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر

میں تشریف لائیں

ضیا حسنی

زیبن

میں بیڈ ٹی پی رہا تھا اور وہ سامنے کچن میں بیٹھی ہوئی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ صالحہ نے مجھ سے کہا
"آج آپ کافی دیر تک سوتے رہے، جلدی سے نہا لیجئے، ناشتہ تیار ہے۔"
میں جیسے ہی باتھ روم میں داخل ہوا تو وہ لہک لہک کر گانے لگی۔

کبھی تو آئیں گے پیغام زندگی لے کر — جو دل کے ساتھ گئے ہیں قرار بھی لے کر
تمہارے غم میں جوانی اداس رہتی ہے — اب آ بھی جاؤ بہاروں کی تازگی لے کر

"زیبن! ذرا ہوش میں آ! میاں غسل خانے میں ہیں"۔ صالحہ نے کہا
"گاتے اور روتے ہوئے مجھے کوئی روک نہیں سکتا، دل دبانے کی مجھے عادت نہیں بی بی!"
"بڑی بے شرم ہے تو"

"بے شرمی کاہے کی۔ کل میاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کوئی پھڑکتا ہوا گیت سنا رہے تھے۔ آپ ان سے ملی بیٹھی تھیں، وہ آپ کو مدھ بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور آپ بھی انھیں جادو برساتی ہوئی نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھیں۔ من موہنے والی سندرتے اور آپ دونوں کے سنگم نے جیسے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا، اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے پہلو سے دل پھسلا جا رہا ہو۔ آج میں گا رہی ہوں تو نہ جانے کیوں آپ ایسا محسوس کر رہی ہیں جیسے میں ننگی ہوئی جا رہی ہوں"
"تو وہاں کیسے پہنچ گئی تھی زیبن"

"میں اتفاق سے آ گئی تھی، میاں نے جو راگ چھیڑا تھا اس میں میری زندگی کا درد بھرا ہوا تھا اس لئے میں ٹھہر گئی تھی [illegible] دیکھ کر میں ہمیشہ ترسا کرتی ہوں، میرا جیون تو کڑی دھوپ میں کٹ رہا ہے۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے میاں کی آنکھوں سے وہی پیار جھلکتا ہوا دکھائی دیا تھا جسے میں اکثر منی کے ابا کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی۔
[illegible] صالحہ نے [illegible] دیا۔
لیکن وہ اسی طرح گاتی رہی [illegible] اور دل کش بھی میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔
میں غسل خانے سے نکلا تو صالحہ نے مجھے دیکھتے ہی زیبن کو حکم دیا۔
[illegible]
[illegible]

میں نے شروع [illegible] کیا تھا بھرپور نغمگی اور دلکشی کے ساتھ گا رہی تھی۔ بھیگا بھیگا سا موسم تھا اور گانے نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ فضا اتنی رومان انگیز ہو گئی تھی کہ حسن جلی زینب کے انگ انگ سے شوخیاں ابلنے لگیں۔ اس کی مستی بھری چال میں ڈگمگاہٹ دیکھ کر صالحہ نے کہا۔

"آپ نے ریڈیو آن کر دیا ہے، دیکھئے! یہ زینب کی بچی کیسی مست ہوئی جا رہی ہے، اگر کراکری ٹوٹی تو میں اس سے وصول کروں گی۔"

وہ فوراً سنبھل گئی اور دھیرے سے ٹرے میرے سامنے رکھ کر چلی گئی۔

"کتنی ظالم ہو تم، ذرا اُسے ٹھہر کر گانا سُن لینے دیتیں۔"

"کیا وہ میرے سر پر بیٹھتی؟ ریڈیو کی ساؤنڈ دُور تک جاتی ہے، اطمینان رکھئے، وہ سُن رہی ہوگی۔"

میں خاموش ہو گیا لیکن وہ دیر تک شکایتیں کرتی رہی۔

"اچھی نوکرانی ڈھونڈھی ہے آپ نے، دن بھر ننگی ننگی باتیں کرتی رہتی ہے، میں ایسی بدچلن عورت کو اپنے گھر میں زیادہ دنوں تک رہنے نہ دوں گی۔"

"لیکن کام کافی مستعدی اور محنت سے کرتی ہے۔ ہمیں اُس کے کاموں سے مطلب ہے۔"

"وہ محنتی ضرور ہے لیکن اُس کی گندی باتیں کب تک سُن سکوں گی؟"

"اُسے سمجھا دو، آئندہ وہ ایسا نہ کرے گی۔"

"وہ بے حیا ہے، فحش گوئی سے باز نہ آئے گی۔"

"سختی کرو شاید سُدھر جائے، ابھی کچھ دن رہنے دو، محنتی نوکر آسانی سے نہیں ملتے۔"

"میں کیسے سمجھاؤں، وہ آپ پر بھی ڈورے ڈال رہی ہے، کیا آپ نے مجھے ڈسنے کے لئے ناگن پالی ہے؟"

"مجھے غلط نہ سمجھو صالحہ! تمہارے دل میں ایسا خیال آیا کیسے؟"

اور یہ واقعہ بھی تھا کہ میں صالحہ کو چھوڑ کر اُس نوکرانی سے دل لگانے کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ وہ میرے لئے معمہ بنی ہوئی تھی اور اب میں اُسے سمجھنا چاہتا تھا۔ چند نفع خور اور ذخیرہ اندوز تاجروں کی وجہ سے مُلک غذائی مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔ سیروں سے گھٹ کر چھٹانکوں میں گیہوں بِک رہا تھا۔ حکومت اُلجھے ہوئے غذائی مسئلے کو سُلجھانے میں لگی ہوئی تھی اور اُس کی انتھک کوششوں کے بعد عوام تک غلّہ پہنچ بھی رہا تھا، لیکن کچھ لالچی بیوپاری حکومت کے راستے میں رُکاوٹ بن کر اپنی تجوریوں کو بھرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عوام ناقابلِ برداشت گرانی کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے، لیکن زینب ہنسے جا رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ میں پتھر کے اُس دل میں جھانکنا چاہتا تھا جہاں سے یہ قہقہے اُبل رہے تھے۔

اسی دوران میں رابعہ کی شادی طے ہو گئی۔ صالحہ بہن کی شادی میں شریک ہونے کے لئے خوشی خوشی تیاریاں کرنے لگی۔ ایک دن میں نے ہنستے ہوئے صالحہ سے کہا۔

"مجھے زینب کے ساتھ اکیلے رہنا پسند نہیں۔"

"میں آپ کو کب چھوڑنا چاہتی تھی لیکن آپ نے خود ہی جانا منظور نہیں کیا۔"

"مجھے شادی کی بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگتی، لیکن ایک تنہائی بھی پسند نہیں جو پُرسکون زندگی میں ہلچل پیدا کر دے۔ میرے پہلو میں کافی حساس دل دھڑک رہا ہے۔ ایک ادیب و شاعر کا دل، زینب اپنی تمام شوخیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میرے دل میں اُترنا چاہے گی تو میں اپنے دل کے دروازے پر قفل [illegible]

کر سکوں گا۔ اگر میں اپنا وطن بھی چھوڑ گیا تو اس کشمکش میں کوئی کام نہ ہو سکے گا۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے بے فکر ہو کر جانے دیجئے، مجھے پورا بھروسہ ہے آپ پر۔"

صالحہ چلی گئی تھی اور اب زینت مجھے ایک دلچسپ ناول کی طرح دھیرے دھیرے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور میں اُسے جلدی پڑھنے کے لئے بے چین بھی تھا۔

اگلے دن وہ میز پر کھانا لگا رہی تھی اور گنگنا رہی تھی میں نے اچانک کہہ دیا۔

"خوب گاتی ہو تم"

"گاتی نہیں ہوں دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہوں۔"

"تمہارا دل بھی بوجھل ہو جاتا ہے، تم تو سدا ہنستی رہتی ہو۔"

"کافی ڈوبا ڈوبا رہتا ہے میرا دل لیکن نہ جانے کیوں میری آنکھوں کے سامنے دھنک کی رنگینیاں پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، وہ مجھے گدگداتی رہتی ہیں اور میں ہنستی رہتی ہوں۔"

"عجیب ہو تم بھی۔"

"روتی رہوں تو یہ سُونا سُونا جیون اور کڑوا کسیلا ہو جائے۔"

"تمہیں کیا غم ہے زینت؟"

"تنہائی کا غم جو بھری جوانی میں کانٹا بن کر ہر وقت چبھتا رہتا ہے"

"کہاں ہے تمہارا شوہر۔"

"جیل میں۔"

"کیوں؟"

"مُنّی کے ابا نے ایک دوست کو سہارا دیا تھا۔ وہ ایک چنچل لڑکی کو لیکر میرے یہاں آیا تھا، میں نے اُس لڑکی کو نگاہ بھر کے دیکھا تو مجھے اُسی وقت دال میں کالا دکھائی دیا تھا اور میں نے کہدیا تھا کہ انہیں گھر میں ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ اُس نے میری بات نہیں مانی اور اُن دونوں کو ٹھہرا لیا۔ اگلے دن وہ بھی گرفتار کر لیا گیا اور اب تک سزا بھگت رہا ہے۔ ہاں میں اُسے دیکھنے کے لئے جیل جانا چاہتی ہوں۔ میری بجائے کل میری نند آئے گی اور وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دے گی۔ مجھے دو سو روپے پیشگی دیجئے اِس لئے کہ مجھے اُس کے لئے بیڑی دیا سلائی اور کچھ مٹھائی لے جانی ہے۔ میں آپ کا احسان نہ بھولوں گی۔"

"احسان کی کیا بات ہے، روپے لے لینا، ہاں تمہارا شوہر بھی تمہیں اسی طرح چاہتا ہے۔"

"نہیں، میری آزاد طبیعت نے اُس کے دل میں نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ وہ مجھے زنجیروں میں جکڑتا اور مسلسل تکلیفیں پہنچاتا رہا لیکن طوفان کہیں بند باندھنے سے رُکتا ہے میری سرکش جوانی بھنور کے بیچ کھڑی ہنستی رہی۔"

"ایسی کیا بات تھی جس نے اُسے بد دل کر دیا تھا۔"

"بچپن سے میری خالہ کا لڑکا نصیر مجھے کافی اچھا لگتا تھا۔ وہ خوب گاتا اور بانسری بجاتا تھا، چاندنی راتوں کیا اُس کے ساتھ نہر کے پل پر بیٹھی گھنٹوں رس بھرے گیت سنا کرتی تھی پھر جب میں رخصت ہو کر دلی میں بیٹھی ہوئی گاؤں سے چلنے لگی تو وہ میرے پیچھے نہ جانے کتنی دور تک بانسری بجاتا ہوا چلا آیا تھا، اُس وقت میرے دل کا جو حال تھا [illegible] آیا تھا اور میرے دامن میں چھم چھم آنسوؤں کا مینہ برس رہا تھا پھر جب میں گاؤں گئی تو [illegible]

[illegible]

سارا وقت میرے یہاں گزارا۔ وہ دلکش گیت سناتا رہا اور میں اُس سے گھل مل کر سنتی رہی۔ میں تیرے بچے کی طرح چلی آرہی تھی اور خوش خوش کرتی رہی تھی، اُسے شمّی کے ابا نے پسند نہیں کیا۔ جب وہ چلا گیا تو اُس نے مجھے کافی مارا اور اُس وقت سے اُس کے بنّی کی کالک پھر دُھل نہ سکی۔ وہ نصیر کو ہمیشہ میرا آشنا سمجھتا اور میں ہنس کر ٹال دیتی تھی۔"

"کیا تمہیں نصیر سے پیار نہ تھا۔"

"مجھے اُس کے رنگین بھرے گیت اور بانسری کی دلکش تانیں پسند تھیں۔ اب بھی جب وہ یاد آتا ہے تو گھنٹوں نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ پھر وہ شہر نہیں آیا نہ جانے اب کس حال میں ہو۔"

وہ ایک مہینہ میرے ساتھ تنہا رہ کر مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی اور کبھی کبھی اُس کی باتیں گستاخی کی حد تک پہنچ جاتی تھیں جو مالک اور نوکر کے درمیان نامناسب سمجھی جاتی ہیں مثلاً وہ مجھ سے کہتی۔

"۱۰ بجے تک آپ سوتے رہتے ہیں، یہ منحوس عادت ہے۔"

میں ہنس کر ٹال دیتا، لیکن جب صالحہ آئی تو اُسے زینب کی یہ باتیں کافی ناگوار ہوئیں۔ وہ اُسے ڈانٹتی لیکن وہ اپنی روش بدلنے کو تیار نہ تھی۔ ایک دن اچھا خاصہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں تیز تیز باتیں کرتی رہیں۔ آخر صالحہ نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔

"نکل جا میرے گھر سے، اب میرے گھر میں قدم رکھا تو ٹانگ تڑوا دوں گی۔"

"میاں کے حکم کے بغیر میں نہیں جاؤں گی۔"

"یہ حوصلے تیرے، دیکھتی ہوں کہ اب تو کس طرح رہتی ہے؟"

وہ نہ جانے کتنی اُمیدیں لئے میری طرف بڑھی۔ میں خاموش تھا اور وہ جن معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اُن میں جھانکتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے وہ صاف کہہ رہی ہو "مجھے دوسرا سہارا ڈھونڈے بغیر اس طرح نکالنا مناسب نہیں، میں آپ کے پاس کافی اُمید لیکر آئی تھی لیکن آپ بولتے ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں زینب!" میں ایکدم بول اُٹھا۔

"کیا حکم ہے میاں؟" اُس نے کہا

"پانچ روپے لے لو اور کوئی دوسری نوکری ڈھونڈ لو، مجھے مجبور سمجھو۔"

"میں اپنی تنخواہ پیشگی لے چکی ہوں، بغیر محنت کے میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہ لونگی۔" یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔

پھر وہ میرے یہاں نہیں آئی، لیکن میرے دل میں وہ ایسا تاثر چھوڑ گئی تھی کہ مجھے کبھی کبھی اُس کا خیال آ ہی جاتا تھا۔

ایک دن میں بچوں کے بیچ بیٹھا ہوا ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آئی اور میرے قریب آکر رُک گئی۔ صالحہ نے اُسے کڑوی نگاہوں سے دیکھا، لیکن میں صالحہ سے بے نیاز ہو کر اُس سے مخاطب ہو گیا۔

"خیریت تو ہے، اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"فہمیدن مر گئی۔"

"ایں! کب؟ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔"

"غریب یوں ہی مرا کرتے ہیں۔ اُن کی خبر کیسے ہوتی ہے۔ میں صبح اِدھر سے نکل تھی تو آپ کے گیراج کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اکڑی پڑی تھی۔ میں اپنی چادر اُڑھا کر فوراً گھر چلی گئی تھی۔ میں نے اپنی قبر دس کے میاں [illegible] روپے رکھ دئے تھے۔ ارادہ تھا کہ شمّی کے ابا کے لئے کپڑے بنواؤں گی اس نے کہا [illegible]

شمیم احمد

تضاد

میں نے اپنے موٹے اور ڈھائی سیر وزنی چسٹر کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے، بوجھل قدموں سے جہانگیر آباد کی طرف روانہ ہوگیا ـــ زندگی میں رچے بسے تضادات کے بارے میں سوچتا ہوا، آگ کا توڑ پانی ـــ اندھیرے کا جگر چاک کرنے کے لئے اُجالے کی ایک کرن ـــ اور سردی کے جان لیوا جھونکوں سے محفوظ رہنے کے لئے گرم کپڑے ـــ کیا ضروری ہے کہ آگ پھیلے تو پانی بہانا ہی چاہئے ـــ آگ پھیلتی ہے تو پھیلنے دو ـــ اُسے بھی تو جلنے کا حق ہے ـــ لوگ اندھیرے سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں ـــ اُجالا نہ بھی ہو تو مر تو جائیں گے نہیں ـــ سردی کو لوگ آخر برداشت کیوں نہیں کرتے ـــ وہ بھی تو آخر نظامِ قدرت کا ایک اٹل اصول ہے ـــ نجانے کیا الابلا سوچتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا۔ رات اور وہ بھی سرد رات ـــ اُس پر اندھیرا اور تنہائی مستزاد ـــ پھر انسان فالتو باتیں نہ سوچے تو کیا کرے۔ چنانچہ سوچنے کا جو حق مجھے ملا ہوا ہے، اُس کا پورا پورا استعمال میں اِس وقت کر رہا تھا۔ اور سردی اپنے شباب پر تھی۔ دسمبر کا مہینہ یوں ہی سردی کے لئے بدنام ہے، لیکن اُس رات تیز برفیلی ہواؤں نے اُسے اور بھی زیادہ سرد بنا دیا تھا۔ کافی گرم اور دبیز چسٹر کے باوجود سارا جسم سردی سے کانپ رہا تھا اور مجھے پر پُورے سراپا کو ہلا دینے والی پُھریریاں آ رہی تھیں ـــ "اُف! یہ سردی تو آج جان ہی لے کے چھوڑے گی" میں مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑایا۔ سرد ہوا کے نوکیلے کانٹوں کی طرح تیز اور زہر میں بجھے ہوئے تیر رگ رگ میں اذیت ناک چبھن لگا رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سردی کے یہ یخ بستہ نشتر ڈھائی سیر وزنی چسٹر کا بھی کلیجہ چیر کر سینے میں اُترتے چلے جائیں گے۔ سردی زیادہ ہو تو چلنے کی رفتار غیر محسوس طور پر بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے چنانچہ میں بھی برابر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلتا رہا، کیونکہ مجھے جلد سے جلد گھر پہنچ کر اس عذاب سے چھٹکارا پانا تھا۔

اب میں پولس اسٹیشن کے سامنے آگیا تھا ـــ اچانک میں نے دیکھا کہ پولس اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک بیس بائیس برس کی سیاہ فام پاگل لڑکی، تار تار کپڑے اپنے جسم سے لپیٹے نیم برہنگی کی حالت میں آگ جلائے بیٹھی تھی ـــ آگ کے شعلے سرد ہواؤں کے تھپیڑے سے بجھ چلے تھے، لیکن پگلی اپنے ننگے اور سرد جسم میں آگ کی حرارت منتقل کرنے کے لئے بجھتے ہوئے شعلوں کو کرید رہی تھی اور پھونک مار کر انھیں پھر روشن کرنے کی کوشش میں مصروف تھی ـــ پولس اسٹیشن پر سپاہی موٹے دبیز چسٹر اور بھاری کمبل میں لپٹا اسٹول پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا ـــ پگلی کو دیکھ کر مجھے ایک دم پھریری آگئی، اور یوں محسوس ہوا جیسے اس سرد رات میں اچانک [illegible] اندر سردی میری جان کے درپے ہے ـــ میں نے ایک ہی لمحے میں [illegible] جسم [illegible] ـــ [illegible] عورت کا جسم ـــ پاگل اور ننگی عورت کا جسم

جس میں کوئی کشش نہ تھی ـــــ اُسی لمحے میری نظریں اپنے ڈھائی سیر وزنی جیسٹر پر جم گئیں ـــــ میں سردی سے کس قدر محفوظ تھا۔ لیکن پھر بھی کانپ رہا تھا ـــــ "اُف! یہ غضبناک سردی اور یہ پگلی یوں ننگی بیٹھی ہے جیسے مئی یا جون کی گرم رات ہو ـــــ کہیں یہ اِس سردی میں ٹھٹھر کر مر نہ جائے ـــــ" میں نے دل ہی دل میں کہا ـــــ اچانک انسانی ہمدردی کا جذبہ میرے دل میں بیدار ہوا۔ اور میں سوچنے لگا ـــــ "یہ جیسٹر اِس پگلی کو دیدوں" مگر دوسرے لمحے میری اخلاقی جرأت نے دم توڑ دیا۔ "پھر میں! میں تو اِس سردی میں مر ہی جاؤں گا۔ کیا یوں نہیں چلے گا کہ میں بھی زندہ رہوں اور یہ پگلی بھی ـــــ اور یہ پگلی تو بہر حال زندہ ہے ہی۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے جیسٹر ضروری ہے۔" چنانچہ اس خیال نے میرے جھوٹے جذبۂ ہمدردی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ اِس سے پہلے کہ میں اِس قسم کا کوئی اور نیک خیال دل میں لاؤں میرے بھاری بھاری قدموں کی چاپ سُن کر پگلی نے ایک والہانہ اور بے نیازانہ انداز میں سر اُوپر اُٹھایا اور مجھے گھُور کر دیکھنے لگی۔ پاگلوں کی آنکھوں میں ویسے ہی کیا کم وحشت ہوتی ہے، اِس ماحول نے اُس کی آنکھوں کو کچھ اور ہی زیادہ وحشتناک بنا دیا تھا ـــــ اُس کی چوڑی اور بڑی بڑی آنکھوں میں اِس سرد رات کی طرح ہولناک وحشت جھلک رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سمائی اِس وحشت زدگی سے میرا دل دہل گیا ـــــ اور ایک انجانے سے خوف کا احساس ہوا۔ مگر میں جی کڑا کرکے تھوڑی دیر کے لئے وہاں رُکا رہا اور بغور اُسے دیکھتا رہا ـــــ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی خاموش اور گمبھیر نگاہیں مجھ سے مخاطب ہیں ـــــ

"آؤ بابو تاپ لو! بہت سردی ہے نا ـــــ"

میں اس کی وحشتناک نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ پولس اسٹیشن سے بائیں ہوئی دائیں جانب جانے والی سڑک پر، کچھ ہی دُور ایک مکان کے سامنے کافی تیز روشنی تھی ـــــ تین چار گیس کی لالٹینیں روشن تھیں اور دس بارہ آدمی گردن جھکائے خاموش، افسردہ اور رنجیدہ سے بیٹھے تھے ـــــ

"شاید کوئی مر گیا۔" میں نے سوچا۔ میرے قیاس کی تصدیق یوں ہوئی کہ میرے نزدیک سے دو آدمی گزرے اُن میں سے ایک نے کہا۔

"بس دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گئیں ـ صاحب نے منع بھی کیا پر نہیں مانیں۔ شام کو ٹھنڈے پانی سے نہائیں۔ فوراً ڈبل نمونیہ ہو گیا اور . . . ."

میں نے یہ بات بالکل صاف سُنی اور غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــ پاگل لڑکی ـــــ زندہ تھی اور آگ کے سامنے بیٹھی اپنے ننگے جسم کو سینک رہی تھی ـــــ اور میں، میں اپنے گرم جیسٹر میں لپٹا آگے بڑھ گیا، کیونکہ سردی شباب پر تھی۔ خُنک اور برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں ـــــ اور میرا ہیٹر سے آراستہ گرم بیڈ روم بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا ـــــ

بقیہ افسانہ "زینب" صفحہ ۳۸

دِن قریب آ رہے ہیں لیکن مُردے کے کفن سے زیادہ اُس کے کپڑے ضروری نہیں، محلے والوں نے بھی کچھ روپے اکٹھا کر لئے ہیں"

"میں سارے انتظامات خود کر لوں گا، تم فکر نہ کرو۔" میں نے کہا

لیکن وہ بیس روپے میز پر رکھ کر چلی گئی۔

میں دیر تک خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا رہا۔ اچانک صالحہ نے مجھے چونکا دیا۔

"باتیں کرنے کا اچھا بہانہ ڈھونڈا، بڑی مکّار ہے حرام زادی۔"

مراٹھی کہانی

ٹا۔ سی۔ بھوسلے
ترجمہ۔ انور پرکار

ایک پیالی چائے

پُورے ایک سال سے وہ دُکان بند تھی!

کورٹ کی طرف جانے والے راستے پر وہ دکان ہونے کی وجہ سے دن میں کم سے کم ایک دو بار تو ضرور دیکھا کرتا۔ لاکھ کوشش کرتا کہ میرا دھیان اس دُکان کی طرف نہ جائے۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی بہانے میری نظریں اُس جانب اُٹھ ہی جاتیں۔ دُکان کے بند دروازوں پر "اپ ٹو ڈیٹ ٹیلرنگ" کا لٹکتا ہوا بورڈ دیکھ کر دِل میں ہوک سی اُٹھتی۔ باہر لٹکا ہوا تالا اس بات کی نشان دہی کرتا تھا کہ یہ دُکان اب پھر کبھی اپنی اُس پُرانی حالت پر نہیں آ سکے گی۔

کورٹ میں جاتے اور آتے وقت اِس دکان کے سامنے مجھے پر کو رُکنا پڑتا۔ مالکِ دکان بابو راؤ اپنی مشین سے سر اُٹھا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا۔ میں بھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھنے کے بجائے اُس سے پوچھتا۔ کہو بابو راؤ کیسے ہو۔؟ بابو راؤ اپنے اسٹول سے اُٹھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ صاحب کوئی نیا حکم، کوئی نئی فرمائش! آپ کی طرف سے نہیں بائی صاحب کی طرف سے۔ بالکل نفی میں جواب دینا مجھ پر گراں گزرتا تھا۔ وکیل کی بیوی کتنی ہی فضول خرچ کیوں نہ ہو تب بھی روز نیا آرڈر دینا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اس لئے میں اُس کے اس سوال کا جواب دئے بغیر کسی اور پہلو کی طرف گفتگو کا رُخ کر لیتا۔ بابو راؤ کے لئے کوئی بھی پہلو دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جو میری آواز سُنتے ہی باہر آ جاتے۔ میں بڑے لڑکے سے جس کی عمر قریب نو سال تھی پوچھتا۔ کہو تمہارے ماسٹر جی کیسے ہیں؟ اس کے بعد چھوٹے لڑکے کے ہاتھوں میں گولیوں کی پُڑیا تھما دیتا۔ کبھی کبھار بابو راؤ میری نئی بھینس کا ذِکر چھیڑتا، چونکہ وہ بھینس بابو راؤ کی تلاش اور پرکھ کا نتیجہ تھی۔ آج تک کوئی ایسا دن نہ گزرا تھا جب ہم ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں۔

وہ بابو راؤ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پانچ سال قبل جب میں وکالت کرنے تعلقہ کے اِس چھوٹے سے دیہات میں آیا۔ تب گاؤن سِلوانے کے سلسلے میں اُس سے سابقہ پڑا۔ اُس نے کہا تھا صرف تین روز میں کوٹ تمہارے گھر پہنچ جائیگا۔ مگر جب دس روز ہونے کو آئے اور کوٹ سِل کر تیار نہیں ہوا تو میرے صبر کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ جب وہ سِل کر میرے گھر پہنچ گیا تو میرا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ لگتا تھا جیسے کوٹ سِل کر صرف میرے ہی جسم کا منتظر تھا۔ میری بیوی ادب سے کافی دلچسپی رکھتی ہے۔ اسی لئے اُس کی مثالوں پر میں ذرا کم یقین رکھتا ہوں۔ مگر اب کی بار وہ اس نئے طرز کے سِلے ہوئے کوٹ کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اِس خوشی میں اُس نے بھی اپنے دو کپڑے بابو راؤ سے سِلوا لئے۔ میں نے اپنے ہم پیشہ لوگوں میں اور بیوی نے اپنی سہیلیوں میں بابو راؤ کی سفارش شروع کر دی۔ میری وکالت بھی چمک اُٹھی اور بابو راؤ نے بھی اپنے قدم جما لئے۔

بابو راؤ سوئی کی نوک سے تاگا نکالنے والا درزی نہ تھا۔ اُس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ اُس کی ہر چیز اچھا ہو

نئے نئے ڈزائنوں کی معلومات کے لئے بمبئی سے وہ کیٹ لاگ منگا یا کرتا۔ نمونے طلب کرتا۔ اپنی مشین کی صفائی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ شاید ہی کوئی موسیقار اپنے ساز کی صفائی کا اتنا خیال رکھتا ہو۔ سچ کہا جائے تو وہ درزی نہیں ایک فنکار تھا! اور فنکار ہونے کی وجہ سے اُس میں خامیاں بھی موجود تھیں۔ بِل وصول کرنے کا اُسے کوئی سلیقہ نہ تھا۔ سارا کام بنا حساب و کتاب ہوا کرتا تھا۔ اگر کسی دوست کو روپیوں کی ضرورت ہوتی تو وہ بلا جھجک اُسکی مدد کرتا اور روپیوں کی واپسی کی اُمید نہ رکھتا۔ کبھی کبھار نشہ بھی کرتا تھا۔ اس لئے روپیوں کے بارے میں اس کی ہمیشہ کھینچا تانی رہا کرتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گاؤں کے مارواڑی سے بطور قرض روپیہ لیتا رہا ہے۔ اِس ذیل میں میں نے اُس کے کان کھولنے کا ارادہ کیا، مگر ناکام رہا۔

ایک صبح اچانک بابوراؤ میرے گھر آیا۔ اور پھوٹ پڑنے کے بجائے وہ بڑی خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ بڑے اصرار کے بعد اُس نے بتایا کہ اُسے سَو روپیوں کی ضرورت تھی۔ اُس نے گاؤں کے ایک پٹھان سے قرض کے طور پر روپیہ لے لیا تھا اور متواتر وعدوں کے باوجود ادا نہ کر پایا تھا۔ پٹھان نے دھمکی دی تھی اگر آج تم رقم ادا نہ کرسکو گے تو میں تمہاری مشین بازار میں بیچ دونگا۔ فنکار کو اپنا فن پیارا ہوتا ہے۔ اس کا فن بنا مشین کے کیسے زندہ رہ سکتا تھا؟ اسی لئے وہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں سَو روپئے تھما دئے اور اِسوقت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس سے پُوچھ بیٹھا۔

"بابوراؤ تمہیں کُل کتنا قرض ادا کرنا ہے؟"

"قریب پانچ سو کے۔"

"گاہکوں سے کتنی رقم آنی باقی ہے؟"

"حساب کون رکھتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہے لکھا ہوا میرے پاس!"

"پھر بھی تمہیں اندازہ تو ہوگا۔"

"اندازاً سات سو روپئے!"

"تو تم اُن سے وصول کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے گاہکوں میں اکثر وکیل، ڈاکٹر اور ماسٹر ہیں۔ تم اُن سے براہ راست وصول کرسکتے ہو۔"

"مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ زندگی میں آج پہلی بار اپنی غرض کا آپ کے سامنے اظہار کیا ہے۔"

"آخر وصول کرنے میں کیا بُرائی ہے۔ تمہاری محنتوں کا صلہ تمہیں ملنا ہی چاہیئے۔"

"آپ اِن باتوں کو سمجھ نہیں سکیں گے۔ کاش سبھی لوگ آپ جیسے بلند خیالات رکھتے۔"

میں نے پُوچھا "بابوراؤ۔ پھر تم یہ قرض کیسے ادا کرپاؤ گے؟"

اُس نے اپنی نظریں اُٹھائیں اور دھیرے سے کہا۔ دیکھیں کون سا راستہ نکلتا ہے۔ پر ابکی بار میں نے کچھ سوچ ضرور رکھا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ اور زینے سے اُترتا ہوا دُکان کی جانب چلا گیا۔

میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو یہ فنکار زندگی سے اُکتا کر اپنی زندگی کا خاتمہ ہی کرلے۔ اس کے دل کا راز جاننے کے لئے کورٹ سے واپسی پر کچھ زیادہ وقت اُس کی دُکان پر بتانے لگا۔ لیکن اُس کے رویّہ میں کسی طرح کا کوئی بھی فرق نظر نہیں آیا۔ ہمیشہ کی طرح ہنسنا اور سوالات پُوچھنا۔ جیسے وہ زندگی کی کسی بھی اُلجھن سے ابھی تک دوچار نہ ہوا ہو۔ اِس طرح ابھی ایک مہینہ ہی گذرا تھا کہ ایک روز بابوراؤ کی دُکان بند نظر آئی۔ سوچا، ہوسکتا ہے دو چار دن کے لئے کہیں باہر گیا ہو۔ دِنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گذر گئے۔ مگر بابوراؤ کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک دن اُسی مکڑے پر کام کرنے والا ایک دوسرا درزی میرے گھر آیا اور مجھ سے پُوچھنے لگا کہ مجھے کپڑے سلوانے ہیں؟

میں نے جواب دیا۔ ہاں! پر مجھے بابوراؤ کے آنے کا انتظار ہے۔
اُس نے ہنستے ہوئے کہا "جب تک لڑائی بند نہیں ہوگی۔ بابوراؤ واپس نہیں آئے گا"
کیا وہ فوج میں بھرتی ہو گیا؟
بابوراؤ جیسے دُبلے پتلے شخص کو فوج میں بھرتی کون کریگا۔ کولھاپور میں ایک شخص نے فوجی کپڑے سینے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ بہت سارے درزی ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی اور نوّے روپیہ تنخواہ! بابوراؤ آجکل وہیں نوّے روپئے مہینہ کما رہا ہے۔
میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔
وہ پھر ایک بار مخاطب ہوا۔ کوئی حکم؟
میں نے کہا "جی نہیں، مجھے کپڑے سلوانے نہیں ہیں"
میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ ایک فنکار، روزانہ کی شرٹ اور آدمی پتلون، قمیص اور پتلون! شاید وہ کسی کارخانے کا اوزار ہو گیا ہوگا
نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں دکان کے بند دروازوں سے ٹکرا کر واپس آئیں اور مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیتیں۔
لیکن اچانک دسہرے سے دو دن قبل بابوراؤ زینہ چڑھ کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے سو روپئے میری میز پر رکھ دئے۔
ہم دونوں تمہیں ہر وقت یاد کیا کرتے تھے۔ مگر بابوراؤ تمہارے اِن روپیوں کے لئے نہیں۔
اُس نے کہا "میں آپ کو بہت ہی قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن آج میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ میں سارا قرض ابھی اسی وقت ادا کرسکتا ہوں"
"تم تو کچھ کہے بنا ہی غائب ہو گئے"
کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہا۔ اپنے زخم جب لوگوں کو دکھانے کی عادت ہوجاتی ہے تو آدمی مسکرا پڑتا ہے۔ وہ بھی مسکرایا۔
"کیا چھپاؤں اور کیا بتاؤں، البتہ اتنا بتا دوں کہ جہاں میں کام کرتا تھا میرے ساتھ قریب دو سو درزی تھے۔ میرے نام سے بھی وہاں کوئی واقف نہ تھا۔ وہاں تو صرف مشین کا نمبر تھا۔ میں بتیس ۳۲ نمبر کا درزی آواز دیتے ہی "ہاں حاضر ہے" کا جواب دیکر پھر سے مشین کی گھڑ گھڑاہٹ میں کھو جاتا۔ کسی بات کی کوئی پروا نہ تھی۔ چاہے مشین خراب ہو یا غلاظت کے انبار لگ جائیں۔ میں بھی مشین کا ایک پُرزہ ہو چکا تھا۔ قرض چکانے کے لئے میرے اندر کا فنکار مرچکا تھا۔ ایک ہی قسم کا کپڑا اور ایک ہی ناپ، وہی ہاتھ اور وہی پاؤں۔ اور ایک ہی قسم کی سلائی۔ کبھی کبھار تو جی ہوتا کہ اِس بتیس ۳۲ نمبر کی مشین کو لات مار کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر ہر بار میں اپنے دل کو سمجھاتا۔ "ابھی قرض چکانا ہے" مہینہ بھر میں پچاس بچا لیتا تھا۔ اِس طرح ساری رقم میں نے جمع کر لی۔ چار روز سسرال رہا اور آج بیوی بچوں سمیت یہاں چلا آیا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی سیدھا آپ کے دفتر کی طرف [illegible] اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ مجھ سے بھی سنبھالا گیا [illegible] گیا۔
میں نے قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اب آئے ہو تو چائے پیتے جاؤ"
اُس کے لب کھُل گئے "میں آپ کو چائے کے لئے ہی اپنے ساتھ لینے آیا ہوں۔ بیوی نے کہا۔ سال بھر کے بعد آج اپنے گھر میں چولھا جلے گا۔ سب سے پہلے کوئی میٹھی چیز پکانا چاہیے۔ اسی لئے بیوی گھر میں چائے بنا رہی ہے۔ چائے بھی تو میٹھی ہوتی ہے نا! وہ کہہ رہی تھی۔ وکیل صاحب تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ انہیں [illegible] تمہارا تیسرا بچہ یعنی مشین آج صحیح سلامت ہے۔ اُن سے کہنا غریب کے گھر کی چائے پی"
میں نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ بابوراؤ تم غریب نہیں ہو۔ تم بہت ہی امیر ہو۔ فنکار کبھی غریب نہیں ہوتا"
(بقیہ صفحہ ۴۷ پر دیکھئے)

مظفر حنفی

سبز روشنی

کلاک نے دو بجائے۔
اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تاریک سڑک پر سبز سگنل تین بار لہرا کر بجھ گئی۔ سیما کا رُوم رُوم جھوم اُٹھا۔
آج قسمت نے اُس کی بے لطف اور بے معنی زندگی کو آگے بڑھنے کا سگنل دے دیا تھا۔
اُس رات "بیلی کوٹھی" کو دُلھن کی طرح سجایا گیا تھا، کوٹھی کا گوشہ گوشہ بقعۂ نُور بن گیا تھا لیکن سیما کے لئے وہ رات کتنی تاریک تھی، دل نے آشاؤں کے سارے دیپک بُجھا دئے تھے اور اُس کے سینے میں سسک رہا تھا۔
وہ اُس کی سہاگ رات تھی۔
کون دبے پاؤں، کب، اُس کے کمرے میں داخل ہوا، اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ کس نے، کب، اُس کا گھونگھٹ اُلٹ دیا، اُسے احساس تک نہ ہوا۔
"سیما!" کسی نے بڑے پیار سے سرگوشی کی۔
اور وہ یادوں کے بھیانک جزیروں میں بھٹک رہی تھی۔
اسلم۔ اسلم۔ کہاں ہو تم۔ تم کہاں ہو اسلم! یہ تم کہاں چھوڑ گئے اپنی سیما کو!
"سیما" کسی نے رُوح کی تمامتر شیرینی اُس کے کانوں میں اُنڈیلنی چاہی۔
اسلم! روتے ہوئے دل نے آواز دی۔
"سیما" اس بار سرگوشی کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے داہنے رُخسار پر بھیگی بھیگی سانسیں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر ہونٹوں پر زندہ کیچوے سے رینگنے لگے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ــــ
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"
سُلگتے ہوئے ہونٹ اُس کی آنکھوں سے بہت پاس لرز رہے تھے اور اُس کا "نصف بہتر" جاوید اپنی بوجھل نشیلی پلکوں کو بڑے جذباتی انداز میں جھپکا رہا تھا۔
"کیا بُرا مان گئیں سیما؟" اُس نے بڑی ملائمت سے پُوچھا۔
تب تک سیما کو اپنے پاگل پن کا احساس ہو چکا تھا۔ یہ اُس کی شبِ عروسی تھی اور وہ اس وقت اپنے مجازی خدا کی بارگاہ میں تھی۔
"کون کہتا ہے اِس دَور میں انسان کی قربانی نہیں ہوتی؟"
"آں...؟" جاوید نے اپنے کان اُس کے لبوں سے بھڑا دئے۔

"جی... جی... میں..." وہ اُس کے شانے پر سر رکھ کر جھجکنے لگی۔

جاوید بوکھلا گیا۔

"لیکن بات کیا ہے سیما؟"

"جی میں بہت شرمندہ ہوں۔" اُس نے سسکیوں کے درمیان بہ مشکل یہ الفاظ ادا کئے۔

"پگلی!" جاوید کی باچھیں کھل گئیں، "حُسن تو منفعل ہو کر اور بھی تیکھا ہو جاتا ہے۔"

اور شب عروسی کا وہ تیکھا حُسن آج تک تیکھا تھا، سیما ہزاروں کوششوں کے باوجود جاوید کے لئے اپنے دل میں کوئی جگہ نہ نکال سکی تھی۔ اور دِل میں جگہ ہوتی بھی کہاں سے، اس کے ہر گوشے پر تو اسلم قابض تھا۔ اسلم جو سیما کا بچپن کا ساتھی تھا۔ جس کے ساتھ اُس نے عمر کی سترہ بہاریں گذاری تھیں۔ بچپن کے وہ سنہرے دن، جوانی کی وہ رنگین راتیں جو سیما نے اسلم کے ساتھ بتائی تھیں، اُس کی متاعِ زیست تھیں، اسلم کا شگفتہ چہرہ، چُلبلی حرکتیں، شوخیاں، یہی خصوصیات وہ اپنے شوہر میں چاہتی تھی لیکن وہ تو فلسفہ کا پروفیسر تھا اور فلسفہ کا پروفیسر کوشش کرنے پر اسپنسر اور مارکس تو بن سکتا تھا، اسلم نہیں۔ وہ جاوید کی محبت میں خلوص کی گہرائیاں تو محسوس کرتی تھی، لیکن اُس میں اسلم کے جذبات کی سی گرمی نہ تھی۔ اس نے کئی بار پُوری پُوری کوشش کی کہ اگر خلوص دل سے نہیں تو کم از کم ظاہری گرمجوشی کے ساتھ ہی جاوید کی محبت کا جواب دے سکے، لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی وہ جسمانی طور پہ جاوید سے قریب تھی لیکن اُس کی رُوح اسلم کے خیالی پیکر کے گِرد دیوانہ وار چکر کاٹتی۔ اور اسلم؟

خدا جانے وہ اتنے طویل عرصے سے کہاں غائب تھا۔ چار سال قبل اُس کے لئے اسلم کا پیغام آیا تھا جسے منظور کرنے کیلئے سیما کی ماں نے یہ شرط لگائی تھی کہ لڑکا کسی اچھی جگہ ملازم ہونا چاہیئے اور پھر اسلم اُس سے جُدا ہو کر ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا اور مسلسل دو سال تک اُس کی خبر نہ ملنے پر سیما جاوید کو سونپ دی گئی تھی، موٹے موٹے ہونٹوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے اس سیہ فام پستہ قامت فلسفے کے پروفیسر کو، جو اسلم کی ضد تھا سیما نے ازدواجی زندگی کے یہ دو سال کانٹوں کی سیج پر گذارے تھے۔ دن اور رات کا کوئی ایک لمحہ بھی تو ایسا نہ تھا جب اسلم کی یاد نے اُس کے دل کا دامن چھوڑا ہو۔ اس کی بے لُطف زندگی ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ اُسے اسلم کا انتظار تھا۔ اور آج سبز ٹارچ نے تین بار لہرا کر اُس کی بے لُطف اور جامد زندگی کو آگے بڑھنے کا سگنل دے دیا تھا!

ہُوا یوں، کہ پرسوں دوپہر کو اُس نے سامنے والی کوٹھی کے نئے کرایہ دار کی جھلک دیکھ لی تھی اور وہ اسکے مَن مندر کا دیوتا اسلم تھا۔ پھر مزید وقت ضائع کئے بغیر اُس نے کل دوپہر میں اسلم سے مل کر تمام معاملات طے کر لئے تھے سیما کے دریافت کرنے پر اسلم نے بتایا تھا کہ وہ "اچھی سی" ملازمت حاصل کرنے کے لئے سرکار کی طرف سے ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا تھا۔ ملازمت چونکہ محکمۂ دفاع سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اُسے زیادہ خط و کتابت کرنے کی اجازت نہ تھی اور اب کہ ٹریننگ ختم ہو چکی تھی، وہ اِس شہر میں ایک اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے وارد ہوا تھا۔

اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت آج صبح ہی سے سیما نے رو رو کر گھر سر پر اُٹھا لیا تھا۔ اُسے جانے کیوں آج اپنی بھولی بسری خالہ زاد بہن یاد آ رہی تھی جو دہلی میں ہوگی کے ایام گذار رہی تھی اور پھر مجبوراً جاوید کو شام کی گاڑی سے اُسے لانے کے لئے دہلی روانہ ہونا پڑا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ احتیاط کے طور پر سیما خود اُسے پلیٹ فارم تک پہنچا آئی تھی اور اب سڑک پر سبز ٹارچ لہرا رہی تھی۔

اُس نے سنگار میز پر سے اپنا سُوٹ کیس اُٹھایا اور تیزی سے تاریک زینہ طے کر کے سڑک پر آ گئی۔

سبز شارع قریب آنے لگی۔

"اسلم نے" وہ وفورِ مسرت سے بیخود ہو کر شارع کی طرف لپکی۔

"سیما!" عقب سے جاوید نے پکارا۔

وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"اس تاریک رات میں سڑک پر کیوں بھٹک رہی ہو سیما! اور یہ سبز روشنی کیسی چمک رہی ہے؟"

"لیکن... لیکن..." سیما نے آواز سنبھال کر بات بنانے کی کوشش کی "تم تو دہلی گئے تھے پروفیسر.."

"آج گاڑی پورے بارہ گھنٹے لیٹ ہے، پل ٹوٹ گیا ہے کوئی، مگر سیما تم..."

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، — ایک شعلہ سا لپکا، لیکن یہ شعلہ سبز نہیں تھا سُرخی مائل نیلا تھا۔

دھماکے کی آواز سے سڑک گونج اُٹھی۔

جاوید سڑک پر تڑپنے لگا!

اسلم جھپٹ کر سیما کو گھسیٹنے لگا —

"چلو سیما! جلدی کرو۔ بڑا خطرناک موقع ہے۔"

سیما نے شیرنی کی طرح غرّا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"دور ہو جا کمینے میری نگاہوں کے سامنے سے۔"

وہ چیخ کر بولی اور جاوید کی لاش کے سرہانے بیٹھ کر اپنی چوڑیاں پھوڑنے لگی!

● بقیہ افسانہ "ایک پیالی چائے" صفحہ ۴۳ ●

"چلئے میری بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "بابو راؤ مجھے نئے دو کوٹ سلوانے ہیں۔ ابھی تک تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"میں بھی پوچھنے ہی والا تھا۔ چونکہ ان ہاتھوں نے سال بھر صرف ٹھیک کا کام کیا ہے۔ اب پھر ان ہاتھوں کو میں فن کی طرف موڑنا چاہتا ہوں۔ ان کمبخت ٹھیکے کے باعث پر میں بھر سے اس فن کی تمیز! احساس تا جل چکا ہے جو مجھ کو تصنیف انیہ کو دھنس گئی ہے۔"

میں سے اُٹھ کر ... اُٹھتا ہوا بابو راؤ کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔

نسیم گوالیاری

پاگل

کہرے کی وجہ سے کھڑکیوں کے شیشے دُھندلے پڑ چکے تھے ——!

ٹرین ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تاریک شب کے مہیب اور دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی چلی جارہی تھی شیشوں سے آنکھیں چپکائے رکھنے پر بھی باہر کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا، پھر بھی میں کھڑکی کے شیشوں سے آنکھیں چپکائے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا —— کبھی کبھی کسی قدآور پیڑ کی ایک ہلکی سی سیاہ لکیر نظر آجاتی، اور پھر وہی تاریکی! - گو میری یہ حرکت طفلانہ تھی، تاہم ذہن کو ایک طرف اُلجھائے رکھنے کے لئے بعض اوقات ایسی حرکتیں بھی سُود مند ثابت ہوتی ہیں اور آج مجھے بھی اپنی اِس حرکت سے یک گونہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔

ٹرین اپنی پُوری رفتار سے منزل کی طرف دَوڑ رہی تھی اور نہ جانے اُسے کب تک اسی طرح اندھیری رات کے سُنسان اندھیروں میں اپنی منزل کے لئے دوڑنا تھا —— اُوپر والی برتھ پر سویا ہوا آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ سامنے والی برتھ پر بیٹھی ہوئی عورت کسی گہری سوچ میں غرق تھی، اُس کا چہرہ اُس کے قلبی تاثرات کی غمازی کر رہا تھا۔ اُس کی بھاری بھاری پلکیں ایک لمحہ کے لئے اُوپر اُٹھتیں اور پھر جُھک جاتیں۔ میں نے کھڑکی سے سر ہٹا کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور ایک بار پھر سامنے بیٹھی ہوئی عورت پر نظر کی۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی ویرانی سی نظر آئی، ایسی ویرانی جس کی تشریح ناممکن ہے۔ میں اُس کے بارے میں کچھ غور کر ہی رہا تھا کہ اُس کی بچّی جو کمبل میں لپٹی لپٹائی اُس کے ساتھ ہی برتھ پر سو رہی تھی، کُنمنانے لگی اُس کے سر پر بندھی ہوئی گُلابی اُون کی خوبصورت ٹوپی کھسک کر اُس کی گردن میں آرہی تھی۔ بچّی نے دو ایک بار اپنے سر پٹکے اور اپنی ننھی ننھی مُٹھیاں ہوا میں لہرائیں اور رونے لگی۔ میں نے دیکھا اُس عورت کی آنکھیں یکلخت نمناک ہو گئیں، آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر اُس کے رُخسار پر اِس طرح بہہ نکلے جیسے کسی سنگِ مرمر کے صحن پر پانی بہہ نکلتا ہے۔ بچّی کا رونا بند نہیں ہوا تھا۔ اُس نے تھپکا کر اُسے سلانا چاہا پھر بھی وہ روتی ہی رہی۔ مجبوراً اُس نے کمبل کا ایک حصہ اُوپر اُٹھا کر برتھ پر اُسے لٹا دیا اور دُودھ پلانے کی غرض سے خود بھی اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔

میں نے کھڑکی سے پھر اپنا سر ٹکا لیا۔

اب دُور تک مجھے بتیوں کی ایک لمبی سی قطار نظر آرہی تھی شاید یہ کسی آبادی کی روشنی تھی یا —— ممکن ہے وہ کسی سڑک کی بتیاں ہوں؟

گاڑی اپنی رفتار سے دَوڑ رہی تھی۔

شیشوں پر بدستور کہرا چھایا ہوا تھا۔ آبادی یا سڑک جو بھی تھی کسی سُست گام مُسافر کی طرح دِھیرے دِھیرے پیچھے رہی جارہی تھی —— شیشوں سے نظر آتے ہوئے اندھیرے پہلے سے زیادہ گہرے ہوتے جارہے تھے میں نے ایک بار پھر اُس

لیٹی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھی۔ اوپر والی برتھ پر سویا ہوا مسافر بدستور خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا مگر اُس کا نیچے لٹکا ہوا ہاتھ کسی پھانسی چڑھے ہوئے مجرم کی طرح کسمپرسی کے عالم میں متحرک رہا تھا۔ بچّے والی عورت بدستور ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی، لیکن اب اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں نظر آرہی تھی بچّی دُودھ پی کر کلکاریاں کرنے لگی تھی۔ اچانک مخالف سمت سے آتی ہوئی ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ سے بچّی کچھ سہم سی گئی، مگر دوسرے ہی لمحے میں جب ٹرین گزر گئی تو وہ اور بھی کلکاریاں کرنے لگی۔ میں نے ایک بار بچّی کی طرف دیکھا۔ بچّی کا چہرہ گدرایا ہوا تھا اُس کے ہلکے گلابی اُون کی ٹوپی سے اُس کے سنہری جھلکتے ہوئے بال بہت ہی خوشنما معلوم ہو رہے تھے، اُس کی ناک ذرا چھوٹی سی تھی لیکن آنکھیں؟ بالکل اُس کی ماں کی طرح گہری اور پھیلی ہوئی تھیں۔ بچّی کی نگاہیں کلکاریاں مارتے مارتے میری طرف گھومیں اور وہ میری طرف لپکنے کے انداز میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں بلند کرنے لگی۔ اُس عورت نے ایکبار اپنی آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی ایسی حسین دُنیا میں پہنچ چکا ہوں جس کا ذرّہ ذرّہ انتہائی حسین و دیدہ زیب ہے۔ بچّی ابھی تک اپنے ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں بلند کر رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے بچّی کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا:۔

"آجاؤ۔ بیٹی۔!"

مگر نہ جانے کیوں بچّی نہ آئی اور اُس کا مُنہ روہانسا ہو گیا۔ اُس عورت نے تیزی سے اُس کے پھیلے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھدئے اور جب بچّی دوبارہ معصومیت کے انداز میں مسکرانے لگی تو اُسکی ماں نے کہا:۔

"پرائے آدمی سے ڈرتی ہے۔"

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ کھینچ لئے ——— وہ عورت پھر کہنے لگی:۔

"دراصل۔ یہ آج تک یا تو میری گود میں رہی ہے یا پھر اپنی آپا کی گود میں۔ آپ ناراض نہ ہوں!"

یہ کہہ کر وہ اپنی بچّی کی پیشانی پر بوسے دینے لگی۔ بچّی اب اپنی آنکھیں موند رہی تھی اور وہ عورت اُسے بے تحاشہ چومتے چومتے گویا اپنے آپ سے کہہ رہی تھی

"بڑی اچھی ہے میری بیٹی!۔ بڑی جلدی سو جاتی ہے۔"

اور پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی میں نے ایکبار پھر غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُسکی آنکھوں کی ویرانی اور سُونا پن ابھی تک قائم ہے۔ اچانک میں نے اُس سے سوال کیا:۔

"کیا عمر ہے بچّی کی؟"

"ایک مہینے کے بعد یہ پُورے ایک سال کی ہو جائے گی۔ لیکن دیکھئے نا۔ چھ مہینے سے بھی کم کی نظر آتی ہے۔ آپکا کیا خیال ہے؟"

میں نگاہوں سے اُس کے سوال کا اقرار کرتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر بھولا پن برس رہا تھا، پھر وہ خود ہی کہنے لگی:۔

"لگتا ہے آپ کو بچّوں سے بہت پیار ہے۔ کتنے بچّے ہیں آپ کے ——— ؟"

اُس کے اِس سوال نے مجھے کچھ بوکھلا سا دیا۔ اور میں چھت پر جلتے ہوئے بلب کو دیکھنے لگا جس کے اردگرد کچھ پروانے منڈلا رہے تھے۔ لیکن اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری تھا، چنانچہ میں نے کہا:۔

"میرے بچّے ——— ؟ ——— ابھی تو نہیں مگر . . . . . !"

"مطلب یہ کہ شادی تو ہو چکی ہے مگر بچے نہیں ہوئے"۔۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی" آپ لوگ تو بچوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔۔۔۔!"

میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا:۔

"نہیں یہ بات تو نہیں۔"

"اس کے ابا کا تو یہ حال ہے کہ اگر دومنٹ کے لئے بھی اُٹھانا پڑ جائے تو جھلا اُٹھیں!۔ اب تو خیر وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا کر لندن جا چکے ہیں۔"

میں نے دیکھا اُس عورت کی آنکھیں پھر کچھ نمناک ہونے لگی تھیں۔ لیکن اُس نے کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اُن آنسوؤں کو پی لیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بالکل اُس معصوم بچے کی طرح مسکراہٹ پھیل گئی جو سوتے میں کبھی رونے لگتا ہے اور کبھی روتے روتے ہنس پڑتا ہے۔ مجھے اب اس عورت کے نجی حالات سے قدرے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا:۔

"کسی خاص کام کے سلسلے میں گئے ہوں گے!"

"جی نہیں۔۔۔۔! ایک ملازمت کے سلسلے میں گئے ہیں۔"

"پھر تو آپ غالباً اُنھیں پہنچانے بمبئی گئی ہوں گی؟"

"جی ہاں!۔ ابھی تو انہیں پہنچانے ہی گئی تھی۔ مگر کچھ عرصہ بعد خود بھی اُن کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"تو کیا آپ تنہا جائیں گی؟"

"جی ہاں۔۔۔۔"

اُس کے لہجے میں خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

"آپ اُن کے ساتھ ہی کیوں نہ چلی گئیں!"

اس سوال پر وہ کسی قدر ٹھٹک گئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ اس قسم کے سوالات کے جوابات دینا نہیں چاہتی۔ مجھے خود بھی ندامت ہو رہی تھی، آخر مجھے اتنی زیادہ کُرید کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میرا اُس سے تعلق ہی کیا۔۔۔؟ میں بلاوجہ اُس کی خانگی زندگی میں کیوں کُود رہا تھا۔۔۔ لیکن، اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی کہنا چاہئے کہ مجھے اس قدر بے تکلف بنانے میں اُسی نے پہل کی تھی۔

وہ کسی قدر جزبز ہو رہی تھی۔ گویا وہ کسی رُوحانی اذیت کو چھپانا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا:۔

"بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ سردست اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ ہم دونوں اکٹھے سفر کر سکتے۔"

"میرے خیال میں آپ اقتصادیات کا ذکر کر رہی ہیں۔۔۔۔!"

"جی ہاں!۔ آپ نے ٹھیک ہی سمجھا ہے۔ فوری طور پر اس ملازمت کے حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے رقم فراہم کی اور کچھ میں نے۔۔۔۔"

"اب آگے کیا ہوگا۔؟ آپ خود کس طرح جا سکیں گی؟"

میں نے گفتگو کو اس لئے طول دیا کہ میرے خیال کے مطابق وہ خود اپنے پوست کندہ حالات سنانے کے موڈ میں تھی ایسے موقع پر کسی کے جذبات کا احترام نہ کرنا بدذوقی کی انتہا کہی جا سکتی ہے۔

"دیکھئے نا۔ ابھی تو مجھے جانے میں چھ آٹھ مہینے کا عرصہ درکار ہوگا۔ اس عرصہ میں کچھ پڑھا بھی لونگی اور کچھ رقم بھی جوڑ لوں گی۔"

"یعنی آپ لندن جانے سے پہلے انگریزی زبان سیکھنا چاہتی ہیں تاکہ وہاں گفتگو میں آسانی ہو۔!"

"جی نہیں۔ یہ مقصد نہیں۔ ویسے تو میں ایم۔ اے کا پہلا سال ختم کر چکی ہوں اور اُمید ہے کہ اگلے امتحان میں ۔ ۔ ۔ !"

"او ۔ ہو ۔ سمجھ گیا ۔ سمجھ گیا ۔"

اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے کئی باتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی ۔

"وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں کسی طرح ایم۔ اے کر لوں ۔"

"بات تو ٹھیک ہے ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"مگر ۔ ۔ میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے ۔ اُن کی عدم موجودگی کے باعث اخراجات میں خود بخود ۵۰ فیصدی کی بچت ہوا کرے گی ۔ کچھ رقم ایکسٹرا ٹیوشن سے بھی پیدا کر لوں گی ۔ بہرحال ۔ میرا خیال ہے کہ ۔ شاید چھ آٹھ ماہ میں لندن جانے کا انتظام کر ہی لوں گی ۔"

اُس کے چہرے پر ایک خوش آئند مسرت کی جھلک نمایاں ہوئی ۔ اُس کے سوچے ہوئے منصوبوں سے میرے اختلاف یا اتفاق کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ ایسے موقع پر ہر شریف آدمی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ "خدا کرے مخاطب کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ۔"

وہ سوئی ہوئی بچی کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی ۔ باہر وہی گھٹاٹوپ اندھیرا تھا ۔ اندھیرا ۔ اُجاڑ ، سنسان اور ویران اندھیرا ۔ ایسا معلوم دے رہا تھا گویا کسی "اُردو ادیب" کا مقدر اپنے عروج کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہے ۔

اُس نے ایک بار پھر بچی کو کمبل میں ڈھانپ دیا تاکہ اُسے سردی نہ لگ جائے ۔ اُوپری برتھ پر سوئے ہوئے آدمی کے خراٹے پورے ڈبے میں گونج رہے تھے ۔

"لوگوں کو سفر میں نہ جانے اتنی گہری نیند کیسے آجاتی ہے ۔" اُس نے گفتگو کا رُخ تبدیل کرتے ہوئے کہا :۔

"مجھے دو دو راتیں بھی سفر کرتے گذر جائیں پھر بھی نیند نہیں آتی ۔" پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو :۔

"اپنی اپنی عادت ہوتی ہے ۔"

"ہاں ! ۔ عادت ہی کی تو بات ہے" ۔ میں نے جواب دیا ۔ "کچھ لوگ بہت ہی بے فکر ہو کر گویا گھوڑے بیچ کر اپنی زندگی آرام سے گذارتے ہیں ، اور کچھ لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"بغیر فکر کے جی ہی نہیں سکتے ۔ کیوں ؟ !" ۔ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی ۔ یہ کہتے ہوئے وہ ذرا ہنس دی ۔ نہ معلوم اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی ! ۔ تاہم میں نے بھی اس سلسلے میں اس سے اشتراک عمل کیا ۔

"میری بہت خراب عادت ہے ۔ میں خواہ مخواہ ہی سوچتی رہتی ہوں ، کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میری یہ وقت بے وقت کی سوچ کہیں مجھے پاگل نہ کر دے ۔ وہ بھی بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ مجھے اپنی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے خیال سے لوگوں سے ملتے جلتے رہنا چاہیے ۔ جتنا بولنا چاہیے ، مگر اُن کے سامنے میں ایسی گم سم ہو جاتی ہوں کہ بس ! ۔ کیا بتاؤں ۔ ! اوّل تو یوں بھی میں بولتی کم ہی ہوں لیکن اُن کے سامنے تو نہ جانے کیوں مجھے سانپ سونگھ جاتا ہے ۔ اب دیکھیے نا ! ۔ کہ میں آپ کے سامنے کیسی قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہوں ، لیکن اگر وہ موجود ہوتے تو شاید میں کچھ نہ کہہ سکتی ۔"

یہ کہتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مُسکراہٹ پھیل گئی ۔

"دیکھیے راستہ کاٹنے کے لئے بات کرنا ضروری ہوتا ہے ۔" میں نے کہا ۔ "خاص طور پر جب نیند کا دور دور پتہ نہ ہو !"

اُس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے پھیل گئیں اور پھر ذرا گردن جھکاتے ہوئے بولی :۔

"اُن کا کہنا بھی یہی ہے۔ کہ جس کے منہ میں زبان نہ ہو اُس کے ساتھ ساری زندگی کیسے گذاری جاسکتی ہے! اور یہ بات بھی ٹھیک ہی تو ہے، آخر انسان اور جانور میں کچھ امتیاز تو ہونا ہی چاہئے نا! میری ہر بار یہی خواہش رہی ہے کہ میں ہمیشہ خوش خوش رہوں اور اُن کے ساتھ کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو کرتی ہی رہوں۔ مگر جیسے ہی وہ سامنے آتے ہیں میری تمام کوششیں اور خیالات یکلخت ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر اُنھیں میری اس بات پر غصّہ آجاتا ہے اور میں رو پڑتی ہوں، لیکن اُنھیں میرا رونا بھی تو گوارا نہیں ہوتا۔"

وہ بیک وقت بہت کچھ کہہ گئی شاید اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے! اور جو کچھ کہہ رہی ہے ــــ آخر مجھے ایسی باتیں بتانے سے کیا فائدہ!

"آپ کا خیال ہے ــــــ میں پاگل تو نہیں ہوں ــ!"

میں نے اِس مرتبہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی طفلِ مکتب تو نہیں سمجھ رہی ہے ــــ میں نے پچھلی گفتگو پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ اطمینان کر لیا کہ کہیں میں نے ایسی تو کوئی حرکت نہیں کی جو بچکانہ کہی جاسکے یا تو کیا اُس کے دماغ میں خلل تھا؟ ــــ بظاہر ایسی بھی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی ــــ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ وہ ایک عورت تھی اور بس!ــ

"میں بہت پاگل ہوں۔" وہ پھر بولی۔ "نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ جتنا مجھے رونے سے روکتے ہیں اُتنے ہی میرے آنسو بہنے لگتے ہیں، دراصل وہ آج تک مجھے سمجھ ہی نہیں پائے۔ میں زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی مگر وہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بات کرتی ہی رہوں۔"

پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے بولی:ــ

"کیا آپ بھی اپنی شریکِ زندگی کو اِس بات کے لئے مجبور کرتے ہیں؟"

میں کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، سردی چونکہ بڑھتی جارہی تھی میں نے اُس سے بچنے کے لئے اپنی بغلوں میں دونوں ہاتھ دبا کر جلتے ہوئے بلب کے اِردگرد منڈلاتے ہوئے پروانوں پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر اُسکی طرف دیکھا وہ سوالیہ نظروں سے ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میں؟" ــ میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:ــ

"مجھے آج تک یہ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی، بلکہ میں تو پانچ سال سے یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ خدا کے لئے ذرا کم بات کریں۔ میرا تو ایسا خیال ہے کہ انسان خاموش رہ کر بھی زیادہ سے زیادہ بات کرسکتا ہے۔ زبان سے کہی ہوئی باتوں میں وہ شیرینی نہیں ہوتی جو آنکھوں کی چمک میں یا لرزتے ہوئے ہونٹوں یا ماتھے کی شکنوں میں ہوتی ہے۔ میں نے جب کبھی اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ہمیشہ مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیتی ہیں کہ زیادہ گفتگو کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اِن پانچ سالوں میں اُنہیں آج تک میں کچھ بھی نہیں سکا۔ دراصل وہ ایک کالج میں لکچرار ہیں۔ اور شاید وہ یہ چاہتی ہیں کہ گھر میں بھی مشق اور پریکٹس کرتی رہیں۔ اور ظاہر ہے گھر میں اُن کا مخاطب صرف میں ہی ہوسکتا ہوں!"

"اوہ ــ!" ــ یہ کہہ کر وہ کچھ عرصہ تک اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے رہی ــ پھر کہنے لگی:ــ

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ــ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے اُن سے یہی شکایت ہے کہ وہ میری بات سمجھ کیوں نہیں پاتے ــ؟ ــ میں کئی بار اُن کے بالوں سے ــ اپنی اُنگلیوں سے بات کرنا چاہتی ہوں، کئی بار اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر مُندی ہوئی آنکھوں سے اُن سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن اُنہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ گڑیوں کا کھیل ہے۔ اُن کی بیوی کو تو ایک جیتا جاگتا انسان ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن میں انسان ہونے کی جتنی بھی کوشش کرتی ہوں اتنی ہی

[illegible] تک انسان نہیں بن سکی۔ اُنہیں میری کوئی عادت پسند نہیں۔ میں نے بارہا چاہا کہ چاندنی رات میں بہتے ہوئے کھیتوں میں ٹہلوں۔ بہتے ہوئے آبشاروں میں اپنے پاؤں لٹکائے بیٹھی رہوں۔ مگر یہ سب کچھ اُنھیں پسند نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں یہ سب شاعرانہ بکواس ہے۔ اُنہیں کلب، سنگیت سبھائیں اور ڈنر پارٹیاں اچھی لگتی ہیں۔ میں اُن کے ساتھ مجبوراً وہاں جاتی ہوں مگر میرا وہاں دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے وہاں کی زندگی ایک لمحہ کے لئے نہیں بھاتی، میری اس اکتاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے وہ بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ میں کہیں پچھلے جنم میں گائے تو نہیں تھی؟ جو عورت کلب میں بیٹھنے کے بجائے کھیتوں میں، آبشاروں کے قریب مینڈکوں کی آواز سُننا پسند کرتی ہو وہ عورت کیسے ہو سکتی ہے؟ تم یقیناً پچھلے جنم میں چوپایہ ہی ہوگی۔ اُن کے اس جملے کے جواب میں، میں کہتی آئی ہوں کہ میں اس زندگی میں بھی تو ایک گائے ہی ہوں۔ میں کلب میں بیٹھنے کے بجائے برسات کے پانی میں بھیگنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے بارش میں بھیگ کر میرا من زیادہ گنگنا اُٹھتا ہے۔ حالانکہ مجھے گانا بالکل نہیں آتا۔ سگریٹوں کے دھوئیں سے اَٹی ہوئی کلب کی گھٹی گھٹی سی فضا میں اگر میرا دم گھٹنے لگے تو کیا اُسے گھٹ جانے دوں؟"

اس وقت اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر بہت ہی دُکھی اور مغموم ہے۔ اس کی یہ باتیں سُن کر میرے دل کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کھُل کر نہیں کہہ رہی ہے۔ میری موجودگی تو اُس کے لئے ایک بہانا ہے۔ دراصل وہ صرف اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ اور میری یہ اُداسی اگر سچ پوچھا جائے تو صرف اُس کے لئے نہ تھی بلکہ اپنے لئے بھی تھی کیونکہ میں اُس سے باتیں کرتے ہوئے اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا ——— میں مسلسل پانچ سال سے اپنی مُتاہل زندگی کی کئی منزلیں طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے کہ مستقبل ——— جو بہت سے رِستے ہوئے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے ——— شاید میری اس ناہموار زندگی کے ڈھانچے کو بھی بدل کر رکھ دے گا۔ ویسے دیکھا جائے تو سطحی طور پر ہر چیز ٹھیک ہی تھی، کہیں کچھ غلط نہیں تھا مگر اندرونی طور پر زندگی کتنی زہر آلود تھی؟ میں نے شادی کے پہلے ہی مہینے میں یہ اچھی طرح جان لیا تھا کہ نلنی مجھ سے زندگی بھر سُکھی نہ رہ سکے گی کیونکہ میں زندگی کی دوڑ میں اُس کے نظریہ کے مطابق اُس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا ہرا بھرا گھر چاہتی تھی جس میں اُس کی حیثیت ایک خود مختار حاکم کی سی ہو ——— وہ ایک ایسی مطلق آزاد سماجی زندگی کا خواب دیکھ رہی تھی جس میں ہر چیز صرف اُسی کے محور پر گھومتی رہے۔ وہ اپنے شوہر کی کسی بھی خواہش کا احترام اپنے دل میں نہ کر پاتی تھی ——— یعنی وہ جو کچھ چاہتی تھی وہ مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ ہم دونوں میں اکثر آئے دن اسی لئے جھگڑے ہوتے رہتے تھے ——— بعض اوقات تو دیواروں سے سر ٹکرانے کی نوبت آجاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی نلنی غصّہ فرو ہو جانے کے بعد معافی ضرور مانگ لیا کرتی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی یہ شکایت بھی ہوتی کہ میں آخر اتنے معمولی معمولی جھگڑوں کے لئے ہفتوں پریشان کیوں رہتا ہوں؟ ——— شاید اُسے یہ خبر نہ تھی کہ ان باتوں کا مجھے ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں میرے ذہن پر اثر رہتا ہے۔ شادی کے دو سال ہم نے اسی طرح بسر کئے۔ اس کے بعد ہم لوگ الگ الگ جگہ رہنے لگے ——— لیکن ——— ہم جب کبھی بھولے سے بھی اکٹھے ہوتے تو ہماری وہی پرانی زندگی لوٹ آتی، حالات کے اس قدر ناسازگار اور طبیعتوں کے اس قدر اختلاف کے باوجود نلنی کو پختہ یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی میرے اور اُس کے درمیان متضاد نظریوں کی جو خلیج ہے وہ ایک دن ضرور پُر ہو جائے گی ———

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟" ——— اُس عورت نے اپنی بچّی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا

میں اپنے ماضی سے یکلخت پلٹتے ہوئے بولا:۔
"ہاں! ـــــ آپ کی باتوں نے مجھے اپنی پچھلی زندگی پر سوچنے کا نیا سبجکٹ دیا تھا۔ کچھ لوگ یقیناً ایسی خانہ بدوش زندگی پسند کرتے ہیں۔ اور شاید انہیں لوگوں میں آپ کے شوہر بھی...... !"
"میں اِس سلسلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ اپنی آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی ــــ "مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنے بہت ہی قریبی لوگوں کے درمیان جاکر بھی خود کو اجنبی اور بیگانہ پاتی ہوں۔ میں نے بارہا تنہائی میں اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ کہیں مجھ ہی میں تو کوئی نقص نہیں ہے؟ میں اتنی بڑی ہو کر بھی وہ سب کچھ نہیں جان سکی جو دوسرے بہت ہی کم عمر میں جان لیتے ہیں، تو آخر مجھ میں کچھ نقص تو ہوگا ہی ــــــ! اُن کا کہنا ہے کہ میں اتنی بڑی ہوکر بھی سماجی اور سماج کے آداب سے ناواقف ہوں"
"کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں؟" ــــ میں نے پوچھا
"کبھی سمجھتی ہوں اور کبھی نہیں" ــــــ وہ کہنے لگی۔ "لیکن ہاں! کچھ ایسے لوگ بھی ضرور ہیں جن کے درمیان جاکر میں بہت خوش ہوتی ہوں ــــــــ شادی سے کچھ دن پہلے میں کالج کی پارٹی کے ساتھ ایک ہل اسٹیشن گئی تھی، وہاں بھی تقریباً سبھی لوگوں کو مجھ سے یہی شکایت رہی کہ میں جہاں کہیں بھی بیٹھ جاتی ہوں وہیں کی ہو رہتی ہوں" ــــ پھر شاید کوئی واقعہ یاد آجانے پر کہنے لگی:۔ "مجھے پہاڑی لوگ بہت اچھے لگتے ہیں، خاص طور پر اُن کے بچے" ۔ میں اُن لوگوں سے بھی ملی ہوں اور اُن کے گھر کے لوگوں سے بھی۔ میں اُن لوگوں سے بہت جلد گھل مل گئی تھی۔ ایک پہاڑی خاندان کی یاد آج تک میرے دل سے محو نہیں ہو سکی حالانکہ میں مشکل دو گھنٹہ اُن کے ساتھ رہی تھی۔ میں نے اُن دو گھنٹوں میں اُن کے بچوں کو نہلایا دھلایا، اُن کے ساتھ کھیلی کودی بھی۔ کتنے اچھے تھے وہ بچے" ۔ ہائے پیار اُن کے چہرے کتنے سُرخ و سفید تھے، میں نے اُن بچوں کی ماں سے کہا بھی کہ وہ اپنے چھوٹے بچے "کِشنو" کو مجھے دے دیں۔ وہ پہاڑی عورت ہنستے ہوئے بولی:۔
"تم سب کو لے جاؤ بہن!۔ یہاں اِن کے لئے کون سے توشے رکھے ہیں؟ یہاں تو دو برس بعد ان کی ہڈیاں نکل آئیں گی۔ وہاں تمہارے پاس رہ کر کھا پی کر اچھے تو رہیں گے۔" مجھے اُس پہاڑی عورت کی زبان سے یہ سُن کر رونا آگیا تھا۔ میں اکیلی ہوتی تو شاید کئی دن اُن لوگوں کے پاس رہ جاتی، ایسے پُرخلوص لوگوں کے درمیان رہنا مجھے واقعی پسند ہے۔ اب تو شاید آپ بھی یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ میں کتنی عجیب عورت ہوں؟ وہ بھی بارہا مجھ کو یہ مشورہ دے چکے ہیں کہ میں جلد از جلد دماغی امراض کے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کروں ورنہ میرے پاگل ہو جانے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔"
"یہ تو اپنی اپنی نظر ہے۔" میں نے کہا۔ "میں خود بھی ایسے لوگوں کے درمیان رہنا پسند کرتا ہوں جو پُرخلوص ہوں، تصنع کی زندگی سے کوسوں دُور، یہی وجہ ہے کہ میں آج تک ایک جگہ اپنا گھر بنا کر نہیں رہ سکا اور نہ ہی اس کی آخری دم تک کوئی اُمید ہے کہ کبھی رہ سکوں گا!"
"کیا آپ کو بھی اِس قسم کی زندگی سے دلچسپی ہے؟"
اُس نے کسی قدر استعجاب لئے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔
"آپ شاید اس لئے خوش ہو رہی ہیں کہ صرف آپ ہی کو اس دنیا میں تنہا پاگل ہونے کا فخر حاصل ہے۔"
میرے اس جواب پر وہ یکلخت کھلکھلا کر ہنس پڑی، اُس کی آنکھیں تیزی سے چھلکنے لگیں۔ اس ایک لمحہ میں مجھے اس کی آنکھوں میں بہت کچھ نظر آیا ــــ اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کانپ کر ہی رہ گئے، میں بھی عجیب جواب لے کر

رہا، کچھ عرصہ کے لئے میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اور آگے کیا کہنا چاہئے۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں چمک کے بجائے افسردگی سی بھرنے لگی اور ایک ہی لمحہ میں وہ افسردگی اتنی بڑھ گئی کہ میں نے گھبرا کر اپنی نظریں اُس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

جلتے ہوئے بلب کے اِرد گرد منڈلاتا ہوا ایک پروانہ جُھلس کر بلب سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بچی نیند میں مُسکرا رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں پر اتنی دُھند جم چکی تھی کہ اب اُس میں اپنا چہرہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ دو ایک بتیاں تیزی سے نکل گئیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا اٹھا دیا، باہر سے آتی ہوئی برفانی ہوا نے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑا دی۔ گاڑی ایک ویران اور اُجاڑ اسٹیشن پر رُک گئی۔

"یہاں تھوڑا سا پانی مِل جائے گا ۔۔۔؟"

میں نے چونک کر دیکھا وہ اپنے ہولڈال سے کانچ کا ایک خوبصورت گلاس نکال کر میری طرف مُلتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو پینے کے لئے چاہئے؟" میں نے پُوچھا۔

"جی کُلی کروں گی میرے ہونٹ اور گلا خشک ہو رہا ہے۔"

"ٹھہریئے! میں تلاش کرتا ہوں شاید مل جائے!"

یہ کہہ کر میں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے لیا، اور تیزی سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ نہ جانے کون سا اسٹیشن تھا، نہ آدمی نہ آدم زاد ۔۔۔۔ بالکل ہُو کا عالم تھا۔ پلیٹ فارم پر برفانی ہوا کے تھپیڑوں سے ہاتھ پاؤں سُن ہوئے جا رہے تھے، میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے، چاروں طرف متجسس نظروں سے نل کو دیکھا، دُور پلیٹ فارم کے آخری حصّہ پر ایک نل دکھائی دے رہا تھا۔ میں تیزی سے نل کی طرف دوڑ پڑا۔ ہنوز میں گلاس میں پانی بھر ہی رہا تھا کہ انجن نے ایک ہلکی سی سیٹی دی اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ چلنے لگی، میں بھرے ہوئے گلاس کو لیکر اپنے ڈبے کی طرف دَوڑا، لیکن ساتھ ہی محسوس ہوا کہ اگر اسی رفتار سے میں دوڑتا رہا تو نہ پہنچ پاؤں گا۔ اور پھر ایسی صورت میں اِس سنسان اور اُجاڑ اسٹیشن پر یک و تنہا مجھے اِس طوفانی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے رہنا ہوگا، اِس خیال کے زیرِ اثر میں اور بھی تیزی کے ساتھ دَوڑنے لگا اور کِسی نہ کِسی طرح دوڑتے ہوئے اپنے ڈبے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا، میں نے دیکھا دروازہ کھُلا ہوا ہے اور وہ عورت دروازے میں مغموم کھڑی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی، میں تیزی سے گلاس اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فُٹ بورڈ پر چڑھ گیا۔ گاڑی کی رفتار ہلکے ہلکے جھٹکوں کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"اندر آجائیے!"

اُس کی آواز سُن کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا فُٹ بورڈ سے آگے ڈبہ بھی ہے، ڈبے کے اندر قدم رکھتے ہوئے میرے قدم کانپ رہے تھے۔ اپنی جگہ آکر میں نے ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں بند کر کے کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جب کچھ دیر بعد میرے حواس دُرست ہوئے تو دیکھا کہ وہ مُنہ ہاتھ دھو کر واپس اپنی سیٹ پر آگئی تھی مگر مُنہ ہاتھ دھو لینے کے باوجود اُس کے چہرے کی افسردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"آپ کا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟" میں نے بے اختیاری کے عالم میں اُس سے پُوچھا۔

"میں بھی کتنی منحوس ہوں" یہ کہہ کر اُس نے اپنا نچلا ہونٹ چبا لیا۔

"کیوں ۔۔۔؟"

"ابھی میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟"

"واہ — یہ خوب سوچا آپ نے!"

"نہیں میں ہوں ہی ایسی — زندگی میں سب کو دُکھ ہی دیا ہے، اگر آپ ٹرین پر سوار نہ ہو پاتے تو؟"

"تو ——— ؟"

"تو — ! اس نے اپنے ہونٹ سکوڑ لئے۔ "تو مجھے پتہ نہیں پھر....."

اُس نے اپنی آنکھیں جُھکا لیں، میں نے محسوس کیا کہ اُس کا تنفس کافی بڑھ چکا ہے، کھڑکی کا شیشہ تھوڑا اُٹھا تھا جس سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں نے شیشہ تیزی سے گرا دیا۔..

"آپ گئے ہی کیوں تھے پانی لانے کے لئے؟ — آپ نے انکار ہی کیوں نہ کر دیا۔"

اُس کے اس طرح پوچھنے پر مجھے ہنسی آ گئی۔

"آخر اس میں بات ہی کیا ہو گئی — آپ کو پانی کی ضرورت تھی نا — !"

"میں تو بے وقوف ہوں — کچھ بھی کہہ دیتی ہوں۔ آپ کو تو سوچنا چاہئے تھا۔"

"اچھا ——— چلئے میں ہی اپنی غلطی مانے لیتا ہوں۔"

یہ سُنکر اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ بھی کہیں گے کیسی لڑکی ہے۔ سچ کہتی ہوں مجھ میں ذرا بھی عقل نہیں ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں لیکن عقل ابھی بالشت بھر نہیں آئی ——— ٹھیک ہے نا ——— !"

میں پھر ہنسا

"آپ ہنستے کیوں ہیں؟" اُس نے شکایت کے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے ہنسنے کی عادت ہے۔"

"ہنسنا اچھی عادت نہیں ہے۔"

مجھے اس بات پر پھر ہنسی آ گئی۔ وہ اسی طرح سنجیدہ اور متین نظروں سے بدستور میری طرف دیکھتی رہی ——— ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی اوپر کی برتھ پر سویا ہوا آدمی نہ جانے کیوں یکایک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور سینہ دباتے ہوئے بھاری آواز میں پوچھا۔

"کیا بجا ہے بھائی ——— !"

"پونے بارہ ——— !"

"کُل پونے بارہ؟ ——— بس؟"

یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر میں پھر خراٹے بھرنے لگا۔

"آپ بھی تھوڑی دیر آرام کر لیجئے!"

وہ پیچھے ٹیک لگائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

"آپ کو نیند آ رہی ہے۔ آپ سو جائیے۔" میں نے کہا

"میں نے آپ سے کہا تھا نا! — کہ مجھے سفر میں نیند نہیں آتی۔ آپ سو جائیے!"

"اچھی بات ہے۔"

[illegible] اُس نے اپنے بستر سے ریشمی رضائی اُٹھا کر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"بڑی ٹھنڈ ہے کہئے تو کمبل بھی نکال دوں!"
"نہیں نہیں!۔ اس کی کیا ضرورت ہے میں تو ویسے ہی گرم کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔"
"اوڑھ لیجئے۔ ورنہ ٹھٹھر جایئے گا۔!"
اُس نے رضائی مجھے اچھی طرح اُڑھاتے ہوئے کہا میں خاموش جلتے ہوئے بلب کو دیکھنے لگا، جہاں جھلسا ہوا پروانہ ابھی تک چپکا ہوا تھا۔
"بتی بجھا دوں؟"
"کوئی خاص ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔
"نہیں۔ بند کئے دیتی ہوں۔ آپ آرام سے سو جایئے!"
اور اس نے اُٹھ کر بتی بند کر دی۔ میں اندھیرے میں لیٹا ہوا کچھ دیر تک اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا — سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گیا — اور جب صبح میری آنکھ کُھلی تو اُس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میرے سامنے والی برتھ خالی تھی۔ اوپری برتھ پر سویا ہوا آدمی ابھی تک خرّاٹے لے رہا تھا — وہ جا چکی تھی — گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ شیشوں سے پرے اب اندھیرا نہیں تھا — بلکہ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی — اور میں اُسکی رضائی اُوڑھے ہوئے اُس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو جاتے وقت اپنی رضائی بھی نہ لے گئی تھی — نہ جانے کیوں؟!!

(صرف مرکزی خیال موہن راکیش کی ہندی کہانی سے)

شادؔ عظیم آبادی

مستزاد

میں[1] ہوں بھی کہ ہونے کا فقط اپنے ہی دھوکا
کچھ کہہ نہیں سکتا
لو مان لیا اس کو بھی، میں ہوں، تو میں ہوں کیا
کچھ کہہ نہیں سکتا

زندہ ہے جو دنیا میں، وہ مرتا ہے مقرر
دیکھا ہے برابر
اس زندگی و موت سے ہے فائدہ پھر کیا
کچھ کہہ نہیں سکتا

اچھا جو ہے سب ہیچ، تو کیا وجہ ہے پیہم
یہ بھی تو ہے مبہم
جو سلسلہ رکھتا ہے، وہ پھر کیوں نہیں مٹتا
کچھ کہہ نہیں سکتا

یہ سلسلہ کس وقت سے ہے جاوداں یہ بھی
کس کو خبر اس کی
مذہب سے بھی الجھا یہ سلجھا کہ نہ سلجھا
کچھ کہہ نہیں سکتا

آغاز کا اس کے نہ پتہ اور نہ خبر ہے
گو سب کی نظر ہے
کون اس کا ہے بانی یہ بنا کب سے ہے برپا
کچھ کہہ نہیں سکتا

بچوں کا ہوا کھیل، کہ بوجھو یہ پہیلی
کیا اصل ہے اس کی
کھانے میں ہے پینے میں ہے کیا اس کا یہ نقشہ
کچھ کہہ نہیں سکتا

اظہار میں سچ بات کے تھی کون مضرت
کیوں دی نہ بصیرت
کیا نفع چھپانے میں ہے کیوں سب کو چھپایا
کچھ کہہ نہیں سکتا

حیوان و جمادات و نباتات بنا کر
شان اپنی دکھا کر
بے حد کئے کیوں تینوں کے اقسام مہیا
کچھ کہہ نہیں سکتا

جب عالم اسباب ہے دنیا تو سبب بھی
ہے اس کا ضروری
کس شکل سے طے پہلے سبب کا ہوا جھگڑا
کچھ کہہ نہیں سکتا

اس اگلے مسبب کا سبب پہلے بتا دو
غصہ میں نہ آ جاؤ
جب دور ہوا اس میں بھی تب کیا کوئی سمجھا
کچھ کہہ نہیں سکتا

خیر اس میں تو کر لیتے ہیں یوں اپنی تشفی
یہ مسئلہ ہے بھی
دشوار بہت عقل سے انسان کی بالا
کچھ کہہ نہیں سکتا

---

[1] عام طور پر اردو والے یہی جانتے ہیں کہ شاد نے صرف ایک رُباعی مستزاد کہی ہے ۔ دو دن میں بھری ہوئے وہ آنکھیں تری کالی کالی ... مگر واقعیت یہ ہے کہ انہوں نے چار مستزاد [illegible] اور مختلف موضوع سخن پر۔ جو حضرت عظیم آبادی [illegible] ایک مستزاد [illegible] ہے [illegible]

متین سروش

غزل

دل کے ہر داغ میں تو جلوہ نما ہو جیسے
وحشتِ عشق، ترا حسنِ ادا ہو جیسے

دل کی بے تابیاں اشکوں سے خفا ہے ایسی
زندگی دردِ محبت کی صدا ہو جیسے

اس طرح ہم نے اُسے دل میں چھپا رکھا ہے
شعلۂ غم بھی کسی گل کی قبا ہو جیسے

لذتِ زخم سے یوں ہے دلِ شیدا مخمور
ہر نفس آپ کا پیمانِ وفا ہو جیسے

اِن حوادث پہ بھی دنیا سے محبت اتنی!
دہر اک شاہدِ معصوم ادا ہو جیسے

یہ تصور ترا، یہ چارہ گری یادوں کی
دل کی دھڑکن تری گلبار نوا ہو جیسے

دلکشا ایسی کہ سجدے میں جھکا دے سر کو
صبحِ گلشن ترا اندازِ حیا ہو جیسے

پرسشِ حال کو یوں ناز کناں آتی ہے
صرصرِ غم، ترے دامن کی ہوا ہو جیسے

خندہ زن یوں مری وحشت پہ چلی آتی ہے
سایۂ زلفِ رسا، شامِ بلا ہو جیسے

رنگ یوں دشمنِ اربابِ وفا نے بدلا
وہ بھی اک بندۂ تسلیم و رضا ہو جیسے

حکم اربابِ جفا ہے کہ زباں بند رہے
دلِ خوں گشتہ ہی جینے کا صلہ ہو جیسے

چشمِ دوراں میں لرزتا ہوا آنسو توبہ!
کسی گم کردۂ منزل کی دعا ہو جیسے

یوں سراسیمہ ہے صیاد کے ہر ساز کی لے
شاخِ ہر گل میں نہاں برقِ فنا ہو جیسے

تیغِ بیداد پہ یوں شوکتِ جم نازاں ہے
یورشِ مرگ ہی انعامِ خدا ہو جیسے

سازِ افرنگ کے نغموں میں یہ بارود کی بو
محفلِ تہذیب میں ہر قتل روا ہو جیسے

ناخداؤں کو یہ ضد ہے کہ ڈبو دیں کشتی
زندگی شاملِ اجزائے فنا ہو جیسے

مرحبا حبِّ وطن، جذبۂ جاں بازِ وطن
ہر صدا دعوتِ پیمانِ وفا ہو جیسے

دوستو آؤ کرو عہدِ محبت پورا
جس کا سوز میں ڈوبی یہ ندا ہو جیسے

کیا سروش اُن سے کہیں حالِ پریشاں اپنا
ہر نظر اب تو حوادث کا گلا ہو جیسے

علی جواد زیدی

غزل

یہ شفق، یہ شام غربت، یہ غبار ہلکے ہلکے
کہیں گرد جیسے آنچل کسی ماہوش کا جھلکے

یہی یادِ یار اے دل، یہ غمِ جہاں کا حاصل
کوئی پھول ہو تو پھر بھی کوئی پھینک دے مسل کے

مرا زہر خند جرأت، سرِ دار دیکھتا جا!
جو یہاں تک آگیا تو مری دشمنی میں چل کے

ابھی اور ہاتھ کانپیں، ابھی اور ہونٹ بھیگیں
ابھی اور چاند چمکے، ابھی اور جام چھلکے

یہ عشوہ ہائے عاشقانہ، یہ حوادثِ زمانہ!
غمِ دل جواں ہوا ہے انھیں گودیوں میں پل کے

وہ لہو کے چند قطرے، شبِ غم کی کہکشاں ہیں
ترے دامنِ وفا میں جو مری پلک سے ڈھلکے

یہی سرکشی کا صحرا، یہی گمرہی کی دلدل
مرے کج مذاق ساتھی ابھی آتے ہیں نکل کے

جو ہو خار زار کوئی تو رواں دواں چلے جا
کوئی صحنِ گلستاں ہو تو گزر سنبھل سنبھل کے

وہی موجۂ حیا ہے جو اڑے ہوا سے آنچل
وہی شوخیٔ مجسّم جو کسی کے سر سے ڈھلکے

جو وہ خود پلائیں زیدی تو یہ شرط ہے عطا کی
نہ ذرا بھی ہاتھ کانپے نہ ذرا بھی جام چھلکے

قیصر قلندر

غزل

مچنواتا ہے دیواریں کرواتا ہے سنگسار
دیوانہ بنے دل کرتا ہے طے مرحلۂ دار

رنگوں کے طلسمات میں الجھا ہوا آدم
خواہش کے قفس میں رہا برسوں سے گرفتار

سناٹا رہا بھی ہے قدم گاہِ جنوں میں
ارمانوں کے لشکر ہیں سدا برسرِ پیکار

پہلو میں سلگتی ہے ابھی آنچ بدن کی
کل شب مری سوئی ہوئی قسمت رہی بیدار

پھر یادِ سرِ شام مہکتی ہوئی آئی
حالات نے پھر کھینچی ہے تنہائی کی دیوار

کس جرم کی پاداش میں سنتے ہیں ابھی تک
زنجیرِ حوادث کی تڑپتی ہوئی جھنکار

تنہا ہمیں جب چھوڑ گئے لمحوں کے راہی
جلتے رہے آنکھوں میں تمناؤں کے گلزار

پھولوں کی یہ رُت وقت سے پہلے نہ گزر جائے
لٹکی ہے ہر اک پھول پہ انجام کی تلوار

یہ کیسی ہوا تھی کہ اسی شہرِ وفا میں
جھلسے گئے راہوں میں وفاؤں کے سمن زار

ہم نے بھی نکھارا ہے لہو دے کے چمن کو
ہم بھی رہے تزئینِ بہاراں کے طلبگار

ملبوس تھا یا آبِ رواں مرمرِ جاں پر
دیکھا ہے سرِ راہِ طرب حسن کا شہکار

معصوم تمنا کی سزا پاتے رہے ہیں
لے درجِ وفا، عظمتِ فن، تیرے پرستار

ایسا بھی شبِ غم میں ہوا کرتا ہے قیصر
چھپ سادھ کے بیٹھے ہیں امیدوں کے گلوکار

مہر محمد خان شہاب مالیرکوٹلوی

غزل

آگیا وقتِ بادہ پیمائی
واہ کیا جھوم کر گھٹا آئی

تم نہ اِس کے ہوا ور نہ اُس کے ہو
کون کہتا ہے تم کو ہرجائی

آن پر جان کون دیتا ہے
ہم نے ایسی مثال کم پائی

کون کس پر نثار ہوتا ہے
کس کو آئی ہے غیر کی آئی

بات کرتے تھے پھول جھڑتے تھے
کیا ہوئی آپ کی وہ گویائی

دلِ مضطر ذرا ٹھہر بھی جا
منزلِ شوق سامنے آئی

میرے آزادیوں کے خوابوں کی
صاف تعبیر ہی نہ ہو پائی

وقت بدلا ہے، راگ بدلے نہیں
ہے وہی تیری ایک شہنائی

وقت کا ساتھ دیجئے ورنہ
دیکھئے سیفِ وقت لہرائی

داستانِ شہاب میں گویا
دل کی تصویر سامنے آئی

محسن زیدی

غزل

خوابِ گل اپنا نہ شرمندۂ تعبیر ہوا
حلقۂ موجِ صبا حلقۂ زنجیر ہوا

آتشِ گل سے کبھی آگ نشیمن میں لگی
شعلۂ برق کبھی باعثِ تعمیر ہوا

میرا فن کیا ہے ترے رُوپ کی پرچھائیں ہے
میں نے جو نقش بھی کھینچا تری تصویر ہوا

بزمِ ساقی میں ہر اک جام پہ لکھا گیا نام
نام اپنا نہ کبھی جام پہ تحریر ہوا

وہ جو اک حرف لبِ شوق پہ ہم لا نہ سکے
آیتِ دل کی وہ اک حرف ہی تفسیر ہوا

اِس اندھیرے میں ہوئی رہبر و رہزن کی تمیز
یہ اندھیرا نہ ہوا صبح کی تنویر ہوا

قیدِ زنداں میں جنوں لاکھ نہ سکے گا محسن
کب بگولہ کوئی پابستۂ زنجیر ہوا

شاہین غازی پوری

غزل

یہ کیا کہ آئے گئے ایک کج ادا کی طرح
ملو کبھی تو ملو، ہم سے آشنا کی طرح

ہم اور تم اسی دنیا کے رہنے والے ہیں
نہ بے نیاز بنو اس قدر خدا کی طرح

کچھ اور بھی دل و جاں کے قریب آ جاؤ
زمانہ گھات میں ہے دیر سے قضا کی طرح

سمجھ میں آ نہ سکے گا مزاج دنیا کا
ترے غرور کی صورت، مری انا کی طرح

خرابہ ہی دلِ وحشی سہی، مگر پھر بھی
ہے رنگ و نور سے آباد یہ خلا کی طرح

ممتاز راشد

غزل

زلف مانگے، نہ مئے ہوش رُبا مانگے ہے
شوق جینے کے لیے اور فضا مانگے ہے

چہرۂ مہر پہ تاریک گھٹاؤں کا ہجوم
اک ذرا جنبشِ دامانِ صبا مانگے ہے

زندگی گردشِ پیہم سے ہوئی یوں مانوس
غم بھی مانگے ہے تو اوروں سے سِوا مانگے ہے

ظلمتِ شب میں فروزاں نہیں کوئی پیکر
چشمِ نم آج ستاروں سے ضیا مانگے ہے

سرِ شوریدہ کو ہے پھر کسی پتھر کی تلاش
دستِ لیلائے سحر رنگِ حنا مانگے ہے

زیدی جعفر رضا

غزل

بزمِ احساس سجاؤ نہ بہت رات گئے
آنسوؤ! پیار جتاؤ نہ بہت رات گئے

یہ ابھی ٹھیک سے سونے بھی نہ پائے ہوں گے
دل کے زخموں کو جگاؤ نہ بہت رات گئے

زندگی یوں بھی گذر جائے گی مثلِ شبِ تار
شمعِ امّید جلاؤ نہ بہت رات گئے

اب کسی طفل تسلی میں نہ ہم آئیں گے
تھپکیاں دے کے سلاؤ نہ بہت رات گئے

کھول کر ذہن کے معصوم دریچوں کو مرے
وادیِ دل میں سماؤ نہ بہت رات گئے

بھوک سے [illegible]ات کسی شخص نے دم توڑ دیا
داستاں [illegible] رات گئے

دامنِ شب نہ [illegible] رہا ہو جعفر
لب پہ نغمہ [illegible] لاؤ نہ بہت رات گئے

اقبال بیجاپوری

غزل

شہر میں روزِ جزا ہو جیسے
خوف دوزخ کا لگا ہو جیسے

یوں ہے انساں اب انساں کے لئے
کوئی مرگھٹ کی بَلا ہو جیسے

زندگی یوں ہے پریشان و گم داماں
قیس صحرا میں کھڑا ہو جیسے

رات بیمارِ الم کی، ہمدم!
قتل گاہوں کی فضا ہو جیسے

یاد یوں آج تمھاری آئی
ریگزاروں کی ہوا ہو جیسے

مست اتنے ہیں خدایانِ جہاں
عرش پر کچھ نہ رہا ہو جیسے!

غم ہیں بازارِ جہاں میں ارزاں
کال خوشیوں کا پڑا ہو جیسے

ہائے اقبال یہ دُنیا اپنی
ایک بیوہ کی دُعا ہو جیسے

کامل القادری

غزل

آغوشِ صدف میں ہوں نہ دریا میں پڑا ہوں
وہ قطرۂ نیساں ہوں کہ صحرا میں پڑا ہوں
ہر قطرہ ہے خمخانۂ سرجوشِ معانی
میں بحثِ تنک ظرفیٔ دریا میں پڑا ہوں
رفتار پہ قابو ہے نہ منزل کا پتا ہے
میں خس کی طرح موجۂ دریا میں پڑا ہوں
فرصت غمِ پنہاں سے جو مل جائے تو سوچوں
اعدا میں پڑا ہوں کہ احبا میں پڑا ہوں
میں یوسفِ گم گشتہ کی صورت پسِ زنداں
صورت گریٔ خوابِ زلیخا میں پڑا ہوں
سر رشتۂ الفت کا بھرم کھل گیا آخر
دنیا سے الگ حلقۂ دنیا میں پڑا ہوں
کیا جنسِ وفا، نافۂ آہو کی طرح ہے
سر پیٹتا پھرتا، شبِ یلدا میں پڑا ہوں
اب تک یہ نشیمن ہے ہدف برقِ تپاں کا
کیا حال کہوں آگ کے دریا میں پڑا ہوں
مرنے کی تڑپ دل میں نہ جینے کی تمنا
صد موجِ خمِ زلفِ چلیپا میں پڑا ہوں
جو عشق میں کامل ہوئے پہنچے وہ سرِ دار
میں خاک بسر دامنِ صحرا میں پڑا ہوں

افتخار احمد فخر دسولوی

غزل

کیا بات ہے کہ دعوئے پیرِ مغاں سے دور
پیمانے آج بھی ہیں لبِ میکشاں سے دور
برقِ تپاں سے اور نگہِ باغباں سے دور
اک آشیاں بنائیں گے ہم لامکاں سے دور
نکلے ہیں جب فریبِ غمِ ہمرہاں سے دور
منزل تھی سامنے جو ہوئے کارواں سے دور
دل زخمہائے عشق سے اک لالہ زار ہے
رہتی ہے یہ بہار ہمیشہ خزاں سے دور
کوئل کی کوک ہو کہ پپیہے کی ہو صدا
کوئی نہیں ہے سوزِ غمِ دلبراں سے دور
انسان دشمنی کی ملے گی انھیں سزا
جو ہٹ گئے ہیں جادۂ امن و اماں سے دور
یادِ چمن نہ دل سے مگر محو ہو سکی
ہر چند ہم قفس میں ہے آشیاں سے دور
محفوظِ دستبردِ زمانہ رہیں گے وہ
جو نقش ہم نے چھوڑ دئے این و آں سے دور
ڈالیں گے چاند تاروں پہ وہ لوگ کیا کمند
دل جن کے فخرؔ رہتے ہیں عزمِ جواں سے دور

جیون لال گوہر موہو چھاؤنی

غزل

جب تری یاد سے پھوٹی نکلی کرن
لہلہانے لگے چاندنی کے چمن
نکہتِ رنگ برسا رہی ہے پون
کیا کہیں چھو کے آئی ہے اُن کا بدن
ہم نے دونوں کو بخشا نیا بانکپن
تیرے گیسو ہوں یا ہوں وہ دار و رسن
بجھ گئی کس لئے زندگی کی کرن
کیا ہوئے وہ خلوص و وفا کے چلن؟
رُوح خوشبو کی پیاسی رہے تو رہے
کیوں صبا سے چھٹے خوابگاہِ چمن
جانے کس موڑ پر آ گئی زندگی
کیوں ٹپکتی ہے چہروں سے اتنی تھکن
خونِ دل اس قدر گوہر ارزاں ہوا
مے چھلکنے لگی انجمن انجمن

ثریا محمود ندرت

غزل

اور ہی شے ہے مرا دیدۂ تر
ورنہ شبنم بھی لٹاتی ہے گہر
بزمِ رنگیں سے تمھاری اٹھ کر
جانا چاہیں بھی تو ہم جائیں کدھر
کشتگانِ شبِ غم پر اکثر
مسکراتی ہوئی آتی ہے سحر
آگہی کی ہے یہ حدِ پرواز
کاش ملتی کبھی اپنی بھی خبر
عظمتِ بادہ کشی! تیرے لئے
عشق نے توڑے ہیں کتنے ساغر
صبح کی پہلی کرن سے پوچھو
کتنے انمول ہیں شبنم کے گہر
ہر اذیت ہے گوارا دل کو
ہے عجب چیز محبت کی نظر
راہبر جانے کدھر ہیں ندرت
ہم بھٹکتے ہیں سرِ راہگذر!

مکتوبات

شمیم کرہانی ——— دہلی

"نیا دور" کے "آزادی نمبر" میں آپ کی نظم "ہم امن چاہتے ہیں!" دیکھی۔ آپ نے عوام کی دُکھ بھری آواز کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دُنیا جس کرب سے گزر رہی ہے اُسکی ایسی سچی اور موثر تصویر کشی کی گئی ہے کہ بے ساختہ مُنہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

جن لوگوں کو صحیح سماجی شعور ہے، وہی ایسی مقصدی اور فنکارانہ نظم کہہ سکتے ہیں۔

کشتی رہے سلامت، پتوار بھی نہ ٹوٹے

یا

خودداریاں نہ جھجکیں، پندار بھی نہ ٹوٹے

ایسے مصرعے اور اشعار ہیں جو شعریت کے ساتھ ذہنی تربیت کا سامان بھی رکھتے ہیں۔

مجھے اِس نظم کو پڑھ کر دلی مسرّت ہوئی۔

مسعود قمر تاباں ——— بھوپال

"شاعر" کا خاص نمبر ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ خاص نمبر نے مجھے ہی نہیں، بھوپال کے تمام ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ سالنامہ کے فوراً بعد اتنا حسین اور معیاری نمبر نکالنا، آپ ہی کا کام ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

عمیق حنفی صاحب نے تخلیق اور تنقید کے بنیادی رشتے کو تسلیم کر کے ادبی نوعیت کے مباحثوں کے لئے ایک روایت قائم کی ہے۔ یہ اُن کی عالی ظرفی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم ——— دہلی

زیدی جعفر رضا صاحب نے میرے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ درست ہے۔ مجھے واقعی چوپائی اور دوہے کے متعلق غلط فہمی تھی۔ اُن کے اعتراض کرنے پر میں نے کچھ مطالعہ کیا اور کچھ ہندی دوستوں سے پوچھا۔ چونکہ زیدی صاحب کی توجہ دلانے پر اِس موضوع پر میرا ذہن صاف ہُوا ہے۔ اِس لئے میں اُن کا شکرگذار ہوں۔

بدیع الزّماں خاور ——— دالچولی

"شاعر" کی تازہ اشاعتِ خاص دیکھ کر مسرور بھی ہوں اور حیران بھی ——— اتنے کم صفحات میں اتنی معیاری تخلیقات پیش کرنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ کوزے میں دریا کو بند کرنا اِسی کا نام ہے۔

آپ کا اداریہ اور آپ کی نظم، دونوں چیزیں اِس شمارے کی جان ہیں۔ دوسرے مضامین، نظم و نثر میں بھی کوئی تخلیق ایسی نہیں، جس کی تعریف کئے بغیر رہا جاسکے ——— ایک لحاظ سے یہ "اشاعتِ خاص" قومی و وطنی یادگار بن گئی ہے۔ ترتیب و تدوین میں بھی آپ کی مہارت قابلِ داد ہے۔ خدا کرے اب "شاعر" اِسی طرح پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے۔

قمر اقبال ——— دیجاپور (اورنگ آباد)

کل اورنگ آباد میں "شاعر" کا تازہ شمارہ دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح حصۂ نظم و نثر جاندار پایا۔ "وہ بھی" جوگندر پال کے اچھے افسانوں میں سے ایک ہے۔ جس کی تعریف اور لوگ بھی کریں گے۔ اتنا سارا معیاری مواد دیکھ کر آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف تو دشمن بھی کریں گے۔

اشتیاق بچھرالونی ——— دہلی

"شاعر" کی اشاعتِ خاص موصول ہوئی۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ایک ایک تخلیق کئی کئی بار پڑھنے کے قابل ہے۔

عبدالرحیم نشتر ——— کامٹی (ناگپور)

اتنے سادہ اور دلکش سرورق کے ساتھ، ایسی پیاری پیاری کہانیوں، نظموں، غزلوں اور عمدہ مضامین سے سجا کر خاص نمبر نکالنا کچھ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ نئی ترتیب اچھی ہے۔ اگر ہر بار اِسی طرح ترتیب رہے تو کیا بُرا ہے ——؟ یوں تو سب ہی مضامین اچھے ہیں، لیکن رشید منظر کی تخلیق زیادہ پسند آئی۔ "میں" بعد بہت اچھی نظم ہے

"چاندنی" "بیچارگی" اور آپ کی نظم "اپنی دھرتی اپنے گیت" بہت پسند آئی۔ فراق صاحب اور سردار جعفری کی غزل و نظم پرچہ کی جان ہیں۔ افسانوں میں "نیا پرانا ہندوستان" اچھا افسانہ ہے۔ "خوشامد میں آمد" اور "بستی بسنا کھیل نہیں" اچھے طنزیے ہیں۔ واہی صاحب کی نظم بھی پسند آئی۔

غرض خاص نمبر ہر طرح کامیاب، معیاری اور دیدہ زیب ہے۔

شفق بھوپالی ——— بھوپال

"شاعر" کی اشاعت خاص (اگست) دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ابھی تو آپ نے ۱۹۶۵ء کا سالنامہ نکالا تھا اور اتنی کم مدت کے بعد ہی یہ اشاعت خاص!!

"نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو!"

اشاعت خاص میں آپ کی نظم "اپنی دھرتی اپنے گیت" کو بار بار پڑھا میں تو آپکی شاعری کا بہت پرانا مداح ہوں۔

فراق صاحب کی غزل واقعی استادانہ ہے، انھوں نے اس غزل کو دو مختلف بحروں میں کہا ہے، جو جائز ہے۔ شاید کچھ لوگ تو یہ سمجھیں گے کہ غزل بے بحری ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

محترمہ آمنہ نفاست حزیں کی نظم "میں اردو" بہت خوبصورت نظم ہے۔ حالانکہ اس میں بھی کہیں کہیں ایسے مصرعوں۔

"کہیں میں ذوق کی عمر شمع کی بس اک رات"

یا ——— "مجھ سے بعد مُنع سبی اجتناب بھی ہے"

پر نظر رکتی ہے۔ شمع اور منع اپنے اعراب کے خلاف نظم ہوئے ہیں۔ پھر بھی میری طرف سے نفاست بہن اتنی خوبصورت نظم کہنے پر مبارکباد قبول کریں۔

شہاب دائروی ——— بہار شریف

آپ نے "شاعر" کا بہت پیارا نمبر نکالا۔ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ میرے افسانچہ "ناشپاتی" کی جگہ "ناشپال" اور بار بار "انکی طرح" کی جگہ "یادِ یاراں کی طرح" پڑھا جائے۔ امید کہ آئندہ آپ مجھے قارئین کی نظروں میں گرنے سے بچائیں گے۔ اس لئے کہ طباعت کی غلطی کو قارئین مصنف کی غلطی [illegible] سمجھتے ہیں۔

ظفر اوگانوی ——— پٹنہ

آپکا دعوت نامہ ملا۔ اس توجہ خاص کا شکر گزار ہوں۔

آپ نے اردو ادب کی جس طرح پُرخلوص اور بے لوث خدمت انجام دی ہے اور "شاعر" کو جس انداز میں خونِ دل سے سینچا ہے، وہی کیا کم تھا کہ اس پر اردو کی آٹھ مایۂ ناز شخصیتوں کے ادبی جائزے کا کوہِ گراں اپنے کاندھے پر اٹھانے کا عزم کر لیا لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ جیسے مردِ آہن کے لئے ہزاروں کوہِ گراں کا بوجھ ایک برگِ گل کے سوا اور کچھ نہیں۔

رام لال ندیم ——— اجمیر شریف

خاص نمبر ملا۔ علامہ سیماب مرحوم، فراق، سردار جعفری، اعجاز صدیقی اور واہی کی نظمیں غزلیں قابلِ صد تحسین و آفریں ہیں۔ "میں اُن سے ملا" انٹرویو بھی خوب ہے۔ احمد جمال پاشا کا مزاحیہ مضمون اچھا خاصا ہے۔ مجموعی طور پر "شاعر" کا "خاص نمبر" قابلِ مطالعہ اور تحسین و ستائش کا مستحق ہے۔ اب ہمیں "کرشن چندر نمبر" کا انتظار ہے۔

شیام کنول ——— ڈگلور (ناندیڑ)

"شاعر" کا مختصر مگر ہر اعتبار سے خوبصورت اور قابلِ قدر خصوصی نمبر باصرہ نواز ہوا۔ اس کے لئے مبارکباد قبول کیجیے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ وقت پر شائع ہوا ہے۔ خدا کرے آئندہ بھی "شاعر" پابندی سے شائع ہو۔

⬤ مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپکا سالانہ خریداری ماہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ختم ہو گیا ہے۔ چونکہ تین ماہ (اپریل، مئی، جون) کے شمارے شائع نہ ہو سکے، اس لئے انکی قیمت وضع کر کے سات روپیہ سالانہ چندہ لے ہوئے آپکی خدمت میں آئندہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے "شاعر" کا وی۔ پی (علاوہ محصول ڈاک) صرف پانچ روپیہ پچاس پیسہ آئندہ آپ کو بھیجا جائے گا یا آپ یہ تخفیف شدہ رقم Rs. 5/50 بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔ اس تخفیف شدہ چندے پر آپ اب آئندہ پورے سال ۱۹۶۶ء تک ماہ بماہ "شاعر" آپکی خدمت میں بدستور حاضر ہوتا رہے گا۔ یہ اطلاع آپکی [illegible]

منیجر

ادارہ

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

چونکہ نقد و نظر کے لئے سو سے زیادہ کتابیں جمع ہو چکی ہیں، اس لئے مطبوعات پر تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال نہ ہو سکے گا اور مختصر تبصرے پیش کئے جائیں گے۔ (ادارہ)

دیدۂ بینا

از ——— کوثر چاندپوری

کوثر چاندپوری، اُردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک اچھے نقّاد اور انشا پرداز بھی ہیں۔ اُن کا شمار اُردو کی صاحبِ نظر شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

"دیدۂ بینا" اُن کے پندرہ ادبی و تنقیدی مضامین کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ "غالب کا فلسفۂ زندگی" اس کتاب کا پہلا طویل ترین مضمون ہے۔ اس کی تیاری میں کوثر صاحب نے بے شمار کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کافی چونکا دینے والا ہے۔ اس میں نہ صرف وحدت الوجود اور تصوّف کے بعض نظریات سے بحث کی گئی ہے، بلکہ مثالوں کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خود غالب کا اپنا کوئی فلسفۂ زندگی نہ تھا، اُس کے یہاں کوئی واضح اور صحت مند نظریۂ حیات نہیں ملتا۔ اس مجموعہ کا دوسرا اہم مضمون "غلطیہائے مضامین" ہے۔ ریختی اور اُس کے فنکار۔ بابر کا ذوقِ جمال۔ تنقید و تجزیہ۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں آرزو بھی اچھے مضامین ہیں۔ دو مضامین طب یونانی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ تحقیقی ہیں۔ نیاز فتحپوری۔ جگر مرادآبادی، سعادت حسن منٹو اور شوکت تھانوی کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی مضامین ہیں۔ غرض یہ ایک اچھا علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کوثر چاندپوری کی زبان اور ان کے اندازِ بیان کا تو کہنا ہی کیا۔ ان مضامین سے احساس کی شدت اور فکر و نظر کی گہرائی کا صاف پتہ چلتا ہے کہ کوثر صاحب کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر ان کے نظریات صحت مند ہیں اسلام کی تعریف سے گہرے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

حجم ۲۷۰ صفحات، قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ: نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ (یو۔پی)

غالب سے معذرت کے ساتھ

از ——— احمد جمال پاشا

وہ سرزمین جس نے شوکت تھانوی کو پیدا کیا، بھلا خالی کیسے رہ سکتی تھی۔ چنانچہ کوئی پچھلے جنم کا مزاح نگار احمد جمال پاشا کے رُوپ میں پیدا ہو گیا۔ احمد جمال پاشا نے چند سال ہی میں ادبی دنیا سے اپنے طنز و مزاح کی داد لی ہے۔ اس وقت تک اُن کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

یہ نظم و نثر کا ایک نہایت دلچسپ اور خندہ آفریں مجموعہ ہے۔ اس میں پچاس سے زیادہ نظم و نثر کے ایسے مزاح پارے ہیں جن میں غالب کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ اردو میں آج سے لیکر اس وقت تک بے شمار شاعروں اور نثر نگاروں نے غالب کا حُلیہ بگاڑا ہے۔ اپنا حُلیہ بگڑوانے میں خود مرزا کو بھی مزہ آتا ہے، چنانچہ اس کتاب کے مرتب احمد جمال پاشا نے بطورِ پیش لفظ "جنّت سے مرزا غالب کی جو تحریر بتھائی کاوش کے ساتھ منگائی ہے، اُس میں بہ زبانِ مرزا غالب اور بقلمِ احمد جمال پاشا" بڑے ہی لُطف کے ساتھ اِن حُلیہ بگاڑوں کا ذکر ہے۔

غالبیات میں یہ کتاب ایک اچھا اضافہ ہے۔ طنز و مزاح کی ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر خود غالب کی روح نے اس کی خریداری کی سفارش کی ہے۔ اس کا جلد پوش بھی خوب ہے۔ حجم ۲۲۲ صفحات، قیمت تین روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

رہنمائے کتاب داری

از ——— غلام رسول

کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی زبان کیوں نہ ہو، کتب خانوں کی سماجی افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کتب خانوں میں کتابوں کو رکھنا، اُن کا اجرا کرنا، اُن کی تنظیم وغیرہ بجائے خود ایک فن ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بڑی بڑی تنخواہوں پر ماہر لائبریرین رکھے جاتے ہیں۔ اِس کتاب کے مؤلف غلام رسول خود ہسٹی کالج حیدرآباد کے لائبریرین تھے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ کتاب داری کے فن پر انگریزی میں تو کتابیں ملتی ہیں لیکن علاقائی زبانوں میں اِن کا فقدان ہے۔ اُردو میں یہ کتاب مرتب کر کے مؤلف نے ایک اچھا اور مفید کام انجام دیا ہے۔ اِس کتاب کے مندرجات کی مختصر تعریف یہی ہے کہ اِس کے مطالعہ سے کتاب داری کے فن سے کما حقہٗ آگاہ ہوا جا سکتا ہے۔ اب ہندستانی یونیورسٹیوں نے کتاب داری کے امتحانات بھی شروع کیے ہیں، یہ کتاب طلبہ کے لئے بھی مفید ہے۔

آخر میں اُن کتابوں کے حوالے کے علاوہ جن سے "رہنمائے کتاب داری" کے لکھنے میں مدد لی گئی ہے۔ بطورِ ضمیمہ ڈیوی کی اعشاریائی درجہ بندی کی تمام جدولیں بھی انگریزی زبان میں دے دی گئی ہیں۔

حجم دو سو صفحات قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔
آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی۔ حیدرآباد (اے۔پی)

نقشِ جاوداں

از ——— پرنس نقی علیخاں ثاقب

ثاقب ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال سے فکرِ سخن کر رہے ہیں۔ "نقشِ جاوداں" اُن کی دس سالہ شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اِس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ دونوں کا آہنگ تقریباً ملتا جلتا ہے۔ چونکہ وہ دورِ جدید کی پیداوار ہیں اِس لئے اُن کے خیالات میں جدید فکر کی جھلکیاں

پائی جاتی ہیں۔ بعض نظموں کی فضا اُسی طرح کی ہے جیسی مجاز وغیرہ کی تھی۔ بعض میں فکر کی یکتائی اور ذہن کی جھلکیاں ملتے ہیں۔ اُن کی غزل کے رنگ و اسلوب کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ سنجیدگی، شستگی اور صفائی کی اُن کے کلام میں کمی نہیں۔

یاد مہکے ہوئے خوابوں کے چمن آتے ہیں
دل کے نزدیک ہی شعلہ بدن آتے ہیں

اُٹھو کہ دار و رسن کا پیام آیا ہے
چلو کہ صبحِ تمنا کی رہگذر آئی

ساز پر کوئی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کے آئینوں کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

حجم ۱۲۸ صفحات۔ سرورق دیدہ زیب۔ قیمت تین روپئے۔ ناشر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان۔ حیدرآباد ۲ (اے۔پی)

پھول اور کانٹے

از ——— موہنی زُتشی

موہنی زُتشی ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی کی عزیزہ اور شاگردہ ہیں۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر و سخن کا ذوق اُن کا فطری ذوق ہے۔ اِس چھوٹے سے مجموعے میں جو کچھ ہے، وہ اُن ہی کا زائیدۂ فکر ہے اور دوسروں کی اُس میں آمیزش نہیں۔ اِس لئے بھی یہ قابلِ قدر ہے۔ موہنی صاحبہ کا رجحان نظم نگاری کی طرف ہے اور اِس مجموعہ میں زیادہ تر اُن کی نظمیں ہی شامل ہیں، غزلیں صرف آٹھ دس ہیں۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، وہ وہی ہیں جن سے موہنی صاحبہ متاثر ہوئیں۔ مثلاً نئے سال کے پیام آزادی پر مسلسل نظمیں، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو پر نظمیں، لڑکی کی شادی۔ سال کا پیغام چار نظمیں مستعمل ہیں۔ باقی مختلف موضوعات پر۔ موہنی صاحبہ کی شاعری سیدھی سادی ہے۔

پیشِ نظر ... [illegible]

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔
موہنی پرکاشن۔ ۱۱۔ وزیر حسن روڈ۔ لکھنؤ۔

ہندوستان کی تاریخ

یہ کتاب حکومت کے پبلیکیشنز ڈویژن نے چھوٹے بچوں کے لئے شائع کی ہے۔ اس کی زبان آسان اور شگفتہ ہے اور یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ ہے۔ بچے اسے ذوق وشوق سے پڑھ سکتے ہیں، اس میں جابجا تصاویر اور نقشے ہیں۔ اسے سنوں کے گراں بار نہیں بنایا گیا ہے لیکن تاریخی ترتیب کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ آخر میں تاریخیں معلوم کرنے کے لئے ایک باتصویر چارٹ دیا ہے اور اس چارٹ سے کام لینے کا بچوں کو طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔

یہ تاریخ وقت کی کہانی سے شروع ہوتی ہے اور پھر وید اور آریوں کے زمانے سے لیکر آج کے ہندوستان تک آجاتی ہے۔ ایک طرح سے یہ چھوٹے چھوٹے اسباق ہیں جو بہ آسانی بچوں کو یاد ہو سکتے ہیں۔

بڑا سائز۔ حجم ۱۹۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ پچھتر پیسے
ملنے کا پتہ:۔ پبلیکیشنز ڈویژن۔ اولڈ سکریٹریٹ ۔ دہلی۔

شیشہ و تیشہ

مرتبہ ———— مجتبیٰ حسین

شاہد صدیقی مرحوم اردو کے مشہور شاعر تھے۔ ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ جہاں شاعری میں مرحوم نہایت سنجیدہ خیالات پیش کرتے تھے، وہیں دوسری طرف روزنامہ سیاست حیدرآباد کے کالم نویس کی حیثیت سے طنز و مزاح کی محفل بھی سجایا کرتے تھے، شاہد بالطبع نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے۔ وہ جس محفل میں بیٹھے تھے اُسے زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ اُن کی طرف سے طنز و مزاح کے تیر چلتے رہتے تھے۔

"شیشہ و تیشہ" شاہد مرحوم کے اُن منتخب طنزیہ اور مزاحیہ مضامین [illegible] کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اخبار سیاست میں لکھے تھے۔ [illegible] مجموعہ کو ساہتیہ [illegible] شائع کیا ہے۔
اس کا فیصلہ تو کوئی نقاد ہی کرسکے گا کہ طنز و مزاح کی صنعت میں شاہد مرحوم کا کیا درجہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں سے ان مضامین کو دیکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ شاہد کے یہ مزاح پارے اپنے اندر لطیف مزاح لئے ہوئے ہیں۔ یہ ادبی، سیاسی اور سماجی تینوں طرح کے ہیں۔

حجم ۲۲۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ آندھرا پردیش۔ ساہتیہ اکیڈمی۔
باغ عامہ۔ حیدرآباد۔ (اے۔پی)

خطِ تقدیر

مرتبہ ———— ڈاکٹر محمود الٰہی

"خطِ تقدیر" مولوی کریم الدین کا ناول ہے، جو اردو کا پہلا نثر طرز کا قصہ کہا جاتا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۶۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا تھا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۹ء تک یعنی صرف چار برسوں میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔

"خطِ تقدیر" کے بعد ۱۸۶۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد کی "مرأۃ العروس" شائع ہوئی جو خطِ تقدیر سے زیادہ ارتقائی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بعد ناول نگاری میں ترقیاں ہی ہوتی گئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولوی کریم الدین کا ناول "خطِ تقدیر" جو ایک اصلاحی نقطۂ نظر رکھتا تھا، ذہن کر دیا گیا اور ابتدا میں اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ باقی نہ رہ سکی۔ پھر اس کتاب کا کوئی ایڈیشن شائع نہ ہوا۔

تقریباً سو سال کے بعد ڈاکٹر محمود الٰہی نے یہ کتاب شائع کی ہے اور "خطِ تقدیر" کی اہمیت اور مولوی کریم الدین کی شخصیت پر اپنے "مقدمہ" میں بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

اُردو کی قدیم اہم کتابوں کے متن اگر اسی طرح شائع کئے جاتے رہیں تو بڑا کام ہو۔

حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔

علمی — ادبی — تہذیبی — خبریں

پروفیسر ندوی اِسکالرشپ فنڈ

پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سابق صدر شعبۂ اُردو اسماعیل یوسف کالج اور موجودہ ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر اُن کی اُردو خدمات کو سراہنے کے لئے نومبر ۱۹۶۲ء میں ندوی صاحب کے سابق طلبہ اور خیر خواہوں نے ایک جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ نیز بمبئی یونیورسٹی میں ایم اے اُردو میں اوّل آنے والے طالب علم کے لئے اُن کے نام سے ایک ریسرچ اسکالرشپ کے قیام اور ندوی صاحب کے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنا بھی طے کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کے لئے [illegible] ہزار روپیہ کی فراہمی کی اپیل کی گئی ہے۔ عطیات کی رقوم — سکریٹری پروفیسر ندوی اسکالرشپ فنڈ۔ شہر دکا سل محمد علی روڈ بمبئی ۳ کے پتہ سے بھیجی جائیں۔

"اُردو ادب" کا نہرو نمبر شائع ہو گیا

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے سہ ماہی رسالے اُردو ادب کا نہرو نمبر نہایت اہتمام کے ساتھ اشاعت پذیر ہو گیا ہے۔ اس کی قیمت پانچ روپیہ ہے

کشمیری شاعر مہجور کی زندگی پر فلم

سری نگر۔ ۵ جولائی۔ مشہور کشمیری شاعر مہجور کی زندگی کی ایک پُر عکاسی کی [illegible] فلم میں عکاسی کی جائے گی۔ مقامی ادیبوں اور حکومت کشمیر کی مدد سے اس سلسلے میں پلان کو آخری شکل دینے کے لئے ڈائرکٹر [illegible] نکری اور [illegible] سا [illegible] سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ حکومت کشمیر اس فلم کے سلسلے میں کافی مدد دے گی۔

حسن دہلوی کا کلام شائع کر دیا گیا

نئی دہلی۔ [illegible] اگست۔ معلوم ہوا ہے کہ تیرھویں چودھویں صدی کے [illegible] خواجہ حسن دہلوی کا کلام تاجکستان میں شائع کر دیا گیا ہے۔ حسن دہلوی امیر خسرو کی طرح ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام نایاب ہے۔ اور اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔

عربی اور سنسکرت کے عالموں کو صدر کا اعزاز

نئی دہلی۔ ۱۴ اگست۔ صدر جمہوریۂ ہند نے ایک عربی اور چار سنسکرت کے علماء ڈاکٹر عبد المجید خاں (عربی) ڈاکٹر رادھاگو بند بساک، مسٹر سدا شیو شاستری، ڈاکٹر منگل دیو شاستری اور مسٹر ے وَنکٹیشور دکشیتلو کو اسناد اعزاز عطا کیں۔

میر اکاڈمی کی طرف سے انعام

مسٹر مقبول احمد لاری صدر آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ نے اُردو کی بہترین کتاب پر ایک ہزار روپیہ کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء کی چھپی ہوئی کتابوں کی پانچ جلدیں سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی لاری ہاؤس لکھنؤ کے پتہ پر بھیجی جائیں۔

کلیاتِ سودا کی ترتیب و تدوین

دلّی مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۶۲ء بروز دو شنبہ بزم ادب کروڑی مل کالج دلّی یونیورسٹی کی ایک خصوصی میٹنگ زیرِ صدارت ڈاکٹر خلیق انجم صدر شعبۂ اُردو کالج ہذا منعقد ہوئی جس میں سال رواں کی ادبی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ بزم ادب کی جانب سے کلیاتِ سودا کی ترتیب و تدوین کا کام سب سے پہلے کیا جائے جس کی ایک پانیدار اور جامع صورت ہو۔ اس مقصد کے لئے چند حضرات پر مشتمل ایک ادارہ کو تشکیل دے کر کام کے آغاز کے لئے ترتیب وار عنوانات کی تقسیم کی گئی۔

تاجکستان میں غالب پر کتاب

تاشقند۔ تاجکستان اکیڈیمی کے جواں سال محقق جلال اللہ صفروف کی مرزا غالب کی حیات اور شاعری پر کتاب شائع ہو گئی ہے۔

رائٹرز گلڈ پاکستان کے انعامات

پاکستان رائٹرز گلڈ نے [illegible] تصانیف پر [illegible]
[illegible] کیا ہے۔

پرنٹر پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳- نوردی اسٹریٹ بمبئی

Regd. No. B. 6082 SEPTEMBER 19

The "SHAIR" Bombay 8
(36 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURN

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیر غم	(عزائی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر، شاعر، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸

Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی

اردو کا چھتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

اکتوبر
۱۹۶۵ء

بمبئی

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

زر سالانہ	زر ششماہی	ممالک غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپے	۱۲ شلنگ	۱۰ آنے

مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۳
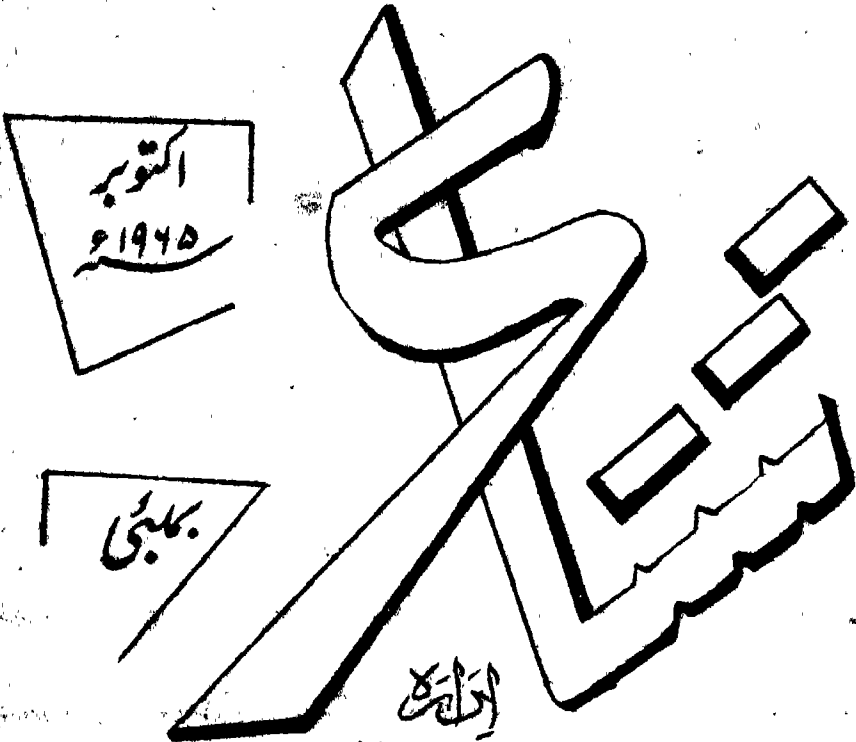
آزادی کا شعلہ
ہمیشہ روشن رہے گا
مادرِ وطن کی آزادی، یکجہتی اور
اس کے وقار کی حفاظت سے بڑھ کر
کوئی عظیم خدمت نہیں ہو سکتی
فوج میں شامل ہو جایئے

ہندستانی بک ٹرسٹ (بمبئی) کی نئی مطبوعات
کبیر بانی
مرتبہ: ——— سردار جعفری
کبیر داس کی ایک سو اٹھائیس ۱۲۸ منتخب نظمیں اور جدید اردو اور ہندی میں
ان کا مکمل ترجمہ۔ سیر حاصل دیباچہ اور حواشی۔ تصوف اور بھگتی کی مشترک
اقدار کا ذکر اور فارسی اور اردو شاعری کے اقتباسات
اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر دو رنگی طباعت
سنہری حروف کی مضبوط اور خوبصورت جلد
آج کی دنیا میں کبیر کی محبت بھری آواز کی بھی ضرورت ہے
جو انسانیت اور نیکی کی ضمانت ہے
قیمت ——— بیس روپیے
جدید اردو ادب کا انتخاب
(بارہ جلدوں میں)
پہلی جلد
رباعیاں
شائع ہو گئی
قیمت: چھ روپیے
دیوان غالب
دیوان میر

شاعر (بمبئی)

اکتوبر ۵ ۱۹۷۶ء

افکارِ اوّل

مقالات

نظمیں

ڈرامہ

افسانے

غزلیں

مکتوبات

شاعر
بڑی مسرت کے ساتھ
اردو کی آٹھ
مایۂ ناز شخصیتوں پر
علی الترتیب
نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر
پیش کرنے کا ہنگامی اعلان کرتا ہے
(۱) کرشن چندر نمبر
(۲) سردار جعفری نمبر
(۳) رشید احمد صدیقی نمبر
(۴) راجندر سنگھ بیدی نمبر
(۵) احتشام حسین نمبر
(۶) خواجہ احمد عباس نمبر
(۷) کنھیالال کپور نمبر
(۸) ساحر لدھیانوی نمبر
ان کے علاوہ دیگر
مشاہیر اردو پر بھی
شاعر
فقید المثال نمبر
پیش کرے گا
اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار
کرشن چندر
کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر
نہ صرف ہندوپاک کے مشہور قلمکاروں بلکہ دنیا کے
کئی بڑے مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات
کرشن چندر نمبر
میں پیش کئے جائیں گے
کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لاثانی تاریخ
اس کی عظمت کی کہانی
اس کی تصانیف کا جائزہ
اس کے زندہ اسلوب فکر اور
شاہکار افسانوں
ناولوں اور ڈراموں پر
تنقیدی نظر
عالمی ادب میں کرشن چندر کا مرتبہ
درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجیے
ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

سید مبارک علی جہانسوی

مرزا غالب علم الاعداد کی روشنی میں

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مرزا غالب محتاجِ تعارف نہیں۔ اُن کی شہرت عام ہے۔ دنیائے شعر و ادب میں وہ ایک ایسے ماہِ درخشاں ہیں جن کی ضیا پاشیوں سے ارضِ شعر و سخن منوّر ہے۔

علم الاعداد سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ پہلے میں اس علم کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

علم الاعداد جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اعدادِ شمار کا علم ہے۔ لیکن علم الحساب سے قطعی الگ۔ اعدادِ شمار کل نو (9) ہیں۔ ۱-۲-۳-۴-۵ ... وغیرہ۔ ابتدائے ارتقا میں یہ اعداد لین دین کی ضرورت پر عالمِ وجود میں آئے۔ تاکہ زندگی کے معاملات میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ لیکن اِن ہی اعدادِ شمار کے بطن سے ایک اور ہی قسم کے علم نے جنم لیا جو علم الاعداد (Numerology) کے نام سے مشہور ہوا۔

فیثا غورث جو ایک یونانی فلاسفر تھا۔ اس علم کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اُس نے اعداد کے متعلق ایک نظام (system) ایجاد کیا اور اُس کے مبادیات ترتیب دئے۔ فیثا غورث نے انکشاف کیا کہ:-

۱- اعداد ہماری قسمت پر حکمرانی کرتے ہیں۔

۲- تموّجاتِ سماوی (Vibrations) کا ایک مربوط نظام موجود ہے، جو حیاتِ ارضی کو کنٹرول کرتا ہے۔ واقعات و حادثات اسی نظام کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

۳- اعداد اسی نظام کے عکاس ہیں۔ اُن کی حیثیت ڈائل (Dial) جیسی ہے۔

۴- اعداد کی ایک الگ مخصوص زبان ہے۔

چنانچہ اعداد کی زبان سمجھنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے گئے۔

اعداد کو سیاروں سے نسبتِ خصوصی ہے کیونکہ سیاروں اور اعداد کی تعداد مقررہ ہے یعنی 9 ہر ایک عدد کسی نہ کسی سیارے سے منسوب ہے۔

۱-۴- شمس
۲-۷- قمر
۳- مشتری
۵- عطارد
۶- زہرہ

[illegible] نواب شمس الدین [illegible]
تاریخ میں بیان ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نواب ——— ۳
شمس ——— ۱
الدین ——— ۲
احمد ——— ۴
خان ——— ۷

۱۷ = (۱+۷) = ۸

تخت نشینی نواب شمس الدین احمد خان ۱۸۲۶ء - (۶+۲+۸+۱ = ۱۷ = ۱+۷) = ۸
پھانسی کی تاریخ ۸ اکتوبر ——— ۸
سالِ وفات اور پھانسی کا حادثہ ۱۸۳۵ء = ۸
KARIM KHAN کریم خاں کے حروف کے اعداد شمار ——— = ۸
کریم خاں کی پھانسی کی تاریخ ۸ اگست = ۸
اگر لاک رام کا قول صحیح ہے تو حادثہ کے وقت نواب کی عمر ۲۶ برس تھی ——— = ۸
نواب شمس الدین کی قسمت کا محور عدد ۸ ہے اور یہ واقعات کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے۔

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ یہ ہمارے ملک ہندوستان سے متعلق ہے۔ ہندوستان کے مشہور حملے اور جنگیں، سلطنتوں کا عروج و زوال زیادہ تر ایک ہی مخصوص عدد ۳ کے اشارے میں ہیں۔ یا اس کے ہم رشتہ اعداد ۶ اور ۹ کے دائرے میں۔ دیکھئے اعداد کس طرح ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

INDIA - ہندوستان کے حروف کا شمار ——— ۱۲ = ۳
DELHI - پایۂ تخت ہندوستان کے حروف کا شمار ——— ۲۱ = ۳
یعنی ہندوستان اور پایۂ تخت ہندوستان کے عدد ایک ہی ہیں یعنی ——— = ۳

دہلی ہمیشہ ہندوستان کا دارالخلافہ رہا ہے۔ اور یہ روایت رہی ہے کہ دہلی کے بادشاہ ہی کو پورے ہندوستان کا بادشاہ کہا جاتا رہا ہے۔ جنھوں نے یہ غلطی کی کہ ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی کے بجائے کسی دوسرے شہر کو بنایا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئے اور ان کو بالآخر دہلی ہی کو دارالسلطنت بنانا پڑا۔ اعداد سے یہ ظاہر ہے کہ دہلی اور ہندوستان ایک دوسرے کا لازمہ ہیں۔ دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی عدد (۳) لیکن پھر بھی ایک بڑا نازک اور لطیف سا فرق دونوں میں پایا جاتا ہے وہ یہ کہ یہ عدد الگ الگ اعداد ۱۲ اور ۲۱ سے حاصل شدہ ہے جو ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ اس لئے ۱۲ اور ۲۱ کو ہندوستان کے معاملات میں بڑا عمل دخل رہا ہے۔

واقعات کی ترتیب اس طرح ہے کہ اگر ابتدائے واقعہ میں ۱۲ کا عدد آیا ہے تو انتہا عدد ۲۱ پر ہوئی ہے۔ یعنی اعداد جب [illegible] برعکس [illegible] میں ہوا تو ہندوستان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور ایک انقلاب نے جنم لیا۔

بانیٔ سلطنت مغلیہ شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر در جنگ پانی پت اوّل ۱۲ اپریل ۱۵۲۶ء = ۱۲
ظہیرالدین محمد بابر کے نام کا عدد ——— = ۱۲
سلطنت مغلیہ کی حکومت کا خاتمہ [illegible] ——— = ۲۱

[illegible] جارج [illegible] ۱۹۱۱ء ———— [illegible]

[illegible] سلطنت برطانیہ کی راجدھانی [illegible] دہلی ———— ۱۹۱۱ء [illegible]

[illegible] شہنشاہ جارج ششم ۱۲ مئی ———— ۱۴

[illegible] سلطنت جارج ششم و عہد برطانیہ ۱۹۳۷ء ———— ۲۱

[illegible] کا حیرت انگیز یکسانیت ملاحظہ ہو۔

[illegible] ———— ۲۱ - سیاسی بدامنی، غدر۔

۱۹۴۷ء ———— ۲۱ - سیاسی اضطراب۔ فرقہ وارانہ فسادات

۱۹۶۵ء ———— ۲۱ اس پس منظر میں ہندوستان کا یہ اہم سال بجا ایک سوالیہ نشان بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔

یہ چند مثالیں ملک و ادب کی حقیقت اجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ چونکہ ہمارا اصل موضوعِ سخن مرزا غالب کا مطالعہ ہے۔ اس لئے ہم اُدھر [illegible] پھیرے لیتے ہیں۔

مرزا غالب اردو کے بہترین شاعروں میں سے ایک عدیم المثال شاعر ہیں۔ اُردو شعر و ادب کو اُن سے بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ غالب جیسے صاحبِ طرز شاعر شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی ایک دور کا آغاز بھی تھے اور انتہا بھی۔ مرزا کے کلام میں ایک خاص چیز پائی جاتی ہے جو کہ مطالعہ کا احساس جگا دیتی ہے۔ دوسرے شعرا کا کلام اس سے خالی ہے۔ بلند تخیل، نرالا اور تیکھا اندازِ بیان۔ صاف ستھری، نکھری ہوئی زبان۔ مربوط اور مضبوط نشست الفاظ۔ دل آویز تراکیب اور بندشیں۔ علوئے خیال اور نکتہ آفرینی کی بیک وقت جتنی مثالیں غالب کے کلام میں موجود ہیں دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ صرف شاعرانہ تعلّی ہے بلکہ حقیقت کا اعتراف بھی ہے۔ لیکن غالب کے بارے میں جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ان کو کس شے نے ایک عظیم شاعر بنا اور وہ عوامل کیا تھے جنھوں نے غالب کی شاعرانہ تخلیقات کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تو ہماری نظر زیادہ سے زیادہ وراثت، ماحول اور تربیت پر جا کر رک جاتی ہے کیونکہ عام طور سے انسان کے بناؤ اور بگاڑ میں یہی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن مرزا کا جہاں تک تعلق ہے ہم یہ پاتے ہیں کہ سوائے ایک [illegible] کے دوسری خارجی قوتوں نے مرزا کی شاعرانہ تخلیقات میں بہت کم مدد کی ہے۔ وراثت میں ان کو شاعری نہیں ملی کیونکہ بزرگوں کا پیشہ بجائے شاعری سپہ گری تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

تعلیم و تربیت:۔ مرزا کی ابتدائی زندگی جن ہنگامہ آرائیوں کی شکار رہی، اس میں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا بہت کم امکان تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی برابر ہوتا رہا۔ ملّا عبدالصمد سے فارسی پڑھنے کی روایت متنازعہ فیہ ہے۔ کیونکہ غالب نے اس بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ تلمیذ الرحمان تھے اور ملّا عبدالصمد فرضی استاد تھے۔

ماحول:۔ ماحول کے اثرات شخصیت پر گہرے ہوتے ہیں۔ لیکن مرزا غالب نے اپنے ماحول کا رنگ قطعی قبول نہیں کیا۔ بلکہ خود اپنا الگ ایک شعری ماحول تراشا جو بجائے اُس وقت کے ماحول کے مستقبل کا سنگِ میل تھا۔ لوگ حیران تھے کہ غالب کس بدعت کو جاری کر رہے ہیں۔ کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی، کلامِ غالب جن کی سمجھ سے خارج تھا۔ اور وہ اس شاعر کے طرزِ گفتار پر معترض تھے۔ غالب کی پریشانی یہ تھی۔ گر یہ مشکل و گرنہ گویم مشکل۔

اِس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وراثت، تربیت و تعلیم اور ماحول نے غالب پر [illegible]
[illegible] عوامل کو یہ اعزاز دیں کہ اُن کے زیرِ سایہ غالب یگانۂ روزگار شاعر بن گئے۔ سوائے اس کے کہ ہم [illegible]

عدد ۹ سے عدد ۳ اور ۶ سے خاص نسبت رکھتا ہے کیونکہ ان اعداد کا آپس میں [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہوتا ہے ———

۳ × ۳ ——————— = ۹

۶ + ۹   ۳۶ (۳+۶) = ۹

۶ ـ ۳ اور ۹ اعداد آپس میں ہم رشتہ ہیں۔ یہ ایک بہترین (Combination) مرکب ہے جو علم الاعداد میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب کا (Combination) مرکب اتفاق سے یہی ہے۔ اس مرکب کی نسبت سے ایک امریکی مصنف نے بڑی پتہ کی بات کہی ہے جو غالب پر سو فی صدی پوری اترتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

" 3, 6, 9 ——————— operates on the plane of talents, artistic gifts or technique in the field of craft and skill. ..... Some inspirational thoughts may suddenly flash through the mind of this individual. " *

۳ ـ ۶ اور ۹ کا مرکب میدانِ معتوسہ، میں کسی غیر معمولی ذہنی قابلیت۔ فنکارانہ عطیہ یا مخصوص ٹیکنک (طرزِ خاص) کا تخلیق کار ہے۔

اس فرد کے ذہن سے یکا یک کبھی کبھی وحیِ الٰہی جیسے افکار کا نزول ہوتا ہے۔

اسی روشنی میں ہم غالب کو دیکھتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ غالب کے اندر (Talents) غیر معمولی ذہنی قابلیت تھی۔ فنکارانہ اہلیت اور فنِ شاعری میں وہ ایک خاص تیکنک رکھتے تھے۔ وہ بے ساختہ شعر کہتے چلے جاتے تھے جیسے خیالات کا نزول ہو رہا ہو۔ غالب کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ رات کو عالمِ سرخوشی میں شعر کہتے اور ہر شعر پر کمر بند میں ایک گرہ لگا دیتے یہاں تک کہ غزل پوری ہو جاتی صبح کو ترتیب سے گانٹھیں کھول کر شعر قلم بند کر لیتے تھے۔

حاضر دماغی حد درجہ تھی۔ کلکتہ میں کسی نے ہاتھ پر چکنی ڈلی (ڈلی) رکھ دی اور غزل کہنے کی فرمائش کی۔ فی البدیہہ پوری معیاری اسلوب کی غزل کہہ دی۔ تشبیہات و استعارات اور بندش تراکیب میں یہ غزل اپنی مثال آپ ہے رسائی اور لگتہ آفرینی کا ایک نقش محکم ہے۔

عدد ۹ کی سب سے نمایاں صفت اپنی انفرادیت اور عظمت ہے جس طرح عدد ۹ دوسرے اعداد سے ضرب دئے جانے پر اپنی انفرادیت باقی رکھتا ہے اور اپنا لادستی ظاہر کر دیتا ہے اُسی طرح وہ افراد جو اس نمبر کے تحت پیدا ہوتے ہیں دوسروں میں نمایاں رہتے ہیں۔ وہ اپنی انفرادیت اور عظمت کا سکہ چلا کر چھوڑتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کی شہرت سات سمندر پار کر جاتی ہے اور صدیوں تک اُن کی شخصیت قابلِ احترام رہتی ہے۔ وہ اکثر بین الاقوامی سطح کے انسان ہوتے ہیں۔ جذبۂ انانیت ایسے افراد میں شدید تر ہوتا ہے۔ وہ [illegible] خود دار اور [illegible] مزاج ہوتے ہیں۔ "ہم من دیگرے نیست"، اُن کا خاص طرزِ فکر ہوتا ہے۔

مرزا غالب کردار و گفتار میں جس طرح منفرد تھے۔ اُس کی مثالیں نہ صرف ان کی شاعری میں ملتی ہیں بلکہ اس بارے میں ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جس سے مرزا کی عجیب و غریب شخصیت کا علم ہوتا ہے۔ وہ اپنے وضع میں اپنے زمانے کے منفرد شخص تھے۔ کہتے ہیں کہ غدر کے زمانہ میں چند گوروں نے غالب کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ کرنل براؤن غالب کے وضع قطع ایرانی وضع قطع اور کلاہ و پاپاخ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور اس نے بیزار ہو کر غالب سے پوچھا "ویل تم مسلمان ہو؟" غالب نے جواب دیا "حضور، آدھا۔ شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔"

غالب کے اندر شدید احساسِ برتری تھی۔ خودداری اور "ہم من دیگرے نیست" والا طرزِ فکر تھے غالب کے مخالفین پیدا کر دیے تھے۔ بعض اوقات غالب نے اپنی طبیعت کی اس انتہا پسندی کو برملا پیش کیا۔

[illegible] ہو چکی ہے۔ آغا خلیل [illegible] تک [illegible] بے مقصد
[illegible] نہیں کر سکتے [illegible] درمیان میں ہیں [illegible] پچھلے [illegible] سال [illegible] کی طرح
[illegible] مواد [illegible] کرتا اور متحرک کرتا) جو اُردو ادب [illegible] اِس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب میں، مقصدیت کی وکیل بن کر سامنے آئی تھی۔ اس وقت کی نظم پہ انیسویں صدی کے انگریزی رومانی شاعروں جیسے ورڈزورتھ، شیلے، کولرج اور جان کیٹس خاص ہیں، کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ جن سے اُدبا کی جذباتیت، حقیقتوں سے فرار اور ایک افلاطونی عشق کی کھوج ذہنوں پر بری طرح چھائی رہی۔ اِس رومانی رجحان کے نمائندہ شاعر اختر شیرانی کی نظموں میں زبان، تکنیک، مواد، اور اسلوب کے کئی تجربے نظر آتے ہیں، مگر ان کی نظر ستاروں کے خوابناک جال میں اُلجھ رہی اور چاند کو چھونے کی ناکام کوشش میں اُلجھے رہے۔ وہ اِس ست رنگی دھرتی کو ماں باپ کی دھرتی مان کر عشق (رومان نہیں) سے کہیں اور لے چلنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اُن کی محبوبائیں بھی دھرتی پہ چلتی پھرتی عورتوں کے بجائے ورڈزورتھ کی لُوسی یا الف لیلوی پریوں کی مانند خیالی پرچھائیاں ہی بنی رہیں۔ ایک قسم کا کھویا کھویا ماحول، اور ٹھہرا ہوا درد، حقیقتوں سے فراریت، پلوٹینک خیالی پرواز اور تخیّلی رنگوں اور خوشبو سے سجی بنی دُنیا کا خواب اس عہد کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔

اُردو میں نیا ذہن سن ۵۰-۱۹۴۶ کی دین ہے۔ یہ اُدھوری جذباتیت اور زندگی کے رومانی نقطۂ نظر کے خلاف ایک بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آزادی ایک مقصد کی طرح بھارت میں بسنے والوں کے سامنے تھی۔ جنگ آزادی صرف ایک سیاسی تحریک نہ ہو کر ایک عبادت، ایک عقیدت کا روپ دھار چکی تھی۔ ہم اپنا تمام قوتوں، جسمانی، ذہنی، اور روحانی سطحوں پر اِس تحریک میں کھوئے ہوئے تھے، اور یک نظر زندگی میں رومان اور خواب ٹوٹنے کے بجائے برٹش راج کی زنجیر کھولنے میں مصروف تھی۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ، بھگت سنگھ کی پھانسی اور سبھاش بابو کے بغاوت آمیز رویئے نے، اس آگ کو اور بھی ہوا دی۔ نظم ابتدا ہی سے رجواڑوں کی شکاریں، خلاؤں کی پتنگ اور فرصت کے لمحوں کی ذہنی عیاشی نہیں رہی تھی۔ وہ کھیتوں کی مٹی، جھونپڑیوں، بند ملوں اور دیش بھگتی کے رس کی کہانی بنتی جا رہی تھی۔ اب نظم کے قارئین کا دریچے سے جھکتے پان کے بیڑے چبانے والے نہیں تھے۔ اس کا تعلق عوام سے تھا، کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں سے — کارخانوں [illegible] [illegible] چوپال پر گائی جاتی تھیں۔ یہ رومانیت دوسری شکل میں اُبھر رہی ہے، پچھڑے ہوئے طبقوں کی برائی کا ماتم، گاؤں کی تنگ پگڈنڈیوں میں [illegible] کی کھوج، محنت کشوں کی طاقت کا بکھان، بجھے ہوئے چہروں میں ہرکلس کی آب و تاب، جہالت میں گیان کا روپ اور ایک خاص نظریۂ حیات پر اٹوٹ اعتماد زندگی کا رومانی پہلو ہی سامنے لاتا ہے۔ مگر وقت سماج اور دیش کے حالات کے مطابق یہ پہلے دور کی رومانیت اور جذباتیت کی طرح افیم کی گولی نہیں تھا .....
یہ بھی وہ نعرے [illegible] بھلے ہی ہوں مگر اِس میں جینے اور حوصلوں میں کس بل پیدا کرنے کی صلاحیت ضرور تھی۔

ان نظموں میں گھن گرج، چیخ پکار، غصہ اور طاقت تھا۔ یہ سیدھی، آسان، بیانیہ اور براہِ راست ہوتی تھیں۔ ان میں فلسفۂ حیات کی جھلکیاں، فرد کی انفرادی الجھنیں، گہری سوچ، چلتی پھرتی زندگی کی پرچھائیاں، نفسیاتی سوجھ بوجھ، اور مختلف آوازوں کے باریک فرق نہیں دکھائی دیتے۔ یہ ٹھہرے ہوئے بند پانی کی طرح ہیں۔ فرد اور سماج کے ذہنی و نفسیاتی رشتے پر ان کی نظر کم ہی پڑتی ہے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کی تخلیقات اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ن۔ م۔ راشد کا مجموعۂ کلام 'ماورا' اِس سطحیت اور [illegible] کے خلاف پہلی آواز تھی۔ جس نے اپنے سے پہلے دور کی بہت ساری آوازوں کو اپنے میں جذب کر لیا تھا۔ راشد، میرا جی، اور کہیں کہیں مقام بھی [illegible] اپنے ڈھنگ، تیور اور لہجے کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ فرد بازی کے شور میں بھی دھیمے دھیمے رنگوں میں [illegible] دور میں سانس لیتے، متوسط طبقے کی کشمکش، الجھنوں اور اقتصادی حالات کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ [illegible] فرد کا تعلق سماج سے زندہ اور نفسیاتی ہے۔ سردار جعفری، نیاز حیدر، کیفی اور مجروح کی نظر انسان کے [illegible]۔

اختر لبستوی

احمد جمال پاشا کا فن

جس طرح بعض بادل یکایک افق کے کسی گوشے سے سر ابھارتے ہیں اور پھر پلک جھپکنے میں سارے آسمان پر چھا جاتے ہیں اسی طرح کچھ اہل قلم بھی اچانک دنیائے ادب میں نمودار ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے معروف ہو جاتے ہیں۔ نوجوان مزاح نگار احمد جمال پاشا کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ انتہائی چونکا دینے والے انداز میں اردو رسائل کے صفحات پر نمودار ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے جاننے کون سی جادو کی چھڑی گھمائی کہ چند ہی سال میں اُن کا شمار اردو کے اچھے ادیبوں میں ہونے لگا۔ اس اعتبار سے پاشا صاحب کو طنز و مزاح کی مملکت کا جولیس سیزر کہا جا سکتا ہے جس نے دعوے کیا تھا "میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے فتح کر لیا۔"

اُن کی اس حیرت انگیز شہرت اور مقبولیت کو یہ کہہ کر نا قابل اعتنا نہیں قرار دیا جا سکتا کہ چونکہ اردو ادب میں مزاح نگاروں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ہر ایرا غیرا نتھو خیرا چند الٹے سیدھے مزاحیہ مضامین لکھ کر اپنا لوہا منوا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اچھے مزاح نگاروں کی کمی کے باوجود ہماری مزاح نگاری کا معیار اتنا بلند ہے اور اس صنف میں اتنی بیش بہا تخلیقات موجود ہیں کہ کوئی شخص آسانی سے اس میدان کا رستم نہیں بن سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ پاشا صاحب کی اٹھان ہی کچھ غیر معمولی تھی۔ انھوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں "اکبر ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" جیسا کامیاب مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد اُن کے دو اور مضامین "رستم و سہراب کے میدان میں" اور "ادب میں مارشل لاء" شائع ہوئے جنھیں پڑھنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ احمد جمال پاشا کو نظر انداز کیا جا سکے۔

پاشا صاحب کی مزاح نگاری کی ابتدا جتنے شاندار طریقے سے ہوئی تھی اتنے ہی حیرت انگیز طور پر انھوں نے فنی معاملات میں بھی ترقی کی۔ "اسکالر" کے پاشا کو "اندیشۂ شہر" کا پاشا بننے کے لئے جن مدارج سے گزرنا پڑا ہے انھیں عام طور پر لوگ پندرہ بیس سال میں طے کرتے ہیں لیکن پاشا صاحب نے صرف نو دس برس کی مختصر سی مدت میں وہ پختگی حاصل کر لی جو اچھے فن کا روں کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہے۔

احمد جمال پاشا کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ حقیقت ایک عام پڑھنے والے پر بھی روشن ہو جاتی ہے کہ وہ مزاح نگاری کے تمام فنی نکات اور ان کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ مزاح پیدا کرنے کے جتنے بھی طریقے ممکن ہیں اور دنیا کے بڑے مزاح نگار اپنے قارئین کو ہنسانے کے لئے جو طریقے اختیار کرتے رہے ہیں وہ سب پاشا صاحب کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ تبسم کا جادو جگانے کے لئے کسی ایک ہی طریقے کو بار بار نہیں استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک ماہر جادوگر کی طرح جگہ اور موقع کی مناسبت سے ہتھیار تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ آئیے ذرا پاشا صاحب کی اس خصوصیت کا تفصیلی جائزہ لیں۔

مزاح پیدا کرنے کا ایک بہت ہی کامیاب طریقہ "لفظوں کی بازی گری" ہے۔ اگرچہ کہ مزاح نگاروں میں یہ طریقہ بہت عام اور مقبول ہے۔ آپ کو اس زبان کا شاید ہی کوئی ایسا مزاح نگار ملے جو Pun سے Fun پیدا کر کے الفاظ کی الٹ پھیر سے مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑنا نہ جانتا ہو۔ لیکن احمد جمال پاشا کے مضامین میں مزاح نگاری کا یہ حربہ جس [illegible]

اس مضمون کے چند فقرات کے بارے میں بشیر بدر نے لکھا تھا۔

"ادب میں مارشل لاء نافذ ہو جانے والا مضمون ہے۔ اس میں جگالی کا فن عروج پر ہے۔"

(ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ، فروری مارچ ۱۹۷۰ء)

کچھ لوگوں کو یہ شکایت بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں کئی مقامات پر طنز کی دھوپ کافی تیز ہو گئی ہے۔ یہ الزام عائد کرتے ہوئے انھوں نے مضمون کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

"ایک مشہور افسانہ نگار جن پر الزام ہے کہ جب تک وہ ماہ بیتے مونگ پھلی کھاتے، دہی بڑوں کے پتے چاٹتے، بیڑی پیتے فٹ پاتھوں پر آوارہ گھومتے، فاقہ مستی اور معمولی ملازمت کرتے تھے بڑے شاندار افسانے لکھا کرتے تھے مگر جب سے ان کو عزت، شہرت اور دولت ملی وہ فلمی دنیا میں چلے گئے تو جاتے وقت وہ اپنے ساتھ میں اپنا قلم بھی لیتے گئے جس سے اب وہ خواب سے خواب افسانے لکھنے کی مشق کر رہے ہیں چنانچہ ان کو مجبوراً اسی ملازمت پر اس تنبیہ کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا کہ اگر اب بھی اچھے افسانے نہیں لکھے تو آیندہ ان کو اس سے بھی معمولی نوکری پر تعینات کیا جائے گا۔ ایک ان سے بھی زیادہ ممتاز افسانہ نگار جو کسی زمانے میں تار گھر میں کلرکی کرتے تھے اور شاندار افسانے لکھتے تھے۔ شہرت اور دولت راس آنے پر ان کو بھی ظلم ہو گیا تھا اور انھوں نے پڑھنے لکھنے سے توبہ کر لی اور بالکل اچھے ہو گئے۔ ان کو بھی وارننگ دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے جلد ہی اس پہلے جیسی افسانہ نگاری نہ شروع کر دی تو ان کے پرانے تار گھر ان کو بذریعہ تار واپس بلا لیا جائے گا۔ اسی ضمن میں ایک مشہور افسانہ نگار خاتون بھی آتی ہیں جو پہلے کسی اسکول میں استانی تھیں اور غضب کے افسانے لکھا کرتی تھیں مگر جب سے انھوں نے کسی فلم ساز سے شادی کر لی اور فلمی دنیا سے لاکھوں روپے کمانے لگیں تب سے غافل ہو گئی ہیں۔ ان استانی جی کو ان کے پرانے اسکول میں دس ایک سو میں روپے والی پرانی جگہ پر واپس بھیجنے کو خوب انتظامات کر رہا ہے۔ ویسے ان سب پر بحیثیت مجموعی دولت اور شہرت راس نہ آنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔"

مندرجہ بالا عبارت میں بکر صاحب کو طنز کی دھوپ محض اس لئے تیز محسوس ہوتی ہے کہ "بات ذاتیات تک پہنچ گئی ہے"۔ مگر میں ان کی رائے سے متفق نہیں ہوں کیونکہ میں اس کلیہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ ذاتیات پر حملہ کرنا ہر حالت میں معیوب امر ہے۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی حرکات و سکنات کا سماج پر گہرا اثر پڑتا ہے اور اکثر ان کی نازیبا عادتوں کی بھی تقلید ہونے لگتی ہے۔ ایسی شخصیتوں کو طنز کا نشانہ بنانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض "بڑے لوگوں" میں علم و ادب کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ دولت کے چکر میں پڑ کر یا دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے جال میں پھنس کر ان صلاحیتوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ ایسے حضرات پر بھی طنز کا تیر چلانا لازمی ہوتا ہے کیونکہ ان کی بے راہروی کی وجہ سے دنیائے علم و ادب خسارے میں رہتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں جن جن حضرات پر طنز کا وار کیا گیا ہے وہ سب اسی قسم کی شخصیتیں ہیں۔

احمد جمال پاشا کی تخلیقات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں افادیت اور مقصدیت کا پہلو قوی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ایسی کوئی بھی تخلیق فن کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتی جو مقصدیت سے عاری ہو۔ طنز و مزاح نگاری کو میں ان وجوہ کی بنا پر فنون عالیہ میں شمار کرتا ہوں ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مزاحیہ ادب کا کوئی عظیم شاہکار گہری افادیت کے بغیر جنم نہیں لے سکتا۔ کیونکہ معیاری مزاح کے لئے مقصد کا پس منظر ضروری ہوتا ہے۔ موجودہ اردو ادب کی ایک بدقسمتی یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور جیسے [illegible] ادیبوں کو چھوڑ کر اردو کا کوئی مزاح نگار اس اہم نکتہ کو نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اردو کے بیشتر مزاح نگاروں کی ذہنیت وہ ہے جسے کلیم الدین احمد "ظریف گری یا مسخرانہ ذہنیت" کہتے ہیں۔ احمد جمال پاشا کے متعلق میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ وہ [illegible] ہیں یا ان کے تمام مضامین شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی بیشتر تخلیقات میں مقصدیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ان کی کتاب "اندیشۂ شہر" شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ آپ کو ایک بھی مضمون ایسا نہیں ملے گا جو محض مزاح برائے مزاح

کا الزام عائد ہوتا ہے۔ "معتقد" کا مقصد ان بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا ہے جو ادبی اصطلاحات پر شعر کہنے کے سلسلے میں عمل میں آتی ہیں۔ "ادب میں مارشل لاء" میں ادب جدید اور ادب اسلامی کی گمراہی اور کج روی کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ "یونیورسٹی کے لڑکے" میں طلباء کی متکبرانہ نیز عادات، ناگفتہ بہ حرکات اور قابل مذمت مصروفیات کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ "مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں" ماڈرن سوسائٹی کے ان لفاظ لیڈروں کی نقاب کشائی کرتا ہے جو سیدھے سادے لوگوں کی جیبوں پر شب خون کر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ "رستم امتحان کے میدان میں" ہندوستانی اسکولوں کی بدنظمی یہاں کے طریقۂ تعلیم کی خرابی اور ماسٹروں کی بے راہ روی کو طشت از بام کرتا ہے۔ "پھر سے اک چائے کی پیالی نے کہا" میں ان شاعروں، افسانہ نگاروں، کھلاڑیوں، فلم بینوں، رئیس زادوں، اخبار نویسوں اور سیاست دانوں کا مذاق اڑایا گیا ہے جن کا دائرۂ عمل میخانوں سے چائے خانوں تک محدود ہے۔ "غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے اسباب" میں افواہ اڑانے والوں کی ٹانگ کھینچی گئی ہے ———— غرض کہاں تک عرض کروں ہر مضمون "مزاح برائے مقصد" کا بہترین نمونہ ہے۔

احمد جمال پاشا کے فن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ابھی ان کا شمار نئے لکھنے والوں میں ہوتا ہے اس لئے اگر میں اپنے مضمون میں اس سے زیادہ لکھ دوں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ لوگ میرے بارے میں کچھ اور نہ سوچنے لگیں۔

اس لئے آخر میں صرف اتنا کہہ کر تمام شد لکھ دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ پاشا صاحب نوجوان نسل کے ایک اہم مزاح نگار ہیں اور ان سے اردو ادب کو بڑی امیدیں ہیں۔

مدت خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپکا سالانہ چندہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء میں ختم ہو گیا ہے۔ چونکہ تین ماہ (اپریل مئی جون) کے شمارے شائع نہ ہو سکے اس لئے ان کی قیمت منہا کر کے سات روپیہ سالانہ چندہ کے بجائے آپکی خدمت میں آئندہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۶۵ء کا شاعر وی پی (علاوہ محصول ڈاک) صرف پانچ روپیہ آٹھ آنے کا بھیجا جائے گا یا آپ یہ تخفیف شدہ رقم Rs. 5/50 بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔ اس تخفیف شدہ چندہ ہی میں آپ آئندہ پورے سال سنہ ۱۹۶۶ء تک ماہ بماہ "شاعر" آپکی خدمت میں بدستور حاضر ہوتا رہے گا۔ یہ اطلاع آپکی بھرپور توجہ چاہتی ہے۔ - منیجر

سردار جعفری

ہمارے نام

ستارے آسماں پر نقرئی حرفوں سے لکھتے ہیں
تمھارا نام، تاریکی کے سینے پر اُبھرتا ہے
یہی تارے تھے، جن کو جوڑ کر، مُدّت ہوئی تم نے
اندھیری رات کے ماتھے پہ میرا نام لکھّا تھا
یہ نورانی فرشتے، ناچ اُٹھے تھے، مُسکرائے تھے
تمھاری ایک انگشتِ حنائی کے اشارے پر
ہمارے جسم گیلی گھاس کی شبنم سے تر ہو کر
فرازِ آسماں سے کہکشاں کو کھینچ لائے تھے
نظر کانپی تھی، لبِ نا آشنا لب تھرتھرائے تھے

زمیں پر میں بھی تنہا ہوں، زمیں پر تم بھی تنہا ہو
ہجومِ بزمِ یاراں میں، ہجومِ غمگساراں میں
ہزاروں فاصلے ہیں منزلوں کے رہگزاروں کے
ہزاروں فاصلے دریاؤں کے اور کوہساروں کے
ہزاروں فاصلے ایسے کہ ناپے جا نہیں سکتے
مگر نیلی فضا میں آسمانوں کی بلندی پر
ہمارے نام ہیں دو دوست، دو معشوق، دو عاشق
جنھوں نے پیار سے باہوں میں باہیں ڈال رکھّی ہیں
یہ روشن دائرے، ہیروں کی محرابوں کے سائے میں
کبھی جا کر ثریّا سے کبھی زُہرہ سے ملتے ہیں
کبھی کرتے ہیں باتیں ماہ و مرّیخ و عطارد سے
کبھی تو تیرتے ہیں کہکشاں کی گہری جھیلوں میں
نہاتے ہیں کبھی رنگِ شفق کے آبشاروں میں

لیے پھرتی ہے ان کو گردشِ شام و سحر لیکن
یہ دامِ گردشِ شام و سحر کو توڑ دیتے ہیں
یہ لافانی ستارے، عصرِ حاضر کا مقدّر ہیں
زمیں، رقاصۂ افلاک کے ماتھے کا جھومر ہیں

کبھی دہلی، کبھی شیراز پہ یہ جگمگاتے ہیں
کبھی لندن، کبھی نیویارک پر یہ مسکراتے ہیں
کبھی یہ ماسکو کے سر پہ تاجِ نور رکھتے ہیں

کبھی یہ دشمنوں کی سرحدوں کو پار کرتے ہیں
کبھی چشموں، کبھی باغوں کو جھک کر پیار کرتے ہیں
پروتے ہیں کبھی زلفوں میں موتی مہ جبینوں کی
کھٹکتے ہیں کبھی نظروں میں اپنے نکتہ چینوں کی
کبھی یہ جھانکتے ہیں اک عروسِ نو کی آنکھوں میں
کبھی مشعل بکف بے آسرا مایوس راتوں میں
کبھی بھٹکے ہوئے رہرو کو یہ رستہ دکھاتے ہیں
کبھی ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر ڈوب جاتے ہیں
کبھی یہ کھڑکیوں پر پھول کی صورت برستے ہیں
کبھی اپنی بلندی سے زمیں والوں پہ ہنستے ہیں
کبھی یہ کھیلتے ہیں مہ وشوں سے، ماہ پاروں سے
بلاتے ہیں کبھی بچوں کو آنکھوں کے اشاروں سے

کبھی بڑھتی ہوئی فوجوں کے اوپر سے گزرتے ہیں
جنازوں میں شہیدانِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں
نکھرتے ہیں کبھی کشمیر کے یہ لالہ زاروں میں
کبھی گنگا کی موجوں میں، کبھی جمنا کے دھاروں میں
کبھی تبدیل ہو جاتے ہیں آتش میں، شراروں میں

جلا سکتی نہیں جنگوں کی آگ اِن ماہتابوں کو
بجھا سکتی نہیں بارود روشن آفتابوں کو
ہمارے نام حرفِ خیر و برکت، نور و نزہت ہیں
ہمارے نام امن و آشتی، عشق و شرافت ہیں
ہمارے نام جنگ آلودہ و خونخوار دنیا میں
اشارہ آدمیت کا ہیں، نیکی کی ضمانت ہیں
ہمارے نام طاقت ہیں، لطافت ہیں، صداقت ہیں
ہمارے نام لافانی و روحانی مسرت ہیں
ہمارے نام، تاریکی کے سینے پر ابھرتے ہیں　　اندھیری رات کے بے نور ماتھے پر چمکتے ہیں

اعجاز صدیقی

کربِ خود کلامی

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ جوں جوں شدّت اختیار کرتی گئی، میری بے چینیاں بڑھتی گئیں اور دل و دماغ پر اُس کے سخت ناگوار اثرات پڑتے رہے۔ اُسی شدید اور المناک تاثر نے یہ نظم کہلوائی۔ نظم میں نے ستمبر کے پہلے ہفتہ میں شروع کی تھی۔ ۱۵ کو یہ مکمل ہوئی۔ اِس لیے ستمبر کے شاعر میں شائع نہ ہو سکی۔

ہر چند یہ طویل نظم میری اپنی زندگی کا مرثیہ ہے۔ لیکن اِس میں بہت سی دوسری زندگیوں کی کہانی بھی ہے۔ یہ میرے ہی دُکھ اور درد کی ترجمان نہیں ہے بلکہ تمام امن پسند حسّاس فنکاروں کی آواز ہے۔ جنگ بندی کے اقدامات کئے جا چکے ہیں، مگر کھنچاؤ بدستور ہے۔ شاید میرے دل کی یہ دردناک چیخیں ہند و پاک کے عوام تک ہوتی ہوئی اُن سربراہوں تک پہنچ جائیں جن کے ہاتھوں میں دونوں مُلکوں کی قسمتیں ہیں ——— اعجاز

اے مرے قلبِ شکستہ، مرے ژولیدہ دماغ!
اے مرے ٹوٹتے اعصاب،
مری ڈھلتی عمر!
اے مرے شدّتِ امراض سے چٹخے ہوئے جسم،
میری کم ہوتی ہوئی بینائی!
میں نے دن رات چلایا ہے قلم،
رنج و غم میں بھی، خوشی میں بھی، علالت میں بھی،
ایک پل بھی نہ تھکا،
کسی صورت نہ رُکا،
راہ دُشوار تھی، پُرخار تھی، چلتا ہی رہا۔
میں نے کھائی تھی قسم!
تاج کی، قلعہ کی، جمنا کی، اور اپنے فن کی،
اپنے اجداد کی عظمت کی قسم!
اپنے اُس "قصرِ ادب"[1] کی جس کو
قہقہے، والدِ مرحوم[2] نے یوں بخشی تھیں،
جیسے لَوٹ آئے ہوں — پھر میر و نظیر و غالب
مجلسیں شعر و ادب کی ہر سُو،
محفلیں عیش و طرب کی ہر سمت،
بزم آرائی احباب، وہ میلے ٹھیلے![3]
اختر و میکش و دلگیر و شباب و مظہر
بزم و ارمان و صبا، نجم و امام،
شاہد و منظر و محمود و لطیف و رعنا،
کوکب و شوخ و تاثر، تابغ و شام،
احتشام اللہ و محبوب و مغیث،
طاہر و قادری، کنزرو و فریدی و مجاز

---

[1] قصر الادب آگرہ

[2] علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

[3] یہ سب اُس دور کے آگرہ کے بعض اساتذۂ سخن اور بعض نوجوان شعرا۔ خادم علی خاں اختر۔ مولوی محمد علی شاہ میکش۔ [illegible] الدین دلگیر۔ حکیم [illegible] شباب۔ [illegible] حسین مظہر [illegible]۔ مرزا عاشق حسین بزم [illegible] ارمان آفریدی۔ [illegible] صبا۔ مرزا [illegible] حسین نجم [illegible]۔ حافظ [illegible] الدین شاہد [illegible]۔ منظر صدیقی۔ سید محمود [illegible]۔ لطیف اللہ [illegible]۔ [illegible] رعنا۔ ماسٹر یعقوب علی خاں کوکب۔ سید [illegible] حسین شوخ۔ ضیاء الدین تاثر۔ [illegible] تابغ۔ [illegible] احتشام اللہ [illegible]۔ سید محبوب حسین محبوب۔ [illegible] الدین [illegible]۔ [illegible] مولانا [illegible] حسن قادری۔ [illegible] حسین فریدی مجاز لکھنوی۔

اکبر آباد میں شمعیں تھیں فروزاں کتنی!
اصفہانی شمعوں سے تھی شعر و ادب کی زینت۔
پھر ہوا ایسی چلی —
نہ وہ شمعیں ہی رہیں اور نہ رہے پروانے!
بے رونق بزم گئی،
منتشر ہو گئے اربابِ وطن،
کچھ ہوئے نذرِ اجل،
کچھ وطن چھوڑ گئے
جسم تقسیم ہوئے،
روح اور قلب کی تقسیم ہوئی!
ہر طرف آگ کے طوفان نظر آنے لگے،
خون سے سرخ ہوئے کوچہ و بازار سبھی —!

بمبئی[1] کھینچ کے لے آیا مجھے عشقِ وطن،
یوں وطن چھوٹ گیا۔
عشق تو یوں بھی جنوں پیشہ و آوارہ ہے!
خاک و خوں میں بھی بکھرنے سے اسے عار نہیں،
"بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"
میرا ایمان یہ تھا،
میرا ایمان یہ ہے،
——،
ہند کا کوئی بھی خطہ ہو، وطن ہے میرا۔
پھر بھی بے چین تھا، بے تاب تھا، مغموم تھا دل،
اپنے اُس مولد و مہبط سے جدا ہونے پر،
رات کی رات کٹا قافلۂ صبحِ بہار —!!
آنکھ سے اشک رواں،
لب پہ آہوں کا دھواں،
کوئی مونس تھا نہ غم خوار رہا نہ ہمدم کوئی،
باپ کی موت کو اک سال ہی بس گزرے تھے!
بھائی بھی چھوڑ گئے،
خالی گھر بھی جدا ہوتا گیا ——!!
اور احباب و اعزا نے بھی منھ موڑ لیا۔
وہ بھرا گھر ——!
وہ مرا "دفترِ شوق"[2]
جس میں بے شبہ ہزاروں ہی کتابیں ہوں گی،
ایک انبار خطوط اور رسائل کا تھا،
سیکڑوں نادر و نایاب و اہم مخطوطے!
سب وہیں چھوڑ دیے،
اور وہ "ردّی" میں بکے!
وقت ہی جبرِ سیاست نے کہاں اتنا دیا؟
کہ وہ محفوظ کہیں ہو جاتے،
ساتھ جو کچھ بھی لیا، وہ بھی تو اپنا نہ رہا۔
بمبئی آنے کے بعد ——
خانہ ویرانی کی سب نذر ہوا —!
اُس پہ ہنستے تھے مسافر خانے،
ہوٹلیں اُس کا اُڑاتی تھیں مذاق،
کبھی مہمانوں سے گھر جس کا بھرا رہتا تھا —!
بمبئی میں نہ ملی اُس کو پناہ،
جس کے ہمراہ تھے چند اور بھی "معصوم نفوس"
عیش میں جھولے ہوئے، نازو نعم کے پالے!
——،
مدتوں خانہ بدوشوں کی طرح،
کبھی اِس گھر کبھی اُس گھر میں رہا!

وقت چلتا رہا، چلتا رہا، چلتا ہی رہا،
زخم بھرتے رہے، رِستے رہے، تڑپاتے رہے،
اور مسافر نے کسی موڑ پہ مانی نہ شکست!
درد کو جھیل لیا،
پیار کیا زخموں کو،
دلِ خوددار کو ہر حال میں خوددار رکھا۔
ضبط سے کام لیا،

---

[1] ۱۹ نومبر ۱۹۵۸ء کو میں نے آگرہ سے بمبئی ہجرت کی [illegible] بعد ازاں [illegible] انتقال فرمایا۔

[2] "قصرِ ادب" دفترِ مشاورت آگرہ۔

شمعِ کردار کو بجھنے نہ دیا،
سیکڑوں سخت مراحل آئے
اَن گنت حادثے دل پر گزرے،
حادثے ایسے، کہ انسان تو کیا ——
ہوں فرشتے بھی تو برداشت جنھیں کر نہ سکیں،
آسماں بھی نہ جنھیں جھیل سکے۔

"دفترِ شوق" کو پھر جمع کیا،
تھا جو مانندِ دلِ صد پارہ،
وہ جو کھائی تھی قسم، اے مرے ژولیدہ دماغ!
اُس کی حرمت کو بہرحال بڑھا کر چھوڑا۔
خدمتِ شعر و ادب،
خدمتِ قوم و وطن ——،
ایسی خدمات کہ "تاریخِ ادب" یاد رکھے۔
اُس زباں کے لئے ہر چیز کو قربان کیا،
اوّلاً جس کی حفاظت کی قسم کھائی تھی،
جس کی خاطر نہ کیا کوئی بھی "پیغام" قبول،
عزّت و جاہ کا،
اور ترکِ وطن کا پیغام،
سب کو ٹھکرا ہی دیا،
مامتا ہو، کہ ہوا احباب و اعزّا کا خیال۔
یوں شب و روز کیا اپنے فرائض کو ادا،
ہوتیں "خود کار مشینیں" بھی،
تو وہ تھک جاتیں ——!
انگلیاں خوں میں دانستہ ڈبو لیں اپنی،
سُرخ رُو تا کہ رہے صبحِ وطن،
اور بڑھتی ہی رہے،
شانِ وطن،
آنِ وطن ——،

ایسی نظمیں، تری تخلیق ہیں، اے میرے دماغ!
بھول سکتی نہیں جن کو، کبھی تاریخِ وطن،
ایسی غزلیں ادبِ عصر کو دی ہیں تو نے،
دھڑکنیں وقت کی سب، جن میں سمٹ آئی ہیں،
جن کے مصرعوں میں فروزاں ہیں حقائق کے چراغ
جن سے چھَن چھَن کے نکلتا ہے نئی زیست کا نور،
جن میں اک درد ہے،
اک کرب ہے،
بے چینی ہے ——،
جو اُمیدوں کی پیامی ہیں، یقیں کی ضامن،
جو روایات سے،
بغاوت کا پتہ دیتی ہیں۔
جن کا اسلوب نیا، فکر نئی، طرز نئی،
اپنے ہی دور کی عکاس و نمائندہ ہیں جو۔
پھر بھی،
افسوس کہ مہلت نہ ملی،
اِس شب و روز کی مصروفیتِ پیہم سے۔
ان میں کچھ اور اضافے ہوتے!
کھُل کے اب تک نہ ملے فکرِ سخن کے موقعے،
اک تڑپ ہے،
جو کبھی شعر میں ڈھل جاتی ہے،
شاعری اِس کے سوا کچھ بھی نہیں!
——،
نہ بنی "پیشہ ورانہ" یہ کبھی —
روشنی کتنے چراغوں کو عطا کی اب تک!
کتنے پھولوں کو تر و تازہ کیا،
کتنے غنچوں کو تبسّم کی ادائیں بخشیں،
کتنے ذہنوں کو شعورِ ادب و شعر دیا،
اور —— اپنے لئے کچھ بھی نہ کیا —!!
مانگتے رہتے ہیں لوگ ——،
میری "انجیلِ سخن"، میری متاعِ افکار،
میرے مخلص، مرے نقّاد احباب،
چاہتے ہیں کہ مرے فن پہ لکھیں،
میرے افکار و خیالات پہ تنقید کریں،

دین مجھے دادِ سخن —
بے نیازی مری فطرت ہے مگر، کیا کیجے۔!!
"نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا"[1]
ہائے، یہ مسلکِ خاموش زدگی!
خود پہ لکھنے کی کسی کو کبھی زحمت ہی نہ دی۔
———،
اپنے اجداد کی خدمات کا کیا ذکر کروں؟
ایسی خدمات تو تاریخِ ادب میں کم ہیں،
بھول بیٹھی ہے مگر ان کو بھی دنیائے ادب!
کل مجھے بھی یہ بھلا دے،
تو تعجب کیا ہے!
کارناموں پہ مرے پھیر دے پانی یکسر۔
اور اک یہ بھی حقیقت ہے کہ،
اے میرے دماغ!
نہ مرے پاس وہ نظمیں ہیں، نہ غزلیں ہیں نہ گیت،
داد جن کی مجھے اربابِ نظر نے دی ہے۔
دفن یہ سب ہیں رسائل کے اُن انباروں میں،
گھر میں جو فرش سے چھت تک ہیں لگے۔
یہ مرا کلبۂ غم — میرا چھوٹا سا مکان؟
یہ پلنگ، اُس پہ یہ تکیے، یہ خطوط اور فائل!
یہ مرا "تختِ ادب"!
جس پہ برسوں سے فروکش ہوں میں،
ہر طرف گھر میں کتابوں کے، رسائل کے ہیں ڈھیر،
مسودے "چند لفافوں" میں چھپے رہتے ہیں،
ایک میرا ہی نہیں،
ان میں وہ قیمتی "سرمایۂ سیماب" بھی ہے،
جو دل و جاں سے زیادہ ہے عزیز —
کون اس قیمتی سرمائے کی تدوین کرے؟
کون — اس فکر کی اذیت سے دلاتا ہے نجات!
کس کو یہ فکر، اک آوارۂ خدمت کے لیے،
کوئی رہنے کو [illegible] مکان ہی مل جائے

[1] غالب

یہ حسیں شہر،
یہ اغراض کا تابندہ دیار ——— !
جس میں ہر سمت ہے، سرمایہ و محنت کا تضاد،
جس میں بکتا ہے خلوص۔
چند سکّوں کے عوض،
جسم بھی بک جاتے ہیں!
حسن عشوہ کا نگر ———
دوست ہی دوست نظر آئیں گے، جن سے ملیے،
اور کوئی دوست نہیں ——— !!!
پھر بھی یہ شہر، نئے دور کی اک جنت ہے،
وہ بے سکونی میں بھی جس کی، ہیں سکوں کے آثار۔
گلشنِ شعر و ادب،
مرکزِ فن ———
ہے بجا،
اس کو اگر "مامنِ اردو" کہیے۔
[1] جعفری، کرشن، مہندر، عصمت،
ساحر و بیدی و عبّاس و شکیل و مجروح،
کیفی و اختر الایمان و نجیب و قیسی
قرۃ العین و شہاب و باقر،
دسنوی، واجدہ، ظوئے،
جاں نثار اختر و سلمیٰ و پریم،
وجد و سرشار و ثنا و شاہد،
حسرت و ناظم و راجہ و خمار ——— !
اور بھی کتنے ہی،

[1] سردار جعفری۔ کرشن چندر۔ مہندر ناتھ۔ عصمت چغتائی۔ ساحر لدھیانوی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ خواجہ احمد عباس۔ شکیل بدایونی۔ مجروح سلطانپوری۔ کیفی اعظمی۔ اختر الایمان۔ سید نجیب اشرف ندوی۔ عزیز قیسی۔ قرۃ العین حیدر۔ مولانا ظہیر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی۔ باقر مہدی۔ سید شہاب الدین دسنوی۔ واجدہ تبسم۔ ظ۔ انصاری۔ جاں نثار اختر۔ سلمیٰ صدیقی۔ پریم وار برٹنی۔ سکندر علی وجد۔ سرشار سیلانی۔ ڈاکٹر [illegible]۔ شاہد علی خاں۔ حسرت جے پوری۔ [illegible] ناظم۔ راجہ مہدی علی خاں۔ خمار بارہ بنکوی۔

کسی صورت یہ گھنے جنگ کے بادل چھٹ جائیں،
ظلمتِ شب سے نمودار ہوں آثارِ سحر،
ہاتھ انسان کا انسان پہ نہ اُٹھے!
کتنی تذلیل ہے انسانیتِ کبریٰ کی — ؟!
"ایٹمی طاقتیں" — یہ بات سمجھتی ہی نہیں!
سامنے ان کے ہے انجام مسولینی کا،
اور ہٹلر کے بھی انجام سے یہ واقف ہیں،
آنے والی نئی نسلیں، یہی سوچیں گی — کہ یہ
عہد میں اپنے تھے، چنگیز و ہلاکو سے سوا —
آج تو امن کی پیاسی ہے یہ ساری دُنیا،
کیوں نہ سب مل کے کریں امن کے پرچم کو بلند،
ایشیا ———
امن کا سنگم بن جائے،
ایشیا ———
امن کا پرچم بن جائے۔

خرمنِ امن و مسرت کو نہ تاراج کرو،
ایک اک دانے کا انسان کو نہ محتاج کرو!
سرحدیں میرے وطن کی نہ چھوؤ —،
لوٹ بھی جاؤ —!
یہ نہ سمجھو ———،
کہ یہ ہے صرف "مرے گھر" کا سوال،
جابرو ———
اپنے گھروں کے بھی بجھاؤ نہ چراغ —!
جال مغرب کی سیاست نے جو پھیلایا ہے،
مجھے اندیشہ ہے، تم صید نہ اُس کے ہو جاؤ،
دعوتیں اور تباہی کو نہ دو،
کام کچھ عقل سے لو،
ہند تک ہاتھ محبت کا بڑھاؤ!
یہ کہ در اس میں "مسلمان" بھی تو بستے ہیں؟
"کلمہ گو" ہیں جو تمھاری ہی طرح —!
"ملک سے اپنے جنھیں عشق بھی ہے پیار بھی ہے۔

———
ہند تھا پہلے تمھارا بھی وطن — اے لوگو!
اِس میں اَسلاف تمھارے بھی ہیں آسودۂ خواب،
اِس میں اب بھی وہ مساجد ہیں،
مقابر ہیں،
جنھیں ———
اک نئے دیش کو جاتے ہوئے تم چھوڑ گئے،
اِس میں اب بھی ہیں،
وہ تقدیس بھری درگاہیں،
سر تمھارے بھی عقیدت سے جہاں جھکتے ہیں!
اُن کی جنت کو جہنم نہ بناؤ؟
" اپنی جنت کے تحفظ کے لئے "
ایک مدت سے کھڑے ہیں جو سرِ بیم و رجا —!

ہند اور پاک جنھیں کہتے ہیں،
ایک ہی بحر کے دو دھارے ہیں،
ایک ہی پیڑ کی ہیں دو شاخیں،
ایک ہی پھول کی دو مُسکانیں۔
ایک ہی ساز سے نکلے ہوئے دو راگ ہیں یہ،
پُرسکوں ہو کے بہیں —
سبز و شاداب رہیں —
مُسکراہٹ نہ چھنے، ان کے لبوں سے یا رب!
اِن کے نغمات سے ہستی کی فضائیں گونجیں،
ان کے تہذیب و تمدن میں "بہت فرق" نہیں —
ایک ہے بُدھ کی روایت کا امیں،
کرشن کا بھگت،
بُدھ تھے پیغمبرِ امن،
کرشن بھی لائے تھے امن اور محبت کا پیام،
اور گاندھی نے بھی تعلیمِ اہنسا کی دی —
دوسرا ———
پیرو دینِ اسلام،
مذہبِ اسلام،

کہ دُنیا سے مٹایا جس نے،
بربریت کا چلن۔
جس نے اخلاق و محبت کو بہت عام کیا،
جس کی تعلیم ہے، تعلیم مذاہب کا نچوڑ۔
جس نے واقف کیا دُنیا کو نئی قدروں سے،
قدرِ انساں کو سمجھنے کا دیا جس نے شعور۔

———،

سیکڑوں سال رہے بن کے جو بھائی بھائی،
مشترک قدریں ہے، اخلاق و محبت جن میں،
ایک وابستگی رکھتے ہیں ابھی جن کے عوام۔
آہ ———،
ماضی کی وہ قدریں بھی مٹی جاتی ہیں!
گردنیں شرم و ندامت سے جھکی جاتی ہیں!

ایشیا،
ہند کی عظمت پہ رہا نازکناں،
آج بھی ———
ہند ہے، اک طرّۂ اقوامِ جہاں،
یہ مذاہب کا مہکتا ہوا گلدستہ ہے،
اور مذہب کا، کسی پر نہیں کوئی بھی دباؤ۔
سب ہیں آزاد،
کہ "جمہوریت" اِن کی ہے اساس۔

ایک میں ہی تو نہیں ہوں فنکار۔؟
اور بھی سیکڑوں فن کار یہاں بستے ہیں،
فکر اور فن کا نہیں جن کے جواب۔

فن کے خلّاق و پرستار ہیں دونوں ہی طرف،
آج ———
فن کاروں سے دُنیا کے، ہے تہذیبِ جہاں،
یہی تزئینِ جہاں ہیں،
یہی تقدیرِ جہاں ہے
میری یہ دُکھ بھری آواز کوئی پہنچا دے،
میرے ہم فکر ———
مرے دَور کے فن کاروں تک۔
"اُن کا جو فرض ہے، وہ اہلِ سیاست جانیں"
"میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے"[1]

خیر ہو، میرے وطن کی یا رب!
تاج کی خیر،
ایلورا و اجنتا کی خیر،
خیر فن کی بھی ہو ———،
فن کار کی بھی ———،
خیر زردار کی،
نادار کی بھی،
خیر بے ہوش کی،
ہُشیار کی بھی،
خیر ———
میرے لبِ گفتار کی بھی!
ہُوں سراسیمہ و مغموم و اُداس،
اے مرے قلبِ شکستہ، مرے ژولیدہ دماغ ———!!!؟

---

[1] جگر مرادآبادی

ظہیر نگلتائی

ہم امن کے پجاری ـــــ!

ہم پرستارِ محبت ہیں، محبت کی قسم
ہم اہنسا کے پجاری ہیں صداقت کی قسم
دشمنِ ظلم و تشدد ہیں شرافت کی قسم
جنگ بربادیٔ گیتی ہے، حقیقت کی قسم

پھر بھی وقت آنے پہ تلوار اُٹھا سکتے ہیں
دشمنوں کا سرِ مغرور جھکا سکتے ہیں
رزم میں جان کی بازی بھی لگا سکتے ہیں
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹا سکتے ہیں

اپنی دھرتی سے عقیدت ہے محبت ہے ہمیں
امن سے پیار ہے اور جنگ سے نفرت ہے ہمیں

حق کو باطل سے کبھی مات نہ کھانے دیں گے
ہم اہنسا پہ کبھی آنچ نہ آنے دیں گے

جنگ تو نام ہے دنیا میں زیاں کاری کا
جنگ پیغام ہے نفرت، کا دل آزاری کا
جنگ اظہار ہے طاقت کی فسوں کاری کا
پیش خیمہ ہے زمانہ میں عزا داری کا

لہلہاتے ہوئے گلشن کو بچانے کے لئے
راحت و امن کے ایوان سجانے کے لئے
دہر میں شمع محبت کی جلانے کے لئے
جنگ کا نام زمانے سے مٹانے کے لئے

جنگ تخریب کا مدفن ہے، ہمیں ہے معلوم
جنگ تہذیب کی دشمن ہے ہمیں ہے معلوم

اپنی خلوت سے بہر حال نکلنا ہو گا
کارواں لے کے نئے عزم سے چلنا ہو گا

طرب افشانیٔ فردا پہ یقیں ہے ہم کو
امنِ مستقبلِ دنیا پہ یقیں ہے ہم کو
قوم کے دیدۂ بینا پہ یقیں ہے ہم کو
ہیں وہ ملّاح کہ دریا پہ یقیں ہے ہم کو

موج و طوفانِ حوادث سے گذر جائیں گے
روشنی بن کے شبِ غم میں ابھر جائیں گے

تبسم صدیقی مستی پوری

اے مری جانِ غزل!

(محاذِ جنگ سے ایک خط)

میری محبوب! مری جانِ غزل! رُوحِ وفا!
اپنے مکتوب میں تو نے یہ شکایت کی ہے
کہ یہاں آ کے تجھے بھول گیا میں شاید!
لیکن اے جانِ وفا! تجھ سے محبت ہے مجھے
میں نے اِس جذبِ محبت کی عبادت کی ہے
اور محبت ہی وہ جذبہ ہے جسے کہئے خدا
دونوں عالم میں نہیں کچھ بھی محبت کے سوا
میں نے چاہا ہے تجھے! میں نے سراہا ہے تجھے
میں نے تیرے لب و رُخسار کی پُوجا کی ہے
تیرے قدموں پہ لُٹائے ہیں عقیدت کے گہر
بڑی حیرت سے یہ دُنیا مجھے دیکھا کی ہے
جب کبھی آتا ہے ترے پیکرِ سیمیں کا خیال
میری دُنیائے تصوّر میں بہار آتی ہے
تیرے ترشے ہوئے ہونٹوں کی دِل آویز ہنسی
برق بن کر مری تخئیل میں لہراتی ہے

تو سمجھتی ہے مجھے تیری ضرورت نہ رہی!
گرمیٔ شعلۂ رُخسار کی حاجت نہ رہی؟
خط بھی لکھتا ہوں تو خوشنودیٔ خاطر کے لئے؟
یعنی اب پیار میں پہلی سی وہ شدّت نہ رہی؟
میری جانب سے جو مشکوک ہے تو جانِ وفا!
یہ ترا وہم ہے اور وہم کا درماں کیا ہے؟
کاش اے رُوحِ وفا! تجھ کو دکھا سکتا میں
ایک نشتر سا یہ نزدیکِ رگِ جاں کیا ہے؟
مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے وہ ترا سوزِ درُوں
جس سے ہو اُٹھتا ہے رہ رہ کے ترا دِل پاگل

میری محبوب! ترا پیار مُسلّم ہے مگر
آسمانوں پہ ہیں چھائے ہوئے خونیں بادل
ابھی خطرے میں ہے یہ "عزت و ناموسِ وطن"
ابھی خطرے میں ہے "تہذیب و تمدّن کا چمن"
ابھی خطرے میں ہے "دامانِ ہمالہ کا وقار"
ابھی خطرے میں ہے "پاکیزگیٔ گنگ و جمن"
ابھی خطرے میں ہے یہ چشتی و نانک کی زمیں
ابھی خطرے میں ہے یہ تاج و اجنتا کا غرور
ابھی خطرے میں ہیں گوتم کے مقدّس سپنے
ابھی خطرے میں ہے رامائن و گیتا کا غرور
ابھی خطرے میں ہے یہ غالب و تلسی کی بہشت
ابھی خطرے میں ہے یہ رام و کنہیا کا نگر
ابھی خطرے میں ہے "میرا کا بھجن، سُور کا سوز"
ابھی خطرے میں ہے یہ کالی و ٹیگور کا گھر
ابھی خطرے میں ہے کشمیر کے عارض کا گلاب
ابھی خطرے میں ہے بنگال کے گیسو کی گھٹا
ابھی خطرے میں ہے کاشی کی سحر، شامِ اودھ
ابھی خطرے میں ہے پنجاب کے چہرے کی ضیا

نغمۂ عشق سُنانے کا ابھی وقت نہیں
تجھ کو سینے سے لگانے کا ابھی وقت نہیں
اک ذرا گردشِ حالات کو تھم جانے دے!
جنگ کی اُٹھتی ہوئی گرد کو جم جانے دے!
پھر ترے ریشمی آنچل کے خنک سائے میں
نیند آئے گی مجھے چین سے سو جاؤں گا
تیری مستی بھری آنکھوں سے [illegible] پی کر
میں ترے جلوۂ صد رنگ میں کھو جاؤں گا

لذّتِ سنگ

یادیں کبھی خوبصورت اور کبھی بدصورت رُخ اپنا کر جب ترتیب پاتی ہیں تو دل کی جن دھڑکنوں پہ زندگی کی اُمیدیں قائم ہوتی ہیں وہی روگ بن جاتی ہیں۔ رُوح کا تعلق براہِ راست دل سے ہے۔ رُوح مر گئی، دھڑکنیں رُک گئیں دِل بجھ گیا ——— دل بجھ گیا اور ابدی اندھیروں میں کھو گیا۔

اگر میں ایک سنگ تراش ہوتا، تو اپنی زندگی کے ابدی اندھیروں میں اُس پتھر کی تلاش کرتا، جس نے کچھ خوبصورت اور کچھ بدصورت یادوں کو ترتیب دے کر مجھ سے میرا ماضی چھین لیا۔ میری روح چھین لی۔ ماضی اور رُوح دونوں ایک دوسرے کے متلاشی ہیں۔ پر اب اُن کی تکمیل کیسے ہوگی۔ اُن کا ملاپ کہاں ہوگا۔

خودکشی ——— ؟!

کہتے ہیں خودکشی بُزدلی ہے۔

سُنا ہے خودکشی بہادری ہے۔

کون سچا اور کون جھوٹا۔ میں بُزدلی اور بہادری کی داستان میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف اُس لمحے کو ایک بار پھر اپنی نظروں کے سامنے دہرانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فرار کا راستہ اپنانے کی بات سوچی تھی۔ شام اُتر رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ [illegible] رہا تھا۔

تم جب چلے گئے۔

تب دوپہر تھی۔

[illegible] آ [illegible] کے [illegible] تھا۔

دھوپ بہت تیز تھی۔

[illegible] ختم [illegible]، اپنے [illegible]

[illegible]

کھڑکی سے۔

شاید تم کو ڈھونڈ رہی تھی۔

کہاں تھے تم

وہ امرت کہاں تھا جسے پا کر میں تمہیں اپنے اندھیرے [illegible] تم چلے گئے تھے

تب دوپہر تھی۔

اور ....!

اور میں نے دیکھا، ایک طویل کمرہ تھا، سنگِ مرمر کا، سنگِ مرمر کے بُت تھے۔ سنگِ مرمر کی تصویریں تھیں۔ اور سنگِ مرمر [illegible] اور بے داغ چہرہ تھا۔

زلیخا نے کہا

"جانتے ہو پھر کیا ہوا"

میں نے نفی میں گردن ہلا دی

"کہتے ہیں یوسف زلیخا کو چھوڑ کر سنگِ مرمر کے اُس ماحول سے بھاگ آیا۔"

"کیوں" میں نے پوچھا۔

"کہتے ہیں زلیخا یوسف سے عمر میں بڑی تھی۔"

"عمروں کے تفاوت میں کیا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کیا رکھا ہے، [illegible] دیکھ لو [illegible]

بالکل اسی طرح پروان چڑھتی جا رہی ہیں۔ جس طرح [illegible]

جتنی [illegible] نے [illegible] دور کرتی ہے۔ میں [illegible]

[illegible] گہرائیوں میں [illegible] ———

[illegible] یوسف [illegible] خوبصورت [illegible]

ایک عورت سے عشق کرتا ہوں۔ جس کی عمر چالیس سال ہے۔ اور جو مجھ سے دس سال بڑی ہے۔ اور جس کا نام زلیخا ہے۔

زلیخا ـــــــ !

ہاں زلیخا جس کی آنکھوں میں گردش کرتی ہوئی سحر انگیز پتلیاں جیسے جگمگاتے ستارے بکھیر رہی ہوں۔ جب وہ ہنستی ہے تو لگتا ہے۔ جیسے پھولوں کا جگر کٹ رہا ہو۔ جب وہ انگڑائی لے کر میری طرف دیکھتی ہے تو محسوس ہوتا ہے۔ جیسے سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی وینس کی مورتی گلاب کی بیلوں کا سہارا لے کر میری طرف تک رہی ہو۔ رنگین لباس میں اُس کا وہ بھیگا بھیگا، سمٹا سمٹا سا بدن، ایسا محسوس ہوتا ہے، شفق جیسے زعفران میں نہا کر آئی ہو۔ اُس کی سانسوں کی خوشبو میں عمر خیام کی رباعیوں جیسی مہک پھوٹتی ہے۔ اور اس کے ماتھے پر گری ہوئی لٹ جیسے کائنات کے حسین چہرے پر رات کی چادر ڈھلک آئی ہے"

"کون ہے وہ ـــــ" اُس نے پوچھا۔

"زلیخا ـــــ"

وہ شرمائی، اُس کا سر جھک گیا۔

میں جانے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو ـــ"

"زلیخا کی تلاش میں ـــ"

"کون ہے تمہاری زلیخا ـــ"

"آئینے میں اپنی صورت دیکھ لو، شاید نظر آ جائے ـــ"

میں جس پھول کی تلاش میں نگر نگر، بستی بستی گھوم رہا ہوں، وہ پھول اب تک کھِل نہ سکا۔ مجھے صرف اُس کی خوشبو محسوس ہوئی ہے۔ اپنے شہر کی اُس ویران گلی میں جہاں زلیخا رہتی ہے ـــــ میں بھی کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ اپنے گلابی رنگ کے بیڈ روم میں اپنے سنگِ مرمر جیسے سپید بستر پر جانے کب کی سو چکی ہوگی۔ جانے کونسا خواب دیکھ رہی ہوگی۔ اور میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں۔ اپنے کمرے کی اُس کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا سامنے والے مکان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ جہاں اب شفقو رہتی ہے۔ اور جہاں کبھی سُرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی زیتون رہا کرتی تھی۔ زیتون کی شادی ہو چکی ہے۔ اِس کھڑکی سے زیتون کو میں نے آخری بار اُس وقت دیکھا۔ جب وہ سُرخ جوڑا پہنے اپنے نئے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی تھی۔ اور اُس کا مہندی میں رنگا ہوا نازک سا ہاتھ اپنے ماتھے کی طرف اُٹھا تھا۔

الوداع ـــــــ میں جا رہی ہوں ـ

الوداع ـــــــ !

اور اسی رات زیتون ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی گئی۔ اب یہاں شفقو رہتی ہے۔ شفقو زیتون کی چھوٹی بہن ہے۔

شفقو !

تمہارے نازک بدن کی لچک دیکھ کر بے اختیار شالیمار کے کسی سرو کے ساتھ بادِ نسیم کا اٹکھیلیاں کرنے کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ سرو جیسے نازک بدن پر تمہارے سینے کی رعنائیاں دیکھ کر بے اختیار انگڑائیاں جنم لینے لگتی ہیں۔ تمہارے بکھرے بالوں پر گمان ہوتا ہے۔ جیسے کالے بھونروں کا جھرمٹ گھٹا بن کر نظروں کے سامنے چھا جاتا ہے۔

زلیخا مجھ سے دس سال بڑی ہے ـ

شفقو مجھ سے دس سال چھوٹی ہے ـ

عمروں کی تفاوت میں کیا رکھا ہے۔ پر میں کس قدر کمینہ ہوں ـ

میرا چھوٹا بھائی زلیخا کو جانتا ہے۔ اور اس کی عزت کرتا ہے۔ میں بھی شفقو کو جانتا ہوں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا چھوٹا بھائی اس کا ہم عمر ہے، دونوں ایک دوسرے کو قریب سے جانتے پہچانتے ہیں۔ میں پھر بھی رات کے دھندلکوں میں وقت بے وقت شفقو کو دیکھنے کی آرزو میں رہتا ہوں ـ

میرے چھوٹے بھائی !

تم نہیں جانتے کہ ایک دن شفقو بھی اپنی بہن کی طرح سُرخ جوڑا پہنے اسی کھڑکی سے تمہیں سلام کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی اور کو اپنا لیگی۔ پھر یہ کھڑکی ہمیشہ کے لئے ویران ہو جائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے زیتون مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بھی میری طرح کسی چالیس سالہ زلیخا سے عشق کرنا پڑے اور کسی ان دیکھے سے میں ..... !

بات خودکشی کی ہے۔ وہ لمحہ تو گذر چکا ہے جب میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُسی لمحے کی یادیں ترتیب پا چکی ہیں۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔

میں یہ ہوش و حواس تحریر کرتا ہوں کہ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ

کیا ہے۔ آدرشوں عقائد سے کسی کا کوئی تعلق نہیں۔ میری موت کے
بعد میرے بارے میں کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ میں اپنی
موت کا خود ذمہ دار ہوں۔

یہ میرا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے۔ میری انگلیوں میں دبا ہوا
یہ قلم کیوں تھر تھرا رہا ہے۔ اب تو صرف دستخط کرنے رہ گئے ہیں۔
دستخط ہونگے تو اس تحریر میں جان آئے گی۔ ورنہ یہ تحریر بے جان
ہے۔ بے رنگ ہے اور........!!

"کون ہے تو؟"

"میں تمہاری روح کی آواز ہوں۔"

"لیکن میری روح تو مر چکی ہے"

"روح کبھی نہیں مرتی"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو"

"زندگی بڑی حسین ہے، اسے اپنا کر پیار کر لو"

"اب تک اپنا کر کیا ملا"

"اپنے ماضی کے دھندلکوں میں جھانکو، شاید نظر آجائے"

"میرا ماضی تو ترتیب پا چکا ہے۔ اب وہاں رکھا ہی کیا ہے"

"تو تمہارا خودکشی کا فیصلہ اٹل ہے"

"ہاں"

کوئی آواز نہیں ———— کوئی آواز نہیں۔

"سنو—"

"کون"؟

"تمہارے ماضی کی آواز"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو"

"خودکشی کرنے سے پہلے اپنے ماضی کی یادوں کو پھر سے
ایک بار بے ترتیب کر لو"

"پھر"

"پھر زندگی سے فرار حاصل کرنا بھی چاہو تو......؟!"

(وہی خاموشی — ایک خاموشی — یہ آواز کہاں کھو گئی)

رات کافی جھک آئی ہے اب، اور میں سونا چاہتا ہوں
اپنے ماضی کی یادوں کو ایک خواب کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔
نیند کس کے بس میں ہے۔ یادوں کے تیز جھکڑ میں یوں بھی سونا
ممکن ہے۔ خیال کے بادل بچھوں پر چھپے ہوئے تھے کے پھر سے

کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتے ہیں!!
تم جب چلے گئے۔
تب دوپہر تھی............

ہاں شاید تب دوپہر تھی جب میں ایک اجنبی بن کر زلیخا
کے شہر کی ویران گلی سے چلا آیا تھا۔ روشنی کی تلاش میں،
لیکن مجھے اندھیرے نے ڈس لیا۔ جو ڈھونڈتا ہے وہ کھو جاتا
ہے۔ میں نے زلیخا کو ڈھونڈا اور اپنے آپ کو کھو دیا۔
کھویا ہوا آدمی ہمیشہ تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی جرم ہے اور اس
جرم کی سزا بھی تنہائی ہے!

رات اور جھک آئی ہے اور مجھے وہ نشگی بیٹھے والی
عورت شدت سے یاد آرہی ہے۔ جسے میں نے سلطنہر کے
ایک بڑے ہوٹل میں ایک شام دیکھا تھا۔ ڈل کے کنارے
پہاڑوں کی گود میں ہوٹل کا دلکش لان شام کی رعنائیوں میں
بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ نیچے ہلکی ہلکی سحر انگیز ہواؤں کے ساتھ
ڈل کی چنچل لہریں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ اور اوپر ہوٹل کے
بڑے لان میں کوئی ایک دیو قامت چنار کے تلے ادیبوں،
شاعروں، مصوروں، سیاست دانوں، افسروں اور فلمی
اداکاروں کی ایک بڑی پارٹی رنگ و بو کے ایک بے ہنگم
طوفان میں گھری رعنائیاں بکھیر رہی تھی۔ مردوں کی بلکیت ہنسی،
حسین تتلیوں کے نقرئی قہقہوں کی جھنکار، چست لباس میں جسم
پھاڑ رہا تھا، جوانیاں بکی جا رہی تھیں، جسموں کا اشتہار
چھپ رہا تھا۔ اور میں اس غبار آلودہ ماحول میں بھی ایک دیا
گل کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔
چوڑیوں کا ساز بجا ہے!
میں لوٹ آیا اور اپنی پہلی ہی نظر میں نشگی بیٹھے والی عورت کو
تلاش کیا۔ وہ صوفہ پر بیٹھی تھی۔ اور لگتا تھا جیسے خلا میں کچھ
پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب
کیا۔ خلا نہیں تھا۔ قلم اٹھائے کا ایک بیرہ تھا۔ جو اپنی کرسی
میں کھڑا اسے اشارے کر رہا تھا۔
میں نے ضمیر کا ہاتھ دبایا۔
"کون ہے یہ"
"تم نہیں جانتے"

۔ نہیں آتے۔

۔ بڑی کچرڈ لیڈی ہے۔ ان کی مسز ــــ"

اور جو میں نے ان کی طرف دیکھا۔ تو ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ان کو تو میں بخوبی جانتا تھا ــ ایک بہت بڑے آفیسر حلیم، ملنسار اور خوبصورت ــــ کھڑکی میں کھڑے اس ہیرو سے بھی خوبصورت ــــ

ایک اور اشارہ ہوا، دبا دبا سا، ایک اور لمحہ گذرا آہستہ آہستہ، وہ صوفے سے اٹھ کر اندر ہوٹل میں چلی گئی ــ میں نے پھر شبیر کا ہاتھ دبایا۔ اور ہم دونوں کی نظریں بے ساختہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ ہیرو اب وہاں نہیں تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا جو ہیرو سے خوبصورت تھے۔ شبیر نے کہا

"قسمت کی بات ہے ورنہ میں بھی کشمیر کا شمّی ہوں ــ"

اور بے ساختہ ایک سراپا نگاہوں کے سامنے پھر گیا ــ ریشم جیسا نرم اور ملائم ــــ لالی کچرڈ لیڈی کی بیٹی ــ

یہ دل ایک سٹیج ہے۔ جس پر نئے نئے کردار آتے ہیں۔ اور نئے نئے کھیل کھیلے جاتے ہیں ــــ ایک ڈرامہ میں بھی کھیل رہا ہوں ــــ اس کھیل کا مصنف میں ہوں، ہیرو میں ہوں، ویلن بھی میں ہی ہوں اور صرف ہیروئن زلیخا ہے، جو مجھ سے دس سال بڑی ہے ــ جس کی ایک بیٹی ہے، شاید میری ہم عمر اور میں جب ان کے گھر کے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہوں، وہ پڑھنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے ــ پڑھنا تو بہانہ ہے، وہ اکرام کو خط لکھتی ہے ــ اور سکون سے خط لکھنے کا اس سے بڑھ کر کون سا وقت نصیب ہو سکتا ہے ــ یہ اکرام بھی عجیب سالا کا ہے ــ میں نے ہمیشہ اسے ہنستے مسکراتے دیکھا ہے۔ وہ ہنستے مسکراتے ہی شمسہ کے خط مجھے پڑھ کر سناتا ہے ــ

میرے پیارے اکرام

میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ....

بس وہی فرسودہ باتیں! اب شمسہ کو کون سمجھائے کہ

تمہارے تو تمہارے پاپا کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے ــ تمہارا پاپا سویرے دس بجے چلا جاتا ہے ــ رات کے دس بجے واپس لوٹتا ہے۔ یہ اس کا معمول ہے۔ بارہ گھنٹے کے اس طویل عرصے میں کیا نہیں ہوتا!

بارہ گھنٹے کی اس طوالت میں ایک لمحے کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی قدر نہیں، بارہ گھنٹے میں کتنے لمحے جنم لیتے ہیں ــ اور ان لمحوں میں کتنے گناہ اور کتنے ثواب وجود میں آتے ہیں، یہ خود ایک طویل کہانی ہے۔ میں اس طویل کہانی کا کردار بننا نہیں چاہتا۔ کہانیوں کا بھی کیا ہے ــ کل کی حقیقت آج کی کہانی نظر آتی ہے ــ

میں اس کی بات سوچ رہا ہوں ــ جو کل راہبر تھا اور آج مجرم، جو کل جلا وطن ہو کر واپس لوٹا تھا لیکن آج لوٹ کر نہ آ سکے گا۔ کتنی الجھی ہوئی ہے یہ کہانی، دراصل اس کہانی کے سارے کردار ہی الجھے ہوئے ہیں، وہ بھی جس نے اپنی ساری کائنات قدموں پر بچھا دی، گرد کا ــ منزل کا کوئی پتہ نہیں، لیکن قدموں کے نشان تازہ ہیں، کوٹھی کے لان میں رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو ابھی باقی ہے انھی کے انتظار میں جو شاید لوٹ کر نہ آ سکے گا، گذشتہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے ــــ!!

میری اس نظم کا عنوان ہے آتش کدہ؟!

آتش کدہ ــــ اگر میرے پاس بھی ایک کوٹھی ہوتی، ایک گھر ہوتا، اس گھر کے گلابی رنگ کی خواب گاہ میں ایک آتش کدہ ہوتا، تو میں اپنی ساری یادوں کو جلا دیتا ــ!

بات دوسری ہے، آتش کدہ تو میں نے اس کوٹھی میں دیکھا ہے، جہاں وہ پروفیسر اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے، میرے لڑکپن کی یادوں کا، پروفیسر کی بیوی سے کس قدر تعلق ہے، لیکن وہ سکون سے آتش کدے کے سامنے بیٹھ کر ادب ترین کی کہانیاں پڑھتی ہے اور اپنے جسم کو گرمی پہنچاتی ہے!!

ــ یہ زندگی ہے؟!

میری دوسری نظم کا عنوان ہے لذت سنگ؟!

لذت سنگ!!

"تم وہاں کیا دیکھ رہے ہو، شاد تمکنت کی نظم
کتنی پیاری نظم ہے" ——— میرا نقاد دوست مجھ
سے کہنے لگا ———
لذتِ سنگ ! !
ٹیگور ہال بھرا پڑا تھا۔ عجیب عجیب صورتیں تھیں، کچھ اَن
جانی اور کچھ جانی پہچانی ——— جانی پہچانی صورتوں میں
وہ بھی تھی۔ جس نے اپنے بالوں میں سپید ہونے سے پہلے
ہی آگ لگادی ہے، ہائیڈروجن پرآکسائڈ کی ———
نام مجھے معلوم نہیں۔ اُس کی اکلوتی بیٹی کے بارے میں
سنا ہے دو بھائیوں سے بیک وقت عشق کرتی ہے۔
مجھے اپنا بھائی یاد آرہا ہے، سامنے والی کھڑکی یاد
آرہی ہے۔ جہاں سے کبھی زیتون دیکھا کرتی تھی۔ اور
اب شفقو دیکھا کرتی ہے ——— دو اور بھی صورتیں ہیں۔
جنھیں میں بخوبی پہچانتا ہوں۔ فرینچ کٹ داڑھی بنائے
یہ سعدی صاحب ہیں، اکلوتی بیٹی کا باپ ! ! !
"سُنا تم نے بیگم" ——— فرینچ کٹ داڑھی والا سعدی
ہر رات اپنی بیوی سے کہتا ہے ——— "آج رزیڈنسی
پر ایک سترہ سالہ لڑکی مجھ پر عاشق ہوگئی ———"
سویٹ سترہ برس کی ! ! !
سعدی صاحب آپ کی بیٹی کی عمر بھی سترہ سے زیادہ
نہیں، سویٹ سترہ برس۔ کتنی ملائم ہے وہ کشمیر کے
مکھن کی طرح ——— سعدی صاحب آپ پر سویٹ
سترہ برس کی لڑکی عاشق ہوگئی ہے نا، وہ بھی سہہ
رہا ہے۔ پر آپ کو کیا معلوم آپ کی بیوی بھی ایک سویٹ
سترہ برس کے لڑکے پر عاشق ہوگئی ہے ———
میں ایک اور جانی پہچانی صورت کا ذکر کر رہا ہوں۔
جو سامنے والی کرسی پر بیٹھا نظم سُن رہا ہے۔
لذتِ سنگ ! !
عمروں کی تفاوت میں کیا رکھا ہے۔ صرف عشق کی
بات ہے۔ زلیخا کی عمر بھی تو چالیس سال کی ہے۔ اور
میں اُس سے عشق کرتا ہوں۔ زلیخا کی بیٹی کی عمر سترہ برس
کی ہے، سویٹ سترہ برس اور میرا دوست مسکرا

عزیز دوست اکرام اُس سے محبت کرتا ہے۔
"تم کیا لوگے ———"
"کچھ بھی نہیں"
"لوائے کباب لاؤ"
"میں کچھ بھی نہیں کھانا چاہتا ———"
"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ایک عدد خط سُن لو ———"
"شعر کا خط سننا ہے تو شراب لاؤ ———"
"ہاں ہاں شراب ——— بس تم خط سُن لو، پھر شراب
پینے چلیں گے ——— بھلا یہ بھی کوئی شراب پینے کی جگہ ہے"
"میرے پیارے اکرام ———"
بس وہی فرسودہ تحریر .... ؟!
"خط سُن چکا ہوں اور اب ———"
"آج سنیچر ہے۔ جنگل لائٹ۔ چلو وہاں چلتے ہیں،
جہاں سپید چکنے فرش پر وہ سپید جسم والی ناچتی ہے"
"کون نینا ——— وہی سپید جسم والی نینا، جو میرے
محلے کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہتی ہے یہیں ہوتا ......!"
"بالکل وہی ——— کیا خیال ہے تمہارا اُس کے بارے میں"
"میرے ایک مصور دوست کو سفید رنگ بہت
پسند ہے"
"تمہارا مطلب ———"
"مطلب یہ کہ رنگوں کے بارے میں اُس کی سوچ کا
مجھ پر بڑا اثر ہے ———"
"شمع کا رنگ بھی تو سپید ہے"
"ہوگا ——— میں نے کبھی اُن نظروں سے نہیں دیکھا"
"اور زلیخا"
"ہاں وہ سپید رنگ کی ایک ترشی ہوئی مورت ہے"
میں بہک گیا ——— سُرخ بالوں والی وہ عورت
جس کا نام مجھے یاد نہیں، اپنے سویٹ سترہ برس کے
لڑکے کے ساتھ بیٹھی ہے ایک ..... رنگ کی
فیٹ میں ....!
کارواں گذر گیا۔ غبار دیکھتے رہے
اور اب تو اُس نظم کی بیتی کے الفاظ اُس پر ...

بھی گزر گئی تھا جب وہ نشگی پیٹھے والی عورت ایک اشتہار سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

وہ غبار دیکھتے رہے اور میں اُن کو دیکھتا رہا جو ہیرو سے خوبصورت تھے!

میں نے ایک کنول کے روپ میں اپنی محبوبہ کو دیکھا، یہ طرح ساری جھیل میں پھیل گئی اور پانی میں اُس کے اشتہار سا لگ گئے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ جھیل کی لہروں میں ارتعاش پیدا ہوا

"کسی نے دیکھ لیا تو"—

"تو کیا ہوگا۔"

"اشتہار سے لگ جائیں گے۔"

"کہاں—"

"پانی میں—"

زلیخا نے جھیل میں جھانکا، وہاں کچھ بھی نہ تھا، ایک ڈرا ڈرا سا، جھکا جھکا سا شفق کی لالی میں ڈوبا ہوا چہرہ تھا۔

"تم بہت خوبصورت ہو"

"یہ تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔"

"بار بار دہرانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں"

"اس لئے کہ مجھے تمہاری کلائی کا صندل پسند ہے۔"

خاموشی —— !

سورج ڈوبا اندھیرا چھا گیا۔

میں نے تمہیں یاد کیا!

"اُف تمہاری آواز میں کتنی مٹھاس ہے۔"

پھر وہی خاموشی............ یہ خاموشی کچھ کہہ رہی ہے —— کیا... کیا... زلیخا شاید اپنی ان بھیگی بھیگی پلکوں میں کوئی کہانی لے آئی ہے!

"کل حامد صاحب تمہارے بارے میں کچھ رہے تھے۔"

"کیا—"

"ایک عجیب سی بات، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اپنی کمزوری کہہ بھی نہیں سکتی۔ کچھ بھی نہیں آتا...!"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی —— حامد صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ...... کہ انہیں تمہارا اور شمسہ کا رشتہ پسند ہے۔"

شمسہ اور میرا رشتہ ؟!

میں نے پتھر پر ایک نقش بنایا۔ وہ نقش مٹ گیا اور پھر وہ پتھر ابدی اندھیروں میں کھو گیا۔ اگر میں ایک سنگ تراش ہوتا، تو ابد کا اندھیروں میں اس کی تلاش کرتا۔

"اکرام کا کیا ہوگا"

"کون اکرام"

"میرا وہ ہنستا مسکراتا انجینئر دوست، جو شمسہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔"

"یہ غلط ہے"

"یہ حقیقت ہے"

"تم بات سمجھنے کی کوشش کرو"

"کونسی بات"

"تمہارے ہاں کرنے سے وہ منزل مجھے مل جائیگی جس کی مجھے تلاش ہے۔ پھر کوئی اشتہار نہ لگ جائے گا، کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا........

پھر میں اور تم........

زلیست میں کوئی تازگی نہیں، زلیست ایک الجھن ہے، شاید اسی لئے میں شمسہ سے شادی نہیں کر سکتا، شاید اسی لئے زلیخا سے عشق کرتا ہوں۔ لیکن اب میری یادیں ترتیب پا چکی ہیں۔ دل کی دھڑکنیں سنگ بن گئی ہیں۔ یہ سارے چہرے آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں، ایک پھیکی پھیکی سی تحریر آہستہ آہستہ ابھر رہی ہے۔

میں بہ ہوش و حواس تحریر کرتا ہوں کہ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے.............!!

(افسانہ)

شیام کنول

انجانا راہی

ماں کی ضد کے آگے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ اُس نے مجبوراً جب ہاں کر دی تو ماں نہال ہو گئی۔ پھر بھی ماں نے بیٹے کا دل رکھنے یا وقت کے تقاضوں کی تکمیل کے خیال سے کہا "اگر تیری مرضی ہو تو دُلہن کی تصویر منگوا کر دکھا دوں" لیکن ساتھ ہی ماں نے ہر ماں کی طرح یہ بھی کہہ دیا کہ "دُلہن چاند کا ٹکڑا ہے" مگر راج کو چاند کے اس ٹکڑے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو شادی کا بس اس لئے کر رہا تھا کہ یہ اُس کی ماں کی دیرینہ آرزو تھی۔ ہر ماں کی طرح اُس کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ اُس کے مرنے سے پہلے گھر میں چاند سی بہو آئے۔ عرصہ تک وہ ٹالتا رہا۔ لیکن جب ماں نے اُسے اپنے دودھ کا واسطہ دیا تو وہ مجبور ہو گیا۔ اور اُس کی مجبوری پر ماں نہال ہو گئی۔

وقت ندی کے دھارے کی طرح بہتا رہا اور وہ دن قریب آ گیا جب کہ راج کو ایک اجنبی راہی کا ہمسفر و ہم خیال بننا تھا۔ دوسری صبح لگن کی صبح تھی۔ بے پناہ مسرت کی لہروں نے گھر کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ لیکن راج کے ذہن میں ایک عجیب کشمکش ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں ایک طرف ماں کی ممتا، فرض اور دنیاداری تھی اور دوسری طرف اُس کے اپنے جذبات، ارمان اور خیالوں میں بسا ہوا ایک رنگین تصور۔ ماں کی ممتا اور فرض کی پکار نے اُسے جھکنے پر مجبور تو کر دیا تھا، لیکن اس کا ذہن انتشار کا شکار تھا۔ وہ کشمکش میں گھِرا تھا۔ جذبات اُسے بار بار بغاوت پر اُکسا رہے تھے لیکن جب ذہن میں اپنی ماں کے الفاظ "تجھے اپنی ماں کے دودھ کا واسطہ" گونجتے تو جذبۂ بغاوت سلب ہو جاتا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ بہت دیر سے ہوا کے جھونکوں کے لمس سے کھڑکی کے پردے سرسرا رہے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر پردے سرکا دئے۔ باہر اُفق میں گھٹتا ہوا چاند تو دیکھی رات کے اندھیرے کا آنچل ہٹا کر اپنی پھیکی زرد کرنوں سے روشنی کا جال پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ راج کی نگاہ چاند کے زوال پذیر حسن پر جم کر رہ گئی۔ اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے چاند کی اوٹ سے کسی کی اداس، حسرت بھری آنکھیں اُسے تک رہی ہیں۔ ان اداس آنکھوں نے اُس کے ماضی کے کھرنڈ چھیل ڈالے ـــــــ

وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک مندر کی یاترا کے لئے گیا تھا۔ حقیقتاً یہ کہنا ٹھیک ہو گا کہ وہ خود گیا تھا اُسے تو ماں گھسیٹ لے گئی تھی ورنہ اُسے یاتراؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ عمر کے اُس موڑ پر پہنچ چکا تھا، جہاں بچپن جوانی سے ہم آغوش ہو کر چنچل اور سرکش ندی کا دھارا بن جاتا ہے۔ اُس کی زندگی بھی چنچل ندی کی بہتی دھارا کی شکل میں ڈھل چکی تھی ـــ

مندر پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ جہاں آرتی ہوتی تھی، زائرین کے اکٹھے ہونے کے لئے ایک طویل برآمدہ تھا، جس کی تقریباً آدھی کھڑکیاں پہاڑ کے دامن، دامن سے پرے ترائی میں بسے چھوٹے سے گاؤں اور گاؤں سے پرے دور دور تک پھیلے دھان کے کھیتوں کا دلکش منظر پیش کرتی تھیں۔ مندر میں آرتی کے بعد دیر تک چہل پہل رہتی اور اُس کے بعد سناٹا چھا جاتا۔ بس کبھی کبھار کوئی عقیدت مند مندر کا گھنٹہ بجا کر سناٹے کا سینہ چاک کر دیتا ـــ

راج کی نہ ختم ہونے کے بعد جب تنہائی سے بور ہوا تو ایک خیال نے کر مندر کے برآمدے میں آ گیا - لیکن یہاں پہنچ کر تو دل سے زیادہ اُس کی وجہ پہاڑ کے دامن میں بکھرے نظاروں کی طرف مبذول ہو گئی - شہر کی ہنگامہ خیزیوں میں پروان چڑھی زندگی، کہ دور سے پہاڑوں کے دامن میں بکھرے فرحت بخش نظاروں کو حیرت و مسرت سے دیکھ رہا تھا —— وہ ان نظاروں میں کھویا ہوا تھا کہ سناٹے کو چیرتی ہوئی گھنٹے کی آواز نے اُسے چونکا دیا - اُس کی نگاہ بے ساختہ آواز کی سمت اٹھی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے تپتی دوپہر میں کالی گھٹائیں چھا کر بوند بوند برسنے لگی ہوں - مندر کی چوکھٹ پر ایک سانولی سلونی لڑکی آنکھیں موندے کھڑی تھی - اُس کے کھلے ہوئے سیاہ گیسوؤں میں سے پانی کے قطرے کسی ٹوٹی ہوئی لڑی کے موتیوں کی طرح بوند بوند گر کر فرش کو گیلا کر رہے تھے - سامنے تھالی میں گیندے کے کچھ پھول اور ان پھولوں کے بیچ میں جھلملاتا ہوا دیا - جھکی ہوئی پلکیں، جھکے ہوئے ابرو، جُڑے ہوئے صندلی ہاتھ جو سینہ تک اُٹھے ہوئے تھے - ایک عجیب سی دلکشی، پُرسکون جمال اور معصومیت اس کے چہرے کو تابناک بنائے ہوئے تھی - راج کی مبہوت نگاہیں اِس سکون بخش کشش سے چپک کر رہ گئیں - اور وہ کھویا کھویا سا اُسے دیکھتا رہا - پرارتھنا ختم کر کے دوشیزہ نے آرتی اُتاری اور پھر وہ پھیرے کرنے لگی - راج کی بے خود نگاہیں بھی اُس کے چہرے کا طواف کرتی رہیں - پوجا ختم ہوئی اور وہ پوجا کی تھالی اُٹھا کر جانے کے لئے مُڑی - تب —— ایک پل کے لئے اُس کی نگاہ راج کی نگاہوں سے الجھی اور جھک گئی - لیکن وہ لمحہ... وہ لمحہ اُس کے جذبات میں طوفان بپا کر گیا - اُس کے رُوح کی گہرائیوں میں رچا بسا گیا - جھیل کی طرح پُرسکون آنکھیں اور اُن میں جھلملاتے ہوئے دیئے - راج کے دل و دماغ پر پیوست ہو کر رہ گئے - اُس ایک لمحے نے بچپن اور جوانی کے سنگم میں ہلچل مچا دی -

اُس شام پوجا کے وقت سے پہلے راج مندر کے دروازے پر کھڑا تھا - اُس کی زندگی میں انتظار کے یہ پہلے لمحات تھے - اور جب انتظار کے لمحات نے اُسے پوری لذت بخش دی —— وہ ہاتھ پر پوجا کی تھالی لئے، نگاہیں جھکائے، خاموش اور پُروقار انداز میں اُس کے قریب سے گذر گئی - راج کا دل شدتِ جذبات سے دھڑک اُٹھا - اُس کے لب پھڑکے، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا گم سم وہیں کھڑا اُسے بس دیکھتا رہا - آرتی ختم ہوئی - لوگ دھیرے دھیرے لوٹنے لگے - پھر وہ "بہارِ زندگی" بھی اُس کے قریب سے گذر گئی - لیکن وہ "بہار" کی آنکھوں میں جھانک نہ سکا - اُن آنکھوں میں جھلملاتے دیئوں کی ایک کرن بھی اُس کی بیقراریوں کو نصیب نہ ہو سکی - اُس کی وہ رات صبح کے انتظار میں کٹی اور جب صبح دوپہر کے اور دوپہر شام کے سناٹوں میں ڈوب گئی تو اُس کا دل بے قرار ہو اُٹھا - وہ اُن لمحوں کا منتظر تھا جب مندر کے مقدس گھنٹے کسی کے سبک ہاتھ کے لمس سے فضا پر محیط منحوس سناٹے کا سینہ چاک کرتے - آخر کار —— منحوس سناٹے میں بہار کے قدموں کی چاپ گونجی —— اور وہ پوجا کی تھالی سنبھالے مندر میں داخل ہوئی - اس کی نگاہیں تو راج پر پڑیں اور جھک گئیں - اُس کے قدم بھگوان کی مورتی کے سامنے جا کر رُک گئے - اور —— مقدس گھنٹے بج اُٹھے - دیئے کی لَو تھرتھرا اُٹھی - آرتی اور اُس کے بعد پھیرے، پرارتھنا ہوئی اور تب —— جب وہ لوٹ کر جانے لگی تو —— دانستہ یا نادانستہ اُس کی خاموش آنکھوں نے ایک بار پھر راج کی نگاہوں سے اُلجھ کر ایک کہانی کو جنم دے دیا - لیکن اُس کہانی کے عنوان کی کسی کو خبر نہ ہوئی - دن گذرتے گئے - پہلا، دوسرا اور تیسرا دن - تیسرا دن بھی اِسی کشمکش کی نذر ہو گیا - لیکن —— چوتھے دن جذبات کا بے باندھ ٹوٹ ہی گیا۔۔

راج اسی طرح منتظر تھا کہ —— اچانک بہار آ گئی - اور مندر کے سناٹے لپک اُٹھے - نگاہیں ملیں اور جھک گئیں - لیکن راج کو ایسا لگا کہ جیسے اُن آنکھوں کے جھیل کے کنارے یاس و حسرت میں ڈوبے ہوئے ہیں - خاموش جھیل کی ان گہرائیوں [illegible] نے اُسے تڑپا دیا اور اُس کے قدم بے اختیار اُس کی سمت بڑھ گئے - وہ آنکھیں موندے مورتی کے آگے کھڑی تھی اور اُس کے سامنے پوجا کی تھالی میں رکھے دیئے کی لَو جھلملا رہی تھی - جس کے عکس میں اُس کا پورا وجود مجسم یاس نظر آ رہا تھا - اور —— بے اختیار جھکی ہوئی پلکوں کے آگے اُس کے ہاتھ جُڑ گئے - پلکیں بھیگ گئیں اور اُس نے اپنا سر جھکا دیا - وہ زندگی میں پہلی بار اپنے دل کی آواز کسی تک پہنچا [illegible]

دونوں کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور ایک معصوم جذبے میں ڈوبے وہ قدرت کے آگے سر بسجود تھے۔
پھر... دو ہاتھ ایک ساتھ اُٹھے... شاید بھگوان کو بتانے۔ لیکن مندر کے گھنٹے بج نہ سکے۔ شاید اس لئے کہ جب دل کے تار اُٹھتے ہیں تو ہر آواز معدوم ہو جاتی ہے۔ ساکت ہو جاتی ہے ـــــ اُٹھے ہوئے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئے۔
ایک لذت نے موندی ہوئی پلکیں کھول دیں۔ چار آنکھیں اُٹھیں اور ٹکرا گئیں۔ لیکن یہ آنکھیں... دو میں حسرت تھی دو میں مسرت، دو میں یاس دو میں اُمید، دو کے دریچے چار ہے تھے اور دو کے دل اُٹھنے کو مچل رہے تھے ـــــ "کون ہو تم؟" بھگوان کے مندر سے ایک آواز اُبھری۔ "ایک داسی"۔ حسرت نے جواب دیا اور پلکیں جھک گئیں۔ تبھی مندر کا گھنٹہ بج اُٹھا اور سناٹے میں دُور تک اُس کی صدا گونجتی چلی گئی۔ لیکن ـــــ دو دلوں کی آواز، اُن میں چھپے آرزوؤں کی بازگشت کسی کے کانوں تک نہ پہنچ پائی۔
شاید... بھگوان تک بھی نہیں۔ پھر آرتی ہوئی اور پھیرے۔ تب ـــــ وہ داسی جانے لگی۔ "یہ ساتھ نہ دو گی؟" ایک سوال اُبھرا اور جذبات سے پجاریوں کا دامن اُلجھ گیا۔ اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ سامنے پتھر کا ستون تھا جو سہارا بننے کے بجائے چوٹ پہنچانے کا باعث بنا۔ پجاری نے خاموشی سے یہ ساتھ دُور تک بڑھا دیا۔ یہ ساتھ لیتے ہوئے راج نے اُن خاموش آنکھوں میں جھانکا تو پلکوں کے جھروکوں میں دو موتی لرز رہے تھے۔ تڑپ کر اُس نے اُن سچے موتیوں کو آنسو بننے سے پہلے ہی پوروں پر لینا چاہا۔ لیکن ـــــ وہ جانے کے لئے مُڑ چکی تھی۔ اور ـــــ یہ اُس کی آخری مُلاقات تھی۔ راج کی نگاہیں پھر کبھی اُسے دیکھ نہ پائیں۔ اور نہ ہی وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اُن آنکھوں کو اپنے دل و دماغ سے نوچ کر پھینک سکا۔ رہ رہ کر اُس کا دل تڑپ اُٹھتا اور وہ سوچنے لگتا کیا اسی کا نام محبت ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دو انجانے راہی زندگی کے کسی موڑ پر اچانک ملیں اور پھر بچھڑ جائیں۔ لیکن ایک باقی رہ جائے۔ ایک تڑپ۔ ایک درد ہمیشہ جاگتا رہے۔؟ آج بھی وہ اُن ہی آنکھوں کے لئے بے چین تھا، منتظر تھا۔ وہ مُدتوں سے اپنی زندگی کی بہار دیکھنے کا متمنی تھا۔ لیکن ـــــ وہ بے بس تھا۔ مجبور تھا ـــــ
بارات آخر دلہن کی ہو گئی۔ اور رستے کی ساعتوں میں بجتے باجوں نے راہی کو بیدار کلیوں سے سجا دیا۔ بارات دُلہن کے گھر پہنچی لیکن وہاں ـــــ! وہاں استقبال کے لئے شہنائیوں کی گونج نہ تھی، ڈھولک پر کوئی تھاپ نہ تھی، میراسنوں کی بے ربط گالیاں نہ تھیں، اور نہ بے باک قہقہے تھے۔ وہاں ہر چہرہ پژمردہ تھا اور سہرے کی کلیاں قدموں میں بکھری پڑی تھیں۔ براتیوں نے سُنا ـــــ دُلہن نے خودکشی کر لی.....

راج کے قدم بے اختیار اُس سمت اُٹھنے لگے جہاں "دلہن" کو چتا کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک "اجنبی" کی طرح وہ لاش کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اُس لاش کو جو اُس کی زندگی کی رفیق بننے والی تھی۔ جسے وہ پنڈت کے منتر پڑھنے سے پہلے آگ کے گرد پھیرے پھرنے سے قبل دیکھ نہ سکتا تھا۔ اُسی لاش کو پنڈت کے منتروں سے پہلے آگ کے پھیروں سے پہلے دیکھنے جا رہا تھا۔ لیکن اُس پر کوئی پابندی نہ تھی۔ کوئی اُصول، کوئی رسم، کوئی رواج اُس کی راہ میں حائل نہ تھا۔
راج نے جرأت کر کے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے دلہن کے چہرے سے "گھونگھٹ" اُلٹ دیا۔ اور ـــــ وہ چیخ ـــــ وہ چیخ جو کربناک تھی جو اُس کے حلق سے نکلی۔ اور وہ لاش ـــــ اُن آنکھوں کی تھی، اُس محبت کی تھی جس نے ایک مقدس مقام پر جنم لیا تھا۔ ایک انجانا ڈگر پر جنم لیا تھا ـــــ

یوسف رضا

بے خواب کواڑ

کارخانے سے نکل کر رمیش نے جیسے ہی سڑک پر قدم رکھا اُسے ایک سکون سا محسوس ہوا، ویسا ہی سکون جیسا ایک مُدت کے بچھڑے ہوئے دوست کی آغوش میں پہنچ جانے کے بعد ملتا ہے۔ سیاہ، سیدھی، کہیں کہیں بل کھاتی ہوئی کولتار کی یہ سڑک جس پر بے شمار گڑھے ہیں رمیش کو بہت پیاری ہے اس پر بنے راستے سے جو اس کی جھونپڑی سے آتا ہے، کارخانے تک لاتی ہے اور ہر روز شام کارخانے سے اس کے گھر تک لے جاتی ہے رمیش کو اس بے ڈھنگی سڑک سے بڑی محبت ہے، کیونکہ یہ اُس کی زندگی سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔

آسمان کا چہرہ دُھلا ہوا تھا اور شفق کے چہرے پر سرخی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑے اپنی پسندیدہ فلمی دُھن بجاتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کے ٹفن دان کو جھلاتے ہوئے لاپرواہ انداز میں جھومتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں تھا۔ جب وہ اعظم پوری کی دوکان کے سامنے سے گزر رہا تھا اسے یاد آیا کہ اُس کے بیٹے ہری نے تختی اور رتین رنگ کا قلم لانے کی صبح تاکید کی تھی۔ وہ پلٹ کر دوکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا.... اسی وقت اُس کے کانوں میں کسی موٹر کے رُکنے کی مخصوص چرچراہٹ گونجی، اور ساتھ ہی ہارن بھی بجا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اُس کی توقع کے مطابق وہ فقیر تو ہی تھا.... "دو منٹ...." اُس نے فقیر تو سے کہا اور دوکان میں گھس گیا... تختی اور قلم لے کر جب وہ موٹر کے نزدیک آیا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا کہ فقیر تو اپنی سلگتی ہوئی بیڑی سے اُس کے لئے دوسری بیڑی سلگا رہا ہے۔ فقیر تو نے اُسے دیکھ کر دروازہ کھولا اور وہ فقیر تو کے برابر بیٹھ گیا۔۔۔ رمیش اور فقیر تو کی دوستی کی عمر ایک مہینہ ہے۔ رمیش جس کارخانے میں کام کرتا ہے اُسی کارخانے کے مالک کی موٹر کا فقیر تو ڈرائیور ہے۔ فقیر تو نے جب پہلے پہل اُسے موٹر میں بیٹھنے کے لئے کہا تھا... تو وہ بہت جھجکا تھا، بڑا بوکھلایا تھا، ہچکچایا تھا... اور بیٹھنے سے انکار کر رہا تھا لیکن فقیر تو کے اصرار پر اُسے مجبور ہونا پڑا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گیا تھا... لیکن بیٹھتے ہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا، اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سیٹ اندر کی جانب دھنسی جا رہی ہے۔ اور اُس کے اس طرح کھڑے ہونے پر فقیر تو نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا... "ہا ہا... بیٹھ جا بیٹھ جا..." اور وہ جھینپ کر بیٹھ گیا تھا... وہ پھر پہلے کی طرح اندر دھنسا تھا، لیکن پھر تھوڑا اوپر ابھر آیا تھا... یہ اُسے [illegible] سے بڑا مزا آیا تھا۔ پھر اس نے دو تین بار ذرا سا اوپر اُٹھ کر سیٹ پر اچھلنے کے انداز میں دباؤ ڈالا تھا، اور سیٹ نے ہر بار اُسے اوپر اچھال دیا تھا... پھر اُس نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اُس نے سوچا تھا... اس سیٹ پر تو لیٹتے ہی نیند آ جائے گی... اور... اور ایک اُس کی جھونپڑی کی زمین ہے اونچی، نیچی، اتنا کھردرا جیسے [illegible] گودڑیاں بچھا کر وہ سوتا ہے... گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہتا ہے، اور نیند آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جگہ بدل بدل کر سونے کے بعد بھی نہیں آتی، اور آئے بھی کیسے؟ جبکہ کہیں جھونپڑی کی زمین کے کنکر اُس کی پیٹھ میں چبھ رہے ہوتے ہیں تو کہیں اُس کی کمر کسی گڑھے میں جھول رہی ہوتی ہے، اور کہیں ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہو جاتا ہے تو کہیں سر اوپر اور ٹانگیں نیچے... پھر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر فقیر تو سے کہا تھا... "اور ے یار فقیر تو! تیرے تو بڑے مزے ہیں۔"

"کیوں بھلا؟" فقیر تو نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

[illegible] سے پلکوں تک آ پہنچی جو بھیگی بھیگی پلکوں سے دور دو ستاروں کے بیچ کا فاصلہ کم کر رہی تھی۔ ایک ... ؟ [illegible] کی طرف دیکھا اور اُس کے قریب کھسک گیا۔ کملا کی بھیگی ہوئی پلکوں جیسا پانی برس برس کر اس کی پلکوں میں اس کے گالوں پر بہنے لگا۔ [illegible] ہوئے تو رمیش نے کچھ کہنے کے لئے اپنے ہونٹ کھولے۔ مگر اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کملا نے اُسے ٹوک دیا ... "تم سے جا! [illegible] کرو اِس گھر سے ..." اُس کے لہجے میں کچھ غصہ تھا کچھ جھنجھلاہٹ تھی۔

"ہیں؟ ہاں! وہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اِس سے بات نہیں کرنی چاہئے۔" رمیش نے کنکھیوں سے انیل کی طرف دیکھ کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔

انیل نے کملا کی ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا.... "مجھ سے اگر اتنی ہی ناراض ہیں آپ بھابی تو پھر یہ آنسو کس لئے بہا رہی تھیں؟"

"چلو ہٹو! بے وفا کہیں کے۔" کملا نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"جانتا ہوں بھابی! تم مجھے بہت چاہتی ہو....." انیل کا گلا رُندھ گیا... "مگر کیا کروں ماں کی موت کے بعد یہ شہر جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا.... یقین مانو بھابی! بمبئی میں بھی تم لوگوں کے بنا ایک پل چین نہیں ملا مجھے۔ اسی لئے دوڑا چلا آیا۔ اب تم سب لوگوں کو فوراً تیار ہو کر میرے ساتھ چلنا ہے، تم لوگوں کے بنا اب میں ایک پل نہیں رہ سکتا، بھگوان کی قسم بھابی! ایک پل نہیں رہ سکتا۔" انیل کی آنکھیں اُبل پڑیں... کملا نے ساڑی کے پلو سے اُس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا.... "اچھا خیر! اب یہ منہ دیکھے آنسو تو رہنے دو، یہ بتاؤ کہ تم اتنے بڑے آدمی کیسے ہو گئے؟"

"بڑا آدمی؟..." انیل ہنس پڑا ... "کہاں بھابی! وہی تو ہوں تمہارا چھوٹا دیور، اگر دولت کے بارے میں پوچھ رہی ہو تو پھر میں یہ کہوں گا کہ دولت سے کوئی آدمی بڑا اور چھوٹا نہیں بن جاتا۔ ہاں! تمہارے پوچھنے کا مقصد اگر یہ ہے کہ اتنی ساری دولت میرے پاس کیسے آئی تو پھر اِس کی کہانی ذرا لمبی ہے، جو بمبئی چلنے کے بعد فرصت سے سناؤں گا۔ اب میرے پاس وقت کم ہے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر تم سب لوگوں کو تیار ہو جانا ہے۔"

جب وہ بمبئی پہنچے تو سورج کا چہرہ جلدی جلدی اپنی کرنوں کا جال سمیٹ رہا تھا۔ سمندر میں سونا پگھل رہا تھا اور پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے.... انیل کا گھر اُن کے خوابوں سے بھی زیادہ سُندر تھا، اُن لوگوں کے منہ ہاتھ دھو کر کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات اُتر آئی تھی۔ سفر کی تکان نے اُنہیں جلد ہی بستروں پہ پہنچا دیا۔

رمیش اور کملا صندل کی مسہری پہ لیٹے ہوئے تھے، جس کے چاروں طرف نائیلان کے پردے تنے ہوئے تھے۔ انہوں نے نرم، ملائم، چکنے بستر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ یہ اُن کے خوابوں کی تعبیر تھی.... نائیلان کے پردے ہوا کے دوش پہ آہستہ آہستہ تیر رہے تھے، جو بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اسی طرح اُن کی روح بھی آج خوشیوں کے دوش پہ تیر رہی تھی۔ سفر کی تکان کے باوجود دیر تک دونوں اپنے خوابوں کے متعلق سوچتے رہے۔ آئندہ کے لئے اُن کے ذہن کی مکڑی نے خوابوں کے تانے بانے ملا کے اور ایک نیا جال بنا۔ جو پہلے خواب سے بھی زیادہ سُندر تھا۔ دراصل خواب اور آرزوئیں وہ فاصلے ہیں جو موت اور زندگی کے درمیان حائل ہیں.... کوٹھی کی دیوار گیر گھڑی نے جب گیارہ بجائے تو وہ اپنے خوابوں سے چونکے، اور پھر اپنے بستر کے نرم نرم تکیوں میں جن کے اندر اُن کے سر دھنسے ہوئے تھے، ہاتھ پھیرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے سوچا...." اِس بستر پر تو پلک جھپکتے میں نیند آ جائے گی ___" لیکن انہیں بڑی دیر تک نیند نہیں آئی.... دیوار گیر گھڑی نے جب بارہ بجائے تو رمیش کسمسا کر اُٹھا، اُسی وقت کملا بھی اُٹھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا.... "آخر نیند کیوں نہیں آتی؟" دونوں نے پھر آنکھیں موند لیں۔

دیوار گیر گھڑی نے ایک بجایا.... (بقیہ صفحہ [illegible] پہ دیکھئے)

ل۔م۔ شاہد

رنگ، خوشبو اور روپ

کردار:-

اقبال	ایک دولت مند نوجوان
ذکیہ	ایک عجیب لڑکی
ریاض	اقبال کا دوست
نعمان	اقبال کا دوست۔ ایک پائلٹ
نعمان کی بیوی	
احمد	اقبال کا ملازم

منظر: ـــــــــــ

اقبال کا بنگلہ۔

ایک بڑا کمرہ، کمرے میں تین دروازے کھلتے ہیں۔ دو باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ فرش پر ایک قیمتی دری بچھی ہوئی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک شیشے کی گول میز رکھی ہے۔ اس پر سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہوا ہے۔ میز کے چاروں طرف چار یا پانچ صوفے ہیں۔ دریچے کے پاس ساگوان کی ایک تپائی پر پھولوں کا گلدستہ مسکرا رہا ہے۔ آتشدان کے قریب ایک بڑی میز پر سفید قیمتی پتھروں کے گھوڑے اور تاج محل نظر آ رہے ہیں۔ اسی میز پر ایک ریڈیو سیٹ بھی ہے۔ دروازوں پر سبز رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر ان لوگوں کی تصویریں آویزاں ہیں جن کا محبوب مشغلہ شکار ہے۔

(اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے۔ اقبال اخبار پڑھ رہا ہے)

(ریاض کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ریاض۔ دس منٹ سے بیٹھک کی کال میں کھڑے میں تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم آئے نہیں۔

اقبال۔ فرصت نہیں ملی۔

ریاض۔ ذکیہ جیسی حسین ترین لڑکی جس کے قریب ہو بھلا اسے فرصت کہاں ملے گی۔؟

اقبال۔ بھئی میں تو ذکیہ سے تنگ آ چکا ہوں۔ عجیب لڑکی ہے۔

ریاض۔ عجیب بھی اور حسین بھی۔

اقبال۔ کل آئی اور اچھل کر میز پر بیٹھ گئی۔ اور میری ناک کھینچ لی۔ میں چپ رہا۔ وہ میز سے اتر گئی۔ اور چند منٹ تک چپ کھڑی رہی۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔ عجیب لڑکی ہے۔

ریاض۔ اس کے خیالات بھی عجیب ہیں۔ شادی کے متعلق میری بہن اکثر اس کے گھر جاتی ہے۔ ایک بار ایک شادی کی بات چیت کلکتہ کے ایک بڑے آدمی کے لڑکے سے چل رہی تھی۔ مگر ذکیہ نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

اقبال۔ وجہ ـــــــــ؟

ریاض۔ دیکھو کل شاید تم معلوم کر سکو ـــــــ

اقبال۔ اتنی جلدی ـــ؟

ریاض۔ [illegible] میں۔

{بیٹھ جاتا ہے۔ اقبال پھر اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے۔ احمد کمرے میں داخل ہوتا ہے}

احمد۔ حضور آپ کا تار۔ (اقبال تار لے کر لفافہ کھولتا ہے) کیسا تار ہے سرکار ۔؟

اقبال۔ میرا ایک ساتھی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ آ رہا ہے ان کے کھانے کا انتظام کرو۔

احمد۔ بہت اچھا

{احمد جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد ذکیہ بڑی تیزی سے کمرے میں آتی ہے اور ایک صوفے پر گر پڑتی ہے}

اقبال۔ آج تم بے حد پریشان نظر آ رہی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تم ایک لمبے سفر سے آ رہی ہو۔

(ذکیہ سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے)

ذکیہ۔ (ایک عجیب نئے لہجے میں) تم جانتے ہو بھائی جان اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ آج ان سے ملنے گئی تھی۔ وہاں شمیمہ کی ماں سے ملاقات ہو گئی۔ وہی شمیمہ جو میرے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس کی ماں مجھے شمیمہ کے وارڈ میں لے گئی۔ وہ ایک پلنگ پر کراہ رہی تھی۔ رو بھی رہی تھی۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ماں بننا بھی کتنا بڑا جرم ہے۔ عورت کو اس مرحلے کے قریب سے گزرنا پڑتا ہے جہاں موت بھی چھپی بیٹھی رہتی ہے۔

مجھے یاد ہے میری ایک سہیلی سلمیٰ کی شادی ہو رہی تھی۔ گرمی کے دن تھے۔ وہ ریشمی کپڑوں اور وزنی زیورات سے ڈھک گئی تھی۔ سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ مگر وہ چپ تھی۔ جیسے منھ میں زبان ہی نہ ہو۔ صرف نکاح کے وقت "قبول ہے" کہنے کے لئے اس کے ہونٹ ہلے تھے۔ (رک کر) اقبال سنا ہے کہ ایک لڑکی شادی کے بعد قید کر لی جاتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ نہ مسکرا سکتی ہے اور نہ کبھی گلی میں جھانک سکتی ہے۔

اقبال۔ ایک لڑکی جب جوان ہوتی ہے تو اسے دلہن بننا ہی پڑتا ہے۔ دلہن کے بعد بیوی .... پھر ماں .... یہ سارے روپ ایک لڑکی کے اپنے ہوتے ہیں۔

ذکیہ۔ محبوبہ بھی تو ایک روپ ہے۔ کیا تمھیں مجھ سے پیار نہیں؟

اقبال۔ (گھبرانے کے انداز میں) میں تم سے پیار کرتا ہوں .... اور کبھی کبھی تمھارے بدن کو چھو کر کچھ محسوس بھی کرنا چاہتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ تم صرف ایک محبوبہ ہو .... بیوی نہیں۔ تم نے شمیمہ کو ہسپتال میں ایک اذیت ناک مرحلے سے گزرتے دیکھا ہے۔ ایک عورت کو اس مرحلے سے گزرنا بھی پڑتا ہے۔ اس مرحلے سے گزرتے ہوئے تکلیف تو ضرور ہوتی ہے مگر اس تکلیف کے بعد ایک ایسی راحت حاصل ہوتی ہے جو عورت کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتی ہے۔ ذکیہ.. ابھی تم نے کہا کہ محبوبہ بھی عورت کا ایک روپ ہے لیکن ذکیہ .... یہ روپ تمھاری زندگی کا ایک سپنا ہے .... اور سپنے ٹوٹ جاتے ہیں، زندگی کے راستے پر چلتے چلتے ایک لڑکی ایک ہم سفر کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ ذکیہ .... ایک عورت جب بہت چھوٹی سی ہوتی ہے نا تو وہ کسی کی بیٹی ہوتی ہے ... کسی کی بہن ہوتی ہے۔ جب وہ بڑی ہوتی ہے تو کسی کی بیوی بن جاتی ہے، پھر وہ ماں بن جاتی ہے عورت کو اپنی زندگی میں کئی روپ دھارنے پڑتے ہیں۔ اور عورت کا اصلی روپ "ماں" ہے۔ اس روپ کو پانے کے لئے عورت کیا کچھ نہیں کرتی — جس عورت کو یہ روپ نہیں ملتا وہ کچھ بھی نہیں ہوتی —

{ذکیہ عجیب سی نظروں سے اقبال کی طرف دیکھتی ہے، جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یا انکی باتیں سن رہی ہو۔ اتنے میں باہر کار کے ہارن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اقبال چونک کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔}

اقبال۔ شاید وہ لوگ آ گئے۔

ذکیہ۔ کون لوگ ———؟

اقبال۔ میرا ساتھی نعمان اپنی بیوی بچے کے ساتھ آیا ہے۔

{اقبال باہر جاتا ہے اور نعمان کو ساتھ لے کر کمرے میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے۔ نعمان ذکیہ کی طرف دیکھتا ہے اور [illegible] پڑتا ہے}

نعمان۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے اقبال ۔؟

اقبال۔ نہیں۔ یہ میری کبھی کی کالج کی ساتھی ہیں .... سامان وغیرہ کہاں چھوڑ آئے ؟

نعمان۔ بھابی رو رہے ہیں۔ کیونکہ ایک گھنٹہ بعد ہم امرتسر چلے جائیں گے۔
اقبال۔ کیوں۔؟
نعمان۔ (اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر) تمہاری بھابی کی والدہ بیمار ہیں
{ اقبال نعمان کی بیوی کی گود سے بچہ لے کر پیار کرتا ہے }
اقبال۔ بالکل تمہاری ہی طرح ہے نعمان ۔۔۔ کیا نام رکھا ہے ؟
نعمان۔ ابھی اس کا کوئی نام نہیں رکھا گیا ہے۔ ویسے ہم بیلو کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک بات یاد آ گئی تمہاری اسٹوڈیو کہاں ہے؟
اقبال۔ قریب ہی ہے۔ کیا کام ہے ؟
نعمان۔ تمہاری اسٹوڈیو کے مالک کا چھوٹا بھائی میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کا ایک خط پہنچانا ہے۔
اقبال۔ چلو۔
{ اقبال بیلو کو اس کی ماں کو دے دیتا ہے۔ دونوں کمرے کے باہر چلے جاتے ہیں۔ ذکیہ خاموش ایک طرف بیٹھی ہے }
نعمان کی بیوی۔ شاید آپ کم سخن واقع ہوئی ہیں۔
ذکیہ۔ (مسکرا کر) نہیں ۔۔۔۔ ایسی بات تو نہیں۔
نعمان کی بیوی۔ تو پھر باتیں کیجئے نا ۔۔۔۔
{ ذکیہ صوفے سے اٹھ کر نعمان کی بیوی کے پاس آتی ہے ۔۔۔ اس کی گود سے بیلو کو لے لیتی ہے۔ اور پیار کرتی ہے }
ذکیہ۔ کتنا خوبصورت ہے آپ کا بیلو!
نعمان کی بیوی۔ (جذباتی لہجے میں) یہ میری قسمت ہے۔ شادی کے بعد نعمان کو مجھ سے اتنا پیار نہ تھا۔ مگر جب بیلو نے جنم لیا تو اس کا پیار بڑھ گیا۔ کیا آپ نے شادی ۔۔۔۔؟
ذکیہ۔ اب تک تو نہیں۔
نعمان کی بیوی۔ آپ ضرور شادی کر لیجئے۔ وہی عورت خوش قسمت ہوتی ہے جو ایک ماں ہوتی ہے۔
{ اقبال اور نعمان دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ اقبال احمد کو آواز دیتا ہے۔ احمد آتا ہے }
اقبال۔ جلدی کھانا لے آؤ۔
احمد۔ بہت اچھا ——————
{ تمام لوگ صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ }
نعمان۔ اب تک تم کنوارے ہو۔ کیوں؟ تمہیں کیا کمی ہے۔ تم ایک بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی ۔۔۔؟
{ اقبال خاموش رہتا ہے۔ احمد میز پر کھانا سجا دیتا ہے۔ سب لوگ کھانا کھاتے ہیں }
شادی نہیں کرو گے تو بھٹکتے رہو گے۔
(اقبال کھاتے کھاتے مسکرا دیتا ہے)
تم تو مسکرا رہے ہو۔؟
اقبال۔ کیا تم دوسری باتیں نہیں کر سکتے۔؟
نعمان۔ (مذاقاً) جب میری بیوی سامنے بیٹھی ہو تو میں دوسری باتیں کر ہی نہیں سکتا۔
(سبھی لوگ ہنس پڑتے ہیں)
نعمان۔ (سنجیدگی سے) اقبال تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ شادی سے انسان بہت ساری برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور زندگی میں اسی وقت بہار آتی ہے جب کوئی ہم سفر مل جائے۔
{ کھانے کے بعد نعمان اٹھ کھڑا ہوتا ہے }
اچھا ہم چلتے ہیں اب۔ تم نے جو خدمت کی ہے اس کا بدلہ میں تو نہیں تمہاری بھابی ضرور چکا دیں گی۔
{ اقبال ہنستا ہے۔ اور جھک کر بیلو کے گال پر بوسہ دیتا ہے۔ نعمان اپنی بیوی کے ساتھ کمرے کے باہر چلا جاتا ہے }
اقبال۔ (ذکیہ سے) سنا تم نے ——————؟
ذکیہ۔ سنا بھی اور دیکھا بھی اور سمجھ بھی رہی ہوں کہ عورت کا یہ روپ اس کی زندگی کے ہر روپ سے زیادہ اہم کیوں سمجھا جاتا ہے۔
اقبال۔ تیتری پھول سے قریب ہو کر اچھی لگتی ہے یا اس سے دور ہو کر؟ اگر تم یہ سمجھ لو تو تمہیں تمہارے "کیوں" کا جواب مل سکتا ہے۔
ذکیہ۔ مجھے اپنے "کیوں" کا جواب مل چکا ہے مسٹر اقبال۔ آپ اپنی منطق اور اپنے فلسفے کو رہنے دو۔ رنگوں کو قید کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں پر پابندی لگانا۔ انہیں محدود کرنا کوئی اچھا کام تو نہیں۔
اقبال۔ مس ذکیہ۔ رنگ، خوشبو اور حسن میں پابندی ہی سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ پھولوں کے بغیر تیتری کا وجود ۔۔۔۔
ذکیہ۔ (بہت متفکرانہ انداز میں مخاطب ہوئی) پھولوں کے وجود ۔۔۔۔ بیکار [illegible] باتیں ہیں۔ جذبات سے [illegible]

ہمیں اپنے سارے اختلافات بھول کر، ایک ہو کر ان مشکل حالات کا سامنا کرنا ہے۔ — لال بہادر شاستری

• سب بھائی بھائی کی طرح رہیں۔

• اپنے پڑوسی کی جان، مال اور مذہب کی حفاظت کریں۔

• نہ افواہ سُنیں، نہ پھیلائیں۔

یقیناً جیت ہماری ہوگی

DA 88/307

صبا اکبر آبادی

غزل

گریباں عام ہو کر رہ گیا ہے
جنوں بدنام ہو کر رہ گیا ہے

خیالِ کیفِ چشمِ دوست اب تو
حریفِ جام ہو کر رہ گیا ہے

گلستاں میں ہر اک جھونکا ہوا کا
ترا پیغام ہو کر رہ گیا ہے

سحر تک دل کو جلنا ہی پڑے گا
چراغِ شام ہو کر رہ گیا ہے

فلک کا نام اربابِ وفا میں
تمھارا نام ہو کر رہ گیا ہے

ابھی سے لطفِ آغازِ محبت
غمِ انجام ہو کر رہ گیا ہے

مرے دل میں ترا داغِ تمنا
مرا انعام ہو کر رہ گیا ہے

ہر اک پختہ تصوّر زندگی کا
خیالِ خام ہو کر رہ گیا ہے

کبھی غم سے ترے خالی نہیں دل
یہ میرا جام ہو کر رہ گیا ہے

بڑھی ہیں اور کچھ قیدیں وفا پر
قفس اب دام ہو کر رہ گیا ہے

ہمارے دل کو کیا کیا حوصلے تھے
مگر ناکام ہو کر رہ گیا ہے

صبا میرے لئے میرا تخلّص
بڑا الزام ہو کر رہ گیا ہے

سلام مچھلی شہری

غزل

وہی عارض، وہی ہونٹوں کا کنول کام آئے
شعلہ افشانیٔ ناہیدِ غزل کام آئے
میرے احساس کے معبد پہ ہے غیروں کی نظر
میرے گیتوں کا حسیں تاج محل کام آئے
ساقیا! بات تو جب ہے کہ سحر ہونے تک
آگ جا ہوں، تو یہی نین کنول کام آئے
آگ پانی کو بنانا ہے دعا دو رندو!
میرے پیالے کا مچلتا ہوا جل کام آئے
ابھی ہم دونوں ہیں مخمورِ محبت لیکن
جنگ میں کل یہی لمحہ، یہی پل کام آئے
زندگی میری ہے، "برِ ہند" کی عظمت کے لئے
موت کا خوف ہو دل میں تو اجل کام آئے
آج کام آ گئی بربط کی دبی آگ سلام
ٹھیک سوچا تھا کہ شاید یہی کل کام آئے

مظہر امام

غزل

اس اضطرابِ شوق کا کوئی صلا تو دو
جاگا ہوا ہوں رات کا، دن میں سلا تو دو
پھر اتنی تیز موجِ تمنا ہو یا نہ ہو
آغوشِ التفات میں خود کو گرا تو دو
دیکھیں مزاجِ وقت پہ ہوتا ہے کیا اثر
پلکیں جھکا کے ایک ذرا مسکرا تو دو
پھر دیکھنا کہ کیسے ابھرتا ہے مہرِ شوق
پہلے حریمِ ناز کی شمعیں بجھا تو دو
دونوں کی داستاں میں ہے اک ربطِ ناگزیر
میرا پتہ بھی پاؤ گے، اپنا پتا تو دو
مرنا برائے زیست بڑی بات ہی سہی
میں یہ بھی کر دکھاؤں، ذرا حوصلہ تو دو
سنگِ گراں کی طرح کھڑے کیوں ہو رہنماؤ!
منزل کو جانتا ہوں، مگر راستا تو دو
تم تو رجائیت کے پرستار ہو امام
فردا کی انجمن سے کوئی شمع لا تو دو

نامی انصاری

غزل

اہلِ دل شیوۂ گفتار سے آگے نہ بڑھے
احترامِ رسن و دار سے آگے نہ بڑھے

بوئے آوارہ پہ قدغن ہے سرِ کوئے جنوں
حکم ہے محفلِ اغیار سے آگے نہ بڑھے

جانے کیا سحر تھا اُن شوخ نگاہوں میں کہ ہم
حلقۂ زلفِ طرحدار سے آگے نہ بڑھے

منتظر تھیں غمِ دوراں کی بلائیں کتنی
شکر ہے کوچۂ دلدار سے آگے نہ بڑھے

کتنی محدود ہے اربابِ سخن کی دُنیا (ق)
عمر بھر سایۂ دیوار سے آگے نہ بڑھے

اہلِ دانش ہیں ستاروں کی فضا میں حیراں
آپ آئینۂ رخسار سے آگے نہ بڑھے

بانکپن گرچہ بہت تھا ترے دیوانوں میں
مصلحت تھی کہ ان اطوار سے آگے نہ بڑھے

کیا خبر اُن کو تقاضائے جنوں کی نامی
جو کبھی جلوہ گہہِ یار سے آگے نہ بڑھے

کرشن موہن

غزل

رات آئی، بات دل کی مان لو
شبنمیں یادوں کی چادر تان لو

لوگ بے شک اِس کو ہٹ دھرمی کہیں
کر دکھاؤ جو بھی دل میں ٹھان لو

تم اگر دلدار ہو تو کیا ہُوا
ہم بھی دلدادہ ہیں آخر، جان لو

شوق میں کچھ بانکپن بھی چاہیئے
کُند ہے یہ دھار، اِس کو سان لو

بعد میں جو چاہے کہہ لینا اُسے
اُس ستمگر کو ذرا پہچان لو

آہوئے رَم خوردہ شاید ہو کہیں
اور کچھ دن کوہ و صحرا چھان لو

عشق میں صدمے اُٹھاؤ اور پھر
دل پہ ناحق حُسن کا احسان لو

اِس کے شکووں میں بھی ہے اک پیار سا
کرشن موہن کو ذرا پہچان لو

اختر نظمی

غزل

زندگی ہے کہ پریشان خیالوں کا ہجوم
چند اُلجھے ہوئے بے ربط سوالوں کا ہجوم

میری نظروں پہ بھروسہ ہے بہت دُنیا کو
ہے مرے ساتھ تجھے دیکھنے والوں کا ہجوم

کتنی شاداب ہے ، دِلکش ہے غزل کی وادی
محوِ گلگشت ہے ہر سمت غزالوں کا ہجوم

چاند ہے یا مری تابندہ تمنّاؤں کا عکس
یہ ستارے ہیں کہ یادوں کے اُجالوں کا ہجوم

جانے کس سمت مُڑے، جانے کہاں جا پہنچے
آج روکے نہیں رُکتا ہے خیالوں کا ہجوم

زندگی لاکھ بچاتی ہوئی دامن گذرے
ساتھ چلتا ہے پریشان سوالوں کا ہجوم

چھوڑ آیا ہوں میں خوابوں کا جزیرہ نظمی
رہ گیا دُور کہیں زہرہ جمالوں کا ہجوم

حبیب الرحمٰن راہی

غزل

تم مناؤ تو سہی جشنِ بہاراں یارو
سِل ہی جائے گا مرا چاکِ گریباں یارو

صُبحِ نو خواب سہی بات کرو خواب ہی کی
ہے عبث قِصّۂ طُولِ شبِ ہجراں یارو

محفلِ عیش ہو یا انجمنِ دار و رسن
ہم کو رہنا ہے بہر طور غزل خواں یارو

دیکھنا یہ ہے کہ اِس عہدِ گُل و نغمہ میں
کون ہوتا ہے بہاروں کا نگہباں یارو

آؤ رفتارِ زمانہ پہ ذرا غور کریں
محوِ گلگشت ہے اک سروِ خراماں یارو

اب تصوّر میں بھی آتا نہیں وہ جانِ غزل
کون ہو زخمہ زنِ سازِ رگِ جاں یارو

وہ نئے دَور کے سنبھلے ہوئے دیوانے ہیں
جو بیابانوں میں کرتے ہیں چراغاں یارو

کیا لہو دل کا جلایا ہے کسی راہی نے
آج تنا روشن تو نہ تھا کوچۂ جاناں یارو

شکیل مظہری

غزل

برسوں یہ ترے شہر میں آوارہ پھری ہے
تب جاکے کہیں پست مری زیست بنی ہے
آجاؤ کہ شمعوں میں اُجالوں کی کمی ہے
سناٹے نے شب کے تمھیں آواز بھی دی ہے
یہ رات تری یاد کی شبنم میں گھلی ہے
اس رات میں شامل تری سانسوں کی نمی ہے
صبحوں کو نکھارا ترے رخسار کی لو نے
شاموں کو تری زلف نے تابندگی دی ہے
جس پیار کو پایا ہے لٹا کر دلِ پُر درد
اُس پیار کا حاصل تو یہی دربدری ہے
یہ بات الگ ہے کہ تجھے بھول چکا ہوں!
اک عمر تری یاد مرے ساتھ رہی ہے
پیچ و خمِ دوراں سے شکیل الجھا ہے برسوں
لیکن دلِ دیوانہ کی رفتار وہی ہے

سکندر محسن

غزل

چرخ پر کس کا منتظر تنہا
ماہِ تاباں تھا رات بھر تنہا
دل کے ویرانے میں تمھاری یاد
جیسے صحرا میں اک شجر تنہا
روشنی کا سفیر ہوتا ہے
ظلمتِ شب میں اک شرر تنہا
زندگی سے نراش اک پنچھی
کب سے بیٹھا ہے شاخ پر تنہا
ہر نظر اک چراغِ منزل ہے
روشنی ہے مری نظر تنہا
سینۂ شب کو چیر دیتی ہے
مسکراتی ہوئی سحر تنہا
زندگی کی اداس راہوں میں
یاد تیری ہے ہمسفر تنہا

کرشن موہن ——— دہلی

"شاعر" کا ستمبر کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ مندرجات خیال افروز ہیں۔ مفتوں صاحب کا مقالہ خوب ہے۔ راز چاندپوری کی خدمات ایک بھرپور مقالہ کی متقاضی ہیں۔"

حمید الماس ——— گلبرگہ

"حال ہی میں میرا تبادلہ گلبرگہ ہوا ہے۔ سخت پریشان ہوں۔ کچھ دیر پہلے "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا تھا۔ حرف بحرف پڑھ ڈالا۔ "شاعر" کو پڑھ کر ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ آپ اپنے "جرعات" اور متنوع مضامین کے ذریعہ جو روایتیں قائم کر رہے ہیں وہ یقیناً قابلِ تقلید ہیں۔ شعری حصہ میں علی جواد زیدی۔ متین سرمست اور اقبال بیجاپوری کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ اقبال بیجاپوری نے چھوٹی بحر میں بڑی برجستہ غزل کہی ہے۔ یوسف ناظم ہمارے ایک ذہین فن کار ہیں۔ دیر ہی سے سہی، اُردو والوں نے اُن کی حیثیت پہچانی تو۔ اُن کے انٹرویو میں بہت سی باتیں سوچنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بڑی جاندار نثر لکھتے ہیں اور ان کے مزاح کے تحت کئی باتیں تہہ در تہہ قاری کو ایک نئی دنیا کی طرف لے جاتی ہیں۔ "شاعر" میں اس طرح کا سلسلہ بہت ہی مفید ہے۔ آپ ایسے ذہین فن کاروں پر ضرور لکھوائیے، جن کے ساتھ تالی بجانے والے نہیں ہیں۔"

جیون لال گوہر ——— مہو (ایم۔پی)

"اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے آپ کی مساعیِ جمیلہ لائقِ صد ہزار ستائش ہیں۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود آپ کے "شاعر" کا معیار آج بھی نئے اُفق چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔

مشاہیرِ ادب پر خاص نمبروں کی اشاعت کا اعلان یقیناً توسیعِ اشاعت پر منتج ہوگا۔ میرے نام "شاعر" جاری کر دیجئے۔ حلقۂ احباب میں بھی خریداری کے لئے تشویق کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

زیدی جعفر رضا ——— علی گڑھ

"معاف کیجئے گا، مصروفیات کے باعث خاص نمبر اور اُس کے بعد ستمبر کے شمارہ کے موصول ہونے کے سلسلے میں شکریہ کا خط بھی نہ لکھ سکا۔ اب کچھ دم لینے کی فرصت ملی ہے تو یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں۔ پرچے آپ خوب نکال رہے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مکتوب میں جس بلند نظری اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ انشاء اللہ، اب کی مرتبہ "شاعر" کے لئے کوئی اچھا سا مقالہ ارسال کروں گا۔"

ضیا حسنی ——— فتحپور (یو۔پی)

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ "زیلیج" کی اشاعت کا شکریہ۔ اس شمارہ میں "تضاد"۔ "سبز روشنی"، اور "ایک پیالی چائے" اچھی کہانیاں ہیں۔ نیا شمارہ ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ مقالات دلچسپی کے ساتھ پڑھے۔ بالخصوص کرشن موہن کی جاپانی جدولیں" کافی پسند آیا۔ "فضلی کی شاعری کا مطالعہ" بھی دلچسپ رہا۔ "شاعر" کے ذریعہ بہترین شعری ادب منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس بار بھی نظموں اور غزلوں کو بغور پڑھا۔

کنول پرشاد کنول ——— حیدرآباد (اے۔پی)

"آزادی نمبر" ملا۔ بے حد مشکور ہوں۔ بہت ہی صاف ستھرا اور حسین نمبر ہے۔ آپ ہی جتنا "شاعر" کا ہر خاص نمبر ہوا کرتا ہے۔ آپ اتنے مصروف آدمی ہیں حیرت ہے کہ اس کے باوجود اتنا اچھا "میٹر" کیسے جمع کر لیتے ہیں۔ چیدہ چیدہ کس کس کا ذکر کروں۔ مجھے تو تقریباً پورا پرچہ ہی اچھا لگا۔

میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

عبدالمنان صدیقی ——— بھوپال (ایم۔ پی)

"شمبر کا تازہ شمارہ با مرہ نواز ہمارے شاعر جب بھی ماہ بہ ماہ نظر آجاتا ہے تو اچانک ادب اور آپ (آعجاز صدیقی) دونوں کے متعلق ہمدردی کے لیے کچھ جذبات دل میں پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اُمید و بیم کے درمیان سے

اندھیری رات کی انجان رہگزاروں میں ۔۔۔ یہ جگنوؤں کی چمک بھی بہت غنیمت ہے۔ (ارشد صدیقی)

"شاعر" کی امدادی اپیل" کی واپسی کا اعلان بڑے افسوس کے ساتھ پڑھا۔ مگر اِس احساس سے کہ اِس بے حس سماج کا رویّہ ہی کچھ ایسا ہے۔ چار و ناچار دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔

ویسے یہ اپیل واپس لے کر آپ نے ملک کے صاحبانِ مقدرت اور نام نہاد اُردو پرستوں کے گلے میں طوقِ لعنت ڈال دیا ہے جنھیں حالات کی نزاکت کا اب بھی احساس نہیں۔ یہ شبکسارانِ ساحل" خاموش تماشائی" کی صورت نظارۂ طوفان کر رہے ہیں۔ شاید انھیں ہوش اُس وقت آئے گا اور "اِس امدادی اپیل" کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس وقت ہوگا جب وہ خود طوفان آشنا ہوں گے۔ اور میں تو دل سے یہ تمنّا کرتا ہوں کہ ؎

اے موجِ بلا اُن کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے ۔۔۔ کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارہ کرتے ہیں (جذبی)

مجھے اُمید ہے کہ آپ حسبِ سابق "شاعر" کی شاندار روایات اور اُس کا معیار قائم رکھیں گے۔ اور "شاعر" روز بروز ترقی کی منزلیں بدستور طے کرتا رہے گا، انشاءاللہ۔

"کرشن چندر نمبر" کی تیاریاں جاری ہوں گی۔ ابھی اور بھی کئی نمبر نکلنے باقی ہیں۔ جن کا ہر ادب سے ذوق رکھنے والے کو شدید انتظار ہوگا۔ کوشش کیجئے کہ سال میں کم سے کم دو نمبر نکل سکیں۔ میری رائے ہے کہ "شاعر" کے خاص نمبر اور سالناموں کی اشاعت سردست منسوخ کر دی جائے اور وہ وقت جو اِن کی اشاعت میں لگتا ہے اُسے "شخصیات نمبروں" کی ترتیب و تدوین میں صرف کیا جائے۔

اختتامِ تحریر میں مَیں ایک بار پھر آپ کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ جیسے "اَن تھک" ادبی مجاہدوں" کا اِس دَور میں دَم غنیمت ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو "شاعر" جیسے ادبی جرائد اور ایسے مخلص ادب پرستوں سے منسلک ہیں جن کا کام ہی بے لوث خدمتِ ادب ہے۔ ورنہ ہندوستان کے فلمی رسائل کے اِس "دورِ اجارہ داری" میں مخصوص علمی و ادبی جرائد کا کہاں گذر۔ خدا جانے ہم ہندوستانی عوام کا مذاق کس روز بلند ہوگا؟

بحیثیت ایک خادمِ ادب کے مَیں "شاعر" کی توسیعِ اشاعت کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتا ہوں اور اُس کی توسیعِ اشاعت کی ہر امکانی کوشش کر رہا ہوں نیز اِس تحریر کے ذریعہ میں تمام بہی خواہانِ اُردو سے مخلصانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ "شاعر" کی چھتیس سالہ علمی و ادبی خدمات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اِس کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کرتے رہیں تاکہ "شاعر" کو اطمینان کا وہ "ایک لمحہ" میسّر آسکے جس کی تلاش میں وہ برسوں سے سرگرداں ہے۔

تمنّا مظفّرپوری ——— مظفّرپور (بہار)

"جولائی سے میں برابر باہر رہا۔ اواخر اگست میں مکان لوٹتے ہوئے پٹنہ میں معلوم کہ "شاعر" جولائی کا شمارہ آیا تھا جو ختم ہو گیا۔ اتفاق ایسا کہ پٹنے کے تمام بک اسٹالس کے بعد مظفّرپور میں بھی نہ مل سکا اور اِس کے بعد یک بیک اگست کا شمارہ خاص نمبر کی شکل میں نمودار ہوا۔ سو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

اِس مرتبہ واقعی آپ نے اچھے طنزیہ و مزاحیہ نثر و نظم مضامین حاصل کئے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب تو مشہور طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کا طنزیہ "بستی بنا کھیل نہیں" بہت پسند آیا۔ اور احمد جمال پاشا صاحب نے تو النساں کی دُکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں نظم "خدمتِ ادب" میں بھرپور طنز کی ہے۔ اور ہاں مسعود قمر تاباں صاحب نے تو میری تمنّا پوری کر دی۔ عظیم بیگ مرحوم پر میں بھی لکھنا چاہتا تھا۔ اور اب تاباں صاحب چغتائی مرحوم پر لکھ کر مجھ سے مبارک باد لینے کے مستحق ہو گئے ہیں۔ عظیم بیگ پر بہت کچھ

کام ہونا چاہئے۔ وہ بہت اچھا ذہین مزاح نگار تھے۔ اُن کی تصنیفات کا پتہ "نوٹی نمبر ۱۰" "تقریبیں" "شیخ زادہ" "جنت کا بھوت" "فل بوٹ" وغیرہ مضامین اور ناولوں سے چلتا ہے۔ تاباں صاحب شاید ان پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اگر مقیم بیگ پر لکھنے کے لئے کچھ امداد چاہیں گے تو میں اُن کی مدد کر سکتا ہوں۔

"خاص نمبر" میں افسانے تو ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں۔ البتہ نظموں میں سردار جعفری کی نظم "جرعہ جرعہ، قطرہ قطرہ"، "ہجر کی رات" (جواد زیدی) "اپنا دھرتی اپنے گیت" (اعجاز صدیقی) "چاندنی" (نازش پرتاب گڈھی) پڑھ پایا ہوں اور پسند آئی ہیں۔

پورے رسالے کو دیکھنے کے بعد آپ کی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انتخاب تخلیق سے لے کر حسنِ ترتیب تک سب داد کے مستحق ہیں۔
"کرشن چندر نمبر" کا اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی۔"

نامی انصاری ——— کانپور

"شاعر" کا خاص نمبر اگست ۷۵ء موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ یہ نمبر بہت جاذبِ نظر اور خوبصورت ہے۔ ترتیب بدل دینے سے نیا پن کا احساس ہوتا ہے۔ عرصہ ہوا ایک صاحب نے برسبیلِ گفتگو یہ فرمایا تھا کہ لوگوں کو اپنے مکان یا کمرے میں اشیاء کی ترتیب بھی گاہے گاہے بدل دینی چاہئے اور ایک آدھ چیز کو ہٹا کر ایک آدھ نئی چیز شامل کر دینی چاہئے۔ اس تبدیلی سے ذہن پر نہایت خوشگوار اثر پڑے گا اور کمرے یا مکان میں آدمی کی دلچسپی بڑھ جائے گی۔ مجھے یہ بات اس وقت سو فی صدی صحیح معلوم ہوتی تھی۔ خاص نمبر نے اس گفتگو کو پھر تازہ کر دیا۔ سردار جعفری کی نظم "جرعہ جرعہ" بہت خوب ہے۔ کرشن چندر نمبر کا انتظار رہے گا۔"

عبدالرحیم نشتر ——— کامپٹی (ناگپور)

"ستمبر کا "شاعر" بڑا ہی جاندار ہے۔ مقالوں میں کرشن موہن پر لکھا گیا مفتون کوٹوی کا مقالہ کافی پسند آیا۔ نور پرکار صاحب سے اور بھی ترجمے کرائیے۔ منظر حنفی کی کہانی میں رام لعل کے افسانے 'ہمدردی' کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جو کہ "شاعر" ہی کے کسی پچھلے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

نظموں اور غزلوں کا حصہ کافی وزنی ہے۔ سلام مچھلی شہری۔ عزیز اندوری اور اسرار اکبر آبادی کی نظمیں بہت پسند آئیں۔ جیون لعل گوہر، ممتاز راشد، زیدی جعفر رضا، علی جواد زیدی، قیصر قلندر، متین سروش اور اقبال بیجاپوری کی غزلیں بھی اچھی لگیں۔ آپ کا اداریہ بھی اپنی روایت کو نبھا رہا ہے۔ یہ جان کر دکھ ہوا کہ اردو دوستوں کی بے حسی کی وجہ سے آپ نے اپنی اپیل واپس لی۔

نسیم مظفر پوری ——— پٹنہ

"شاعر" موصول ہوا۔ شکریہ۔ خط لکھنے میں تاخیر ہوئی۔ جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ بغیر کسی اعلان کے اتنی کم مدت میں اتنا اچھا نمبر نکال دینا آپ ہی کے بس کی بات ہے۔ "شاعر" کے خاص نمبروں نے تو اپنی ایک تاریخ بنا لی ہے۔ اس اشاعتِ خاص کی جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ مضامین نظم و نثر کا یکے بعد دیگرے شائع ہونا ہے۔ ایک مقالہ پڑھئے، پھر ایک غزل سے دماغ روشن کیجئے۔ پھر افسانہ پڑھ کر حیات کی رہگزاروں میں گھو مئے۔ اور پھر مقالہ ..... آپ نے اچھا ہی کیا جو مضامین نظم و نثر کی ابوابی تقسیم نہیں کی۔ اگر ممکن ہو تو یہ ترتیب آپ "شاعر" کے ہر شمارے میں برقرار رکھیں۔!

مندرجات میں رشید منظر کا مقالہ، جوگندر پال کا افسانہ، فراق گورکھپوری کی غزل، سردار جعفری کی نظم اور رسول احمد کا ڈرامہ خصوصیت سے پسند آئے۔ میرا افسانہ بھی آپ نے اس اشاعتِ خاص میں شائع کیا ہے۔ جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

وارثی بریلوی ——— بریلی (یو۔ پی)

ستمبر کا "شاعر" نظر نواز ہوا۔ جرعات میں آپ کا پیغام ہر شخص کے لئے قابلِ قبول ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد [illegible] پروفیسر زیدی ثانی سے "شاعر" کے ذریعہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُن کے مقالے اور حضرت شاد مرحوم کے [illegible] کیا کہنا! اردو کے جدید تنقید نگاروں میں جو بلند مقام وہ حاصل کر رہی ہیں، اس کے احساس سے مسرت ہوتی ہے۔ [illegible] صاحب کی اردو خدمات

کی طرف توجہ کم کی گئی بلکہ نہیں کے برابر۔ موصوف نے اپنے مقالے کے آخر میں جو مشورہ دیا ہے کہ ..... ان کے نظم و نثر کے مجموعے مرتب کر کے شائع کئے جائیں، وہ اُن کے کلام کا انتخاب اُردو والوں کے لئے ایک ادبی تحفہ ہوگا اور ایک بزرگ شاعر کی خدمات کا اعتراف بھی۔ حقیقتاً یہ رائے قابلِ توجہ ہے۔ مقالات نیز منظومات و غزلیات کا حصہ کافی وزنی ہے "شاعر" کو دیکھ کر کون ہے جو آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کرے گا۔ مندرجۂ ذیل اشعار بہت ہی پسند آئے :-

سازِ افرنگ کے نغموں میں یہ بار رود کی بو　　حسنِ تہذیب میں ہر قتل روا ہو جیسے

(متین سرونجی)

جو ہو خارزار کوئی تو رواں دواں چلے جا　　کوئی صحنِ گلستاں ہو تو گذر سنبھل سنبھل کے

(علی جواد زیدی)

اب کسی طفل تسلی میں نہ ہم آئیں گے　　تھپکیاں دے کے سلاؤ نہ بہت رات گئے

(زیدی جعفر رضا)

انسان دشمنی کی ملے گی انہیں سزا　　جو ہٹ گئے ہیں جادۂ امن و اماں سے دور

(پروفیسر فخر)

سید حرمت الاکرام ———— مرزاپور

آپ کے پہلے ہی جملے نے تڑپا دیا۔ کیا خبر تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اخلاقی اقدار اور انسانی روایات کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی اور بد اخلاقی کی ایسی فضا میں سانس لینا پڑے گا جو انسان کو انسان کے لئے اجنبی بنا دے۔ آپ کی تو بات ہی اور ہے، خود میں نے اس انقلابِ مسلسل کے دور میں جو کچھ دیکھا ہے اور جن حالات و حوادث سے دوچار ہوا ہوں، اُس کے تحت خیریت پرسی کی زحمت کرنے والے کو بھی اپنا محسن تصور کرتا ہوں۔ اتنے حقائق کا شیرازہ بکھرتے اور اتنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ شدید قسم کی رجائیت پرستی کے باوجود انسان اور حیاتِ انسانی کے خوش آیند مستقبل کی نیک خواہشات کبھی کبھی متزلزل ہو جاتی ہیں اور دل لرز جاتا ہے کہ نہ جانے کچھ دنوں کے بعد موجودہ قدریں بھی جنھیں ہم آپ کم عیار تصور کرتے ہیں، برقرار رہ سکیں گی یا نہیں؟

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ، نیز اس سے زیادہ بگڑے ہوئے مابعد، نوعیت انتہائی جانگداز ہے اور اس کی زہرناکیاں جہاں روح و احساس میں پیوست ہوتی جارہی ہیں، وہیں سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی بڑی دور رس ہیں۔ یہ حالات کسی بھی حساس شخص کے لئے عذاب سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی صحت پہلے سے بھی ایسی نہیں کہ ان سانحات کی تاب لا سکے۔ یہ جنگ اُردو حلقوں کے لئے متعدد اور مختلف نقصانات کا کھلا ہوا پیغام ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ یہ وقفہ طویل تر تو ہو سکتا ہے مگر اس میں تخفیف کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ با ایں ہمہ آپ کی حوصلہ مندی قابلِ مثال ہے۔

دو چار سو صفحات کو مضامین سے پُر کر دینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن فی الاصل "کرشن چندر نمبر" کی اشاعت ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس نمبر کو ایک طرف کرشن چندر اور دوسری جانب "شاعر" کے شایانِ شان بنانا ہے۔ یہ مہم نہیں تو اور کیا ہے؟ بیرونی امداد و تعاون ناگزیر ہے، اور حالات قطعاً نامساعد! خدا آپ کو کامیاب کرے۔

اِدھر کچھ دنوں کے اندر "شاعر" اور "نیا دور" وغیرہ میں آپ کی جو نظمیں مطالعہ سے گزری ہیں، اُن میں وہ کرب ناک شدت نمایاں ہے جس کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ اس کرب ناکی کو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کا تجزیہ بھی ممکن ہے۔ لیکن مداوا محال ہے۔

تازہ غزل [illegible] جذبۂ شاعر کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور ایسی غزلوں کی داد آپ ہی جیسے اہلِ نظر سے مل بھی سکتی ہے۔ [illegible] ہر کسی کو یہ بھی نہیں سکتی۔

مناظر عاشق ہرگانوی ——— ہرگانواں (بہار)

"آپ نے جس خلوص سے شفیق (جونپوری) مرحوم پر لکھنے کی دعوت دی ہے، شاید میں اس کا اہل نہ تھا لیکن آپ کی فرمائش پر میں ضرور اپنی صلاحیت کو صرف کروں گا۔ آپ نے جس محبت سے خط لکھا ہے، اس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اُمید کہ آئندہ بھی اپنی شفقت سے محروم نہ رکھیں گے۔

علی گڈھ سے ایک کرم فرما نے اطلاع دی ہے کہ آپ "شاعر" کا کرشن چندر نمبر نکال رہے ہیں۔ یہ اطلاع یقیناً مسرت بخش ہے۔ لیکن اس کے لئے کافی محنت، سرمایہ اور وقت درکار ہے۔ کیونکہ کرشن چندر کا حق ادا کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ توقع ہے کہ یہ نمبر کرشن چندر کے شایانِ شان ہوگا اور "شاعر" اپنی دیرینہ روایات پر قائم رہتے ہوئے یہ نمبر پیش کرے گا۔

افتخار احمد فخر دصولیوی ——— جلگاؤں

"ستمبر کا "شاعر" نظر نواز ہوا۔ اداریہ سے لے کر علمی، ادبی اور تہذیبی خبروں تک دلچسپی سے پڑھا۔ حالات کے پیشِ نظر "اداریہ" میں آپ کا پیغام بہت برمحل ہے۔ اُردو کے شعراء اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہیں۔ ملک کے تحفظ کے جذبات اور حب الوطنی اُن کی ولولہ انگیز تخلیقات سے عیاں ہے۔ جو آئے دن اخبارات و رسائل کی زینت بن رہی ہیں۔ ریڈیو اور مشاعروں کے ذریعہ عوام تک وہ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ جس کی توثیق ملک کے لیڈروں کی تقاریر سے بھی ہو رہی ہے۔ اور اُردو کی اہمیت کا اندازہ اب اُنھیں بھی ہو رہا ہے۔

مقالات میں پروفیسر زرینہ ثانی نے ایک ایسے قدیم، شمعِ اردو کے پروانے اور ادبِ اُردو کے پیرِ مغاں پر قلم اُٹھایا ہے جو میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہے اور جس کے پیالے سے ہر رنگ کی شراب چھلک رہی ہے۔ اُردو کے ناقدین نے واقعی اس قدیم خادمِ اُردو پر ہنوز توجہ نہیں فرمائی ہے۔ موصوفہ کا مضمون اپنی جگہ بہت خوب ہے مگر ع "دریا نہیں کار بندِ ساقی"۔ موصوفہ نے نوائے راز کا جس انداز سے جائزہ لیا ہے وہ قارئین "شاعر" سے اس کا متقاضی ہے کہ ع

محرم نہیں ہے تو ہی "نوا ہائے راز" کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محی الدین احمد نے فضلی کی "چشمِ غزال" کی روشنی دُور تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور "چشمِ غزال" کی خوبصورتی سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ یوسف ناظم پر عروج احمد عروج کے انٹرویو نے ناظم صاحب کے قیامِ جلگاؤں کی یاد تازہ کر دی۔ اُن کی نثر واقعی رنگین اور حسین ہوتی ہے۔ انٹرویو میں اُن کے جوابات اُن کے خطرناک حد تک ذہین ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ الغرض مقالات سب ہی اچھے ہیں۔

نظموں میں سلام مچھلی شہری کی "گنگا کی لہریں"، "فاصلے"، "میں پھر آواز دیتا ہوں" اور "پرواز" بہترین تاثرات قائم کرتی ہیں۔ افسانوں میں ضیا حسنی کی کہانی "زمین" کردار نگاری کی اچھی مثال ہے۔ نور پرکار نے "تا۔ سی۔ پھڑکے" کی مراٹھی تخلیق کا اچھا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اُردو والوں کو دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم سے بھی دامنِ اُردو کو مالا مال کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو ڈراموں، بالخصوص اسٹیج کے قابل ایک ایکٹ کے ڈراموں کا اُردو میں فقدان ہے۔ "پاگل" اور "سبز روشنی" بھی اچھے افسانے ہیں۔ غزلوں میں اسین سروش کا اندازِ بیان متانت اور علوئے تخیل کا حسین نمونہ ہے۔ غزل مرصع ہے۔ محسن زیدی، اقبال بیجاپوری، ممتاز راشد اور زیدی جعفر رضا کی تخلیقات پسند آئیں۔

دیگر۔ "اُستاذی پروفیسر سید یحییٰ اشرف ندوی اسکالرشپ فنڈ" کی خبر نے مسرت بخشی۔ خدا اُن کی عمر دراز کرے۔ (آمین) کرشن چندر نمبر کا اعلان طلباء کے لئے مسرت انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں کرشن چندر "ایم۔ اے کے کورس" میں شامل ہیں۔ نمبر کی اشاعت ایم۔ اے کے طلباء کی مشکلات آسان کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ یوں بھی کرشن چندر جدید اُردو افسانہ کا بادشاہ اور اُس کی آبرو ہے۔

ادارہ

محفل اپنی ....!

یہ تازہ شمارہ

اکتوبر ۶۴ء کا تازہ شمارہ حاضر ہے۔ پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ "شاعر" مہینہ کے شروع یا وسط میں شائع ہونے لگے۔ ملک کے موجودہ ہنگامی حالات نے کچھ اور دشواریاں پیدا کردی ہیں۔ ان دشواریوں پر بہرصورت قابو پانا ہے اور "شاعر" کی روایات کو قائم رکھنا ہے۔

اکتوبر کی یہ تازہ اشاعت اپنے دامن میں بڑی رنگا رنگ تخلیقات لئے ہوئے ہے۔ اس میں خیال انگیزی اور فکر و نظر کا کافی مواد ہے۔ اس کا پہلا ہی مقالہ "مرزا غالب علم الاعداد کی روشنی میں" غالب پر ایک بالکل نئے انداز کا مضمون ہے یہ نہ صرف چونکا دینے والا ہے بلکہ غالبیات میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالہ نگار رشید مبارک علی جعفری نے اسے نہایت عام فہم اور اپنے موضوع کے مطابق بھرپور بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مضمون کی قدر ہوگی۔ ندا فاضلی کا مقالہ "نئی نظم۔ نئی کسوٹی" پرانی نسل کے ادباء اور نقادوں کی توجہ چاہتا ہے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں کے راستوں کی تعیین کے لئے نیک اور تعمیری مشوروں کی ضرورت ہے۔ نئے ذہنوں کو در خور اعتنا نہ سمجھنا اور کانوں پر ہاتھ رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ آج کا ذہن تیزی کے ساتھ دوڑ رہا ہے "احمد جمال پاشا کا فن" تدریج ارتقا پذیر ہے۔ اختر بستوی نے اُن کے فن کا مخلصانہ جائزہ لیا ہے۔

حصۂ نظم میں سردار جعفری کی نظم "ہمارے نام" فکر اور فن دونوں اعتبار سے خاصے کی چیز ہے سردار جعفری کی نظر کا عمق بہت زیادہ بڑھ چکا ہے اور وہ اُردو نظم کی ایک اہم علامت بن چکے ہیں۔ ظہیر ناشاد کی نظم "ہم امن کے پجاری" اور قیصر صدیقی کی نظم "اے مری جانِ غزل" حقیقت پسندانہ ہیں۔ اس شمارہ کی طویل ترین نظم "کربِ خود کلامی" کے سلسلے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ نہ صرف ادبی بلکہ سیاسی اور سماجی حلقوں کے لئے بھی ایک لمحۂ فکریہ۔ نظم کے اتنے گوشے اور زاویئے ہیں کہ تا دیر اس پر اظہار خیال ہوتا رہے گا۔ جہاں اس کے فکری پہلو توجہ طلب ہیں، وہیں اس کی فنی حیثیت بھی اربابِ فن کو نظم آزاد کی عروضی وسعتوں کے امکانات کا احساس دلائے گی۔

اس شمارے کے افسانوں میں "قربتِ سنگ" خورشید کی بہترین کہانیوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس میں تجربے نفسیاتی اور جذباتی موثر ہیں۔ شیام کنول کی کہانی "اجنبی راہی" اور یوسف رضا کی "بے خواب کواڑ" بھی کچھ کم اچھی کہانیاں نہیں ہیں۔ ل۔ م شاہد کا ڈرامہ "رنگ، خوشبو اور روپ" ایک ہلکا پھلکا، دلچسپ اور نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ عورت کی ذہنی کشمکش اور تبدیلیوں کا عکاس۔

پچھلے شمارہ میں غزلیں بہت کافی تھیں۔ اس بار کم ہیں۔ لیکن ان میں ایک سے ایک اچھی غزل ہے۔

ہمارا اور آپ کا فرض

ہمارا فرض "شاعر" کے ذریعہ اُردو کے باذوق حلقوں تک بہتر سے بہتر ادب پہنچانا ہے اور آپ کا فرض اس حلقہ کو وسیع کرنا ہے۔ آپ ذرا سی توجہ سے اپنے احباب و اعزا کو "شاعر" کا مستقل خریدار بنا سکتے ہیں۔ "شاعر" نہایت قلیل سالانہ چندہ میں زیادہ سے زیادہ صفحات اور بہتر سے بہتر ادب پیش کرتا ہے۔ ہم قارئین "شاعر" کے احساسِ ادب نوازی سے مسلسل یہ درخواست کرتے آرہے ہیں کہ وہ "شاعر" کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر نہ صرف اس کی بنیادوں کو مضبوط بنائیں بلکہ ادارہ کو وہ حوصلہ دیں جس سے "شاعر" کو اور زیادہ بہتر انداز میں پیش کیا جا سکے۔ "شاعر" کا ہر قاری ہر مہینے ایک دو نئے خریدار ضرور بنا سکتا ہے اور ہم ہر مہینے "شاعر دوستوں" کی ایک طویل فہرست شائع کرنے کی مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔

کرشن چندر نمبر

بدقسمتی سے "کرشن چندر نمبر" کے کاموں میں موجودہ صورتِ حال نے زبردست رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ پھر بھی کام جاری ہے ہندوستان کے اہلِ قلم اب مزید تعویق سے کام نہ لیں اور جلد اپنے مضامین و تاثرات بھیج دیں۔ تاکہ ہم موصولات کی فہرست دینا شروع کر دیں۔

کرشن چندر کے سلسلے کی یادگار تصاویر۔ اُن کے خطوط اور پرانے رسائل میں شائع شدہ مضامین کے تراشوں کی بھی ضرورت ہے۔

بقیہ افسانہ صفحہ ۵۲ "بے خواب کواڑ"

پھر ..... وہ .....

جب رمیش نے پھر آنکھیں کھول کر کملا کو پکارا۔۔" کملی!.... کملا نے فوراً آنکھیں کھول دیں.... "بولو!" ..... دونوں کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں، اور اُن کی سُرخ آنکھوں میں وہی ایک سوال تھا۔ ...."نیند.... ؟" — پھر دونوں کی نظروں میں اپنی جھونپڑی کی گوبر اور گڑھوں والی، اُونچی نیچی، ناہموار زمین گھوم گئی، جس پر وہ تھوڑی دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد بے خبر سو جایا کرتے تھے۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ اِس بستر میں تو اُن کی جھونپڑی کی زمین سے زیادہ گوبر اور گڑھے ہیں۔ اُس سے کہیں بڑے بڑے گوبر بڑے بڑے گڑھے۔

صبح جب انیل نے اُنھیں جگانے کے لئے دروازہ تھپتھپانے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا، وہ صرف بھیڑا ہوا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ رمیش اور کملا اپنے ہاتھوں کا تکیہ اپنے سرھانے رکھے فرش پر پڑے بڑے مزے میں سو رہے ہیں اور مسہری پر بے شمار شکنیں بکھری پڑی ہیں۔

بقیہ ڈرامہ صفحہ ۵۵ — رنگ، خوشبو اور رُوپ

مسٹر اقبال، اُس کی پھڑ پھڑاہٹ کا تماشا دیکھا ہے۔ اُس پر کیا گزرتی ہے؟

اقبال — اب تک تو نہیں لیکن اب پکڑ کر دیکھتا ہوں، اب پھڑ پھڑاہٹ کا تماشا کروں گا۔

(اقبال ذکیہ کو پکڑنے کے لئے اُس کی طرف بڑھتا ہے اور اپنے ہاتھوں میں اُسے محصور کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن ذکیہ پھڑ پھڑا کر اُس کی گرفت سے نکل جاتی ہے۔ اُس کا چہرہ ارغوانی ہو گیا ہے وہ بڑی سُرعت سے کمرے کے دُوسرے سرے پر پہنچ جاتی ہے، یعنی کے دروازے کے قریب)

اقبال — (ذکیہ کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے) بولو قید منظور ہے یا پسند کرتی ہو۔ جلدی بولو عورت کے آخری گُر دیپا آنا چاہتی ہو یا نہیں ..... اور شادی...

ذکیہ — (گھبرائے ہوئے، ہنستے ہوئے، ہانپتے ہوئے) شادی۔ ہاں میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے مگر تم سے نہیں...

(یہ کہتے ہوئے ذکیہ دروازے سے جلدی سے نکل جاتی ہے۔ اقبال بلکی ہنسی کے ساتھ ذکیہ کو پکڑنے کے لئے دروازے تک آتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

دو نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مضامینِ رشید

از ——— پروفیسر رشید احمد صدیقی

رشید صاحب اُردو ادب میں جو بلند مقام اور انفرادیت رکھتے ہیں اُس کے متعلق تو یہاں کچھ نہیں کہنا ہے۔ صرف "مضامینِ رشید" پر تبصرہ مقصود ہے۔ رشید صاحب کے مضامین کا ایک مجموعہ مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اُردو نے چھاپا ہے۔ انجمن کے شائع کردہ اس ایڈیشن میں "دھوبی" اور "سرگزشتِ عہدِ گل" دو نئے مضامین شامل کر کے "چند اماموں"، "مضمون" اور "گھر" تین مضامین نکال دئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان مضامین پر رشید صاحب نے نظرِ ثانی بھی کی ہے اور کافی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ ابتدا میں اُنھوں نے "کچھ اپنے اور کچھ ان مضامین کے بارے میں" لکھا بھی ہے اور اُن کے اس اشارے کے باوجود کہ اسے انکسار نہ سمجھا جائے، یہ تحریر نہ صرف کسرِ نفسی ہی پر مبنی ہے بلکہ اس سے ایک ذہنی و دماغی کاہلی کا بھی کچھ نہ کچھ احساس ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سال سے رشید صاحب نے لکھنا قریب قریب ترک کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادبی حلقوں میں اپنے کسی ذکر کو بھی پسند نہیں فرماتے۔ پچھلے دنوں اُن کا ایک اعلان بھی شائع ہوا تھا جس میں اُنھوں نے اُردو والوں پر سخت پابندیاں عائد کرنے پر زور دیا تھا۔ اُن کے خطوط نہ چھاپے جائیں۔ اُن کے لئے کوئی جلسہ نہ کیا جائے۔ اُن کی طویل علمی و ادبی خدمات کا اعتراف نہ ہو۔ اُن پر نمبر نہ نکالے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

اُردو والے اُن کا جتنا احترام کرتے ہیں اُنھیں جتنا پسند کرتے رہے ظاہر ہے اُن کی اس تہدید کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اُن کی ذہنی تبدیلیوں اور بیزاریوں کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اُن کا اس طرح کنارہ کش ہو جانا اُردو زبان و ادب کی بدقسمتی ہی ہے۔ اُمید یہ تھی کہ یونیورسٹی کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد رشید صاحب زیادہ سے زیادہ لکھیں گے۔ اُن کے قلم سے ادب و تنقید اور طنز و مزاح میں اضافے ہوں گے لیکن ہوا اس کے برعکس!! مجنوں گورکھپوری نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اختر علی تلہری خاموش ہو گئے۔ اثر لکھنوی پیرانہ سالی کے شکار ہو گئے۔ نیاز فتحپوری پاکستان چلے گئے اور رشید صاحب کے بعد میں آنے والے ادیبوں اور نقادوں میں سید احتشام حسین پروفیسر آل احمد سرور کی دلچسپیاں بھی کم ہو گئیں۔ شاعری کے نئے نقاد پیدا ہونے بند ہو گئے۔ نئی نسل کے لکھنے والے سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا۔ تنقید صرف دیباچوں اور تبصروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ رشید صاحب نے ان باتوں کا ذرا بھی احساس نہیں کیا۔ اُنھیں بعض مخلصین نے بار بار جھنجھوڑا بھی مگر بے سود۔ آج عام طور پر مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اُردو ادب و تنقید کی صحیح طور پر تعلیم نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ کالجوں سے نکلنے والے اُردو طالب علم کچھ بھی نہیں بن پاتے۔ دوسری طرف یہ عالم تھا کہ رشید صاحب کے پڑھائے ہوئے طلبہ بڑے ادیب، نقاد اور شاعر بن گئے۔ مگر رشید صاحب اس دوران میں اپنے لیکچر ہی مضامین کی شکل میں تحریر فرماتے تو آنے والی نسلوں کو کتنا فائدہ پہنچتا۔ "مضامینِ رشید" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اور اس طرح کی بہت سی دوسری باتیں ذہن سے ٹکراتی ہیں۔

"مضامینِ رشید" میں بیس طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں ان میں سے کئی بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ ہر بار انھیں پڑھنے سے لطف تازہ ہوتا ہے۔ رشید صاحب کے طنز میں بڑی تہیں ہوتی ہیں اور ان کے مزاح میں ایک "معصوم سنجیدگی"، اور یہی معصومیت جو علمی ادبی ماحول سے اُن کے یہاں آتی ہے، قاری کو اُچھال دیتی ہے۔ اس میں سستاپن نہیں ہوتا۔ دیکھئے۔

"اکثر سوچتا ہوں دھوبی اور لیڈر میں اتنی مماثلت کیوں ہے۔ دھوبی لیڈر کی ترقی یافتہ صورت ہے یا لیڈر دھوبی کی! دونوں دھوتے پچھاڑتے ہیں۔ دھوبی گندے چیکٹ کپڑے علیحدہ لے جا کر دھوتا ہے اور صاف اور اجلا کر کے دوبارہ پہننے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیڈر سرِ عام گندے کپڑے دھوتا ہے اور گندگی اچھالتا ہے washing dirty

[illegible] کا تو یہی مفہوم ہے۔
لیڈر کا مقصد نجاست کو دُور کرنے کا اتنا نہیں ہوتا
جتنا نجاست پھیلانے کا۔ دھوبیوں کے لئے کپڑے
دھونے کے گھاٹ مقرر ہیں، لیڈر کے لئے پلیٹ فارم
حاضر ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ دھوبی کپڑے
پھاڑتا ہے، غائب کر دیتا ہے اور اُن کا آب و رنگ
بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن لیڈر کی طرح وہ گندگی کو پائدار
یا رنگین نہیں بناتا، نہ متعدی کرتا ہے۔"

دیکھا آپ نے کیسا علمی اور فکری پیرایہ ہے۔ رشید صاحب کے تمام مضامین اِسی نوع کے ہیں۔ ایک سے ایک دلچسپ مضمون اِس میں شامل ہے۔ کتاب میں جا بجا کچھ اغلاط رہ گئی ہیں اور وہ ایسی ہیں جن کا براہِ راست رشید صاحب پر اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ محض کتابت کی غلطیاں کہی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

"مولانا ہی کی ایماء، اصرار اور ہمت افزائی سے"
"یہاں تذکرہ تھا مولانا کی کلام کی کمیابی اور نایابی کا"
دونوں جگہ "کی" کے بجائے "کے" ہونا چاہئے تھا۔

یہ تو رشید صاحب کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں۔ انھوں نے علمی ادبی اور تنقیدی مضامین بھی کافی لکھے ہیں۔ یہ مضامین بھی شائع ہو جائیں تو ادبی دنیا کو بہت فائدہ ہو۔

کتاب نہایت صاف ستھری چھپی ہے۔ ۲۸۰ صفحات ہیں قیمت چھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) علی گڑھ

جگر کے خطوط

از ——— محمد اسلام

محمد اسلام صاحب نے جگر مرادآبادی مرحوم کو مستقل طور پر اپنا موضوعِ قلم بنا لیا ہے۔ جگر پر ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی زیرِ ترتیب و طبع ہیں۔ بات بہت اچھی ہے، اگر نئی نسل کے تنقیدی ذہن رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ اُردو کے مختلف مشاہیر شعراء اور اُدباء میں سے ایک ایک کو اپنا موضوعِ فکر بنا لیں تو بہت کام ہو سکتا ہے، اور مشاہیر کے کارنامے پوری طرح منظرِ عام پر آ سکتے۔ لیکن اپنے کسی بھی محبوب ادیب و شاعر کو مستقلاً موضوعِ فکر بنانے اور اُس کے فکر و فن پر کتابیں لکھنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ صرف اُسی ادیب و شاعر کی خوبیوں اور خامیوں پر لکھا جائے، اُس کی شخصیت کو نمایاں کیا جائے۔ دوسری شخصیتوں کو گرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ بعض پرستارانِ جگر نے اپنی تحریروں میں کچھ اِسی طرح کی کوششیں کیں۔

زیرِ نظر کتاب میں جگر مرادآبادی مرحوم کے خطوط ہیں۔ اِس سے پہلے جگر کے خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جس میں صرف تسکین قریشی کے نام خطوط تھے۔ لیکن اِس کتاب کے خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں۔ اِن خطوط سے جگر کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جگر مرادآبادی نے اپنی زندگی کا ایک ہی راستہ متعین کرنے کے لئے اپنی شخصیت میں بہت سے رچاؤ پیدا کئے، شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں سے انھوں نے اپنی آخری زندگی کو "خوبصورت اور معصوم" بنا لیا تھا۔ اِن خطوط میں سے بھی بعض میں یہی معصومیت اور بے ریائی ہے۔ جگر کے کردار، اُن کی مجبوریوں اور معذوریوں کا اِن خطوط سے صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا مختصر تعارف اور پھر خود محمد اسلام کا ایک اچھا مقدمہ اِس میں شامل ہے۔ ۵۵ صفحات قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ: سروش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

انوارِ نظر

مرتبہ ——— طالب دہلوی

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی پر بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ حالانکہ وہ انیسویں صدی کے آغاز کی اہم شخصیت ہیں۔ نظر لکھنوی کی اہمیت ایک تو اِس اعتبار سے ہے کہ اپنے دَور میں اُن کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ وہ نہایت صاف ستھرا اور اچھا شعر کہتے تھے۔ وہ دَور عام طور پر غزلوں کا دَور تھا۔ لیکن نظر لکھنوی نے نظم نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ طبع زاد نظموں کے علاوہ چند انگریزی زبان کی نظموں کے بھی کامیاب ترجمے کئے۔ حالانکہ انھوں نے کہیں انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اُن کی مسلّمہ شاعرانہ حیثیت کے علاوہ وہ خدمات اور بھی زیادہ اہم ہیں جو انھوں نے مختلف جرائد و رسائل سے منسلک ہو کر کیں۔ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی اُن تاریخ ساز لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو صحافت کے امکانات کو آگے بڑھایا۔ [illegible] تھے۔

[illegible] میں انھوں نے خود اپنا ایک رسالہ "خدنگ نظر" کے نام سے نکالا تھا۔ پانچ چھ سال نکلنے کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا تھا۔ نظر لکھنوی ۱۹۰۹ء میں منشی دیا نرائن نگم کے رسالہ "زمانہ" سے منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد نے ایک معیاری رسالہ "ادیب" کے نام سے نکالا تھا۔ اس کی ادارت کے لئے بھی نظر لکھنوی ہی کو بلایا گیا تھا۔ ہفتہ وار "آزاد" اور "اودھ اخبار" کے ادارے میں بھی وہ رہے۔

"انوارِ نظر" کے ابتدائیہ سے پتہ چلتا ہے کہ نظر مرحوم کی ایک مبسوط سوانح حیات انجمن ترقیٔ اردو کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔ یہ بھی جناب کالی داس گپتا رضا ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

"انوارِ نظر" میں پہلے تقریباً ساٹھ صفحات میں نظر لکھنوی کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ اس کے بعد نظمیں ہیں۔ غزلوں اور نظموں کو جستہ جستہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر لکھنوی کی شاعری سپاٹ نہیں تھی۔ ان کے یہاں بھاری پن بھی نہیں ہے۔ وہ خوبصورت اور ہلکی پھلکی تراکیب استعمال کرتے تھے۔ انھیں زبان پر دسترس تھی۔ کالی داس رضا نے نظر لکھنوی کا یہ مجموعہ مرتب کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ابھی نظر لکھنوی کا اور بھی کلام ہوگا۔ ان کے کلام کا ایک مکمل ایڈیشن تنقید و تبصرہ کے ساتھ شائع ہونا چاہئے۔

یہ تقریباً ۱۵۰ صفحات کا مجموعہ ہے۔ نظر مرحوم کی تصویر اور ابتدا میں کچھ ان کے حالاتِ زندگی بھی ہیں۔ قیمت دو روپیہ پچیس پیسے۔
ملنے کا پتہ: مسیح بک ڈپو۔ آصف علی روڈ نئی دہلی۔

لمعاتِ اُفق

مرتبہ —— منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کے نام اور اُن کی ہمہ گیر شخصیت سے سب ہی واقف ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر نگار، صحافی، ناول نویس اور ڈرامہ نگار تھے۔ ایک ہی شخص میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ایسی ہمہ گیر شخصیتوں کا احاطہ کرنا، جنھوں نے اپنے پیچھے بہت سا ادبی سرمایہ چھوڑا ہو، مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال اس مشکل کام کو ان کے صاحبزادے منور لکھنوی نے حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ سالِ گزشتہ دہلی کے [illegible] اُفق لکھنوی کی صد سالہ [illegible] کے طور پر ایک [illegible]

دیا تھا کہ افق پر ایک مکمل کتاب شائع ہونی چاہئے۔ چنانچہ کئی سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب بہر اعتبار افق کے کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں افق کی زندگی کے تمام اوراق کو نہایت تحقیق کے ساتھ اُلٹ پلٹ کیا گیا ہے۔ اور اُن کی ایک مکمل سوانح حیات پیش کی گئی ہے۔

افق ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۱۳ء میں اُن کی وفات ہوئی۔ اس اعتبار سے وہ نئے اور پرانے کے درمیان کی ایک کڑی تھے۔ ہر چند انھوں نے بہت کم عمر پائی لیکن وہ ادب و شعر کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے۔ "لمعاتِ افق" میں اُن کی نظم و نثر تحریروں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔ اس میں نثر کے نمونے تو نہیں ہیں۔ لیکن حصۂ نظم میں نظمیں، غزلیں، قطعات، مسدس سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے افق کے فکر و فن کی گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندی اور فارسی شاعری کا کچھ انتخاب بھی اس میں ہے اور منظوم ڈراموں کے کچھ حصے بھی۔ افق کا رجحان مذہب کی طرف بھی تھا سیاست اور سماج کی طرف بھی۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی نثر بھی کافی لکھی لیکن انھیں اس اعتبار سے ایک لقب دیا جا سکتا ہے کہ اُس عہد میں لکھنؤ کے جن شعرا نے نظم نگاری کی طرف توجہ کی اُن میں افق کا نام پیش پیش ہے جس طرح "لمعاتِ افق" میں اُن کا کلام جمع کیا گیا ہے ضرورت ہے کہ "افق" کی نثر کی کتابوں کو بھی از سر نو مرتب کیا جائے۔ نثر کے سلسلے میں جو اشارے کئے گئے ہیں وہ بہت ناکافی ہیں۔

بہرحال منور لکھنوی نے نہایت محنت سے یہ ضخیم کتاب مرتب کی ہے اور ان کا یہ کام بجا قابلِ قدر ہے۔ قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ آدرش کتاب گھر۔ فیض گنج۔ دریا گنج۔ دہلی۔

شاہکار "فراق نمبر"

ماہنامہ "شاہکار" اردو کا بہت ہی اچھا ادبی مجلہ ہے۔ کافی دن پہلے اس نے "فراق نمبر" نکالنے کا اعلان کیا تھا اور پھر طویل انتظار کے بعد یہ نمبر منظر عام پر آ گیا۔ یہ چھوٹے سائز کا تقریباً چھ سو صفحات کا نمبر ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ سرورق پر فراق گورکھپوری کا تصویری اسکیچ ہے اور خوب ہے۔

ابتدائی حصے میں بعض شعرا نے فراق کو خراجِ عقیدت و محبت پیش کیا۔ شخصیت پر [illegible]

تو یہ [illegible] ہے۔ نمبروں کے بعد فراق پر مختلف ادیبوں کے مضامین ہیں۔
فراق اپنے معاصرین کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے کلام پر
اظہار خیال کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس اعتبار سے "شاہکار" کے فراق نمبر کا تنقیدی
حصہ ویسا نہیں ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ ادارۂ "شاہکار" نے تازہ مقالات
لکھوانے کی بہت کوشش کی جس کا اظہار اس نے اپنے اداریہ میں کیا ہے لیکن
اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں چند ہی نئے مضامین ہیں۔ فراق کی شخصیت
اب جس طرح ابھر چکی ہے اور اب اس پر جس بھرپور انداز میں اظہار خیال ہو سکتا
ہے وہ پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں ملک میں ادیبوں کی کمی نہیں پھر بھی جب
شخصیتوں پر لکھنے کا وقت آتا ہے تو گریز کیا جاتا ہے۔ فراق کے اپنے بعض
حلقے بھی بعض نقادوں کو قلم اٹھانے سے روکتے ہیں۔ خود ادارۂ شاہکار نے
فراق نمبر کے اداریہ میں لکھ کر

"ہماری نظر میں فراق سے بڑی اردو ادب میں کوئی دوسری شخصیت
نہیں، نئی نسل کو فراق صاحب سے زیادہ کسی شاعر نے متاثر نہیں
کیا۔ نظم اور رباعی میں ان کے تجربوں نے اردو شاعری کو
ایک نیا موڑ دیا۔"

اپنے کسی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ایسی ہی باتیں
ادبی دنیا میں افتراق و انتشار پیدا کرتی ہیں۔ فراق بڑے ہی نہیں بہت بڑے
شاعر و ادیب ہیں نہ صرف یہی بلکہ ایک صاحب نظر نقاد اور مختلف زبانوں کے
اسکالر، ان کی غزلوں میں بہت سے اشعار اپنی فکر اور اپنے اسلوب کے
اعتبار سے "تازہ تر" کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی عظمت کی اور
بھی بہت سی نشانیاں مل سکتی ہیں لیکن یہ کہنا کہ اردو ادب میں ان سے
بڑی کوئی دوسری شخصیت نہیں، غلو اور مبالغہ پر مبنی ہے۔ فراق کو جہاں ہم
عہد آفریں مان سکتے ہیں وہیں ان کے فکر و فن میں [illegible] باتیں بھی
جگہ پاتی ملتی ہیں۔ فراق کے یہاں کمزوریاں بھی ہیں اور دونوں کا یہ
اظہار خیال ہونا چاہیے۔

"فراق نمبر" کچھ خالی خالی اور بجھا بجھا سا معلوم ہوتا ہے۔ فراق
کی شخصیت میں جو کشش ہے۔ وہی اس نمبر میں ہونی چاہیے تھی۔ یہاں تک کہ اس کا
تصویری حصہ بھی سونا سونا سا معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو تصاویر کم ہیں دوسرے
ان کی تاریخی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنے
ضخیم نمبر میں فراق کے حالاتِ زندگی اور ان کی طویل ادبی خدمات
کی کہانی نہیں ہے۔

فراق نمبر کا آخری سوا دو سو صفحات کا حصہ خود فراق
کی نظم و نثر کے انتخاب کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اس میں فراق کے
کئی اچھے نثری مضامین شامل ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا
انتخاب خلیل الرحمن اعظمی نے کیا ہے جو کافی اچھا ہے۔ مجموعی حیثیت سے
فراق نمبر اس قابل ہے کہ اسے ہر اردو دوست اور فراق کی شخصیت سے
دلچسپی رکھنے والا دیکھے۔ ادارۂ "شاہکار" نے بہرحال ان تمام نمبروں کی
اچھا نمبر نکالا ہے جو اب تک ہندوستان میں شخصیات پر نکل چکے ہیں۔

اس نمبر کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:-
مینیجر ماہنامہ "شاہکار" ممتاز باغ لوکر گنج الہ آباد ۳

علمی - ادبی - اور تہذیبی خبریں

ہندی کے بعد سب سے زیادہ تعداد اُردو اخبارات کی ہے

نئی دہلی ۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء، اخبارات کے رجسٹرار برائے ہند نے ہندوستان بھر میں اخباروں کے متعلق ۱۹۶۴ء کی جو رپورٹ جاری کی ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۴ء کے دوران ملک میں جو اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہے اُن میں ۵۱۴ روزنامے۔ ۴۶ ہفتہ میں ۲ یا ۳ بار اور سہ روزہ شائع ہونے والے اخبارات ۲۳۱۱ ہفتہ وار اور ۵۲۹۰ رسائل تھے۔ گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۹۶۴ء کے دوران روزناموں کی تعداد میں ۱۱ کا، ہفتہ وار اخباروں میں ۱۴۸ کا، سہ روزہ اور ہفتہ میں تین بار شائع ہونے والے جرائد میں ۳ کا اور رسائل کی تعداد میں ۲۱۵ کا اضافہ ہوا۔

کل ۵۱۴ روزناموں میں سب سے زیادہ تعداد ہندی اخبارات کی تھی جو ۱۴۹ ہے۔ اُردو دوسرے درجہ پر رہی۔ اُردو میں شائع ہونے والے روزناموں کی تعداد ۷۸ تھی۔ انگریزی تیسرے درجہ پر رہی جس میں شائع ہونے والے روزناموں کی تعداد ۵۶ تھی۔ نئے روزناموں میں ہندی زبان کے روزناموں کی تعداد دس اور اُردو کی چھ تھی۔

کہانی نگار ظفر احمد ڈائریکٹر بنا دئے گئے

اُردو کے معروف کہانی نگار جنہوں نے کہانیوں کے علاوہ اچھے ڈرامے بھی لکھے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ پچھلے سال سے گورنمنٹ کے نیشنل اسکول آف ڈرامہ میں فنِ ڈرامہ کی عملی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مئی ۱۹۶۵ء میں ظفر احمد نے یہ تین سالہ کورس مکمل کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی یہی نہیں بلکہ "نیشنل اسکول آف ڈرامہ" کی طرف سے سالِ رواں کے تین بہترین ڈائریکٹروں میں سے اُنھیں ایک ڈائریکٹر منتخب کیا گیا۔ ڈائریکٹرشپ کے کورس کے لئے ظفر احمد نے جو ڈرامہ ڈائریکٹ کیا اُسے بعد سراہا گیا اور انہیں "ناٹیہ اکاڈمی" کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ ظفر احمد فنِ ڈرامہ کی عملی تعلیم کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ظفر احمد رانچی (بہار) کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

کشمیر میں قدیم قلمی کتابوں اور دستاویزوں کے مائیکرو فلم

سرینگر۔ یہاں ریاستی محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کیا ہے۔ جس کے تحت تاریخِ کشمیر کے متعلق پُرانی سنسکرت، عربی اور فارسی کتابوں، کاغذات اور دستاویزوں کے مائیکرو فلم حاصل کئے جائیں گے۔

قرونِ وسطیٰ میں کشمیر فارسی زبان، اور ادب و شعر کا ایک مشہور مرکز تھا اور اُس کو ایرانِ صغیر (چھوٹا ایران) کہا جاتا تھا۔

راجستھان ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے انعامات

راجستھان ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۵-۶۶ء کے لئے بہترین کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعامات صرف راجستھان کے ہندی، سنسکرت، راجستھانی اور اُردو ادیبوں کو دئے جائیں گے۔ یہ انعامات مکمل یا ایکانکی ڈراموں، تنقید، شاعری، ناول، کہانی، سوانح اور بچوں کی کتابوں پر دئے جائیں گے۔ یہ رقم مساوی طور پر ہر زبان کے لئے پانچ پانچ سو روپیہ ہوگی۔ تفصیلات، شری منگل سنگھ۔ ادبی سکریٹری راجستھان ساہتیہ اکاڈمی اُودے پور (راج) سے حاصل کیجئے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی کتاب کا ترکی میں ترجمہ

حیدرآباد۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی کی کتاب "مسلمانوں کے سیاسی نظریات" کا ترکی کے ایک مصنف مسٹر کمال توغچی نے ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اِس ترجمہ شدہ کتاب کا نسخہ مترجم نے فاضل مصنف کو بھیجا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ جب کسی اُردو زبان کی کتاب کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا گیا ہے۔

قائم چاند پوری - حیات اور فن پر ڈاکٹریٹ

سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے اُردو فارسی کے لکچرر جناب سید عبدالحی صاحب نے قائم چاند پوری۔ حیات اور

نے پہلا پہلا مقالہ بمبئی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لئے داخل کیا تھا بمبئی یونیورسٹی نے اُس وقت اِس میں ایچ سخ گی عنایت کی۔ سید عبداللہ صاحب ... پروفیسر این۔ایس۔گورکر صدر شعبۂ اُردو سینٹ زیویئرس کالج بمبئی کی رہنمائی میں مرتب کیا ہے۔

تصحیح الاغلاط کی اشاعت

حیدرآباد۔ اُردو حلقوں میں یہ خبر مسرّت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ "تصحیح الاغلاط" نامی ڈکشنری مرتبہ احمد علی خاں شائع ہوگئی ہے۔

یادگارِ داغ حضرت زار دہلوی کا انتقال

نئی دہلی، ۷ر اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ہندوستان کے بزرگ ترین شاعر پنڈت شری بھون ناتھ زتشی زار دہلوی کا ۲ر اکتوبر کی شام کو انتقال ہوگیا۔ اُن کی عمر ۹۴ سال تھی۔ وہ پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، مولوی وحید الدین بیخود دہلوی اور علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے ہم عصر اور ہم نشین تھے۔ اتنی طویل عمر اُردو کے کسی شاعر نے نہیں پائی۔

حضرت زار دہلوی سنسکرت، اُردو اور فارسی زبانوں کے متبحر عالم تھے۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تھے۔ تقریباً تیس سال تک مقامی اندرپرستھ کالج میں صدر شعبۂ اُردو و فارسی رہے۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب پر سیمینار

علی گڑھ ۱۹ر ستمبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام ایک سیمینار "اُردو زبان و ادب کا مطالعہ"، دسمبر ۶۵ء میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے رقم فراہم کی ہے سیمینار کا مقصد یونیورسٹی کے شعبوں میں نوجوان اساتذہ کو مضمون کے بارے میں مکمل و جدید معلومات فراہم کرنا اور اُن کو جدید طریقۂ تعلیم و تحقیق کے مقاصد سے روشناس کرانا ہے۔ توقع ہے کہ اس سیمینار میں تقریباً تیس اساتذہ اور دس سینیئر اسکالر شریک ہوں گے۔ جن سینیئر اسکالروں کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے اُن میں ڈاکٹر ایس کے چٹرجی ڈاکٹر ایس۔ایم۔کترے، ڈاکٹر عبدالحق صدیقی، ڈاکٹر ... پروفیسر ایم۔ایچ رضوی، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر ایس احتشام حسین، پروفیسر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر ایم۔ایچ۔خان۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سیمینار میں "زبان کے مطالعہ میں لسانیات کا مقام" "اُردو ادب کی تاریخ کے مطالعہ کے مسائل"۔ "طریقۂ تعلیم نظم" "طریقۂ تعلیم نثر"، "مشرق و مغرب میں تنقید کے اصول"۔ "عملی تنقید" "اُردو میں ریسرچ کے جدید طریقے"۔ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کے انڈر گریجویٹ و گریجویٹ کلاسوں کے لئے کتابوں اور سلیبس کا انتخاب اور تیاری وغیرہ"۔ جیسے اہم مسائل پر بحث ہوگی۔

شاہ نیپال کے کلام کا اُردو ترجمہ

شاہ نیپال مہاراج مہندر دیر بکرم شاہ دیو کا نیپالی کلام اُردو میں منتقل کیا جا رہا ہے اور اُسے ملکۂ نیپال کے نام سے معنون کرنے کی اجازت بھی حاصل کرلی گئی ہے۔

شاہ نیپال نیپالی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ اُن کی تقریباً ساڑھے تین درجن نیپالی نظموں کا مجموعہ "اسٹی کالاگی" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ جو نیپال یونیورسٹی کے ایم۔اے کے نصاب میں داخل ہے۔

اِن نیپالی نظموں کا منظوم ہندی ترجمہ "اُسی کے لئے" کے نام سے اِس سے قبل شائع ہو چکا ہے اور منظوم انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

میر اکاڈمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری نے شاہ نیپال سے اِن کے کلام کا منظوم اُردو ترجمہ شائع کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے

اکبر میموریل کمیٹی الٰہ آباد۔ راجہ جی کی رامائن اور مہابھارت اُردو میں شائع کرے گی

الٰہ آباد۔ الٰہ آباد کی اکبر میموریل کمیٹی نے مسٹر سی راجگوپال آچاری کی دو تصنیفات رامائن اور مہابھارت کو اُردو میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ اعلان کرتے ہوئے کمیٹی کے سکریٹری نے کہا کہ راجہ جی سے اُن کی دونوں تصنیفوں کی اشاعت کی اجازت لے لی گئی ہے۔ اِن کتابوں کے انگریزی اور ہندی ... شائع ہو چکے ہیں۔

"SHAIR"
(36 Years of Publication)
THE ... OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURN...

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات اورور تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
میر عم (عزائی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر ، شاعــــر ، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸

... printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا چھتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

نومبر ۱۹۶۵ء
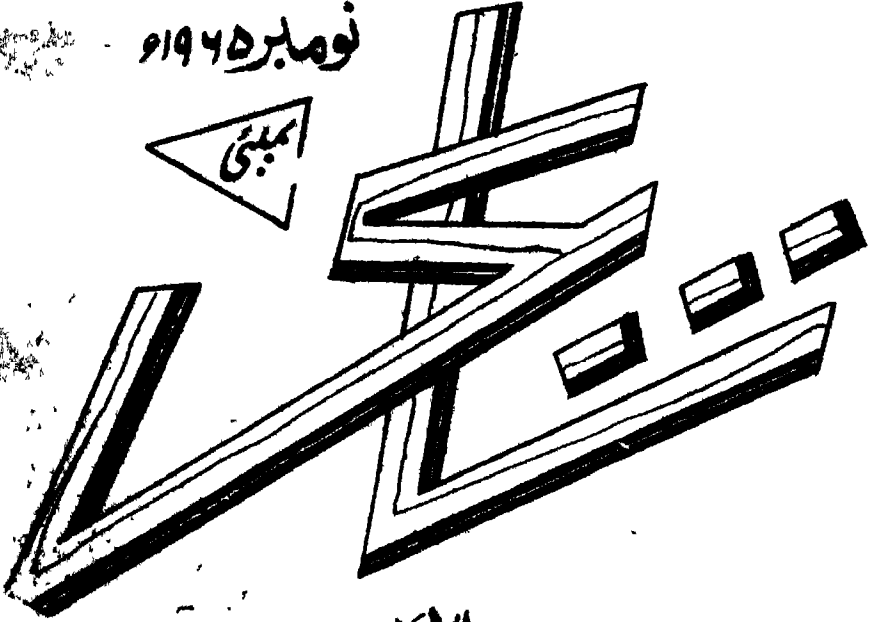
بمبئی

شاعر

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

فی پرچہ	ممالک غیر سے	زر ششماہی	زر سالانہ
۱۰ آنے (۶۲) پیسے	۱۶ شلنگ	چار روپے	سات روپے

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۵۲۶ ۔ بمبئی ۔ بی سی
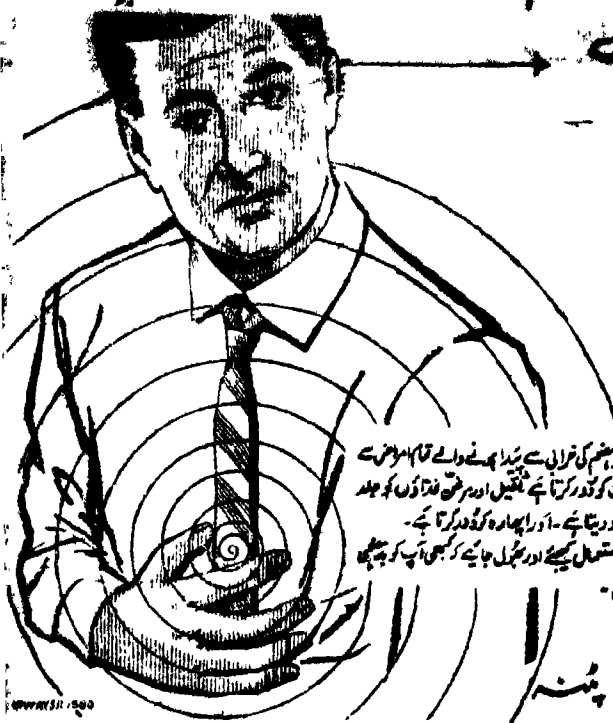
بدہضمی ؟
پیچول
استعمال کیجیے
نیا
پیچول آپ کو ہضم کی خرابی سے پیدا ہونے والے تمام امراض سے
بچاتا ہے۔ تیزابیت کو دور کرتا ہے ثقیل اور مرغن غذاؤں کو جلد
ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور اپھارہ کو دور کرتا ہے۔
آج ہی پیچول استعمال کیجیے اور بھول جائیے کہ کبھی آپ کو بدہضمی
کی شکایت بھی تھی۔
دہلی · کانپور · پٹنہ

شاعر
بمبئی
نومبر ۱۹۶۵ء

ترتیب

افکار ادارہ

مقالات

نظمیں

افسانے

ڈرامہ

غزلیں

مکتوبات

ایم اے ناز قادری

ادارۂ شاعر
فخر و مسرت کے ساتھ
اردو کی آٹھ مایۂ ناز شخصیتوں پر
علی الترتیب
نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر
پیش کرنے کا ہنگامی اعلان کرتا ہے
(۱) کرشن چندر نمبر
(۲) سردار جعفری نمبر
(۳) رشید احمد صدیقی نمبر
(۴) راجندر سنگھ بیدی نمبر
(۵) احتشام حسین نمبر
(۶) خواجہ احمد عباس نمبر
(۷) کنھیا لال کپور نمبر
(۸) ساحر لدھیانوی نمبر
ان کے علاوہ
دیگر مشاہیر اردو پر بھی
"شاعر"
فقید المثال
نمبر پیش کرے گا
(۱)
اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار
کرشن چندر
کی منفرد شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر
نہ صرف ہندوپاک کے مشہور قلمکاروں بلکہ دنیا کے
کئی بڑے مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات
کرشن چندر نمبر
میں
پبلش کیے جائیں گے
کرشن چندر
کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ۔ اُس کی عظمت کی
کہانی۔ اُس کی تصانیف کا جائزہ اُس کے زندہ
اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں
اور ڈراموں پر تنقیدی نظر
عالمی ادب میں کرشن چندر کا مرتبہ
درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجیے
اربابِ قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

جہات

حکومتِ مہاراشٹر اور اُردو

صوبۂ مہاراشٹر عموماً اور اس کا دارالخلافہ بمبئی خصوصاً اپنی تہذیبی، لسانی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور انتظامی روایات کے اعتبار سے دوسرے صوبوں سے نہ صرف مختلف بلکہ مابہ الامتیاز ہے۔ اس کی غذائی، لسانی اور ترقیاتی پالیسیاں دوسرے صوبوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ بے شمار چھوٹی بڑی زبانوں کا صوبہ ہے اور یہاں کی مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے قریب ہو کر ایک نئی تہذیب بن گئی ہیں۔ بمبئی تقریباً چھیالیس لاکھ آبادی کا شہر ہے لیکن کیا مجال کہ اس کے انتظامیہ میں کوئی بڑا جھول آ جائے۔ لسانی اعتبار سے بھی یہ صوبہ اور اس کا یہ بڑا شہر ہمیشہ پُرامن رہا ہے۔

جہاں تک اُردو زبان کا سوال ہے پورے ملک میں لسانی دنگوں کے باوجود مہاراشٹر میں اُردو پر اتنا دباؤ نہیں ہے جتنا دوسرے صوبوں میں ہے۔ یہاں کی تین بڑی زبانیں مراٹھی، گجراتی اور اُردو ہیں۔ صوبۂ گجرات کے علٰحدہ ہو جانے سے مراٹھی کے بعد دیسی زبانوں میں سب سے زیادہ جاننے والے اور بولنے والے اُردو ہی کے ہیں۔ صوبۂ مہاراشٹر کی تشکیل کے وقت اس کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر وائی۔ بی۔ چوہان نے مختلف جلسوں میں یہ بات صاف طور پر کہی تھی کہ اب مراٹھی کے بعد بمبئی میں دوسری زبان کا درجہ اُردو کو ملے گا۔

بمبئی میں بڑی تعداد میں ایسے ثانوی مدارس ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ ان کے علاوہ میونسپلٹی کے پرائمری اور پرائیویٹ پرائمری اُردو اسکولوں کی تعداد کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ سالِ گزشتہ ان اُردو مدارس کے لئے نصاب کی جو تین کتابیں حکومت نے شائع کی تھیں ان میں سے ہر ایک کی تعداد چالیس ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ مکتبہ جامعہ کا اُردو نصاب ہزاروں کی تعداد میں خریدا جاتا ہے۔ علمی، ادبی اور شعری کتابوں کے لئے بھی اس کا مارکیٹ وسیع ہے۔ "شمع" اور "بیسویں صدی" کی کئی ہزار کاپیاں یہاں کھپ جاتی ہیں۔ بڑی اشاعت کے اُردو روزنامے بھی یہاں سے نکلتے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے "اُردو ٹریننگ اسکول" بھی ہے اور کئی کالجوں میں اُردو ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کاروباری زبان عام طور پر اُردو ہی ہے۔ یوں گجراتی اور مراٹھی زبانیں جاننے والے موقع بہ موقع ان دونوں زبانوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی دفتر یا کسی دوکان اور کاروباری ادارے میں اُردو نہ سمجھی جاتی ہو۔ بڑے بڑے ہونے والے مشاعروں کا یہ حال کہ ان کے ہزاروں سامعین میں خاص اُردو کے لوگ کم اور دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ ریڈیو پر کبھی مشاعرہ ہو تو گھر گھر، دوکان دوکان اور بازار بازار ریڈیو سیٹ کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ اُردو میں ہر روز ہونے والے پروگراموں سے غیر اُردو داں طبقہ زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ یہ ہے بمبئی میں اُردو زبان کے چلن کا ایک اجمالی خاکہ۔

سوال یہ ہوگا کہ پھر تو صوبۂ مہاراشٹر اور اس کے قلب "بمبئی" میں اُردو کا کوئی خاص مسئلہ ہی نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بمبئی کے علاوہ اس صوبے کے بعض شہروں میں اُردو زبان کے لئے کم و بیش وہی دشواریاں ہیں جو دوسرے صوبوں میں ہیں۔ یہاں دشواریوں کا تعلق اُردو تعلیم سے زیادہ ہے اور بعض اُن مراعات سے بھی جو حکومت کی طرف سے اُردو زبان کو دی جانی چاہئیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس صوبہ میں صحیح جمہوری نظام ہے اور جمہوری اصولوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس صوبہ کی لائقِ تعریف حکومت نے وہ اقدامات نہیں کئے ہیں جو اسے اپنے صوبے کی اس بڑی زبان "اُردو" کے لئے کرنے چاہئیں۔ سرکاری سطح پر لاکھوں اُردو جاننے والوں کے لئے صوبۂ مہاراشٹر میں جو امور حکومت کی توجہ چاہتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ سرکاری اطلاعات اور قوانین دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی الگ سے شائع ہوں۔

۲۔ دہلی سے ایک سرکاری ماہنامہ "آج کل" شائع ہوتا ہے۔ دوسری صوبائی حکومتوں میں آندھرا پردیش سے رسالہ "آندھرا پردیش"، اُتر پردیش سے "نیا دور"، پنجاب سے "پاسبان"، بہار سے "بہار کی خبریں"، کشمیر سے "جائزہ"، مغربی بنگال سے "مغربی بنگال" اور راجستھان سے "نخلستان" شائع ہوتے ہیں۔

صوبۂ مہاراشٹر سے بھی اُردو کا ایک اچھا سرکاری ماہنامہ نکلنا چاہئے۔ اور وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہ صرف کامیاب ہوگا بلکہ صوبے کے مفید و [illegible] کاموں کی تبلیغ بھی ہو سکتی ہے اور اُردو زبان و ادب کی سرپرستی بھی۔ یہ قومی یکجہتی بھی پیدا کرے گا۔

راز چاند پوری

داستانے چند

(۴)

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

مولانا سیماب اکبرآبادی مرحوم نے ذہن رسا اور ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ وہ ہر موضوع پر نظم و نثر میں بے تکلف اظہارِ خیال کر سکتے تھے اور بیشتر قدرے غور و تامل کے بعد قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ زود گوئی اور زود نویسی میں وہ اپنے وقت میں منفرد تھے۔ اُنھوں نے اتنا سرمایۂ نظم و نثر اپنی یادگار چھوڑا ہے کہ بیک وقت اس کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔

مولانا سیماب نے کلیم عجم میں، "شعر الحیات" کے ذیل میں اپنی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۲۸۴ لکھی ہے۔ افسوس ہے ان کتابوں کی کوئی فہرست اُنھوں نے مرتب نہیں کی۔ بظاہر یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے لیکن جو لوگ اُن کی ذات و صفات سے واقف ہیں وہ بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس امر میں مبالغہ بھی ہوگا تو جائز شاعرانہ حد تک ہوگا۔ اس تعداد میں یقیناً تمام چھوٹی بڑی نظم و نثر کی کتابیں شامل ہوں گی جن کو اُنھوں نے دوسروں کی فرمائش پر اُن ہی کے نام سے تصنیف و تالیف کیا تھا اور وہ تمام کتابچے بھی جو اُنھوں نے خود لکھے تھے اور بر بنائے مصلحت دوسروں کے نام سے منسوب کر دیے تھے، نیز وہ کتابچے بھی شامل ہوں گے جو انھیں کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ خاص طور سے "نفیر غم" اور "فریاد" یہ دونوں پہلے کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ اور اب "نیستاں" میں شامل ہیں۔

کلیم عجم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا سیماب چودہ پندرہ سال اور زندہ رہے۔ اس طویل عرصے میں اُنھوں نے اور کتابیں بھی مرتب کی ہوں گی۔ مثلاً دستور الاصلاح اور کلام پاک کا منظوم ترجمہ۔ قصر الادب کی بنیاد رکھنے سے پہلے اُنھوں نے دو ادارے اور قائم کئے تھے:

(۱) دار الترجمہ و دار الاصلاح، آگرہ۔ (پیمانہ دسمبر ۱۹۲۸ء)

(۲) دار التصنیف دہلی، بزمانۂ قیام دہلی۔ اس وقت وہ اخبار "ریاست" دہلی کے شعبۂ ادارت سے منسلک تھے۔ دار التصنیف دہلی سے "پیمانہ" کا ایک نمبر (جنوری ۱۹۳۰ء) بھی شائع ہوا تھا۔

اِن اداروں میں بھی کچھ کتابیں اور ترجمے مرتب کئے گئے ہوں گے۔ اس طرح اُن کی تصانیف و تالیفات کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔

مولانا سیماب نے کلیم عجم میں اپنی مطبوعہ، غیر مطبوعہ اور زیرِ تصنیف و ترتیب کتابوں کی جو فہرست دی ہے، وہ بہت مختصر ہے۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"تصنیف و تالیف کا شوق تو مجھے عہدِ طفولیت سے ہے۔ اس وقت تک دو سو چوراسی (۲۸۴) کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہینِ کشش ہیں، جو ناشرین کتب سے حقِ تالیف لے کر میں نے لکھیں، یوں میں خواہش کے لئے ... لکھا ہے ... بھی ہے"۔ (کلیم عجم)

اور حسبِ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ جامع المکتب اور عزیز المکتب۔ (خطباتِ عربیہ کے منظوم تراجم)

(۲) الہام منظوم ترجمہ مثنوی مولانا روم۔ (چھ جلدیں)

(۳) سیرت الحسین، سیرت الکبریٰ اور بنتِ رسول۔

(۴) ابو العلائی۔ (چار کتابیں)

(۵) پیامِ تازہ اور پیامِ مراثی۔

(۶) معلّمہ - لڑکیوں کی تعلیم کے لئے۔

اِن کے علاوہ پیمانہ آگرہ، اپریل ۱۹۳۲ء سے اُن کی بعض دوسری تالیفات کا بھی علم ہوتا ہے یعنی (۱) نورجہاں بیگم۔ (۲) زیب النساء (۳) سوانح خواجہ غریب نواز۔ (۴) اللہ والوں کی محفل۔ (۵) زیورِ ایمان۔ (۶) آرشادِ احمدی (۷) زنانہ لسبتہ (دو کتابیں) (۸) خطوطِ عنت اور (۹) زنانہ خط و کتابت۔

جو کتابیں ادبی مرکز "قصر الادب" کی ذاتی ملکیت ہیں، اُن کی تعداد پندرہ ہے۔ ان میں سے (۱) کارِ امروز (۲) کلیم عجم۔ (۳) نے ستاں۔ اور (۴) ساز و صبوحی شائع ہو چکی ہیں اور شاید پیام فردا، "ساز و آہنگ" کے نام سے، تورات الشرق "مسکرۃ المنتہیٰ" کے نام سے اور پیغامات بھی "شعر انقلاب" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے علاوہ سیاسی و ہنگامی رباعیوں کا مجموعہ "عالم آشوب" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے اور سلام و مراثی کے دو مجموعے "سرِ دیم" اور "نغمۂ غم" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا سیاب اوّل و آخر شاعر تھے۔ اُن کی شاعرانہ شخصیت و شہرت کی وجہ سے اُن کی نثری تخلیقات کی طرف کسی نے آج تک کوئی خاص توجہ نہیں کی، اگر کسی نے توجہ کی ہوگی تو مجھے اِس کا علم نہیں۔ نثر کی جانب توجہ نہ کرنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کی تمام نثری تخلیقات کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔

کلام سیاب، خصوصاً اُن کی غزل گوئی کے متعلق موجودہ دَور کے مبصرین و ناقدین کی آراء کا خلاصہ بقول حضرت مجنوں گورکھپوری یہ ہے۔

"وہ خود بڑے مشّاق شاعر ہیں اور شعر کہنے میں اُنھیں مطلق زحمت نہیں ہوتی۔ اُن کے یہاں کافی تعداد اچھّے اشعار کی نکل آتی ہے، مگر اُن میں کسی خاص جمالیاتی بصیرت یا وجدانی تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔" (دوش و فردا ص ۱۴۹)

لیکن اِس قسم کی آراء کو نہ مطلق حقیقت کہا جا سکتا ہے نہ مطلق مجاز۔ ہر مبصر کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کے بارے میں اپنی صوابدید کے مطابق کوئی رائے قائم کرنے اور اُس کے اظہار میں آزاد ہوتا ہے۔ اُس کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ اُس پر نقد و نظر بھی، لیکن اُس پر کم نگاہی و تعصب کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اِس موضوع پر کسی آیندہ داستان میں گفتگو کروں گا۔ یہاں یہ "معترضہ" پیش کرنے کی ضرورت اِس لئے محسوس ہوئی کہ بعض مبصرین مولانا سیاب کی نثر کے متعلق بھی وہی حسنِ ظن رکھتے ہیں جو اُن کی نظم و غزل سے متعلق ہے۔

اہلِ قلم و صاحبانِ نظر اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ موضوعِ گفتگو کے لحاظ سے زبان و اندازِ بیان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ علمی و تاریخی موضوعات پر ادبی و شاعرانہ زبان میں اظہارِ خیال کرنا، اُن کی اہمیت و افادیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ مولانا سیاب نے بھی موضوعِ سخن کے لحاظ سے زبان و بیان اختیار کیا ہے۔ کہیں مرصّع اور کہیں سادہ، لیکن اُنھوں نے جو ہمہ گیر طبیعت پائی تھی، اُس کی بنا پر وہ ہر رنگ میں حادۂ سخن سے بہرہ در رہتے۔

مندرجۂ ذیل مختصر اقتباسات سے مولانا سیاب کے اسلوبِ نگارش و اندازِ بیان کا کچھ اندازہ کیا جا سکے گا۔ اِن میں مرصّع نگاری اور سادہ کاری، دونوں قسم کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اِن کو فراہم کرنے میں کسی خاص کاوش سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ ع

پا یا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

تلاش و جستجو کے بعد اِن سے بہتر نمونے بھی مل جائیں گے۔

(۱) جشنِ شگوفہ

"شگوفہ کے جشن کا ایک خاص کرشمہ یہ ہے کہ اِس میں لطافتیں زیادہ شریک ہوتی ہیں۔ ہلکی ہلکی رنگین ساریاں اور غنچہ رنگ چہرے، اِس جشن کو اور بھی صبیح بنا دیتے ہیں۔ رقاصۂ چمن "تیتری" جب ایک مستقل اضطراب کے ساتھ شگوفوں پہ رقص کرتی ہے تو نظر لرزش میں آجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شگوفوں کا "غبار رنگین" شگوفوں کی بلائیں لے رہا ہے۔ نوخیز کلیاں بھی اِس جشن میں شریک ہوتی ہیں، لیکن اُن کی طرف کوئی اِس لئے نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتا کہ آدابِ جشن کے خلاف شگوفوں کو ناگوار نہ ہو۔"

(پیمانہ (آگرہ) نومبر ۱۹۲۳ء)

Jashne Swagoofa

(۲) وادیٔ "عنقرہ" کے ایک غار میں

"ترکستانِ بعید کی رزم گاہیں جب "اُقتل" "وَاضرب" کے محشر آفریں ہنگاموں سے گونج رہی تھیں، عین اُسی زمانے میں قبیلۂ "ناصری" کا ایک نوجوان، پیکرِ وفا "ناظم" محبت سے شکست پائے ہوئے دل کی تڑپ سے مجروح پڑا تھا۔ اُس کے سر میں سودائے قوم ضرور تھا مگر دل کی مجبوری اُسے روکے ہوئی تھی اور یہ اپنی زندگی کا بہترین معیار صرف اِسے سمجھتا تھا کہ "تبسمِ برنائی" کی بے حجاب تجلیوں سے شہید ہو جائے۔"

(پیمانہ (آگرہ) جنوری ۱۹۲۴ء)

(۳) فلسفۂ تصوّر

کسی چیز یا ہیولا کو جوفِ دماغ میں محدود و تخیل کرنے کا نام تصوّر ہے۔ تصوّر بہ اعتبار ظاہری دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تصوّرِ ذہنی اور تصوّرِ مکانی۔ تصوّرِ ذہنی محض قوتِ متخیلہ کی صورت آفرینی اور واہمہ کی خلاقی کا ایک مرئی نتیجہ ہے۔ تصوّرِ مکانی مشاہدہ کا ماتحت ہے، جو اکثر اصولِ نظریہ پر مبنی ہوتا ہے اور بیشتر مشاہداتِ عملی پر۔ باصرہ جو کچھ دیکھتی ہے اُس کے خاکے دماغ میں محدود ہو جاتے ہیں اور قوتِ متصورہ اُنھیں نقش و نگار سے آراستہ کر کے تعبیر تصورات بنا دیتی ہے۔"

(پیمانہ (آگرہ) اپریل ۱۹۲۴ء)

(۴) امکانِ تجلّی پر ایک دلچسپ نظریہ

تجلی کے لئے جمال لازمی ہے اور جمال کے لئے صورت یقینی، لیکن جس کی تجلی یہاں مقصودِ نظر ہے، اُس کا جمال صورت سے معرا ہے۔ وہ خود ایک مثال ہے اور خود بے مثال۔ تعیینِ صورت اُس کے لئے محالات سے ہے اور روایاتِ تجلی معتبر، لہٰذا معلوم ہوا کہ تجلی کے لئے جمال لازمی ہے، خواہ وہ صورت سے پیدا ہو یا مثال سے۔ انعکاسِ جمال اگر صورت کا محتاج ہے تو امکانِ تجلی نہایت سادہ اور آسان ہوا جاتا ہے، لیکن جمالِ مثال میں امکانِ تجلی حقیقتاً فہم و ادراک کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہے، جس کو ہم سلجھانا چاہتے ہیں۔ وہو المقصود۔

(پیمانہ (آگرہ) اکتوبر ۱۹۲۴ء)

(۵) ولادتِ گوتم بدھ

"یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت دانیال کے الہامات اور علم الاسرار کی برکات، بابل، یونان اور ایران کی فضاؤں کو چیرتی ہوئی ہندوستان تک پہنچ چکی تھیں اور یہاں بھی برہمن علم نجوم کی رُو سے حکم لگایا کرتے تھے، چنانچہ حسبِ رسم کے مطابق گوتم بدھ کا جنم پتر بنا تو پنڈتوں نے باتفاق رائے کہہ دیا کہ راج کنور کی پرورش گھر کے اندر ہونی چاہیئے، اسے ہمیشہ گھر کے اندر رکھنا چاہیے ورنہ یہ لڑکا جوگ اختیار کرے گا اور راج گدی کے کام کا نہ رہے گا۔ راجہ کو

اس بات سے بڑی تشویش ہوئی اور پنڈتوں کے کہنے کے مطابق گوتم بدھ کی پرورش اُن کی خالہ پرجاپتی کے زیر نظر راج محل میں ہونے لگی ۔ (پیمانہ (دہلی) جنوری ۱۹۲۷ء)

(۶) غزل کی زبان

"جو طبقات غزل کو صرف بازاری خیالات اور چوما چاٹی نگاری تک محدود سمجھتے ہیں، وہ اس کے بھی حامی ہیں کہ غزل میں مبتذلہ ہونا چاہیے۔ میرا مذہب یہ نہیں ہے۔ میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں۔ غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ مضبوط و لطیف، پُر شوکت و نغمہ بار ہوں اور خیالات و جذبات بلند و پاکیزہ ہوں۔" (کلیم عجم (۱۹۳۶ء) ص۸)

(۷) تمہید

"میں جس کتاب کو آج لکھنے بیٹھا ہوں، وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں صبر و تحمل، توکل و صداقت، غربت و بے کسی اور استقلال و استحکام طبیعت کی جیتی جاگتی تصویریں صورت طراز ہیں۔ اس کتاب میں سیدالشہداء امام الثقلین سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کی لائف پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کی ولادت سے شہادت تک کے تمام واقعات مستند و معتبر تواریخ سے اخذ کر کے صاف اور سُتھری زبان میں جمع کئے گئے ہیں ۔" (سیرۃ الحسینؓ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۶ء ص۳)

(۸) ؟

"آپ (رسول اللہ) جن کو چاہتے تھے زر و مال دیدیتے تھے اور بی بی خدیجہؓ یہ بھی نہ پوچھتی تھیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں انھیں شوہر کی خوشنودی کا خیال تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اُس وقت مسعود اور زمانۂ محمود کی منتظر تھیں جب جناب سرورکائنات کو نبوت ملنے والی تھی۔ وہ حسرت مند تھیں کہ اُن کے مرنے سے پہلے وہ زمانہ بھی آجائے، تاکہ اُس کی برکات سے یہ اپنی آنکھیں جمال آنکھیں منور کر سکیں ۔" (سیرۃ الکبریٰ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۶ء ص۲۴)

مولانا سیماب کے نوشتہ مضامین اور افسانے ہنوز شائع نہیں ہوئے ہیں اور شاید ڈرامے بھی۔ اُن کے دو ڈراموں کے مسودے میری نظر سے گزرے تھے اور وہ بھی محض حسن اتفاق کی بنا پر:-

آگرہ - ۱۷ر جنوری ۱۹۲۲ء

"مجتبیٰ! آج سیماب آپ کو اپنا حقیقی ہمدرد سمجھ کر ایک خاص معاملے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ ...."

"میرے پاس دو ڈرامے مدت سے رکھے ہوئے ہیں جو کسی طرح اب تک نہیں نکلے۔ کانپور میں ایک کمپنی موجود ہے محنت سمجھئے گا تو خدا اجر مزدور دے گا، مگر یہ کام جنوری میں ہو جانا چاہیے۔ میں بلا انتظار جواب کل دونوں ڈرامے بصیغۂ "خوشی" بذریعہ رجسٹری آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ مجھے نہ بلایئے۔ میں آج کل کسی کام کا نہیں ہوں۔ ...."

پریشان اور سخت پریشان

سیماب اکبرآبادی

یہ جنوری ۱۹۲۲ء کی بات ہے اور اب اکتوبر ۱۹۶۵ء ہے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ ان ڈراموں کے نام اور پلاٹ کیا تھے اور اس وقت کون کمپنی کانپور میں تھی۔ گمان غالب یہ ہے کہ بمبئی کی کوئی کمپنی تھی، شاید آغا حشر کاشمیری کی قائم کردہ کمپنی۔ میں نے اس کمپنی کا ایک کھیل

"نور کی پتلی" (سعیدہ) دیکھا تھا اور اُس کے دیکھنے سے میرے قلب پر جو اثر ہوا تھا، اُس کو ایک مختصر نظم "نور کی پتلی" میں ظاہر کیا تھا۔ یہ نظم اُسی دَور کے کسی رسالے میں شائع بھی ہوئی تھی اور اب "دنیائے راز" میں شامل ہے۔

میں اپنے ایک کرم فرما قاضی امیر احمد تسمل بلگرامی مرحوم کے ساتھ کمپنی کے منیجر سے ملا تھا لیکن وہ کوئی نیا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ ہوا تھا اور میں نے مسوّدے مولانا کو واپس کر دئے تھے۔

(باقی، باقی)

ادارتی نوٹ :-

والدِ مرحوم علامہ سیماب اکبر آبادی کا ایک مصنّف کی حیثیت سے مکمّل جائزہ نہ اُن کی زندگی میں لیا گیا اور نہ اُن کی وفات کے بعد۔ اُن کی وفات کو پندرہ سال ہو چکے ہیں لیکن اِس دَوران میں اُن کی کوئی ایک نئی کتاب تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ یہاں اسباب کو زیرِ بحث نہیں لانا ہے۔ حضرت راز چاند پوری کا "نثرِ سیماب اور تصانیفِ سیماب" کا جو اہم سوال اُٹھایا ہے، مجھے اُس سلسلے میں صرف چند باتیں عرض کرنا ہیں اور "داستانِ عجیب" کی تحریک پر ان کا شکر گزار ہوں کہ ایک [illegible] پیش کرتی ہے۔ ہر چند مجھے اِس میں بہت چھان بین کرنا پڑی ہے لیکن اس حیلے سے آئندہ کام کرنے والوں کے لئے کافی معلومات بہم ہو گئی ہیں۔

میں خود، جو علامہ سیماب کے تصنیفی و تالیفی کاموں سے سب سے زیادہ واقف ہوں، اپنی حد تک جب بھی اِس سلسلے میں سوچتا ہوں تو بات بڑی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی تمام تصانیف اور پوری علمی و ادبی زندگی کا مکمّل جائزہ لینا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ یوں اگر چند بہت ذہین اور تحقیقی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اِس کام کے لئے خود کو وقف کر دیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ سیماب کی تصانیف و تالیفات کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے اور موضوعات کے اعتبار سے اُن کی تقسیم کرنے میں کئی دشواریاں ہیں۔ اُن کی بہت سی کتابیں نایاب ہیں اور بہت سی ہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ مرحوم نے خود اپنے کاموں کے پیچھے ایسے تاریخی حوالے اور واضح نشانات یا تو چھوڑے ہی نہیں ہیں یا استبدادِ زمانہ نے اُنھیں مفقود کر دیا ہے جو اس کام میں ممد و معاون ہوتے۔ ایک عظیم شاعر و مصنّف کے سلسلے میں یہ ایک طرح کا حادثہ ہی ہے۔ دراصل یہ جو کچھ بھی ہوا غیر ارادی اور حادثاتی طور پر ہوا۔ اِس میں جہاں ایک طرف اُن کی بے نیازیوں اور لاپروائیوں کو دخل رہا، وہیں اُن کی ہمہ وقتی مصروفیت اور بار بار ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہونا بھی ہے۔ اُن کی ابتدائی زندگی آگرہ کے بعد اجمیر شریف میں گزری۔ پھر وقفوں وقفوں سے کانپور، گونڈلہ، آگرہ، دہلی اور لاہور میں قیام رہا۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے یکسو ہو کر اُنھیں آگرہ میں بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد اگست سنہ ۱۹۴۸ء میں پھر حادثاتی طور پر ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلا جانا پڑا اور وہیں ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۵۱ء کو انتقال ہو گیا۔ پاکستان وہ اپنے منظوم ترجمۂ قرآن پاک کی اشاعت کے سلسلے میں تاج کمپنی لمیٹڈ کے ایما پر گئے تھے۔ وہاں بھی کارواں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہاں بھی تاج کمپنی کی فرمائش پر قلیل مدّت میں ایک ضخیم "سیرت النبیؐ" لکھ دی جو کافی مقبول ہوئی۔

وہ آخری اٹھارہ سال جو اُنھوں نے آگرہ میں گزارے، اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتبار سے بڑے ہنگامی تھے۔ ۱۹۴۱ء میں اُنھیں مرضِ نواسیر ہوا تھا۔ یہ اتنا شدید اور تکلیف دہ مرض تھا کہ سخت سے سخت دل انسان بھی اُن کو تڑپتا ہوا دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ تکلیف اُن کی آخری سانس تک رہی۔ اس کے باوجود اُن کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں کسی وقت بھی سرِ مو فرق نہ آیا۔ مرض کے شدید دَورے اور اُس کی وجہ سے ہو جانے والے بخار کی صورت میں بھی میں نے اُنھیں "مثنوی مولانائے روم" کے تیس تیس سو اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کرتے دیکھا ہے۔ اتنا ہی کام کرنے کی اتنی ہی غیر معمولی قدرت و صلاحیت تھی۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ وہ اوقاتِ کار کے حد درجہ پابند تھے۔ اُن کی ادبی ذمہ داریاں اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ اُنھیں یہ سوچنے کی کبھی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنی طویل خدمات کی پھیلی ہوئی کڑیوں کو ایک جگہ کر دیں۔ حتیٰ کہ اُن کے ذاتی کتب خانہ میں خود اُن کی بیشتر تصانیف کی ایک کاپی بھی نہ تھی۔ دوسرے مصنّفین کی ہزاروں کتابیں تھیں۔ حالانکہ اُن کی ابتدائی تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن دوسرے اداروں کی طرف سے شائع ہو چکے تھے۔ یہ اپنے زمانے کی مقبول ترین کتابیں تھیں، جنھیں پبلشروں نے بہت بیچا کیا۔ ایسے خطوط اور ایسی تحریریں بھی وہ سنبھال کر نہ خود رکھ پائے اور نہ رکھوا سکے جن کی مدد سے آج ہمیں بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا۔ میں نے کچھ خطوط اور کاغذات جمع کئے اور کرائے تھے لیکن وہ تقسیم کے ہنگامے میں تلف ہو گئے۔ پھر بھی اگر کوشش کی جائے اور تحقیق [illegible]

کام لیا جائے تو ان کے ابتدائی دور کی بہت سی کتابیں کہیں نہ کہیں ضرور مل سکتی ہیں۔

علامہ سیماب نے بہت چھوٹی سی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا اور اپنے ابتدائی دور ہی میں اپنی تسلی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ اُن کی ولادت ۱۸۸۰ء میں ہوئی تھی۔ اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کالج کی تعلیم ترک کر دینی پڑی۔ ملازمتیں اختیار کیں۔ اُس زمانے میں تنخواہیں بہت قلیل ہوتی تھیں۔ بڑا کنبہ تھا اور وہ تنہا اُس کے کفیل۔ چنانچہ جب مختلف ملازمتوں سے گزر بسر کی معقول صورت پیدا نہ ہو سکی تو ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے قلم کو ذریعۂ معاش بنایا اور اپنے دور کے رجحانات کے مطابق نظم و نثر لکھ کر معاوضہ حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۰۰ء کی ابتدا سے ۱۹۲۲ء تک کے بعض مخصوص رسائل میں وہ مستقل طور پر معاوضہ لے کر لکھا کرتے تھے۔ "نظام المشائخ"، "صوفی" اور "افادہ" کے وہ خصوصی قلم کار تھے۔ ایک طرف کتابیں لکھ رہے تھے۔ دوسری طرف آگرہ کے دو رسالوں "مرصع" اور "پردہ نشیں" اور ایک اخبار "آگرہ اخبار" کو بھی قلیل مشاہرہ پر ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء سے خود اپنا ایک مختصر سا رسالہ "پری خانہ" بھی نکالتے تھے۔ قارئین کو اس بات سے تعجب ہوگا کہ اب سے چالیس پچاس سال پہلے علامہ سیماب کو ایک نظم کا معاوضہ مشکل سے تین روپیہ تک مل جایا کرتا تھا اور نثر مضامین کا اس سے بھی زیادہ۔ اُس دور میں بھی اُن کی نظم و نثر سے اہلِ علم بہت متاثر ہوتے تھے۔ اسی تاثر کے تحت خواجہ حسن نظامی خود اُن سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ سیماب کس عمر کے آدمی ہیں جو اُن کے رنگ کی بھی نثر لکھ لیتے ہیں۔ یہ سنہ ۱۹۱۲ء سے پہلے کی بات ہے۔ اور پھر سیماب سے کتنا کام لیا۔ یہ دونوں مرحومین کی روحیں جانتی ہوں گی۔ خواجہ صاحب سے نہایت قریبی تعلقات کا بڑا سبب وہی تاثر تھا جو نثر سیماب نے پیدا کیا تھا۔ جب اُن کی طویل نظم "فریاد" شائع ہوئی تو تعریفی خطوط کے علاوہ دُور دُور سے لوگ ملنے کے لئے آئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب علامہ اقبال مرحوم نے نظم "شکوہ" لکھی تھی۔ اور آغا حشر مرحوم نے "شکایت"۔ شکوہ - فریاد اور شکایت اُس دور کی تاریخی نظمیں تھیں۔ جنھوں نے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایک طرف وہ رسائل میں بالالتزام لکھتے تھے۔ دوسری طرف (۱) ابوالعلائی اسٹیم پریس ہینگ کی منڈی آگرہ (جو بعد میں الیکٹرک ابوالعلائی پریس ہو گیا تھا اور "میراں حسینی" کے چوراہے پر اپنا ایک بڑی بلڈنگ تعمیر کرا کے اُس میں منتقل ہو گیا تھا۔ زمین دوز ہال بنوا کر اس میں نئی مشینیں نصب کرائی تھیں۔ یہ بہت بڑا پریس تھا) (۲) عزیزی پریس صابون کٹرہ آگرہ۔ (۳) صوفی پبلشنگ ہاؤس۔ منڈی بہاؤالدین گجرات۔ پنجاب (۴) کے۔ حاجی محی الدین تاجر کتب۔ بنگلور (میسور) (۵) حکیم یعقوب علی فراش خانہ دہلی (۶) دین و دنیا پریس دہلی کے لئے کتابیں بھی لکھتے رہے۔ قدردانی کا یہ عالم تھا کہ بنگلور سے حاجی محی الدین تاجر کتب تحفۃً قیمتی اونی شال اور "طوطا پری" آم بھجوایا کرتے تھے۔ اسی طرح رسالہ "صوفی" کے مالک تحفے بھیجتے تھے۔ مشاعروں میں الگ کامیابی حاصل ہو رہی تھی اور شاگردوں کی تعداد الگ بڑھ رہی تھی۔ ایسا کم ہوا ہے کہ تیس پینتیس سال کی عمر ہی میں کسی کو مستند اہلِ قلم مان لیا گیا ہو۔

ابوالعلائی پریس کے مالک خواجہ بخش مرحوم تھے۔ بڑے جہاں دیدہ اور تیز قسم کے انسان۔ اُن کے دو بھائی اور بھی تھے۔ ایک کا نام حافظ فیاض الدین اور دوسرے کا غالباً عبدالغفور تھا۔ ہینگ کی منڈی میں جب یہ "ابوالعلائی اسٹیم پریس" کے نام سے تھا (اس وقت دفاتر سالِ ۱۹۱۲ء میں) اس پریس میں زبردست آگ لگ گئی تھی اور پورا پریس مع کتب خانہ جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ اُسی سال مالکانِ پریس نے علامہ سیماب سے بارہ "مراثی" لکھوائے تھے اور ہر مرثیہ کئی کئی ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کتابیں "جزوں" کے حساب سے کتب فروشوں کو بیچی جاتی تھیں۔ ایک روپیہ میں تیس چالیس جز تک۔ سولہ صفحات کا ایک جز ہوا کرتا تھا۔ سلام مرثیوں کے عنوانات الگ الگ تھے۔ ایک مرثیہ کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ سولہ صفحہ کا تھا۔ قیمت دو پیسے اور ایک آنہ تھی۔ پندرہ روپیہ فی مرثیہ معاوضہ دیا گیا تھا۔ لیکن پریس سے باہر آنے سے پہلے ہی اُن مطبوعہ مرثیوں کی تمام کاپیاں مع مسودات جل کر خاکستر ہو گئی تھیں۔ اور سیماب مرحوم کے پاس اُن کی نقلیں بھی نہ تھیں۔ غالباً "شاعر" کے آگرہ نمبر میں اس طرف ایک اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

"عزیزی پریس" کے مالکان عبدالرؤف خاں ہاتف اور عبدالعزیز خاں صاحب تھے۔ عزیزی پریس طباعت کے اعتبار سے بہت اچھا پریس تھا۔ یہ دونوں بھائی زمیندار اور خوش حال تھے۔ پریس کا کام بہت اطمینان سے کرتے تھے۔ عبدالعزیز خاں صاحب تیمور دن

اور افسانہ "کوچ سہیلی"، "روشنائی" نگار نے اور مزید عزیزوں کو مختلف انداز سے کاٹنے میں پڑے سے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان دونوں پریسوں نے علامہ سیماب کے ابتدائی عہد کی بہت سی تصانیف معاوضہ دے کر پبلشر کی حیثیت سے شائع کی تھیں۔ رسالہ "پردہ نشین" بھی عزیزی پریس ہی سے نکلتا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ ان پریسوں کے مالکان کے نام سے بھی علامہ مرحوم نے کئی کتابیں تصنیف یا تالیف کیں۔ طباعت کام کے ساتھ ساتھ ان پریسوں میں کتابوں کی تجارت بھی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ یہ ڈیڑھ اور دو روپیہ فی صفحہ علامہ مرحوم کو معاوضہ دیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں کی مطبوعہ تصانیف سیماب میں جہاں سو صفحات سے کم یا زیادہ کی کتابیں تھیں وہیں ۱۶۔ اور ۳۲ صفحات کے کچھ کتابچے بھی تھے۔ جیسے "سترہ کہانیاں"، "سولہ کہانیاں" ہر کہانی الگ ایک ایک دو دو جز کی تھی اور رنگین سرورقوں کے ساتھ انھیں شائع کیا گیا تھا۔

حال ہی میں علامہ سیماب کے شاگرد رشید مولانا بدیع الزماں قمر نعمانی سہسرامی (مقیم بمبئی) نے بڑی تلاش و جستجو سے علامہ کی دو پرانی کتابیں (۱) "اللہ والوں کی محفل" اور (۲) "سوانح نورجہاں بیگم" حاصل کی ہیں۔ دونوں خاصی ضخیم ہیں۔ "سوانح نورجہاں بیگم" بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے "دیباچہ" پر "۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۲ء" اور سرورق پر مطبوعہ ابوالعلائی اسٹیم پریس لکھا ہوا ہے۔ اس وقت علامہ سیماب ٹونڈلہ ضلع آگرہ میں ریلوے میں ملازم تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک ٹونڈلہ کی ملازمت کا سلسلہ رہا تھا اور اس دوران میں انھوں نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ "سیرۃ الحسینؑ" اور "سیرۃ الکبریٰؑ" پر ۱۹۱۲ء ہے گویا تیس پینتیس سال کی عمر ہی میں انھوں نے اتنی بہت سی کتابیں لکھ لی تھیں۔ "سوانح نورجہاں" کے سرورق کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے صفحہ پر متعدد کتابوں کے نام مع کیفیت درج ہیں اور ان میں زیادہ کتابیں سیماب ہی کی ہیں۔ سرورق پر "بار سوم" بھی لکھا ہوا ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سوانح اتنی مقبول ہوئی تھی کہ ایک دو سال ہی میں اس کے تین ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ دوسری کتابوں کی مقبولیت کا بھی یہی عالم تھا۔ بعض کتابوں کے قلیل مدت میں پانچ پانچ چھ چھ ایڈیشن شائع ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں علامہ سیماب نے خود اپنے اور دوسرے لوگوں کے نام سے میرے اندازے کے مطابق کسی طرح ڈیڑھ سو سے کم کتابیں نہیں لکھی ہوں گی۔ صرف ان دو پریسوں سے علامہ کے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں۔ پہلے اُن کے نام پیش کرتا ہوں۔ بعض دوسری کتابوں کے نام جن کا مجھے علم نہیں، شاید کسی اور صاحب کو معلوم ہوں۔ یا کسی وقت تحقیق کرنے سے معلوم ہو جائیں۔

مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ :۔

۱۔ بعثت الرسولؐ (نثر)
۲۔ معلمہ "
۳۔ ارشادِ احمدؐ (نظم)
۴۔ تذکرۃ الرسولؐ (نثر)
۵۔ انمول موتی "
۶۔ ۱۶ کہانیاں (نثر) (چونکہ یہ کہانیاں مختلف عنوانات سے الگ الگ شائع ہوئی تھیں اس لئے تعداد کے اعتبار سے یہ سولہ گنی جائیں گی)
۷۔ جڑاؤ چندن ہار (نثر)
۸۔ سگھڑ سہیلی (نثر)
۹۔ سترہ کہانیاں (نثر) (یہ بھی الگ الگ سترہ ہی شمار کی جائیں گی)
۱۰۔ زنانہ آداب (نثر)
۱۱۔ فریب وفا (ڈراما)

کل تعداد (چھوٹی بڑی ملاکر) = ۴۲

مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ ؛۔

۱۔ سوانح خواجہ غریب نوازؒ (نثر)
۲۔ سوانح نورجہاں بیگم "
۳۔ سوانح زیب النساء بیگم "
۴۔ اللہ والوں کی محفل "
۵۔ زنانہ خط و کتابت "
۶۔ سردار علی پاپکی اور سردار بیبے لال "
۷۔ آئمۃ الہدیٰ (نثر)
۸۔ حیات صابرؒ "
۹۔ انوار العلا "
۱۰۔ رونسن کروسو "
۱۱۔ نیا باورچی خانہ "
۱۲۔ گلدستۂ عطار (حصۂ اول)
۱۳۔ گلدستۂ عطار (حصۂ دوم)
۱۴۔ گلدستۂ عطار (حصۂ سوم)
۱۵۔ گلدستۂ عطار (حصۂ چہارم)
۱۶۔ گلدستۂ عطار (حصۂ پنجم)
۱۷۔ وفا کی دیوی (نثر)
۱۸۔ صبر ایوبؑ "

۱۔ یہ مکمل حیات نامہ ہے اور ہر حصہ سو صفحات سے زیادہ کا ہے۔

۱۹۔ غوث الاعظم (نثر)　　۲۲۔ چڑے چڑیا کی کہانی (نثر)　　۲۵۔ بہشتِ شدّاد (نثر)
۲۰۔ جڑاؤ چمپاکلی "　　۲۳۔ مضمون نویسی "　　۲۶۔ زنانہ میلاد "
۲۱۔ لوری نامہ (نظم)　　۲۴۔ سلاڈ لا بیٹیا "　　۲۷۔ نفیسہ بیگم "
۲۸۔ زیورِ ایمان "

ڈرامے مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ:-

۲۹۔ ہیر [illegible] (نثر)　۳۰۔ داؤ پیچ یا خوبصورت بلا (نثر)　۳۱۔ ناکامِ تمنّا (نثر)　۳۲۔ پیچ در پیچ (نثر)

(کل تعداد — ۳۲)

گویا عزیزی پریس اور ابوالعلائی پریس نے مل کر ان کی تقریباً ۳۲ چھوٹی بڑی کتابیں پندرہ سال کی مدّت میں شائع کی تھیں۔

علامۂ سیماب نے اُس زمانہ میں اپنی ان تصانیف و تالیفات کے ذریعہ خواتین، بچّوں، بچیّوں، بوڑھوں اور جوانوں کے لئے مذہبی، اخلاقی، سماجی اور اصلاحی ادب بکثرت پیش کیا تھا۔ متذکرہ تمام کتابیں بیحد دلچسپ تھیں۔ بعض ناول کے انداز پر لکھی گئی تھیں اور اہم بات یہ ہے کہ یہ سب اپنی عالمانہ اور ادیبانہ نثر کے اعتبار سے بیحد معیاری ہیں۔ اگر آج بھی یہ شائع ہوں تو نہ صرف معیاری ادب پر لیڈی آتریں بلکہ انی مقبول ہوں۔ نثر کے چند نمونے حضرت ساز چاندپوری نے اپنے مضمون میں دئے ہیں۔ "سوانح نورجہاں (رجحال ہی میں مولانا قمر لغانی کے ذریعہ چھپا ہے)، کی نثر میں نے دیکھی تو میں حیران رہ گیا۔ ۵۸ سال پہلے کی لکھی ہوئی کتاب کی نثر بالکل آج کی نثر معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں سطورِ بالا میں عرض کرچکا ہوں اور حضرت ساز چاندپوری نے بھی "داستانِ چند" میں لکھا ہے۔ والدِ مرحوم علامۂ سیماب محض اپنی اقتصادی ضرورتوں کی بنا پر اپنے دماغ و قلم سے نکلا ہوا بیشتر سرمایہ دوسروں کے نام سے منسوب کرنے پر مجبور رہے۔ لیکن اپنے ادبی مستقبل، اپنے عہد آفریں رجحانات و خیالات اور اپنی شخصیت کی تعمیر سے کبھی غافل نہ رہے۔ اُس دَور میں ایک طرف مولانا راشد الخیری اس طرح کا اصلاحی اور اخلاقی ادب قوم کو دے رہے تھے اور دوسری طرف علامۂ سیماب۔ لیکن سیماب کی نظر اپنے عہد سے بہت آگے تھی۔ وہ دنیائے ادب و شعر میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۳ء تک انھوں نے جو کچھ لکھا وہ وقتی اور ہنگامی تھا۔ اُن کی منزل تو کچھ اور ہی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں رسالہ "پیمانہ" کی اشاعت کے بعد آہستہ آہستہ ادب و شعر کے جدید تقاضوں کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرنا شروع کردیا۔ اپنے ہم عصر شعراء اور ادبا کے قدیم خیالات کے علی الرغم جدید طرزِ فکر و اسلوب کی تبلیغ کی اور خود نظم و نثر کا وہ معیار پیش کیا جس نے نئی نسل کے ذہنوں کو بے حد متاثر کیا۔ علاوہ اس "روایت شکنی" کے سلسلے میں اُنھیں بڑا جہاد اور سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے موقف سے ذرا بھی نہ ہٹے۔ وہ ارتقائے ادب و شعر کے سلسلے میں مولانا حالی سے بھی آگے تھے۔ حالی کی بعض تحریکوں کی اُنھوں نے تجدید کی۔ مثلاً اُن کے ابتدائی دَور میں اُردو نظم، غزل ہی کا ایک انداز تھی۔ اُنھوں نے بے شمار ہیئتی تجربے کئے۔ موضوعاتِ نظم کو وسیع کرنے پر زور دیا۔ ۱۹۲۲ء میں جب اُنھوں نے "پیمانہ" نکالا ہے تو یہ جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری کا ابتدائی دَور تھا۔

اُنھیں اپنے ذہن و قلم پر پُورا اُپورا اعتماد تھا کہ اپنی "مجبوریوں" کے تحت دوسروں کے نام سے بے اندازہ نظم و نثر کا ہدیہ پیش کرنے کے بعد بھی وہ اپنے لئے اتنا کچھ لکھ لیں گے کہ ادبی دُنیا اُن کی عظمت کو ماننے پر مجبور ہوگی۔ اور یہی ہوا بھی۔ ادب کے ہر محاذ پر اُن کے نقوش ثبت ہیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ علامۂ مرحوم کے نام سے اب تک نظم و نثر میں جو کچھ شائع ہوچکا ہے یا آیندہ ہوگا اُس کا کم از کم ایک چوتھائی اُنھوں نے دوسروں کو ودیعت کیا۔ یہ اُن کی ذات پر ایک طرح کا الزام بھی ہے۔ لیکن اِس کے پیچھے جو محرکات و عوامل ہیں وہ اُنھیں ہر دَور میں "معصوم" ہی ثابت کریں گے۔ میں یہاں دو تین مُبہم سی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

چند ماہ پہلے "ہماری زبان"، علی گڑھ میں علامۂ اقبال مرحوم اور حکیم احمد شجاع کے ناموں سے مرتّب کردہ ایک "تعلیمی نصاب" کی بحث چھڑی تھی۔ لیکن میں دانستہ خاموش رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نصاب رائے صاحب منشی گلاب سنگھ نے علامۂ سیماب سے مرتّب کرایا تھا اور

جس پر نام علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع کے تھے۔ اُس وقت ان دونوں حضرات کی سرکاری اور سیاسی مصروفیتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ مرتبہ مرحلہ پبلشر نے ان کی نظر سے گزار دیا تھا اور یہ نہیں بتا یا گیا تھا کہ اسے کس سے مرتب کرایا گیا ہے۔ یہ کام منشی محمد الدین فوق کاشمیری مرحوم (جو علامہ کے انتہائی مخلص اور گہرے دوستوں میں سے تھے اور اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے) کی وساطت سے ملا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ سیماب مستقلاً آگرہ بجنب آبادی اور دوسرے مخلصین کے اصرار پر لاہور (پنجاب) کو مستقلاً اپنا مستقر بنا لیا تھا اور مع اہل و عیال لاہور چلے گئے تھے۔ سامعین اور پیر کا بہت مزورت تھی۔ وہیں سے رسالہ "پیمانہ" شائع ہونے لگا تھا۔ یکی دروازے کے باہر دفتر اور رہائش کے لئے الگ الگ دو مکانات لئے گئے تھے۔ منشی محمد الدین فوق کاشمیری کا دفتر اور "فیروز سنز" کا ادارہ قریب ہی میں تھا۔ ساغر نظامی اور منظر صدیقی بھی ساتھ تھے۔ اِس نصاب کی ترتیب کی تفصیلات کو اُنکی اُس مبسوط قلمی سوانح حیات میں بھی موجود ہے جو تقسیم سے پہلے اُن کے ایک شاگرد قاسم علی خاں قادری نے خود اُن سے حالات و واقعات پوچھ پوچھ کر دو جلدوں میں لکھی تھی اور یہ دونوں جلدیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ علامہ مرحوم کے ایک اور دوست محمد عبد اللہ خویشگی، جو غالباً اب بھی بقیدِ حیات ہیں، اور خود حکیم احمد شجاع صاحب (جو اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور شاید اُن کے حافظے میں اب یہ بات نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کی بات ہے) اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اب رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کی کوئی تحریر بھی بطورِ ثبوت نہیں مل سکتی۔ ہاں جناب ساغر نظامی اور جناب منظر صدیقی اِس بات کے عینی شاہد ہیں اور وہ اِس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

آگرہ کے ایک بڑے پبلشر غالباً رام نراین یا گیا پرشاد (حکیم وصی حسن روڈ) نے تقسیم سے کئی سال پہلے طلباء کے لئے دنیا کی جدید ایجادات پر قصّہ اور کہانی کے طور پر مکالموں کی صورت میں ایک کتاب کے چار حصّے لکھوائے تھے (کتاب کا نام اِس وقت یاد نہیں آ رہا ہے لیکن آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے) یہ چاروں حصّے یوپی کے نصابِ تعلیم میں شامل تھے۔ لیکن محض اِس لئے کہ محکمۂ تعلیم اُس نصاب کو فوراً منظور کر لے اُس پر ایک مشہور ماہرِ تعلیم کا نام دے دیا گیا تھا جو ایک مشہور اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ اِس کی شہادت مولوی بشارت علی خاں ارمان آفریدی اکبر آبادی (جو اب پاکستان چلے گئے ہیں) دے سکتے ہیں۔

تقسیم کے بعد "ہمارا گاندھی"، "ہمارا نہرو"، "ہمارا ابو الکلام"، "ہمارا سوبھاش بوس" کے نام سے علامہ مرحوم نے چار کتابچے لکھے تھے۔ اُن پر بھی اُن کا نام نہیں ہے۔ یہ دہلی سے شائع ہوئے تھے۔ دہلی کے اور بھی کئی اداروں اور مصنّفوں نے اُن سے اِس طرح کے کام لئے۔

پنجاب سے ایک مکمّل ڈرامہ (نام شاید "بیدار" تھا) مع گانوں کے شائع ہوا تھا۔ اُس پر نام ایک دوسرے ہندو ادیب کا تھا اور لکھا اُسے سیماب ہی نے تھا۔ اِس ڈرامے کا "وی۔پی" دو سو یا ڈھائی سو روپیہ کا خود میں نے اُن ادیب کے نام سے بھیجا تھا اور اُنھوں نے فوراً وصول کر لیا تھا۔ نثر ہی نہیں بلکہ کتنے ہی شعری مجموعے جو دوسروں کے نام سے شائع ہوئے اُن ہی کے رہینِ قلم تھے۔ کتنی غزلیں، کتنے سہرے اور نظمیں، کتنے قطعاتِ تاریخ، کتنے افسانے اور مضامین اُنھوں نے دوسروں کے نام سے لکھے یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ لیکن اُن کا سربستہ رازوں کا راز ہی رہنا مناسب ہے۔ چونکہ یہ بات بہت عام ہو چکی ہے، اِس لئے مجھے بھی اِس کے اعتراف میں تکلّف اور تامّل نہیں ہے کہ اُنھوں نے بہت بڑا نثری اور شعری ذخیرہ دوسروں کو دے دیا۔ انسانی ذہن شاید اِسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو کہ ایک تنہا ذہن و قلم نے لاکھوں معیاری اشعار اور نثر کی سطریں اُگل دیں لیکن واقعہ یہی ہے۔ اگر کوئی اُن تمام اشعار اور نثر کی سطروں کو گِن سکے اور عمرِ سیماب کے لمحات کی تعداد سے تقسیم کرے تو بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ لمحات کم ہوں گے اور اشعار اور نثر کی سطروں کی تعداد زیادہ۔ متفرق تحریروں کی طرف اگر میں اشارہ کر دوں تو ایک پورا مضمون بن جائے۔ اِس طویل نوٹ میں اُن کا میں نے کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

بہر حال بات اُن کی ذاتی تصانیف کی چل رہی تھی۔ سطورِ بالا میں اِن کی تعداد ۷۴ ہوئی تھی۔

مطبوعہ صوفی پرنٹنگ ہاؤس۔ منڈی بہاؤالدین گجرات (پنجاب) :-

۷۵۔ سیرۃ الکبریٰؓ (نثر)
۷۶۔ سیرۃ الحسینؓ (نثر)
} اِن کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ دونوں کتابیں کافی ضخیم ہیں اور اہتمام سے چھپی تھیں

۷۷۔ حالاتِ حالیؔ (نثر)
۷۸۔ چراغِ داغ (نثر)

تقسیم سے کئی سال پہلے سیرۃ الکبریٰؓ کا ترجمہ گجراتی زبان میں بھی ہوا تھا اور یہ کتاب گجراتی زبان جاننے والے مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوئی تھی۔

مترجم نے حضرت علامہ سے باقاعدہ اجازت لی تھی لیکن معاوضہ کچھ نہیں دیا تھا۔

مطبوعہ کے حاجی محی الدین تاجر کتب معسکر۔ بنگلور (میسور):-

۷۹- جامع الخطب ۸۰- عزیز الخطب ۸۱- ریاض الاظہر

مطبوعہ حکیم محمد یعقوب خاں۔ فراشخانہ دہلی:-

۸۲- آفتاب زندگی (اصلاحی ناول)
۸۳- شباب زندگی " " "
زنانہ بستہ (نثر)
۸۴- بسم اللہ کی کتاب
۸۵ کہانیوں کی کتاب
۸۶- کھیل کی کتاب
۸۷- لکھنے کی کتاب
۸۸- نماز کی کتاب
۸۹- کھانا پکانے کی کتاب
۹۰- تندرستی کی کتاب
۹۱- تہذیب کی کتاب
۹۲- پردے کی کتاب
۹۳- خانہ داری کی کتاب
۹۴- } ان دو نوں کتابوں کے نام یاد نہیں رہے ہیں خالباً
۹۵- } انہی انہی نگی پر میں کل ۱۴ کتابیں زنانہ بستہ میں تھیں

" زنانہ بستہ " کے حقوق حکیم محمد یعقوب خاں صاحب نے حصرت بکڑ پو سے لے لئے تھے۔ " زنانہ بستہ " کے ایڈیشن بار بار شائع ہوئے شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جہاں بچیوں کے لئے " زنانہ بستہ " نہ منگایا جاتا ہو۔ یہ بستہ باقاعدہ جہیز میں دیا جاتا تھا۔

دیگر مطبوعہ تصانیف سیماب:-

۹۶- خلوطِ جنت (نظم)
۹۷- فریاد "
۹۸- مشاہدات (نثر)
۹۹- سرودِ غم (نظم)
۱۰۰- نیفیرِ غم "
۱۰۱- آفتابِ اُردو (کورس کی کتاب)
۱۰۲- الہامِ منظوم۔ ترجمہ مثنوی مولانا رُوم (حصۂ اول)
۱۰۳- " (حصۂ دوم)
۱۰۴ " (حصۂ سوم)
۱۰۵ " (حصۂ چہارم)
۱۰۶ " (حصۂ پنجم)
۱۰۷ " (حصۂ ششم)
۱۰۸- ادبی موتی (حصۂ اوّل) نصاب کی کتاب
۱۰۹ " (حصۂ دوم)
۱۱۰ " (حصۂ سوم)
۱۱۱ " (حصۂ چہارم)
۱۱۲- تحفۂ دربارِ ولایت (نثر)
۱۱۳- بن بنی (دیہات سُدھار گیت)

۱۱۴- کلیم عجم (نظم)
۱۱۵- کار امروز "
۱۱۶- سازِ و آہنگ "
۱۱۷- سدرۃ المنتہیٰ "
۱۱۸- شیرِ انقلاب (نظم)
۱۱۹- عالم آشوب "
۱۲۰- کرشن گیتا "
۱۲۱- نے ستان "
۱۲۲- رازِ عروض (نثر)
۱۲۳- دستور الاصلاح "
۱۲۴- سیرۃ النبیؐ (یہ کتاب کئی سو صفحات کی تھی جو تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔ کراچی نے شائع کی)

پرانے ڈرامے:-

۱۲۵- سرفروش (الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بمبئی کو فروخت کیا گیا تھا)
۱۲۶- جوہرِ شمشیر (رجوبلی تھیٹریکل کمپنی دہلی کو فروخت کیا گیا تھا)
۱۲۷- قیبی تلوار (پارسی تھیٹریکل کمپنی بمبئی کو فروخت کیا گیا تھا)

وہ ڈرامے جو طباعت کے لئے محفوظ ہیں:-

۱۲۸- گوتم بدھ ۱۲۹- جون آف آرک یا دوشیزۂ فرانس ۱۳۰- کلنگ
۱۳۱- ایکٹرس کی محبت ۱۳۲- گیشا کی محبت

وہ تصانیف جو شائع ہونی ہیں:-

۱۳۳- وحیِ منظوم ترجمۂ قرآن مجید (مکمل) تیس پارے الگ الگ نمبر شمار ۱۳۳ - تا ۱۶۲ -

۱۶۳۔ تجلیات (نعتیہ کلام)
۱۶۴۔ نورِ تن (۹۔ ۹ سفر کی نظمیں)
۱۶۵۔ حدیثِ امروز (قومی نظمیں)
۱۶۶۔ لوحِ محفوظ (غزلوں کا تیسرا دیوان)
۱۶۷۔ نظمِ باقی (متفرق نظموں کا مجموعہ)
۱۶۸۔ خطباتِ سیماب (حصۂ اول)
۱۶۹۔ " (حصۂ دوم)
۱۷۰۔ جدید شرح دیوانِ غالب (نثر)
۱۷۱۔ شاعری کی باتیں (نثر)
۱۷۲۔ منہاج الادب (ادبی و تنقیدی مضامین)
۱۷۳۔ مضامینِ سیماب (تاریخی۔ اصلاحی۔ علمی)
۱۷۴۔ آیاتِ سخن (رباعیات)
۱۷۵۔ سیماب کے افسانے (نثر)
۱۷۶۔ سفری کتبے (قطعاتِ تاریخ)
۱۷۷۔ تاج اللغات (مصادر)
۱۷۸۔ کتاب السلف (قدیم شعراء کا تذکرہ)
۱۷۹۔ شاہراہ (نثر۔ ہندی عروض)
۱۸۰۔ نکاتِ فن (فنی مباحث)
۱۸۱۔ طیبا طیبہ (مولانا نیاز کے الزامات کا جواب)
۱۸۲۔ مکاتیبِ سیماب (نثر)
۱۸۳۔ القافیہ (نظم)
۱۸۴۔ ناظمینِ اردو (نثر)
۱۸۵۔ قصائدِ سیماب (نظم)
۱۸۶۔ بہار اینام (سیاسی و اتفاقی نظمیں و رباعیات)
۱۸۷۔ سیماب کے مختصر ڈرامے (نثر)
۱۸۸۔ الہیارے (نثر)
۱۸۹۔ اصلاحاتِ سیماب
۱۹۰۔ شذراتِ سیماب ——— (اخبار تاج کے سیاسی ایڈیٹوریل)

تصانیف و تالیفاتِ سیماب کی جو فہرست میں نے پیش کی ہے وہ بڑی حد تک مکمل اور معتبر ہے۔ ممکن ہے کچھ پرانی مطبوعہ کتابیں اور بھی ہوں۔ یا کسی غیر مطبوعہ کتاب کا مسودہ مل جائے۔ یا مختلف رسائل و اخبارات سے کچھ چیزیں لے کر چند کتابیں اور مرتب ہو جائیں۔ بہرحال یہ لگ بھگ دو سو ہو سکتی ہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد والدِ مرحوم علامہ سیماب نے نظموں کا ایک مجموعہ مجھ سے مرتب کرایا تھا۔ جس میں بعض ایسی سیاسی اور ہنگامی نظمیں تھیں جو اخبارات کے لئے لکھی گئی تھیں اور ہلکی پھلکی تھیں۔ جنھیں وہ اپنی نظموں کے مجموعوں کار امروز، ساز و آہنگ یا شعرِ انقلاب میں دینا نہیں چاہتے تھے۔ مثلاً گاندھی جی پر ایک نظم تھی۔ جس کا ٹیپ کا مصرع تھا ؎

"تکلی میں حقیقت پروتا ہوں اور چھپکے چھپکے روتا ہوں"

اسی میں ایک بہت طویل نظم "انڈین نیشنل کانگریس کی مکمل تاریخ تھی" عنوان یاد نہیں رہا۔ کانگریس کے آغاز سے تقسیم تک اس کے جتنے صدر ہوئے، اُن کی شخصیت اور اُن کے زمانے میں جو سیاسی تحریکیں اُٹھیں یا کامیابیاں ہوئیں، اُن پر الگ الگ دس دس بارہ بارہ اشعار تھے۔ اس مجموعے میں تقریباً چالیس نظمیں تھیں اور حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب تھا۔ اردو کاپی کے علاوہ (س) کی ایک کاپی ہندی رسم الخط میں بھی کرائی گئی تھی۔ یا اسے ہندی رسم الخط میں اُن کے ایک عزیز شاگرد حکیم الدین فہیم فیروزآبادی نے نہایت خوشخط لکھا تھا۔ فہیم صاحب اب بھی فیروزآباد میں موجود ہیں اور ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ پھر بڑے سلیقے سے ان دونوں قلمی نسخوں کی جلد بنوائی گئی۔ جلد پر ہندوستانی پرچم کے اعتبار سے تین رنگ کی پٹیاں لگوائی گئی تھیں۔ حکومت اُترپردیش کی طرف سے اس مجموعے کی اشاعت کا قوی امکان تھا۔ پھر اُس کا کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں۔ وہ علیل ہو کر چلے گئے تھے اور دو سال ہی میں مجھے آگرہ سے ہجرت کر کے بمبئی آنا پڑا ——— میں نے صرف چند دن میں گھر اور دفتر کی تین سے زیادہ الماریوں میں بھری ہوئی ہزاروں کتابوں اور مختلف جگہوں پر پڑے ہوئے کاغذات، مسودات اور رسائل کو اُلٹ پلٹ کیا تھا اور شب و روز مصروف رہ کر سیکڑوں کاغذات و مسودات، کتب و رسائل اپنے ساتھ بمبئی لانے کے لئے نکالے تھے۔ اُس وقت مجھے نظموں کے اُس مجموعے کا جس کا میں نے ذکر کیا ہے اُردو نسخہ تو مل گیا تھا لیکن ہندی نسخہ نہیں ملا تھا اور پھر وہ اُردو نسخہ بھی اُن ہنگامی حالات میں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی چیزیں تلف بھی ہو گئیں۔ اُن کے تین قدیم دیوان بھی ضائع ہو گئے۔ جن میں سے ایک کا سرورق حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور جو نستعلیق میں نہایت خوبصورت اور خوشخط لکھا ہوا تھا۔ اندرونی صفحات میں کافی غزلیں بھی جگر صاحب کے قلم سے نقل شدہ تھیں (سرورق کا عکس ایک بار "شاعر" میں بھی چھاپا گیا تھا) ان تینوں "دیوانوں" میں سے والدِ مرحوم نے کچھ منتخب اشعار "کلیمِ عجم" کے آخری حصے میں لے لئے تھے۔ جو راز چاندپوری اکثر اُن میں سے بعض غزلوں کے اشعار اپنی "داستانِ [illegible]" میں یاد دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سیماب کی اور بہت سی یادگار و قیمتی چیزیں تلف ہو گئیں۔

بقول حضرت راز چاندپوری، نثرِ سیماب کی طرف ہنوز کسی نے توجہ نہیں کی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ نثر ہی کیا اُن کے سرمایۂ نظم وغزل، قطعات و رباعیات پر بھی اب تک لکھنے کی طرح کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ جناب مجنوں گورکھپوری کی جس رائے کا اقتباس ملاحظہ نے اپنے مضمون میں دیا ہے وہ مجنوں صاحب کی ذاتی رائے نہیں ہے۔ اسی طرح کی رائیں مولانا نیاز فتحپوری کی اُن مصلحت آمیز رایوں کی بازگشت ہیں جو اُنھوں نے "نگار" کے ایک نمبر میں دی تھیں۔ "نگار" کے اس نمبر میں اُس دور کے اساتذہ کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد دوسرا شمارہ "انتقاد نمبر" تھا۔ اس "انتقاد نمبر" میں اکثر نقادوں نے کچھ الفاظ بدل کر نیاز صاحب ہی کی رایوں کو دہرا دیا تھا۔ ہمارے اس دور کے نقادوں نے خود سیماب صاحب کو مکمل طور پر پڑھنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ صرف پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتابوں میں سیماب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے دوسروں سے الگ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

قطع نظر اس سے کہ سیماب نے نظم ونثر کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ اس کی مثال مشکل ہی سے کسی دوسری زبان کی تاریخ میں ملے گی، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس "تمام سرمایۂ ادب" کا دیانت دارانہ تجزیہ کیا جاتا۔ کمزور اور معمولی چیزوں کو نکال دیا جاتا۔ اور اُن کی نظم ونثر کے اہم شہ پاروں کو نہ صرف اچھے انداز میں شائع کیا جاتا بلکہ اُن پر اظہارِ خیال بھی ہوتا۔ اُردو میں بہت بڑی بڑی شخصیتیں ہوئی ہیں۔ ہم نے غالب اور اقبال کی عظمت اور اُن کے سرمایۂ کلام کی تنقید وتدوین اور اعتراف کے لئے بڑا کام کیا ہے۔ دوسرے مشاہیرِ اُردو پر بھی خاطر خواہ کام ہونا چاہئے۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

ایک گذارش :-

والدِ مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی کی وہ مطبوعہ، پرانی نثری کتابیں جن کے نام میں نے دئے ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں کسی صاحب کے پاس اگر اُن کا کوئی نسخہ ہو تو از راہِ کرم مجھے بھیج دیں یا جن حضرات کی نظروں سے دونوں ملکوں کی چھوٹی بڑی لائبریریوں میں کوئی کتاب گذری ہو تو مجھے مطلع فرما دیں تاکہ اُس کی نقل حاصل کی جا سکے۔

اعجاز صدیقی

جیون لعل گوہر

ہندوستان کا فنِ مصوری

زمانۂ قبلِ تاریخ کا انسان جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا، اپنے رہائشی غاروں کی دیواروں پر مختلف جنگلی جانوروں کی تصاویر جادو ٹونے کے طور پر بنایا کرتا تھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ شکار حاصل کر سکے ـــــ یہ تھا فنِ مصوری کا نقطۂ آغاز ـــــ

دُنیا کی قدیم ترین پکچر گیلریاں دشت و جبل کے یہی غار ہیں جن میں ہرن، بارہ سنگھا اور دیگر جانوروں کے نقوش انسان کے ذوقِ مصوری اور اُس کے رجحانِ فطرت پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

قدیم یونان و روم، مصر و بابل، چین و ہندوستان، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں فنِ مصوری کے نامور ماہرین پیدا ہوئے۔ جن کی تخلیقاتِ جمیل آج متمدن دُنیا کا تہذیبی سرمایہ ہیں۔

ہندوستان میں فنِ مصوری کا آغاز تہذیب کی پہلی کرن کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ہندوستانی مصوری کی جڑیں، موسیقی اور شاعری کی طرح، مذہب کی زمین میں پیوست ہیں۔ قدیم مذہبی لٹریچر مثلاً رامائن میں MURAL PAINTING یعنی نقش بردیوار تصاویر کا ذکر ملتا ہے۔ بھاگوت پُران میں بھی قدیم مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں ـــــ بُدھ اور جین مت کے دورِ عروج میں مصوری اور سنگ تراشی نے مذہبی داستانوں اور گاتھاؤں ہی کو اپنا موضوع بنایا۔ جہاں جین مت کے اثرات مغربی ہند کے دیلواڑہ مندروں کی چھتوں پر MINIATURE STYLE کے نقوش میں جھلکتے ہیں وہاں بُدھ مت کے عروج کی داستان نقوشِ اجنتا دہراتے ہیں۔ اجنتا کے MURALS جنہیں غلط طور پر فریسکوز FRESCOS کہا جاتا ہے (درحقیقت FRESCO اُس نقش کو کہتے ہیں جو دیوار کے گیلے پلسٹر پر بنایا جائے) نامعلوم فنکاروں کی تخلیق ہیں۔ یہ قدیم شہ پارے قدیم ہندوستانی مصوری کے محاسن کا حیرت آفریں آئینہ ہیں ـــــ امتدادِ وقت کے ہاتھوں مجروح ہونے کے باوجود یہ نقوش صرف ایشیائی مصوری ہی میں بلند مقام نہیں بلکہ مائیکل انجلو MICHAEL ANGELO کے عہد تک کے مغربی شاہکاروں پر بھی اُنہیں وہ تفوّق حاصل ہے جسے خود یورپ کے نقادانِ فن نے تسلیم کیا ہے ـــــ اجنتا آرٹ کمالِ فن کا وہ سرچشمہ ہے جس سے پورے ایشیا کا فنِ مصوری برسوں فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ اجنتا اسکول کے اثرات، افغانستان اور چینی ترکستان کے قدیم نقوش میں جلوہ گر ہیں۔

تبت کے ایک شخص تارا ناتھ کی تصنیف میں ہندوستان کی قدیم اسالیبِ مصوری کی جغرافیائی تقسیم کے مطابق، پراچین بھارت کے مختلف علاقوں میں مختلف اسالیب (STYLES) مروج و مرتّب تھے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں مگدھ دیش (جسے اب بہار کہتے ہیں) کے مشہور حکمران، راجہ بمبسار (बिम्बीसार) نے فنِ سنگ تراشی اور مصوری میں بہت دلچسپی لی اور فنکاروں کی فراخدلی سے سرپرستی کی۔ اُس کے عہدِ حکومت میں اِس کلا کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ کچھ سال بعد مشرقی ہند میں بنگالی اسکول نے کافی اہمیت پائی۔ دسویں صدی عیسوی میں کشمیر، نیپال، برما اور جنوبی ہند میں گولکنڈہ، میسور اور لنکا کے اسٹائل نے اپنے اپنے انفرادی مقام پیدا کئے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں درختوں کے پتّوں پر کھینچی ہوئی رقص کی مختلف مُدراؤں POSES کی تصویریں اپنے رنگوں کی شادابی و تازگی، خطوط کی نفاست و نزاکت کے اعتبار سے آج کے نقاد کو بھی "نقشِ حیرت" بنا دیتی ہیں۔

پندرھویں صدی میں حُسین شاہ سیکری کے عہد میں جین مت کی مشہور کتاب "جین کلپ سوتر" کے قلمی نسخے کو مصوّر کیا گیا۔ یہ قلمی نسخہ جناب احمد آباد کی جین لائبریری میں ہے۔ MINIATURE PAINTING کی دربار کا اسٹائل کا دلکش نمونہ ہے۔

پندرھویں صدی میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد میں ایرانی اور راجپوت اسالیبِ مصوّری کے باہمی اختلاط سے "مغل اسکول" کی عمارت پڑی اور اکبر نامہ، رزم نامہ جیسے مرقعّے معرضِ وجود میں آئے جن میں دربار و شکار، رزم و بزم وغیرہ کے متحرک اور جاندار مناظر کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ عہدِ اکبری کے دو مشہور ایرانی مصوّروں عبد الصمد اور سید علی نے پچاس ملازم ہندوستانی مصوّروں کے اشتراکِ عمل سے حمزہ نامہ کی چودہ سو رنگین تصاویر کا مرقع تیار کیا جو قدیم راجپوت سٹائل اور ایرانی اثرات کے امتزاج کا آئینہ ہے۔

سولہویں صدی میں شہنشاہ جہانگیر جسے خود فنِ مصوّری سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ اپنے نقّادِ فن ہونے پر بھی فخر تھا، نے کئی فنکاروں مثلاً آقا رضا ہراتی، فرخ بیگ، منصور، ابو الحسن، گوردھن اور کشن داس کو ملازم رکھا اور سر ٹامس رو THOMAS ROE جو انگلستان کے دربار میں جیمز اوّل کا سفیر تھا، سے کہہ کر یورپ کے مستند شاہکار منگوائے اور اپنے درباری مصوّروں سے اُن فن پاروں کی ایسی کامیاب نقول تیار کرائیں کہ خود سر ٹامس رو کو اصل اور نقل میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔

سترھویں صدی کے آغاز میں گولکنڈہ کے فن کاروں نے سُوتی کپڑے پر نہایت پائدار رنگوں میں مندروں اور شاہی درباروں کے لئے حسین و جمیل تصویریں تیار کیں۔ سترھویں صدی کے آخر میں کانگڑہ اسکول کے اربابِ فن نے راجا سنسار چند کی سرپرستی میں رادھا کرشن کے موضوع پر وہ جاذبِ نظر فن پارے پیش کئے جن میں رنگوں کی آب و تاب اور خطوط کی دلآویزی یکسر ایک لحنِ موسیقی ہے، ایک "دنیائے رنگ و آہنگ" ہے۔ انسانی چہروں میں لطیف جذبات کے "انعکاسِ کامل" نے مصوّری اور شاعری کو ہم آغوش کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ تصاویر سو جانیت، سجگتی، پاکیزگیٔ محبت اور خود سپردگی و فداکاری کے عاشقانہ جذبات کا عکسِ جمیل اور خط و رنگ کی زبان میں کہی ہوئی "غزلیں" معلوم ہوتی ہیں۔

کانگڑہ شیلی کے مصوّر مانک نے ہندی کوی بہاری کے جذبات انگیز و حشر خیز کلام کو اس کی سرشارکن کیفیات کے ساتھ اپنے فن میں سمو کر بہاری کے "شرنگار رس" اور حُسنِ خیال کی یوں تجسیم کی ہے کہ ہر نقش کے منہ میں زبان رکھ دی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں دوسرے پہاڑی مکاتب و مراکزِ فن مثلاً چمبا، بسوہلی، ملوٹ، کچھ وغیرہ کے اہلِ فن نے مہا بھارت، بھگوت گیتا، پنچ تنتر اور شاعر جے دیو کی گیت گووند سے منتخب موضوعات کے با تصویر مرقعّے پیش کئے۔ اسی صدی کے آخر میں بجے پور میں راجپوت سٹائل کے نمائندہ فن کاروں نے "راگ مالا" کو مصوّر کیا اور اپنی خیال آفریں صلاحیتوں کا عرفانی نقش دلوں پر بٹھا گئے۔

عہدِ مغلیہ ہی میں یورپ کے شاہکار ہندوستان میں درآمد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ شاہانِ مغلیہ کے مصوّروں نے مغربی تکنیک کے عناصر کو اپنے اسلوب میں جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح مغربی آرٹ کی پرچھائیاں ہندوستانی مصوّری پر پڑنے لگ گئی تھیں۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد جب ملک پر غیر ملکی غلبہ مکمل ہو گیا تو ہمارے آرٹ اور کلچر پر مغربی اثرات، وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ یہاں کے اربابِ فن نے مغرب کے تجربات سے اثر قبول کیا اور پرسپکٹیو PRESPECTIVE لائٹ اینڈ شیڈ، وغیرہ کے اصولوں کو سمجھ لینے کے بعد یہاں کے مصوّروں نے اپنی تخلیقات کو زندہ اور متحرک بنا دیا، لیکن اس تقلیدی عمل کا ردِّ عمل بھی ہوا۔ بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کے اثر سے اشیتل کمار ہلدار A. K. HALDAR اور نند لال بوس نیگالی چتر کاروں نے بھارت کے کلاسیکل آرٹ کو پھر سے زندہ کیا۔ سودیشی کی تحریک نے اجنتا فریسکو، راجپوت اور مغل سٹائل کی تجدید پر زور دیا اور کلاسیکی مصوّری پھر مقبول ہونے لگی۔ تاہم برٹش اقتدار کے زیر اثر مغربی اسالیبِ فن کی مختلف لہریں، مختلف وقتوں میں ہندوستانی مصوّری کو نئے نئے موڑ عطا کرتی رہیں۔ سب سے زیادہ اثر غالباً فرانس کے اسالیب سے قبول کیا گیا۔ جدید رجحانات کے اثر سے، مختلف سکولوں کے امتزاج باہمی سے نئے نئے اسالیب کی بنیاد پڑتی رہی۔ مختلف وقفوں کے بعد جو مختلف اسکول منظرِ عام پر آئے اُن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں

امپرشنزم IMPRESSIONIST اس اسکول کا بانی CEZANNE تھا۔ جس کا نظریہ مصوری یہ تھا کہ پہلی نظر میں جو تاثر فنکار محسوس کرتا ہے صرف وہی نقش کیا جائے۔

کیوبزم (CUBISM) فرانس کے اس اسلوبِ مصوری کے نمائندے GRIS JEANUERET BARQE وغیرہ رہے۔ لیکن پکاسو PICASSO کا نام اس باب میں زیادہ معروف ہے۔ اقلیدسی اشکال، مثلث، مربع اور دائرہ سے یہ اسکول کام لیتا ہے۔

سرریلزم SURREALISM اس اسکول کی ابتدا شاعر ANDRE BRETON آندرے بریتون کی تحریک سے ہوئی۔ جس نے شاعری، ڈراما اور فلسفے تک کو متاثر کیا، اس کا تعلق تحت الشعور (SUBCONCIOUS) سے ہے یعنی فرائڈ کی تھیوری سے یہ کافی حد تک متاثر ہے۔ ہسپانوی مصور SALVADOR DOLI کا نام اس سلسلے میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

جس طرح شاعر الفاظِ منتخب کے حسنِ ترتیب سے اپنے تاثرات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اسی طرح مصور بھی اظہارِ خیال و تاثر ہی کے لئے خطوط و اشکال، رنگ و روغن، روشنی اور سائے کے حسنِ امتزاج سے کام لیتا ہے۔ گویا مصوری خط اور رنگ کی زبان میں کی ہوئی شاعری ہے۔ مثلاً راگ مالا میں ہندوستانی فن کاروں نے راگنیوں کی جو تاثراتی تصاویر پیش کی ہیں، اُن میں قوتِ تخیل کے زور سے انسانی چہروں، بادلوں، سبزہ زاروں وغیرہ "جزئیاتِ ماحول" کے ذریعے اُن راگنیوں سے پیدا ہونے والے اثرات و کیفیات کو ظاہر کیا ہے۔ یہی ہر تصویر کا ایک مفہوم ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ مصور نے اپنے محسوسات کا اظہار ہیئت و رنگ COLOUR + FORM کی زبان میں کیا ہے اور اس طرح اپنی شخصیت اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ فن در حقیقت فن کار کے قلب و دماغ و روح کا مظہر یا فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت اور اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کی خواہش انسان کی جبلت و فطرت کا تقاضا ہے لیکن فرانس کے امپرشنسٹ اسکول کے اکثر شاہکار دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے کوئی جھاڑو مختلف رنگوں میں ڈبو کر کینوس پر پھیر دی ہے اور مصور اگر کسی خیال کو ظاہر کرنا چاہتا بھی تھا تو اُس خیال کا اظہار اُس کی تخلیق نہیں کرتی۔ یہ درست ہے کہ عہدِ قدیم کا معیارِ فن یہ تھا کہ آرٹسٹ نے نقل کو کہاں تک اصل سے مطابق اور قریب کر دیا ہے اور آج ہم محض نقالی کو معراجِ فن قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ دیکھنا تو آج بھی ضروری سمجھا جانا چاہئے کہ آرٹسٹ کا ذہن خیال آفریں ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ وہ اپنے تاثر کو CONVEY کر سکتا ہے یا نہیں۔ عہدِ حاضر کی تکنیک کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو لیکن جدید ترین شاہکاروں میں مفہوم اور جمالیاتی قدروں کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ ہاں اگر آج حسن کی بنیادی قدریں ہی اتنی زیادہ بدل گئی ہیں کہ تناسب و توازن کو عیب اور اظہارِ احساس و خیال کو ایک مجذوبانہ حرکت سمجھا جانا ضروری ہو گیا ہے تو بات دوسری ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حسن کی اساسی اقدار پر سکیچ کے اصول، خطوط کا تناسب و تجاذب، کلر و فارم کی تہذیب و ترتیب، جن کا تعلق انسان کی جمالیاتی حس AESTHETIC SENSE سے ہے اور جو انسانی تہذیب کا حصہ اور سرمایہ ہیں مکمل طور پر منقلب کیونکر ہو سکتی ہیں یا محض آڑی ترچھی غیر متناسب لکیروں اور رنگین دھبوں کو نئی شاہکار کہنا کہاں تک مناسب ہے!!—

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا کہ "شاعری میں کبھی مفہوم کو بنیادی اہمیت حاصل تھی لیکن آج محض الفاظ ہی سب کچھ ہیں اُن کو اِدھر سے اُدھر کرتے رہیے ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو بچ جائیں گے وہ سامعین خود پورا کر لیں گے، بلکہ آج کل تو ویسے اچھا شعر وہی سمجھا جاتا ہے جس کا کوئی معنی و مفہوم ہو ہی نہیں"۔ یہ اُن کا ایک طنز تھا جدید رجحاناتِ شاعری پر لیکن غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ کم و بیش یہی حال ہماری جدید مصوری کا بھی ہے۔ ٹالسٹائی کا قول ہے کہ آرٹ ایک ایسا شغل ہے جس میں شعوری طور پر اپنے احساسات کو اس انداز میں دوسروں تک فن کار پہنچاتا ہے کہ دوسرے بھی اُس کے احساس سے اسی طرح متاثر ہوں جیسے خود فن کار متاثر ہوا ہے۔ گویا ناظر سے خطاب، یا ترسیلِ خیال "COMMUNICATION" ہی ہر تخلیقی عمل اور ہر فن پارے کا مقصودِ اصلی ہونا چاہئے۔ لیکن ہمارے جدید فن کاروں نے فرانسیسی اور دیگر مغربی STYLES کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا کر ایک ایسے تجریدی دور کا آغاز کیا کہ ان تجربات

ڈاکٹر سید عبدالحی رضا
(سینٹ زیویرس کالج بمبئی)

اعجاز صدیقی کی نظم کربِ خود کلامی پر چند تاثرات

پتہ نہیں اوروں کا کیا حال ہوا، مگر اعجاز صدیقی کی نظم "کربِ خود کلامی" پڑھ کر مجھ پر ایک عجیب سی رقت طاری ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظم میں صرف اعجاز صدیقی نہیں بولتے ہیں بلکہ صدہا انسانوں کے دل کی آواز سنائی دے رہی ہے جو امن اور شانتی کے خواہاں ہیں۔ اس میں ایک محبِ وطن شاعر بول رہا ہے اور آج کے صحیح الدماغ انسان کے دل کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔

اس نظم میں شاعر کے جذبے کے خلوص ہی کو نہیں بلکہ تجربہ اور مشاہدہ کو بھی بڑی قربت حاصل ہے اسی لئے تیکھے پیرایۂ بیان میں بھرپور صداقت اور تاثر پیدا ہوگئی ہے۔ اچھا ہوا کہ شاعر نے اپنے دل و دماغ کے پورے کرب کو نظم کے اس فارم میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس فارم کی وسیع فضا کی وجہ سے شاعر کو بھی اظہارِ خیال میں کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی ہوگی اور اسی کی وجہ سے اس کا ذہن ماضی، حال اور مستقبل کا بڑے پھیلاؤ کے ساتھ جائزہ لے سکا ہے۔

دورانِ جنگ میں بہت سی نظمیں لکھی جاتی ہیں، مگر جذبہ کی اصلیت کے فقدان کی وجہ سے بلندی تک نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ یہ نظم "کربِ خود کلامی" ہرگز اس اعتبار سے نہیں لکھی گئی ہے، عنوان اور پوری نظم کا مزاج اس بات کی کھلی دلالت کرتا ہے کہ اس نظم کو ذہن سے صفحۂ قرطاس پر لانے کے لیے خود شاعر کا ذہن اور قلب کس قدر کرب میں تھا۔ اسی وجہ سے اس پوری نظم میں الہامی رنگ پیدا ہوگیا ہے، برسوں کا مطالعہ، برسوں کے تجربات، برسوں کے مشاہدات شاعر کے ذہن میں اکٹھے ہوتے رہے ہیں۔ اس حالیہ جنگ نے ایسی کربناک فضا پیدا کی کہ شاعر اس نظم کی تخلیق کے کرب میں تڑپنے لگا، یہاں تک کہ یہ نظم وجود میں آئی، میرا خیال ہے کہ اس پوری جنگ کے دوران اور اس کے بعد اب تک اس سے بہتر نظم نہیں لکھی جا سکی ہے۔ اب یہ نظم اعجاز صدیقی کی نظم نہیں رہی ہے بلکہ وقت کی آواز ہوگئی ہے، اس نظم میں امن اور محبت کا عالمگیر پیغام ایک خاص پس منظر میں سنائی دیتا ہے۔ یوں تو ہر شاعر امن و آشتی کا پیغام دیتا رہتا ہے اور اسے صرف ایک موضوع کی حیثیت سے برتتا ہے مگر اس نظم میں امن کے مطالبہ کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ شاعر ماضی کے پس منظر میں ڈوب کر ابھرتا ہے، حال کا جائزہ لیتا ہے اور مستقبل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

سترہ سال کے بعد،
آج زخموں سے اسی طرح لہو بہنے لگا،
جیسے پہلے کبھا بہا،
ایک ایک منظرِ خوں بار ہوا پھر تازہ!
آج پھر "برقِ تپاں" کوند رہی ہے سر پر،
کہیں تاراج نہ ہو جائے، یہ پھر سے مرا گھر؟!
"آٹھ معصوم یہ پھول" —!
ملک کے اور بھی لاکھوں غنچے،

کہیں مسموم ہواؤں سے نہ مرجھا جائیں۔؟!
دفن ہو کر کہیں رہ جائیں نہ وہ شہ پارے،
جن کی نقلیں بھی نہیں!
ہیں جو اوراقِ رسائل پہ ابھی تک کندہ،
یا کوئی آگ لگا دے ان میں،
یا کسی بم کے دھماکے سے جھلس جائیں یہ؟

شعلۂ جنگ جگایا ہے جو ہمسایوں نے

اُس سے دامانِ وطن جل اُٹھا
رہ گئے امن کے وہ خواب پریشاں ہو کر!
مَیں جنھیں دیکھ رہا تھا اب تک،
امنِ عالم کے لئے میں نے دُعائیں کی ہیں
اُن دُعاؤں کا یہ انجام ہوا؟!
میرے اللہ — نہ چھڑ جائے کہیں،
تیسری جنگِ عظیم —،
دُوسری جنگ کی دیکھی ہے تباہی میں نے —

پُوری نظم ایک خاص آہنگ اور آہ ما زپیش کرتی ہے، شاعر نے بلندی پر چڑھ کر اور گہرائی میں ڈوب کر بڑی اُونچی بات کہی ہے، عام طور پر جنگ کے دوران میں ایسی باتیں کہنے کی حقائق گم ہو جاتی ہے، یہ نظم اپنی جاندار اثرانگیزی کی بُنیاد پر بہت دنوں تک زندہ رہے گی اور تاریخِ ادب میں اس کا ذکر ناقابلِ گریز ہو گا۔

شاعر نے صدہا انسانوں کے دل اور دماغ سے اِس قدر قریب ہو کر یہ نظم کہی ہے کہ آپ بیتی میں جگ بیتی کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی بھی جب اِس نظم کو پڑھتا ہے تو اُسے اپنے دل کی آواز اور دھڑکن سنائی دینے لگتی ہے۔ اُس کے اپنے ہی جذبات ڈھلتے ہوئے سامنے آنے لگتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی جذبے سے پُر تو ہوتا ہے مگر الفاظ پر، اُس کی ترتیب پر اور خود اظہارِ فن پر قدرت نہیں رکھتا تو صرف دو ایک جملے کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اعجاز صدیقی ایک صاحبِ نظر شاعر ہیں، اِس لئے جذبات کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اُن کی اِس نظم میں خیال اور جذبہ کا ایک سیلاب سا اُمڈا چلا آتا ہے۔

ہند اور پاک جنھیں کہتے ہیں،
ایک ہی گھر کے دو دروازے ہیں،
ایک ہی پیڑ کی ہیں دو شاخیں
ایک ہی پھول کی دو مُسکانیں —
ایک ہی ساز سے نکلے ہوئے دو راگ ہیں یہ،
پُرسکوں ہو کے بہیں،
سبز و شاداب رہیں،
مُسکراہٹ نہ چھنے اِن کے لبوں سے یارب
اِن کے نغمات سے ہستی کی فضائیں گونجیں
اِن کے تہذیب و تمدّن میں بہت فرق نہیں،
سیکڑوں سال رہے ہیں کے جو بھائی بھائی
"مُشترک قدر" ہے، اخلاق و محبّت جن میں
ایک وابستگی رکھتے ہیں ابھی جن کے عوام —
آہ —،
ماضی کی وہ قدریں بھی مٹی جاتی ہیں،
گردنیں شرم و ندامت سے جھکی جاتی ہیں۔

نظم اپنے ابتدائی حصّے میں اعجاز صدّیقی کے دُکھ درد کی تصویر معلوم ہوتی ہے، مگر جوں جوں آگے بڑھتی ہے جذبات کی روانی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اِس کا کینوس وسیع ہوتا جاتا ہے اور اس کی ہمہ گیریت اور آفاقیت بڑھتی جاتی ہے اور اپنی اثرانگیزی کی وجہ سے قاری کے ذہن میں جذب ہونے لگتا ہے۔ کبھی قاری پر رقّت طاری ہوتی ہے اور کبھی وہ ایک پاکیزہ جذبہ میں ڈوب کر شاعر کی ہم نوائی میں گم ہو جاتا ہے۔

اِس نظم کے پس منظر میں شاعر کا وجود اور اس کی شخصیت اُبھرتی نظر آتی ہے۔ اُس کا دلِ دردمند، اُس کے مزاج کی نرمی، ذہن کی پاکیزہ وردی، اُس کا خلوص، اُس کی حبّ الوطنی، انسانی ہمدردی، جنگ کی مخالفت، امن کی آرزو، اپنے اور اپنے گھر والوں سے محبّت، وطن والوں سے الفت، ہندوستانی روایت، مذہب کی روح، ادب کی قدر دانی، ہر طبقۂ انسان کی خیرخواہی، اُس کی زندگی کا المیہ، اُس کی خاموش ردّی، اُس کی چھوٹی بڑی آرزوئیں۔

میرے باغوں، مری ندیوں، مرے کہساروں کی خیر
میرے شہروں، مرے قصبوں، مرے بازاروں کی خیر
آنچ آئے نہ کوئی عصمتِ حُرّیت پر،
ہم بڑھے اور بڑھیں، اور بڑھیں،
پست نہ ہوں —
کسی صورت یہ گھنے جنگ کے بادل چھٹ جائیں،
ظلمتِ شب سے نمودار ہوں آثارِ سحر،
ہاتھ انسان کا انساں پہ اُٹھے!
کتنی تذلیل ہے انسانیتِ کبریٰ کی —؟!
"بڑی طاقتیں" — یہ بات سمجھتی ہی نہیں!
سامنے اِن کے ہے انجام مسولینی کا،
اور ہٹلر کے بھی انجام سے یہ واقف ہیں،
آنے والی نئی نسلیں یہی سوچیں گی — کہ یہ،
عہد میں اپنے تھے چنگیز و ہلاکو سے سوا —
آج تو امن کی پیاسی ہے یہ ساری دنیا —
کیوں نہ سب مل کے کریں امن کے پرچم کو بلند،

الشیا ـــــ
امن کا سنگم بن جائے

الشیا ـــــ
امن کا پرچم بن جائے

غرض شاعر نے پوری نظم میں بڑے پاکیزہ جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے اور ملک کے امن پسند مزاج کی نمائندگی کی ہے۔

نظم "کربِ خود کلامی" میں اضافہ و تصحیح

صفحہ ۵۳ کے دوسرے کالم کی ساتویں سطر میں "حُسن عشوہ کا نگر" چھپا ہے۔ اِس میں "واؤ" رہ گیا ہے۔ "حُسن و عشوہ" بنالیا جائے۔

صفحہ ۵۳ کے پہلے کالم کے پانچویں مصرعہ میں "ایٹمی طاقتیں" کے بجائے "جنگجو طاقتیں" کرلیا جائے۔

صفحہ ۵۳ کے دوسرے کالم میں بمبئی کی چند ادبی شخصیتوں کے نام دیئے گئے ہیں۔ اِنتشارِ ذہنی اور شعری دُشواریوں کے سبب اس وقت چند اور قابلِ ذکر شخصیتوں کے نام رہ گئے تھے۔ اِس حصّہ کے آخر میں ذیل کے چار مصرعوں کا اضافہ کرلیا جائے۔

اعجاز صدّیقی

فازی و ذاکر و رزّاق و زکریا و قمر
کالیہ، حارث و بوبیرے، فقیہہ و انور
حمید رونامی و جاوید و محی، گوریکر
احسن و آہ و مظفر، اسد و جانی، نظر

مولانا حامد الانصاری غازی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ عبدالرزاق قریشی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا۔ مولانا قمر نعمانی سہسرامی۔ قمر جلال آبادی، پرنسپل مدن موہن کالیہ۔ معین الدین حارث۔ عبدالحمید خاں بوبیرے۔ مصطفٰے فقیہہ۔ انور عظیم۔ حکیم مرزا حمید بیگ۔ ڈاکٹر عبدالسلیم نامی۔ پروفیسر عصمت جاوید۔ ڈاکٹر عبدالعلی رضا۔ پروفیسر نظام الدین۔ ایس گوریکر۔ احسن رضوی داناپوری۔ ڈاکٹر صفدر آہ۔ مظفر شاہجہانپوری، اسد بھوپالی۔ آغا جانی کاشمیری۔ نظر مالیگانوی۔

ضیا حسینی

ثاقب کانپوری سے ایک گفتگو

ثاقب صاحب فتحپور تشریف لائے تو میرا بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر اُن سے شعر و ادب کے موضوع پر باتیں کروں، وہ ملتفت ہوئے تو میں نے یوں بات شروع کی۔

ضیا۔ جناب، آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

ثاقب۔ کانپور میں پیدا ہوا، اِس وقت میری عمر اکسٹھ سال ہے۔

ضیا۔ آپ نے اپنی ادبی زندگی کب اور کس طرح شروع کی ؟

ثاقب۔ ۱۹۳۱ء میں میں حیدرآباد گیا تھا۔ وہاں میرے ایک عزیز سید علی جمل الیل کا قیام تھا۔ اُن سے مجھے دلی محبت تھی، اُن کا وعدہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ کانپور چلوں گا لیکن وہ میری روانگی سے پہلے کسی قریبی گاؤں میں چلے گئے۔ میں مجبوراً بادلِ ناخواستہ کانپور کے لئے روانہ ہوگیا۔ اِس واقعہ نے میری طبیعت میں انتہائی جوش اور ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ جب میں کانپور پہنچا تو میرے دل کی بے چینی نے مجھے ایک نظم کہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ میری سب سے پہلی نظم تھی۔

ضیا۔ جیسے ہی آپ کے وجدان نے شعر گوئی پر آپ کو آمادہ کیا تو اُس وقت آپ کو کسی رہنما کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ وہ قابلِ قدر شخصیت کون تھی ؟

ثاقب۔ اُس زمانے میں ایک صاحب تلاشِ معاش کے سلسلے میں کانپور آئے ہوئے تھے اور مولانا آزاد سبحانی سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے اُن ہی کے دولت کدے پر قیام پذیر تھے۔ میں نے نثر نگاری پہلے ہی شروع کر دی تھی اور مولانا آزاد سبحانی سے مضامین پر اصلاح لیا کرتا تھا۔ یہ نظم بھی اصلاح کے لئے میں نے اُن ہی کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ "اب مولانا احسن آگئے ہیں تم اپنے مضامینِ نثر و نظم اُنھیں کو دکھایا کرو۔ چنانچہ میں نے وہ نظم مولانا احسن کی خدمت میں پیش کی۔ اُن کی ضروری اصلاح نے اُس نظم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور پھر اصلاح کا مستقل سلسلہ قائم ہوگیا۔

ضیا۔ ادبی زندگی کے آغاز کے وقت کوئی مقصد پیشِ نظر تھا آپ کے ؟

ثاقب۔ میرے نزدیک شعر گوئی خود ایک مقصد ہے جس نے مجھ سے شعر کہلوانا شروع کئے۔

ضیا۔ ویسے آپ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن آپ کی غزلیات نے بالخصوص میری توجہ مبذول کی ہے۔ کیا آپ زحمت کر کے اُن چونکا دینے والی نظموں کی طرف اشارہ کریں گے جو میری نگاہوں سے نہیں گزریں۔

ثاقب۔ "بیوہ اور برسات"، "شاعر"، "محبت"، "حسن"، "شمع اور پروانہ"، کافی مقبولِ عام نظمیں ہیں، اِنھیں آپ میرے پہلے مجموعے "متاعِ درد" میں دیکھ سکتے ہیں۔

ضیا۔ آپ کے کتنے شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں ؟

ثاقب۔ دو، "متاعِ درد" اور "زرِ جاوداں"۔

ضیا۔ آپ کے نزدیک اچھی نظم کی خصوصیت کیا ہے؟
ثاقب۔ اچھی نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے اشعار بیچ سے حذف کر دئے جائیں تو نظم بے کیف اور غیر مرتب ہو جائے گی۔ اور اُس کے تسلسل میں فرق آجائے گا۔ میری نظمیں ایسی ہیں جن کے ساتھ آپ ایسا سلوک نہ کر سکیں گے۔
ضیا۔ آپ نظم کس طرح کہتے ہیں؟
ثاقب۔ جب نظم کا خاکہ میرے ذہن میں مرتب ہو جاتا ہے تو میں قلم اُٹھاتا ہوں۔
ضیا۔ آپ اچھی غزل کسے کہتے ہیں؟
ثاقب۔ غزل میں محض جذباتیت نہ ہو اور وہ واردات قلب کی حقیقی ترجمان ہو۔
ضیا۔ قدیم شعراء میں سے کس شاعر نے آپ کو سب سے زیادہ متأثر کیا ہے اور کیوں؟
ثاقب۔ صرف غالب نے، اِس لئے کہ اُس نے اپنے زمانے میں ایک ایسا راستہ متعین کر لیا تھا کہ اُس پر اُس کے علاوہ کوئی چلنے والا نہیں تھا۔
ضیا۔ ثاقب صاحب! کیا آپ غزل کے کچھ منتخب اشعار سُنا کر مجھے شاد کام کریں گے؟
ثاقب۔ سنئے!

ساری آبادی ویرانہ مری ذات سے تھی — ایک سناٹا مرے بعد بیابان میں رہا
اللہ ری تاروں کی یہ بے خوفیٔ انجام — ہوتی ہے سحر اور یہ تو ہنستی ہے جبیں اور
اللہ! اللہ! تری بزم کی حیرت افزی — سوچتا ہوں کہ مری رات کہاں گزری تھی ہے

ضیا۔ آپ شعر کب اور کس طرح کہتے ہیں؟
ثاقب۔ میں غزل ہر وقت کہہ سکتا ہوں۔ اِس کے لئے کوئی خاص وقت کی ضرورت نہیں۔ لیکن عموماً پچھلی رات کو اُٹھنے کے بعد غزل کہتا ہوں۔
ضیا۔ شاعری کے علاوہ ادب کی کن دُوسری اصناف سے آپ کو دلچسپی ہے؟
ثاقب۔ پڑھنا اور لکھنا شب و روز کا مشغلہ ہے۔ ہر موضوع پڑھتا ہوں۔ سوانح اور سفرناموں سے بے حد دلچسپی ہے۔ نثر سے میں نے اَدبی زندگی شروع کی تھی "الادب" جو مولانا احسن سنبھلی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اُس میں میرے بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ میری کچھ کہانیاں ماہنامہ "ساقی" میں چھپی تھیں۔ ایک کہانی جس کا عنوان "شہیدِ غربت" تھا۔ "خدمت" میں چھپی تھی۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور میری ہی ادارت میں نکلتا تھا۔
ضیا۔ کہانی کا مرکزی خیال کیا تھا؟
ثاقب۔ عرصے کی بات ہے۔ کچھ یاد نہیں۔
ضیا۔ نئی کہانیوں کو آپ پسند فرماتے ہیں؟
ثاقب۔ مقصدی اور تعمیری کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔
ضیا۔ آپ ادب میں نئے رجحانات کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟
ثاقب۔ ترقی پسند ادب نے اُردو کو بہت کچھ دیا ہے۔ میں اُس کا مخالف نہیں ہوں۔
ضیا۔ نظم معرّیٰ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
ثاقب۔ نظم معرّیٰ سب سے پہلے میں نے کہی تھی۔ جب ترقی پسندوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ نظم کا عنوان "آبشار" تھا جو ماہ نامہ

"ہمایوں" میں شائع ہوئی تھی۔ نظم معرّیٰ اگر ایک بحر میں ہو تو مفید اور کام کی چیز ہے۔ اور جو مصرعوں کی ناہمواری کے ساتھ کہی جاتی ہے وہ بالکل مہمل اور تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں ہوتی

ضیا۔ آپ کی نظم "آبشار" کا تذکرہ میں نے "سوغات" کے جدید نظم نمبر میں دیکھا تھا۔ اُس سال آپ کی نظم کے ساتھ اور بھی نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ مثلاً علامہ تاجور کی نظم "مشرق کا پیامِ اخوت مغرب کے نام"۔ "افسر میرٹھی کی "وقت کی ڈبیا" وغیرہ۔ ممکن ہے آپ نے "آبشار" ان سب سے پہلے کہی ہو۔

ثاقب۔ ہاں اِن شعراء کی منظومات بھی شائع ہوئی تھیں۔

ضیا۔ عرصہ ہوا میں نے "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں منشی دیا نراین نگم کی شخصیت پر آپ کا مضمون پڑھا تھا۔ اُس مضمون میں آپ نے کانپور کی ادبی شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے ساتھ آپ اُن دنوں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔

ثاقب۔ علامہ سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی۔ مولانا حسن سنبھلی، اصغر گونڈوی بہت ہی قادر الکلام شاعر تھے اور ہر شخص پر اُن کی شخصیت کا اثر پڑتا تھا۔

ضیا۔ اور علامہ اقبال کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ثاقب۔ اقبال سے میں متاثر ہوں۔ وہ ایسا شاعر ہے جہاں دوسرے شاعروں کا تخیل بھی اُس کی گردِ راہ کو نہیں پہنچتا۔

ضیا۔ نیاز فتحپوری ایک صاحبِ طرز ادیب اور ایک دلکش اسلوبِ نگارش کے مالک ہیں۔ وہ نقاد اور اچھے صحافی بھی ہیں۔ لگتا ہے میں نے اُن کی شعری کاوشوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ زحمت کر کے اُن کی شاعرانہ شخصیت پر روشنی ڈالئے۔

ثاقب۔ نیاز صاحب نے اپنی ادبی زندگی شعر و شاعری سے شروع کی تھی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد سمجھ لیا کہ وہ اس میدان کے شہسوار نہیں بن سکتے۔ اُنھوں نے کبھی کوئی نظم مسلسل اور مربوط نہیں کہی۔ اُن کے مصرعوں سے کمزوریٔ بیان صاف دکھائی دیتی ہے اور شاید اسی لئے اُنھوں نے شعر و شاعری کو اپنا نہ سمجھ کر بہت جلد ترک کر دیا اور وہ اُن کے لئے مبارک ثابت ہوا۔ نیاز صاحب ذکی اور فہیم انسان ہیں۔ اُن کی نقادانہ نظر بہت وسیع ہے۔ شعر کا کوئی عیب اور حسن اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

ضیا۔ آپ مشاعروں کو مفید سمجھتے ہیں یا مضر؟

ثاقب۔ زبان کی جہاں تک ترویج و ترقی کا تعلق ہے میں مشاعروں کو مفید سمجھتا ہوں۔

ضیا۔ آپ کو "سحر طراز"، کا خطاب کہاں ملا تھا؟

ثاقب۔ لاہور میں ایک ادبی انجمن تھی جس کا نام "انجمن اربابِ علم" تھا اور جس کے سکریٹری علامہ تاجور نجیب آبادی۔ صدر سر عبد القادر اور مشیر علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ اس انجمن نے آٹھ عنوانات نظم مقرر کئے تھے اور تمام شعراء کو اس مقابلے میں شرکت کی دعوت دی تھی اور اس کا اعلان تمام اخبارات اور رسائل میں شائع ہوا تھا۔ میں نے چند نظمیں کہی تھیں اور اُن کو علامہ تاجور کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ دو مہینے کے بعد جب نتیجہ نکلا تو میری نظمیں اوّل قرار دی گئیں اور چار سو روپے نقد اور "سحر طراز" کا خطاب دیا گیا۔

ضیا۔ عرصۂ دراز سے آپ اصلاح کا کام بھی کر رہے ہیں۔ آپ اپنے شاگردوں میں کن کو فارغ الاصلاح سمجھتے ہیں۔

ثاقب۔ شارق ایرایانی۔ زیب غوری۔ پرنسپل شیام کشور نوگر۔ ساجد امیٹھوی اور بیتاب بیلی بھیتی کو۔

ضیا۔ بھائی جناب ہاشمی تشریف لے آئے۔ یہ آپ کے اعزاز میں ہونے والی نشست میں آپ کو لے جائیں گے۔ اس لئے اب میں اجازت چاہوں گا۔

یعقوب راہی

کوکن — بدیع الزّماں خاور کی نظر میں

بدیع الزّماں خاور کوکن کے ممتاز شاعر ہیں جن کا کلام ہند و پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں نمایاں طور پر چھپتا ہے۔ اور یہ بات کوکن کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ کوکن کی سرزمین اُردو ادب کی ترویج و ارتقاء کے لئے ہمیشہ سازگار رہی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کل کوکن کے ادیب و شاعر اپنی سرزمین کو اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے ہموار کر رہے ہیں اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

خاور کوکن کے ایک اہم مقام بانکوٹ میں جو بحیرۂ عرب اور دریائے ساوتری کے سنگم پر واقع ہے ۔۱۰ر جنوری ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ اس سنگم کا ذکر خود خاور اپنی ایک نظم (مصوّر سے) میں ایک جگہ یوں کرتے ہیں :-

جہاں کی سرزمیں فطرت کا شہکارِ مجسّم ہے — اسی وادی میں وہ دریائے ساوتری کا سنگم ہے
اسی وادی کا شاعر ہوں اسی سنگم پہ رہتا ہوں — میں تجھ سے اپنے فن کے تجربوں کی بات کہتا ہوں
کسی دن اے مصوّر تو اگر کوکن میں آئے گا — مری وادی کے حسن و دلکشی میں ڈوب جائے گا

خاور کو شاعری کا ملکہ ورثہ میں ملا ہے۔ اُن کے والد اور چچا شاعر ہیں جو حضرت آسی کے تلامذہ میں سے ہیں اور جو صوفی بانکوٹی اور شاکر بانکوٹی کے نام سے اہلِ کوکن میں مشہور و مقبول ہیں۔ مگر ہم اہلِ کوکن کی بدنصیبی ہے کہ مذکورہ شعراء کی شہرت اور مقبولیت و دیگر کوکن کے شعراء کی طرح صرف کوکن کی سرزمین تک محدود ہے اور جس کے لئے کسی حد تک کوکن کے شعراء خود ذمّہ دار ہیں۔

خاور نے کوکن پر بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ اور کوکن کی سرزمین کو اُردو دنیا سے روشناس کیا ہے۔ جہاں سرزمین پنجاب پر اختر شیرانی کو ناز ہے وہاں کوکن کی سرزمین کو بدیع الزّماں خاور پر فخر ہے۔ میں یہاں خاور کی اُن چند نظموں پر اکتفا کروں گا جو کوکن سے متعلق ہیں۔ خاور نے کوکن کے فطری مناظر کو بڑے دلکش اور انوکھے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ انھیں کوکن کی سرزمین سے پیار ہے، اُس کے فطری مناظر سے پیار ہے، یہاں کے لوگوں سے پیار ہے۔ بالفاظِ دیگر خاور کو کوکن کی ہر اُس چیز سے پیار اور محبّت ہے جو یہاں موجود ہے۔

خاور کی منظر کشی روایتی نہیں ہے۔ اُن کی منظر کشی میں ہندوستانی دیہاتی ماحول صاف طور سے جھلکتا ہے۔ کوکن کے مناظر پر لکھی ہوئی نظموں میں کوکن ہماری نظروں کے سامنے واضح طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ خاور جس وادی میں بستے ہیں، اُس وادی کا ذکر وہ نہایت انوکھے انداز میں "مصوّر سے" یوں کرتے ہیں :-

کسی دن اے مصوّر تو اگر کوکن میں آئے گا — مری وادی کے حسن و دلکشی میں ڈوب جائے گا
نکل آتا ہے جب سورج مرے پربت کی چلمن سے — اُجالے بہنے لگتے ہیں یہاں آنگن کے دامن سے
گلوں سے بھری مانگیں یہاں کی رہگزاریں ہیں — یہاں محسوس ہوتا ہے کہ جنّت کی بہاریں ہیں
خرامِ ناز کے منظر یہاں کی کھاڑیوں میں ہیں — سُپاری، ناریل، کیلے یہاں کی باڑیوں میں ہیں
بساتی ہیں یہاں انفاس میں امرائیاں خوشبو — یہاں کے بیلیوں کے چھاؤں جیسے سایۂ گیسو
یہاں خوش رنگ سبزہ زار شبنم میں نہاتے ہیں — یہاں بے خوف شاخوں پر پرندے چہچہاتے ہیں

یہاں ٹیلوں پہ ریوڑ کے جب چرواہے جاتے ہیں | کھتا کی رسیلی بانسری میں گیت گاتے ہیں
تلاطم خیز موجوں کے غضب کو دیکھ سکتا ہے | یہاں سے آدمی بحر عرب کو دیکھ سکتا ہے
یہاں بھی اپنے خالق نے حسینائیں اُتاری ہیں | جنھیں پوجے ہمارا فن وہ سلمائیں اُتاری ہیں

کوکن میں وہ سب کچھ ہے جو ایک حسین و دلکش دیہاتی ماحول میں ہوتا ہے۔ یہاں کی صبحوں میں تازگی ہے، شاموں میں دلکشی ہے۔ کلیوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کی چہچہاہٹ، پتوں کی سرسراہٹ، سبزے کی لہلہاہٹ اور پنہاریوں کی پنگھٹ پہ گنگناہٹ بھی ہے۔ سرسبز جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں، باڑیاں ہیں اور کھاڑیوں کے شادمان خیز انداز ہیں۔ پربت کے دامنوں میں کھپریلوں کے چھپر ہیں۔ پگڈنڈیوں کے پیچ در پیچ صرف کی کہکشاں کا کام سر انجام دیتے ہیں۔ یہاں کے مزدور اپنے کاموں میں منہمک ہیں۔ یہاں کی عورتیں دنیا کی عورتوں سے مختلف نہیں ہیں۔ وفا پرست ہیں۔ گھر میں دیئے جلانے اور اپنے آنگن کو جگمگانے کا خیال انھیں ہر وقت رہتا ہے۔ مسور کرنے والیاں امرائیاں بھی ہیں جن پہ بھیچا ہٹ لیاں اور انگڑائیاں ہیں۔ ایسے ہی خیالات کو خاور "کوکن میں کیا نہیں ہے" میں بیان کرتے ہیں۔

ایک محبِ وطن جب اپنے وطن سے دور ہوتا ہے تب اُسے اپنی یہ دوری بُری طرح تڑپاتی ہے۔ وطن کی بے ساختہ یاد آتی ہے۔ اس حالت میں کبھی وہ اختر شیرانی کی طرح اپنے وطن سے آنے والے سے وطن کے متعلق سب کچھ پوچھ لیتا ہے۔ اور کبھی بدیع الزماں خاور کی طرح تنہائی میں اپنے وطن کو یاد کرنے لگتا ہے۔ شاعر کو آباد مگر ویران شہر میں رہ کر امرائیوں کے سلسلے یاد آتے ہیں۔ شہر میں تفریح گاہوں کے ہوتے ہوئے بھی اُسے اپنے گاؤں کے ٹیلوں کی یاد آتی ہے۔ شہر کی اکثر حسیناؤں کی بہ نسبت دیہات کے معصوم پیکر اس کے دل کو گدگدا تے ہیں۔ شہر کے پکے مکانوں کی چھتوں کو دیکھ کر اسے اپنے گاؤں کے چھانیوں کے چھپر بے ساختہ یاد آتے ہیں۔ مشینوں کی کھٹکھٹاہٹ میں گیتوں کا شہد نایاب ہے، گاؤں کے رہٹوں کے چکروں کی یاد دلاتی ہے۔ پنگھٹ کے دلفریب منظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اپنے گاؤں کی مسجد کے محراب و منبر کے نقوش پھر وہ ذہن پر اُبھرتے ہیں۔ بزم سخن کا اہتمام کرنے والے فرزانہ، شاکر، آزاد اور محشر یاد آتے ہیں جن کی یاد شاعر کی اجتماعیت پسندی کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ رات میں جب کہکشاں کھلا کرتی ہے تب اپنے گاؤں کی پگڈنڈیاں نظر کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان ساری چیزوں کی یاد کا اظہار خاور "یاد اپنے گاؤں کی" میں یوں کرتے ہیں۔

جو خود میری زباں میں خطۂ کوکن کی جنت ہے | مجھے اپنی اُسی وادی کے منظر یاد آتے ہیں
میں اُن امرائیوں کے سلسلوں سے دور آیا ہوں | جو اس آباد ویرانے میں رہ کر یاد آتے ہیں
نہیں ہے شہر میں کوئی کمی تفریح گاہوں کی | مجھے لیکن مرے ٹیلے ہی اکثر یاد آتے ہیں
دلوں کو گدگدا دیتی ہیں جب اکثر حسینائیں | مجھے دیہات کے معصوم پیکر یاد آتے ہیں
میں جب پکے مکانوں کی چھتوں کو دیکھ لیتا ہوں | مجھے بے ساختہ چھانیوں کے چھپر یاد آتے ہیں
مشینوں کی کھٹا کھٹ میں کہاں وہ شہد گیتوں کا | مجھے تو رہٹ کے بے تاب چکر یاد آتے ہیں
تڑپتی ہیں نگاہیں جن کی خاطر بھور ہوتے ہی | مجھے اُن پنگھٹوں کے اب بھی منظر یاد آتے ہیں
میں اپنے گاؤں کی مسجد کو جب سے چھوڑ آیا ہوں | مجھے اُس کے حسیں محراب و منبر یاد آتے ہیں
سخن کی محفلیں جب منعقد کرتے ہیں دیوانے | فرزانہ و شاکر و آزاد و محشر یاد آتے ہیں
کھلا کرتی ہے جب بھی کہکشاں راتوں کے دامن پر | مجھے پگڈنڈیوں کے سرخ پیکر یاد آتے ہیں

کوکن میں ایسی شہزادیاں بہت نظر آتی ہیں جو اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھا لئے گاؤں گاؤں بیچتی پھرتی ہیں۔ ایسی ہی شہزادیوں کو خاور "امرائیوں کی شہزادیاں" کہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شہزادی کی تصویر کشی خاور یوں کرتے ہیں۔

جواں بدن کے دل آویز سانولے پن میں | سکوتِ کوہ کی شاداب یاں چھپائے ہوئے

کلائیوں کی حسین چوڑیوں کی جنبش سے فضا میں لاؤ نیوں کا فسوں جگائے ہوئے
محل کے کاخوں سے امرائیوں کی شہزادی چلی ہے شہر کی جانب قدم بڑھائے ہوئے
خرامِ صبحِ گلستاں پہ طنز کرتے ہوئے یہ ننگے پیر جو ہیں دُھول میں نہائے ہوئے
بجائے عشق، طلب صرف چند پیسوں کی ہے ایک پیکرِ کوکن پہ ظلم ڈھائے ہوئے
نہ جانے کس کی رسوئی میں جلنے والی ہیں یہ لکڑیاں جو سرِ ناز ہے اُٹھائے ہوئے

ایک طرف جہاں خاور امرائیوں کی شہزادی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف کوکن کے کھیتوں کے شہزادے کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ہمیں یہ یاد رکھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ یہ سادہ سیرت والا کوکن کے کھیتوں کا شہزادہ اپنے کام میں ہمیشہ منہمک رہتا ہے۔

گھروالی کے ہاتھوں کی تازہ روٹی کھائی ہے
چوڑے چکلے سینے میں جس سے گرمی آئی ہے
اپنی اک پھٹکاری سے بیلوں کو دوڑاتا ہے
ٹوٹی پھوٹی اُردو میں فلمی گانے گاتا ہے
بھور بھئے کھلیانوں میں محنت کرنے نکلا ہے
یعنی دھان کے کھیتوں سے گاڑی بھرنے نکلا ہے
اس کی صورت پیاری ہے لیکن سیرت سادہ ہے
یہ کوکن کے کھیتوں کا متوالا شہزادہ ہے

اپنے فنِ منظر کشی اور تصویر کشی کے جوہر خاور نے اور کئی نظموں میں دکھائے ہیں جن کی داد دینے کو جی چاہتا ہے خاور کو کوکن کی یہ سرزمین بہت ہی پیاری ہے اس لئے ان کی آرزو ہے کہ:۔

جس کو چھوتی ہوئی بہنے والی ندی گنگنایا کرے چاندنی راتوں میں جس کے اطراف کی خوشنما وادیاں سبزہ زاروں کی ڈھلکی ہوئی برساتوں میں
گھر ہو کوکن کے اک ایسے دیہات میں

کوکن میں آم کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور اسداللہ خاں غالب کو آم بے حد پسند تھے۔ اس لئے خاور نے غالب اور امرائیوں سے متعلق ایک نئے خیال کو اپنی بہت سی نظموں میں نظم کیا ہے۔

یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو ساوتری ندی میں ہماپرول نامی گاؤں کے نزدیک ایک "حیدری لانچ" ڈوبی تھی۔ اس سانحہ سے کوکن کا ہر فرد متاثر ہوا تھا۔ اس حالت میں کوکن کے اس شاعر کا متاثر نہ ہونا جس نے کوکن کی منظر کشی کی ہے، کوکن کی شہزادیوں اور شہزادوں کی تصویر کشی کی ہے۔ تعجب خیز بات بن جاتی۔ خاور نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر ایک نظم بعنوان "تجدیدِ روایات" لکھی۔ جسے پڑھ کر ڈوبنے والوں کے لئے جہاں خاور کا خلوص نظر آتا ہے وہاں اُن کی وہ خواہش بھی ظاہر ہوتی ہے جو کوکن سے متعلق ہے۔ اس نظم کے چند بند درج ذیل ہیں۔

میری کھاڑی میں جو اربابِ سفر ڈوبے ہیں کون کہتا ہے کہ بے وجہِ خطر ڈوبے ہیں
ارضِ ساوتری کو شہروں سے ملانے والی کوئی بتلائے ذرا اور ہیں کتنی برلیں؟
کیوں جہاز آتے نہیں پھر بھی مرے ساحل تک جب کہ کوکن میں کھلی ہیں سبھی بندرگاہیں
میری کھاڑی کوئی حیوانوں کا جنگل تو نہیں میری کھاڑی میں بھی انسان بسا کرتے ہیں
اور لوگوں کی طرح اپنی ضرورت کے لئے ان کو درپیش سفر بھی تو ہوا کرتے ہیں (بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

آثر فاروقی

بات میں بات

بات میں بات پیدا کرنے کا یہ طریقہ بالکل ہی نیا تو نہیں مگر یہاں واوین کے سہارے مُثبت بات کا منفی یا منفی بات کا مُثبت پہلو ظاہر کرنا یا دونوں مطالب نکالنا ہے۔ اِس طرح واوین کے استعمال کے علاوہ بغیر کسی تفصیل یا پس منظر کی وضاحت کے کسی خاص بات کی طرف اشارہ کرنا ہے، تاکہ انشائیوں کی حد تک اُردو طنز و مزاح میں ہلکے پھلکے انداز میں طنز و مزاح کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ اِس معمولی سی کوشش کو اِس کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ جس کے ذریعے ہیرالڈ نکلسن کی اس بات کو کہ "طنز تلوار ہے تو مزاح ڈھال ہے" اُردو طنز و مزاح میں زیادہ فرق کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ مثلاً اگر کسی نقاد کی حیثیت کو تسلیم نہ کرنا ہو یا اُسے نام نہاد نقاد بتانے کے علاوہ طنز بھی مقصود ہو تو واوین کے ذریعے اِسے یوں مکمل کیا جا سکتا ہے۔ شہرت یافتہ "نقاد"۔ اِس سے نہ صرف سارا پس منظر، ساری بات وضاحت کے ساتھ ذہن میں آجاتی ہے بلکہ الفاظ کے استعمال کے بغیر طنز کی کاٹ بھی گہری ہو جاتی ہے۔ ——— (ا۔ف)

اُردو ادب یوں تو قطاروں کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ پہلا زمانہ تھا کہ راجا یا بادشاہ کی سواری گزر رہی ہوتی اور اُن کا حلقۂ احباب قطار باندھے، سر جھکائے اور نظر نیچی رکھتے اُن کے تزک و احتشام کا ثبوت بہم پہنچایا کرتا تھا اِس لئے بھی اُردو ادب میں اِس طرح کے تذکروں کی بہتات غیر فطری نہیں معلوم ہوتی۔ امانت کی "اندر سبھا" ہو یا محمد حسین آزاد کا تذکرہ، اِن سب میں قدیم وضع قطع اور پُرانی تہذیب و تمدّن کی اِن "قطاروں" سے چکا چوند کا سماں بندھ جاتا تھا۔ مگر آج جبکہ زمانے کی سب ہی قدریں بدل گئی ہیں، راجوں، مہاراجوں اور بادشاہوں کی جگہ وزراء وغیرہ نے لے لی ہے وہیں "قطار" نے بھی اپنا رنگ روپ بدل دیا ہے اور اُس کی "شان و شوکت" بھی بڑی حد تک جدید اور "سائنٹفک" ہو کر رہ گئی ہے۔ اب جب کوئی لیڈر کسی پروگرام کے افتتاح کے لئے براجمان ہوتا ہے تو کھدّر کی سفید ٹوپیاں اُن کے استقبال کے لئے قطاریں باندھ کر اچھا خاصا امن کا خوشگوار ماحول اپنی "سفیدی" کی بدولت پیدا کرتی دکھائی دیتی ہیں حالانکہ بیشتر کا یہ خیال ہے کہ بدامنی کی بنیاد بھی یہی ہیں۔

اِن قطاروں کی بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں جتنی نرالی اور انوکھی بات بمبئی شہر کی قطاروں کی ہے، جو سینکڑوں افراد ریلوں اور بسوں سے لیکر سنیما گھروں تک میں نشست حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ باندھے نظر آتے ہیں۔ اِن سب میں منفرد اور اچھوتی "بس قطار" ہوتی ہے کیونکہ یہاں ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی خیال سمایا رہتا ہے کہ بس اگر "بس" کے باہر ہو گئی تو وہ بے بس ہو جائے گا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ "بے بس" آدمی بمبئی میں کچھ نہیں کر پاتا۔

یوں تو بمبئی میں پروڈیوسر، ڈائریکٹر، شاعر کی طرح کئی اور چیزیں بھی اپنی نوعیت کی واحد اور منفرد ہوتی ہیں مگر اِن سب پر بمبئی کی "کیو" کو افضلیت حاصل ہے۔ خواہ وہ بس کے لئے ہو، یا ریل کے لئے، یا سنیما گھر کے لئے یا "پیشاب گھر" کے لئے!! اگر بمبئی کی اِن قطاروں کا نظّارہ مقصود ہو تو صبح یا شام کے وقت دو چار ریل یا بس کے "مقامات" کا معائنہ کر لینا کافی ہوگا۔ لوگ یوں "بے بس" منتظر، چُپ چاپ اور اُکتائے کھڑے دکھائی دیتے ہیں جیسے انھیں برسوں گزر گئے ہوں۔ اِسی لئے یہ بات کافی درست معلوم ہوتی ہے کہ آپ بمبئی میں حسبِ وعدہ بروقت کسی "محبوب" کو حاصل کر سکتے ہیں مگر بروقت بس یا ریل کے حصول کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

چیزیں اپنی پابندی وقت کے لئے بھی گنجائش نہ رکھتے ہوئے "وقت" کے ساتھ دوڑنے کی کوشش کرتی ہیں جبکہ انسان پیدل وقت کے پیچھے رہ جاتا ہے اور اگر بروقت پہنچ جاتا ہے تو پھر "قطار" کے پیچھے رہ جاتا ہے۔ قطاروں کی اتنی "شان و شوکت" تو شاید کسی زمانے میں نہیں رہی ہوگی۔

بس کے انتظار میں "نمبر" کی گھڑیاں گننا، محبوب کے انتظار میں تارے گننے کی قدیم ترین ضرب المثل کو بھی شرمندہ کر چکا ہے۔ پہ نہیں پہلے شعراء نے قدیم ترین ادب میں معشوق کو اس بری طرح رات سے کیوں وابستہ کر دیا کہ ہر عاشق ہمیشہ گِلا کرتا تھا کہ وہ "روشن" ہو یا "تاریک"! اب تو دونوں "متاثرین" کو بسیں گننی پڑتی ہیں۔ بعض وقت بمبئی کے بابوؤں کے لئے یہ گھڑیاں پیچ و تاب کھانے کا ساماں مہیا کر دیتی ہیں۔ مگر پھر بھی بے چارے "بے بس" ہونے کا احساس کر کے صبر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک محقق کی اس بات میں بڑی صداقت معلوم ہوتی ہے کہ بمبئی ہی وہ واحد مقام ہے، جہاں صبر کی "انتہا" کی بدولت "بے صبری" زیادہ پھلتی ہے۔ ایک وقت ایک خبر کا متن اس طرح تھا کہ بس کے انتظار میں کھڑی ایک خاتون ماں بن گئیں اور ایک عدد انسان کے وجود میں آجانے کے باوجود بس نہ آسکی۔ بمبئی کی قطاروں کی حد تک اسے "اضافت" کا پہلو قرار دیا جا سکتا ہے جو راست ہے جہاں ہے اضافہ تھا تو کیا وزراء کو پسند نہیں آسکتی۔ ویسے بھی روایتاً یہ لوگ ان اضافتوں کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ بچہ کم از کم اتنا تو ثبوت کر لیتا کہ "بس" میں آجاتا۔

بعض مناظر تو واقعی دیدنی ہوتے ہیں، مثلاً گھنٹوں سے بس کا انتظار ہو رہا ہے۔ بس آتی دکھائی دیتی ہے اور قطار اندر "قطار" "نمبر" کے ساتھ "چڑھائی" کی تیاری مکمل کر لی جاتی ہے۔ ڈبل ڈیکر میں اوپر کی نشستوں پر چند صورتیں ہی ہیں، مگر کنڈکٹر "ٹھہرے تین آنے کو منگتا" کہہ کر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ دراصل جب یہ لوگ بس میں سوار ہوتے ہیں تو "بے بس" ہو جاتے ہیں۔ نتیجے میں مسافروں کو دوبارہ "قطار" کے ساتھ اپنی "بے بسی" کا ماتم کرنا پڑتا ہے کہ بمبئی کی قطاریں خود بمبئی کے "بس" کے باہر ہیں۔

بقیہ "کوکن۔ بدیع الزماں خاور کی نظر میں" صفحہ ۳۳

یاد ہوگا اسی زرخیز حسیں وادی میں — ہم نے چاہا تھا کہ سڑکیں بھی بنائی جائیں
یہ سسکتی ہوئی پگڈنڈیاں دیہاتوں کی — جگمگاتے ہوئے شہروں سے ملائی جائیں

اس نظم کے آخر میں خاور اہلِ کوکن کو اس سانحہ سے درس لینے کا پیغام یوں دیتے ہیں:

ان سے اک درس لو، اک ساز لو، کچھ کام کرو — گرمیِ خونِ شہیدانِ سفر عام کرو

مضمون کے آخر میں اس اردو کے نوجوان اور کوکن کے مایۂ ناز شاعر کا اپنی سرزمین کے فن کاروں کے نام دیا ہوا ایک پیغام (جو بظاہر کوکن کی سرزمین کے فن کاروں کے نام ہے مگر دراصل وہ ہم سب کے لئے ہے) نقل کرتا ہوں۔

اے جہانِ ادب کے معمارو — اے مری سرزمیں کے فن کارو!
جذبۂ اشتراک لے کے اٹھو — نغمۂ اتحاد گائے چلو
برق رفتار ریل سے پیار کرو — شست گاموں کا دل بڑھائے چلو
آتشِ مشعلِ حقیقت سے — خوابِ نادار کو جگائے چلو
دوریوں کا فسوں مٹا ڈالو — سوئے منزل قدم بڑھائے چلو

ہر کرن نور سے عبارت ہے
فرد جمہور سے عبارت ہے

یوسف ناظم

امن کی دیوی

ہر بزم ترے نام سے رخشندہ و تاباں
ہر لب پہ ترے نام کی تحریر لکھی ہے

ہر ذہن پہ حاوی ہے تری یاد کا جادو
ہر دل میں ترے حسن کی تصویر سجی ہے

افکار میں اقوال میں تیری ہی تمنّا
ہر دین پہ، مذہب پہ تری مہر لگی ہے

توریت میں، انجیل میں، قرآں میں ترا ذکر
گیتا میں تو مرقوم ہے، ویدوں میں چھپی ہے

معصوم دعاؤں میں، نمازوں میں تری یاد
آیات میں، اشلوک میں تشہیر تری ہے

قانون نے، دستور نے چاہا ہے تجھی کو
ہر دور میں امید کی تو شمع رہی ہے

مندر نے بھی، مسجد نے بھی تجھ کو ہے پکارا
آواز تجھے اہلِ کلیسا نے بھی دی ہے

تو شعر کا مقصود ہے، تصویر کا معصوم
فن کار کی، شاعر کی بھی محبوب ہی ہے

ہر دستِ طلب تیرے تعشق میں بڑھا ہے
تیرے لئے اشکوں کی بھی برسات ہوئی ہے

ہر صبح کو، ہر شام کو تیرا ہی تصور
لوگوں نے ترے واسطے دنیا بھی تجی ہے

ہر ملک نے پوجا تجھے، ہر قوم نے مانگا
پر ہاتھ کسی کے نہ لگے، تو وہ پری ہے

ہر شخص تری دید کو بے تاب رہا ہے
کس آنکھ کو پر دولتِ دیدار ملی ہے

اے امن کی دیوی! ہمیں اتنا تو بتا دے
کس دور میں، کس وقت زمیں پہ تو رہی ہے

جس وقت ہوئی امن کی تلقین جہاں میں
تاریخ بتاتی ہے کہ بس جنگ ہوئی ہے

حسن کمال

زہر کون پیے؟

نہ جانے یہ ہے منزلِ آگہی یا عروجِ جنوں کی کوئی انتہا ہے
کہ اپنے ہی سائے کو مشکوک نظروں سے تکتے ہیں جیسے
کوئی دم میں پیروں تلے سے نکل کر
یہی وار کر دے گا اپنے بدن پر

نہ جانے یہ ہے سادگی یا کوئی اجنبی خوف جس کی جھلک سے
نگاہیں نہیں رکتی ہیں آئینے پر، یہی خوف رہتا ہے ہر دم
کہیں اپنا عکس آئینے سے نکل کر جھپٹ لے نہ ہم کو

یہ منزل وہ منزل نہیں، جس پہ آئے ہوں خود ہم
یہاں تک پہنچنے کی ہے داستانِ ستم، ایک جبرِ مسلسل
کہ جو تیرہ صدیوں کے پُرخار دامن کے سائے میں پھولا پھلا ہے
مگر ہم مقامِ جنوں، منزلِ آگہی سے پلٹنا ہے اک دن
تو پوچھیں گے اپنے ہی سایوں سے اے ڈرنے والو
ہماری ریاضت کہ جس کے سبب ہم نے پہچانا تم کو
صلہ چاہتی ہے، پلٹتے کہاں ہو؟
بڑے نکتہ داں نکتہ رس، دُور رس، فلسفی، حق کے جویا
ذرا سی حرارت میں اے موم کی پتلیو! نرم شمعوں کی صورت پگھل جانے والو
پلٹتے کہاں ہو، حساب اپنا بے باق کرتے چلو، فیصلے کی گھڑی ہے۔

ذرا یہ بتاؤ کہ ویران بنجر زمیں کی سطح پر
لہو جو بہا اُس کا کیا فلسفہ تھا؟
وہ اک منہ کھلا، چشم وا، سرد، بے جان لاشہ
شہیدِ وطن ہے کہ ہے کوئی دشمن، غرض ہو کوئی بھی
یہ کس جرم اور کس خطا کے عوض گھر کے ہنگام سے دُور
زاغ و زغن کی ضیافت کا ساماں بنا ہے۔ ؟

بتاؤ کہ اس کی حیات و شہادت کا کچھ فلسفہ تھا؟
ذرا یہ بتاؤ کہ فاقے سے بدحال، روتے، سسکتے، بلکتے ہوئے
طفلِ معصوم کا ہر نوالہ
جو چھینا ہے بے رحم ہاتھوں نے، کس کے ہیں آخر؟
ہمارے، تمھارے یہی ہاتھ جن پر ہمیں اور تمھیں فخر ہے
کل کہاں تھے؟
کبھی ہم بھی پوچھیں گے، گندم کے خوشے سیہ دھان کے نرم پودے
سزا پا رہے ہیں جھلسنے کی کس جرم میں کچھ بتاؤ

ارے نکتہ داں، نکتہ رس، دُور رس، فلسفی، ماہرو
کبھی آئینے میں اگر اپنی صورت جو تم دیکھ لیتے
تو شاید تمھارے تدبّر، تفکّر، سیاست کا سارا بھرم ٹوٹ جاتا

ارے نکتہ داں، نکتہ رس، دُور رس، فلسفی بننے والو
یہ منزل علاجِ غمِ زندگی تو بھلا کیا، تمھارے مرض کی
تمھاری مریض اور ضعیف ذہنیت کا بھی درماں نہ نکلی

مرض اک تیرہ صدیوں کا ورثہ۔ جُذامِ کدورت کی صورت
تمھارے دلوں میں پلا ہے، ابھی تک جواں ہے، ابھی تک رہا ہے۔

جو پلٹو کبھی اس مقامِ جنوں، منزلِ آگہی سے
تو اس ذہنِ بیمار و قلبِ حزیں کو کہیں پھینک آنا
اُبھرتی ہوئی ننھی کلیوں کو، آتی ہوئی نسل کی کونپلوں کو
نہ اس منزلِ آگہی کی نگہ، نہ اس انتہائے جنوں کا کوئی پاس ہوگا
تم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مقابر کی تعمیر کر لو
کہیں یہ نہ ہو تم مگر کبھی تمھارے، تمھیں مل نہ پائیں۔

اے نکتہ دانِ نکتہ رس، دُوردرسِ فلسفی، سچ کو سچ کہنے والو
کبھی یہ بھی سوچا ہے، سچ کو تو اپنے ہی ہاتھوں سے تم نے
تنِ آسودگی کی لحد میں زمانہ ہوا دفن خود کر دیا تھا
وہ شے جس کو تم آج سچ کہہ کے سینے سے چمٹائے رہتے ہو
وہ ہے کرم خوردہ کفن، جس کی بدبو تمہارے لباسِ تنوں میں بسی جا رہی ہے
اسے پھینک آؤ، کسی کو ضرورت نہیں ہے اب اس کی
ارے جابرو، وقت اور مصلحت کے غلامو!
نہ سلجھاؤ حکمت کی گتھی کو، اُلجھے ہوئے فلسفوں کو
یہ سلجھے تو ساری نقابیں سرک جائیں گی اپنے اپنے رُخوں سے
تمھیں اپنی صورت نظر آئے گی آئینے میں
بس اب اپنی جھنکار سے کوئی نغمہ نہ گانا
تمہارے ترنم میں گریہ کا، آہ و بُکا کا جو پوشیدہ سُم ہے
رگوں میں یہ دوڑا تو اپنا بدن اپنے ہاتھوں سے نوچو گے
چلاؤ گے درد سے، کرب سے تم

بتاؤ وہ چوڑی جسے سینے بالجبر توڑا
وہ سیندور جو چند ہاتھوں نے ماتھے سے پونچھے بنا پونچھ ڈالا
وہ چوڑی، وہ سیندور کس جرم میں عمر قید اور سسکنے کی آخر سزا پا رہے ہیں!

وہ بچہ جو اپنے پتا، اپنے بابا کی رہ تکتے تکتے جواں ہو گیا ہے
تمہارے بڑے فلسفے کی کوئی دین تھا کیا؟

محبت، مساوات، آزادیٔ ذہن و افکار کے نرم نغمے
اخوت، تمنائے امن و اماں، آگہی کے وہ رنگیں ترانے
چلو اِن کو وحشت، کدورت، عداوت کے نوحوں میں تبدیل کر لو
جلاؤ قلم، فکر، تدبیر کے سب سنہرے رو پہلے حریری پیرے

وہ تم کو چھپائیں گے آخر کہاں تک جو خود چھپتے چلے ہیں؟

نہ سلجھاؤ حکمت کی گتھی، رموزِ خودی، نکتۂ آگہی کو
کھلونوں سے کب تک بہلتے رہو گے؟
تمہارے جنوں کو، تمہارے تدبر، تمہارے سسکتے ہوئے فلسفوں کو
وہ بے جان لاشہ، وہ ناکارہ خوں کب کا سلجھا چکا ہے۔
جو آنچل کے سائے، نگاہوں کی ٹھنڈک، اشاروں کے ساحل سے غافل
بہت دُور اک اجنبی سرزمیں پر،
تمہاری تمنا کے نفرت کدے، ریگ زاروں کے طوفاں میں
مسخ جھلسا پڑا ہے۔
شہیدِ وطن ہے، کہ ہے کوئی دشمن خدا جانے کیا ہے؟

وہ شے جس کو تم فلسفہ کہہ رہے ہو۔ تمہارا مرض ہے۔
وہ لوری جسے تم رجز کہہ رہے ہو
وہ کتنے ہی بیمار ذہنوں کو خوابِ ابد کے ہنڈولے میں پہنچا چکی ہے
وہ طاعون جو خود تمہاری ہی سانسوں نے پھیلا دیا ہے
کبھی یہ نہ سوچا۔ کہ اب بھینٹ لے گا تمہاری،
تمہارے تدبر، تفکر، سیاست، بھرم کی۔
پلٹنا تو لازم ہے بڑھتے ہوئے دوستو
تم مگر یہ نہ بھولو
کہ دامن پکڑ کر یہ پوچھیں گے تم سے
یہ کیا تھا؟
عروجِ جنوں، منزلِ آگہی؟ کون سا راستہ تھا؟
نہ بھولو کہ ہر قطرۂ خوں تمھیں بڑھ کے ٹوکے گا اک دن
پلٹتے کہاں ہو؟
حساب اپنا بے باق کرتے چلو۔ فیصلے کی گھڑی ہے۔

عنوان چشتی

شکستِ انا

متاعِ پاکیزگیٔ دل کو
نظر کی تقدیسِ آرزو کے کنوارپن کو
قدم قدم پر بعض نفس پہ بچھا کے گزرا
ان جسموں کے زاویوں پر بڑی طنز سے مسکرا کے گزرا
مہکتے سانسوں کے کیف و کم پہ
مچلتے سینوں کے زیر و بم پہ
غرور سے
مسکرا کے گزرا

مگر اذوقِ خود پرستی !! مری انا کی تمام مستی کو آج
رنگیں شکست دیکر
مرے اصولوں، خودی کے سارے حسین پھولوں کو
وہ مسل کر
غرور سے طنز کر رہی ہے
حیات میں رنگ بھر رہی ہے

"وہ" جلوۂ گل نہ رقصِ مستی
جوابِ مہتاب و مہر و انجم نہ پیکرِ رنگ و حسن و خوبی
نہ رقصِ شعر و شراب و نغمہ

تو اور کیا ہے....؟
صنم؟
نہیں !!
وہ تو اب خدا ہے
خدا؟
خدا سے بھی وہ سوا ہے
مصوّری، آذری، اور بُت گری میں

مَیں اپنے وجدانِ شاعری میں
اُسی کو تحلیل کر رہا ہوں
جمالِ تقدیسِ آرزو کو
متاعِ پاکیزگیٔ دل کو
نظر نظر کے کنوارپن کو
اُسی میں تحلیل کر رہا ہوں
مری انا کی شکست گویا مجھی کو مجھ سے ملا گئی ہے
دوئی کا پردہ اُٹھا گئی ہے۔

فرخ بانکوٹی

شرطِ سفر

وہ محبت جو رہِ جہد کی دیوار بنے
اُس محبت کو سہارا نہ بنانا اے دل
وہ حسیں موڑ جہاں راہگذر کھو جائے
اُس حسیں موڑ پہ بھولے سے نہ آنا اے دل

عشقِ بے سود ہے جو فرض کی راہیں روکے
حسن بے کار ہے جو پاؤں کی زنجیر بنے
رہِ تاریک میں ہو عشق کے ہاتھوں کا چراغ
حسن خلوت میں فقط زلفِ گرہ گیر بنے

گر میسر ہو شبستانِ محبت کا سکوں
حسن ہے شمع کی مانند بکھرنے کے لئے
اور پڑ جائے اگر وقت تو آمادہ رہے
حسنِ دشت و بیاباں سے گزرنے کے لئے

ہم سفر اُس کو جو بننا ہے تو اِس طرح بنے
شورِ زنجیر ہو پازیب کی جھنکار تلک
ساتھ دے، ساتھ رہے، ساتھ جیے، ساتھ مرے
محفلِ شوق سے شہرِ رسن و دار تلک

تحسین انصاری

مداوائے غم

(ایک واقعہ سے متاثر ہو کر)

آج بیزار سی ہیں تیری نگاہیں مجھ سے
راہِ الفت میں مگر یوں نہ مچل جانِ بہار
اپنے جذبات کی شدت سے نہیں تو واقف
اور لگ جائے گا فرقت کا نیا ایک آزار

میں نے مانا کہ ترے غم کا سبب میں ہوں مگر
مجھ سے دوری ترے ناسور کا مرہم تو نہیں
تو مداوائے الم جس کو سمجھ بیٹھی ہے
اُس سے بڑھ جائے نہ اے دوست ترا درد کہیں

حسنِ ظن تیری تڑپ دور نہیں کر سکتا
تجھے معلوم نہیں کیا ہے یہ شئے سوزِ دروں
سرد آہوں سے ملے گا نہ تجھے غم سے فراغ
اور اِس آگ میں جل جائے گا دامانِ سکوں

ہاں اگر تو ہے طلبگارِ مداوائے الم
میں بتاؤں تجھے اے جانِ جہاں چارۂ غم
منزلِ عشق میں باقی نہیں رہتا پندار
بھول جا حسنِ جفاکار کا "کردار" صنم

آ مرے شانے پہ سر رکھ کے گھڑی بھر رو لے
آ مرے زانو پہ سر رکھ کے گھڑی بھر سو لے

مایا شنکر

نہیں تیرے ہوش ٹھکانے

آپ چھٹی نامدار سنگھ کے پاس سے گزر رہے ہوں، آپ کو کسی آگے کے گاؤں میں جانا ہو، پھر بھی آپ کا دل مچل اٹھے گا۔ تھوڑا وقت ضائع کر کے، کچھ رستہ خراب کر کے بھی آپ چھٹی نامدار سنگھ ضرور ہی دیکھنا چاہیں گے۔ جیسے پنجاب دیش بھر کے پرانتوں میں مشہور ہے، اسی طرح یہ گاؤں پنجاب کے دیہاتوں کا گہنا۔

دھول مٹی سے بھری پڑی کچی سڑک سے ذرا ہٹ کر وہ دیکھیں، گاؤں کی حویلیاں گھنے درختوں کی چھتریاں تانے کھڑی گویا آپ کی آمد کی منتظر ہیں۔

آپ شمال کی جانب سے گاؤں میں داخل ہوں تو پہلے آپ کو چار ٹولے سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ نیچے نیچے گارے مٹی کے مکان، تنگ گلیاں۔ گلی گلی میں شور مچاتے چار بچے۔ دھول مٹی سے لتھڑے ان کے جسم۔ جیسے بھوت ہوں۔ انھوں نے آپ کو گزرتے نہیں دیکھا۔ گزرتے دیکھا بھی تو آپ کا کیا بگاڑ لیں۔ بس آگئی ان کی شامت۔

"اے بے حرام تخم! اے ماں کے .... "

آپ کو زرج کھڑا پاکر آنگن میں بیٹھا حقہ پیتا کوئی بوڑھا چمار اٹھ کھڑا ہوگا۔ لاٹھی پٹک پٹک کر گندی گالیوں کی بوچھار شروع کر دے گا۔ من من بھر کی گالیاں سن کر آپ اپنے کانوں میں انگلیاں دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ کی آنکھیں جھک جائیں گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے آپ اپنی آنکھیں اٹھا لیں گے۔ ایک کوٹھری سے پازیبوں کی جھنک، دوسری سے چوڑیوں کی کھنک اور تیسری سے ناک کی لونگ کا لشکارا۔ بوڑھے چمار کی جوان بہو بیٹیاں آپ کی طرف جھانکنا شروع کر دیں گی۔ جوانی کے بوجھ سے جھکی جھکی ان ٹیاروں کی رتنار آنکھوں میں کھو کے رہ جائیں گے آپ۔

"کس کی حویلی میں جائیں گے بابو!"

بوڑھے چمار کے کسمساتے حلق سے یہ سوال سن کر آپ یقیناً اپنی لیک پر لوٹ پڑیں گے۔ ایک آہ آپ کے سینہ میں ہی گھٹ کر دم توڑ دے گی۔ کیونکہ آپ تو صرف ایک راہی ہیں۔ راستہ میں بھٹک جانا ایک راہی کا دھرم بھی تو نہیں۔

اگر آپ کو جنوب کی طرف سے گاؤں میں داخل ہونا ہے تو گاؤں سے کافی ادھر آپ کا استقبال کرے گی ایک کل کل بہتی ندی۔ برکھا کے دنوں میں لوگوں کو گھنٹوں اس کے پاس تک پھٹکنے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس کی تانبی لہریں، جیسے بے شمار مٹیالے سانپ سر اٹھائے بل کھاتے پھنکارتے ہوں۔ باقی دنوں میں یہ ندی پایاب بہا کرتی ہے۔ بس گھٹنوں تک ہی اس کا موتیوں کی طرح نکھرا ہوا پانی چڑھتا ہے۔ کہیں کہیں ندی خوب گہری بھی پڑتی ہے۔ مگر اس سے آپ کو کیا سروکار!

ندی میں نہاتے ہوئے سرداروں کے لونڈے آپ کو دیکھ کر بے تحاشا کھلکھلا اٹھیں گے۔ آپ ندی میں آہستہ سے جھجک رہے ہیں۔ کچھ آپ پر پانی کے چھینٹے بھی اڑانے سے نہ چوکیں گے۔ کوئی ذرا سیانا لڑکا انھیں پھٹکار دے گا۔ پھر اپنی بھینسوں کے جسم پر سے کیچڑ چھڑانے میں مشغول ہو جائے گا۔ بڑی خوبصورت بھینسیں۔ لمبے لمبے تھن۔ دودھ کا ایک مٹکا سا پیٹ کے نیچے لٹکائے ہوئے۔ چھپ چھپ پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے آپ ندی پار کر لیں گے۔ پار پہنچ کر تھوڑا ہی سستا کر آپ آگے چل پڑیں گے۔ کیونکہ یہاں

بیٹھے بیٹھے تو آپ نے منزل کھوٹی نہیں کی ہے۔ آپ ایک خواہش۔ بیٹی نامدار سنگھ دیکھنے کی لیکر ادھر گھوم رہے ہیں جو۔

اس مردم خیز خطے کے چھیل چھبیلوں کی کہانیاں سن سن کر کتنی بار آپ نے دانتوں میں انگلیاں دبائی ہیں۔ سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے ادھر کے لونڈوں کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ کھیل تماشوں کے رس میں ڈوبے ڈوبے۔ کسرت کرکے بدن بنانے کا شوق ان کے سروں پر ایک بھوت کی طرح سوار۔ گلاس کٹورے میں تو ان کو دودھ جیسے اثر ہی نہیں کرتا ہو۔ بھینس کے نیچے جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سارا دودھ چھک کر پی جاتے ہیں۔ بھینس کے تھنوں میں کتنا دودھ؟ اس کی کوئی ناپ تول نہیں۔ ایک بھینس کا دودھ کچھ کم پڑنے لگا کہ بابا آٹھ دس سو میں دوسری لا باندھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر کے جوان دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ آنکھیں دیکھتے دیکھتے نہیں تھکتیں۔

دیکھ دیکھ کر آنکھیں نہیں بھرتیں اور کوئی مٹیار ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ کسی رنگیلے کو دل دے بیٹھتی ہے۔ ایک اور ہیر پیدا ہو جاتی ہے جو چھپ چھپ کر بیلے میں جاتی ہے اور اپنے رانجھے کو چوریاں کھلا کھلا کر رجھاتی ہے۔ ایک دوسری سسی کا جنم ہو جاتا ہے جو تھلوں میں سسکتی اور بلکتی ہوئی پنوں کے فراق میں جان دے دیتی ہے۔ کوئی صاحبان کی طرح عشق کا کلنک بن کر مرزا۔ اپنے محبوب کو موت کے گھاٹ بھی اتروا دیتی ہے۔ کوئی سوہنی بن کر کچے گھڑے کے سہارے ہی طوفانی ندی میں کود پڑتی ہے اور عشق کی لاج نباہ دیتی ہے اپنی جان پر کھیل کر۔

ایسی ویسی کتنی رنگین داستانیں وابستہ ہیں بیٹی نامدار سنگھ سے۔ بیلا سنگھ اور ساجی کا قصہ آپکے دماغ پر سوار ہے۔ بیلا سنگھ تو اب نہیں رہا ہے مگر ساجی آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہے یہاں۔ ایک ناکام انتظار۔

بیلا سنگھ کے بغیر یہ اس کے گھر میں کیسے ٹھہر پاتی؟ سرداروں کی بلند حویلیوں اور چماروں کے گھروندوں کے درمیان خالی پڑی جگہ پر اس نے جھونپڑی ڈال لی ہے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے اس نے بھٹی لگا چھوڑی ہے۔ بڑے غضب کے دانے بھونتی ہے۔ مکا جوار ہو یا چنے۔ خوب کھل اٹھتے ہیں اس کی بھٹی میں۔ بس دانے ہونٹوں سے چھوئے نہیں کہ بتاشوں کی طرح گھل جاتے ہیں منہ میں۔ ساجی خود کیسی ہے؟ کچھ پوچھیں نہیں جناب! جانے ساجھنا رکو کتنی فرصت کی گھڑیاں میسر آگئیں اور اس کی مورت گھڑتا رہا۔ بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں اس کے منہ سے۔ نوک جھونک پر اتر آئے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں سب۔ کسی سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑتا۔ بس بت بنے اس کے مکھ کی طرف تکتے رہ جاتے ہیں۔ تکتے ہی رہ جاتے ہیں۔

ساجی اور بیلا کی داستانِ محبت میں غلطاں اسی جھونک میں لہراتے کھیتوں کی مینڈھیں کاٹتے کب آپ گاؤں میں داخل ہوگئے اس کا آپ کو ذرا بھی دھیان نہیں رہتا اور آپ کسی حویلی کی ڈیوڑھی پر اپنے آپ کو ٹھٹکے کھڑا پاتے ہیں۔ حویلی کا مالک آپ کو ایک اجنبی پاکر بھی سر آنکھوں پر بٹھا لیتا ہے۔ آپ نے اسے بندگی کہی یا رام رام کہا۔ جے مند کہہ کر اس سے مخاطب ہوئے یا ست سری اکال کہہ کر۔ سب گوارا ہے۔ سب منظور ہے اس کو۔ وہ تپاک سے آپ سے ہاتھ ملائے گا اور اس طرح آپ کی خیر و عافیت پوچھے گا گویا آپ اس کے کوئی سگے ہوں۔

بھوجن کا تھال آپ کے سامنے لگ جاتا ہے۔ آپ سو بار انکار کریں۔ حویلی کا مالک آپ کو کھلائے بغیر چین نہیں پائے گا۔ آپ ہاتھ دھو کر کھانے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ موٹے موٹے پرونٹھے۔ جن سے گھی چو رہا ہے۔ ان پر مکھن کا بڑا سا لوندا پڑا پگھل رہا ہے۔ ایک آدھ موسم کی ترکاری ساتھ ساتھ میں دہی سے بھرا کٹورا اور لسی سے بھرا ہوا چھوٹا دیدار گلاس۔ کھاتے کھاتے یونہی ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ باتوں کے سلسلے کا کوئی تانکا ہاتھ پڑتے ہی سردار جی چہک اٹھتے ہیں۔

"بابو نامدار کی کیا پوچھتے ہو تم!"

سردار کی بجھی جھکی جاتی پھول اٹھتی ہے۔ اس کی گردن فخر سے تن جاتی ہے۔ بابو نامدار سنگھ کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ سردار جی کہتے چلے جاتے ہیں۔

کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے وہ مہاراج کی فوج میں سوار بھرتی ہوئے تھے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہی انہیں ایک ہزاری منصب مل گیا۔ دیکھنے میں بابو بالکل سیدھے سادے معلوم ہوتے تھے۔ مگر میدانِ جنگ میں شیر کی طرح بپھر جاتے تھے۔ ان کی تلواریں دائیں ہاتھ کی طرح بائیں

ہاتھ کی۔ دشمنوں کے پرے کے پرے صاف کرتی چلی جاتیں۔ اُن کی تلواروں میں بجلی کی تیزی بھری ہوئی۔ انسان تو کیا اگر گھوڑے کی پیٹھ پر پڑے تو وہ بھی دو ٹکڑے ہو جائے۔

کابل کی جنگ میں ایک موقع پر مہاراج بُری طرح گھر گئے۔ اِن کے جانباز ایک ایک کر کے کٹنے لگے۔ شیرِ پنجاب کی زندگی کا چراغ بجھنے ہی کو تھا کہ بابو نامدار سنگھ کی نظر اُدھر گئی۔ وہ اُدھر لپکے۔ اُن کا رسالہ بھی پیچھے جھپٹا۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتے ہوئے انھوں نے پٹھانوں کی صفوں میں ابتری پھیلا دی۔ مہاراج کی گردن پر ایک غضب کی تلوار ٹوٹی کہ بابو نے اپنا کندھا بیچ میں ڈال دیا۔ اُن کا بازو کٹ گیا۔ لیکن مہاراج کی جان بچ گئی۔ بابو کے سوار بھی پہنچ چکے تھے۔ پٹھانوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ خالصئی پرچم کابل پر لہرانے لگا۔

مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد اُن کی پٹی کھلی۔ دربار میں اُن کی حاضری ہوئی۔ مہاراج اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بولے۔ "نامدار! زندگی دینے والا بھی جیوں نے سنا ہے۔ بچانا چاہے تو بچا لیتا ہے۔ میں موت کے مُنھ میں آ گیا تھا۔ مگر اُس کے دانت میرے جسم پر نہ چل سکے۔ تیری بانہہ جو آڑے آ گئی تھی۔"

"سپاہی کا یہی فرض تھا مہاراج!"

بابو نے سر جھکا کر جواب دیا

"ہمارا بھی تو کچھ فرض ہے نامدار"

نامدار سنگھ چپ، کہے تو کیا کہے۔؟

"ہم تمہاری اِس بہادری پر بہت خوش ہوئے۔" مہاراج نے کہا۔ "مانگ، کیا مانگتا ہے؟ مانگ۔"

سب درباری سوچ رہے تھے کہ پنج ہزاری سے کم کیا مانگے گا۔ پر مانگا تو کیا مانگا بابو نے؟ سب حیران کچھ مونچھوں ہی مونچھوں میں ہنسے بھی — ڈھاک والا جنگل۔

ڈھاک والے جنگل کا پٹہ بغل میں دبائے بابو گھر پہنچے تو دونوں بیویوں نے سر پیٹ لیا۔ جوان بیٹے اُٹھ کر باہر چلے گئے منھ پھیر کر من ہی من بڑبڑاتے ہوئے۔ سوچتے — مانگا تو کیا مانگا؟ ڈھاک کے تین پات۔

بابو نے اِس پر بُرا نہیں مانا۔ بلکہ من ہی من میں اُن کی ناسمجھی پر ہنس دیئے۔ بھلا یہ کیا جانیں۔ بادشاہوں کا مزاج! ندی کے پھیر اور راجہ کے من کا کون ٹھکانہ؟ کون جانے کب کدھر پھر جائے۔؟

"سُن رے فتّو"

وہ چار لوگوں کے چوہدری کے پاس پہنچ کر بولے۔ "ہمیں ڈھاک والا جنگل کٹوانا ہے۔ وہاں کھیتی ہوگی۔ ہماری بستی بھی وہیں بسے گی!"

فتّو چپ۔ سارے چار خاموش۔ بیگار ایک دن کی نہیں۔ مہینے دو مہینوں کی بھی نہیں۔ جانے عمر ہی کھپ جائے وہاں۔ کیا جواب دیں؟ ایک طرف کھائی دُوسری طرف کنواں۔

بابو کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ مُہروں سے بھری تھیلی فتّو کے سامنے کھول دی۔ سب چار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چم چم چمکتی مہروں کو دیکھنے لگے۔

"یہ سب تمہارے لئے ہیں۔"

بابو نے ہنس کر کہا۔

"ویسے نہیں" چار مہروں پر ٹوٹ پڑتے کہ بابو نے ٹوکا — "فتّو اِن مہروں سے سال بھر کی رسد خرید لو۔ بیس تیس کنبے جو خوشی سے تمہارے ساتھ چلیں، اُنہیں ساتھ لے لو۔ کل ہی چلنا ہوگا۔"

تیسرے دن چاروں کے چالیس کنبے بابو کی حویلی پر آ پہنچے۔ وہ تیار کھڑے تھے۔ پانچویں دن ڈھاک والے جنگل کے ایک سرے پر اُن کے خیمے گڑ گئے۔

"پھر؟"

آپ اپنے میزبان کے ذرا رک جانے پر پریشان ہو کر کہہ اٹھیں گے — "پھر؟"

"پھر میلوں تک پھیلا جنگل صاف ہوتا چلا گیا۔ اس کی جگہ لہلہاتے کھیتوں نے لی۔

ایک گہری سانس بھر کر وہ آگے بولیں گے۔

بابو چلے گئے۔ اِس سنسار سرائے میں کس کو مقام ہے؟ پینتیس کے قریب حویلیاں اُن کی یادگار میں کھڑی ہیں آج۔ ہم سب بابو نامدار سنگھ ہی کی اولاد ہیں۔ قتلو بابا بھی مرگئے۔ ساتھ والے چار ٹولے کے ڈیڑھ سو کے قریب گھر اُن کی یاد دلاتے ہیں۔ ہمارے سارے کھیت وہی کاشت کرتے ہیں۔ بابو کے ہاتھ کا لکھا پٹہ اُن کے پاس محفوظ پڑا ہے۔

یہیں نامدار سنگھ کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر آپ کی بے چینی بدستور قائم ہے۔ ساجی اور بیلا سنگھ۔ بیلا اور ساجی آپ کے سر پر سوار ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے میزبان اُن کی بھی کہانی سنائیں۔ لیکن سیدھا پوچھنے میں جھجک رہے ہیں آپ۔ ایک اجنبی سے اتنی جلدی کھل جانا۔ ایسی کھلی باتوں پر آجانا ناپسندیدہ بھی تو نہیں سمجھتے آپ۔ آپ کا پنچھ بھی کھوٹا ہوا۔ میٹی نامدار سنگھ کی بھٹیارن دیکھی تھی اُس کی محبت کی داستاں ہی تھی۔ پھر دیکھا ہی کیا؟

"سُنتے ہیں سردار جی!

بے اختیار آپ کی زبان پر آکر کوئی ناچ اُٹھتا ہے — اِدھر کوئی ساجا بھٹیارن ہے۔ کمال کے دانے سینکتی ہے۔"

"اوہ۔ یہ بات ہے؟"

آپ چونک کر آنکھ اُٹھاتے ہیں۔ آپ کے میزبان کے چہرے پر اُبھر آئی لکیریں — آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے ساجی کی بات چلا کر اُن کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سردار جی سنبھل جاتے ہیں اور مُند مُند مسکاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"چلئے اُس کے ہاتھوں کے دانے بھی کھائیں اور درشن بھی کرائیں گے آپ کو۔"

اُس وقت درختوں کے سائے کافی لمبے پڑ چکے ہوتے ہیں۔ آپ سردار جی کے ساتھ ساتھ چار ٹولے کی طرف چل دیتے ہیں۔ سردھر چلتے چلتے وہ کہانی بھی سُناتے جاتے ہیں، جس کے سُننے کے لئے آپ نے اپنا پنچھ کھوٹا کیا تھا۔

بیلا سنگھ بڑا ہی رنگیلا جوان تھا۔ پار سال ایک دن صبح صبح مچھلی مارنے کے لئے نکل پڑا تھا۔ کانٹے پر کانٹے پھینکتا وہ اُوپر کی جانب بڑھتا گیا کہ کہیں تو کوئی مچھلی چارے پر مُنھ مارے۔ کئی میل اُوپر — جہاں ندی پہاڑیوں پر سے اُترتی ہے — ایک چٹان پر بیٹھ کر اُس نے ندی میں کانٹے ڈال دیئے نیا چارہ لگا کر۔ وہاں دو پہاڑیوں میں کس کر ندی کا پاٹ بہت کم چوڑا رہ جاتا ہے۔ اُونچائی سے گر کر ندی کی دھار جھاگ پیدا کرتی ہے وہاں۔ پانی بھی کافی گہرا پڑتا ہے۔ ہاں تو کانٹے ندی میں ڈال۔ بیلا سنگھ ایک لمبی چٹان پر لیٹ گیا۔

"لے سردار جی! مچھلی پھنس گئی۔

ایک سُریلی میٹھی آواز پہاڑی سے ٹکرا کر، ندی کی سطح پر سے تیرتی ہوئی بیلا سنگھ کے کانوں سے آٹکرائی۔ بیلا نے چونک کر سر اُٹھایا۔ کتنی میٹھی لَیکا رتھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ندی کے اُس پار دیکھا۔

ایک حسینہ چٹان پر بیٹھی اپنی مرمریں پنڈلیاں ندی میں لہراتی، ایک ٹکٹکی اُس کی طرف تک رہی تھی۔ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ گویا اُس کی سُدھ بُدھ ہی کھو گئی۔

"ایسے کیا دیکھتا ہے سردارجی! مچھلی تو کانٹا لے بھاگی۔"

اور وہ ہنسار کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

بیلا سنگھ اُس کی کھل کھلاہٹ دیکھ کر جیسے ہوش میں آگیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ گز بھر کانٹے کی ڈوری ندی کے بہاؤ میں بہہ رہی تھی پھر کانٹے میں اٹکی مچھلی بیلا سنگھ کے ہاتھوں میں چھٹپٹانے لگی۔ بیلا کی آنکھ اُس سُندری پر جمی تھی اور اُس سُندری کی آنکھ مچھلی پر۔

"سیر بھر کی تو ہوگی سردار جی ؟
"سیر سے کم کیا ہوگی ؟"
"روہو لگتی ہے ۔"
بیلا سنگھ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ۔مچھلی کانٹے سے چھڑا ہی چکا تھا ۔ زور سے اس پار پھینک دی ۔
جھن جھن پازیب بجی ۔ شیار نے اٹھ کر مچھلی تھام لی ۔
"اِدھر کیوں پھینک دی ؟"
"تیرے لئے "
"میرے لئے ۔ اوہ ۔کتنے اچھے ہو سردار جی ! تمھارا نام ؟"
"بیلا سنگھ ۔"
"بیلیا ! کل پھر آنا ۔ آؤ گے نا ؟"
اور کل تو کیا — کہانی میں ڈوبے ہوئے سردار جی آپ سے کہتے جا رہے ہیں :۔
بیلا سنگھ روزانہ مچھلی پکڑنے جانے لگا ۔ اس کے حلق میں ساجی کے جلووں کا کانٹا بُری طرح اٹک گیا تھا ۔ پریم کے کانٹے کی نظر نہ آنے والی ڈور میں بندھا باؤلا سا ہو گیا ۔ دن کو آرام نہ رات کو چین پڑتا اُسے ۔ ساجی کے نام کی مالا ہی جپتا رہتا ۔
ساجی ایک پہاڑی پنچھی ، برف گرنے لگی تو نیچے میدانوں میں آ چکے ۔ بسنت آئی تو لگے پر پُرزے تولنے واپسی کے لئے ۔ سکّو کی شاداب گھاٹیاں اُس کے کُنبے کو پکارنے لگیں ۔ اُن کی بکریاں ممیانے لگیں ۔ اُن کے گھنے بالوں والے گُتّے گرمی سے ہانپنے لگے زبانیں نکال نکال کر ۔
مگر ساجی کا من اُس سے سرگوشی کرتا — 'پردیسی دیس نہ جا ۔ وہاں تو بیلیا نہیں ملے گا '
دیس ، ماں باپ ، اور بھائی بہنوں کا پیار اُدھر کھینچتا اُسے ۔ بیلا کی جوان محبت اِدھر ۔
ساجی کے دماغ میں رسّہ کشی ہونے لگی ۔ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہی تھی کہ اُس کے کانوں میں بیلا کی مانوس سیٹی بج اٹھی ۔ ندی پار کی اُس چٹان کی اوٹ میں کھڑا بیلا سنگھ مُنہ میں اُنگلیاں پھنسا کر سیٹی پر سیٹی بجا رہا تھا ۔ ساجی اب کیا کرے ؟
کُنبے کے لوگ سامان باندھ رہے ہیں ۔ کل علی الصبح چل دینا ہے ۔ سکّو کی گھاٹیوں میں بسے گدّیوں کی یہی زندگی ہے ۔
بیلا سنگھ اپنی اُنگلیوں سے زبان دوہری کر کے سیٹی پر سیٹی دے رہا ہے ۔ پریم دیوانی ساجی کہاں تک برداشت کرے ؟ وہ ندی کی طرف بھاگ نکلی ۔ کب سے انتظار میں کھڑے بیلا سنگھ کے سینے میں مُنہ چھپا کر بلک اُٹھی ،
"بیلیا !"
"ساجی !"
"میرے بیلیا !"
ایک آہٹ کا احساس ہوا ۔ بیلا سنگھ نے چونک کر گردن گھمائی کہ ایک نوجوان گدّی کی پھینکی ہوئی چھُری اُس کے کندھے میں پھنس کر جھول گئی ۔ بیلا نے تلملا کر ساجی کو اپنے سے الگ کیا ۔ بھری بندوق کندھے پر لگا کر بھاگتے ہوئے اُس گدّی کا نشانہ سادھا ۔ بندوق کا گھوڑا گرا ۔ مگر گولی اُس نوجوان کے سر پر سے تیر کر نکل گئی ۔ بیلا نے جلتی ہوئی آنکھوں سے ساجی کی طرف دیکھا ۔ اُس نے بندوق کی نالی کو ذرا اوپر کو ٹھیل دیا تھا ۔
"س .... ا ...... ج .... ی .... " بیلا سنگھ چیخا ۔
"وہ میرا بھائی ہے ۔"
"تیرا بھائی ۔"
"ہاں میرا بھائی ہے ۔"

ساجی نے سر ہلا کر کہا۔ "اُسے تیری گولی لگ جاتی تو میرا تیرا پیار ٹوٹ جاتا۔"

"اور اب؟"

"اب جُڑ گیا ہمیشہ کے لئے۔" ساجی نے بیلا کا منہ چوم کر کہا۔ "چل۔ مجھے اپنے گھر لے چل۔ وہ لوگ اب تیرے کا بھی انتظار نہیں کریں گے۔ ابھی پولیس کو چل دیں گے۔"

چھُری نکالنے پر دُل دُل خون بہنے لگا۔ ساجی نے گھاؤ پر کس کر اپنی چُنری باندھ دی۔

"اب چل بیلیا۔ ساجی تیری باندی ہو گئی۔"

ساجی کے چہرے پر دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

اُس بار ساجی کی بکریاں ممیاتی ہوئی چلی ہی تھیں۔ اُس کے پیارے کُتّے رہ رہ کر بھونک اُٹھتے۔ جیسے ساجی کو بُلا رہے ہوں۔ بیچ بیچ میں اُس کا بھائی اور بابا بکریوں کو ہانک لگاتے جاتے تھے اور وہ ہانک گویا گونج کر ساجی کے کانوں سے ٹکراتی اور کہتی ہو۔

بچھڑ نہیں۔ بچھڑ نہیں۔

"پہنچ میری جان!"

زخم میں اُٹھ رہی بے پناہ ٹیسوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ساجی کو آغوش میں بھر کر بیلا سنگھ بولا۔ "میں نہال ہو گیا ساجی! چل تُو میرے گھر کی رانی بن کر رہے گی۔"

بیلا سنگھ چار قدم ہی چلا تھا۔ کہ اُس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کا سر گھومنے لگا۔

بیلا سنگھ گھر نہیں پہنچا۔ رات بیت گئی۔ دن نکلتے نکلتے گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔ اُس کے بابا پریشان۔ اُس کی ماں سر پیٹتی ہوئی رونے لگی۔ چاروں طرف لوگ پھیل گئے بیلا سنگھ کو تلاش کرنے۔ دوپہر ڈھلے ایک چھوکرے نے آکر بتایا کہ بیلا اُدھر ندی کے کنارے بے ہوش پڑا ہے اور ایک گادی لڑکی اُس کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔

کھاٹ پر ڈال کر ہم بیلا کو گھر لے آئے۔ پاندھے بابا نے اُس کے حلق میں کوئی دوا ٹپکائی اور ناڑی پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"ناڑی لوٹی۔"

پاندھے بابا ہونٹوں میں بڑبڑائے۔

بیلا کے پیر ہلے۔ اُس کی پلکیں جھپکیں۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ اپنے گرد جمع ہوئی بھیڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن کہیں اُس کی آنکھ ٹھہرتی نہیں تھی۔

"س.... ا.... ج.... ی!"

وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ ہونٹوں پر پھیلے جھاگ کو چیرتی ہوئی اُس کی آواز نکلی۔ "میری ساجی!"

پٹیلے فرش پر بیٹھی ہوئی ساجی اُٹھ کر اُس کے سرہانے کی طرف آگئی۔

"میرا بیلیا! میرا......"

ساجی کے حلق نے آگے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بیلا سنگھ پر گر گئی۔

"بیلا!"

ماں نے اُس کے ہونٹ چوم کر بلکتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے کیا ہو گیا میرے لال!"

"کچھ نہیں..... زرا..... چوٹ..... ماں رو..... ت..... پگلی..... ماں!"

بیلا سنگھ رُک رُک کر بولتا گیا اور چاچی اور زور سے بلکنے لگی۔

"یہ..... دیکھ..... میرا..... سہرا۔"

بیلا سنگھ نے اپنا ماتھا ٹٹولتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا۔ "لے تیرے سارے ارمان پورے ہوئے ماں! لے دیکھ ... دیکھ نا ماں بھی بھولایا ہوں — دیکھ رانی لگتی ......"

ساجی کے سر میں ہاتھ پھیرتے پھیرتے بے ہوش ہو گیا!

کتنے لمحے بیت گئے — آپ کے کان صرف سائیں سائیں بجا رہے ہیں۔ کوئی آواز آپ کے کانوں میں نہیں پڑ رہی ہے۔ شاید آپ کے میزبان کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔ آپ چونک کر اُن کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

وہ چپ اُدھر منہ پھیر کر، اپنا بھیگا بھیگا چہرہ آستین سے پونچھ کر بولتے ہیں:۔

شہر سے سول سرجن بھی آ پہنچا۔ بیلا کے نیلے پڑ چکے شریر میں اس نے سوئی لگائی لیکن کچھ نہیں بنا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ جنگلی توریں کسی جڑی بوٹی کے رس میں چاقو چھری کا بجھا لیتے ہیں۔ یہ زہر جان لیکر ہی چھوڑتا ہے۔ اِس کی کوئی کاٹ ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی ہے۔

سامنے چار قدمے کے اس سرے پر ایک جھونپڑی سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ گاؤں کے لڑکے بالے، کچھ جوان اور بوڑھے بھی ساجی کی بھٹی کے گرد جمگھٹ لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ بھی بھاڑ پر پہنچ گئے۔

ساجی دانے سینک رہی ہے۔ لانبی پلکوں کے نیچے اس کے وشال نین کچھ ڈھکے ڈھکے لگتے ہیں۔ لمبوترے گھونگھٹ پر شتوان ناک، ناک میں سونے کی لونگ چم چم چمک رہی ہے۔ ایک من موجی جوان بھاڑ میں کنڈے جھونکتے جھونکتے مدھم آواز میں ایک گیت گا رہا ہے۔ اس کی آواز میں بلا کا درد اور سوز ہے۔ اپنے تہمند کے ایک کونے میں تھوڑے سے دانے بھی باندھ رکھے ہیں اس نے۔ آپ کے کان اس کے گیت پر لگ جاتے ہیں:۔

بھُن دے فقیراں دے دانے۔ رب تیرا بھلا کرے گا

بھٹیار یئے بھُن دے فقیراں دے دانے۔ رب تیرا بھلا کرے گا

بیٹھے نے فقیر نہ ملنے ۔ بھُن دے فقیراں دے دانے

ہوداں دے دانے کنک چھولیاں دے۔ میرے نے جو دے پُرانے — بھُن دے فقیراں دے دانے

بھوں آون تے پہلوں بھُنا دن — آج نہیں تیرے ہوش ٹھکانے .....

گیت کی آخری کڑی میں پنہاں کراری چوٹ ساجی برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ وہ تلملا کر اپنے وشال نین اس کی طرف گھماتی ہے۔ رتنار نینوں سے نکلتے شعلے جیسے کہتے ہیں۔ "ارے! جا جا۔ اپنے ہوش ٹھکانے رکھ۔ ساجی کے ہوش تو مرتے دم تک ٹھکانے رہیں گے اپنے بیلیا کی یاد میں۔

(اپنی ہی ہندی کہانی کا اُردو روپ)

ڈرامہ

الیس ایم شاہنواز

ہاتھی کے دانت

کردار

اسلم — اُردو کے مشہور افسانہ نگار
جمیل — مدّاح
بیگم — اسلم کی بیوی۔

(دروازہ پر دستک)

اسلم: کون؟ ارے بھئی کون صاحب ہیں؟

آواز: ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں ہوں جمیل۔

اسلم: (خودکلامی کے انداز میں) جمیل؟ کون جمیل؟ کمبختوں نے پریشان کر ڈالا۔ ہر وقت دروازہ پر کوئی نہ کوئی ملک الموت کی طرح آدھمکتا ہے۔ "میں شاد ہوں۔ میں ناشاد ہوں۔ میں بے کل ہوں۔ میں بے دل ہوں۔ میں جمال ہوں میں خیال ہوں... میں خورجہ سے آیا ہوں۔ آپ کا مدّاح ہوں۔ آپ کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ بڑا اشتیاق تھا آپ سے نیاز حاصل کرنے کا۔ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟" تنگ آگیا۔ ان مدّاحوں سے۔ اُول جلول نام۔ اول جلول باتیں۔ افسانے پڑھتے ہیں یا بڑا احسان فرماتے ہیں مجھ پر۔

(دستک)

قبلہ ذرا صبر کیجئے۔ حاضر ہوا...... بھئی بیگم، آپ باورچی خانے میں چلی جائیے۔

بیگم: میں تو عاجز آگئی تمہارے ملنے والوں سے۔ اتنی سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ ابھی ہنڈیا روٹی سے نپٹی ہوں اور اب پھر اسی جہنم میں جا گھسوں؟

اسلم: اب تقریر مت فرمایئے۔ اندر تشریف لے جائیے۔ دیکھئے دروازہ اچھی طرح بند کر لیجئے گا۔

(بیگم بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہے)

(دروازہ کھول کر) تشریف لائیے۔

جمیل: آداب عرض!

(حیرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے)

اسلم: آداب عرض۔ تشریف رکھئے۔

جمیل: شکریہ۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ دراصل جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کے افسانے پڑھ رہا ہوں۔ میرے دل میں آپ کے لئے بڑی عقیدت ہے۔ کتنا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔ یقین جانئے آج بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے آپ کو دیکھ کر۔

اسلم: ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ ورنہ خاکسار اس قابل کہاں۔

جمیل: یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے۔ کیا شان ہے؟ جیسی آپ کی تحریریں ہیں بالکل ویسی ہی گفتگو۔ آپ کا تازہ افسانہ "قفس" ماہنامہ "پروانہ" میں پڑھا تھا۔ کتنے عظیم ہیں آپ اور آپ کے خیالات! آپ نے سماجی لعنتوں کو ختم کرنے کا جو بیڑہ اُٹھایا ہے اُس کے لئے آپ قابلِ صد مبارک باد ہیں۔ جب تک آپ جیسے بہادر میدانِ عمل میں نہیں آئیں گے اور رِستے ہوئے ناسوروں پر نشتر نہیں چلائیں گے، قوم کیسے سنبھل سکتی ہے۔ جی چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔

اسلم: شکریہ، شکریہ۔ ماشاء اللہ اچھے خیالات ہیں۔

جمیل: یوں تو آپ نے ہر سماجی بُرائی کے خلاف قدم اٹھایا ہے لیکن عورتوں کی آزادی، تعلیم اور سماجی حقوق کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ہم لوگوں میں عورتوں کو ہر معاملے میں

کتنا پیچھے دھکیلا جا رہا ہے آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس مظلوم طبقے کو آپ کی تحریروں کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ابھی تک آپ نے اس موضوع پر قلم کیوں نہیں اٹھایا؟ میں اس بارے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔

اسلم: یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔۔۔ ہمارے سماج میں عورت کو جس ظالمانہ طریقے سے نظر انداز کیا جا رہا ہے اُسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کا سخت مخالف ہوں اور آج کل اس موضوع پر ایک ناول ترتیب دے رہا ہوں جس میں عورت پر ہونے والے مظالم اور اُسے محروم کر دیئے گئے حقوق پر تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک خوشحال سماج کی تعمیر اور سماجی بہبود کے لئے عورتوں کی آزادی، تعلیم اور اُن کے حقوق کی حفاظت کرنا کتنا ضروری ہے۔ خصوصاً پردہ کی لعنت کو ختم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ تمام ممالک میں اسے ختم کیا جا چکا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کی ترقی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے ختم ہونا ہی چاہیئے ورنہ اس کی سڑانڈ ہماری سوسائٹی، ہماری قوم اور ہماری قدروں کو سڑا ڈالے گی۔ اس قسم کی گھناؤنی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے سب کو آگے جانا چاہیئے۔ تبھی قوم کی اصلاح ہو سکے گی۔

جمیل: (متاثر ہوتے ہوئے) بجا فرماتے ہیں۔ کتنا درد ہے آپ کے دل میں عورت ذات کے لئے کتنے اعلیٰ نظریات ہیں۔ کاش ہمارے سماج کا ہر فرد یہی بات سوچنے اور محسوس کرنے لگے تو ملک اور قوم کی نیا پار لگ سکتی ہے۔۔۔ مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے آپ جیسی عظیم شخصیت سے مل کر، میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔۔۔۔ میں شملہ سے آیا ہوں۔ وہاں میری چھوٹی سی کوٹھی ہے۔ پاس ہی کلب ہے۔ رات گئے تک فضا میں موسیقی کی مدھم دھنیں ناچتی رہتی ہیں اور تھوڑی کی تیز خوشبوئیں اندھیرے میں تیرتی رہتی ہیں۔ میری بیگم بھی رقص کی شوقین ہیں۔ آپ کو تو یہ چیزیں بہت پسند ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اکثر اِن کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔ کلبوں، ریستورانوں اور ریس کورسوں کا ماحول۔

کتنی زندگی ہوتی ہے! آپ اپنی بیگم صاحب کے ہمراہ کبھی غریب خانے پر تشریف لائیے اور اس ناچیز کو خدمت کا موقع دیجئے۔

اسلم: شکریہ۔ موقع ملا تو ضرور آؤں گا۔

جمیل: اچھا اب اجازت دیجئے۔ آپ کا بہت قیمتی وقت ضائع کیا۔۔۔ معاف کیجئے گا، کیا ایک گلاس پانی مل سکے گا؟ گرمی کے مارے گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔

اسلم: ابھی لایا۔ کیا بتاؤں دونوں میں سے ایک بھی نوکر اس وقت موجود نہیں۔ ایک ہفتہ بھر سے بیمار ہے اور دوسرا پندرہ روز سے چھٹی پر گیا ہوا ہے۔

(جاتا ہے اور گھڑے پر رکھے ہوئے المونیم کے ڈونگے میں پانی لاتا ہے)

معاف کیجئے گا، ہمارے پڑوس میں ایک تقریب ہے اور ساری کراکری اُن کے یہاں مانگے میں گئی ہوئی ہے۔ پڑوسی جو ٹھہرے۔ ہر پڑوسی کا یہ فرض ہے کہ آڑے وقت میں اس کی مدد کرے۔ بے چارے غریب ہیں۔ چندوں کے لئے انھوں نے ہمارا مکان بھی لے لیا ہے اور یہ کمرہ ہمیں دے رکھا ہے۔ پڑوسی جو ٹھہرے۔ بیگم بھی وہیں گئی ہوئی ہیں۔ بے چارے غریب آدمی ہیں۔ کسی کا دل نہیں توڑنا چاہیئے۔

جمیل: بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں اسی سے پی لوں گا۔ آپ کے یہاں تو چلو سے پینے میں بھی فخر محسوس کروں گا۔ کتنے بلند خیالات ہیں۔ کتنا درد ہے قوم کے لئے۔ سبحان اللہ! (پانی پی کر) اچھا، خدا حافظ پھر ملاقات ہوگی!

اسلم: انشاء اللہ۔

(جمیل جاتا ہے۔ قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آجائیے محترمہ۔

بیگم: (قریب آتے ہوئے) اُف کتنی گرمی ہے! میں کہتی ہوں ایک نہ ایک آیا گیا لگا ہی رہتا ہے۔ تم چار پیسے آنے کا ایک گلاس کیوں نہیں لے آتے۔ بڑی کوفت ہوتی ہے جب کوئی پانی کے لئے کہتا ہے۔

اسلم: آپ اپنے دیدے کیوں چمکا رہی تھیں؟ کتنی مرتبہ کہا کہ کوئی غیر مرد بیٹھا ہو کرے تو آپ جھانکنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایا کریں۔

مگر آپ پر اُس کی نظر پڑ جاتی تو؟ بزرگ کہتے آئے ہیں" اگر عورت کے جسم کے کسی حصے پر کسی نامحرم کی نگاہ پڑ جائے تو وہ حصہ جہنم میں جلایا جائے گا۔ میں آپ سے کہتے کہتے تھکا جاتا ہوں۔ ایک آپ ہیں کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ پردہ کی ضرورت اور اہمیت ہی کو نظر انداز کئے جا رہی ہیں۔

بیگم : اوہو تو ایسی کیا قیامت آگئی اگر ایک بار جھانک لیا۔ وہ بھی گرمی کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا تو ذرا کواڑ کھول لیا تھا۔

اسلم : گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ یعنی کہ میں سٹری ہوں۔ گتا ہوں جو بھوں بھوں کرتا رہتا ہوں۔ مگر ایک ہی بار وہ آپ کو دیکھ لیتا پھر کیا رہ جاتی عزت؟ تم تفضل حسین خاں کی بہو ہو۔ سمجھیں؟ جن کے زنان خانے میں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ کیا مجال جو کوئی حویلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ ڈیوڑھی پر خواجہ سراؤں کا پہرہ رہتا تھا۔ کسی کم عمر لڑکے کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ آپ ایسے ہی خاندان کی بہو ہیں۔ یہ تو وقت کی بات ہے کہ آج آپ اِس حال میں ہیں۔ آپ کی بدنصیبی ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

بیگم : خوش قسمتی کہو.... ابھی کچھ دیر پہلے تم کتنی اچھی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم بول رہے ہو۔ اپنی کہانیوں میں تم کتنی پُرلطف اور اچھی باتیں لکھتے ہو.... دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور تم اُسی لکیر کو پیٹ رہے ہو۔ آج عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں عورت موجود ہے اور تم عورت کو سات تالوں میں بند رکھنا چاہتے ہو کہ کہیں اسے ہوا نہ لگ جائے۔ تمہارے نزدیک اُس کی اہمیت ایک لونڈی سے زیادہ نہیں۔ تم لوگوں کے ذہنوں پر ڈاکہ ڈالتے ہو۔

اسلم : تو میری کہانیاں پڑھ پڑھ کر آپ کا دماغ خراب ہو رہا ہے؟ جبھی تو میں کہوں کہ آخر یہاں انقلابی جراثیم کیسے پہنچ گئے۔ اچھی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ بیگم الگ لیڈر بنی جا رہی ہیں اور مُلّاؤں نے الگ ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اِس سے تو بہتر تھا وہی بزرگوں کی دوکان کھول لیتا۔ اس میں فائدہ رہتا..... آپ میری کتابوں اور رسالوں کو کیوں چھُوتی ہیں۔ آپ شوہر کی بات مت کیجئے۔ آپ صرف اُمورِ خانہ داری سے دلچسپی رکھئے۔ گھر

اور شوہر کی فرمانبرداری کیجئے۔ یہی باتیں آپ کو صراطِ مستقیم کی طرف لے جائیں گی۔ سمجھیں؟ .... مگر جھانکنا اتنا ہی ضروری ہے اور ڈاکٹر نے اِس کے لئے ہدایت کی ہے تو آپ روشن دان سے پیچھے گلی میں کیوں نہیں جھانک لیا کرتیں؟ یہ بانس کی سیڑھی میں نے اِسی لئے لگا دی تھی۔

بیگم : چچ چچ! کوئی دیکھنے لگا تو کیا کہے گا۔ گلی میں پیچھے ہے کیا؟ ایک گندہ نالہ۔ جہاں سارا دن مچھر آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ کیا میں سیڑھی پر لٹکی اُنھیں دیکھا کروں؟ تم یہی باتیں لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے؟ اپنی کہانیوں میں ایسی دلفریب باتیں کیوں لکھتے ہو؟ لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کیوں کرتے ہو؟

اسلم : اور جو باتیں میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، کیا یہ بکواس ہے؟ کہانیوں میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں وہ سراسر لغو ہے۔ لوگوں کو فریب دینے کے لئے لکھتا ہوں۔ اگر کہانیوں میں یہی باتیں لکھوں تو ہم اور آپ بھوکے مر جائیں گے۔ سمجھیں؟ دُنیا فریب چاہتی ہے نا۔ میں اُنھیں دھوکا دیتا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا۔ میں اُن کے ذہنوں پر ڈاکہ ڈالتا ہوں۔ مگر جو کچھ میں آپ سے کہتا ہوں آپ وہی کیجئے۔ دوسری عورتیں چاہے کچھ کرتی پھریں۔ آپ کو صرف وہ کرنا چاہئے جو میں کہوں۔ میں ــــ آپ کا مجازی خدا۔ میں وہی کہتا ہوں جو ہمارے بزرگ کہتے اور کرتے آئے ہیں۔

بیگم : تم نے اور تمہارے بزرگوں نے ہی ہماری یہ حالت بنا ڈالی ہے.... ایک بار میں کالے برقعے میں لپٹی ہسپتال جا رہی تھی۔ مجھ سے آگے آگے پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت لڑکا اپنی ماں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اُس کی کالی کالی بڑی آنکھیں تھیں۔ اُس نے مجھے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میں جتنا اُس کے قریب ہوتی جا رہی تھی اُس کی رفتار اُتنی ہی سُست ہوتی جا رہی تھی اور وہ اپنی ماں کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ جب میں اُس کے قریب پہنچی تو وہ سہم گیا اور ایک بھیانک چیخ مار کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ بے چارہ! یہ کتنا بھرپور طمانچہ تھا ہم عورتوں کے مُنہ پر! بلکہ اس پردہ پر۔ سیاہ برقعہ .... سیاہ کفن۔ میں اپنی بے بسی پر کُڑھ کر رہ گئی.... یا خدا! تو اِن کے حال پر رحم کر۔ یہ جو عورت کو صراطِ مستقیم کے بجائے جہنم کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ جو عورت کو مُردہ گھر کی لاش سمجھے ہوئے ہیں۔ اِسے محاسب گھر کی ہی تصور کئے بیٹھے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ کیجئے)

اشتیاق جھواشیوی

دہر کے اِن ویرانوں میں

وہ خوش خاموش اُداس رات کے تاریک سائے بڑھتے رہے!
رات کی اُداس تاریکی جیسے اُس کے ذہن و دل میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ پُر ہَول شب کی ساعتیں زہریلی ناگنوں کا رُوپ دھار کر اُسے ڈس رہی تھیں، گھبراہٹ اور ہراس کے عالم میں لیٹے لیٹے وہ اُٹھ بیٹھتی، پھر لیٹ جاتی۔ اُسے کسی کل چین نہ تھا۔ برابر ہی دُوسرے پلنگ پر اُس کا ننھا سو رہا تھا۔ دُنیا و ما فیہا سے بے خبر۔ گُڈّو کو دیکھ کر اُس کی اُداس اور ویران آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی۔ وحشت و سراسیمگی کے آثار اُس کے چہرے سے عیاں تھے۔

مجرم!
قاتل!
ظالم!
خود غرض!

وہ چیخ اُٹھی۔ ذہن میں لاوا سا دھڑک اُٹھا۔ ہوا کے تیز و تُند جھونکوں کی تاب نہ لا کر جیسے درختوں کی شاخیں جھُول جاتی ہیں۔ بالکل یہی وہ خود محسوس کر رہی تھی۔ جیسے خیالات و افکار کا یہ تلاطم اُس کے دماغ کی رگوں اور نسوں کو توڑ مروڑ کر رکھ دے گا۔ ذہن کی رگیں پھٹ جائیں گی، وہ پاگل ہو جائے گی ــــ پاگل ــــ دیوانی!
کاش وہ یہ سب کچھ سوچنے کے قابل نہ رہتی، اس کی اپنی مجرمانہ شخصیت کا اُسی لمحہ خاتمہ ہو جاتا۔
گھبرا کر وہ پھر اُٹھ بیٹھی۔ تیزی سے کارنس کی جانب بڑھی۔ وحشت زدہ نظریں آئینے پر گاڑ دیں۔ وہ خود اپنی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ بڑی بڑی ویران، اُداس اور بھیانک آنکھیں۔ مارے خوف کے اُس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ کچھ دیر بعد سہمے ہوئے انداز میں اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔
زرد زرد گھٹا گھٹا سا چہرہ ــــ اَنگنت شکنیں ــــ یہ شکنیں اُس کے گزرے ہوئے لمحات کی یاد دلا رہی تھیں۔ اُن لمحات حسین غلط ساعتوں کا طویل رُوپ دھار لیا تھا۔ عہدِ رفتہ اور پُر ہَول ماضی نے اُسے بنجر حال کی سنگلاخ وادی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ شاندار و پُر شکوہ عمارت کا نام و نشان تک نہ رہا تھا۔ صرف نام سے کھنڈر رہ گئے تھے۔ جیسے اُس کی خوبصورتی اور جوانی محض ایک بھُولا بسرا سپنا ہو۔ وہ سارے ایسی ہی بوڑھی رہی ہو ــــ جیسے آج وقت اور اپنی عمر سے پہلے ہی وہ بوڑھی نظر آ رہی تھی۔
وحشت اور غصّہ سے بھری نظریں اُس نے گُڈّو پر ڈالیں۔ اُس نے اِس ننھی سی جان کے لئے اپنا سُکھ، چین اور تمام مسرتیں بھگا دی تھیں۔ یہ گُڈّو ــــ یہ ننھی سی جان جس نے اب تک اپنی عمر کی ۷۔ ۸ سیڑھیاں طے کر لی تھیں، ایسے نامساعد حالات میں جبکہ اُس پر ایک ایک سانس گراں بار تھا۔ ہاں اُسے اِس دنیا میں جینے کا حق نہ تھا۔ دُنیا کی نظروں میں وہ ناجائز اولاد تھی۔ ناجائز اور غیر قانونی ــــ دو جسموں کے غیر قانونی ملاپ کا ایک بدنُما نتیجہ ــــ مگر اِس میں اِس ننھی سی جان کا کیا دوش تھا؟ ماں باپ بھلے ہی غیر قانونی اور ناجائز تھے۔ مگر اِس کا

اُس کا کیا قصور؟ اسی لئے رفعت نے اُسے اپنی جان پر کھیل کر پالا پوسا تھا۔ دھول کے اس پھول کو سنوارا تھا۔ ماں باپ بھائی بہن اور عزیز و اقارب غرضکہ ہر ایک کو چھوڑ کر وہ ہر کے اس ویرانے اور انجان سی بستی میں آبسی تھی۔ اُس کے اپنے خیال میں اگر تھی تو وہ خود اس جرم کی مرتکب تھی۔ سزا کی ذمہ دار اُس کی اپنی ہستی تھی۔ جو محض کسی پر بھروسہ کر کے اپنی عزت و عصمت کا سودا کر بیٹھی تھی۔ مگر دنیا کی ریت تو یہی ہے۔ وہ اُسے دغا دے کر کہیں رُو پوش ہو گیا۔ پھر کبھی واپس نہ آنے کے لئے!

اپنی غلطی اور اس ناکردہ گناہ کا کفارہ اُس نے اس طرح ادا کرنے کی ٹھان لی کہ اپنی اس پیار کی نشانی کو پال پوس کر بڑا کرے۔ اُس کی پرورش اور بُود و باش کچھ اس طور پر ہو کہ دنیا اُسے گناہ کا رُوپ نہ سمجھے۔ اُس کی شخصیت کی عظمت کی قائل ہو جائے۔ اس بدنامی کا سودا وہ عزت اور نیک نامی سے کرنا چاہتی تھی۔

یہاں اُسے ایک پرائمری اسکول میں جگہ مل گئی تھی۔ ننھے ننھے معصوم بچے ہر وقت اُس سے چمٹے رہتے۔ اپنے ارد گرد ان نازک کلیوں کو دیکھ کر اُس کا دل کھل کھل اُٹھتا۔ اُسے بے پناہ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا۔ اپنی فطرت سے معصوم یہ بچے کسی بھی فریب، دغا اور دھوکے سے مبرّا۔

اُس نے اس ننھی سی جان کے لئے ہر طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں اُٹھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ زندگی کے پے در پے مصائب و آلام نے اُسے پختہ کر دیا تھا۔ جیسے گرم لوہے پر پیہم ضربیں لگا کر اُسے فولاد کا رُوپ دے دیا جاتا ہے۔ اُس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ اب تو زندگی و حیات کی ایک سے ایک بڑھ کر ضرب اور چوٹ تھا وہ سہنے کے قابل ہو چکی تھی۔ اب تو اُسے ان چوٹوں، شکستوں اور پریشانیوں کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔

اُس وقت اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ اگر وہ چاہتی تو کسی بھی ہمسفر کا ہاتھ پکڑ سکتی تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی۔ کئی نوجوان اُس کی جانب بڑھے مگر اُس نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بُری طرح روک دیا۔ وہ کسی طرح تیار نہ تھی کہ اپنے بچے کی محبت میں کسی اور کو شریک کرے۔ مایوس و ناکام نوجوان ڈھلتے ہوئے سایوں کی طرح ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اُس کی تمام تر توجہ کا مرکز اُس کا اپنا گڈو تھا۔ ہر وقت اُس کے خیال میں وہ ڈوبی رہتی۔ کسی اور خیال کو اُس کے ذہن و دل کے نہاں خانوں میں داخل ہونے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ اُس کا اپنا گڈو اُس کے لئے راحت و آرام، سکون اور چین ــــ غرضکہ سبھی کچھ تھا۔

وقت کی شوخ اور چنچل پری اپنے پروں پر برق رفتاری سے اُڑی چلی جا رہی تھی۔ ایک حسین و نوخیز اُمید کے سہارے ــــ منزل اب اُسے زیادہ دُور نظر نہ آ رہی تھی۔ جیسے اُس کے سُندر اور سُہانے سپنوں کی حسین پری اپنی خوش رنگ تعبیریں لئے اُس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مگر ــــ اُف اُس دن کا وہ واقعہ!

اس سانحہ نے اُس کی زندگی کے رُخ کو موڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے ذہن سے وہ اُسے محو کرنے میں یکسر ناکام رہی تھی۔

حسبِ معمول اُس دن بھی وہ گڈو کو سیر کرانے لے جا رہی تھی۔ سڑک کی چہل پہل اور بھیڑ بھاڑ میں وہ بڑی ہوشیاری سے قدم بڑھا رہی تھی۔ موٹر، تانگوں اور اسکوٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ انسانوں کا بے پناہ سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ ایک بے پناہ ہجوم۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانی سمندر!

ایک موڑ!

اور یہی موڑ اس کی اپنی زندگی کا ایک اہم موڑ بن گیا تھا۔

وہ سُرعت کے ساتھ نکل جانا چاہتی تھی۔

کروسنگ پار کرتے ہوئے وہ سرتاپا لرز اُٹھی ــــ سامنے سے تیزروی کے ساتھ ایک کار آ رہی تھی۔ دائیں طرف سے ایک اسکوٹر رکشا دندناتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اور عین اُس کے پیچھے بھاری بھرکم ایک ٹرک۔

وہ بُری طرح نروس ہو گئی۔ بھیانک موت کے سائے اُس کی آنکھوں میں رقصاں ہو اُٹھے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے ہوش

کھڑی تھی۔ بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ گڈو کی شدید مدد ذرا بھی تو نہ رہی!

گھبراہٹ، ہراس اور وحشت!

وہ بری طرح چیخ مارنا چاہتی تھی۔ مگر آواز جیسے حلق کی بے پناہ گہرائیوں میں کہیں کھو چکی تھی۔ لاشعوری طور پر گڈو کو اس نے اپنے آگے کر لیا۔ جیسے گڈو کی آڑ لے کر وہ اپنی جان بچانا چاہتی ہو۔

چرچراہٹ کی کریہہ آواز کے ساتھ بریک لگے۔ سامنے سے آتی ہوئی کار اپنی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دو ایک فٹ کے فاصلے پر ہی کھڑی تھی۔ بازو کے آؤٹ کا فاصلہ بھی ایسا زیادہ نہ تھا۔ پیچھے سے آتا ہوا بائیسکل ٹرک بیچ بچا کر آگے نکل گیا تھا۔

پے در پے ہارنوں کی آواز کے باوجود چند ساعتوں تک وہ آنکھیں نہ کھول سکی۔ نیم وا آنکھوں سے اُس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ ہر طرح محفوظ تھی۔

دوسرے ہی پل اُسے گڈو کا خیال آیا۔

گڈو پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا!

شوخ اور چنچل مسکراہٹ ——— کسی بھی قسم کے خوف و ہراس کے جذبات سے عاری!

لپک کر اُس نے گڈو کو سینے سے چمٹا لیا۔ جیسے اُسے اپنے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ گڈو اب بھی مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

اُسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔

گھبرا کر اُس نے گڈو کو اپنے سے الگ کر دیا۔

اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گڈو اپنی معصوم سی نظروں سے شکوہ کر رہا ہو۔

"واہ۔ امّی واہ۔ تم بھی کس قدر ڈرپوک ہو۔ اپنی جان تمہیں کتنی عزیز ہے۔ اپنی جان بچانے کی خاطر مجھے آڑ بنا لیا۔ مگر دیکھا میں پھر بھی بچ گیا۔"

اُس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ گڈو کی مسکراہٹ اُسے زہر لگ رہی تھی۔

نہ جانے کس طرح وہ گھر تک آئی۔

نہ جانے کیوں وہ گڈو سے آنکھیں چار کرنے میں اپنے آپ کو قطعی مجبور اور بے بس سا پاتی۔ اُس کا خود ساختہ جرم اُس کے ذہن میں جڑ پکڑتا گیا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ مجرم تھی۔ خود غرض۔ ظالم اور سفاک۔ اور نہ جانے کیا کیا۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ مگر اِس احساسِ جرم کو وہ اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکی۔ ذہنی سکون اور آسودگی اُس سے جیسے روٹھ سی گئی۔ ہر لمحہ اور ہر پل۔ واقعہ اُسے اذیت و کرب میں مبتلا رکھنے لگا۔ وہ کیا کرے؟ کس طرح اِس ذہنی عذاب اور کرب سے چھٹکارا حاصل کرے۔ زندگی اُس کے لئے جہنم ہو کر رہ گئی تھی۔ مسرت اور خوشیاں اور سکون جیسے ہمیشہ کے لئے اُس سے روٹھ گئے ہوں۔ ذہنی اذیت اور کرب اُسے گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔

"اُف، یا خدا رحم"——— اُس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ذہن اور دماغ کے تار مضرابِ الم کی ضرب سے جھنجھنا اٹھے۔

گھبرا کر پھٹی پھٹی نظروں سے اُس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

قریب ہی دوسری چارپائی پر پڑا گڈو نیند کے مزے لے رہا تھا۔ معصوم معصوم سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر لرزاں تھی۔ مسکراہٹ کی وہ تاب نہ لا سکی۔ جیسے زہر ملا ہو اُس مسکراہٹ میں!

اس کی ذہنی قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ تیزی سے وہ اُٹھی۔ جیسے اُس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔

غالباً اُس نے اپنی اِس اُلجھن کا قطعی حل ڈھونڈھ لیا تھا!

جھک کر اُس نے گڈو کی گردن میں اپنے ہاتھ حائل کر دئے۔ دھیرے دھیرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔

گڈو کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ گھبراہٹ میں اُس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وحشت ناک اور خوفناک سائے منڈلا رہے تھے۔ جو اس

کرنے لئے تعلّی نہ تھے

وہ ٹکر ٹکر ماں کو تکے جارہا تھا۔

تمنّت اُس کی وحشت زدہ آنکھوں کی تاب نہ لاسکی۔

اُس نے آنکھیں بھینچ لیں۔

"اُف۔ امّی یہ آپ کیا کررہی ہیں ؟" گڈّو کی گھٹی گھٹی سی آواز اُبھری۔

کسی انجانے خیال کے تحت اُس نے اپنی تمامتر قوّتوں کو مجتمع کرکے آنکھیں کھول دیں۔ تاکہ آخری وقت وہ گڈّو کی تکلیف، اذیت اور کرب سے لذّت حاصل کرسکے۔ اپنے خودساختہ ذہنی کرب اور اذیت کا مداوا کرسکے جس میں ایک عرصے سے وہ گرفتار تھی۔

جوں ہی اُس نے آنکھیں کھولیں۔ گڈّو کے سہمے ہوئے زرد زرد سے چہرے پر ایک پژمردہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"امّی یہ آپ پیار کیسے کررہی ہیں۔ تکلیف ہوتی ہے۔" گڈّو شکایت آمیز لہجے میں گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

پیار!

پیار!

پیار!

اُس کے ذہن کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ پیار، الفت اور محبّت کا خوابیدہ جذبہ ایکبار پھر اپنی تمامتر توانائیوں کے ساتھ بیدار ہو اُٹھا۔ پیار لفظ کی مٹھاس اور شیرینی اُس کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ اِس روشنی سے من کے اندھیارے دُھلتے چلے گئے۔

ماں کی ممتا ایک بار پھر اپنی پوری شدّت کے ساتھ عود کر آئی۔

گڈّو میرے گڈّو میرے لال — آنسوؤں کی روانی میں گھٹی سی آواز اُبھری۔ وہ گڈّو سے لپٹ لپٹ گئی۔ اِس بڑی طرح جیسے اپنی ہستی میں جذب کرلینا چاہتی ہو۔

"میرے بچّے، میرے راجہ — میرے لاڈلے میں ..... میں ...... ہاں میں تمھیں پیار ہی تو کررہی ہوں... پیار... پیار!

خودساختہ جُرم اور گناہ کے مہیب سائے جیسے ڈھل چکے تھے۔

گناہ اور جُرم جیسے بے نقاب ہوگیا تھا۔

آنسوؤں کی روانی نے جیسے گناہ کے دھبّوں کو یکسر دھو دیا تھا۔

محبّت، ممتا اور پیار کے تیز و تُند تھپیڑے نے جیسے دوسرے تمام تر جذبات کے غبار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُڑا دیا تھا۔

اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں ...... اور .... سات آٹھ سالہ گڈّو حیرت و استعجاب کا نشان بنا اُسے تک رہا تھا!!!

○

(بقیہ ڈراما "ہاتھی کے دانت" صـ۵)

یہ جو مجازی خدا ہیں، یہ جو بزرگوں کے قول اور عمل کے بیچ پھنس کر رہ گئے ہیں.... یا اللہ قوم کے ان ناخداؤں پر رحم کر! یا خدا.... (پردہ)

سیّد حرمت الاکرام

غزل

وہ دل ٹٹولے جو داماں میں کائنات کا کرب
اٹھا سکا نہ خود اپنے تصوّرات کا کرب

نکلنا خلد سے آدم کا بن گیا کیا چیز!
یہ زندگی ہے کہ ہے ایک واردات کا کرب

اندھیرے ڈستے رہے، شمع جھلملاتی رہی
کہیں تو کہہ نہ سکیں زندگی کی رات کا کرب

مرا وجود ہے دردِ حیات کی تاریخ
نفس نفس میں ہے صدیوں کے حادثات کا کرب

پناہ کے لئے خوابوں کی گود ڈھونڈتی ہے
حیات سہہ نہ سکی اپنے تجربات کا کرب

بڑا عجیب ہے خود سے یہ معرکہ اپنا
یہاں ہر ایک سے اٹھا شکستِ ذات کا کرب

ہے انتظار میں اک انقلابِ آخر کے
زمیں لئے ہوئے کتنے تغیرات کا کرب

یہ جیت کم ہے کہ غم راس آگیا، ورنہ
خوشی خوشی کوئی جھیلا ہے اپنی مات کا کرب؟

قدم قدم پہ ملے [illegible] شکستگانِ حیات
مگر کسی نے نہ دیکھا دلِ حیات کا کرب

سمٹ کے بن گیا ہونٹوں پہ نالۂ سحری
تمام دن کی اذیت، تمام رات کا کرب

جگر گداز تھے حرمت کچھ اور غم بھی مگر
بسا گیا ہمیں اوجِ تخیلات کا کرب

محتاجِ نطق و عاجزِ طرزِ بیاں نہ کہہ
دل کی زباں نظر ہے، اسے بے زباں نہ کہہ

اس نے بنا دیا ہے ترے در کو آئینہ
میری جبیں کو رہینِ خطِ آستاں نہ کہہ

میں ہوں امینِ لطفِ ستم ہائے روزگار
ناآشنائے لذتِ دردِ نہاں نہ کہہ

پامالِ راہِ عشق کی منزل ہی اور ہے
مٹی کو میری گردِ پسِ کارواں نہ کہہ

یہ میرے سازِ دل کی نوائے فسردہ ہے
میری فغاں کو آخرِ شب کی اذاں نہ کہہ

اک بوند تھی لہو کی جو پلکوں پہ آ گئی
آنسو کو میرے قطرۂ جوئے رواں نہ کہہ

جس کو نفس نفس پہ پیامِ اجل ملے
اُس زندگی کو زندگیٔ جاوداں نہ کہہ

ہوتا ہے اس سے زندگیٔ عشق کو فروغ
سوزِ غمِ فراق کو جی کا زیاں نہ کہہ

تجھ کو کہاں نصیب غمِ دل کی لذتیں
اے ناشناسِ عشق! اسے آزارِ جاں نہ کہہ

مارا ہوا ہوں میں ترے لطفِ عمیم کا
تو مجھ کو کشتۂ ستمِ دشمناں نہ کہہ

طرفہ اسی سے کھلتا ہے انسان کا ضمیر
اُن کی نگاہِ ناز کو برقِ تپاں نہ کہہ

شہاب جعفری

میں بجھ رہا ہوں مرے غم کی تاب لا ساقی
خراب کر دے مرے ساقی، شراب لا ساقی

حیات قطرۂ شبنم تھی، پیاس کیا بجھتی
شراب ختم ہوئی، آفتاب لا ساقی

سیاہ ہو گئیں راتیں، میں راہ بھولا ہوں
کہاں چھپا ہے مرا ماہتاب لا ساقی

لہو کا گرم سمندر ہے، دور جانا ہے
کہیں سے برف کی دوزخ کا آب لا ساقی

زوالِ نشہ میں نیندیں پکارتی ہیں کسے
مجھے کچھ اور نہیں میرا خواب لا ساقی

جہاں سے حرفِ وفا مٹ چکا کہ باقی ہے
کسی سے پوچھ، کسی سے جواب لا ساقی

صدائے درد بھی اب وہم ہوتی جاتی ہے
زمیں پہ جلد کوئی انقلاب لا ساقی

مری شراب بھی ساقی مرا لہو کیوں ہے
میں پوچھتا ہوں خدا سے جواب لا ساقی

مظفر حنفی

اب تمھیں بزم کا آئین بدلنا ہوگا
ورنہ خود اپنی ہی محفل سے نکلنا ہوگا

بعد از وقت پشیمان کہاں ہوتے ہو
پھول جب توڑ لیا ہے تو مسلنا ہوگا

کوئی فرہاد نہ تیشے کی طرف بڑھ جائے
ٹوٹنا چاہیں نہ پتھر تو پگھلنا ہوگا

لوگ حالات پہ یوں طنز کیے جاتے ہیں
جیسے سانچے میں کسی اور کو ڈھلنا ہوگا

اس طرح دور کھڑے ہو کے نظارہ نہ کریں
آپ نے آگ لگائی ہے تو جلنا ہوگا

میری غزلوں سے مظفر جو خفا رہتے ہیں
اُن بزرگوں کو مزاج اپنا بدلنا ہوگا

کفیل آذر

غزل

بے کسی ہی مری چاہت کا صلہ ٹھہری ہے
تم نے جو بات بھی کی، حکمِ خدا ٹھہری ہے

چاہے کچھ بھی ہو اُمیدوں کا گریباں نہ سلے
اے جنوں اُن سے یہی شرطِ وفا ٹھہری ہے

کوئی سنتا ہی نہیں شہر میں کس سے پوچھیں
رات! کیوں اپنے مقدّر کا لکھا ٹھہری ہے

ہم تو کہہ دیتے کہ لوٹا ہے ہمیں کس نے، مگر
جنبشِ لب تری محفل میں خطا ٹھہری ہے

منتظر شہرِ تمنّا کی دلہن ہے، کب سے
جانے کس دشت میں خوشبوئے حنا ٹھہری ہے

میری تنہائی کے آنگن میں شبِ غم کی طرح
کتنے گزرے ہوئے لمحوں کی صدا ٹھہری ہے

عمر بھر جلتے رہیں درد کی پلکوں پہ چراغ
شرطِ جینے کی ترے شہر میں کیا ٹھہری ہے

قیدیو جشن کہ پھر رنگ لہو کی خاطر
جانے کب سے درِ زنداں پہ صبا ٹھہری ہے

اُن کے ہونٹوں پہ مرا نام نہ آئے آذر
کون سا جرم ہے جس کی یہ سزا ٹھہری ہے

شاہین الہ آبادی

(زیر تنویر)

غزل

دُور کھڑے کیا دیکھ رہے ہو، آؤ پاس کچھ آؤ نا!
پیار کے دیپ جلا کر میرے سینے سے لگ جاؤ نا!

آنے والے کل پر رکھ کر فکرِ علاجِ قلب و نظر
آج کی جلتی شام و سحر سے اپنی آنکھ چراؤ نا!

"زلفِ شبِ تاریک" کے خم کو سلجھانے کی کوشش میں
مدھ ماتی، متوالی رات تو، دن کا ہاتھ بٹاؤ نا!

بد مزگی سے فائدہ کیا ہے آؤ مِل کر پھول چُنیں
کس کی خطا ہے، کون ہے مُجرم، چھوڑو بات بڑھاؤ نا!

چُپ چُپ آخر کیوں ہو اتنے، دن کے بلبلو ساز اُٹھاؤ
گیت وداعِ شب کے، مل کر میٹھے سُر میں گاؤ نا!

شور و زیاں کی اس محفل میں پوچھ رہے ہیں ہم تم سے
وجہِ شکستِ جام و سبو، کچھ ہم کو بھی سمجھاؤ نا!

بیت گیا ہے ایک زمانہ ساون رُت کی آشا میں
کھول کے اپنی زُلفِ خمیدہ شانوں پر لہراؤ نا!

چاند کے زرّیں ویرانوں کی باتیں سوچ چکے لوگو!
انسانوں کی بستی پر کچھ پیار کے دھن برساؤ نا!

سلجھانے کا پہلو ڈھونڈو، کھینچا تانی ٹھیک نہیں
پہلے سے جو ڈور ہے اُلجھی اور اُسے اُلجھاؤ نا!

پوچھو گے تم جب بھی ہم سے رائے یہی ہم دیں گے تمھیں
زاغ و زغن سے جوڑ کے رشتہ شاہیں سے ٹکراؤ نا!

تم بھی نہیں ہو پاس شبِ غم بھی طول ہے
گھبرا کے مر نہ جاؤں مرا دل ملول ہے

یہ بارگاہِ حسن ہے نیچی نگاہ رکھ
اے دل یہ بزمِ حسن کا پہلا اصول ہے

میری تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
وہ مجھ پہ مسکرائیں تو قیمت وصول ہے

دنیا سمجھ رہی ہے جسے مست چاندنی
جانِ بہار وہ ترے قدموں کی دھول ہے

وہ کون سا ہے پھول کہ جو ہے خزاں سے دور
جس کو خزاں نہیں وہ محبت کا پھول ہے

ـسرت جو تم پہ جان دے تم اس پہ جان دو
ل بے وفا سے دل کا لگانا فضول ہے

جب کبھی برباد ہوا اپنا گلستاں یارو
بن گیا ایک نئی زیست کا عنواں یارو

کون کہتا ہے کہ ناپید ہوئی رسمِ جنوں
ہم سے باقی ہے ابھی رونقِ زنداں یارو

وہ بھی اک دن تھا کہ ہوتا تھا تمناؤں کا جشن
دل میں مہمان ہے اب شامِ غریباں یارو

ہم سے سرِ راحتِ دل چھین کے دنیا خوش تھی
آج یہ اپنے کئے پر ہے پشیماں یارو

خضر کی طرح بتاتے ہیں یہ منزل کا پتہ
پیار کی راہوں میں یادوں کے چراغاں یارو

چند تعریف کے کلمات میں بکتا ہے خلوص
دوستی بکتی ہے بازار میں ارزاں یارو

آج اس موڑ پہ پہنچی ہے بشر کی عظمت
ذکرِ انساں ہی سے جل جاتا ہے انساں یارو

دل تو کھو بیٹھا ہے اس جنتِ خوباں میں امیر
گل کھلاتا ہے یہ کیا شہرِ نگاراں یارو

اسرار اکبرآبادی

غزل

گرمیٔ عزمِ جواں، طوفانِ گردِ کارواں
بن رہا ہے آسماں اک در زیرِ آسماں

بادۂ صد کیف و مستی قطرۂ اشکِ رواں
ایک ہی ساغر میں آ کر مِل گئے ہیں دو جہاں

اے غمِ فرقت نگارِ حُسن لا محدود سے
وصل تو ممکن ہے لیکن زندگی ہے درمیاں

جلتے بجھتے اِن چراغوں سے سجائیں بزمِ شوق
وسعتِ کونین پر لہرا رہی ہے کہکشاں

کل چلے تھے ہم جہاں سے آ گئے ہیں پھر وہیں
دائروں کا سلسلہ ہے کائناتِ بیکراں

قلبِ سوزاں کے شرارے نعتہائے رنگ رنگ
چھوڑتا جاتا ہوں میں اسرار رستوں پر نشاں

قیصر شمیم

غزل

ہم نقش گرِ خطرۂ فردا تو نہیں ہیں
شورش کو چھپائے تہہِ دریا تو نہیں ہیں

کیوں خاطرِ نازک پہ گزرتے ہیں گراں ہم
سب کچھ ہیں مگر شکوۂ بیجا تو نہیں ہیں

کیوں شامِ سرِ راہگزر ہنستی ہے ہم پر
واماندہ سہی نقشِ کفِ پا تو نہیں ہیں

ہیں شام و سحر در پئے آزار تو غم کیا؟
ہم گردشِ دوراں کا اجارا تو نہیں ہیں

بازیچۂ طوفاں کہے کیوں ہم کو زمانا
دیوانے ہیں، گردِ رہِ صحرا تو نہیں ہیں

میخانے میں محرومِ توجہ ہیں تو کیا ہے
ہم بادۂ رد کردۂ مینا تو نہیں ہیں

ہم گشتۂ بیدادگری ہی تو ہیں قیصر
کیا دیکھنے آئے ہو تماشا تو نہیں ہیں

پروفیسر سید مبارزالدین رفعت ——— مہاراجہ کالج میسور

اکتوبر کا شاعر آج ہی ملا۔ اور ہمیشہ کی طرح میں نے اُسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔

آپ کے اداریے "جرعات" ہمیشہ نہایت وقیع، سلجھے ہوئے اور بہت معقول ہوتے ہیں۔ اب کی بار تو آپ نے کمال کر دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے آپ نے میرا دل، میرا کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔

جب میں نے پہلی بار یہ خبر اخباروں میں پڑھی کہ حکومت ہند اُتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان اور دہلی میں اُردو زبان کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس خبر سے میرا دل اتنا دُکھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ پھر اس اعلان کے لئے وقت بھی بالکل ناموزوں اور نامناسب تھا۔ اس زیادتی کے خلاف ایسے وقت میں آواز بلند کرنا بعض ناسمجھوں کے نزدیک اپنی وفاداری کو مشتبہ بنانا تھا۔ میں منتظر رہا کہ اس زیادتی کے خلاف کہیں سے کوئی آواز بلند ہو، سلیقہ سے، قرینہ سے، لیکن کم سے کم میری نظر سے تو کوئی احتجاجی مضمون نہیں گزرا۔ آپ کا اداریہ غالباً اس سلسلہ میں پہلی صدائے حق ہے۔ آپ نے اپنی بات کتنے سلیقہ، قرینہ، معقولیت اور مدلل طریقہ پر بیان کی ہے، اس کے لئے دل سے آفرین نکلی۔ خداوند عالم آپ کو اس کی جزائے خیر دے کہ آپ نے لاکھوں اُردو پرستوں کی حقیقی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔

آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" بھی اس بار غضب کی چیز ہے۔ کیا پیاری نظم کہی ہے آپ نے؟! غالب کا مصرع "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" اب بہت پٹا ہوا مصرع بن گیا ہے۔ لیکن کیا کروں کہ اس نظم کے پڑھنے کے بعد میرے جو دلی تاثرات رہے اُن کے بیان کے لئے اس پٹے ہوئے مصرع کے سوا اور کوئی موزوں ذریعۂ اظہار مجھے نہ مل سکا۔

آپ یہ بہت اچھا کر رہے ہیں کہ ہمارے نئے اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں پر مضامین اور انٹرویو شائع کرتے ہیں۔ یوسف ناظم والا انٹرویو اچھا تھا۔ اب کے شمارے میں احمد جمال پاشا والا مضمون بھی اچھا ہے۔ لیکن اس مضمون میں یہ جملہ کھٹکا "طنز ایک ایسا اسلحہ ہے"۔ آپ جانتے ہیں کہ "سلاح" واحد ہے اور اُس کی جمع "اسلحہ"، جمع کو واحد کے طور پر کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ طباعت سے پہلے شاید اس جملہ پر آپ کی نظر نہ پڑی ورنہ آپ خود اسے دُرست فرما دیتے۔ اس جملہ میں "اسلحہ" کی جگہ "ہتھیار" رکھ دیا جاتا تو عربی کے ایک بھاری بھرکم لفظ سے بھی نجات مل جاتی اور جملہ بھی پورا اُردو ہو جاتا۔

"مضامینِ رشید" پر آپ کا تبصرہ پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس سلسلے میں آپ نے بہت سی باتیں بڑے پتہ کی کہی ہیں۔ رشید صاحب کے منکرانہ انکار کے باوجود "شاعر" کا رشید احمد صدیقی نمبر نکالنے کا آپ کا عزم یقیناً لائق داد و آفرین ہے۔

عنوان چشتی۔ ایم اے ——— لیکچرر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

اکتوبر ۱۹۶۵ء کا شاعر پیشِ نظر ہے، مدیروں کی قصیدہ خوانی اور اپنے حلقے کے ادباء و شعراء کی مدح سرائی میرا مزاج ہے نہ میری عادت، لیکن اس شمارہ میں چند چیزیں ایسی ہیں جن کی داد نہ دینا اخلاقی بخل ہی نہیں بلکہ جرم ہوگا۔ پہلی چیز آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" ہے۔ مجموعی نظم میں بلا کا تاثر اور جذب ہے اور پوری نظم اسی کرب ناکی اور ستم رانی کی تفسیر ہے۔ کروچے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "آرٹ" کا اظہار وجدان ہی میں مکمل ہو جاتا ہے، جب وہ حرکات و سکنات، رنگ و روغن، یا حرف و صوت میں ڈھلتا ہے تو اپنی فطری و حقیقی اثر پذیری کھو دیتا ہے اور اُس کی صورت اور روح دونوں بدل جاتی ہیں۔ آپ کی نظم پڑھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جذبوں کی برقی لہروں یا وجدانی تجربوں کو ایک باذوق اور حساس فن کار تخلیقی عمل کی کڑی منزلوں اور کٹھن راہوں کے بعد بھی اُس کے حقیقی تاثر کو اُسی انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ جو لوگ آپ کی ذہنی ظرف اور ضمیر سے ناآشنا ہیں وہ بھی اس نظم سے متاثر ہوں گے، لیکن جنھوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے، سمجھا ہے، اور پرکھا ہے اُن کے دل و دماغ میں اس نظم کا ہر ایک حرف نشتر کی طرح اُتر گیا ہوگا۔ ——— مرثیائی اور عزائی دامن میں نظمیں لکھنے کا

رواج عام ہے، موت کی ستم ظریفیوں پر المیہ انداز میں ہزاروں شاہکار لکھے گئے ہیں جن کی ایک خاص وقعت ہے اگر آپ کی یہ نظم "زندگی کا نوحہ"
اپنے دور کا مرثیہ اور سماج و ادب کا المیہ ہے۔ اگر غم کے تذکرے بڑے تخلیقی تجربے ہیں تو آپ کی یہ نظم شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، اور آپ کو تاریخِ ادب
اُبدی کا درجہ دے گی۔ نظم کی تکنیک، الفاظ کا محتاط استعمال، ترکیبوں کا برمحل صرف، صورت و معنی کا ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک
مثبت اِکائی کے روپ میں اُبھرنا، اِس کا تسلسل، پیچ و خم، اور صناعی اپنی جگہ اہم ہیں۔ نظم کا کینوس اپنے دور کی طرح وسیع ہے، جس کو
آپ نے فن کارانہ شعور سے ایک نظم میں سمو دیا ہے۔ یہ نظم نہیں روح کی آواز ہے، صدائے بازگشت ہے، آوازۂ جرس ہے۔ اِس
میں تہذیب و سماج کی کربناکی اور ذاتی و شخصی زخم خوردگی ہے۔ یہ زخم خوردگی اور کربناکی اِس دور کی قسمت ہے۔ اتنی اچھی اور بڑی نظم
کی تخلیق پر صمیم قلب سے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سردار جعفری، بھی ادب میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ کچھ غیر محتاط اور سرپھرے لوگوں نے اُن کے ادب کو 'پروپیگنڈائی' اور 'ہنگامی'
قسم کا ادب کہہ کر اُن کی اہمیت اور عظمت کو کم کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یہ نظم ایسے لوگوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ نظم کی جمالیاتی فضا، ادائی
ادا اور صناعت دامنِ دل کھینچتی ہے۔

مقالات میں "مرزا غالب علم الاعداد کی روشنی میں" مفید اور موزوں مضمون ہے۔ سید مبارک علی صاحب کی عرق ریزی قابلِ داد ہے۔
کیا اچھا ہو کہ وہ اِس سلسلے کو جاری رکھیں۔ بہتر ہوگا کہ اِس موضوع پر مسلسل لکھتے رہیں۔ مثلاً ہر 'عدد' کے صفات، کے بارے میں قدرے تفصیل
سے لکھیں۔ جس سے عام اور عوام بھی استفادہ کر سکیں۔ صبا اکبرآبادی۔ مظہر امام، سلام مچھلی شہری کی غزلوں کے چند شعر پسند آئے۔ ویسے
تمام تخلیقات اچھی ہیں۔

سید شہاب الدین دسنوی —— پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی ۸

"شاعر" کے کئی خاص نمبر اور نہ جانے کتنے عام شمارے نظر سے گزر چکے ہیں۔ اِن کے بارے میں آپ کو کبھی کچھ لکھنا اِس لئے مناسب
معلوم نہ ہوا کہ اکثر ذاتی ملاقاتوں میں اُن کا تذکرہ ہو جایا کرتا تھا۔ تحریری صورت میں کچھ لکھ کر بھیجنا رسمی تکلف سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن تازہ
شمارے میں آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" کا جو اثر ہوا، اُسے ادا کرنے کے لئے شاعر ہی کی زبان چاہئے جو میرے پاس نہیں ہے۔
میں دو تین روز کے لئے دلی جا رہا ہوں، واپسی پر ملاقات ہوگی۔ لیکن اِس درمیان میں اِس کا یقین دلاتا ہوں کہ جب شاعر کا دل
روتا ہے تو وہ تنہا نہیں روتا ہے!　　خلوص و محبت کے ساتھ۔

پروفیسر زرینہ ثانی۔ ایم اے —— ۲۶۱ شنکر نگر —— ناگپور

ابھی ابھی "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" پڑھی۔ کئی جگہ آنکھیں نم ہو گئیں۔ تاثر کا جادو اِسی کو
کہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا فردِ ادب ہو، جو اِس نظم کو پڑھ کر رو نہ دے۔ اتنی شاندار نظم کی تخلیق پر کس طرح مبارکباد دوں؟ کاش
آپ کی آواز، آپ کا پیغام ہر طرف پھیل جائے۔ آپ کی خواہش پوری ہو۔ اِس نظم کو دوسرے ڈائجسٹ نقل کریں تو بہتر ہوگا تاکہ یہ زیادہ سے
زیادہ لوگوں کی نظروں سے گزرے۔ آپ کا عزم و ہمت قابلِ ستائش ہے۔ خدمتِ اُردو کے سلسلے میں آپ کا نام تاریخِ ادب سے کوئی مٹا نہیں سکتا!

یوسف ناظم ایم اے —— اسسٹنٹ ایکزیکٹیو انجینئر، فرام جی، کاؤس جی بلڈنگ، دھوبی تالاب - بمبئی ۱

"شاعر" مسلسل مل رہا ہے اور آپ کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اِس ہنگامۂ دار و گیر میں بھی آپ وقت کے پابند ہیں۔ پرچہ کا
معیار بلند ہوتا جا رہا ہے۔ بالخصوص نثری مضامین بہت اچھے شائع ہو رہے ہیں۔ تازہ شمارے میں سردار جعفری اور آپ کی نظمیں بڑے کام کی
ہیں۔ اِس طرف سردار جعفری نے بڑی عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ آپ کی نظم بڑی دردناک اور فکر انگیز ہے۔
"غالب علم الاعداد کی روشنی میں" بہت پسند آیا۔ صاحبِ مضمون نے اِس مضمون پر بڑی محنت کی ہے اور اُن کی نظر علم الاعداد پر بڑی گہری
معلوم ہوتی ہے۔ آپ کا پرچہ ادبی ہے۔ ورنہ علم الاعداد کی روشنی میں دنیوی حالات پر مضامین کا سلسلہ بڑا دلچسپ ہوتا۔ غالباً قاضی کا مضمون
نامکمل معلوم ہوتا ہے پہلے تو پہچاننا مشکل ہے کہ یہ مضمون خود اُن کا ہے یا کسی اور ہندی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اُن کے پاس معلومات

براہ خیو ہے اور وہ چاہیں تو بڑے مفید مضامین ادب کو دے سکتے ہیں۔ تنقید کو چھوڑ دیئے اچھے تبصرے اور تذکرے ہی کہاں چھپ رہے ہیں۔

مضامینِ رشید پر تبصرہ بہت اچھا ہے۔ رشید صاحب بھلائے جانے کی چیز بھی نہیں ہیں۔ مکتوبات کے حصے میں آپ نے فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ تمام مکتوب اچھے ہیں جن میں میرا ذکر ہے۔

سلام مچھلی شہری ——————— آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی

تازہ "شاعر" ملا۔ جعفری کی نظم یقیناً بہت خوبصورت ہے۔ یادِ مرگ انھوں نے بڑی شاندار نظمیں لکھی ہیں۔ تمہاری نظم کا پہلا حصہ PERSONAL ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ وہ فنکار کی زندگی کے تلخ مسائل کا حل بھی چاہتا ہے۔ آخری حصہ حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہے اور تمہارے صحت مند اندازۂ فکر کا عکاس ہے۔ مبارک ہو۔ ندا فاضلی کا مضمون بھی بہت خوب ہے۔ یہ اچھا شاعر ایک دن ضرور بہت اچھا تنقید نگار بھی ہوگا۔

میرے نام برادرِ محترم کرشن چندر کے بہت پرانے خطوط مچھلی شہر میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب "یہ نمبر" واقعی چھپنے لگے تو کچھ پہلے مجھے مطلع کر دینا۔

ضیا حسنی ——————— چھوٹی بازار، فتحپور (یو۔ پی)

تازہ "شاعر" ملا۔ حصۂ نظم پسند آیا۔ آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" کافی موثر ہے اور پُر درد بھی۔ نظم پڑھتے پڑھتے مجھے بھی وہ کرب ناکی محسوس ہوئی۔ جس نے آپ کے حساس دل کا محاصرہ کر کے آپ کو اس پُر تاثیر نظم کہنے پر مجبور کیا تھا۔

"اے مرے قلبِ شکستہ ......

باور کیجئے! نظم کے اس پُر درد آغاز کو میں نے بچشمِ تر پڑھا ہے۔ اور اس شکستگی کے باوجود آپ کے قلم کی روانی، ان تھک محنت اور اعجاز فشانی کے خیال نے مجھے آفریں کہنے پر مجبور بھی کیا۔ جہاں پر آپ نے حُبّ الوطنی سے سرشار دل کی ترجمانی کی ہے اُن اشعار کو پڑھ کر میرا دل خوشی سے جھوم جھوم اٹھا۔ آپ کو اس بہشت نظیر وطن سے سچا عشق ہے۔ ندیاں، پہاڑ، شہر، قصبے، تاج، ایلورا، اجنتا اور فن کار سب کے لئے دل تڑپا ہے اور آپ نے اُن کی سلامتی کے لئے دعا کی ہے۔ یہ آپ کے دل کی آواز ہے۔ آپ نے کامیابی کے ساتھ اسے نظم کا روپ دے دیا۔

سردار جعفری کی نظم بھی لائقِ ستائش ہے۔ دوسری نظمیں بھی اچھی ہیں۔ مقالات میں اختر بستوی اور افسانوں میں نور شاد کو پڑھ سکا ہوں۔ اِن کے سلسلے میں رائے عالی سے متفق ہوں۔

کہانی "تزئین" کے سلسلے میں قارئینِ "شاعر" کی پُر خلوص آرا سے کافی ہمت افزائی ہوئی۔

سید محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی ——————— میوہ کٹرہ - آگرہ

"محفلِ اپنی" کے تحت معلوم ہوا کہ کسی صاحب نے میری غزلیں یا غزل اپنے نام سے شائع کر دی ہے۔ میرے لئے یہ واقعہ پہلا نہیں ہے۔ ایک حیثیت سے میں اسے داد اور قدردانی سمجھتا ہوں۔ اگر میری غزل اُن کو پسند نہ آتی تو اپنے نام سے کیوں شائع کرتے۔ مگر یہ تجربہ کاری ہے کہ انھوں نے یہ غزلیں ایک روزنامے میں شائع کرائیں۔ روزنامہ کتنے دن محفوظ رہے گا۔ ابھی حال میں جناب فراق گورکھپوری صاحب نے "شاہکار" اللہ آباد کا فراق نمبر مجھے عنایت فرمایا۔ کھولتے ہی اتفاق سے ایک نظم تمنا کاظمی طہرانی صاحب کی نظر پڑی۔ انھوں نے میری ایک غزل (مطبوعہ آجکل نظم نمبر اپریل ۱۹۵۳ء) کے تین مصرعے اس انداز سے قبول فرمائے ملاحظہ ہوں۔

میری غزل کے مصرعے ہیں۔

بہار آئی جو ذکرِ بہار میں نے کیا
خزاں کو موجِ نسیمِ بہار میں نے کیا
جنوں کو شیخِ سبزہ و گلزار میں نے کیا

تمنا صاحب نے فرمایا ہے۔

بہار آئی جو ذکرِ بہار تو نے کیا
خزاں کو ورزشِ فصلِ بہار تو نے کیا
جنوں کو شیخِ سبزہ و گلزار تو نے کیا

—

اس سے زیادہ عبرت ناک یہ واقعہ ہے کہ ادارۂ کاروانِ سخن بھوپال نے ایک کتابچہ "نئی کرنیں" شائع کیا جس میں شاعر کا حال اور اُس کا کلام درج کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے میری پوری غزل اُس میں اپنے نام اور حالات کے ساتھ درج کردی۔ غزل بھی وہ جو کئی رسالوں میں شائع ہوئی اور ریڈیو سے نشر ہوئی اور جو مجھے اپنی غزلوں میں بہت پسند بھی ہے۔

حاصلِ عشق جز اندوہ و رنج کچھ بھی نہیں　　اور اگر ہے تو سب اُن کا ہے مرا کچھ بھی نہیں

یہ مجموعہ شفا صاحب گوالیاری کی سرپرستی میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اُن کو لکھا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ
"...... کو بلوایا پہلی بار اُن کی زیارت ہوئی۔ دیکھ کر افسوس ہوا۔ گریجویٹ سمجھدار آتے ہی ہاتھ جوڑ کر رونے لگا اور جو کچھ اِس غلطی کی وجہ بتائی وہ اُس کے معافی نامے میں موجود ہے۔"

اب وہ وجہ بھی ملاحظہ فرمائیے جو اُنھوں نے معافی نامے میں لکھی ہے۔
"...... یقین مانئے قبلہ میرے ایک قریبی دوست نے کافی عرصہ ہوا یہ غزل مجھے روانہ کی تھی جس میں اُنھوں نے میرا تخلص بھی لکھ مارا اور تحریر کیا کہ تم استعمال کرسکتے ہو، حالانکہ کلام دیکھ کر مجھے شک ہوا مجھے یہ قطعاً علم نہ تھا کہ وہ اتنا بڑا مذاق کرکے نہ صرف میری بلکہ آپ جیسے بزرگ اور ادب نواز شخص کو تکلیف پہنچائیں گے۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں اور بزرگ اُنھیں معاف کردیا کرتے ہیں۔ یہ ایک پہلی اور شاید اب آخری غلطی ہوگی جو باعثِ مصروفیت کہیے یا باعثِ جہالت عمل میں آئی۔　　آپ کا منتظر کرم
...... بھوپال ۱۲ راگست ۶۳ء"

اِس میں شاید کا لفظ قابلِ توجہ ہے۔
یہ تو عام شاعروں کی بات ہے۔ بعض خواص اور اساتذہ (بزعم خود) بھی اِس میں ملوث نظر آتے ہیں اور یہ تو کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا کہ کسی کا مضمون لے کر اپنے شعر میں باندھ لیا جائے۔ اِس کے لئے یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ ہم نے اِس مضمون کو ترقی دی ہے اور متقدمین ایسا کرتے آئے ہیں۔ میں اِس بارے میں کیا عرض کرسکتا ہوں سوائے اِس کے کہ میں اِسے اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ توارد یا عدم علم کا معاملہ دوسرا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی تو خود نہیں کیا جاسکتا کہ ہم نے دوسرے کے مضمون کو ترقی دی ہے یا اِسے ادبیت کردیا۔ بہرحال یہ ایک مسئلہ ہے جس پر اہلِ نظر کو توجہ کرنا ضروری ہے۔ حالات اور زمانے کے ساتھ نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ جو فیصلے اگلے بزرگوں نے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق کئے تھے آج بھی قابلِ تقلید مانے جائیں۔ اُمید ہے کہ اہلِ علم اِس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔ رہا سرقے کا معاملہ تو اِس کا علاج بھی کچھ نہ کچھ سوچنا ہی چاہیے۔ کم سے کم اُن لوگوں کی ایک فہرست بنالی جائے اور تمام اربابِ رسائل اور اخبارات کو بھیج دی جائے۔

حسرت جے پوری ——— ۱۳۱ "کیلاش" کھار بمبئی ۵۲

"شاعر" ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ خصوصاً آپ کی نظم "کربِ خودکلامی" کے عنوان سے بڑی کامیاب اور بے انتہا اثر انگیز ہے۔ ویسے تو تمام پرچہ ہی ادبی حُسن سے جگمگا رہا ہے۔ آپ اپنے اوقات تحریر فرمائیں۔ نیاز حاصل کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ سالانہ خریدار بن جانے اور اُردو کی خدمت کرنے کو ہر وقت تیار رہوں گا۔ مرحوم سیماب صاحب کے بعد آپ ہی ہیں جو کفر کے اندھیرے میں اُردو کا پرچم لئے جلوہ فگن ہیں۔ اپنی غزل کے کچھ اشعار بھی پیشِ خدمت ہیں۔ شاعر کے لئے۔

طرفہ قریشی ——— آغا حسین کا باڑہ عقب تحصیل صاحب ناگپور

اکتوبر کے "شاعر" کے ساتھ ستمبر کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ محترمہ زرینہ ثانی نے حضرت راز چاند پوری اور اُن کی تصنیف "نوائے راز" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ دوسرے ناقدین کے لئے ترغیبِ صالح ہے۔ راز صاحب ہندوستان کے اُن باکمال اور بزرگ شعرا میں سے ہیں جن پر ہمارے ناقدین نے اب تک کوئی توجہ نہیں فرمائی ہے۔ ضرورت ہے کہ راز صاحب کے کمالِ نثر و نظم پر زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔

جلیل القدر شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ نہایت پُر اثر اور معرکہ آرا نظم آپ کے دل و دماغ کی حالت کی آئینہ دار ہے۔ اِس درد ناک اور انتہائی پُر خلوص، سچی اور حقیقی سرگزشتِ حیات کو جسے میں عرصۂ دراز سے پڑھتا رہا ہوں، اب نظم کے رُوپ میں پڑھ کر دل تھم سے بیٹھ سا گیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور میں اُس وقت سے اِس خط کے لکھنے تک آپ ہی کے بارے میں سوچتا اور غمگین و ملول ہوتا رہا ہوں۔ اِس وقت بھی اِس قابل نہیں کہ اِس نظم کی عظمت اور شدتِ تاثر پر موزوں اور مناسب انداز میں کچھ لکھ سکوں۔ یہ نظم لافانی تخلیق ہے۔ اپنی سچائی، شدتِ تاثر اور سادگی و پُرکاری کے حُسن اور پُر اثر طرزِ ادا کی بدولت کم از کم اِس چوتھائی صدی کی شاہکار اور اعلیٰ شاعری کی نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے۔

دل کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے لئے جن زہر کے پیالوں کو آپ پیتے رہے ہیں۔ اُن ہی پیالوں کے زہر کے چند قطرے ہی سہی، میرے حلق سے بھی اُترتے رہے ہیں۔ آپ کے نقوشِ قدم میرے راہبر ہیں اور میں قدم بقدم آپ کے پیچھے چل رہا ہوں۔ زخم نڈھال اور دل شکستہ ــــ ذہن میں ناآسودگی۔ نارسائی اور محرومی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ بے شمار سوالات لئے ــــ!

آمیر عارفی ــــــــــــ شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اکتوبر کا شاعر" نظر نواز ہوا۔ آج کل میں اپنے ایم۔اے فائنل کے تحقیقی مقالہ "اُردو شاعری میں شہر آشوب" کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ لیکن "شاعر" ملتے ہی ایک ہی رات میں ختم کر ڈالا۔ سیّد مبارک علی جیلانی کا مضمون ایک معرکہ آرا چیز ہے، اور اِس سے پہلے اُردو میں علم الاعداد پر اتنا دلچسپ مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ اُن سے اِس طرح کے اور مضامین لکھوائیے۔

ندا فاضلی نئے اور اچھے شاعر ہیں، اُن کا مضمون "نئی نظم ــ نئی کسوٹی" اچھا ہونے کے باوجود تشنہ ہے۔ اُنھوں نے مجروح جیسے غزل گو اور پیارے شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ایک ہی سانس میں سردار، نیاز حیدر، کیفی اعظمی اور مجروح کا نام لینا کسی طرح دُرست نہیں۔ اُنھوں نے مثالوں میں دیگر نمائندہ شاعروں میں اور بہت اچھے شاعروں کو چھوڑ دیا۔ جیسے بشیر بدر اور دوسرے بھی ــــــ۔ احمد جمال پاشا کے فن پر مضمون اچھا خاصا ہے۔

افسانوں میں یوسف رضا کا افسانہ "بے خواب کواڑ" بہت ہی جاندار ہے اور خوبصورت بھی۔ نور شاہ کا افسانہ باوجود ٹھیک ہونے کے اپیل نہ کر سکا۔

غزلوں میں صبا اکبر آبادی کے یہ شعر ؎

سحر تک دل کو جلنا ہی پڑے گا   چراغِ شام ہو کر رہ گیا ہے
گلستاں میں ہر اک جھونکا ہوا کا   تماشہ نام ہو کر رہ گیا ہے

کرشن موہن کی غزل کا مطلع بس پسند آیا ؎

رات آئی بات دل کی مان لو   شبنمی یادوں کی چادر تان لو

شکیل مظہری کی غزل میں فراق اور مخدوم کا حسین سنگم ہے۔

آجاؤ کہ سینوں میں اُجالوں کی کمی ہے   سناٹے نے شبدکے تمھیں آواز بھی دی ہے

سکندر محسن کی غزل کا مزاج دلنواز ہے۔ ؎

دل کے ویرانے میں تمھاری یاد   جیسے صحرا میں اک شجر تنہا
روشنی کا سفیر ہوتا ہے   ظلمتِ شب میں اک شرر تنہا

نظموں میں سردار جعفری کی نظم "ہمارے نام" اُن کے اپنے مخصوص انداز کی اچھی نظم ہے۔ لیکن اِس شمارے کا حاصل آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" ہے۔ یہ نظم نہیں بلکہ ایک عہد، ایک تہذیب کی وہ جھلکیاں ہیں جو آج ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ یہ کرب ایک فردِ واحد کا نہیں بلکہ پوری اُردو تہذیب کا کرب ہے۔ اس میں دوستوں کی یاد، وطن کی محبت، اُردو کو زندہ رکھنے کی جد و جہد اور

کرب مسافت کی حسین داستان ہے۔ واقعی اس نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک حساس دل درد مند جب سوچتا ہوگا تو یہ کرب کس قدر جاں لیوا ہوگا۔ آپ کی اس نظم نے مجھے بیحد متاثر کیا۔

رشید الدین بی اے ——— مددگار مترجم (اردو) محکمۂ ترجمہ۔ تالاب ماں صاحب۔ حیدرآباد ۲

بہت دن کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور اس کا محرک "شاعر" کا تازہ شمارہ ہے، جو ایوانِ اردو اور حیدرآباد کی لائبریری میں ابھی ابھی نظر سے گذرا۔ اس شمارہ میں غالب پر بڑا نادر اور اچھوتا مضمون شامل ہے۔ غالب پر جب بھی کوئی ایسی چیز پڑھتا ہوں تو خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ جملہ بے ساختہ یاد آجاتا ہے "غالب بڑا تہہ دار شاعر ہے۔ باوجود اتنا کچھ لکھے جانے کے، ابھی اس کے کلام کی گرہیں ایسی رہیں جو کھلنی ہیں۔ مگر اس کے کلام کی ایک گرہ اگر کھلے تو سو گرہیں اور پیدا ہو جاتی ہیں۔ نوجوان مزاح نگار احمد جمال پاشا کے فن پر اختر بستوی کا مضمون بھی اچھا ہے۔ نوجوان لکھنے والوں پر ان دنوں کچھ نہ کچھ لکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔

حصۂ نظم میں آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" بڑے معرکے کی چیز ہے۔ نظم میں بلا کی روانی اور تاثیر ہے۔ الفاظ سیدھے سادے اور عام فہم ہیں۔ مگر پڑھتے پڑھتے جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دور بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ موجودہ ہنگامی حالات کے دوران دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر کوئی ایسی چیز جو دل سے نکلے اور دل میں گھر کرے، نظر سے نہ گذری تھی۔ آپ کی نظم نے یہ حسرت بھی پوری کر دی۔ نظم کی تکنیک بھی خوب ہے اور آزاد نظم میں نئی راہوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس نظم سے اس جد و جہد کا بھی پتہ چلتا ہے جو آپ نے "شاعر" "افتخار الادب" کو باقی رکھنے کے لئے اب تک کی ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم کا سب سے زیادہ قابلِ ستائش پہلو دونوں ملکوں میں صلح و آشتی کا جذبہ دل میں رکھتا ہے۔ بہرحال آپ کی اس نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ اقبال نے سچ ہی کہا تھا ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ‏ ‏ ‏ پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

کرشن چندر نمبر اور اس کے ساتھ دیگر آٹھ نمبروں کا اعلان ہر اردو داں کے لئے باعثِ مسرت ہو سکتا ہے۔ مُردہ پرستی کے اس دور میں "شاعر" کا یہ اقدام یقیناً قابلِ صد تحسین ہے۔ مجھے توی امید ہے کہ اردو داں افراد اس سلسلے میں آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔

پروفیسر پیرزادہ اقبال ہاشمی ایم۔اے ——— درگاہ ہاشم پیر، بیجاپور ۲

اکتوبر کا "شاعر" موصول ہوا۔ شکریہ۔ اس بار مقالات اور نظمیں واقعی قابلِ تعریف ہیں۔ سردار جعفری کی نظم کے کیا کہنے، نظم پڑھنے کے بعد ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے۔

آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" پڑھ کر طبیعت تادیر مسحور رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں تعریف کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نظم جنگ کی باقی الصالحات میں شمار کی جائے گی۔

ظہیر ناشاد اور قیصر صدیقی کی تخلیقات بھی خوب ہیں۔

غزلیات کا حصہ کافی اچھا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار بہت ہی پسند آئے۔

فلک کا نام ارباب رضا میں	تمہارا نام ہو کر رہ گیا ہے	(رضا اکبرآبادی)
آگ پانی کو بنانا ہے دعا دو رِندو!	میرے پیالے کا چھلکتا ہوا جل کام آئے	(رحیم مچھلی شہری)
مرنا برائے زیست بڑی بات ہی سہی	میں یہ بھی کر دکھاؤں ذرا حوصلا تو دو	(مظہر امام)
جھکے آوارہ یہ قدغن ہے سرِ کوئے جنوں	حکم ہے محفلِ اغیار سے آگے نہ بڑھے	(ناجی انصاری)
یہ بات الگ ہے کہ تجھے بھول چکا ہوں	اک عمر تری یاد مرے ساتھ رہی ہے	(شکیل منیلہ)

بدیع الزماں خاور ——— نیشنل ہائی اسکول۔ دائیوانی (رتناگری)

اکتوبر کا "شاعر" پیشِ نظر ہے۔

آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" صرف آپ کی ذات کا نہیں ایک پورے عہد کا مرثیہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نظم ہر حساس اور حقیقت پسند

انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرے گی۔ چاہے اُس کا تعلق کسی بھی خطّے اور کسی بھی سرزمین سے ہو۔ سردار جعفری کی نظم بھی شاہکار ہے اور اُردو کے اُس عظیم ادب میں گراں قدر اضافہ، جسے موجودہ حالات نے جنم دیا ہے۔

نائب وزیر دفاع کا بیان اُردو والوں کے لئے یقیناً جذبات انگیز ہے مگر یہ اُردو والوں کی وطن پرستی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی قسم کے ردّ عمل سے بچائے ہوئے ہیں — اُردو نے ہر دَور اور ہر عہد میں دُوسری زبانوں سے زیادہ اور ٹھوس خدمت کی ہے اور آج بھی ہمارے فن کار قومی اور وطنی ادب کی تخلیق میں سب سے آگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو والوں کی حالیہ خدمات ہمارے ارباب اقتدار کو اُردو کی اہمیت تسلیم کرانے اور اُسے جائز مقام دلانے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ہم منظم طور پر اور صحیح راستے سے اپنا مقدمہ وقت کی عدالت میں پیش کریں !!

مسعود قمر تاباں ایم اے ——— جہانگیر آباد — بھوپال

اس دَوران میں "شاعر" برابر دیکھتا رہا ہوں۔ ستمبر کے "شاعر" کے مُرقعات کی تعریف کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہ فکر اور فکر کی گہرائی کا آئینہ دار ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کے قلم کو تا دیر سلامت رکھے۔

"شاعر" بچپن سے میرا محبوب رسالہ رہا ہے۔ بچپن میں "مسافر سفر میں ہے"۔ میں اُسی ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا جس طرح آج کل لوگ جاسوسی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

اکتوبر کے "شاعر" میں نظم "کربِ خود کلامی" جہاں آپ کی فنی مہارت کا ثبوت ہے، ذہنی فکر کی گہرائی کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہ نظم موجودہ حالات سے متاثر ہو کر کہی ہوئی تمام نظموں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو اپنے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے اس شاہکار تخلیق پر ہدیۂ مبارکباد پیش کر سکوں۔ آپ کی اور سردار جعفری کی نظم "ہمارے نام" نے "شاعر" میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

منظفر حنفی ——— میواتی پورہ۔ بھوپالی گیٹ۔ سیہور (بھوپال)

موجودہ جنگ کے متعلق سردار جعفری کی نظم "کون دشمن ہے" ایک پرچہ میں دیکھ کر خیال گزرا تھا کہ اس سے بہتر نظم شاید اس موضوع پر نہ کہی جا سکے۔ لیکن آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" تو اُس سے بھی بازی لے گئی۔ جس نے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ افسوس ہے، میں تعریف کرنے کے فن سے نابلد ہوں، ورنہ یہ نظم اس قابل ہے کہ مستقل مضمون اس پر لکھا جائے۔

"شاعر" اکتوبر ۶۵ء میں جناب مظہر امام کی غزل کا مطلع ؎

جاگا ہوا ہوں، رات کا، دن میں سُلا تو دو
اس اضطرابِ شوق کا کوئی صِلا تو دو

شش و پنج میں ڈالے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ مظہر امام صاحب سے روانی میں "ایطا" سرزد ہو گیا ہے۔ یہ بات اعتراض کے خیال سے نہیں محض اپنی معلومات کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اُمید کہ موصوف اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔

اُن حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے "سبز روشنی" کے سلسلے میں پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب کا یہ خیال کہ میرے اِس افسانے میں رام لعل صاحب کے کسی افسانے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ حقیقت پر مبنی نہیں، سوائے اِس کے کہ دونوں کہانیاں اُردو میں لکھی گئی ہیں جن احباب نے دونوں افسانے پڑھے ہیں، وہ بہتر فیصلہ کریں گے۔

محسن زیدی ایم اے ——— ۸۹۷۱۔ نیا محلہ۔ پُل بنگش۔ دہلی ۶

اکتوبر ۶۵ء کے "شاعر" میں آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" بہت پسند آئی۔ حالیہ جنگ پر اتنی اچھی نظم میری نظر سے نہیں گزری۔ کاش ملک کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو ہمیں تاریخ کے اس المیہ سے نہ گزرنا پڑتا۔

پروفیسر اختر نظمی ایم اے ——— شبیر کوارٹرز۔ نیا محلہ۔ جبلپور

"شاعر" ملا۔ غزل کی اشاعت کا شکریہ۔ نئی نظم کے متعلق ندا فاضلی کا مضمون بصیرت افروز ہے۔ افسانہ ابھی میں نہیں پڑھ سکا ہوں۔

نظم "کربِ خودکلامی" سے انگنت تاثرات کی حامل ہے۔ سردار جعفری کی نظم "تجارت" سنا ہے لے اُن کے نام کی لاج رکھ لی۔ منسبات مجموعی اعتبار سے گرانقدر ہیں۔

اسرار اکبر آبادی بی اے بی ٹی - ۱۶-۳۴۲ منٹولہ - آگرہ (یو - پی)

اپنی روایات کے مطابق "شاعر" اکتوبر فکر وفن کی تمام باریکیوں اور رنگینیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ آپ کی نظم "کربِ خودکلامی" کے اُتار چڑھاؤ، ماحول اور تاثر نے ذہن پر کافی گہرے نقوش چھوڑے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اور ہمت بھی بڑھی۔ دیگر تخلیقات بھی خوب ہیں۔

ایم اے تاز قادری - یونائیٹڈ ہائڈرانیڈ اکن کمپنی برہمپورہ (مظفر پور)

حسبِ معمول "شاعر" کا اکتوبر والا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سید مبارک علی ساغر بستوی - نور فضا اور یوسف رضا کی تخلیقات کافی پسند آئیں۔ جناب مبارک علی نے تو ایک نئی چیز پیش کی ہے۔ یوں تو سبھی نظمیں اچھی ہیں لیکن آپ کی نظم نے تو مجھے تڑپا دیا۔ دل کو چھوتی ہے میری پلکیں تو نمناک ہو گئیں۔ حصۂ غزلیات میں سلام مچھلی شہری منظر امام، نامی انصاری، حبیب الرحمٰن راہی اور شکیل مظہری کی غزلیں خوب ہیں۔ شاہد صاحب کا ڈرامہ بھی اچھا ہے۔ اُردو ادب میں ابھی ڈرامے کی کمی ہے۔ اُن سے کہئے کہ وہ ڈرامے خوب لکھیں۔ دوسرے فن کاروں سے بھی ڈرامے لکھوائیں اور ہر ماہ "شاعر" میں کم از کم ایک ڈرامہ ضرور دیں۔ "شاعر" کے معیار کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اِس دور میں اتنا اچھا ادب پیش کرنا آپ ہی کے بس کی بات ہے۔ ہندوستان کے بعض اُردو رسائل و جرائد کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

رسالہ "نگار" کے دو نمبروں کی ضرورت

میں ناگپور یونیورسٹی میں "نیاز" کی نظمیہ شاعری پر پی - ایچ - ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہوں۔ مجھے مولانا نیاز فتحپوری کے رسالہ "نگار" کے مندرجۂ ذیل نمبروں کی سخت ضرورت ہے۔

(۱) سالنامہ نگار جنوری فروری ۱۹۳۶ء (۲) انتقاد نمبر مارچ ۱۹۴۳ء۔

جن صاحب کے پاس یہ دونوں نمبر ہوں وہ مجھے قیمتاً یا عاریتاً عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(بہو مغیر) زرینہ ثانی
۲۱۱ شنکر نگر - ناگپور (مہاراشٹر)

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

پھول اور چراغ

مرتبہ ——— سید اقبال احمد جونپوری

یہ اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر شفیق جونپوری مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے اور شفیق جونپوری اُن بدقسمت شاعروں میں سے ہیں جن کو اُن کی زندگی میں شہرت تو ملی لیکن نقادانِ سخن نے اُن کو دینے کی طرح دادِ سخن نہ دی۔ دوسری طرف خود شفیق مرحوم کے بعض عقیدت مندوں نے اُن کی تعریف کچھ اس طرح کی کہ وہ خود اُن کی تنقیص بن کر رہ گئی۔ اُن کی زندگی میں اُن کا ایک بھی ڈھنگ کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اُن کا زیرِ نظر ضخیم انتخابِ کلام پچھلے تمام مجموعوں سے بہتر ہے لیکن بعض اُمور میں یہ بھی سابقہ مجموعوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس میں بھی کوئی ایسی تاریخی ترتیب نہیں ہے جس سے اُن کے فکری ارتقا کا اندازہ لگایا جاسکے۔ صرف اُن کے اُن مجموعوں کے نام دے دیئے گئے ہیں جن سے یہ غزلیں نقل کی گئی ہیں۔ کم از کم ہر حصے کا ایک الگ سے ٹائیٹل ہی دے دیا جاتا۔ جہاں تک غزلوں کے انتخاب کا تعلق ہے اس میں بھی کسی بلند انتخابی فکر و شعور سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انتخاب میں یہ شعر بھی موجود ہے ؎

روتی بھی شفیق کی آگاہی گاندھی کے لئے، جوہر کے لئے
اے قائدِ اعظم تو نے بھی آرام بہ زیرِ خاک کیا

ظاہر ہے کہ یہ شعر محض وقتی ہے اور اس میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں ہے۔ جس طرح پہلے کے بعض مجموعوں میں شفیق مرحوم کے سلسلے میں غلو سے کام لیا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں بھی وہی انداز اُن کے مداحین نے اختیار کیا ہے۔

"نعت و منقبت، مثنوی اور قصیدہ گوئی کے فنون میں بھی معاصرین میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔"

شاید "حرفِ اوّل" لکھنے والے صاحب کو عزیز لکھنوی، ضیاء القادری جیسے مشہور و مقبول نعت گو شعراء اور نجم آفندی جیسے کامیاب قصیدہ گو کے نام معلوم نہیں۔ اس گزارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شفیق مرحوم نے اچھی نعتیں نہیں لکھیں یا اچھے قصیدے نہ کہے ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ دوسرے مشاہیر شعراء کو یک قلم مسترد کر دینے کا سبب؟ جس بات میں توازن نہ ہو وہ بات کیا ہوئی؟

مجموعہ پر نام بھی دیا ہے "فخرِ مشرق علامہ شفیق جونپوری" لکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شفیق جونپوری کم تر درجہ کے شاعر تھے، نہیں اُن کا مرتبۂ شاعری بہت بلند ہے لیکن افسوس اُن بلندیوں کو صحیح تنقیدی فکر و نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ شفیق نہ اقبال، سیماب اور جوش کی صف کے شاعر تھے نہ اصغر، حسرت، فانی اور یگانہ کے زُمرے میں وہ آتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے تو عزیز شاگرد بھی تھے۔ ہاں ان جلیل القدر اساتذہ اور اپنے اپنے رنگ کے عظیم شعراء کے بعد آنے والے ممتاز شعراء میں شفیق جونپوری کا شمار ضرور ہوتا ہے۔ اور شفیق پر لکھتے وقت اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔

شفیق جونپوری بڑے ہی قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن یہ ان کی ایک پیش پا افتادہ سی خصوصیت ہے۔ قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ اُن میں ایک فکری بصیرت بھی تھی جو اُن کی شاعری میں شروع سے آخر تک ملتی ہے۔ مرحوم کی تعلیم و تربیت قدیم انداز پر ہوئی تھی۔ اُن میں ایک دینی لگاؤ تھا۔ عربی اور فارسی اُن کے علم کی بنیاد تھی۔ لیکن انھوں نے ذہن جدید پایا تھا۔ اُن کے کلام سے اُن کے عصری شعور کا زبردست اظہار ہوتا ہے اور لطف یہ کہ خارجی مسائل کو وہ بڑے شاعرانہ حُسن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس حُسن میں ایک جرأت بھی ہے اور کس بل بھی۔ اسی لئے اُن کے اشعار اور بھی زیادہ پُرتاثیر ہوگئے ہیں ؎

وہ بزمِ ناز کا ہنگامۂ حشر آفریں توبہ
چراغاں کے بہانے پھونک ڈالے تم نے گھر کتنے

یہاں بھی رہنما ہے راہگیروں کو ہیں اندیشے
یہاں بھی قافلوں کے راہزن ہیں راہبر کتنے

ابھی تو رات بھر رونقِ محفل پہ نازاں ہے
خدا جانے کرن ہو جاتے ہیں تارے تا سحر کتنے

گئے وہ دن کہ موجوں میں سفینے ڈوب جاتے تھے
گزر جاتے ہیں اب موجوں کے سینے چیر کر کتنے

ان اشعار کا رمز و کنایہ خود طلب ہے اور ایسے ہی اشعار میں شفیق

کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ چونکہ اپنے استاد مولانا حسرت موہانی کی طرح اُن کی ایک ہی غزل میں عاشقانہ، زاہدانہ، ناصحانہ، سیاسی، تقیہ اور کئی دوسری طرح کے اشعار ہوتے تھے۔ اس لئے شفیق کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ پھر بھی کوشش کر کے ان کا ایک ایسا انتخاب کلام مرتب کیا جا سکتا ہے جو اُن کے مقام کو متعین کر سکے۔ شفیق کی شاعری نقد و تبصرہ چاہتی ہے، لیکن بہت حقیقت پسندانہ۔ ایسا نہیں جیسا اب تک اُن کی کتابوں میں نظر آیا ہے۔ اس سے شفیق مرحوم کی شخصیت کو نقصان پہنچا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

"پھول اور چراغ" کا حجم ۵۷۶ صفحات ہے۔ تقریباً چار سو صفحات میں غزلیں ہیں۔ ابتدائی ۹۶ صفحات میں مختلف لوگوں نے قلم سے اُن کی زندگی اور شاعری پر اظہار خیال ہے۔ اس میں زیادہ حصہ مختصر آراء کا ہے۔ جناب حبیب احمد صدیقی نے شفیق جونپوری مرحوم کی شاعری کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ آخری حصہ میں ۵۴ چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ شفیق مرحوم نظم کے شاعر نہ تھے۔ پھر بھی اُن کی بعض نظمیں خاصی اچھی ہیں اور بعض محض برائے بیت۔ اُن کی نظموں کا ایک اچھا انتخاب الگ ہی سے شائع ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ کی کتابت تو اچھی ہے لیکن غیر معیاری طباعت نے اس کے حسن کو مجروح کر دیا ہے۔

قیمت سات روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس ۳۵۴ رضوی خاں۔ جونپور (یوپی)

"من سمجھاون"

مرتبہ ——————— ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر سیدہ جعفر اُردو کی ایک اچھی ادیب اور محقق ہیں۔ "ماسٹر رام چندر" پر انھوں نے ایک کتاب لکھ کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ "من سمجھاون" اُن کی دوسری تحقیقی کتاب ہے۔ یہ ایک ولی صفت بزرگ شاہ تراب کی نظم کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ ہے۔ شاہ تراب چشتیہ سلسلے کے وہ آخری صوفی شاعر تھے جنھوں نے اپنے ملفوظات سے کئی کتابیں چھوڑیں اور اُن کے ذریعے دکنی زبان میں رموز و اسرار کا ئنات، عرفان و ادراک، خدا پرستی اور اپنے صوفیانہ تصوّرات کو پیش کیا۔ اس کتاب میں انھیں ایک بزرگ شاعر ثابت کیا گیا ہے سنہ ۱۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اسّی سال سے زیادہ انھوں نے عمر پائی۔ یہ زمانہ جنوبی ہند میں ولی ویلوری، سراجی اور غالب وغیرہ کا تھا اور شمالی ہند میں میر، سودا، سوز اور مظہر وغیرہ کا۔ دکنی اُردو پر جنوبی ہند کی زبانوں کا گہرا اثر تھا۔ لیکن شمال میں اُردو کا رنگ نکھر تا جا رہا تھا۔ شاہ تراب نہ صرف جنوبی ہند کی زبانوں سے واقف تھے بلکہ یہاں کے رشیوں اور سنتوں کی تعلیمات سے بھی متاثر۔ چنانچہ نظم "من سمجھاون" مہاراشٹر کے عظیم فلسفی اور صوفی شاعر سنت رام داس کی منظوم تصنیف "مناچے شلوک" سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ کتاب میں جہاں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے دونوں نظموں کا تقابل کیا ہے۔ مطالعہ سنت رام داس کے افکار و خیالات کی جھلک "من سمجھاون" میں صاف نظر آتی ہے۔ لیکن اس نظم میں خود شاہ تراب کے مشاہدات و تجربات اور اسلامی تصوّرات بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ پہلا رنگ کچھ زیادہ گہرا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی نظم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے اللہ یا رحیم نظم نہیں کیا ہے بلکہ جگہ جگہ "رام" ہی لکھا ہے اور اس طرح مذہبی منافرت کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں نظم تو پچاس صفحات ہی میں ہے لیکن ابتدائی ۱۶۸ صفحات میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شاہ تراب کی زندگی کے تفصیلی اور تحقیقی حالات۔ پھر سنت رام داس اور اُن کے شاگردوں کے کارناموں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ دونوں کی نظموں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ سنت رام داس کی نظم ۲۰۵ مصرعوں پر مشتمل ہے اور انھوں نے آخر میں لکھا ہے کہ جو لوگ انہیں پڑھیں گے اُن کو گیان مل جائے گا، اُن کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے "مناچے شلوک" کی اُس دور میں کتنی اہمیت ہوگی۔ دونوں نظموں کے "موازنہ" میں دیدہ وری سے کام لیا گیا ہے۔ بعض ہندی (شلوکوں) کے معانی و مطالب بھی بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں شاہ تراب کی مکمل نظم دیکر۔ اُس کے ساتھ مشکل دکنی الفاظ کی فرہنگ شامل کر دی گئی ہے۔ جگہ جگہ حواشی ہیں اور بڑی حد تک تحقیق کے اصولوں کو برتا گیا ہے۔

کتاب کے نثری حصے میں البتہ مشکل دکنی، مراٹھی اور سنسکرت الفاظ کے معانی و مطالب حاشیہ پر نہیں دیئے گئے ہیں جس سے قاری کو سمجھنے میں تھوڑی سی دشواری ہوتی ہے کتاب کا ٹائپ بھی اچھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اُمید کہ آئندہ ایڈیشن میں دونوں باتوں کی طرف ڈاکٹر سیدہ جعفر توجہ دیں گی قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔

ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ خیریت آباد حیدرآباد ۴ (اے۔پی)

علمی - ادبی اور تہذیبی خبریں

ہندی کی پانچ اور اُردو کی صرف ایک

دہلی ۱۱ر نومبر۔ نئے پڑھنے والوں کے لئے کتابوں کے چوتھے مقابلے میں جو اقوام متحدہ کی سماجی، معاشی اور تمدنی تنظیم کے زیر نگرانی ہوا، تشو کتابیں منتخب ہوئی ہیں۔ ان کے مصنفین کو ایک ایک ہزار روپے دئے جائیں گے۔ مقابلے میں ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کی کتابیں شامل ہیں، جن میں پانچ ہندی کی ہیں اور صرف ایک اُردو کی۔

اُردو کتاب "چاند کی طرف پہلا قدم" ہے جو محمد اسحاق صدیقی کی تصنیف ہے۔

مشترکہ تہذیب کا نمونہ

زار دہلوی کو وزیر اعظم شاستری کا خراج عقیدت

نئی دہلی ۱۴ر نومبر۔ آج وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری نے رہنمانی پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی کو ایک ممتاز شاعر قرار دیا۔ انھوں نے کہا "زار دہلوی جن کا انتقال گزشتہ ستمبر کو ہوا یکجہتی اور دہلی کی مشترکہ تہذیب کا نمونہ تھے۔ وہ کلاسیکل سنسکرت اور فارسی ادب کے عالم تھے۔"

وزیر اعظم نے یہ خراج عقیدت "یوم زار" کے موقع پر پیش کیا جو آج یہاں منایا گیا۔ اس سلسلہ میں منعقدہ تقریب میں پروفیسر ہمایوں کبیر، مسٹر شاہنواز خاں اور مسٹر شاہ احمد کے علاوہ شہر کے ممتاز شعراء، ادبا اور عمائدین نے شرکت کی۔ اس تقریب میں ممتاز شخصیتوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔

سردار جعفری کی کتاب "ایک خواب اور" پر انعام

نئی دہلی ۱۲ر نومبر۔ سوویٹ لینڈ نہرو انعام اسکیم کے تحت سوویٹ لینڈ کی طرف سے بین الاقوامی امن اور ہندوستان سوویٹ دوستی پر ادبی، صحافتی اور مصوری کے بہترین نمونوں کو پنڈت جواہر لال نہرو کی یادگار کے طور پر انعامات دئے گئے۔

پہلا انعام ہندی کے مشہور ادیب سمترا نندن پنت کو اُن کی کتاب "لوک یاتن" پر، دوسرا انعام مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری کو اُن کے مجموعۂ کلام "ایک خواب اور" پر اور تیسرا انعام جاگیر سنگھ آنند کو شولوخوف کی کتاب VIRGIN SOIL UPTURNED کے ترجمے پر دیا گیا۔

انعام میں ساڑھے سات ہزار روپئے، ایک تمغہ اور مدت تک روس کی سیر شامل ہے۔

رُوسی ادیب شولوخوف کو ادب کا نوبل انعام

اسٹاک ہوم ۱۶ر اکتوبر۔ ادیب میخائیل شولوخوف کو ۱۹۶۵ء کا ادب کا نوبل پرائز اُن کے مشہور ناول "اور ڈان بہتا رہا" پر دیا گیا ہے۔ اس ساٹھ سالہ روسی ادیب کو ۱۹۴۴۳ اسٹرلنگ کا یہ انعام دسمبر میں دیا جائے گا۔

ڈاکٹر گیان چند شعبۂ اُردو جموں کے صدر

کشمیر یونیورسٹی کا ایک شعبۂ اردو کئی سال سے سری نگر میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس سال سے یونیورسٹی نے ایک اور شعبۂ اُردو جموں میں کھولا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جو اب تک بھوپال میں شعبۂ اُردو کے صدر تھے اب شعبۂ اُردو جموں کشمیر یونیورسٹی مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف نے چارج لے لیا ہے۔ اُن کا ڈاک کا پتہ یہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند پروفیسر اُردو جموں و کشمیر یونیورسٹی۔ جموں (کشمیر)

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کو نظام دکن کا عطیہ

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کو اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں نظام دکن نے تیس ہزار روپیہ کی گرانقدر رقم عطا فرمائی ہے۔ اس رقم سے دہلی یونیورسٹی میں "نظام توسیعی خطبات" کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور ہر سال مقتدر اہل علم کو مختلف موضوعات پر خطبہ دینے کے لئے مدعو کیا جائے گا۔

ایک ہزار روپیہ صاحب خطبہ کو دیا جائے گا اور ایک ہزار ان خطبوں کی اشاعت و طباعت پر صرف کیا جائے گا۔ اسی طرح ہر سال دو ہزار روپے خرچ کئے جائیں گے۔

مولانا مظہر الحق مرحوم کی یاد میں

دہلی میں آل انڈیا مشاعرہ کی تیاریاں

صوبۂ بہار کے مشہور قومی رہنما مولانا مظہر الحق مرحوم کی صد سالہ برسی کے موقع پر دہلی میں ۱۸ر دسمبر کو ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوگا۔

مشاعرہ کا افتتاح وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری کریں گے اور صدارت صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین فرمائیں گے۔ اس مشاعرہ میں چوٹی کے شعراء کی شرکت متوقع ہے۔

دولتِ مشترکہ نمائش میں نہرو اور ٹیگور کی کتابیں

لندن ۱۰ نومبر۔ دولتِ مشترکہ کی کتابوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور اور آر۔ کے نارائن کی کتابیں بھی رکھی گئی ہیں۔ اس نمائش کا افتتاح دولتِ مشترکہ کے سکریٹریٹ کے پہلے سکریٹری جنرل آرنالڈ اسمتھ نے مارل برو ہاؤس میں کیا، جہاں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی تھی۔

لکھنؤ میں یادِ مجاز کی شاندار تیاریاں

لکھنؤ ۳ نومبر۔ ینگ سوشلسٹ سوسائٹی اُتر پردیش ۵ دسمبر کو اسرار الحق مجاز کی دسویں برسی پر ایک شاندار پروگرام کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اس پروگرام میں مقالات، تقاریر اور مشاعرہ شامل ہوگا۔

مولانا آزاد کے خطوط

ساہتیہ اکاڈمی دہلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام تحریریں اہتمام کے ساتھ شائع کرنا چاہتی ہے۔ ان میں ایک جلد خطوط کی بھی ہوگی۔

جن صاحب کے پاس مولانا آزاد کے خطوط ہوں وہ ذیل کے پتہ پر بھیج دیں۔ ان کی نقل یا فوٹو لینے کے بعد بعد شکریہ احتیاط کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔ پتہ یہ ہوگا۔

جناب مالک رام، ساہتیہ اکاڈمی۔ رابندر بھون۔ نئی دہلی

ہز ہولی نیس سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین
چانسلر مسلم یونیورسٹی کی وفات

بمبئی ۱۲ نومبر ۱۹۶۵ء کو جمعہ کے دن داؤدی فرقے کے مشہور و عظیم پیشوا اور داعی مطلق نے ۸۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

آپ کا شمار دنیا کی مشہور اور بزرگ ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ اس کے علاوہ وہ عربی زبان کے جید عالم اور مستند کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

آپ کے جلوسِ جنازہ کے طویل راستہ میں چپہ چپہ پر ہزاروں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ مختلف ممالک کے قونصل جنرلوں کے علاوہ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی جنازے میں شرکت کی۔

تلوک چند محروم کی تصنیف بچوں کی دنیا کو انعام

نئی دہلی ۲۰ نومبر۔ مرکزی وزارتِ تعلیم نے اس سال بچوں کے لئے کتابوں کے گیارہویں مقابلہ میں اردو کی کتاب "بچوں کی دنیا" مصنفہ تلوک چند محروم کو منتخب کیا ہے۔ جس پر انہیں ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ ۱۳ بھارتی زبانوں کی دیگر کتابوں کو بھی انعام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں دو ہندی، ایک پنجابی اور ایک سندھی زبان کی کتاب شامل ہے۔

مراٹھی ادب کی حوصلہ افزائی

بمبئی ۶ نومبر۔ حکومت مہاراشٹر نے سال ۱۹۶۵-۶۶ء کے دوران ادب کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ایک اسکیم منظور کی ہے۔ اس کے تحت بالغوں کے لئے لکھی گئی مراٹھی کی بہترین کتابوں کے مصنفین کو فی کتاب ۱۵۰۰ روپے دئے جائیں گے۔ اس میں ناول، مختصر افسانے، نظم، سوانح، خود نوشت (آپ بیتی) تذکرہ، تحقیقی مضامین، سفرنامے، فلسفہ، تاریخ، سوشل سائنس، ادبی تنقید، زبان و قواعد، سائنس اور عام ادب کی کتابیں شامل ہوں گی۔

بچوں کے لئے مراٹھی میں لکھی جانے والی نظموں کا نرسری، ڈرامہ وغیرہ مختصر قصے، پریوں کی کہانیاں، دیہاتی کہانیاں، سوانح عمریاں، عام معلومات، سائنس اور لوک ادب پر بھی انعامات دئے جائیں گے۔

اس مقابلہ میں پیش کی جانے والی کتاب یکم نومبر ۱۹۶۴ء اور ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوران تصنیف یا تالیف کی گئی ہونی چاہئے۔ یہ مقابلہ ریاست مہاراشٹرا اور اس سے باہر کے مصنفوں اور ناشروں کے لئے عام ہے۔

علامہ جمیل مظہری بہار یونیورسٹی میں

مظفر پور۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اردو کے مشہور شاعر جمیل مظہری کو بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شامل کیا گیا۔ آپ پٹنہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

آل انڈیا ریڈیو سے ایک اور اردو

دہلی۔ آل انڈیا ریڈیو سے مغربی پاکستان کے سننے والوں کے لئے اردو میں ایک نئی سروس شروع کی گئی ہے جو دن کے بارہ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک جاری

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا چھتیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

دسمبر ۱۹۶۵ء
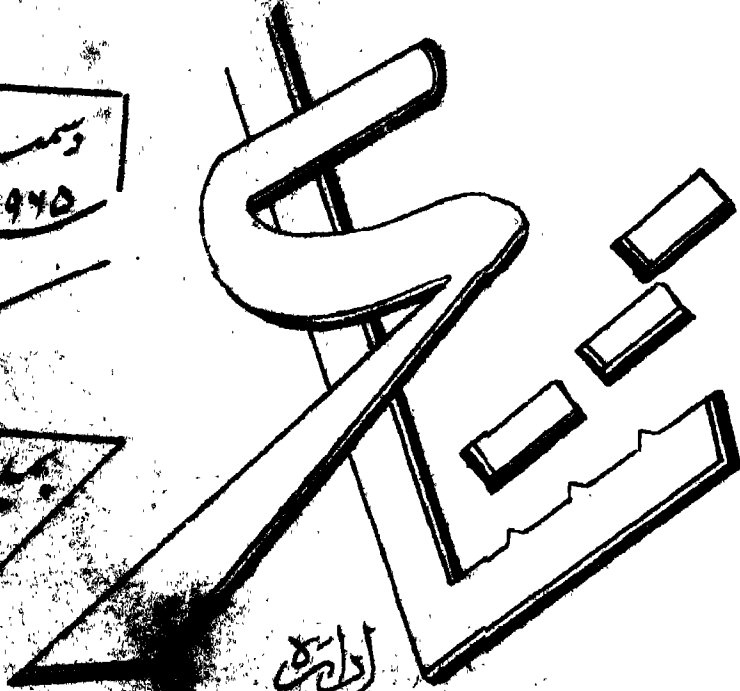
شاعر

بمبئی

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ

سات روپے

شاعر کی سینتیسویں سالگرہ پر

آئندہ ماہ جنوری میں پھر ایک خوبصورت اور بھاری **سالنامہ** ۱۹۶۶ء پیش کیا جا رہا ہے۔

شعر و ادب کا ایک دل آویز صحیفہ

ایک نا تمام جھلک

نثر نگاری کا مفہوم (مقالہ) ڈاکٹر سلام سندیلوی
سنیما کے بیشتی تجربے (مقالہ) پروفیسر زرینہ ثانی
"ایلو آرٹسٹ" کی تصویری نظمیں (مقالہ) ندا فاضلی
فنی ڈراما اور اداکاری (مقالہ) لطف الرحمٰن
گلدستۂ نسیم (دہلی) (مقالہ) تمنّا مظفر پوری
علم سے قلم تک (طنز و مزاح) یوسف ناظم
دھکی (افسانہ) ڈاکٹر دوست پرکاش سنگھ
سمندر (افسانہ) آمنہ ابوالحسن
نرسنگھ بھیّا (افسانہ) مانک ٹالہ
مٹی (افسانہ) شکسپیر (ترجمہ فیض الحسن)

انتظاریہ ——————

کوثر چاندپوری - قرۃ العین حیدر - رام لعل - فراق گورکھپوری
میکش اکبرآبادی - سردار جعفری - علی جواد زیدی - جگن ناتھ آزاد -
شمیم کرہانی - سلام مچھلی شہری - رفعت سروش - نشاط شاہدوی - کرشن موہن
نازش پرتاپ گڑھی - متین سروش - منظر امام - شاذ تمکنت - محسن زیدی
راج نراین راز - مخمور سعیدی - ناوک انصاری - شہاب جعفری - قیصر قلندر
بدیع الزماں خاور - زیدی جعفر رضا - اسرار اکبرآبادی —— اور دوسرے

حجم سو صفحات —————— قیمت ایک روپیہ دو آنے

ایجنٹ حضرات جلد اپنے بڑھے آرڈروں سے مطلع کریں

کھوئی ہوئی توانائی حاصل کیجیے
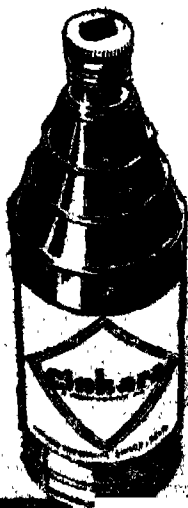
آپ کے اور آپ کے
گھر بھر کے لیے

سنکارا

وٹامنوں سے بھرپور جڑی بوٹیوں کا ٹانک

ہمدرد
دہلی • کانپور • پٹنہ

HDC 371 D/UR

شاعر بمبئی

دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء

ترتیب

افکارِ دائرہ

مقالات

نظمیں

افسانے

غزلیں

مکتوبات

———✦———

تصویر ——— کشمیری لال ذاکر

ادارۂ شاعر نخر و مسرت کے ساتھ
اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار
کرشن چندر
پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے
کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان
کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دنیا کے کئی بڑے مصنفین اور
مفکرین کے مضامین و تاثرات
کرشن چندر نمبر
میں
پیش کیے جائیں گے۔!
کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ
اُس کی عظمت کی کہانی، اُس کی تصانیف کا جائزہ
اس کے زندہ اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں
ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر
درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجیے
کرشن چندر نمبر میں
خود
کرشن چندر
کے اپنے قلم سے
ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار نئے
ناول
کے علاوہ
تین تازہ کہانیاں
ایک ڈرامہ
ایک مزاحیہ
میرے ادبی نظریات
میرے تنقید نگار
میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام
کرشن چندر کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعہ)
اور
عکسِ تحریر
کرشن چندر
کے اہم خطوط
اربابِ قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

علی عباس عابدی اسسٹنٹ ...

جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ

پہلی جنگ آزادی (جسے عرفِ عام میں غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے موسوم کرتے ہیں) کے بعد ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاجِ برطانیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی اور لارڈ کیننگ گورنر سے وائسرائے ہوگیا۔ اگرچہ بظاہر یہ تبدیلی کوئی بہت اہم نہ تھی لیکن اس ردوبدل کا اثر ہندوستانیوں کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر شعوری اور غیر شعوری طور پر پڑا اور ہندوستان تاریخی اعتبار سے پہلی بار غدر کے بعد ہی مجموعی طور پر ہمارا سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی شعور بیدار ہوا اور ہم نے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اس دور کو اگر ہم ہندوستانی عوام کی زندگی کا RENAISSANCE کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس وقت ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہمارا شعری سرمایہ زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ موضوع اور مواد کی قدامت کے ساتھ ہی ہمیں ہیئت اور فارم کی بوسیدگی کا بھی احساس ہوا اور یہ چیز واضح ہوگئی کہ اگر ہمارا ادب وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا تو مستقبل قریب میں اس کی بقا ناممکن ہوگی۔ لہٰذا ادب کو عصری میلانات سے ہم آہنگ کرنے اور اس کے ساتھ چلانے کی شعوری طور پر کوششیں ہوئیں۔ مولانا آزاد اور حالی نے موضوع اور مواد کے اعتبار سے شاعری میں گرانقدر جدید اضافے کئے۔ لیکن ہیئت اور فارم کی اصلاح ان بزرگوں کے مبارک ہاتھوں نہ ہو سکی۔ اسلوب میں جدت پیدا کرنے کا سہرا عبدالحلیم شرر اور مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کے سر بندھا۔ اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "تاروں بھری رات" اس جدت کا عمدہ نمونہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے آزاد نظم نہیں کہہ سکتے کیونکہ بقول پروفیسر احتشام حسین نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم میں فرق ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ دونوں کو ایک ہی میں ملا دیتے ہیں۔ نظمِ معرّیٰ یعنی بے قافیہ نظم میں ہر مصرعہ برابر ارکان رکھتا ہے صرف قافیہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی بلکہ کسی بحر کے معیّن ارکان کے ساتھ آزادی برتی جاتی ہے اور بحر کے اندر ہی رہتے ہوئے ہر مصرعہ میں رکنوں کی تعداد بڑھائی یا گھٹائی جا سکتی ہے۔ گویا مصرعے برابر نہیں ہوتے لیکن ایک دوسرے سے ہم آہنگ ضرور ہوتے ہیں۔ وزن ہوتا ہے لیکن وزن کا وہ معیّن اور مقرر تصور نہیں ہوتا جو مصرعوں میں برابر تعداد کے ارکان ہونے کی وجہ سے ذہن نشین ہوگیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نظم میں ہر مصرعہ یا دو دو مصرعے مل کر کسی مکمل خیال کا احاطہ نہیں کرتے بلکہ جتنے مصرعوں یا رکنوں میں خیال مکمل ہو سکے اس کی پابندی کی جاتی ہے۔

اس دور میں "تنگنائے غزل" کی تنگی کا بھی شدید احساس ہوا اور ردیف و قوافی کی پابندی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اسلوب سے متعلق پابندیوں کی بندشیں ڈھیلی پڑنے لگیں اور پرانے شعری اسلوب کی کہنہ عمارت مسمار ہونے لگی۔ موضوع، مضمون اور مواد کی تبدیلیوں کے ساتھ ہی ہیئت اور طرزِ اظہار میں بھی نئے اسالیب کو اپنایا گیا۔ ایک طرف ہندی کا اثر قبول کیا گیا دوسری طرف انگریزی کا۔ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات کے اسلوب سے متاثر ہو کر اسی انداز میں نظمیں کہی جانے لگیں۔ دراصل آزاد نظم نگاری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اس کا سراغ بیسویں صدی کے ... سے ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے ... اوائل میں ... جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ ہیئت کے سلسلے میں شعراء نے بہت سے تجربات کئے۔ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ ...

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس تحریک کے زیر اثر ان تجربات نے اور بھی زور پکڑا۔ ہمارے ادب میں خود بخود ایک طبقاتی شعور، ہیجانی کیفیت اور ایک طرح کا اعصاب زدگی طاری نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان ہیئتی تجربات کو ایک نئی تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ تجربات طبع زاد FORMS ہنیں تھے بلکہ یورپی ادب کے مختلف فارموں کا محض نقالی تھے۔ غیر ملکی ادب کا اثر ہمارے شعراء میں جنون کی حد تک بڑھ چکا تھا اور اس اضطراری کیفیت کی معراج یہ تھی کہ پنجاب کے نوجوان شعراء نے شوقیہ سانٹ اور کینٹوز لکھنے کے بعد فرانسیسی شاعر بادلیر کی طرز میں نظم منثور بھی لکھنی شروع کردی تھی اور یہ خبط اس حد تک بڑھا تھا کہ ایک صاحب نے "برہنہ" کے عنوان سے ایک ایسی نظم بھی لکھ دی تھی جس میں شروع سے آخر تک ایک لفظ "جنون" کی تکرار تھی۔ ترقی پسند تحریک پرجوش اور حوصلہ مند باغی اور انقلابی ادیبوں کی چلائی ہوئی تھی۔ اُن کی حوصلہ مندی، بغاوت اور انقلاب پسندی چند سماجی عقائد پر راسخ ایقان کا نتیجہ تھی جس کی وجہ سے زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویّہ پیدا ہوا۔ سماجی، طبقاتی اور بین الاقوامی شعور جاگ رہا۔ نفسیات سے واقفیت بڑھی۔ فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ کے نظریات کا دخل وعمل شاعری میں ہونے لگا۔ مختلف نظریات وعقائد کے ٹکرانے سے پیدا شدہ شعور منظر کے میں حقیقت کی جستجو کی گئی۔ آڈن اور ایلیٹ کے کھوئے ہوئے تفکر، فرائڈ اور ژونگ کے جنسی نظریات، مارکس، لاشعور اور کینیز کے معاشی اصول، سائنسی فضاؤں میں روایات اور عقائد و ایقان کی بندشوں سے آزاد و آوارہ انسانی ذہن کے پیدا شدہ ہیجانات اور تضادات کو پیش کرنے کے لئے مبہم اور گنجلک اسلوب بیان تلاش کیا گیا۔ ن۔م۔ راشد، تصدق حسین خالد، عبدالمجید بھٹی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مہدی علی خاں، ڈاکٹر تاثیر اور میراجی نے آزاد نظم کو اپنا کر اسلوب اور ہیئت کا تجربہ کیا۔ ان کے علاوہ الطاف گوہر، شریف کنجاہی، محمد صفدر، مختار صدیقی، وشوامتر عادل، انجم رومانی، فکر تونسوی، سلام مچھلی شہری، اعجاز، ضیاء الاسلام، منیب الرحمٰن، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، خلیل الرحمٰن، وامق اور علی جواد زیدی وغیرہ دوسرے شعراء نے بھی اس صنف کو اپنایا۔ اسلوب اور ہیئت کے بے شمار نئے نئے تجربے کئے اور اردو شاعری کو نئے فارم عطا کئے۔ لیکن اس تجرباتی دور کا یہ المیہ ہے کہ بے شمار شعراء اور کئی ایک [illegible] اپنے تجربات کا آپ شکار ہوگئے اور ان کی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار نہ آسکیں۔ ان میں سے اکثر نے میر کے رنگ [illegible] ہی میں عافیت دیکھی۔

[illegible] کے نقوش (لاہور) میں علی عباس حسینی نے اپنے مضمون 'عظیم بزبان کلیم' میں لکھا ہے۔

"ہم ہمیشہ سے اپنی عقل سے زیادہ اپنے تعلیمی نصاب پر بھروسہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ یہی کافی سمجھا کہ ہماری درسی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اور ہمارے مدرسوں نے ہمیں جو پڑھایا ہے۔ چنانچہ ہم عربی وفارسی پڑھتے تھے تو معنی وبیان کے نکات ان ہی زبانوں سے مستعار لیتے تھے، اب انگریزی پڑھتے ہیں تو شعر وادب کی ساری تعریفیں یورپ سے پارسل منگاتے ہیں ۔۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں ہم اپنی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے۔ آج کل چونکہ ہندی کا بول بالا ہے۔ اس لئے ہمیں ہندی شاعری کے اسلوب کا جامہ پہننے میں بھی تامل کرنا نہیں چاہئے۔ کچھ لوگ تو نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو زبان ہی کو ہندی کے حوالے کرنے پر مصر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اس کی صرف ایک صورت ہے اور وہ ہے دیوناگری رسم الخط۔ بہرحال مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ یہاں مجھے آج کی شاعری کے لئے کس FORM کی ضرورت ہے؟ اس سوال پر کچھ کہنا ہے۔

اردو شاعری کو عصری میلانات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے گزشتہ ایک صدی کے عرصے سے فارم اور ہیئت کا مسئلہ ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس مدت میں ہم نے وقتاً فوقتاً اٹھنے والے مختلف مسائل کے موثر حل ڈھونڈ نکالے ہیں۔ لیکن یہ ہیئت کا مسئلہ ہنوز معرضِ بحث میں ہے۔ اب تک کوئی تشفی بخش حل نہیں ڈھونڈا جاسکا ہے۔ علی گڑھ میگزین کے حالیہ شمارے میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے "اصناف سخن کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں ہیئت کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے

---

۱ شہر سخن جلد اوّل ص

انھوں نے لکھا ہے :-

"یہ دور ایک عجیب و غریب کرب کا دور ہے۔ زندگی کی رفتار یک لخت جتنی تیز ہو گئی ہے اتنا تیز چلنے کے ہم عادی نہیں ہیں۔ اس لئے چلنے کے حوصلے کے باوجود تھکن کا ایک احساس ہے۔ اس لئے آج ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس حوصلہ اور تھکن کا اظہار کرنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ زندگی کی بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل نے تنہائی کا جو احساس دیا ہے اُسے کس طرح ظاہر کیا جائے۔ ہم سناٹے کے ایک بھنور میں ہیں۔ یہی بھنور ہمارا موضوع بھی ہے .... اب ایک طرف فرد اور اُس کی تنہائی ہے اور دوسری طرف چاند تک پھیلی ہوئی یہ دنیا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کا اظہار برابر کے دو مصرعوں میں کیسے ہو سکتا ہے ..... کیوں نہ آزاد نظموں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے اور کیوں نہ ان آزاد نظموں میں اپنے لوک گیتوں کی موسیقی کے ارتعاش کو مقید کرنے کی کوشش کی جائے۔"

موجودہ زمانہ میں انسان اُس کے ماحول اور اُس کے مسائل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد راہی معصوم رضا نے اِس دور کو چھوٹے چھوٹے گیتوں اور مختصر نظموں کا دور بتایا ہے۔ وہ آزاد نظموں میں لوک گیتوں کی موسیقی، کا ارتعاش بھر کر ایک جدید اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میں اُن کی اس بات سے متفق ہوں کہ غزلیں آجکل کی مخصوص فضا میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارے افکار میں عصری مسائل اور وقتی رجحانات کا مکمل عکس ہونا ضروری ہے اور یہ انعکاس غزلوں کے مقابلے میں چھوٹے گیتوں اور مختصر نظموں میں زیادہ بھرپور اور مکمل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اِن گیتوں اور آزاد نظموں کے FORM کا سوال ہے اس سلسلہ میں موجودہ آزاد نظمیں بے حد مفید ہوں گی۔ لیکن راہی نے ان نظموں میں لوک گیتوں کی موسیقی کا سہارا لینے کی جو رائے دی ہے میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ بیشتر لوک گیتوں کی موسیقی طربیہ ہے۔ بیشتر کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ 'بابل' اور 'ماہیے' کے غم انگیز گیت اور آلہا اودل کا رزم نامہ بھی لوک گیتوں میں شامل ہیں۔ ایسی صورت میں ہم حوصلہ اور تھکن، تنہائی اور بھیڑ بھاڑ کے متضاد رجحانات کو طربیہ موسیقی کے سہارے ظاہر کر کے مقبول بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس قسم کے دو ایک یا چند گیت تو کامیاب و مقبول ہو سکتے ہیں لیکن ایک جامع اور مکمل اسلوب کے طور پر اس طرز کو اپنانا ناممکن ہوگا۔ دوسرے یہ کہ جب ہم مروجہ نظموں کے سلسلے میں بحور و اوزان، ردیف و قوافی کی بندشیں توڑ چکے ہیں تو خواہ مخواہ لوک گیتوں کی موسیقی کو اپنے اُوپر کیوں مسلط کریں۔ راہی صاحب نے اپنے مضمون کے شروع میں خود بھی لکھا ہے کہ "نثر کے اس دور میں پابند شاعری کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے۔" اسکا مطلب لوک گیتوں کی موسیقیت کو اپنانا کیا دانشمندی ہوگی۔ لوک گیتوں کی موسیقی کو اپنانے کا مطلب ہے ایک کا ترک اور دوسرے کا اختیار۔ اس نئے FORM کو اپنانے کے بجائے اگر ہم اپنے جانے پہچانے FORM ہی کو زندہ رکھیں تو کیا بُرا ہے؟ اور اگر اسے زندہ رکھنا ممکن نہیں ہوسکتا تو پھر کسی نئی پابندی کے عائد کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم بالکل آزاد ہو جائیں اور اپنے موضوع کے گرد چکر کھانے کے بجائے صاف اور سیدھی بات کرنا شروع کریں۔

آزاد نظموں کے سلسلے میں ہم نے بزرگوں کی نکتہ چینیوں اور اعتراضات کے جواب میں کہا تھا کہ جدید خیالات کے موثر اظہار کا یہ مناسب اسلوب ہے اور اب نئی بندشیں عائد کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ آزاد نظموں کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں کئے گئے اب تک کے سارے تجربات ناکام رہے ہیں۔ لیکن یہ بات حقیقت سے بہت دور ہوگی۔ ہمارے بہت سے شعراء جنھوں نے آزاد نظموں میں اظہار و بیان کو موضوع اور مواد سے مربوط اور ہم آہنگ کیا ہے، آج بھی کامیاب شاعری کر رہے ہیں۔ عمیق حنفی، شہزاد احمد، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، [illegible]، حبیب تنویر، راہی معصوم رضا، سلام مچھلی شہری وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے مختلف لب و لہجہ میں مغرب کی علامتی شاعری سے کسب فیض کرتے ہوئے ہندوستانی اساطیر، ماحول اور معاشرے سے ہم آہنگ، بدلتے ہوئے عہد کی ترجمان میں کامیاب نظمیں تخلیق کی ہیں۔

لوک گیتوں کے رد عمل سے ممکن ہے شاعری عوام سے قریب تر ہو جائے لیکن عوام میں شاعری کو مقبول بنانے کی یہی ایک واحد صورت تو نہیں۔ فلمی گیتوں کے گیت [illegible] مقبولیت یہ ثابت کرتی ہے کہ ہماری شاعری نئے رجحانات کے ساتھ بھی غزلوں کے روپ میں باقی رہ سکتی ہے۔ راہی صاحب کی طرح میں بھی غزل کو بڑی پیاری چیز سمجھتا ہوں [illegible] غزلیں لکھتا ہوں لیکن

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

ڈاکٹر نسا پروین عالم

ادب اور جمالیات

ادب اور جمالیات میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ بغیر جمالیاتی اقدار کے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جمالیاتی اقدار ہی کسی تحریر کو فن و ادب کے دائرے میں لانے کا سبب بنتی ہیں۔ بعد ازاں اس تخلیق کا مقام و مرتبہ متعین کیا جاتا ہے۔ جمالیات ادب اور فنون لطیفہ کی بنیادی قدروں میں سے ہے۔ اس لئے ادب اور جمالیات کے تعلق کی وضاحت سے پہلے جمالیات کی حقیقت و اصلیت اور واقفیت و ماہیت سے آگہی ضروری ہے۔

احساسِ حسن انسان کے بنیادی جبلی تقاضوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حسن اپنی ابتدا میں ایک داخلی اور روحانی کیفیت کا نام ہے جس سے انسان حسب ضرورت استفادہ کرتا ہے اور روحانی تشنگی کے لئے تسکین حاصل کرتا ہے۔ چونکہ احساسِ حسن انسان کا فطری اور جبلی خاصہ ہے اس نے اس نے ہر دور میں حسن کے اثرات قبول کئے ہیں اور حسن کی اصلیت و ماہیت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حسن کے نظریات میں اتنے اختلافات ہیں کہ قطعیت کے ساتھ اس کی جامعیت کا اندازہ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ کوئی اسے قطعی داخلی، انفرادی اور روحانی کیفیت سمجھتا ہے اور کوئی اس کو اجتماعی، خارجی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ریاض الحسن اس سلسلے میں والٹر پیٹر کا خیال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حسن کی جامع تعریف ممکن نہیں کیونکہ حسن محض ایک انفرادی کیفیت کا نام ہے جس سے عام قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" بہرحال! جمالیات کا فلسفہ حسن ہی کی مختلف کیفیات و واردات کی تشریح و تعبیر ہے۔

مجنوں گورکھپوری "تاریخِ جمالیات" میں رقم طراز ہیں کہ "فلسفے کی حیثیت سے جمالیات کی ابتدا سب سے پہلے یونان میں ہوئی یونانی مفکرین نے علم کائنات COSMOLOGY نفسیات PSYCHOLOGY اور مقصدی افعال انسانی کا نظریہ THEORY OF PURPOSE یا HUMAN ACTIVITY کے پہلو بہ پہلو حسن و جمال کے مختلف مظاہر و اثرات کا مطالعہ کیا" اس کے بعد حسن و جمال کے مختلف نظریات پیش کئے گئے لیکن باضابطہ فلسفہ کی حیثیت سے AESTHETIC جمالیات کی اصطلاح فلسفۂ حسن کے معانی و مطالب میں جیوم اور بام گارٹن کے وقت سے مستعمل ہوئی۔ بالخصوص بام گارٹن نے فلسفۂ جمالیات پر بڑی تفصیل و تشریح سے نظر ڈالی۔

اردو میں جمالیات کی اصطلاح تقریباً نئی ہے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ "جس انگریزی لفظ کے جواب میں یہ اردو لفظ گڑھا گیا ہے اس کا یہ صحیح مترادف نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں ASTHETICS جمالیات سے کہیں زیادہ جامع اور بلیغ ہے ASTHETICS کے معنی ہر اس چیز کے ہیں جس کا تعلق حس سے بالخصوص حسِ لطیف سے ہو۔" پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر اس اعتبار سے AS-THETICS کا ترجمہ کیا جائے تو حسیات، یا وجدانیات، اس کی بہترین اصطلاح ہو۔ مگر 'حسیات' سے خیال 'نفسیات' کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور 'وجدانیات' سے تصوف کی طرف۔ اور ASTHETICS کا ان سے کوئی خاص تعلق نہیں۔" ASTHETICS جمالیات حسن اور فنون لطیفہ کا فلسفہ ہے یعنی مفکرین کے وہ نظریئے جو حسن کے مظاہر و آثار اور فنون لطیفہ کی ماہیت و اصلیت کے سلسلے میں پیش کئے گئے ہیں جمالیات کہلاتے ہیں۔

بہرحال! یہ بات قطعی ہے کہ انسان فطری طور پر حسن کی نیرنگیوں سے کسب لطف و انبساط کرتا ہے۔ حسن پرستی چونکہ اس کی جبلی خصوصیت ہے اس لئے وہ عالمِ خارجی کی مختلف اشیاء میں حسن کی تلاش و جستجو کرتا ہے اور اپنے فطری احساس جمال کی تسکین چاہتا ہے

ادبیات و فنونِ لطیفہ میں بھی انسان حُسن کے عناصر کی جستجو کرتا ہے۔ اِس لئے اب یہ دیکھنا ہے کہ فنونِ لطیفہ کا حُسن سے کیا تعلق ہے؟

یہ بات طے شدہ ہے کہ فنونِ لطیفہ اور حُسن و جمال الگ شے نہیں ہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن بڑی حیرت انگیز اور افسوسناک بات یہ ہے کہ قدیم یونانی مفکرین حُسن اور ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہیں۔ وہ اصل تزکیۂ اخلاق اور جستجوئے حُسن ہی کو وہ لوگ حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک خیالِ حُسن کی اہمیت نہیں۔ بلکہ حُسنِ عمل ہی سب کچھ ہے۔ اِس لئے اُن کے نزدیک حُسن کوئی مفید اور کارآمد شے نہیں۔ چنانچہ سقراط اور افلاطون بھی حسین چیزوں میں افادیت کے متلاشی ہیں، اور اگر کسی شے سے افادیت کا تصور وابستہ نہیں تو اُن کے نزدیک وہ حسین نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ حکماء نے فنونِ لطیفہ کو بھی لغو اور لاطائل سمجھ کر اُسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ اُن کے نزدیک حُسن کا تصور خیر اور حقیقت سے وابستہ ہے۔ لیکن یونانی حکماء میں ارسطو کے بعد ابیقوریوں کا گروہ حُسن کو صرف کسبِ لذت و نشاط کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ فلسفیوں کا یہ گروہ رُوح اور جسم دونوں کو مادی سمجھتا ہے۔ اِس لئے اُن کی زندگی کا نصب العین بھی لذتیت و نشاطیت ہے۔ اُن کے بعد رواقی STOICS مفکرین آتے ہیں۔ جنھوں نے زندگی کا مقصد ہی "خیرِ اعلیٰ" کو سمجھا اور حُسن و جمال کا تعلق نظامِ اخلاق سے وابستہ کر دیا۔ اِس لئے اُن کے نزدیک بھی فنونِ لطیفہ بے اصل اور بے سُود چیز سمجھی گئی۔ اِس کے بعد اشراقین حکماء کا دور آتا ہے۔ مفکرین کے اِس گروہ نے جمال و حُسن کو روحانیت و ماورائیت کا ہم معنی سمجھا۔ سینٹ آگسٹین نے حُسن و جمال کا قدرے بسیط اور متنوع نظریہ دیا۔ وہ وحدتِ وجود کا قائل تھا۔ اِس لئے موجودات کی ہر شے میں حُسن دیکھتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ قبیح اور بد صورتی کو بھی حُسن سے تعبیر کرتا ہے۔ سترہویں صدی میں بیکن BACON نے بھی حُسن کو حصولِ لذت و نشاط کا ذریعہ سمجھا۔ وہ عقلیت و تجزئیت سے علیحدہ حُسن کا تصور نہیں کرتا۔ اُس کے ہم عصر ڈیکارٹ نے بھی اُس کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ اٹھارہویں صدی میں ہیوم نے حُسن کا افادی نظریہ پیش کیا۔ لیکن اِس افادی نظریہ میں بھی وہ اجتماعی شعور کا قائل ہے۔ یعنی اُس کے نزدیک حُسن اُس شے میں ہے جو اجتماعی نظامِ حیات کے لیے مفید ہو۔ بام گارٹن احساسِ حُسن کو محسن اور ادراکِ حُسن کو حقیقت سے تعبیر کرتا ہے یعنی وہ حُسن اور حقیقت کو ایک ہی شے سمجھتا ہے۔ وائیکو VICO حُسن کے انفرادی شعور کا قائل ہے۔ اور مابعد الطبیعات کو قدرے اُس کی ضد سمجھتا ہے۔ اِس لئے اُس کے نزدیک حُسن لذت گیری کا ایک ذریعہ ہے۔ کانٹ جو وجدانیت اور عقلیت کی کشمکش میں اُلجھ کر رہ گیا تھا حُسن کو منطق سے الگ ہو کر دیکھتا ہے۔ وہ حُسن کو موجود فی الذہن تسلیم کرتا ہے۔ لیکن شلر نے اُس کے نظریہ سے اختلاف کیا۔ وہ کہتا ہے کہ حُسن زندگی میں ہر طرف موجود ہے جو فنونِ لطیفہ میں اپنے حسین اظہار کی وجہ سے اور نکھر جاتا ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ میں صرف جمالیات کی جستجو کرتا ہے۔ ہیگل فنونِ لطیفہ میں حُسن کے وجدانی ادراک کو اہمیت دیتا ہے۔ شوپنہار فنونِ لطیفہ میں اخلاقی اقدار و محاسن کا جویا ہے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں زندگی کی مسلسل اور پیہم جبریت سے نجات اِسی طرح ممکن ہے۔ اطالوی مفکر کروچے نے مابعد الطبیعات اور تصوف کی بنیاد پر جمالیات کا نظریہ پیش کیا۔ اُن کے نزدیک حُسن کا تصور وجدان سے منسلک ہے۔ اِس لئے حُسن میں افادیت، اخلاقیت یا لذتیت کی جستجو گمراہ کن ہے۔ یہ صرف وجدانی احساسات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ میں بھی افادیت و اخلاقیت کے بالکل خلاف ہے بلکہ اس کو وجدانی کیفیات و واردات کا مکمل و منظم اظہار سمجھتا ہے۔ اُس کا تصورِ حُسن متصوفانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کی رُوحانی قدر کو اہمیت دیتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف مفکرین نے حُسن و جمال کے بہت ہی مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ اور فنونِ لطیفہ اور حُسن و جمال کے گہرے ربط پر بڑی نکتہ پردازی کی ہے۔ اِس لئے حُسن و جمال کا فلسفہ بے حد بحث طلب ہے۔ مگر یہ بات تمام حکماء نے مان لی ہے کہ فنونِ لطیفہ اور ادبیات ہر دور میں حُسن و جمال سے گہرے روابط رکھتے رہے ہیں۔ یعنی جمالیات اور ادبیات کو ایک دُوسرے کا تکملہ سمجھنا چاہیئے۔

درج بالا سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کچھ لوگ ادب میں تکنیک اور ہیئت FORM سے حُسن کو وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی اُن کے نزدیک ادب کی صورت گری، پیکر تراشی اور تشکیل و تجسیم کے عمل میں حُسن ہوتا ہے [illegible] اس نظریہ کا حامل ہے

کہ آرٹ میں حُسن و جمال رنگ و خط کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریے کے حامی ادب میں حُسن صرف اس کی ظاہری ہیئت و اسلوب میں دیکھتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے ادب میں موضوع اور مواد کے اندر حُسن کا جلوہ دیکھا۔ اور حُسن کو افادیت، مقصدیت اور اخلاقیات سے الگ کوئی حیثیت نہیں دی۔ مثلاً WILLIAM MORRIS ولیم موریس کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ میں افادیت اور حُسن دو الگ شے نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے آرٹ یا فن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسین بھی ہو اور کارآمد بھی۔ کچھ لوگوں کو فن میں بلند روحانی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس میں بلند اخلاقی اقدار کے متمنی ہوتے ہیں۔ اور اس بات کے مدعی ہیں کہ چونکہ آرٹ کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے اور اخلاقیات کا مقصد زندگی کی تحسین ہے۔ اس لئے آرٹ میں اخلاقی اقدار کا وجود ضروری ہے۔ یونان کے قدیم حکماء کے یہاں بھی "حُسن" اور "نیکی" ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ اسی بنا پر وہ حُسنِ جمال اور حُسنِ قدرت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ نتیجتاً وہ بھی فنونِ لطیفہ میں "خیر گی" کی تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے نظریات کے ماننے والے ادب میں موضوع اور مواد کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ سقراط اور افلاطون آرٹ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حُسن خیر اور حقیقت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور آرٹ یا فن فطرت یا نیچر کی نقل ہیں۔ اور چونکہ فطرت بھی عالمِ مثال کی اشیاء کی ناقص نقل ہے۔ اس لئے فنونِ لطیفہ میں حُسن و جمال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن ارسطو نے افلاطون کے اس خیال میں ترمیم کی اور کہا کہ حُسن اس کیفیت کا نام ہے جس سے انسان تلذذ اور انبساط حاصل کرتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ادب میں حُسن کی اہمیت کا اقرار کیا ہے وہ لوگ دو مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ ادب کی ہیئت اور اسلوب میں حُسن تلاش کرتے ہیں۔ اور ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ اور کچھ لوگ ادب اور افادیت کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ادب کے موضوع اور مواد اور اس کی داخلیت کے حُسن ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

بہرحال! ان ساری بحثوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فنونِ لطیفہ اور ادبیات میں حُسن و جمال کے عناصر کی موجودگی سے انحراف ممکن نہیں کیونکہ یہی خصوصیت ادب کو ادبیت کے دائرے میں لاتی ہے۔ البتہ حُسن کی داخلی اور خارجی اقدار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ محرکات کے اعتبار سے ادیب عالمِ خارج کا پابند ہوتا ہے اور اظہار کے اعتبار سے بھی اس کو خارجیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن فن و ادب کی تخلیق فنکار کے ذہن و دل میں ہوتی ہے۔ یہ ایک لطیف داخلی و روحانی عمل ہے۔ جس میں جذبات و احساسات کی شعلگی بھی شامل ہے اور ادیب کے تجرباتِ حیات کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ جن کا اظہار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تخلیق میں ہو جاتا ہے۔ اور اسی منزل میں ادب اجتماعی شعوریات کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔ اس لئے اس کی افادی اہمیت بھی کم نہیں۔ اور اس اعتبار سے موضوعِ فن کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور فن کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی اور کائنات کی ممتاز قدروں کی آئینہ داری کرے۔ اور انتخاب، تجزیہ، مشاہدہ اور موضوع و مواد میں سنجیدگی، متانت اور عظمت کا خیال رکھے۔ اس لئے کہ ان کی غیر موجودگی میں ادب آفاقی و کائناتی نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرے درجے کی تخلیق ہو کر رہ جائے گا۔ اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود ادب میں ایک خصوصیت اور ہوتی ہے جو اس میں دلنشینی، جانگدازی، رعنائی، لطافت، نزاکت اور شیرینی پیدا کرتی ہے۔ وہ خصوصیت اس کے صوری اور ظاہری حُسن میں ہے۔ یعنی اسلوب و ہیئت کی دلکشی و دلچسپی ہی آرٹ کو غیر فانی، لازوال، ابدی اور دائمی بناتی ہے۔ یہیں سے ادب میں مواد، موضوع اور اسلوب و ہیئت کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ یعنی ادب میں مواد اور موضوع زیادہ اہم ہیں کہ اسلوب و ہیئت۔ یہ مسئلہ بجائے خود بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ مختصراً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ ادب مواد، موضوع اور ہیئت و اسلوب کے دلکش امتزاج و انضمام کا نام ہے۔ یعنی ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ کیونکہ دونوں اپنی اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مواد اور موضوع کی حیثیت روح کی ہے جو اپنے اظہار کے لئے مادی پیکر کی محتاج ہے۔ ادب کی روح کا یہ مادی پیکر اسلوب و ہیئت میں۔ جس طرح حسین و جمیل جسم میں حسین روح کی موجودگی شخصیت کی جاذبیت میں چار چاند لگا دیتی ہے اسی طرح حسین و جمیل موضوع و مواد جب حسین و دلکش پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں تو ادیب کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ موضوع اور مواد عالمِ خارج کے تابع ہوتے ہیں اور معاشرتی میلانات اور سماجی رجحانات کے پرداختہ ہوتے ہیں اور ہیئت و اسلوب ادیب کی داخلیت و انفرادیت کے پروردہ لیکن ان دونوں عناصر کا حسن کارانہ اور فنی استعمال ہی آرٹ کا کمال ہے۔ حُسن کاری کی کوشش میں ادیب جادۂ سخن کی منزل سے گزرتا ہے اور بقول اختر اورینوی وہ ایک صلیب بدوش پیغمبر کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے چلتا ہے۔ وہ محفلِ آب و گل سے تجربات و مشاہدات حاصل کرتا ہے اور ان کا اثرات

تبدیل کرتا ہے۔ یہ صلاحیت فطری اور مستقل ہوتی ہے لیکن حسن کش کا مرحلہ ادیب کے ذوق و میلان کی پرورش و تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ الفاظ جذبات و محرکات و میلانات کو لفظوں کے ذریعے وجودیت عطا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ الوہیت اور خلاقی کی صفت رکھتا ہے۔ لفظوں کی ترکیب جدید بھی فن کا معجزہ ہے۔ مگر صرف الفاظ و تراکیب کے حسن سے ادب میں آفاقیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ آرٹ بیانش آئینہ جمال ہے۔ نگارخانۂ ادب میں ہر شے کو حسین ہونا چاہیے اور اس کے لئے ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ مگر صرف کاریگری ادب نہیں ہے۔ ادب ویسے تا ب تک پہنچے ہوئے انسان کی لفظی تصویر ہوتا ہے۔ ادب میں جمالیات ایک رُوحانی کیفیت کا نام ہے۔ جو داخلی تخیل، جذبہ اور تفکر کے باہمی امتزاج سے مترتب ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں ادب اور جمالیات کا مسئلہ جب اُٹھتا ہے تو ادب کے فنی تقاضوں کو جمالیاتی اقدار کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی گمرہی ہے۔ ادب کے فنی تقاضے اس کی ہیئت اور اسلوب کے اصول ہیں۔ جن کے دائرے میں رہ کر فن کار ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ ادب کی صرف ظاہری خارجی ہیئت میں حسن کی اقدار کی جستجو جمالیات کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ آدبی بحثوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ موضوع فن میں بھی جمال و حسن کی اقدار موجود ہیں اور ان کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ حسن کا مفہوم کسب لذت و نشاط کے سوا اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ حالانکہ ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ حسن صرف لذتیت و نشاطیت کا نام نہیں بلکہ اس میں گرانقدر سماجی اور معاشرتی افادیت کا تصور بھی پنہاں ہے۔ اس صورت حال میں صحیح نظریہ یہی ہے کہ ادب کے دونوں پہلوؤں میں حسن و جمال کی اقدار کا پتہ لگایا جائے یعنی موضوع اور فن دونوں کو حسن کے وسیع اور رسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ مگر اکثر ناقدین ادب میں جمالیات کے مفہوم کو صرف اسلوب اور ہیئت میں محدود کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کروچے جیسا خالص جمال پرست جو حسن و جمال کا ماورائی نظریہ رکھتا ہے اور اس میں اخلاقیات و مقصدیت کی تلاش کو ناجائز سمجھتا ہے۔ کہتا ہے کہ فن میں مواد ضروری ہے۔ کیونکہ مواد کی عدم موجودگی میں فنی صورتگری کس چیز کی ہوگی؟ یعنی وہ فن میں مواد کی اہمیت کو فراموش نہیں کرتا۔ اس لئے میرے نزدیک ادب میں جمالیاتی اقدار کی تلاش موضوع اور فن دونوں جہتوں میں ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ عظیم اور پائدار تخلیقی ادب وہی ہے جس میں موضوع اور ہیئت و اسلوب کے مابین متوازن و متناسب جمالیاتی ہم آہنگی اور امتزاج ہو۔ کیونکہ جمالیاتی اقدار کی عدم موجودگی کسی تخلیق کو ادبی نہیں رہنے دے گی۔ خواہ اس کی کمی موضوع فن میں ہو یا اصول فن میں۔ تندرست اور حسین جسم میں اگر کثیف اور آلودہ رُوح ہو تو وہ قابل تحسین نہیں۔ حسن صورت گری کی عالمگیریت سے انکار نہیں لیکن حسن سیرت کی ابدیت بھی بہت اہم ہے۔ ادب میں صرف جسم یعنی ہیئت و اسلوب کی دلکشی کو جمالیات سے تعبیر کرنا اور اس کی معنویت یعنی شعور کے حسن کو نظرانداز کر دینا بڑا ظلم ہے۔ ادب میں جمالیات کا مفہوم میرے نزدیک یہی ہے کہ تجربات و مشاہدات کے حسن کو پیش نظر رکھتے ہوئے وسیلۂ اظہار کے حسن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور یہی ادب اور جمالیات کا صحیح نظریہ ہوگا۔

(جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ بقیہ صفحہ ۱۱ کا)

یہ بات طے شدہ ہے کہ غزلیں اس دور میں زندہ تو رہ سکتی ہیں مگر زندگی کی ترجمانی اور اس کے ذریعے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔ حکایت بیدگفتن کی چیز کسی نہ کسی صورت میں لگ ہی جاتی ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کا واحد حل ہیں نظمیں۔ اب رہا ان نظموں کی ہیئت یا FORM کا سوال، تو ہماری آزاد نظم میں وہ امکانات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ جو بیک وقت حوصلہ و تمکن اور بعید و بے جا کی کیفیات کو بغیر کسی خاص جبر کے بالکل یا بہ شعری قالب میں ڈھال کر خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں بعض لوگ گیتوں کے ارتقاء کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آزاد نظم کو مکمل اور سہل تر بنانے پر اسلوب بیان بنانے کی جرأت کی حاجت ہے۔ سجاد ظہیر نے اس جرأت کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے آزاد نظم کو مکمل آزادی دے کر ایک نیا تجربہ کیا۔ آج کی شاعری کے لئے یہ FORM نہایت ہی کامیاب ہے۔ اس کامیابی کا ثبوت ہیں وہ آزاد نظمیں جو کل شدت سے لکھی جا رہی ہیں ہمارے نئے شعراء اس طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سجاد ظہیر کا تجربہ ہر طرح سے کامیاب رہا۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ تجربہ آئندہ بھی کامیاب رہے گا اور مستقبل قریب میں لوگ اسی کو "فن" بنائیں گے۔ اگر یہ اسلوب رائج ہو گیا تو شعراء کو مزید تجربات کی زحمت نہیں اٹھانی ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ ان تجربات کے دھندلکوں میں اپنی صلاحیتوں کا نابود کر دینے والے نظم اور ان کی صلاحیتوں سے بھی اردو ادب مستفید ہو سکے گا۔

(انٹرویو) محی الدین احمد

قاضی عبدالودود سے تحقیق کے متعلق چند سوالات

اگست ۱۹۶۰ء سے اپریل ۱۹۶۳ء تک میں بسلسلۂ ملازمت عظیم آباد میں مقیم تھا اور اردو، فارسی اور عربی میں ایم۔اے کرنے کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ تین سال کے اس زمانۂ قیام میں زیادہ سے زیادہ وقت میں مکرمی پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب اور محبی پروفیسر علی حیدر نیّر کی صحبت میں گزرتا تھا۔ ایک دن پروفیسر علی حیدر صاحب نے مشورۃً مجھ سے فرمایا کہ آپ انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بجائے اردو میں پی۔ایچ۔ڈی کیوں نہیں کرتے؟ میں نے جواب میں کہا، مشورہ تو نیک ہے مگر اس کے لئے ایک لائق رہنما کی ضرورت ہے جو مجھے حاصل نہیں۔ انھوں نے کہا اگر آپ اس سلسلے میں اپنی آمادگی کا اظہار کریں تو میں قاضی عبدالودود صاحب کی خدمات آپ کے لئے حاصل کر لوں گا۔

قاضی صاحب کا نام سنتے ہی اُن کا وہ مقالہ میری نظروں میں پھر گیا جو انھوں نے کچھ ہی دن پہلے ہندوستان کی باون مختلف یونیورسٹیوں میں ادب اردو میں ریسرچ کئے جانے والے مضامین پر تحریر فرمایا تھا اور جو "ہماری زبان"، علی گڑھ اور غالبؔ "شاعر" بمبئی میں شائع ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اُن کی ذات و شخصیت کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں میرے ذہن پر یکے بعد دیگرے اُبھریں۔ مثلاً یہ کہ اُن کی محققانہ بصیرت اپنی جگہ مسلّم مگر اُن کی باتیں اُکھڑی اُکھڑی ہوتی ہیں۔ وہ بلاشبہ پابندیٔ وقت کا خاص خیال رکھتے ہیں مگر مذہب سے سخت بیزار ہیں۔ جہاں نواز ضرور ہیں مگر محترم شخصیتوں کا احترام نہیں جانتے۔ نئے لکھنے والوں کی خوب ہمت افزائی کرتے ہیں مگر خود پر تنقید برداشت نہیں کرتے۔

غرض اُن کی شخصیت کے متعلق اِن معلومات کے ساتھ ۸؍ اپریل ۱۹۶۳ء کی ایک شام پروفیسر علی حیدر نیّر کی معیت میں قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور رسمی بات چیت کے بعد علی حیدر صاحب نے اُن سے میرا تعارف اِن الفاظ میں کرایا "ان کا نام محی الدین احمد ہے۔ آڈیٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہونے کے باوجود انھوں نے اردو، فارسی اور عربی میں ایم۔اے کیا ہے اور اب آپ کی رہنمائی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتے ہیں۔" قاضی صاحب نے میری ہمت افزائی فرمائی اور کہا کہ حیرت ہے آپ نے طبیعت اور پیشے کے تضاد کے باوجود اپنے علمی ذوق کو برقرار رکھا۔ پھر انھوں نے مجھے تیسرے دن چار بجے شام کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تاکہ تحقیق کے متعلق تفصیل سے گفتگو ہو سکے۔

تیسرے دن وقتِ مقررہ پر جب میں تنہا اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ میرا ہی انتظار کر رہے ہوں۔ اُس دن میں نے انھیں پہلے دن کے مقابلہ میں زیادہ خاطر مدارات کے ساتھ دلداری و دلجوئی کرتے ہوئے محسوس کیا۔ جس شفقت و محبت کے ساتھ وہ مجھ سے دو گھنٹے تک محوِ گفتگو تھے اور میرے سوالوں کا تشفی بخش جواب دے رہے تھے میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ اُن کے اور میرے درمیان جو گفتگو ہوئی اُسی کی افادیت کے پیشِ نظر میں چاہتا ہوں کہ تحقیق سے متعلق اُن کے نظریات و تصورات کو اپنے الفاظ میں پیش کر دوں تاکہ محققینِ ادب کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکیں۔

س: میری آمدنی نہایت قلیل اور ذمہ داریاں بہت ہیں، اس لئے آپ میرے لئے کوئی ایسا موضوعِ تحقیق منتخب فرمائیں جس پر مصارف کم سے کم ہوں اور زیادہ وقتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ نہ کرنا پڑے۔

ج: آپ مصحفی کے تیسرے دیوان کو ایڈٹ کریں۔ یہ آپ کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہوگا۔ اب تک اس کے تین ہی نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ تو آصفیہ لائبریری میں ہے دوسرا رامپور اور تیسرا لاہور میں۔ علاوہ ازیں مصحفی کے دیگر دیوانوں کے

مقابلے میں ضخامت بھی کچھ زیادہ نہیں۔ اس میں مصارف بھی کم آئیں گے اور آپ کو زیادہ زحمت بھی نہیں اٹھانا پڑے گی۔

س: تحقیق کے سلسلے میں محقق کو کن باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے؟

ج: اہلِ تحقیق کے پیشِ نظر کون سی باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے بتانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ تحقیق کیا چیز ہے؟ تحقیق حقیقت میں نئی حقیقتوں کی تلاش اور جستجو ہے۔ محقق حقائق کی روشنی میں نئی نئی حقیقتوں کی کھوج لگاتا ہے اور اُسے دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

س: ایسا تو مورّخ بھی کیا کرتے ہیں۔

ج: مورّخ معلوم حقیقتوں میں اپنی رائے سے رنگ آمیزی کرتا ہے اور محقق نامعلوم حقیقتوں کو حقائق کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔

س: حقیقت تو صرف ایک ہی ہوگی پھر نامعلوم اور نئی حقیقتوں کی دریافت کیا معنی؟

ج: مضمونِ تحقیق کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اِن مختلف پہلوؤں میں مختلف حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِن مختلف پہلوؤں کے جن حقائق کی طرف اہلِ تحقیق کی اب تک نگاہیں نہیں پہنچی ہیں اُن حقیقتوں کی نقاب کشائی محقق کا سب سے اہم فریضہ ہے۔

س: تو کیا اہلِ تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ مضمونِ تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر بیک وقت خامہ فرسائی کریں۔؟

ج: مضمونِ تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر بیک وقت خامہ فرسائی کرنے کے بجائے ضروری ہے کہ ایک وقت میں کسی ایک پہلو پر سیر حاصل بحث کی جائے تاکہ اُس کے پہلو کے ہر گوشے سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے اور اُس کا کوئی گوشہ بھی تشنہ نہ رہے۔

س: مضمونِ تحقیق کے مختلف پہلو کیا ہو سکتے ہیں؟

ج: تحقیق کے مختلف پہلو یہ ہیں (۱) لفظی تحقیق (۲) صحیح متن کی تعیین (۳) معلومات کے ماخذ (۴) صحیح مفہوم کا تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی پس منظر میں صحیح تحلیل و تجزیہ وغیرہ۔

س: محقق کے لئے حقیقت کا چھپانا کسی قیمت پر جائز ہے یا نہیں؟

ج: محقق کے لئے حقیقت کا چھپانا کسی بھی قیمت پر جائز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فیصلوں کو لوگوں کے طعن و تشنیع کے خوف سے چھپایا جا سکتا ہے مگر تلخ و طنزیہ لہجے کے بجائے نرم و شگفتہ اندازِ بیان اختیار کیا جائے تو اپنی رائے کو بھی چھپانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

س: تحقیق کے سلسلے میں محقق کو اپنی رائے کے اظہار کی کس قدر ضرورت پڑتی ہے؟

ج: حقائق پر اظہارِ رائے محقق کا حق اور منصب ہے مگر حقائق کی تلاش کے مقابلے میں اظہارِ رائے پر زورِ قلم نہ صرف کیا جائے بلکہ اُسے تحلیل و تجزیہ کی حد تک محدود رکھا جائے۔

س: تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ محقق کو CRITIC BRAIN بھی ہونا چاہئے۔

ج: یقیناً۔

س: محقق تحقیق کے سلسلے میں قیاس آرائی سے بھی کام لے سکتا ہے یا نہیں؟

ج: حقائق کی روشنی میں قیاس آرائی سے کام لیا جا سکتا ہے مگر قیاس آرائی پر اس قدر زور نہ دیا جائے کہ بنیادی حقیقتیں نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔

س: کیا اہلِ تحقیق کو اپنے معلومات کا ماخذ بھی بتانا ضروری ہے؟

ج: معلومات کا مواد تحقیق کی جان ہے۔ اسی کی صحت پر تحقیق کا دارومدار ہے اور محقق کی دیانت داری اور راست بازی کی وقعت کا انحصار۔ اس لئے کسی دوسرے مصنف کے دیئے ہوئے حوالے کے بجائے اہلِ تحقیق کو چاہئے کہ خود اصل ماخذ تک پہنچنے کے لئے سہل انگاری کے بجائے سعیِ بلیغ سے کام لیں۔ حوالے کے وقت نہ صرف مصنف اور کتابوں کے ناموں کا بتانا ضروری ہے بلکہ کتاب کے صفحے اور سطر کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ یہی نہیں کتاب کے ایڈیشن اور پبلشر کے نام کا اظہار بھی ضروری ہے تاکہ اہلِ تحقیق کو کتاب کی تلاش میں

آسانی ہو۔

س : میرے خیال میں تحقیق کے اِس معیار پر اردو کے محقق بہت کم اتریں گے ۔ ڈاکٹر عبدالحق اور نیاز فتحپوری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان کا شمار محققین میں کیا جاسکتا ہے۔

ج : ڈاکٹر عبدالحق اُردو ادب کے محسنِ اعظم اور نیاز فتحپوری اُردو ادب کے منفرد ادیب ہیں تو ہوں مگر میں اُنھیں محققین میں شمار نہیں کرتا ۔ ڈاکٹر عبدالحق سے متعلق تو میں معاصر میں ایک مقالہ سپردِ قلم کر چکا ہوں ۔ نیاز کے بارے میں بھی میری رائے کم و بیش یہی ہے کہ وہ بھی محقق نہیں۔ اُن کی دیانت اور راست بازی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے معلومات کا ماخذ مطلق نہیں بتاتے بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ حقیقت کے مقابلے میں قیاس پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور تحریف و تلبیس سے کام لیتے ہیں۔

س : محقق کے لئے مزید کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ؟

ج : محقق کے لئے قوتِ حافظہ کی بھی سخت ضرورت ہے ۔ اُس کی نگاہ چھوٹی سی چھوٹی خامی پر سخت ہونی چاہیئے ورنہ ایسی حالت میں اُس سے بڑی سے بڑی غلطی بھی سرزد ہو جانے کا احتمال ہے۔

س : تحقیق کا مقصد کیا ہے ؟ اِس کے حصول کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے ؟

ج : تحقیق کا مقصد اُفقِ علم کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے۔ اِس کے حصول کے لئے علمی دیانت، سچی روایت، ادبی اصول، تحقیقی حوالہ اور سب سے بڑھ کر تنقیدی رائے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن حقائق کو تاریکی سے روشنی میں لے آنا ہے، جو سماج کو ترقی کی راہ پر لگا سکتے ہیں۔ اِس طرح ہماری تحقیق ماضی کی یادگار، حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ بھی ثابت ہو سکتی ہے اور ہمارا اُفقِ علم وسیع تر بھی ہو سکتا ہے۔

س : اِن دنوں آپ کس کتاب پر ریسرچ فرما رہے ہیں ؟

ج : میری تحقیق کا محور اِن دنوں مرزا غالب کی لغت ہے۔ بر سبیل تذکرہ اُنھوں نے بتایا کہ غالب عربی سے بالکل نابلد تھے اِس لئے کہ اُن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ واحد مذکر غائب اور واحد مونث غائب کی ضمیروں کا استعمال بھی نہیں جانتے تھے۔

س : کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ کتابت کی غلطی ہو ؟

ج : اِس سلسلے میں مجھے صرف اِس قدر کہنا ہے کہ آپ قیاس سے کام لے رہے ہیں۔ اور میں تحقیق کے ذریعے اِس دریافت تک پہنچا ہوں۔

(بقیہ مکتوبات صفحہ ۵۹)

معاف کیجئے گا، "زہر کون پیئے" نظم سے زیادہ نثر معلوم ہوتی ہے۔ نہ شعریت نہ نغمگی ۔ فلسفیانہ افکار کی تکرار کا نام تو شاعری نہیں ہے۔ مظفر حنفی کی غزل کے اِس شعر میں ۔

بعد از وقت پشیمان کہاں ہوتے ہو
پھول جب توڑ لیا ہے تو مسلنا ہوگا

"کہاں" کا لفظ بے محل ہے ۔ مضمون بھی زیادہ جاندار نہیں۔ البتہ اِسی غزل کا یہ شعر

لوگ حالات پہ یوں طنز کئے جاتے ہیں
جیسے سانچے میں کسی اور کو ڈھلنا ہوگا

بہت بھرپور طنز بھی ہے اور ہمارے افکار و خیالات کا احتساب بھی ۔ یہ شعر بہت پسند آیا۔ جناب ثاقب کانپوری سے ضیا رحمٰنی صاحب کا ہلکا پھلکا انٹرویو دلچسپ ہے۔

آج [illegible] کو گزرے ہوئے تیس برس ہونے کو آئے ہیں میں ذاکر صاحب ہی کے پاس ہوں۔ ہر لمحہ میں اُن کا شریک رہا ہوں اُن کے ہر دکھ درد میں حصہ لیا ہے، اُن کے سب دردوں میں نے اچھی طرح دیکھے ہیں، مجھے آج بھی وہ شام اچھی طرح یاد ہے، جب وہ اپنی بیوی (نرسیندر کی ملکہ، کی ہیروین) کی موت کے بعد چھت پر چڑھ کر بیروں والے کمرے میں منہ چھپائے گھنٹوں روئے تھے، اِس سے پہلے میں نے اُن کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ذاکر صاحب رو بھی سکتے ہیں یہ مجھے اُسی دن یقین آیا۔ کئی دنوں تک انھوں نے شیو نہیں کیا۔ دو مہینے اسکول سے چھٹی پر رہے، میں نے اِس دوران میں اُن کی شخصیت کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا اور اِس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکا یا میں نے کچھ نہیں کرنا چاہا کیونکہ اُن کی شخصیت اتنی ہی پُرکشش اور خوبصورت ہے، کہ اُن کے پاس رہتے ہوئے مجھ جیسا انسان شاید اور کچھ کر بھی نہیں سکتا۔

ذاکر صاحب اُردو ادب کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ اور بڑے افسانہ نگاروں اور ناقدوں کی نظر میں اِس ہر روز بدلتے ہوئے نظریات کے دور میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا اپنا ہی ایک اسلوب ہے اور اُن کے پیشِ نظر اُن کا اپنا ہی ایک معیار ہے، وہ نہ اپنے اسلوب سے ہٹتے ہیں اور نہ اپنے معیار سے نیچے اُترتے ہیں۔ اُنھیں تقاضے پورے کرنے کے لئے کہانیاں نہیں لکھنی ہوتیں۔ وہ جب اپنے اندر سے کہانی لکھنے کا اشارہ پاتے ہیں اور اُن کے ماحول سے کوئی شے اُنھیں اپنے بارے میں کہانی لکھنے پر آمادہ کرتی ہے تو وہ کہانی لکھتے ہیں۔ وہ کیٹس کے مقولے کے قائل ہیں۔ اور صداقت کو حُسن جانتے ہیں اور حُسن کو صداقت سمجھتے ہیں۔ اُن کی کوئی کہانی ایسی نہیں ہوتی جو زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر واضح نہ کرے۔ اُن کے نزدیک کہانی کے لئے پلاٹ کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے، وہ ماحول، نقطۂ نظر، بات کہنے کے سلیقے اور نفسیات پر خاص زور دیتے ہیں۔ اُن کی اپنی ہی ایک زبان ہے، اُن کا اپنا ہی ایک اسلوب ہے، اُن کی کہانیاں پڑھتے ہوئے بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ورڈز ورتھ کی کوئی نظم پڑھ رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے فقرے، کہیں کوئی اُلجھن نہیں، اچھوتی تشبیہیں، ڈھلے ڈھلائے الفاظ جن کا جادو کہانی پڑھنے کے بہت دیر بعد تک دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اِس لئے وہ حُسن کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اپنے یہاں ہر کہیں حُسن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنھیں اپنے ماضی سے خاص لگاؤ ہے، اِسی لئے وہ اکثر اپنے مدّت سے نہ ملے ہوئے دوست سے ملاقات کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں اور کسی کام سے کہیں جاتے جاتے راستے میں رہ جاتے ہیں۔ اِسی لئے وہ کسی ایسے موقعے کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب وہ ماضی سے رشتے قائم کر سکیں اور اُس کی یاد تازہ کر دیں۔ اُن کی کہانیوں میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں وہ اپنے ماضی کے نقوش کو لافانی بنا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اِس طرح کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور زیادہ بڑھ جائے اور وہ کہانی کا زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھائے، وہ یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی کہانیاں پڑھنے والے غم کے اثرات قبول کریں۔ وہ اِس بات کا ہر حال میں خیال رکھتے ہیں۔ اور کسی جگہ بھی اپنی کہانی کی نفاست کو ٹھیس نہیں پہنچنے دیتے۔ وہ اِس فن پر قدرت رکھتے ہیں۔

مکالمہ نویسی میں اُنھیں خاص مہارت حاصل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مکالمے کے الفاظ اُن کے اپنے نہیں ہیں بلکہ کہانی کے کرداروں کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ اُن کی کوئی کہانی ایسی نہیں ہے جس میں اُن کا یہ فن پوری آب و تاب کے ساتھ موجود نہ ہو۔ اِس سے وہ اپنی کہانی کے جادو کو اور زیادہ نکھارتے ہیں، اور اُسے ایک مانی ہوئی حقیقت ماننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ زندگی کا کوئی نہ کوئی فلسفہ یا نقطۂ نظر اپنے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانی "پتھروں کے سوداگر" میں مُردوں کے بارے میں کتنی خوبصورت بات کہی ہے۔ سلمیٰ کہانی کی ہیروین جس نے ایک ہندو لڑکے یعنی خود مصنف سے محبت کی تھی۔ اُس کی موت ہو گئی۔ اُس کو تہِ خاک ہوئے بارہ برس ہو چکے ہیں، جموں پتھروں کا شہر، جہاں مصنف اور اُس کی سلمیٰ میں محبت ہوئی تھی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جانے پر مصنف کو اُس قبرستان کی یاد دلاتا ہے اور وہ دوستوں سے الگ ہو کر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں اُس نے اپنی سلمیٰ کی یاد میں نرگس کا پودا لگایا تھا۔ وہ وہاں پہنچ کر اپنے ماضی میں ڈوب جاتا ہے اور گریز ایلیجی GRAYS ELEGY اُس کے خیالات میں گھوم جاتی ہے اور وہ وہاں سے واپس آتے ہوئے مُردوں کے بارے میں چیخ اُٹھتا ہے۔

"مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چل رہی ہو، میں نے گھوم کر اِس لئے نہیں دیکھا کہ تم کہیں پلٹ نہ جاؤ، قبرستان کے گیٹ پر

تھا، تم بھی مر گئیں۔ مرنے کے بعد بھی تو تمہارے لئے سچائیں (سماجی حدیں) موجود تھیں جیسے کہ زندگی میں تھیں۔ انسان نہ زندگی میں انھیں پھلانگ سکتا ہے نہ موت کے بعد، سچائیں اُس کی میراث ہیں۔ میں پل بھر کے لئے قبرستان کے گیٹ پر رُکا۔ اور اب آگے قدم بڑھایا تو تمہارے خدا حافظ کی چاپ بھلا دی۔ تم واپس جا چکی تھیں۔"

اِس کے علاوہ ذاکر صاحب کو کہانی کے میدان میں دُوسرے افسانہ نگاروں سے جو بات سب سے زیادہ الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی کہانی کے نام نہایت اچھوتے رکھتے ہیں۔ شاید اِس لئے کہ اُن کے ماں باپ نے اُن کے معیارِ حسن کے مطابق اُن کا نام نہیں رکھا تھا اور اِس کمی کو اِس طرح پورا کرتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اُن کے یہاں بعض کتابیں محض اِس لئے ہیں کہ ان کے نام نہایت خوبصورت ہیں۔ یہی نہیں وہ اپنی کہانی کے کرداروں کے نام بھی رکھنے میں اِس حسن کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ غالباً یہ اِسی احساس کا تقاضا ہے کہ وہ بعض شہر صرف اِسی لئے دیکھنے جاتے ہیں کیونکہ اُن کے نام خوبصورت ہوتے ہیں۔

اُن کی کہانی میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اکثر تین سے زیادہ کردار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی کہانی میں کم سے کم کردار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ عورت کے کردار پر خاص توجہ دیتے ہیں اور اُس کے دل کی اندرونی تصویریں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے اِسی لئے اُن کے ارد گرد یا وہ اپنے ارد گرد ایسا ماحول پسند کرتے ہیں جس میں انھیں عورت کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہو اور ایسا ہوتا ہے بھی فطری۔ کیونکہ وہ حسن کے پرستار ہیں اور حسن عورت سے زیادہ اور کہاں ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت کے حسن کا جواب قدرتی مناظر کے پاس بھی نہیں ہوتا۔

محبت کے بارے میں بھی اُن کا نقطۂ نظر انوکھا ہی ہے۔ ایک اوسط درجہ کے انسان کی طرح نہیں۔ اُنھوں نے ہمیشہ اپنی کہانی کی ہیروئن کو رُلایا، ستایا اور رُلاتے ہوئے اپنا دامن چھڑا کر اُس سے بھاگ نکلنا چاہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں اُنھیں تسکین ملتی ہے۔ اِن کی کہانیاں جنسی بھوک سے بالکل پاک ہیں، اکثر قارئین اُن کی کہانیاں پڑھتے ہوئے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے تو محبت کو چھیڑ کا کھیل سمجھا ہے، اور اِن کا عشق جانے کی پیاس تک ہی محدود رہتا ہے، اِس سے زیادہ آگے اُن کی جنسیات نہیں بڑھتی۔

ذاکر صاحب نے ورجینیا وولف اور جین آسٹن کو خوب خوب پڑھا ہے۔ گویا یہ اُن کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ اِن کا اُن پر اور اُن کی کہانیوں پر گہرا اثر بھی ہے۔ یا یہ کہئے کہ اُن کی مزاجی کیفیت اِن سے یکسانیت رکھتی ہے اور اُنھیں طبیعت کچھ اُن ہی کے ڈھول کی ملی ہے۔ ورنہ اِن سے اِس درجہ شغف کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کی اِس دلچسپی سے اُن کے بارے میں بہت سے قیاسات قائم کئے جا سکتے ہیں اور اُن کے بارے میں بہت سے اندازے کئے جا سکتے ہیں۔

میری زندگی میں ۲۰ر مارچ اور ۱۰ر اپریل کی تاریخیں بہت گہرا اثر رکھتی ہیں۔ ۲۰ر مارچ کو ذاکر صاحب کی زندگی کا سہاگ لُٹ گیا اور میں بالکل یتیم ہو گیا۔ اُس دن میری ماں مجھے اِس دُنیا کے حوالے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئیں اور مجھے اُن کے آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوئے۔ میں نے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن اِس وعدے کو اُن کی زندگی میں پورا نہ کر سکا۔ اِس گھاؤ کا کوئی علاج ہو سکے گا یا نہیں۔ اِس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اِس گھاؤ پر ایک محبوب ہستی پھاہا رکھتے رکھتے ایک اور گھاؤ دے گئی۔ جانے ابھی کتنے گھاؤ لگیں گے اِس ایک گھاؤ پر پھاہا رکھنے کی تمنا میں۔

ذاکر صاحب کی معیت کے اِس طویل زمانے میں اُن کی شخصیت کے ذرّے اُڑ اُڑ کر مجھ پر اِس طرح جم گئے ہیں کہ میں خود کو ابھی نہیں پہچان سکتا ہوں اور اپنے آپ کو اُن کا ایک حصہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ یہ اُن کی مجھ سے محبت یا شفقت کا ثبوت ہے یا میری اُن سے عقیدت کے کسی ایک پہلو کا انجام، لیکن مجھے اپنے لئے نہیں تو اُن کے لئے "میں" ہونا ہے۔

(ہندی سے ترجمہ)

شاذ تمکنت

بارِ وفا

پھر وہی آنکھیں، وہی میری طرف دار آنکھیں
مسکراتی ہوئی، سرشار، ملنسار آنکھیں
نارسیدہ یہ تمنّائیں، یہ ارمان ترے
صاف آمادۂ شب خوں یہ پلک بان ترے
یہ کھلی زلفیں، یہ شب زادیاں نکہت بردوش
اُف یہ دوشیزگیٔ بر یہ کنواری آغوش
راہِ عصیاں سے اُبلتی ہوئی یہ جوئے ثواب
معبدِ جسم، یہ کندن کے کلس یہ محراب
سپر افگندہ نگاہوں میں مناجات لئے
ہمہ تن آرزوئے دید و ملاقات لئے
تو کہ ہے منتظرِ جرأتِ اظہارِ وفا
پھر وہی بارِ وفا، پھر وہی تکرارِ وفا
درد سرشار ہوں، لذّتِ کشِ آزار ہوں میں
صورتِ نقش ہوں میں صورتِ دیوار ہوں میں

کیا کہوں تجھ سے مری سانس رُکی جاتی ہے
تیرے پہلو میں کسی اور کی یاد آتی ہے

اویس احمد دوراں

بہار قید ہے

چمن میں رُت ہے کون سی کہ زندگی مضمحل کو درد جھیلنا پڑا
یہ اپنے آشیانے میں دُھواں کہاں سے بھر گیا
کہ جس میں گھر کے دفعتاً ہماری سانس رُک گئی
تمہارا حُسن کھو گیا
کسی سے پوچھو تو ذرا
یہ غم کی رات کس لئے طویل ہوتی جاتی ہے
یہ کس کے ہاتھ ہیں جو آج زندگی کی انجمن میں جام بانٹتے نہیں
یہ لوگ کتنے بے وفا ہیں اپنی سخت مٹھیوں کو اب بھی کھولتے نہیں
فضا میں زہر گھل گیا، حیات بجھ کے رہ گئی مگر یہ بولتے نہیں

یہ چند سخت مٹھیاں بہار جن میں قید ہے
کروڑوں اہلِ درد کا سکون جن میں بند ہے
حریص کتنی ہیں کہ یہ تمام عالمِ نحیف و زار پر محیط ہیں
ہماری بھیڑ کیا کرے یہ خود ہی غم پسند ہے
یہ خود تڑپتی پھرتی ہے
یہ خود سسکتی پھرتی ہے
یہ حوصلہ بھلا کہاں کہ وقت کی گرفت سے
بہار کو چھڑا سکے
خوشی کا دور لا سکے
ہنسی خوشی بہا سکے
جب آنسوؤں میں ہو مزہ
تو پھر بلکتے ہونٹ کیوں تبسم آفریں بنیں
جب آہ و کھینچنے سے ہو تسلیِ دلِ حزیں
تو پھر دلوں کے ساز کیوں ترنم آفریں بنیں
اندھیری رات تو فقط چراغ و آفتاب سے شکست کھاتی آئی ہے

ستمگروں کی بزم میں ملول تم، ملول ہم
نئی سیاستِ چمن جو اک پیامِ مرگ ہے
بڑھا رہی ہے تشنگی
بجھا رہی ہے روشنی
مٹا رہی ہے دلکشی
جوانیاں پگھل پگھل کے مل رہی ہیں خاک میں
شباب کا زمانہ ہے مگر حیاتِ زندگی کا دور تک پتہ نہیں
تمہاری چشمِ نازنیں میں عشق کی وہ دلبری کا دور تک پتہ نہیں
وہ دلنشیں ادا نہیں
وہ سرخ سرخ لب نہیں
تمہاری زلفِ خم بہ خم میں وہ شمیم اب نہیں
ہمارے چہرے پر بھی اب وہ نورِ زندگی نہیں
جو کائنات آب و گِل کی رونقیں بڑھا سکے
خزاں نصیب پھول تم، خزاں نصیب پھول ہم
ستمگروں کی بزم میں ملول تم، ملول ہم

رونق نعیم

ہم پاسباں ہیں

ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں
کیا چاہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں، وہ جو شکارِ وہم و گماں ہیں
جو دیکھتے ہیں، وہ بولتے ہیں، اہلِ نظر ہیں، اہلِ زباں ہیں
وہ اور ہوں گے، جو ہر قدم پر، اندیشہ مندِ سود و زیاں ہیں

اپنا ترنگا، اونچا رہے گا، ہر معرکے میں ہم کامراں ہیں
ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں
تاریکیوں کی یلغار ہے پھر، شمعِ وطن پر کیا دیکھتے ہو
گردِ تشدد، پڑنے لگی ہے، روئے چمن پر کیا دیکھتے ہو
بم کے دھماکے، ہونے لگے ہیں، سرو و سمن پر کیا دیکھتے ہو

جنت نظیرِ کشمیر کی پھر، بربادیوں کی تیاریاں ہیں
ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں
پرہول بادل، آ کے برسے، بولو کہاں تک ہم چپ رہیں گے
طوفان گزرے، اور وہ بھی سر سے، بولو کہاں تک ہم چپ رہیں گے
تخریب جھانکے، دیوار و در سے، بولو کہاں تک ہم چپ رہیں گے

ہم رازدارِ نطق و بیاں ہیں، ہم پاسدارِ امن و اماں ہیں
ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں
شہرِ غزل کی، ہر ہر گلی میں، بارود کی بو پھیلانے والو
نغموں کا خطہ، جھلسا ہوا ہے، تم راکٹوں سے برسانے والو
انجام تم نے سوچا نہیں ہے، طاقت پہ اپنی اترانے والو

ہم متحد ہیں، ہم سے نہ الجھو، ورنہ تمھاری رسوائیاں ہیں
ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں
اس سرزمیں کی ہر رہگزر میں، ہر ہر قدم ہشیار ہیں ہم
اس گل کدے میں گل ریز ہیں ہم، گل بار ہیں ہم، گلکار ہیں ہم
اس کی حفاظت ہے فرض ہم پر، اس گلستاں کے معمار ہیں ہم

اس گلستاں کی ہر شاخِ گل پر، ہم بلبلوں کے کچھ آشیاں ہیں
ہم پاسباں ہیں، ہم نوجواں ہیں، ہم سرفروشِ ہندوستاں ہیں

نصیر پرواز

حقیقت

میں کہ ناکام جنونِ غمِ فردا بھی رہا
مرکزِ چشم و دلِ نرگسِ شہلا بھی رہا
شہرِ تنویر میں بدنام بھی رسوا بھی رہا
اپنی خودداریٔ احساس سے مجبور رہوں میں

سینۂ گیتی میں دل بن کے دھڑکنے بھی لگا
گیسوئے یار کی خوشبو سے مہکنے بھی لگا
چشمِ اقرار سے پی لی تو بہکنے بھی لگا
غمِ تقدیر کے چکر سے بہت دور رہوں میں

چھین لوں دستِ زلیخا سے میں اپنا دامن
پھول مانگے جو کوئی بخش دوں سارا گلشن
غالب و میر کا پرتو ہے مرا ذوقِ سخن
اور اسی ذوقِ گراں مایہ پہ مغرور رہوں میں

مجھ سے مانگا ہے ہنرمندوں نے حسنِ ادراک
میں نے سکھلائی نگاہوں کو ادائے بے باک
مسکرائی ہے مرے دم سے فضائے نمناک
یہ الگ بات کہ رستا ہوا ناسور رہوں میں

محفلِ زہرہ و پرویں مری رفعت کی اسیر
کہکشاں ہے مری تنویر کی ہلکی سی لکیر
ایک تقدیرِ جہاں ساز ہے میری تقدیر
سنگ و آہن جسے کہتے ہیں وہ دستور رہوں میں

چشمِ نم دیدہ سہی چاک گریباں تو نہیں
میری صحبتوں سے کوئی نور گریزاں تو نہیں
خوش ہوں میں مجھ پہ کسی کا کوئی احساں تو نہیں
زندگی خود بھی فسردہ ہے تو رنجور رہوں میں

اخلاق تحصوری

تاثّر

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی اک انجان کرن
ایک شاعر کے حسیں خواب کی روشن تعبیر
ایک عاشق کے جواں شوق کا رنگیں پیکر

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی اک انجان کرن
جام بر دوش، شفق رنگ بہاروں کی جھلک
درفشاں نور بکف شوخ ستاروں کی چمک
رنگِ فرحت کا کوئی پھوٹ پڑا ہے چشمہ
یا اُبھر آئے کسی گُم شدہ جنّت کے نشاں
اتنی تازہ کہ خجل جس سے ہوں نورس کلیاں
اتنی معصوم کہ حوروں کا تقدس قرباں

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی اک انجان کرن
گُل کی آغوش کا پروردہ اشارہ کوئی
مئے خوش رنگ میں ڈوبا کوئی رنگیں پیغام
شعر و نغمہ کی فسوں خیز مسلسل بارش
مستی و ہوش کے کھلتے ہوئے پیہم اسرار
دفعتہً جیسے بکھر جائے گُلوں کی خوشبو
یک بیک جیسے سمٹ جائے کہیں رنگِ بہار
ہے سخن ریز کوئی سلسلہ خاموشی کا
خواب آور کوئی افسانۂ بیداری ہے

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی وہ انجان کرن
زندگی جس کے تاثّر سے ہوئی مُہر بہ لب

—— "گہرا داغ" —— راجندر کمار کی تصویر پر کسی شریر بچے کی پھینکی ہوئی گیلی مٹی چپک کر رہ گئی تھی ۔ "کشمیر کی کلی" کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی پھیکی پھیکی سی ویران مسکراہٹ اور پھر دلیپ کمار ، اشوک کمار نہ جانے کتنے کماروں کماریوں کے دھندلے دھندلے سے بدصورت خاکے رات کی شبنم میں بھیگ کر رہ گئے تھے —— اچانک مرادی کے قدموں کو جیسے بریک سے لگ گئے ۔ نگاہیں پوسٹروں پر ٹکنے لگیں اور ہاتھ میں دبی ہوئی کیتلی جھول کر رہ گئی —— "گہرا —— داغ —— کشمیر کی کلی —— شہر —— اور —— سپنا اونہہ دیہاتی ہے سالا —— بڑا سا جھگڑا —— بالکل خراب پکچر بالکل خراب" شہر اور سپنا کے پوسٹر کو گھورتے ہوئے اس نے ناک سکوڑی ، منہ بنایا اور پھر دوسرے اشتہارات کی طرف متوجہ ہو گیا ۔ ہونٹ دھیرے دھیرے ہلتے رہے اور مرادی اپنے آپ سے بے نیاز پوسٹروں پر رینگتا رہا ۔ اچانک اس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹ پڑی ۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا —— "پھر آئی ساتی —— ضرور —— اب کی تو ضرور دیکھوں گا" جیسے اسے سب کچھ مل گیا ۔

اس نے دل ہی دل میں زمتبر دیکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر جھومتا جھامتا ممدو کے ہوٹل کی طرف چل دیا ۔

"سلام مرادی استاد —— " مرادی چونک پڑا ۔ سامنے فخرو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا ۔

"اوہ اچھا فخرو —— تم —— کہو بیٹا کیا حال چال ہے " مرادی کی پتلی سی گردن خاص انداز میں اکڑ گئی سینہ تن گیا اور پھر آواز میں بھی ہلکی سی کرختگی آگئی ۔

"مزے میں استاد —— " فخرو لجاجت سے دوہرا ہو گیا ۔

"کیوں بے سالے بھاگ کر کہاں مر گیا تھا —— کیا کرتا ہے آج کل —— " مرادی کے تیور اچانک بگڑ گئے ۔

فخرو لرز گیا —— " کچھ نہیں استاد —— آج کل تو جوتے پالش کرتا ہوں جوتے "

" ٹھیک ہے —— " مرادی دھیما پڑ گیا " جا گھر جا —— اور ہاں اپنی ماں کو سلام بولنا —— کہنا مرادی استاد سلام بولا ہے"

" اچھا استاد —— " فخرو نے جان کی اماں پا کر جلدی جلدی گردن ہلائی —— " استاد " یکا یک فخرو کچھ دیکھ کر بول اٹھا —— " کیا بات ہے —— ؟ " مرادی کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔

" تمہارا کان کیوں لال ہے استاد —— ؟ " مرادی سٹپٹا کر رہ گیا ۔ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی —— " جا —— جا تجھے مطلب ۔ چوٹ لگ گئی تھی " اس نے جلدی سے کان کی لو پر انگلیاں رکھ دیں ۔ فخرو خاموشی سے کھسک گیا ۔

ممدو کے چھوٹے سے ہوٹل پر تو جیسے جاڑوں میں بہار آجائے ۔ تل رکھنے کو بھی جگہ نہ رہ جاتی تھی ۔ عبدالرحیم ، عیدو جیسے دیکھو مکان سے نکل کر تھرتھراتا کانپتا ممدو کے ہوٹل میں گھس پڑتا اور پھر پیالیوں کی کھنکھناہٹ کے درمیان اندھا دھند باتیں شروع ہو جاتیں —— شہر کے کس غنڈے نے چھری چلائی ۔ کس کی بیٹی آوارہ نکل گئی اور کبھی کوئی سیاسی موضوع بھی چھڑ جاتا —— لیکن ہمیشہ ہر گفتگو کا اختتام اسی گھسے پٹے پرانے جملے پر ہوتا —— " کون سینما میں کون پکچر کھیل رہی ہے ممدو بھیا " ممدو کی باچھیں کھل اٹھتیں اور وہ مسکرا مسکرا کر سارے سینما گھروں کی خبریں اس طرح سناتا جیسے وہ سچ مچ کوئی " فلم نیوز ایجنسی " ہو ۔

" لے ممدو چا —— دو پیالی خوب گرما گرم " مرادی نے چائے کی کیتلی ممدو کی میز پر دے ماری —— " ٹھہر ابھی دیتا ہوں —— " ممدو نے پیالیوں میں شکر ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا —— " ارے ارے —— اُدھر کہاں " اچانک ممدو نے ہانک لگائی لیکن مرادی ایک ہی چھلانگ میں چولھے کے قریب پہونچ چکا تھا ۔

" ذرا آگ سینک لوں ممدو چا —— بڑی سردی ہے " مرادی نے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ دبکتے ہوئے چولھے پر پھیلا دئے ۔ ہوٹل میں بیٹھے سیاستدانوں میں گرما گرم بحث چھڑی تھی ۔ ممدو کا چمچہ تیزی سے گردش کر رہا تھا ۔ مرادی کی سمجھ میں

کچھ بھی نہ آسکا ۔ وہ سر جھکائے آگ کے شعلوں کو گھورتا رہا ۔۔ اچانک جیسے اُسے کچھ یاد آگیا اور اُس نے ممدو کے قریب پہونچ کر اُس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑ دیا —— "ارے ممدو چچا — چائے دو نا یار — بہت دیر ہو گئی، بیگم صاحب ناراض ہونگی"
" دیتا ہوں بے — مرا کیوں جاتا ہے " ممدو نے جھڑک دیا پھر خود ہی جلدی جلدی چائے بنا کر اُس کے حوالے کر دی ۔ مرادی ہاتھ میں کیتلی لٹکائے دوڑتا ہوا گھر کی طرف چل دیا ۔

باورچی خانے کی تیز روشنی میں مرادی رات گئے تک برتن صاف کرتا رہا ۔ صاحب نے دوستوں کی دعوت کی تھی ۔ بہت سارے برتن اکٹھا ہو گئے تھے ۔ اُس نے چولھے کی طرف دیکھا آگ بجھ چکی تھی ۔ چینی کی پلیٹیں جلدی جلدی صابن کے جھاگ میں ڈبو کر وہ تیزی سے کام کرنے لگا ۔ صابن کے جھاگ قمیص کی آستین نم کر رہے تھے ۔ اُس نے چٹکیوں سے بٹن کھول کر آستین اوپر سرکا لی ۔ بانہوں تک آستین برابر کرتے ہوئے نہ جانے کیوں اُسے زمبو کا خیال آگیا ——— شیر کی کھال سے جھانکتے ہوئے مضبوط بازو —— اس نے قمیص کا دامن سمیٹ کر گھٹنوں میں دبا لیا اور پھر وہ زمبو کے قوی ہیکل تصور سے الجھ کر رہ گیا ۔

جھن — جھن — جھناک برتن ٹوٹنے کی تیز آواز کانوں تک پہونچتے ہی صفیہ پلنگ پر اچھل پڑیں —— "کیا ہوا مرادی" لیکن مرادی خاموشی سے آنکھیں پھاڑے پلیٹ کے اُن ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا جو باورچی خانے کے فرش پر بکھرے پڑے تھے —— "جواب کیوں نہیں دیتا کمبخت ۔ حلق بند ہو گیا کیا" صفیہ دندناتی ہوئی باورچی خانے میں گھس پڑیں اور ٹوٹے ہوئے برتن دیکھ کر تو جیسے اُن کے تن بدن میں آگ لگ گئی —— "خدا غارت کرے سارا سٹ چوپٹ کر دیا ۔" صفیہ نے مرادی کے بال پکڑ کر اس طرح کھینچے کہ وہ زمین پر لڑھک گیا ۔ لیکن اس کی آنکھیں اب تک حیرت سے پھیلی تھیں ۔ وہ حالات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ "میں کہتی ہوں ابھی نکل جا گھر سے —— اسی وقت ۔ نہیں تو مارتے مارتے جان لے لوں گی" صفیہ نے مرادی کی پیٹھ پر دو چار ہاتھ اور جڑ دئے — "حرامزادے ۔ اسی دن کے لئے تجھے رکھا تھا ۔ چل اٹھتا ہے یا دھکے دے کر نکالوں" صفیہ کی آنکھیں غصّہ سے سرخ ہو رہی تھیں ۔ وہ چیختی پیر پٹختی باورچی خانے سے نکل گئیں ۔ دھیرے دھیرے ہر طرف خاموشی چھا گئی ۔ دُور تاریک کسی گوشے سے جھینگروں کی دبی ہوئی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں ۔ اچانک مرادی کی دبی دبی سسکیاں باورچی خانے کی بوجھل فضا میں اُبھر ابھر کر دم توڑنے لگیں ۔

سردی کی لرزتی کانپتی رات گزر گئی اور ٹھنڈک سے تھرتھراتے ہوئے سورج کی نرم کرنیں بند دروازوں پر دستک دینے لگیں ۔ پیپل پر سویا ہوا شور جاگ اٹھا ۔ پرسکون ڈالیاں ہلنے لگیں —— مرادی نے راستہ چلتے ہوئے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا ۔ سیٹھ رام داس کے اکلوتے بیٹے گھنشیام کے اجلے کبوتروں کا جوڑا آسمان کی بلندیوں میں پرواز کے بعد تھک کر دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا ۔ پھر کبوتروں کا وہ جوڑا "رام نواس" کی سب سے اونچی لگر پر بیٹھ گیا ۔ مرادی کا سر جھکائے دھیرے دھیرے چلنے لگا ۔ سردی تیز تھی لوگ اب تک گھروں میں اوڑھے لپیٹے پڑے تھے ۔ پرانی حویلی کی لمبی چوڑی دیوار کے قریب اُس کے قدموں کو پھر ایک بار بریک لگ گئے ۔ نگاہیں بھدّے رنگین پوسٹروں پر رینگ گئیں ۔ اچانک برتن ٹوٹنے کی تیز آواز نے اُسے چونکا دیا ۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ ایک موٹر سڑک پر تیزی سے گزر گئی ۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مرادی کی نظروں میں ایک بار اور زمبو کے قوی ہیکل جسم پر پھیل گئیں ۔ پھر وہ تھکے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ گیا ۔

"سلام مرادی استاد —— " مرادی چونک پڑا " کیا بات ہے استاد ۔ تمہارا منہ اترا ہوا ہے " فخرو کو مرادی کی حالت دیکھ کر سخت حیرت ہوئی ۔

"کچھ نہیں یار فخرو —— ذرا طبیعت ٹھیک نہیں" مرادی نے خود کو سنبھالا اور فخرو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا —— "ابے فخرو — کوئی کام دلا دے ۔ " کچھ دیر بعد مرادی نے اُداس لہجے میں سکوت توڑا ۔ فخرو نے پھر حیرت زدہ نگاہوں

سے مرادی کی طرف دیکھا —— "ایسا کو ہے ——"

"وہاں سے جواب مل گیا۔ میں رات سے بھوکا ہوں یار" مرادی کی آواز رندھ گئی۔ اُس نے آستین سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں خشک کرلیں۔ فخرو کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"استاد ایک ترکیب —— میں جوتے پالش کرنے جا رہا ہوں —— تم بھی چلو" فخرو نے چٹکی بجا کر بات سمجھائی۔ وہ کو تیار ہوگیا۔ جانسن روڈ پر ہمیشہ کی طرح اُلٹتے ہوئے انسانوں کے طوفان میں دونوں جانے کتنے قدم تیزی سے فٹ پاتھ کو روندتے ہوئے گذر رہے تھے کہ فخرو نے مرادی کو ایک جگہ روک دیا اور جوتے پالش کرنے کے کچھ سامان اُس کے حوالے کرتے —— "مرادی استاد تم یہاں بیٹھ جاؤ" —— مرادی نے فوراً اپنے سامان فٹ پاتھ کے کنارے جما دئے لیکن فخرو کا بکس اب تک اُس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ مرادی کو حیرت ہوئی —— "کیوں فخرو تو یہاں نہیں بیٹھے گا کیا —— ؟"

"نہیں استاد —— میں پنجاب بینک کے چوراہے پر رہوں گا۔ تم شام کو وہاں آجانا پھر ساتھ ہی گھر چلیں گے" فخرو اُسے سمجھاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور مرادی اُسے اُس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ جانسن روڈ کے طوفان میں اوجھل نہ ہوگیا۔ پھر اس کی انگلیاں ہاتھ میں دبے برش کے نرم بالوں پر سرکنے لگیں۔ سامنے سے گذرتی ہوئی گوری چٹی لڑکی کے شانوں پر بکھرے ہوئے بال اس کی انگلیوں میں سرسرا اُٹھے —— اس کی نگاہیں دور تک سیاہ بالوں کا پیچھا کرتی رہیں۔ اچانک کسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا —— "جی صاحب" اس نے جلدی جلدی سامنے کھڑے گاہک کا پیر فریم پر رکھ کر جوتے پالش کرنے شروع کر دئے۔ کچھ ہی دیر بعد جوتوں کی سطح پر مرادی کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں اُبھرنے لگیں۔ اس نے جوتوں کی سطح پر اُبھرتے ہوئے مرادی کو مسکرا کر آنکھ ماری اور جوتا چمکانے کی پٹی لپیٹ کر بکس میں ڈال دی۔ اس کی نگاہیں گاہک کی طرف اٹھ گئیں۔

"کتنے پیسے ہوئے —— ؟"

"پندرہ پیسے صاب"

"اب پالش کے پندرہ پیسے —— لے دس پیسے" ایک جگمگاتا ہوا سکہ اُس کے قدموں میں گر کر چمکنے لگا۔ اُس نے جاتے ہوئے گاہک کو آواز دی "صاب لے ——" لیکن وہ طوفان میں گم ہو چکا تھا۔ مرادی نے سکہ اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

شام تک اس کی جیب اچھی خاصی بھر گئی —— قریب کھڑے خوانچہ والے سے چنے کر اس نے بھوک مٹائی اور پاس ہی کے نل سے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ ابھی گاہکوں کے آنے کی امید تھی اس لئے اُس نے پنجاب بینک کے چوراہے تک جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یکایک اس کی نگاہیں فٹ پاتھ کے کنارے رکنے والی پولیس گاڑی پر پڑیں اور وہ اُن باوردی سپاہیوں کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا جو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے دکانداروں اور خوانچہ والوں کی مرمت کے بعد اُن کو گاڑی میں بند کر رہے تھے۔ مرادی کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جلدی جلدی بکھرے ہوئے سامان سمیٹ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک سپاہی کی گرفت میں آکر بے بس ہوگیا اور پھر وہ بھی قیدیوں میں شامل کر دیا گیا۔

کوتوال نے تمام قیدیوں پر "جرمانے" لگائے۔ "جرمانے" کی ادائیگی کے بعد کچھ قیدی سر جھکائے گھروں کی طرف چل دئے۔ مرادی نے اپنی جیب سے تمام پیسے نکال کر انسپکٹر کے سامنے کی میز پر رکھ دئے —— "جرمانے" کی رقم ادا نہ ہوگی۔ لہٰذا وہ بھی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ رات سرد تھی۔ مرادی بت جیسی [illegible] کی تاریکی پر نظریں جمائے نہ جانے کس خیال میں ڈوب گیا۔ سردی کی لرزتی کانپتی رات گذر گئی اور ٹھنڈک سے تھرتھراتے ہوئے سورج کی نرم کرنیں بند دروازوں پر دستک دینے لگیں۔ پیپل پر سویا ہوا شور جاگ اٹھا۔ ڈالیاں ہلنے لگیں —— مرادی نے کوتوالی سے نکل کر ایک طویل انگڑائی لی اور دھیرے دھیرے ایک طرف چل دیا۔ سارا جسم ہلکے ہلکے درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ کوتوالی کے ٹھنڈے فرش پر ساری رات اسے نیند نہ آسکی۔ دو کچھ دیر

سڑکوں پر یونہی ادھر ادھر بھٹکتا رہا ۔ دھوپ بڑھتے بڑھتے دکانوں کے زینوں تک پہونچ چکی تھی ۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک کر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کچھ سوچنے کے بعد سامنے کی دوکان کی طرف بڑھ گیا ——— "امپیریل جیولرز" میں بیٹھے گول مٹول پنّالال نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے آگے پڑے رنگ برنگ چمکیلے پتھروں کو مفلر سے چمکانے میں منہمک ہوگیا ۔

"صاب — " پنّالال کی جھکی ہوئی گردن پھر سیدھی ہوگئی ——— "کوئی کام ملے گا صاب "

مرادی دروازے سے ٹیک لگائے چمکیلے پتھروں کی طرف دیکھنے لگا ۔

" جاؤ ——— جاؤ یہاں کوئی کام دام نہیں — " پنّالال نے اسے جھڑک دیا ۔

" صاب ——— "

" منشی جی ۔ اس لونڈے کو باہر نکالو ۔ " پنّالال چیخ پڑا لیکن منشی کے آنے تک مرادی دوکان سے باہر جا چکا تھا ۔ پنّالال جھنجھلاتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا ۔

دوپہر تک وہ اسی طرح سڑکوں کا چکّر لگاتا رہا ایک بارونق سڑک سے گزرتے ہوئے اس نے رنگین سوئٹروں کے شوکیس کے پاس رک کر شیشے سے اندر جھانکا ۔ نیلے رنگ کے سوئٹر پر بنے ہوئے چینی کے برتن جیسے سفید پھول ذہن کے کسی گوشے میں مہک اٹھے اور اس نے ناک کے نتھنے پھیلا کر ایک عجیب سی خوشبو محسوس کی ۔ اس کی نگاہیں خود بخود ایک سمت مڑ گئیں ۔ قریب کی دوکان پر کوئی مٹھائیاں سے رہا تھا ۔ اچانک ہنسی کی آواز سن کر اس نے مڑ کر دیکھا دو تین لڑکے گلے میں ریشمی رومال باندھے اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے ——— وہ بھی مسکرا دیا ——— " کیا دیکھ رہے ہو مرادی ——— " کریم نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ۔ مرادی کی نگاہیں ایک بار پھر شیشوں سے گزر گئیں ۔ وہ ہنستے ہوئے مرادی کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئے ۔ سڑک سے گزرتے ہوئے گلی میں اکرام ان میں سے ایک نے گندی قمیص کی جیب سے تاش کی پرانی گڈی نکالی اور پھر سب سامنے کی بوسیدہ عمارت کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کی اوٹ میں چھپ چھپا آلتی پالتی مار کر بیٹھ رہے ——— سگرٹ کے دو چار کش کے بعد کھیل شروع ہوگیا ۔ جگمگاتے ہوئے سکّے ایک طرف سے دوسری طرف سرکتے رہے ۔ اور بہت دیر بعد دور دِیں کوٹن مل کے سائرن کی تیز آواز کے ساتھ دھوپ بلند عمارتوں کی چکنی دیواروں سے آسمان کی جانب جا چکی تھی تاش کے پتّے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرح پھر گڈی میں واپس چلے گئے ۔ مرادی نے گردھاری کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے ہنس کر بات ٹال دی ۔ سڑک پر آ کر سب اپنے اپنے گھروں کی سمت چل دئے ۔ گردھاری نے مرادی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو مرادی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا ۔ دونوں دھیرے دھیرے سڑک پر چلنے لگے ۔

چاندنا کے باہر رکھا لمبا چوڑا پوسٹر دیکھ کر تو مرادی کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی " ——— شیر کی کھال سے جھانکتے ہوئے مضبوط بازو ——— اس کی نگاہیں الجھ کر رہ گئیں اور ہونٹ اپنے آپ سکڑ کر تنگ ہوگئے ۔ پہلا شو شروع ہونے میں شاید تھوڑی ہی دیر باقی تھا ۔ ٹکٹ گھروں پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے ۔ گردھاری اس کا ہاتھ تھامے بھیڑ میں گھس پڑا ——— " مرادی تم اس جگہ کھڑے رہو ۔ " ایک جگہ رک کر گردھاری نے سرگوشی کی اور قبل اس کے کہ مرادی اس سے کچھ پوچھے گردھاری تیزی سے بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا ۔ مرادی اپنی جگہ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا ۔ تھوڑی دیر بعد گردھاری واپس آیا تو اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ——— وہ مرادی کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا اور تیز تیز سانس پر قابو پاتے ہوئے اس نے مٹھی کھول دی ۔ گردھاری کی ہتھیلی پر چند سکّے دیکھ کر مرادی کی آنکھیں پھیل گئیں ——— " یہ کیا — "

" ہاتھ کی صفائی پیارے — " گردھاری نے ہنس کر آنکھ دبائی — " اچھا تم ٹھہرو میں ابھی جا کر ٹکٹ لاتا ہوں ۔ تم ادھر ادھر مت جانا بہت بھیڑ ہے " وہ مرادی کو سمجھاتا پھر بھیڑ میں غائب ہوگیا ۔ لیکن امڈتے ہوئے طوفان کے جھکولوں نے مرادی کے قدم ڈگمگا دئے ۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتا سرکتا ریستوران کی دیوار سے چپک گیا ۔ اندر سے اٹھتی ہوئی کھانوں کی تیز خوشبو

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

کمال گورکھپوری

نامُراد

یہ عجیب بات تھی نا ــــ کہ ماں پڑوسن سے جھگڑے کے بعد آج گھُل مِل کر باتیں کر رہی تھیں ۔ اُسے کچھ دال میں کالا نظر آیا..... یہ تو اُسی وقت ہوتا ہے جب ماں کسی سے اہم کام کرانا چاہتی ہیں ۔

یہ پہلا موقع تھا جب گھر میں سب سے چھپا کر ایسی باتیں کی جا رہی تھیں ۔ اُسے یہ بات کھٹکی ، اسے بڑا تعجب ہوا ۔ آج آخر کون سی نئی بات تھی جو اُسے بتانے کے بجائے اُلجھ رہی ہیں ... پڑوسن سے کہی جا رہی تھی ۔

یہ ہستی جس کے لئے پردۂ راز پریشان کن ہوتا جا رہا تھا ... خاموش تھی ۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح جیسے آرام کے وقت بولنا بھی عذاب معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اُسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی ۔ اسی لئے یہ باتیں اور زیادہ کھُل رہی تھیں ۔ لیکن اس اضطراب کے باوجود بھی اس کی طبیعت استفسار پر آمادہ نہ ہو رہی تھی ۔ اُس نے کئی بار گفتگو پر کان لگائے .. مگر لاحاصل .. بات پانا تو دُور .. وہ اس گفتگو کا کوئی لفظ بھی نہ پا سکی ۔ شوہر سے کیا کہتی .. یہ اس کی ماں کی بات تھی ۔ ان کے کان تک بات پہونچتی تو یہ معمولی سا استفسار جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا ۔

ساس کی رازدارانہ گفتگو میں کنائے پیدا ہونے لگے ۔ پڑوسن نے اس کنائے کو معنویت دینے کی کوشش کی .. مگر صفدر کی بیوی بوڑھی ساس کا عندیہ نہ پا سکی ۔ وہ کئی بار اس مقصد کے لئے قریب سے گذری ۔ دونوں کی باتیں فلم کی طرح کٹ گئیں ۔ جیسے دونوں گونگی ہوں ۔ اور اپنی بات سمجھانے کے لئے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کر رہی ہوں ۔ کئی بار ان کی نظروں کی پروا نہ کر کے اس نے ساس اور پڑوسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں .. سب بے سود .. بھید کھل نہ سکا ۔ راز راز ہی رہا ۔

صبح ہی صبح صفدر کی ماں نے برقعہ سنبھالا ۔ بہو مُنہ دھو رہی تھی ۔ وہ یہ کہتی ہوئی دروازہ سے باہر ہو گئیں ۔ بیٹی ابھی آتی ہوں ، زرینہ کی ماں کے ساتھ ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں ۔

وہ چڑ سی گئی .. زرینہ کی ماں کے ساتھ .. چڑیل کہیں کی ۔ پتہ نہیں پڑوس میں کہاں سے آ بسی ہے ۔ ساس کو اُس سے کیا کام ؟ اس سے پہلے تو انھیں کبھی زرینہ کی ماں سے کوئی کام نہیں پڑا تھا ۔ پڑوسن سے بات بات پر بدکنے والی ساس اس سے گھُل مل کیسے گئیں ۔ وہ سوچتے سوچتے اُوب گئی ۔ خیر مجھ کو کیا ... ایسی کمینی کا ساتھ کر کے خود ہی بھگتیں گی ۔ بڑی بوڑھی ہیں ۔ کون کچھ سارا مصیبت اپنے سر آجائے گی ۔

صفدر دن نکلنے پر اٹھا .. ماں کہاں گئیں .. وہ کیا بتاتی .. اُس نے ساس کے الفاظ دہرا دئے .. وہ خاموش فکر مند سا سوال کرتا رہا ۔

بچیاں باورچی خانہ میں ، آپس میں ناشتہ کے لئے جھگڑ رہی تھیں ... اُسی وقت صفدر کی ماں آ پہونچی ۔ بچیاں شور مچا تی ہوئی

دادی سے لپٹ گئیں۔

ارے تم سب برقعہ تو اتار لینے دو.. دادی یہ کیا ہے.. مٹھائی مٹھائی..

چھوٹی بچی نے جھولا پکڑ لیا.. بڑی مشکل سے وہ برقعہ اتار سکیں۔ سب لڑکیاں جھولے پر لڑنے لگیں۔ دادی ہمیں پہلے دینا... دادی فہمیدہ کو مت دینا.. انھوں نے ہمیں مارا ہے۔ اوں اوں ہم دادی سے زیادہ مٹھائی لیں گے۔... چھوٹی بچی ٹھنکی

دادی اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گئیں انھوں نے مٹھائی تقسیم کی۔

فہمیدہ یہ تم لو..

زرینہ تم..

نسیمہ ہم تمھیں خالی ہاتھ میں نہیں دیں گے۔ جاؤ پلیٹ لے آؤ.. ورنہ سب ستیاناس کر دوگی دیکھو تم لوگ گرانا نہیں۔ شیرینی ہے شیرینی.. تبرک...

سب نے گردن ہلاتے ہوئے.. اچھا اچھا کہا... جیسے سب کی سب مفہوم سمجھ گئی ہوں۔

"دلہن"

"جی"

"کہاں ہو" اچھا.. میں باورچی خانہ ہی میں آرہی ہوں۔

ساس نے شیرینی کا جھولا.. بہو کو پکڑا دیا... دیکھو بیٹی.. صبح کھانے کے لئے ہے۔ چالیس دن استعمال کرنا ہے۔ یہ پانی کی شیشی ہے... اسے صبح شام ایک ایک گھونٹ پی لیا کرنا.... دیکھو ناغہ نہ ہونے پائے۔ بڑی محنت سے منگوا کے لائی ہوں۔

"اچھی بات ہے"

"دیکھو اسے کمرہ میں رکھ دو.. یہاں بے ادبی ہوگی۔

صفدر والدہ کے پاس آ بیٹھا... دلہن نے کنکھیوں سے دیکھا.. ماں نے بیٹے سے باتیں شروع کر دیں۔ صفدر گفتگو کی پراسراریت میں کھو گیا... بہو کمرے سے لوٹتے ہوئے پاس سے گذری۔ وہ جیسے چونک پڑے۔ جیسے ان کے راز میں کوئی مخل ہو گیا ہو۔ صفدر نے کن انکھیوں سے پلٹ کر دیکھا... وہ بھاری قدم اٹھاتی ہوئی... باورچی خانہ میں آ بیٹھی۔

"دلھن بابو.. کو کھانا نکال دو"

کھانے کے دوران اسے شوہر کی نگاہیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئیں.. اُس نے محسوس کیا جیسے وہ اپنی بیوی میں کوئی نئی چیز پا لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہو نے اس نئے پن کو تاڑ لینے کی کوشش کی.. مگر خاموشی نے دونوں طرف کی طنابوں کو کھینچے رکھا۔

وہ آرام کرنے کے لئے لیٹی.. نیند کہاں آتی.. خیالات جو ستانے لگے... شوہر کی نگاہیں.. سارے جسم میں چبھتی معلوم ہوئیں.. آخر وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں.. وہ بتاتے کیوں نہیں.. ماں سے کہیں گے.. ماں سے سنیں گے۔ میں کیا ایسی گئی گذری ہوں۔ کہ دل کی بات بھی زبان پر لانا برا سمجھتے ہیں۔ وہ روہانسی ہو گئی.. اس کا دل بھر آیا.. بچیاں غوں غاں کرتی ہیک جھپک کمرہ میں گھس آئیں۔ وہ ماں سے لپٹ گئیں۔ اُس نے بڑی طمانیت محسوس کی۔ بچیوں کو باری باری سینے سے بھینچ لیا۔ ان کو پیار کیا.. ان کے بوسے لئے اور ان سے طرح طرح کی باتیں کرنے لگی.. جس میں معصومیت تھی.. پیار تھا دُلار تھا۔ اور سکون و دلبستگی کے سارے سامان موجود تھے۔

ساس نے کمرہ میں جھانکا.. بڑی بچی کو بلایا... بیٹی جاؤ سکینہ کی اماں کو بلا لاؤ.. آج کہیں پتہ ہی نہیں؟

پھر وہی دل جلانے والی باتیں۔ اُس چڑیل سے انھیں پتہ نہیں کیا ملنے والا ہے.. جب دیکھو بڑ بڑ لگائے ہوئے ہیں۔ ہر وقت پھر نہ کچھ کھسر پھسر لگا رکھی ہے.. توبہ توبہ... یہ چڑیل پتہ نہیں ہمارے پڑوس میں کہاں سے آ بسی۔ اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

تدینہ کی ماں تم لوگوں سے دکھائی ہی نہیں دیں۔ ... ـــــ

ہاں کچھ کام تھا... وہ جھینپ گئی... پھر بہو نے کوئی لفظ نہ سنا۔

شام کو تدینہ کی ماں نے بتایا... سامان لے آئی ہوں... اچھا اچھا. پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

بہو نے گھنی ان سنی کردی.. اماں پتہ نہیں اس سے کیا کام لے رہی ہیں۔ مجھے کیا لینا دینا۔ بچیوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا، وہ پڑوس کے چھوٹے بچے کو کھلا رہی تھیں۔ مگر ہر ایک اس کو زیادہ سے زیادہ ہنسانے کا سہرا اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ ان کے کشمکش، کھینچا تانی کا انداز پیدا تھا۔

دوسری صبح بہو سے کچھ کہے بغیر ساس کہیں چلی گئیں۔

بہو دوپہر کے کھانے پر ان کا انتظار کرتی رہی.. مگر وہ شام کو لوٹیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔

اس دن ان کی نماز غیر معمولی طور پر لمبی ہوگئی... آج تک ان کے ہاتھ میں تسبیح نہیں دیکھی گئی تھی۔ بڑا تعجب ہوا.. وہ ابھی تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ صفدر دفتر سے آپہنچا۔ اس نے ماں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ ناشتہ بھی کر چکا۔ مگر ماں نماز ہی میں مشغول رہیں۔

اس نے ماں کے بارے میں پوچھا۔

اماں تسبیح پڑھ رہی ہیں.. صفدر نے تعجب سے سنا.. پھر خاموش ہوگیا۔ اس نے دیکھا... ماں کی انگلیوں میں تسبیح دبی تھی.. وہ اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

شام ہوتے ہوتے ساس نے تسبیح ختم کی۔ وہ صفدر کے پاس آبیٹھیں... شاید وہ بھی ماں سے باتیں کرنے کا متمنی تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھیں بیٹے سے باتیں کرتی رہیں.. نہ جانے کیا کیا؟

صفدر کی بیوی کو ہمیشہ سے یہ شکایت رہی ہے۔ ماں سے اس طرح بات کرتے ہیں۔ جیسے اُن سے پہلی بار مل رہے ہوں۔ مجھ سے تو دو لفظ پیار کے بھی کبھی نہ کہے ہوں گے.... میں تو ترس گئی۔ وہ گردن جھکائے باورچی خانہ کی دھواں دار فضا میں گھستی رہی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ جیسے ساری خوشیوں کا جوش و خروش اس فضا میں آکر ختم ہوگیا ہو۔

اس کے لئے زندگی کی رفتار ڈھیلی اور سست ہوتی جارہی تھی.. اُس کی طبیعت مسلسل گرنے لگی۔ ساس کی مصروفیات بڑھتی رہیں۔ مگر ان کی نگاہ مستقل طور پر بہو کی نگرانی کرتی رہی۔

ایک دن علی الصبح ہی بہو کی آنکھ کھلی۔ بچی نے پیشاب کر دیا تھا۔ بستر بھیگ چکا تھا۔ اس نے بچی کو غصہ میں کئی دھکے دے کے۔ وہ زور زور سے چیخ مار کر رو پڑی۔ بغل کی چارپائی پر سوتے ہوئے صفدر کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بستر لپیٹ کر رکھ دیا۔ سرہانے پڑے ہوئے ایک کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہی رہ گئی۔ کسی [illegible] بچے کا کرتہ [illegible] جیسا تھا۔

یہ کیا ہے؟ .. وہ شوہر کو متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

صفدر نے چہرہ سے چادر ہٹائی.. ادھر لاؤ.. بیٹا! نہ لیک کر [illegible] اس نے بیوی کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ شوہر کی اس پھرتی کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُسے ایسا لگا جیسے اس رنگین کپڑے کے بارے میں اُسے سب کچھ معلوم ہو... وہ خاموشی سے شوہر کا بھولا ہوا پائجامہ بدلنے لگی۔

خلافِ معمول آج صفدر نے چھٹی لے لی تھی۔ صبح ہی سے وہ کسی کام کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اماں نے اسے سمجھا کر بڑا یا.. بیٹا! اسے کسی فقیر کو دے آؤ۔

پھر چلا۔۔ وہ ہڑ بڑا گیا۔۔ سگریٹ کا گل بڑی دیر سے رکا ہوا تھا۔ وہ پیر پر آرہا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
اس کے قدم گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ نظریں پیچھے گئیں۔۔۔ ایں ایں۔۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ رہا۔
اُس کی بیوی نے دیکھا۔۔۔ وہ آنکھیں مل رہا تھا۔ ساس مسکرا اٹھی تھیں۔ وہ بے ساختہ اپنی گردن پردہ سے باہر نکال کر جھانکنے لگی۔
عورت غائب ہو چکی تھی۔

صفدر آہستہ قدموں سے چلتا لڑکے کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کی نگاہیں چوراہے پر ملنے والی چاروں راہوں کا جائزہ لینے لگیں۔ جیسے وہ کسی مسافر کی راہ تک رہی ہوں۔ تپتی دھوپ میں زمین سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ جیسے دھرتی کا سوز زمین پر بسنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو۔

لڑکا پسینہ سے تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ بار بار پیر بدلتا رہا۔ صفدر خاموشی سے سگریٹ پھونکتا رہا۔ وہ بھی پسینہ سے شرابور ہو چلا تھا۔ ململ کا کرتا بھیگ کر تندرست جسم سے چپک گیا تھا۔ رومال چہرہ سے پسینہ پونچھتے پونچھتے تر بتر ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں رومال دوسرے میں سگریٹ دبائے ساکت کھڑا تھا۔ نگاہیں سنسان راستوں پر کسی اجنبی مسافر کے انتظار میں تھیں۔ جوان کے لئے ان کا مانا جانا سندیس لا رہا ہو۔ من چاہا۔۔۔ دلپسند نوید، وہ سب سہ تن انتظار بن گئے تھے۔۔۔ ساس اب تھک کر دروازہ کی چوکھٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ ایک ٹک دیکھنے میں ان کی آنکھیں پلک جھپکانا بھی بھول گئی تھیں۔

صفدر کی بیوی کئی بار ستا کر چک سے لگ کر آکھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا گمان شاید صحیح ثابت ہو۔ وہ یقین و گمان کے پلڑے میں جھولتی رہی۔ سوچتی رہی۔

لڑکے نے اشارہ کیا۔۔ صفدر نے مخالف سمت میں دیکھا۔۔ دو بچے آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے۔ صفدر کی بیوی نے محسوس کیا اس کا شوہر اُن بچوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ بچے اسکولی وردی پہنے چلے آرہے تھے۔ دونوں نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے اسی سمت بڑھے آرہے تھے۔ ایک بچے نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے سر میں پیچھے کی طرف بندھے ہوئے بال نظر آئے۔۔۔ پھر وہ دونوں مڑ گئے اُسی راستہ پر۔
ماں بیٹے کی آنکھیں ملیں اور مایوسی سے پلٹ آئیں۔

شبیہ چہرے کے انتظار میں منتظر آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ دھوپ اب لڑکے کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار پیر بھی پٹکے شاید کھڑے کھڑے اس کے پیر سُن پڑ چکے تھے۔ صفدر کی بیوی نے دیکھا۔۔۔ لڑکے کے ہونٹ ہلے۔۔۔ اس کے شوہر نے کچھ دلاسا دیا۔۔ مگر وہ بھی۔۔۔ سورج کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ گویا کہہ رہا ہو کیا آج ہی کے لئے ساری تپش تھی کاش، خوش قسمتی کا ابر ذرا چھا جاتا۔

جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہانپتا۔۔ ایک آدمی نظر آیا۔ صفدر نئی سگریٹ منہ میں دبائے دیا سلائی کی تیلی نکال چکا تھا۔ سر پر گٹھڑ اٹھائے۔۔ ہاتھ میں جھولا لٹکائے وہ اسی طرف بڑھا آرہا تھا۔ دیہاتی آدمی پھر شاید اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ ادھ کھلی دیا سلائی اور تیلی اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ صفدر کا دل زور زور سے دھڑکا۔ اس کی بیوی نے دیکھا۔ اس کا شوہر مسکرایا۔۔۔ باچھیں کھلیں، پھر بن جلا سگریٹ منہ سے نکل کر دور جا گرا۔۔۔ وہ دو ہی چار قدموں میں گھر کے اندر تھا۔

ماں نے جھٹ پٹ بلائیں لے ڈالیں۔ انھوں نے بیٹے کے سر کو جھکا کر کندھے سے لگا لیا۔ ان کا پوپلا منہ پورا کھل گیا تھا۔ نچلی داڑھ کا وہ کالا سٹونٹ دانت متبسم چہرہ پر بھدا معلوم ہو رہا تھا۔ بہو نے محسوس کیا۔ ماں بیٹے کی نگاہیں کسی نوید کا پیغام دے رہی تھیں۔۔۔ کسی شبیہ چہرے کا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپانے کے لئے کمرہ سے باہر نہ نکل سکی۔ اس نے اپنے گرد چادر لپیٹ لی اور چہرہ چھپا لیا۔ جیسے وہ اس راز کو کچھ اور دنوں کے لئے چھپائے رکھنے کا جتن کر رہی ہو۔

گھر میں عجیب ہلچل سی مچ گئی ... بچّیوں کے لئے مٹھائی آئی ۔ فقیروں کو کھانا کھلایا گیا ۔ ساس ، بہو پر واری صدقے ہوتی رہیں ۔ صفدر نے بیوی سے التفات برتنے کی رفتار بڑھا دی ۔ بچّیوں کے چاؤ چاپلوسی باپ کا وقت زیادہ لینے لگے ۔ انہوں نے بھی دلاسوں کے ڈھیر لگا دئے ۔

ابّو جان .. ہمیں کھلونا لا دیجئے

پھر وہ کھلونے کی تشریح بتانے لگیں ۔

ہم ہوائی جہاز لیں گے زوں زوں اڑتا ہوا

ہم تو گھر گھر کرتی موٹر لیں گے ۔

نہیں نہیں ہم تو .. ابّو سے بابو لیں گے ۔ ننھا منّا .. چھوٹی بچی ٹھنکی اور باپ کے چہرہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے مروڑنے لگی ۔

ابّو جان ابّو جان .. ہم بھی بابو لیں گے ... زرینہ کے بابو کی طرح ... سب بچّیاں ایک ساتھ چلّا اٹھیں ۔

صفدر مسکرا دیا ۔ وہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا .. کیسا بابو ... اس نے پاس رکھے ہوئے جھولے سے تصویروں کا البم نکالا ۔

بچّیاں سب جھک پڑیں ۔ .. رنگین تصویریں ۔ دلآویز ، خوبصورت چھوٹی بچّی نے ورق پکڑ لیا ۔ ابّا ایسا ہم ایسا بابو لیں گے ۔

ہنستی ہوئی بچّے کی تصویر ۔ صفدر کے ذہن میں کھُب گئی ۔ اُس کی ماں نے بھی بیٹے کے کندھے سے جھانکا ۔ وہ بھی کھل اٹھیں ۔

ابّو جان ابّو جان امّی جان کو بھی دکھا دیجئے " اس نے صفدر کی محویت کو توڑ دیا ... وہ تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا ۔

بچّی نے معصومیت سے تصویر کو پکڑ لیا ... وہ بار بار باورچی خانے کی طرف اشارہ کرکے ماں .. ماں کہہ رہی تھی ۔

لو ، لو یہ اپنی امّی کو دے آؤ ۔

چھوٹی بچّی نے وہ صفحہ خود ہی الٹ کر ماں کو دکھا دیا ۔

بچّہ دونوں ہاتھ ... اوپر اٹھائے ... ماں کی طرف لپک رہا تھا ... ماں کے ہاتھ تصویر میں نظر آ رہے تھے ، مگر باقی جسم تصویر میں نہ تھا ۔

اس نے محسوس کیا .. گویا دونوں بڑھے ہوئے ہاتھ خود اسی کے ہوں ۔ اُس نے اپنے دل میں گدگدی سی محسوس کی بے ساختہ اُس نے تصویر کو چوم لیا ۔ بچّی کھڑی ماں کو تعجب سے دیکھتی ہی رہ گئی ۔

مامتا ابل پڑی تھی ... اس کا چہرہ کھل اٹھا ۔ اس نے بچّی کو اپنے سے لپٹا لیا ۔ چٹ پٹ بچّی کے کئی بوسے لے ڈالے ۔ .. وہ گھبرا سی گئی ۔ .. پھر گالوں کو صاف کرتی ماں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی ۔

ساس باورچی خانہ کی طرف کان لگائے تھی ۔ وہ وہاں تک آئیں اور کوئی بات بن سکے اس منظر کو دیکھ کر واپس چلی گئیں ۔

اچانک بچّی نے محسوس کیا وہ ماں کی گود سے چھوٹ رہی ہے ۔ اُس نے ماں کے چہرے کو دیکھا ۔ آنکھیں مندی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہاتھ پیٹ کو دبانا چاہتے تھے ۔ صفدر آنگن ہی میں تھا ۔ اس نے آہ کی آواز سُنی ... وہ بہت چکرایا .. گھوم کر باورچی خانہ کی طرف دیکھا .. چھوٹی بچّی باورچی خانہ سے روتی ہوئی باہر نکل رہی تھی ۔ امّاں امّاں ... ابّو ..

گھر کا ہر فرد بوکھلا گیا ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے ۔ صفدر نرس کے لئے بھاگا ۔ ماں نے بہو کو سنبھالا ۔ بچّیاں وہاں سے ہٹا دی گئیں ۔ پاس پڑوس کی بڑی بوڑھیاں جمع ہو گئیں ۔ دایہ کے لئے آدمی پہ آدمی دوڑا دئے گئے ۔

بیہوشی کیا معنی ؟ .. اللہ رحم .. موت .. ایک کوندا لپکا ... صفدر کی آنکھیں بند ہو گئیں ، پھیلتے ہوئے اندھیرے میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا ... وہ پسینہ میں نہا اٹھا ... اللہ ... رکھنا تیز چلو .. مخنات کے کتنے سراپے آنکھوں کے سامنے پھیل گئے ... سہم گیا ۔ آنکھیں بند ہوئیں .. تاریکی ... اندھیرا .. اس نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں .. تاریکی کے دھبے صاف ... [illegible]

بقیہ افسانہ صفحہ ۳۴۸ پر دیکھئے

روشن آرا نیّر (بھاگلپور)

نوری

شام ہو رہی تھی۔

دھند لکے تیزی سے تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔ صرف پہاڑیوں کے اوپر پھیلے ساگوان اور شیشم کے تناور درختوں پر کچھ چمک باقی رہ گئی تھی۔ چڑھائی کی سب سے لمبی سڑک جو چوٹی کا چکر کاٹ کر سارآں اور مارآں کی طرف دو ٹکڑوں میں بٹ کر بل کھاتی وادی میں اتر گئی تھی۔ اسی پتھریلی سڑک پر گبرو اور شیرا، دونوں تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ اتفاقاً شیرا کی نظر چوٹی پر جا پڑی۔ جہاں ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ شیرا نے گبرو کو مخاطب کر کے کہا۔ "گبرو! بہادر اب بھی زندہ ہے۔ وہ دیکھ اس کی قبر پر روشنی ہو رہی ہے۔"

گبرو نے چونک کر چوٹی کی طرف دیکھا۔ واقعی چوٹی پر روشنی کا ہالہ ٹمٹماتے تارے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا "شیرا! بہادر تو کب کا مر چکا، پر وہ روشنی کیسی ہے؟"

"تو نہیں جانتا گبرو۔" شیرا نے انگوچھے سے چہرہ صاف کیا اور اس کی جانب مڑ کر بولا "انسان مر جاتا ہے۔ پر اس کی روح نہیں مرتی۔ کہتے ہیں جس جگہ سے اسے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اس کی روح اکثر وہاں کا چکر کاٹتی ہے۔ ہو سکتا ہے، اسی کی روح یہاں ہو جسے ہم روشنی سمجھ رہے ہیں!"

گبرو نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ خاموشی سے نیچے وادی میں دیکھنے لگا۔ سوفٹ گہری وادی میں سارآں اور مارآں کی جھونپڑیاں صاف طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اور ان جھونپڑیوں سے روشنی کی کرنیں لمبی لمبی لکیریں معلوم ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف سے پہاڑیوں نے سارآں اور مارآں گاؤں کو اس طرح اپنی آغوش میں ... کی طرح گھیر رکھا تھا۔ اور پہاڑیوں کی آغوش میں ان دونوں گاؤں کے ڈھور ڈنگر جیسے ہو گئے تھے۔ شیشم اور ساگوان کے درختوں کے علاوہ مختلف قسم کی جھاڑیوں نے ایک قسم سے پہاڑیوں کو ڈھک رکھا تھا۔ نیچے وادی میں کھیتوں کے علاوہ سبز گھاس کے میدان بھی تھے۔ جہاں کھیتی بھی ہوتی تھی اور مویشی بھی چرتے تھے۔ سرحد کے طور پر دونوں گاؤں کو جدا کرنے والی سڑک پر گبرو اور شیرا قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔

شیرا نے چوٹی کی جانب دیکھا۔ پہاڑی سڑک، زلفوں کی طرح پیچ و خم کھاتی اوپر چلی گئی تھی۔ سڑک کے اطراف کی ... نگاہوں سے دیکھ کر شیرا نے کہا "ماں کہتی ہے۔ میرا بھی قد ... اور لمبا چوڑا تھا۔ شانوں کے ... اور سینہ تو مجھ ہی سے ملتے جلتے تھے۔" شیرا نے سینہ تان کر سینہ پھلا دیا۔ گبرو نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ تاریکی میں بھی اب شیرا کا سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ سینہ اور پٹھے سے پھیل کر گبرو کی نظر اس کی مچھلیوں پر جا پڑی، تنے پٹھے اور ابھرتے بازو کی مچھلیاں فولاد کی طرح سخت لگ رہی تھیں۔ گبرو نے نظر موڑ کر اپنے پٹھے، سینہ اور بازو کا جائزہ لیا۔ پٹھے کی نکلی ہڈیاں، بازو کی سوکھی مچھلیاں اور پنجرہ صرف کی طرح بے ہنگم سینہ۔ شیرا کے مقابلے میں گبرو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔!

گندمی رنگت، سیاہ گول آنکھیں، بڑی مونچھوں اور خوبصورت جسم والا شیرا، سارا گاؤں کے جاگیردار کا نائی تھا۔ اور گبرو مارآں کے جاگیردار کے منشی کا لڑکا۔ اس طرح کی دوستی اس سے پہلے دونوں گاؤں کے کسی فرد میں نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ دونوں گاؤں کے جاگیرداروں میں خاندانی عداوت چلی آ رہی تھی۔ اور اکثر کسی نہ کسی بات پر جھڑپ ہو ہی جاتی تھی۔ ایک دو لاشیں گرتیں، اور کچھ زخمی ہو جاتے۔ دونوں دوست اچھی طرح جانتے تھے کہ ساراں اور ماراں کے باشندے کو گلے لگانے والا کون تھا؟ کس کی بدولت گاؤں کے بیچ سے سالوں سال کی دشمنی ختم ہوئی تھی۔ اگر بہادر کے سینہ میں ماراں کے جاگیردار کی گولی نہ لگتی تو، ایسا کبھی نہ ہوتا! مگر ماراں کے زمیندار نے بہادر کو گولی مار کا تو کیوں؟ اور کبھی گاؤں والوں کی جرأت نہ ہوئی کہ اس کی وجہ پوچھتے۔ بلکہ دونوں گاؤں کے باشندوں کو حکم تھا کہ کوئی بھی کچھ یہ جاننے کی کوشش نہ کرے کہ بہادر کیوں مارا گیا؟ شیرا ماں اور نانا سے بہادر کے متعلق پوچھتا۔ مگر ماں خاموش ہو جاتی تھی۔ اور نانا دوسری طرف منہ کر لیا کرتے تھے۔ ماں بہادر کے نام پہ خاموش تو ہو جاتی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک کیوں آجاتی تھی۔ یہ سمجھنے سے اس کا دماغ قاصر تھا۔

آخر بہادر کے نام پر ماں کی آنکھیں کیوں بھر آتی ہیں؟

بہادر کے جوانمردی کے گیت گانے والی زبان بند کیوں ہو جاتی ہے۔

اس نے بہت سوچا، پوچھا ——— مگر مایوسی کے سوا اُسے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ساراں اور ماراں دو بھائی تھے۔ چونکہ وہ لوگ خانہ بدوش تھے۔ اس لئے ویران علاقے کو اپنے لئے چنا۔ دونوں بھائیوں کا قبیلہ پہاڑ کی وادی میں بس گیا۔ دونوں نے آپس میں پہاڑیوں اور زمینوں کا بٹوارہ بھی کر لیا۔ گاؤں کے باشندے خوش تھے۔ آپس میں لین دین شادی بیاہ۔ رسم و رواج سبھی قائم تھے۔ دونوں میں اگر کچھ حد تک فاصلہ تھا تو صرف گاؤں کے نام کا۔ ورنہ زمین ایک تھی۔ ایک ہی فضا میں سانس لیتے تھے اور ایک ہی آبشار کا دونوں پانی پیتے تھے۔

لیکن ایک دن ساراں اور ماراں اپنی ہی زندگی میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ محض معمولی سی بات تھی۔ ماراں کے بیٹے کو ساراں کی بیٹی سے پیار ہو گیا تھا۔ اور ایک رات ماراں کا بیٹا ساراں کے یہاں سانپ کے کاٹنے سے مر گیا۔ کسی نے موقعے سے فائدہ اُٹھا کر ساراں جاگیردار تک یہ بات پہونچا دی کہ ساراں اپنی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور رستہ صاف کرنے کے لئے زہر دے کر مار ڈالا۔ ساراں نے لاکھ سر پٹکا۔ قسم کھائی۔ پر ماراں تو غضب کا شعلہ بنا ہوا تھا۔ اسی دن سے دونوں بھائیوں میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی تعمیر شروع ہو گئی۔ زمانے کی رشتہ داری ختم ہوئی۔ اکثر دونوں جانب سے ذرا ذرا سی باتوں پر جھڑپ ہو جاتی۔ اور دشمنی کا سلسلہ اسی زمانے سے چلا آ رہا تھا۔

مگر بہادر ——— جس کے متعلق گاؤں والوں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ ایک مفرور قیدی تھا۔ جو انگریزی حکومت سے چوری چھپے جیل سے بھاگ کر آیا تھا۔ اور ساراں آکر وہ زمیندار کے رحم و کرم پر بس گیا تھا۔

بہادر ایک لمبا چوڑا، خوبصورت جوان تھا۔ اس کا سخت بدن دھوپ میں سرخ لوہے کی طرح چمکتا تھا۔ کشادہ چھاتی، بڑی بڑی آنکھیں اور ان آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی لکیر۔ جب وہ اپنے رخسار پہ پھیلی مونچھوں پر گھی کی مالش کر کے کاندھے پر لٹھ رکھ کر گاؤں میں نکلتا تو دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ساراں اور ماراں میں، بہادر جیسا کوئی جوان نہ تھا۔

گاؤں کی لڑکیوں کا کیا کہنا ——— سبھوں کے دلوں میں بہادر کا خوبصورت جسم، بہادر ہی کی طرح ڈولا کرتا تھا۔ لڑکیوں نے مویشی چرانا اور جنگل میں بے مقصد بھٹکتے رہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے برعکس لڑکیوں کے دلوں میں بہادر کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا رہتی تھی۔ بہادر گاؤں کی سڑک پر چلتا تو، لڑکیاں آپس میں ہم آغوش ہو جاتیں۔ جیسے وہ آپس میں نہیں بلکہ بہادر سے ہم آغوش ہو رہی ہوں۔

اور لڑکی سے پوچھا "تو کون ہے۔ کل بھاگ کیوں گئی تھی ؟"

"میں نوری، ساراں کے زمیندار کی بیٹی ہوں"۔ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ "کل تجھے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔"

"اور آج ___ ؟"

"___" بہادر نے گلاب کی لچکتی ڈالی جیسی جسم والی نوری کے ہونٹوں پر ایک مجوب مسکراہٹ دیکھی۔ رخسار بھی دہک رہے تھے اور آنکھیں بھی بارِ حیا سے جھک گئی تھیں۔

بہادر نے کہا۔ "نوری! تو میرے دل کے قریب آ اور اس میں اس سلگتی ہوئی آگ کو دیکھ جو کل تو نے لگائی تھی۔ میں رات بھر اس میں سلگتا رہا ہوں۔"

"لیکن ___ یہ سرحد؟"

"سرحد ___" بہادر نے منہ بنا کر کہا۔ "سرحد تو ان لوگوں نے قائم کی ہے جن کے پاس دل نہیں۔ ہم دونوں کے پاس دل ہے۔ اور دلوں کے درمیان کوئی سرحد نہیں ہوتی۔"

نوری اس کی باتوں میں کچھ دیر کھوئی رہی۔ اس کا معصوم دل سرحد کے پار جانے سے ڈر رہا تھا۔ مگر اس کے پاؤں خود بخود سرحد کے پار چلتے گئے۔ اور وہ بہادر کے بالکل قریب آ گئی۔ بہادر نے نوری کے نرم و نازک ہاتھوں کو تھام لیا۔ اور نوری کا کنوارا جسم غیر مرد کے ہاتھوں کے لمس سے لرز سا گیا۔ کسی مرد نے اسے چھوا تک نہیں تھا۔ اور بہادر اس کے ہاتھوں کو تھامے بڑی پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نوری شرم سے جھکی جا رہی تھی۔ اور بہادر، نوری کی شربتی آنکھوں میں جیسے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

بہادر نے اپنی تیز تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ "نوری تو ماراں کی ہے اور میں ساراں کا۔ پھر ہم دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟"

بہادر کی باتوں پر نوری نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ بہادر کے چہرے پر فکر کی سیاہ لکیریں ابھر آئی تھیں۔ دونوں کی منتظر نگاہیں کچھ دیر کے لئے آپس میں الجھی رہیں۔ نوری کی نگاہوں نے بہادر کی آنکھوں میں زندگی کا ایک انوکھا اور نرالا پیغام دیکھا اور وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

"بہادر ___" نوری اس کے سینے میں سر چھپا کر بولی۔ "میں تجھے روز چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی۔ جس دن سے تجھے دیکھا ہے، شاہ جی کے مزار پر روز گھی کے چراغ روشن کرتی ہوں اور تجھے مانگتی ہوں۔ تو فکر مت کر، ہم دونوں ایک دوسرے کے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ہم دونوں کو جدا کر سکے۔"

نوری کی حوصلہ مند باتیں سن کر بہادر کو ایسا لگا جیسے واقعی نوری اس کی ہو گئی اور اس نے نوری کو اپنے چوڑے چکلے سینے میں زور سے جکڑ لیا اور بولا۔ "تو بڑی ظالم ہے نوری! اتنے دنوں بعد میرے پاس آئی۔ سچ نوری تیری محبت نے مجھے ایک بار پھر سے زندہ کر دیا۔ چل، چل مجھے شاہ جی کے مزار پر۔ میں بھی تیرے ساتھ اپنی مرادوں کے واسطے گھی کے چراغ روشن کروں گا۔"

"آج نہیں بہادر۔" نوری نے کہا۔ "پیر کی شام کو چلنا۔ شاہ جی بڑا ہی اللہ والا ہے۔"

بہادر نے ساراں اور ماراں کی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "دیکھ نوری! دونوں گاؤں کیسے خوبصورت لگ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم دونوں آسمان پر ہیں اور نیچے جھلملاتے تارے۔"

نوری نے وادی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔"

"مگر تیری آنکھوں میں جو خوشی کے دیپ جل رہے ہیں اُن سے کم۔"

اور نوری اس کی بے باکی پر سمٹ سی گئی۔ بہادر چٹان پر بیٹھ گیا اور نوری کا ہاتھ کھینچ کر بولا۔ "آ نوری میرے پاس آ جا۔"

نوری کو ایسی توقع نہ تھی۔ بہادر کے کھینچنے پر وہ یکدم سے بہادر کی آغوش میں آ رہی اور جب اپنے آپ کا ہوش آیا تو بہادر کی نگاہ اپنے سینہ کی دھڑکنوں میں چبھتی محسوس ہوئی۔ لجا کر وہ اور بھی بہادر کی آغوش میں سمٹ گئی۔ بہادر اور نوری نے ایک دوسرے کا مکمل طور پر اعتماد حاصل کرنے کے لئے شاہ جی کے مزار پر جا کر قسم کھائی۔ دونوں کے دلوں میں جو گناہ اور خوف کی رکاوٹ تھی، صدق دل سے کھائی ہوئی قسم نے اسے دور کر دیا۔ سماجی رشتہ کے بندھن میں بندھے بغیر ہی وہ ایک دوسرے کے مکمل طور پر ہو گئے۔

اور پھر کچھ دنوں میں ساراں کے جاگیردار کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ وہ مارے غصے کے کانپنے لگا اور بندوق لے کر تیزی سے چوٹی کی جانب چل پڑا۔۔۔ نوری اس وقت بہادر کے سینے پر سر رکھے دوشیزگی کے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ زلفوں نے بہادر کے سینے کو ڈھک لیا تھا اور خمار بھری آنکھیں بہادر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ بہادر مخمور نگاہوں سے نوری کے پیازی لبوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک گرجدار آواز پر دونوں چونک پڑے۔

نوری کا باپ ہاتھ میں بندوق لیے سرخ سرخ آنکھوں سے دونوں کو گھور رہا تھا۔ جاگیردار نے گرج کر کہا۔ "اے اوگتے۔ ساراں جیسے ناپاک گاؤں میں رہ کر تم نے ساراں جیسے پاک گاؤں کی عزت پر مجھے ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ بتا، ورنہ گولی سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا۔" نوری کا باپ کے غصے سے بخوبی واقف تھی۔ اور وہ تیزی سے ڈھلوان پر وادی کی طرف دوڑ پڑی۔ جاگیردار گرج کر بولا۔ "رک جا نوری! ورنہ میں گولی مار دوں گا؟"

مگر نوری رکی نہیں۔ جاگیردار نے نشانہ بنا کر اس کی طرف گولی چلا دی۔ مگر عین وقت پر بہادر نے آگے بڑھ کر بندوق کی نال اٹھا دی۔ گولی شیشم کے درخت سے ٹکرا کر رہ گئی۔

جاگیردار اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اور بندوق سے بکھرتا دھواں فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ بہادر نے کہا۔ "جاگیردار! ناپاک انسان کا ذہن ہوتا ہے دھرتی نہیں۔"

اور بہادر نے وادی کی طرف نظر ڈالی۔ نوری تیزی سے ساراں کی طرف جا رہی تھی۔

بہادر نے گھبرا کر آواز دی۔ "نوری آگے مت جا۔"

آواز نوری تک گئی یا نہیں، البتہ آواز کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

"ناپاک کتے۔" جاگیردار نے کہا۔ "ایک تو تو میری عزت سے کھیلا اور جب میں اپنی خود داری کا گلا خود سے گھونٹ رہا تھا تو تو نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بتا تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"جاگیردار! تم اپنے ناپاک الفاظ واپس لو۔" بہادر نے گرج کر جواب دیا۔ "بے شک نوری تمھاری عزت ہے اور میں شاہ جی کے مزار کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اب تم سے زیادہ نوری میری عزت ہے۔ تمہاری نظروں میں یہی گناہ ہے کہ میں ساراں کا ہوں۔ تم آپس میں سرحد قائم کر سکتے ہو مگر دلوں کے درمیان نہیں۔ جاگیردار! تمھیں مجھ سے شکایت ہے تو بے شک مجھے مار دو۔ مگر خدا کے واسطے انسانوں کا خون کرنا بند کر دو ساراں اور ساراں کے معصوم باشندوں کو آپس میں ملنے دو، تمھیں نوری کی قسم۔"

"خاموش کتے۔" جاگیردار نے چیخ کر کہا۔ "نوری کا پاک نام تو اپنی زبان پر مت لا اور نہ ساراں سے ملنے کی بات زبان پر لا کے مر۔ اب تو مر۔ میں تجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔" قبل اس کے کہ بہادر اپنی جان بچاتا جاگیردار کی گولیاں پے در پے بہادر کے سینے میں اترتی گئیں۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ گہرے سرخ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ بہادر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "جاگیردار! میرے اس خون سے اگر تم دونوں آپس میں مل جاؤ تو میری روح کو بڑا سکون ملے گا۔ مگر تمھیں شاہ جی کی قسم۔ نوری سے کچھ نہ کہنا۔ ہم دونوں نے شاہ جی کے مزار پر آپس میں شادی کر لی تھی۔ نوری ایک مقدس لڑکی ہے اور رہے گی۔"

"بہادر۔۔۔" اور نوری کی چیخ نے بہادر کی آواز دبوچ لی۔ اس نے بمشکل سر گھما کر دیکھا۔ نوری پسینے سے تر بتر ہو رہی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ جابجا خراشیں پڑ جانے سے خون رس رہا تھا۔ وہ دوڑ کر بہادر سے لپٹ گئی اور سسکیاں لے کر بولی۔ "آخر بابا نے تجھے مار ہی ڈالا۔"

"نوری تو فکر مت کر پگلی۔ اب دونوں گاؤں والے آپس میں مل جائیں گے تو۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ماراں کے جاگیردار کے پیچھے ساراں کے جاگیردار اور گاؤں والوں کو سخت بپھرے ہوئے انداز میں بڑھتے دیکھا اور وہ چیخنے لگا۔ "نہیں! تم لوگوں کو میری قسم جاگیردار کو کچھ نہ کہو، یہ بے قصور ہے۔" وہ ہانپنے لگا۔ پھر سانس پر قابو پا کر بولا۔ "ماراں اور ساراں کے باشندو اور جاگیردارو، تمھیں اپنے خدا کی قسم آپس میں مل جاؤ۔ ایک ہو کر رہو۔ بس میری یہی آخری خواہش ہے۔ اور ہاں مجھے اسی جگہ دفن کر دینا۔ تاکہ میں اس بلندی سے تمھیں ہمیشہ خوش و خرم دیکھتا رہوں۔"

اور بہادر نے زور سے ایک ہچکی لے کر دم توڑ دیا۔

ساماں کے جاگیردار نے کہا "ارکانو! تو نے بہادر کو مار کر باپ دادا کا پچھلا بدلہ لے ہی لیا۔"

اور ماراں کا جاگیردار آنکھیں پھاڑے نوری کو دیکھ رہا تھا جو بہادر کے سینے سے لپٹی ہچکیاں لے رہی۔ جس کا لباس بہادر کے گاڑھے تازہ خون سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگا ہے گبرو ۔۔" شیرا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں شیرا۔" گبرو نے جواب دیا۔

دونوں دوست چڑھائی عبور کر رہے تھے۔ وہ دونوں بہادر کی قبر کے بالکل قریب تھے۔ بہادر کی قبر ساراں و ماراں کے باشندوں کی نگاہوں میں شاہ جی کے مزار سے کچھ کم عقیدت کی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ بہادر ہی کی قربانی نے دونوں گاؤں والوں کو ملا کر ان میں نئی زندگی اور یگانگت پیدا کی تھی۔ دلوں کے خشک کھیتوں میں بہادر کا خون ہریالی لایا تھا۔

گبرو اور شیرا نے تعجب سے مزار کی جانب دیکھا۔ ایک عورت مزار کے سرھانے بیٹھی تھی۔

"یار اندھیرے میں بھلا اتنی دور کون آ سکتا ہے۔ چل دیکھیں تو کون ہے۔" شیرا نے کہا۔

"اپنے کو کیا۔ کوئی ہوگا۔" گبرو نے کہا "جلدی چل، شام ہو رہی ہے۔ بابا انتظار کرتا ہوگا۔"

شیرا اُس کی سُنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مزار کے پاس جاتے ہی وہ حیرت سے چیخ پڑا "ماں"۔

عورت نے چونک کر دیکھا اور کہا "ارے شیرا! تو اتنی جلدی آ گیا!"

"مگر تو شام کو روز یہاں کیوں آتی ہے ماں؟"

ماں نے اپنے لختِ جگر کو تھوڑی دیر تک دیکھا اور قریب جا کر اُس کی پیشانی چوم کر بولی "بہادر کی قبر پر دیا جلانے آئی تھی۔ تو بھی ایک دیا روشن کر دے اپنے باپ کی قبر پر۔"

"ماں ۔۔ ؟؟"

"ہاں شیرا ۔۔ بہادر تیرا باپ تھا۔"

"بہادر میرا باپ تھا۔" شیرا چیخ پڑا۔ "ماں! مگر تو نے تو کہا تھا کہ تیرا باپ لڑائی میں مارا گیا۔"

"ہاں شیرا ۔۔" نوری نے کہا "تیرا باپ سرحد کی لڑائی میں مارا گیا۔"

اور شیرا نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ باپ کے سرھانے دیا روشن کر دیا۔ نوری کو اس روشنی میں ایسا لگا۔ جیسے شاہ جی کے مزار پر بہادر اس کی شادی کی رات کی طرح گھی کے دیئے جلا رہا ہو۔ اور وہ بلکنے لگی۔ اُس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو کے قطرے اُمڈ کر جھریوں پڑے چہرے سے پھسل کر آنچل میں جذب ہو رہے تھے۔

۔۔۔ بقیہ افسانہ "نامراد" صفحہ سے آگے ۔۔۔

چلے گئے۔ مشعل روم کچھ نہ تھا۔ دعائیں بے ساختہ منہ سے نکل رہی تھیں۔ .. اللہ تو ہی میری بچیوں کا نگہبان ہے ۔۔۔ رکشہ رکا صفدر اندر بھاگا۔ عورتوں نے سسکے کر کے [illegible] ماں عورتوں کے بیچ سے بڑبڑاتی ہوئی آئیں "پتہ نہیں کہاں کا پھوٹا نصیب لکھ کر آئی ہے۔" صفدر چکرا گیا۔ اُس کے [illegible] اُس نے [illegible] دیوار کا سہارا لیا۔

[illegible] نے پُرتشویش لہجہ میں پوچھا...

"صفدر .. صفدر... ! آپ کو کیا ہوا؟" ۔۔ صفدر کی زبان گنگ تھی۔ اُسکے کان بہرے ہو رہے تھے۔ عورتوں نے دیکھا اُسکی نگاہیں تینوں بچیوں پر گڑی ہوئی تھیں [illegible] خوفزدہ انداز میں ... باپ کے چہرے پر پدرانہ محبت کے نقوش تلاش کر رہی تھیں۔

محمد شاہد عظیم

احساس جاگا!

وہ اُسے چھپ چھپ کر کھڑکیوں اور کواڑوں کی آڑ سے دیکھا کرتی تھی۔ دراز قد، چھریرا ورزشی جسم، بکھرے ہوئے بال، چہرے پر ایک عجیب سا بھولا پن۔ جب وہ بات کرتا تو بالکل بچّوں کی سی معصومیت چہرہ پر چھا جاتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ کواڑوں سے لگی سروپ کی باتیں سن رہی ہوتی۔ یکایک کسی کے آنے کی آہٹ سُنائی دیتی۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور وہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ اگر اماں دیکھ لیں تو کیا کہیں گی۔ یہ خیال کر کے وہ وہاں سے ایسی بھاگتی کہ اپنے کمرے میں آکر دم لیتی۔ توبہ!! ایک لڑکی کے لئے اس سے زیادہ کیا بے شرمی ہو سکتی ہے۔ وہ قسم کھاتی کہ وہ پھر اُسے نہیں دیکھے گی۔ بھلا اُس میں ہے ہی کیا!! یوں ہی معمولی لڑکوں جیسا ہے۔

سروپ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ تنخواہ کم تھی اس لئے اُس نے دو تین جگہوں پر چھوٹے موٹے کام سنبھال رکھے تھے۔ وہ سویرے گھر سے چلا جاتا اور رات دیر گئے گھر لوٹتا۔ گھر میں اُس کی بوڑھی ماں تھی۔ سروپ دونوں وقت اوشا کے سامنے سے گزرتا۔ کندھے پر کوٹ ڈالے۔ ہونٹوں سے سیٹیاں بجاتا، اپنے خیالوں میں کھویا ہوا، قدموں کی چاپ سے اُس کے کان اس قدر مانوس تھے کہ وہ دُور ہی سے پہچان لیتی۔ نپے تلے قدم۔ زمین کا سینہ کوٹتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز۔ اوشا اُس وقت کوئی کام کر رہی ہوتی تو کام روک دیتی۔ پھر آہٹ پر اُس کا دل دھڑک اُٹھتا اور وہ گھبرا کر سمٹ جاتی۔ وہ یوں پسینہ پسینہ ہو جاتی جیسے سروپ انجانے طور پر اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ وہ اُن آنکھوں کو بھلا کیسے سکتی تھی۔ درد سے بھری مسکراتی آنکھیں۔ اُف وہ آنکھیں جو ہر دم اُسے اپنا پیچھا کرتی معلوم ہوتی تھیں۔

اُسے گرمیوں کی وہ سنسان دوپہر تک اب تک یاد تھی۔ جب پہلی بار دونوں کی نظریں ٹکرائی تھیں۔ چلچلاتی دھوپ پھیل کر برآمدے تک آگئی تھی۔ گرم جھلستا ہوا سورج نیم کے اوپر بڑی شدّت سے چمک رہا تھا۔ اوشا کو پیاس لگی۔ گھر ٹونٹی خالی پڑی تھی۔ ابھی کل ہی تو ممی نے گھڑا پھوڑا تھا۔ جس پر خوب پٹائی ہوئی تھی اُس کی۔ اوشا نے باورچی خانے کا رُخ کیا۔ وہاں فرید پانی پی رہا تھا۔ کونے میں صراحی مل گئی۔ جس کے پیندے میں تھوڑا سا پانی اُس کا منھ چڑا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ صراحی کو زور سے زمین پر ٹپک دے۔ وہ آنگن میں آئی۔ یکایک نہ جانے کیسے اُس کی نظریں پڑوس کی طرف اُٹھ گئیں۔ دیوار کے اُس پار سے کوئی اُسے پُر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اوشا کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ مارے شرم کے اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اُسے اور کچھ نہ سُوجھا تو جلدی جلدی رسّی پر پڑے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی جو ماں نے سُوکھنے کے لئے پھیلائے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کنکھیوں سے سروپ کی طرف دیکھتی جاتی۔ مگر سروپ نے ایک پل کے لئے بھی آنکھیں نہیں جھپکائی تھیں اور وہ اُسے عجیب والہانہ انداز میں دیکھے جا رہا تھا۔ اوشا نے اپنا جائزہ لیا تو اُس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ بے خیالی میں بغیر دوپٹہ اوڑھے چلی آئی تھی۔ اُس کا سینہ کھلا ہوا تھا۔ ہائے رام ـــ میں تو مر گئی۔ لمحہ بھر میں وہ اپنے کمرے میں تھی۔ اُس نے دروازے کے کواڑ بند کر کے اطمینان کی سانس لی۔ بھگوان کا شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چہرہ پسینہ سے بھیگ گیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ میلوں دوڑ کر آئی ہو۔

سرِ شام ہی سے کمرے میں مشین کی گھر گھر سُنائی دے رہی تھی۔ وہ دن بھر دیوالی جو تھی۔ اوشا کے پیر اور ہاتھ تو تیزی سے چل رہے تھے لیکن گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ اُس نے سلائی روک دی۔ یہ آنے والا سروپ تھا۔ وہ اس آواز کو ہزار آوازوں میں بہ آسانی پہچان سکتی تھی

یہ سروپ بھی کتنی رات گئے گھر لوٹتا ہے، اُسے اپنی بوڑھی بیماریاں کا تو کیا بھی خیال نہیں۔ تبھی تو انکل بیمار پڑ گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ سروپ نے سگریٹ بھی پینا شروع کر دیا ہے۔ ضرور دُکان سے چار مینار سگریٹ لی ہو گی۔ وہ اب بہت سگریٹ پینے لگا ہے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے سروپ نے اپنے مخصوص انداز میں کوئی نہ کوئی دلچسپ بات کہی ہو گی۔ اُس پر پنواڑی کی ہنسی باہر نکل آئی ہو گی۔

اُف وہ۔ میں بھی کن خیالوں میں کھو گئی۔ آدرشا نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور ٹانکے لگانے لگی۔

"ڈکھی من میرے ۔۔۔" گلی کے سناٹے میں ایک آواز اُبھری۔ آدرشا نے کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ گلی میں ایک تنہا سا سایہ ڈول رہا تھا۔ سروپ نے آہستہ سے اپنے سامنے پڑی ہوئی کنکری کو ٹھوکر ماری۔ کنکری شور مچاتی سڑک کی دوسری طرف چلی گئی۔ جہاں تاریکی اور گہرا سناٹا تھا۔ ایک طرف گلی کے سارے کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔ ارے ۔۔۔۔ رے۔ ہش اور وہ آگے بڑھ گیا۔ گلی دوبارہ پُرسکون ہو گئی۔

اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی سروپ کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ ہر دم، ہر وقت سروپ کا تصوّر۔ اگر کچھ دن اور یہی حال رہا تو میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ سروپ میرا کون لگتا ہے میں اُسے روز دیکھتی ہوں۔ اُس نے بھی کوشش کی کہ مجھے دیکھے۔ وہ پھر خود ہی اپنی ان بے نام اُلجھنوں پر ہنس پڑتی۔

سروپ کی عادتیں، سروپ کے پسندیدہ کھانے، بچپن سے لے کر جوانی تک کے اَن گنت واقعات، کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو آدرشا کو یاد ہو گئی تھیں۔ ۔۔۔۔۔۔ آدرشا کبھی سروپ کی ماں کے سامنے سروپ کے بچپن کا کوئی واقعہ یا پسند کا تذکرہ چھیڑ دیتی تو وہ حیران رہ جاتی۔ اُسے خود یاد نہیں تھا کہ یہ تمام باتیں اُسے کیسے یاد ہو گئیں۔ اکثر تنہائی میں وہ ان تمام واقعات کی کڑیاں جوڑتی۔ ایسا کرنے میں اُسے سکون ملتا۔ یہ جو ایک کہانی تھی جس میں ربط تھا۔ تسلسل تھا اور بے پناہ بہاؤ تھا اور بلا کی روانی۔ اِس کہانی کے نوک پلک دُرست کرتے کرتے وہ خود اِس کا جزو بن گئی تھی۔

آدرشا گھنٹوں سروپ کے تصوّر میں گم رہتی۔ سروپ اپنے کمرے میں پڑھ رہا ہو گا۔ وہ پیچھے سے جا کر اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دے گی جب تک وہ پہچان نہ لے گا۔ ہاتھ ہٹائے گی نہیں وہ خوشامد کرے گا۔ میری بلا سے۔ نہیں نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ پھر میں لال باغ لے چلنے کا وعدہ لے کر ہٹوں گی۔ وہاں ہم دونوں خوب گھومیں گے۔ شام میں جب سورج لال، بنفشی، زرد رنگ سمیٹنے لگتا ہے تو اس وقت لال باغ کتنا حسین ہو جاتا ہے۔ تب میں سروپ کے سینے پر اپنا سر ٹیک دوں گی۔ اُسے میری آنکھیں پسند ہیں۔ وہ انھیں لوگوں کی نظریں بچا کر ضرور چوم لے گا اور ۔۔۔ اور ساری آدرشا کہاں کھو گئی۔ دیکھو تو کم بخت بلی سارا دودھ پی گئی۔ ماں نے آواز دی۔ اچھا ماں ابھی آئی۔ اکثر یونہی ہوتا۔ اُس کے خوابوں کے تانے بانے بکھر جاتے اور وہ مسوس کر رہ جاتی۔

ماں تو کھانا جلانے بیٹھی، دیکھا ماچس نہیں ہے۔ ماں پڑوس سے لے آؤں۔ آدرشا بولی۔ ہاں جا بیٹا مریں سے لے آ کہنا ابھی لوٹا دیں گے۔ وہ تیزی سے سروپ کے گھر چلی گئی۔ دروازہ کھلا پڑا تھا سو وہ اندر چلی گئی، شاید سروپ سے سامنا ہو جائے۔ سامنے ہی تو سروپ کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود وہ خود کو کمرے میں جھانکنے سے باز نہ رکھ سکی۔ کمرہ میں کسی کو نہ پا کر اُس کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔ وہ پلٹی اور اپنے قریب سروپ کو پا کر گھبرا گئی۔ نکلنے کا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ سروپ راستہ روکے کھڑا تھا۔ کسے پتہ تھا۔ وہ یوں اچانک سیڑھیوں پر مل جائے گا۔ ورنہ وہ فوراً لوٹ جاتی۔ وہ منھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے سانس کی آنچ کانپ رہے تھے سچے چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ اُس نے سروپ پر نگاہ ڈالی۔ ڈر اور خوف سے سہمی ہوئی۔ سروپ نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھا۔

آدرشا ۔۔۔ وہ میرے پیر تک لرز گئی۔ میرے خوابوں کی رانی۔ سروپ نے اُسے اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لیا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔ اچانک یہ خواب ٹوٹ گیا۔ سپنا بکھر گیا۔ وہ تڑپی اور کسمسا کر سروپ کی باہوں سے نکل گئی۔ وہ حیران و ساکت کھڑا جاتے دیکھتا رہا۔ سب کچھ جیسے لمحہ بھر میں ہو گیا۔ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔ آدرشا سیدھے اپنے پلنگ پر جا گری۔ اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ کمرے میں بہت دیر تک سسکیاں رہ رہ کر اُبھرتی رہیں۔

ساری رات گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی رہی۔ اُس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند جیسے آنکھوں سے اُڑ گئی تھی۔ تم گھروں میں بیٹھنے والیاں بہت جلد باز ہوتی ہو۔ جہاں کوئی کھڑا پسند آ گیا، اُسے دل دے بیٹھیں۔ آگے سوچا نہ پیچھے۔ یہ بھی کوئی محبت ہوئی۔ اُدھر سے جواب ملا نہیں بس محبت نفرت میں بدل گئی۔ تم کیا جانو شمع کیوں جل جاتی ہے۔ بہت دن پہلے یہ جملے اُس کی ایک سہیلی نے کہے تھے۔ جس کے معاشقوں کی داستانیں عام تھیں

"غلط فہمی نہ کیجیئے، نفرت سے آرشا نے اپنے ہونٹ سکوڑ لئے۔

اپنا یہ فیصلہ اچھا تو ہے ہی پر پہلی مرتبہ وہ خوب رو کی مسکراہٹ سے اپنے ہونٹ جلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ تصور ہی اس کو رنج کو نڑپا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ رات بھر اپنی لگائی آگ میں جھلستی ہی سلگتی رہی۔

دوسرے دن جب وہ کھڑکی میں کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی سروپ کھڑکی کے قریب سے گزرا۔ ایک پل کے لئے آرشا کا ہاتھ جیسے رک گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں، پھر جھک گئیں۔ آرشا کو اپنی طرف متوجہ پاکر سروپ کے خشک بے جان ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ میں دعوت بھی اپنا پن تھا۔ چاہت تھی۔ آرشا کو وہ مسکراہٹ جیسے زہر لگی۔ اسے یوں بے باکی سے مسکراتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"تم محبت نہیں کرسکتیں۔ آ۔ ہا ہا ہا۔ تم محبت نہیں کرسکتیں۔ کبھی بھی نہیں"۔

آرشا نے سوچ رکھا تھا وہ مسکرائے گی نہیں۔ اپنی اس محبت کا گلا گھونٹ دے گی۔ وہ بھول جائے گی۔ کبھی اس نے سروپ کے بارے میں سوچا تھا چپ چاپ اسے اپنے من میں بسا یا تھا اور انجان بنی پوجتی رہی۔ اس نے اپنی اداسیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا وہ خلش جو اس کی روح کو بے چین کئے ہے اس سے چھٹکارا پائے گی۔ اس نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔

ایک چھوٹی سی کنکری کھڑکی کی راہ سے اندر آگئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سروپ شاید چھیڑنے پہ آمادہ تھا ——— غنڈہ کہیں کا ماں بہن جیسے ہے نہیں۔ ساتھ ہی اس نے جھلا کر کھڑکی بند کردی۔

——— (بقیہ افسانہ "روپ" صفحہ ۳۱) ———

ناک سے گزرتی ہوئی معدے سے ٹکرائی —— مرادی نے ویران نگاہوں سے قریب کا جائزہ لیا۔ اس کی نظریں یکایک نزدیک کھڑے ہوئے شخص کی جیب پر پڑیں اس کا دل دھڑک اٹھا۔ کانپتی ہوئی انگلیاں رینگ گئیں اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ چھپتا چھپاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے اس نے اطمینان کا سانس لیا —— آج سردی تیز تھی۔ مرادی نے جیب میں پڑے کھڑکھڑاتے نوٹ پر انگلیاں پھیرتے ہوئے جھرجھری سی لی اور دانتوں پر دانت جمائے ایک ہوٹل میں گھس پڑا۔

سردی کی لرزتی کانپتی رات گزر گئی اور ٹھنڈک سے تھرتھراتے ہوئے سورج کی نرم کرنیں بند دروازوں پر دستک دینے لگیں۔ چین پر سویا ہوا شور جاگ اٹھا، پرسکون ڈالیاں ہلنے لگیں ——— سڑک پر گزرتے ہوئے راہگیر دھیرے دھیرے سڑک کے کنارے جمع ہو کر اس پرانے مکان کے برآمدے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی برآمدے کے قریب جانے کی ہمت نہ کرسکا پولس کو خبر دی جاچکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پولس کی گاڑی کے ساتھ ہی ایک ایمبولنس بھی آگئی۔ دلیپ تھرے نے گاڑی سے اتر کر دالان میں پڑی بچے کی لاش کا جائزہ لیا ——— "ٹھنڈک سے مرگیا بیچارہ —" وہ افسوس کرتا ہوا پیچھے سرک کر جیب سے ڈائری نکالتا ہوا مجمع سے مخاطب ہوگیا ——— "آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب اس بچے کا نام پتہ کچھ بتاسکیں گے" لیکن کوئی کچھ بھی نہ بتاسکا۔ لاش ایمبولنس میں رکھ دی گئی۔ سڑک کے کنارے خالی ہوتے گئے اور اونگھتے ہوئے برآمدے سے دور قدموں کی آہٹیں تیز ہوگئیں۔

علاج!

"کہیئے — !"
"جی —!"
"کوئی تکلیف ہے آپ کو —!"
"جی —۔"
"جسم میں خون کی کمی معلوم ہوتی ہے —!"
"جی ہاں —۔"
"جگر کی حرارت بڑھی ہوئی ہے، پیاس زیادہ لگتی ہوگی!"
"جی ہاں —۔"
"بے خوابی کی بھی شکایت ہوگی —!"
"جی —۔"
"ہاضمہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا —!"
"جی ہاں —"
"خوفناک اور ڈراؤنے خواب بھی نظر آتے ہوں گے —"
"روزانہ —۔"
"دماغ بھی کمزور ہوگا —!"
"جی —"
"کوئی بات یاد رہتی نہ ہوگی —!"
"جی —"
"ہاتھ، پیر اور کمر درد کرتے ہوں گے —!"
"جی —"
"زیادہ چلنے سے سانس پھول جاتی ہوگی!"
"جی ہاں —"
"طبیعت نڈھال اور گھٹی گھٹی سی رہتی ہوگی —!"
"جی جی —"
"کہیں ملازم ہو —!"
"جی ہاں —۔"
"تنخواہ —!"
"ایک سو بیس روپیہ —!"
"شادی شدہ ہو —!"
"جی —۔"
"بیوی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوگی!"
"جی ہاں —۔"
"بڑے گھر کی لڑکی ہوگی —!"
"جی —۔"
"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا علاج نہیں کر سکتا۔ آپ کا مرض لا علاج ہے —۔"

مچھلی کا شکار

"ارے — تم اس قلعہ پر بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو —!"
"یہ قلعہ نہیں ہے —"
"پھر کیا ہے —!"
"یہ تو پاگل خانہ ہے —"
"پھر تو تم بھی شاید....."
"جی ہاں آپ نے ٹھیک ہی سمجھا ہے —"
"اندر اور بھی..... !"
"جی ہاں — کافی تعداد میں ہیں —"
"خوب —۔"
"مگر آپ یہاں جھیل کے کنارے کیا کر رہے ہیں؟"
"مچھلی کا شکار کر رہا ہوں —۔"
"کس طرح — ؟"

"نیچے نہیں — یہ کانٹا پانی میں جو ڈال رکھا ہے!"

"عجیب —!"

"کیوں —! اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"آپ شادی شدہ ہیں — ؟

"ہاں — ہاں —۔"

"بچے بھی ہوں گے —!"

"ماشاء اللہ پانچ بچے ہیں —۔"

"کہیں ملازمت کرتے ہو —!"

"نہیں تو —۔"

"پھر —!"

"خدا کا دیا بہت کچھ ہے —!"

"امیر آدمی معلوم ہوتے ہو —۔"

"اللہ کا کرم ہے —۔"

"کوئی خاص شغل —!"

"جائداد کی آمدنی کافی ہے۔"

"شکار کے لئے روزانہ آتے ہو!"

"مچھلی کے شکار کے لئے تو ہفتہ میں دو ایک بار چلا آتا ہوں۔"

"باقی دن —!

"کبھی خرگوش اور ہرن کے شکار کے لئے بھی نکل جاتا ہوں!"

"یہاں کب سے تشریف فرما ہیں!"

"صبح سے —!"

"کتنا وقت ہوا ہوگا؟"

"سات گھنٹے ہو چکے ہیں!

"کوئی مچھلی ہاتھ لگی —!

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ملا —!"

"پھر تو — اندر آجائیے — ہمارے پاس!"

میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے!

"السلام علیکم —!"

"وعلیکم السلام —۔"

"اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو ایک بات پوچھوں!"

"ضرور — ضرور —۔"

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے!

"ممکن ہے —"

"آپ پیر جماعت علی شاہ کے خلیفہ تو نہیں — ؟

"جی نہیں —"

"میں نے شاید آپ کو دارالعلوم دیوبند میں دیکھا ہے —۔"

"جی — میں کبھی دیوبند نہیں گیا۔"

"کیا آپ دو سال قبل بمبئی کی مینار [illegible] خطیب نہیں تھے؟

"جی نہیں —!"

"— ہاں ہاں — یاد آیا —!"

"کیا — ؟"

"آپ تو شاید جامع مسجد آگرہ کے مفتی تھے —۔"

"نہیں بھائی — میں تو کہیں کا بھی مفتی نہیں تھا۔"

"بہر حال — میں نے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے —!

"ممکن ہے!"

"آپ کسی زمانہ میں بریلی شریف میں تھے؟"

"نہیں تو —!"

"کیا آپ اُس سرکاری وفد میں نہیں تھے جو ممالک اسلامیہ گیا تھا۔ میں نے تصویر دیکھی تھی۔"

"جی — میں کسی وفد میں کبھی نہیں گیا!"

"دو سال قبل آپ حج کو تشریف لے گئے تھے!"

"جی نہیں — ہنوز یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔"

"عجیب بات ہے!"

"کیا —!"

"یہی کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔"

"ہو سکتا ہے —"

"آپ جمعیۃ العلماء کے مراد آباد والے اجلاس میں ڈائس پر موجود تھے؟"

"— —۔"

"اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس اجلاس میں آپ نے ایک ایمان افروز تقریر بھی فرمائی تھی!"

"جی نہیں — مجھے اُس اجلاس کا کوئی علم نہیں ہے —۔"

"تو کیا آپ کسی علمی درسگاہ کے مدرس ہیں —!

"نہیں تو۔"

"پھر آپ کیا کرتے ہیں ۔۔۔!"

"ارے صاحب! میں تو بازاروں میں مجمع لگا کر تیل بیچتا ہوں!۔۔۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

کوالیفکیشن

"پچھلے تین سال سے بیکار ہوں ۔"

"کہیں ملازمت کیوں نہیں کر لیتے!"

"ارے صاحب! کہیں ملے بھی!"

"اچھا۔ آپ مِل میں کام کر سکیں گے؟"

"مِل میں ۔۔؟"

"ہاں ہاں ۔"

"اجی ۔۔ مل کا تو نام سنتے ہی میرا سر چکرانے لگتا ہے ۔"

"کیوں ۔!"

"مل کی گرمی، پسینہ، شور و ہنگامہ.... !"

"خیر جانے دیجئے ۔ اکاؤنٹ تو آپ جانتے ہی ہیں نا۔"

"اما ۔۔ حساب میں تو میں شروع ہی سے کچا ہوں!"

"اچھا تو کسی اسکول میں انتظام کرا دوں!"

"یعنی ٹیچری کا ۔۔!"

"ہاں ۔"

"ارے نہیں! میرے پاس کوئی کوالیفکیشن نہیں ہے ۔"

"اچھا ۔ ایک کام کرو ۔"

"فرمائیے ۔!"

"میونسپلٹی کے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں درخواست دیدو ۔"

"وہاں مجھے کیا کام کرنا ہوگا ۔۔!"

"یہی ۔ گھی، دودھ، مکھن اور مٹھائی والوں کی دکانوں کی دیکھ بھال۔"

"ارے نا بابا ۔۔ یہ سارے شہر کا چکر کون کاٹتا پھرے گا!"

"پھر یہ کرو ۔ کسی یتیم خانہ کے سیکریٹری بن کر چندہ وصول کرو ۔"

"یہ تو کوئی اچھا کام نہیں ہے ۔"

"اچھا کسی آفس میں ٹائپسٹ کا کام تو کر لو گے!"

"لیکن ۔۔ ٹائپ کرنا تو مجھے آتا نہیں ۔"

"ملک اقتصادی ترقی میں نہ بندوبست کرا دیا جائے!"

"یہاں تو تقریریں کرنی پڑیں گی ۔۔ اور مجھے...!"

"آخر آپ نے تعلیم کہاں تک پائی ہے؟"

"چوتھی جماعت تک!"

"پھر تو میرے خیال میں آپ کو لیڈر بن جانا چاہئے کیونکہ آپ اسی کام کے لئے موزوں ہیں ۔"

غزل

"آئیے آئیے ۔۔ ن ۔ م صاحب!"

"آداب عرض ہے ۔"

"تسلیم تسلیم ۔ تشریف رکھئے ۔!"

"کہئے ۔!"

"مشاعرہ تو بے حد کامیاب رہا ۔"

"واقعی ۔"

"انتظام بڑا معقول تھا ۔"

"جی ہاں ۔"

"بھئی ۔ غزل تو آپ ہی کی حاصل مشاعرہ رہی ۔"

"اجی ۔ میری غزل تو ...!"

"نہیں نہیں ۔ غزل واقعی خوب تھی ۔"

"ذرّہ نوازی ہے ۔"

"یہ اور بات ہے کہ بعض حضرات کو کچھ غلط فہمیاں ہو گئیں ۔"

"غلط فہمیاں ۔۔!"

"جی ہاں ۔۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ مطلع تو اعجاز صدیقی کا تھا۔"

"جی ....!"

"جی ہاں ۔۔ اور وہ گل صاحب کہہ رہے تھے کہ تین شعر جگر کا چربہ تھے۔"

"کیا ۔۔؟"

"جی ۔ اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ پانچویں اور چھٹے شعر کے دونوں آخری مصرعے مرزا یگانہ کے تھے۔"

"۔۔۔!"

"مگر حد تو یہ ہوئی کہ خود صدر مشاعرہ آپ جلے میں فرما رہے تھے کہ خمار صاحب کا مطلع دراصل سیماب اکبر آبادی کا تھا ۔!"

"۔۔!"

"میں نے کہا ۔ ماشاءاللہ ۔ ترنم تو خمار صاحب ہی کا سارے مشاعرے میں کامیاب رہا ہے ۔!"

"لیکن صاحب آپ نے کیا ۔!؟"

"آپ کے دوست فرمانے لگے کہ ترنم بھی ساغر نظامی ہی کی تقلید تھی۔"

"۔۔۔....!"

متین سروش

غزل

جوانیوں کے مہکتے ہوئے یہ میخانے
چھلک رہے ہیں مئے زندگی سے پیمانے

چمن میں عام ہیں جب وحشتوں کے افسانے
چلی ہیں سرد ہوائیں جنوں کو سمجھانے

ترے جمال کو جو آئینہ دکھاتے ہیں
نظر نظر میں ہیں آباد وہ صنم خانے

ہمارے نام سے پاتے ہیں رنگ و حسن دوام
صنم کدوں کی روایت، جنوں کے افسانے

نظر فروزیِ حسنِ خیال کے صدقے
ہزار رنگ میں دیکھیں گے تجھ کو دیوانے

صحیفۂ غمِ دل ہو گا مختصر کیسے
جنونِ عشق سلامت، ہزار افسانے

خوشا وہ دل کہ ترے غم سے روشنی پائے
نہ ہے وہ غم کہ ہزاروں میں تجھ کو پہچانے

شعاعِ مہر نہیں ہے جمالِ ماہ نہیں
وہ جانِ حسن ہے اس سے سوا خدا جانے

ٹھہر گیا تھا زمانہ ترے لئے جس جا
وہیں پہ آج بھی رقصاں ہیں چند پروانے

نہ سوزِ شمع ہے دل میں نہ شوقِ پروانہ
رموزِ عشق کو سمجھیں گے کیسے فرزانے

سرورِ دشت نوردی سے کام ہے ہم کو
نشانِ منزلِ راحت ہے کیا، خدا جانے

اٹھاؤ جام کہ روحِ طرب کو دیں آواز
چراغِ بادہ سے روشن ہوں دل کے غم خانے

نمودِ حسنِ بہاراں پہ مطمئن کیا ہیں
مزاجِ شعلۂ گل بھی سمجھ لیں مستانے

حکیمِ وقت کو شاید ہو کچھ خبر اس کی
شکستِ ساز پہ سر دھن رہے ہیں دیوانے

زمانہ سازیِ اہلِ خرد پہ مت جانا
جنوں کی آگ سے روشن ہیں دل کے کاشانے

ہمارے خواب تمنا سے ضو فشاں ہیں سروش
جمال و حسن کی وادی، وفا کے ویرانے

علیم اختر مظفر نگری

غزل

اس طرح چُپ ہوں کوئی بات ہوئی ہو جیسے
کسی جنگل میں کہیں رات ہوئی ہو جیسے

ہائے یہ عیش و مسرت، یہ خوشی کا عالم
غمِ دوراں سے ملاقات ہوئی ہو جیسے

نہ مرے حال پہ نمناک نگاہیں توبہ
بے ارادہ کہیں برسات ہوئی ہو جیسے

نگہِ لطف و عنایات نے یوں لوٹ لیا
بازیِٔ دل میں کوئی مات ہوئی ہو جیسے

مل کے اب اُن سے یہ محسوس ہوا ہے اختر
مفلسی میں بسر اوقات ہوئی ہو جیسے

سرشار سیلانی

غزل

دل شاد تھا کہ پھول کھلیں گے بہار میں
مارا گیا غریب اسی اعتبار میں

منزل کا اشتباہ تھا ہر اک مقام پر
کیا کیا مقام آئے تری رہگزار میں

جس دن اسیر ہو کے چلے تھے چمن سے ہم
گنتی کے دن تھے آمدِ فصلِ بہار میں

اتنا بھی "انقلاب" کسی کو بدل نہ دے
دشمن بھی اجنبی نہ ہوا اپنے دیار میں

کس دل سے آہ اُٹھ کے چلے بزمِ یار سے
کس دل سے آہ آئے تھے ہم بزمِ یار میں

کیا اتفاق ہے، جسے پوجا تمام عمر
پتھر وہی لگا مرے لوحِ مزار میں

سرشار ڈھونڈ، خاک خرابات میں پناہ
کیا مقبرہ بنے گا تری یادگار میں؟

اعزاز افضل

غزل

پل رہے ہیں وہ طوفاں ندیوں کے سینوں میں
بس چلے تو ساحل بھی جا چھپیں سفینوں میں

شورشِ پرستش کی خود سری کو کیا کہئے
گھس کے آستاں کتنے کھو گئے جبینوں میں

ہیں انگوٹھیاں حلقے سیم و زر کی سازش کے
انگلیوں کی رعنائی کھو گئی نگینوں میں

کیوں بلند بامی اب زندگی سے ترساں ہے
پائے عقل کی لرزش آگئی ہے زینوں میں

کھیتیاں ہیں کیوں روٹھی آندھیاں ہیں کیوں برہم
ہم نہ خوشہ چینوں میں، ہم نہ نکتہ چینوں میں

وقت کے سمندر میں ڈوب کے ذرا دیکھو
کشتیاں ہزاروں ہیں اس کے تہہ نشینوں میں

پتھروں کے ٹکڑوں کی سادگی کو کیا کہئے
کوستے ہیں شیشے کو چھپ کے آبگینوں میں

قیصر قلندر

غزل

جگمگاتے تاروں میں رنگ ہے تبسم کا
مسکراتی کلیوں میں حسن ہے ترنم کا

کس جہاں میں چھوڑ آئے ہوش کے جواں لمحے
کیسی باتیں کرتے ہو دھیان ہے تکلم کا

دل کی بات کرتے ہو، دل تو اک سمندر ہے
خانۂ تمنا بھی، گھر بھی ہے تلاطم کا

شعر کی حسیں دنیا اس نظریہ قرباں ہو
جس میں رنگ شامل ہے بادۂ تبسم کا

جس جگہ سے بھی گزرا، کارواں بہاروں کا
اس جگہ تو رہتا ہے ولولہ تصادم کا

شہرِ گل سے آیا ہوں اجنبی دیاروں تک
حسنِ شعر قیصر بھی ساتھ، نورِ انجم کا

بدیع الزماں خاور

غزل

دیارِ جور میں اک گلبدن سے پیار کیا
لہو سے ہم نے فروزاں چراغِ دار کیا

شبِ سیاہ کو گیسوئے مشکبو سمجھے
فراقِ یار کو ہم نے وصالِ یار کیا

غمِ بتاں نہ سہی، دردِ کائنات سہی
خموشِ دل کو کسی نے تو بے قرار کیا

پڑا جو وقت تو ہم نے حسین یادوں سے
غمِ حیات کے موسم کو خوشگوار کیا

یہ بھول ہم سے ہوئی ہے کہ بے وفاؤں کا
وفا کے موڑ پہ اک عمر انتظار کیا

ہمارے نالۂ و فریاد گننے والوں نے
تمہارے ظلم و ستم کا بھی کچھ شمار کیا؟

ہماری طرزِ جنوں کیوں نہ منفرد ٹھہرے
کہ بڑھ کے وقت کے دامن پہ ہم نے وار کیا

عشرت قادری

غزل

خاک سمجھے گا وہ زخموں کا، چٹخنا یارو
دشمنِ جاں ہے جسے کہیئے مسیحا یارو

اس کے ہر ایک تغافل پہ دل جا بیٹھا
ٹوٹ سکتا ہے کہیں درد کا رشتہ یارو

کیا دیا عہد نے اپنے یہ شکایت نہ کرو!
اپنی بے مائگی سرمایہ ہے اپنا یارو

بزمِ ساقی ہے اگر قتل گہِ دیدہ وراں!
کوئی دن اور سہی خونِ تمنا، یارو

کیسے بچھڑے ہوئے کہاں ہو کوئی آواز تو دو!
دشتِ صیاد میں آوارہ ہوں، تنہا یارو

عرصۂ جہد میں الزام ہے، اصنام گری
حلقۂ نازنیں اب عشق ہے رسوا یارو

ننگِ تہذیب ہوئی وضعِ رفیقانِ وطن
اجنبی بن گیا ہر ایک شناسا یارو

عمر روتے ہوئے گزری ہے پرائے غم پر
اپنے دل میں نہ کبھی جھانک کے دیکھا یارو

دل سے چھو کر بھی گزرتی نہیں اب یاد کوئی
شوق ہے منتظرِ عشرتِ فردا یارو

انتخاب احمد فخر دسولوی

غزل

ہر ایک گل کو رسولِ بہار ہونے دو
خوشی سے سارا چمن ہمکنار ہونے دو
نگاہ ہی لیں گے کسی روز منزلوں کے سراغ
نظر سے دور حجابِ غبار ہونے دو
چمن پہ آنچ نہ آئے، غمِ نشیمن کیا
اگر ہے یورشِ برق، و شرار ہونے دو
مے نشاط سے خالی ہیں دل کے پیمانے
ہوائے گل کو ذرا کیف بار ہونے دو
جنونِ آبلہ پائی کا لطف آئے گا
قدم قدم پہ جو ہیں خارزار ہونے دو
وہ لوگ جو نہیں کیفِ حیات سے واقف
انھیں اسیرِ غمِ روزگار ہونے دو
شریک وہ بھی محبت میں ہیں برابر کے
انھیں بھی میری طرح بے قرار ہونے دو
گلوں سے آگ لگی ہے اگر گلستاں میں
تو برق کو بھی شریکِ بہار ہونے دو
میں اس کا اہلِ قلم ہوں، مجھے بھی ہوگا فخر
وطن کو باعثِ صد افتخار ہونے دو

پیرزادہ اقبال بیجاپوری

غزل

ہے بپا چاروں طرف شورشِ محشر ساقی
ہم کہاں جائیں تری بزم سے اُٹھ کر ساقی
مشعلِ آہ فروزاں ہے لبوں پر سب کے
آگ بھڑکے نہ کہیں جام کے اندر ساقی
یاد آئے ہیں وہاں نشترِ مژگاں تیرے
دل میں اُترا ہے جہاں وقت کا خنجر ساقی
جام و مینا کے اُجالے میں بہت آت گئے
یاد آتی ہے ہمیں صبحِ منوّر ساقی
اتنی تنظیم تو باقی رہے میخانے میں
جام ہاتھوں سے نہ چھینے کوئی بڑھ کر ساقی
نظمِ میخانہ اب اقبال مبارک تم کو
اُٹھ کے میخانے سے یہ چل دیا کہہ کر ساقی

راز چاند پوری ——— ۱۲ دارالسلام۔ سول لائنز۔ علیگڑھ

نومبر ۱۹۶۵ء کا "شاعر" ملا۔ شکریہ۔

میں خوش ہوا کہ آپ نے مختصر سی داستان پر طویل نوٹ لکھ کر اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو آپ سے بہت پہلے ادا کرنا چاہئے تھا۔ یہ نوٹ خود میری معلومات میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔ اور مولانا سیماب پر تحقیق کرنے والوں کے لئے بھی مفید ہوگا۔

مخمور سعیدی ——— ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی

بہت دن کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ حالانکہ ہر مہینے "شاعر" کا تدریجی نکھار دیکھ کر، آپ کی کوششوں اور کاوشوں کا قصیدہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔
گزشتہ شمارے میں آپ کی جو نظم شائع ہوئی ہے، اُس نے تو بہت دیر تک بے چین کئے رکھا۔ ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے افسوسناک تصادم پر اُردو میں بہت سی نظمیں شائع ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اِس زاویۂ نظر سے کوئی نظم نہیں کہی گئی۔ سردار جعفری کی نظم "کون دشمن ہے" کے بعد اتنی پُر اثر اور انسان دوستی کے جذبے کی حامل کوئی دوسری نظم ہے تو وہ "کربِ خود کلامی" ہے۔

محمد عظیم فیروز آبادی ——— نادر بخش اینڈ کو۔ فیروز آباد ضلع آگرہ

حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی پر آپ کا ادارتی نوٹ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ سے بہتر لکھنے والا علامہ سیماب پر ہندو پاکستان میں اب کوئی نہیں ہے۔ آپ نے اب تک عبث یہ کام دوسروں پر اُٹھائے رکھا۔ حضرت علامہ کے متعلق جتنی معلومات (فرسٹ ہینڈ معلومات) آپ کو حاصل ہیں کسی اور کو نہیں۔ آپ کہیں گے کہ آپ کو فرصت نہیں ہے۔ پھر کس کام کے لئے آپ کو فرصت ہے؟ آپ کہیں گے فرزند ہونے کی حیثیت سے علامہ پر آپ کا قلم اُٹھانا مناسب نہیں۔ درست ہے، علامہ نے اپنے قلم سے کتنوں کے نام چمکا دئے۔ آپ علامہ کی خاطر اپنے قلم سے ایک کو بھی نقاد نہیں بنا سکتے۔ کتنی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ لوگ خود اپنے آپ پر لکھتے ہیں۔ نام دوسروں کا ہوتا ہے۔ پھر یہ سب باتیں اہم نہیں۔ اہم یہ بات ہے کہ ایک ہمہ گیر اہلِ فکر کو عدم توجہی سے التوا میں پڑا ہوا ہے۔ پروفیسر زرینہ ثانی نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن یہ کام آپ کی نگرانی میں ہونا چاہئے۔
پروفیسر زرینہ کے مطلوبہ "نگار" کے دونوں شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میرا خیال ہے اُنھیں اِن شماروں سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا اور اگر اِن کی بنا پر اُنھوں نے کوئی رائے قائم کی تو یہ انصاف پر مبنی نہیں ہوگی۔
نظم "کربِ خود کلامی" داد سے مستغنی ہے۔

ڈاکٹر ظفر حمیدی (ایم۔ بی بی ایس) ——— ہری سبھا روڈ، مظفر پور (بہار)

...... غیر ایسے موڈ میں آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" باصرہ نواز ہوئی۔ مجھ پر ایک ایسا خاص تاثر ہوا، جو بیان سے باہر ہے، اِس لئے کہ جذبات کا آہنگ کچھ آپ کی اعجاز بیانی سے تال میل کھا رہا تھا۔ تازہ شمارہ میں اُس پر ایک صاحب کے تاثرات نظر سے گزرے۔ افسوس کہ اُنھوں نے اِس نظم کے ساتھ پورا انصاف نہیں فرمایا۔ اگر فرصت نصیب ہوئی تو میں کچھ لکھوں گا۔ ویسے وہ نظم بلا مبالغہ جدید نظم نگاری میں ایک (TRAGIC EPIC) کا مقام خود لے گی۔

محی الدین احمد ایم اے ——— پتھل گڑھا۔ رانچی (بہار)

نومبر کا شمارہ ہر لحاظ سے بلند معیار کا ہے۔ راز چاند پوری کا مضمون "داستانے عبرت" اور اُس پر آپ کا ادارتی نوٹ حضرت سیماب اور اُن کے متعلقین سے وابستہ یادوں اور حقیقتوں کی طرف اشارے کرتا ہے۔ انشائے لطیف اور اچھے نثر لکھنے والوں میں اب تک محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، مہدی افادی، میر ناصر علی، خلیق دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی اور نیاز

تجربے کا بھی انکشاف ہوا۔ اگر حضرت سیماب کے نمونۂ نثر سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا شمار بھی اِن ہی لوگوں میں ہونا چاہیے۔ خواجہ حسن نظامی کے متعلق میرے ایک محترم جناب عارف سیاکھی صاحب عظیم آبادی جو کبھی اُن کے شریک کار تھے، مجھ سے اِس طرح کی باتیں بیان کرتے تھے کہ خواجہ صاحب دوسروں سے مضامین لکھوا کر نظر ثانی کے بعد اپنے نام سے چھپوایا کرتے تھے۔ علامہ نیاز فتحپوری کی مصلحت آمیز رایوں کا شکار نہ صرف حضرت سیماب ہی ہوئے بلکہ آپ نے دیکھا کہ جناب جوش اور جگر بھی اُن سے نہ بچ سکے۔ علامہ سیماب کی شاعری میں اگر انھیں کسی خاص جمالیاتی بصیرت اور وجدانی تاثر کا کہیں سُراغ نہ ملا تو جگر کی شاعری میں انھیں زبان و بیان کی خامیاں ہی ہر جگہ نظر آئیں۔ کیا کیجئے گا، زمانہ ہمیشہ ایسی ہی مصلحت آمیز باتوں کو حق و انصاف کے پس پردہ اپنا چلن بنایا کرتا ہے۔ کیا آپ کو آج بھی "حق تلخ اور انصاف اندھا ہے" کی صدائے بازگشت سُنائی نہیں دیتی ؟

دو چار سال سے اُردو ادب میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اُدبا اور شعراء سے اُن کے فن کے متعلق سوال و جواب کا سلسلہ۔ یہ ایک خوش آئند ادبی مستقبل کا آغاز ہے۔ سوالِ شوق اور سوالِ شک میں امتیاز کرنے والے ہی اِس بات کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم الیقین سے عین الیقین تک رسائی کا یہی ایک آسان ذریعہ ہے۔ چنانچہ ضیا حسنی کا "ثاقب کانپوری سے ایک گفتگو" اِس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

آغا ارشد کا مختصر انشائیہ "بات میں بات" بہت پسند آیا۔ آغا صاحب کا نام میں نے پہلی بار سُنا ہے۔ اگر یہ نئے لکھنے والوں میں ہیں تو ان کا مستقبل روشن ہے اور اگر پرانوں میں ہیں تو ان کا شمار اچھے انشائیہ نگاروں کی فہرست میں اب تک کیوں نہیں ہوا ؟

یوسف ناظم کی نظم "امن کی دیوی" بہت کامیاب نظم ہے۔ دورِ حاضر کی تڑپ اور بے چینی کو اُنھوں نے بڑی خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں جذب کر لیا ہے۔ عنوان چشتی کی "شکستِ انا" اور تحسین انصاری کی "نداواے غم" بھی اچھی نظمیں ہیں۔ شہاب جعفری کی غزل کے کئی اشعار بہت حسین اور فکر انگیز ہیں۔

قمر قریشی کا یہ شعر ؎

میں ہوں امینِ لطفِ ستمہائے روزگار　　نا آشنائے لذتِ دردِ نہاں نہ کہہ

اُن کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اُن کے اشعار سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصائبِ روزگار سہنے کے وہ پوری طرح عادی نہیں۔ ورنہ غالب کی طرح غم کو اپنا فن بنا لیتے۔ یا حسرت و وحشت کی طرح غم سے زندگی کا حوصلہ پیدا کر لیتے۔

سید برکت الکرام بھی اپنے مخصوص اندازِ فکر کے ساتھ اپنی غزل میں نمایاں ہیں۔ مظفر حنفی، کفیل آذر اور امیر عارفی کی غزلیں بھی اپنی اپنی جگہ خوبصورت اور معاصر کے فکری و ذہنی تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

آپ کو تو معلوم ہوا ہے کہ اکتوبر کا "شاعر" مجھے کس قدر تاخیر سے ملا۔ مگر باور کیجئے کہ میں نے آپ کی شاہکار نظم "کربِ خود کلامی" اُسی کرب اور بے چینی کے ساتھ پڑھی جس سے آپ اُس کی تخلیق کے وقت دوچار تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نظم پڑھتے وقت میرا دل بھی غم و اندوہ سے بھر گیا تھا اور آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔

دادِ سخن سے "بے نیازی" آپ کی فطرت ہی سہی "پھر بھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کو دادِ سخن دئے جا رہا تھا۔ آپ کی انجیلِ سخن اور [illegible] کا حاصل میں آپ کی نظم "کربِ خود کلامی" کو سمجھتا ہوں۔ جس میں اُردو ادب اور ثقافت کی ایک پوری تاریخ کے پس منظر میں ستاون اور سینتالیس جیسے زہرہ گداز کرب و بلا سے پیدا ہونے والے مسائلِ حیات کا نہ صرف تذکرہ آگیا ہے بلکہ اُس کا صحیح حل بمبئی اور آگرہ جیسے شہروں میں اُبھرنے والی انفرادیت و شخصیت سے تجربہ کر کے جگر کی زبان میں پیش کر دیا ہے ؎

"اُن کا جو فرض ہے، وہ اہلِ سیاست جانیں　　اپنا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔"

مناظر عاشق ہرگانوی ———— ہرگانوہ۔ برگیہ، مونگیر (بہار)

عرصے کے بعد "شاعر" کا تازہ شمارہ نومبر ۶۵ء پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نوعات میں آپ نے بمبئی میں اُردو زبان کے چلن کا جو اجمالی خاکہ کھینچا ہے وہ فکر انگیز ہے۔ صوبۂ مہاراشٹر کی حکومت کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اُردو کی شاخ کو بھی اِس طرف مزید توجہ دینی چاہیے۔

"داستانِ چند" پر آپ کا ادارتی نوٹ پڑھ کر آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں۔ لیکن بعض جگہ آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ ادیب کی بے چارگی

اور عیاں ہو رہا۔ آپ نے اپنے نوٹ میں علامہ سیماب مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ علامہ مرحوم کے نثری اور شعری حصہ پر بھرپور روشنی ڈالی جائے تاکہ ایک بلند پایہ ادیب کا حق ادا ہو سکے۔ علامہ مرحوم کی تصانیف کی تعداد دیکھ کر حیرت اور مسرت کی کس گہرائی میں ڈوبا ہوا ہوں اس کا اندازہ خود مجھے بھی نہیں ہے۔ بس یہی خواہش ہو رہی ہے کہ سارا کام چھوڑ کر علامہ پر تحقیق کرنے میں وقت گزارا جائے لیکن مجبوری اور وقت کی تنگی دامن تھامے ہوئے ہے۔ لیکن مارچ اور اپریل ۱۹۷۶ء دو مہینہ میں علامہ مرحوم پر تحقیق کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ دیکھئے اس ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں۔ علامہ مرحوم کی دو کتابیں میری نظر سے بھی گزری تھیں "وفا کی دیوی" اور "خوبصورت بلا" عرف آئینہ۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق میں آپ کو بعد میں ذرا تفصیل سے آگاہ کر سکوں گا۔

علامہ مرحوم کی غیر مطبوعہ تصانیف میں "جدید شرح دیوانِ غالب" "منہاج الادب" "کتاب السلف" "سیماب کے افسانے، آیاتِ سخن اور "وحی منظوم" کو جلد سے جلد شائع ہو کر منظر عام پر آجانا چاہیئے۔ ان میں "کتاب السلف" "جدید شرح دیوان غالب" اور "منہاج الادب" کافی معلوماتی کتابیں معلوم ہوتی ہیں اور تحقیق و تالیف میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان تینوں کتابوں کو شائع کر کے کوئی ادارہ نقصان میں نہیں رہ سکتا۔

جیون لال گوہر، ضیا حسنی، یعقوب راہی کے مضامین اور حسن کمال، عنوان چشتی کی نظمیں اور حرمت الاکرام، شہاب جعفری، مظفر حنفی، عشرت جے پوری اور امیر عارفی کی غزلوں کے چند شعر پسند آئے۔ ویسے تمام تخلیقات اچھی ہیں۔

اختر بستوی۔ بی۔ اے　　———　　مدشن محل، گاندھی نگر۔ بستی (یو۔پی)

"شاعر" کے نومبر کے شمارے میں سید مبارز الدین رفعت صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انھوں نے میری ایک غلطی کی طرف آپ کی اور "شاعر" کے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ میں نے اپنے مضمون "احمد جمال پاشا کا فن" میں لفظ "اسلحہ" کو واحد کی حیثیت سے استعمال کیا ہے جبکہ مبارز الدین صاحب کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ "سلاح" کی جمع ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے عربی کی کوئی عبارت نہیں لکھی ہے۔ میرا مضمون اُردو زبان میں لکھا گیا ہے اور جس طرح اُردو مختلف زبانوں کے امتزاج سے معرضِ وجود میں آنے کے باوجود اپنی ایک الگ منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس زبان کے بیشتر الفاظ بھی ایسے ہیں جو عربی، فارسی اور دیگر زبانوں سے لئے جانے کے باوجود اب مکمل طور پر اُردو کے اپنے الفاظ بن چکے ہیں اور ان کا عربی، فارسی یا کسی اور زبان کی لغت یا قواعد سے کوئی خاص تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ لفظ "اسلحہ" عربی میں چاہے جس طرح بھی استعمال ہوتا ہو لیکن اُردو میں یہ لفظ عام طور پر واحد کی حیثیت سے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ میری اس بات کے ثبوت کے لئے بہت زیادہ تلاش اور جستجو کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آج کل کے ہنگامی حالات میں ملک کا کوئی بھی اُردو اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو یہ لفظ بیسیوں کی جگہ واحد کی حیثیت سے لکھا ہوا نظر آئے گا۔ صرف اسی ایک لفظ پر کیا منحصر ہے۔ عربی زبان کے سینکڑوں اور بھی ایسے الفاظ ہیں جو اُردو میں آنے کے بعد واحد سے جمع اور جمع سے واحد بن گئے ہیں۔ مثلاً "اخبار" عربی لفظ "خبر" کی جمع ہے۔ کیا یہ لفظ اُردو میں واحد کی حیثیت سے مستعمل نہیں ہے؟ کیا اس کی جمع "اخبارات" غلط ہے۔ اُردو زبان میں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ قواعد کے اعتبار سے اس لفظ کی کایا پلٹ ہو گئی بلکہ اس کے معنی بھی بدل گئے ہیں ——— اس موقع پر اگر مبارز الدین صاحب یہ بحث اٹھانا چاہیں کہ شاعروں اور ادیبوں کو الفاظ کی صحت کا سختی کے ساتھ خیال رکھنا چاہیئے اور مستعمل کی پروا نہیں کرنا چاہیئے تو میں ان کے جواب میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی ایک عبارت نقل کروں گا جس میں وہ فرماتے ہیں: "افلاطون اور ارسطو کا قول ہے کہ عام لوگ زبان کے معاملے میں بادشاہ ہیں اور کسی کو میر فیصل نہیں ماننا چاہیئے۔ اُردو میں بھی اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ مولوی سید احمد کہا کرتے کہ مرکزِ زبانِ اُردو میں لکھتے ہیں کہ باہر کے ایک صاحب کو کسی لفظ کی صحت میں شبہ تھا اور وہ اس سے متعلق دہلی کا مستند معلوم کرنا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے شیخ ابراہیم ذوق سے رفعِ شک کرنا چاہا تو شیخ صاحب ان کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لے گئے اور ان کا شک لوگوں کی زبان سے رفع ہوا"۔ اسی سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے ایک انتہائی مفید مشورہ دیا ہے جسے نظر انداز کرنا اُردو زبان کے حق میں سم قاتل ہوگا۔ وہ اپنے مضمون "مشترکہ زبان" میں لکھتے ہیں "تکرار" کے معنی جھگڑا، "روزگار" کے معنی نوکری یا پیشہ، "خفیف" کے معنی شرمندہ، "غرور" کے معنی گھمنڈ، "قضا" کے معنی موت، "علاقہ" کے معنی زمینداری، "حجام" کے معنی نائی ہی لینا چاہیئے گو کہ عربی اور فارسی میں ان لفظوں کے معنی کچھ اور ہیں۔

اکتوبر کے شمارے میں آپ کی طویل نظم "کرب خود کلامی" پڑھ کر بے اختیار جی چاہا تھا کہ اس عدیم المثال شعری شاہکار کی تخلیق پر آپ کو مبارکباد پیش کروں

خود میری سمجھ میں "حسین شاہ سیکری کے عہد میں" میں یہ نہ سمجھ سکا کہ حسین شاہ سیکری کون بادشاہ تھا۔ میرے خیال میں "حسین شاہ شرقی" سہواً سیکری غلطی سے لکھ گیا ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی ——— شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور

ماہ نومبر کا "شاعر" موصول ہوا۔ اس سے قبل اکتوبر کا "شاعر" بھی مل گیا تھا۔ عنایت خاص کا بے حد شکریہ۔ آپ کی نظم "کرب خود کلامی" واقعی بہت اچھا تحفہ ہے اور اس انتشاری دور کی بہترین یادگار۔

میں نے گزشتہ ماہ میں میر کی مثنویوں پر مضمون مکمل کر لیا تھا۔ اب میں کرشن چندر ہی پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنا موضوع "کرشن چندر کے افسانوں کا اسلوب" منتخب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسی ماہ میں مضمون مکمل ہو جائے گا۔

رشید الدین ——— محکمۂ ترجمہ۔ تالاب مان صاحبہ۔ حیدرآباد ۲۵

تازہ "شاعر" کے "جرعات" میں "حکومت مہاراشٹر اور اردو" کے عنوان سے آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بڑی معقول ہیں اور حکومت مذکور کو اس پر فوری توجہ دینی چاہیے۔ آپ کے "جرعات" پڑھنے کے بعد جب میں نے ریاست آندھرا پردیش میں اردو کے موقف کے بارے میں غور کیا تو یہاں مجھے ریاستی حکومت کی پالیسی بڑی فراخدلانہ نظر آئی۔ چنانچہ اس خیال سے کہ بعض دوسری ریاستوں کے ارباب مقتدر کو اس طرح کچھ تحریک ہو سکے "شاعر" جیسے مرکزی پرچے میں میں ریاست آندھرا پردیش میں اردو کے موقف کے تعلق سے ایک مضمون بھجوا رہا ہوں جو امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔

تازہ "شاعر" میں آپ کی نظم کا وہی ردّ عمل دیکھا جس کی مجھے امید تھی۔ محترم راز چاندپوری نے علامہ سیماب اکبرآبادی کی نثر پر ایک مختصر سا مضمون لکھ کر کئی اردو داں افراد کو تحریک دی۔ چنانچہ آپ نے جو اتنا طویل نوٹ لکھا وہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ یقیناً راز صاحب کے مضمون اور آپ کے نوٹ کے بعد کئی اردو داں حضرات کے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہوگا کہ علامہ مرحوم پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ یقیناً زیادتی ہوئی ہے۔ خود میرے ذہن میں اس قسم کا خیال آیا اور میں نے طے کر لیا کہ علامہ مرحوم پر ایک اچھا سا مضمون لکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ سے چند استفسارات کرنے ہیں۔ آپ اس وقت سیماب مرحوم پر AUTHORITY کی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ کی ذات سے اس سلسلے میں کافی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

جیون لعل گوہر ——— گوہر بلڈنگ۔ مین اسٹریٹ۔ مہو کینٹ (ایم۔پی)

میرے مقالے "ہندوستان کا فن مصوری" سے متعلق آپ نے جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے میں صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ آپ ہمیشہ فراخدلی سے "تازہ واردانِ بساطِ ادب" کی حوصلہ افزائی فرما کر ان کے ذوقِ اظہار کو نکھرنے اور سنورنے کے مواقع عطا کرتے رہتے ہیں۔

آپ کی نظم "کرب خود کلامی" میں اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سن کر میرے مجروح شعور کی پلکیں بھی طغیانیِ احساس سے شبنم آلود ہو گئیں۔ یہ نظم آپ کے حساس وجدان، عظمتِ فن، آپ کی انسان دوستی اور نادر الکلامی کا آئینہ ہے۔ نظم جتنی کرب ناک ہے اتنی ہی خیال انگیز بھی ہے۔

ناجی انصاری ——— ۹۷/۱ پریڈ ——— کانپور

"شاعر" کا نومبر کا شمارہ ملا۔ مکتوبات سے معلوم ہوا کہ اکتوبر ۶۵ء کے شمارے میں آپ کی نظم "کرب خود کلامی" نے بڑی شہرت اور وقعت پائی۔ نظم کے بعض حصے اسی شمارے میں نظر سے گزرے جس سے کچھ اندازہ ہوا کہ نظم یقیناً شاہکار ہوگی۔ افسوس کی بات ہے کہ اکتوبر کا شمارہ مجھے نہیں ملا۔ (اسی شمارے میں میری غزل بھی شائع ہوئی ہے جیسا کہ مکتوبات سے معلوم ہوا) زیادہ اشتیاق تو آپ کی پوری نظم پڑھنے کا ہے۔

زیر نظر شمارے میں یوسف ناظم کی نظم "امن کی دیوی" بڑی بھرپور اور حقیقت سے قریب تر ہے خصوصاً آخر کے دو شعروں میں حقیقت کس قدر تلخ انداز میں بیان ہوئی ہے۔

اے امن کی دیوی ہمیں اتنا تو بتا دے — کس دور میں کس وقت زمیں پر تو رہی ہے
جس وقت ہوئی امن کی تلقین جہاں میں — تاریخ بتاتی ہے کہ بس جنگ ہوئی ہے

شہاب جعفری کی غزل بہت جاندار ہے۔ انداز کا تیکھا پن اور خیالات کا خلوص پوری غزل میں نمایاں ہے۔ یہ اشعار بے حد پسند آئے ہیں۔

حیات قطرۂ شبنم تھی پیاس کیا بجھتی — شراب ختم ہوئی آفتاب لا ساقی
جہاں سے حرفِ وفا مٹ چکا کہ باقی ہے — کسی سے پوچھ کہیں سے جواب لا ساقی

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر دیکھئے)

اداریہ

محفلِ اپنی.....!

۱۹۶۵ء کی آخری اشاعت

۱۹۶۵ء اپنی خونریزیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے بعد ختم ہو رہا ہے۔ یہ اپنی بہت سی تلخیاں اور شگفتگی بھری یادیں چھوڑ گیا۔ خدا کرے ۱۹۶۶ء امن و سکون کا پیش خیمہ ہو اور انسان کی تڑپتی ہوئی روح کو تسکین ملے۔

دسمبر کا یہ شمارہ اِس سال کا آخری شمارہ ہے اور مجموعی حیثیت سے اپنی جگہ کافی وزنی۔ اس میں دو خالص ادبی مقالے ہیں۔ ایک انٹرویو (دیکھا ملاحظہ ہے) اور ایک شخصی تاثر شامل ہے۔ بعض قارئین کو افسانوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اِس بار نہ صرف چار بھرپور افسانے دئے جا رہے ہیں بلکہ چند "افسانچے" بھی ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی بھرپور ہیں۔ اُمید کہ پچھلی اشاعتوں ہی کی طرح یہ اشاعت بھی قارئین کو متاثر کرے گی۔

سالنامہ ۱۹۶۶ء

ملکی حالات جو کچھ بھی ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ بہرحال اپنی روایتوں کو برقرار رکھنا ہی ہے۔ تقریباً آٹھ سال سے مسلسل ہر سال "شاعر" کا ایک "سالنامہ" اور ایک "خاص نمبر" پابندی کے ساتھ نکلتا رہا ہے۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں بھی ایک چھوٹا سا خوبصورت سالنامہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں نہایت منتخب اور اعلیٰ درجہ کی تخلیقات ہوں گی۔ "شاعر" کے بلند ذوق قارئین اسے بیحد پسند کریں گے۔

تجدیدِ خریداری

جن خریدارانِ شاعر کی مدتِ خریداری دسمبر ۱۹۶۵ء میں ختم ہو رہی ہے۔ انہیں سُرخ نشان کے ذریعہ اطلاع دی جا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ سب تجدیدِ خریداری فرمائیں گے اور "شاعر" سے اپنا دیرینہ تعلق قائم رکھیں گے۔

مکتوبات

گزشتہ اشاعت میں بھی مکتوبات کے متعلق ایک نوٹ دیا گیا تھا۔ باوجود پچھلے ماہ کی اشاعتوں کے سلسلے میں ڈھائی تین سو خطوط آئے ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان میں کافی اہم خطوط بھی سب کے سب شائع نہیں ہو سکتے۔ مکتوب نگاروں سے درخواست ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اختصار سے کام لیں۔ دسمبر کے "شاعر" کی کاپیاں جانے کے بعد نومبر کے شمارے کے متعلق کئی اہم خطوط آئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ وہ جنوری کی اشاعت میں شامل ہو جائیں۔ "شاعر" کا مکتوبات والا حصّہ کافی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

آپ "شاعر" کے مستقل خریدار ہوں،
یا "شاعر" اعزازی طور پر آپ کو جاتا ہو،
یا آپ ایجنسی سے خرید کر مطالعہ فرماتے ہوں،

کوئی بھی صورت ہو "شاعر" سے آپ کا ایک گہرا تعلق ہے۔ آپ "شاعر" پسند فرماتے ہیں۔ "شاعر" کی طویل خدمات کا آپ کو اعتراف ہے اور یقیناً یہ بھی چاہتے ہیں کہ "شاعر" کے معیار میں اضافے ہوں، یہ پھلے پھولے اور اس کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوں کہ وقت کی تیز و تند آندھیاں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں

چھتیس ۳۶ سال پورے ہو گئے

"شاعر" اپنی اشاعت کے چھتیس ۳۶ سال پورے کر کے اب سینتیسویں ۳۷ سال میں قدم رکھے گا۔ ایک خالص ادبی رسالے کا اتنی طویل مدت تک نکلتے رہنا اُردو زبان کے لئے فخر و مسرت کی بات ہے۔ ہندوستان میں کوئی دوسرا ادبی رسالہ اس عمر کا نہیں ہے۔

ہم ہمیشہ قارئین "شاعر" کو توسیعِ اشاعت کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں۔ آج پھر اُس کے سبھی ہمدردوں سے

درخواست ہے

کہ وہ "شاعر" کی سینتیسویں ۳۷ سالگرہ کو حقیقی معنوں میں پُر مسرت بنانے کے لئے اپنا تھوڑا سا وقت دے کر اس کے چند سالانہ خریدار عنایت فرمائیں۔ یہ اجتماعی و علمی قلم درخواست "سب ہی سے ہے اور اس اُمید کے ساتھ کہ آئندہ ماہ جنوری ۸۶ء میں نکلنے والے خوبصورت سالنامہ سے ہر وہ ہمدردِ اردو اور بہی خواہِ "شاعر" جس کی نظر سے یہ درخواست گزرے، دو دو چار چار نئے خریدار ضرور بنائے۔ ذرا سی زحمت اور توجہ سے خریداروں کے ڈھیر لگ سکتے ہیں۔

جو لوگ اُردو کو بچانا چاہتے ہیں

اور اُس کے لئے اپنا تن، من، دھن سب کچھ لگا دینا چاہتے ہیں کیا وہ ایک خالص علمی و ادبی رسالہ کو صرف سات روپیے نہیں دے سکتے؟ جبکہ سات روپیہ میں ایک سال تک انھیں نہایت بیش قیمت سرمایۂ ادب ملتا ہے۔ "شاعر" کا سالانہ چندہ بہت کم ہے اور پورے سال میں اس کے جتنے صفحات پیش کئے جاتے ہیں۔ اُتنے صفحات پندرہ ۱۵ روپے میں بھی نہیں مل سکتے۔

"شاعر" کی توسیعِ اشاعت کے لئے بارہا درخواستیں کی گئی ہیں۔ آج پھر بطورِ خاص اُن سب ہی قارئین سے یہ درخواست کی جا رہی ہے جن کی نظر سے کسی نہ کسی طرح "شاعر" گزرتا رہتا ہے۔

—— ادارہ ——

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شکیل بدایونی کی رومانی شاعری

از ——— ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

شکیل بدایونی مشہور و مقبول غزل گو شاعر ہیں جہاں ایک طرف انہوں نے فلمی نغمات کے ذریعہ اردو زبان کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، اور نہایت اچھے اچھے گیت لکھے ہیں۔ وہیں وہ اپنی شاعری سے مشاعروں میں گرمی پیدا کرتے رہے ہیں۔ وہ اس عہد کی کلاسیکی غزل کے نمایندہ ہیں جو داغ، جلیل اور جگر کی روایتوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ان اساتذہ کے تغزل سے اثر گہرا ہوا اور فن کے احترام کے ساتھ جنہوں نے نشاطِ فکر کو ضروری سمجھا۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی رائے ہیں۔

"شکیل کے تغزل کو معصومانہ تغزل" کہہ سکتے ہیں جس کا رشتہ دہلی کے کلاسیکی شعراء سے ملتا ہے۔"

"معصومانہ تغزل" کیا ہوتا ہے یہ تغزل کی کون سی قسم ہے اور دہلی کے کلاسیکی شعراء سے رشتہ کیوں؟ سے قطع نظر اس کتاب میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے شکیل بدایونی کی شاعرانہ شخصیت اور اُن کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کی غنائی اور رومانی شاعری کا تجزیہ کیا ہے لیکن یہ تجزیہ اور تبصرہ ایک ایسا چیستاں بن کر رہ گیا ہے جو نہ سمجھنے کا ہے اور نہ سمجھانے کا!! اس کتاب کی نثر ایک چیستاں ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک بے محل اور مغلق الفاظ کا صرف ہے۔ روحِ تنقید سرے سے مفقود ہے سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پوری کتاب پڑھ جایئے، آپ یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ شکیل بدایونی کی شاعری اور اُن کی انفرادیت کیا ہے، اُن کا رنگِ سخن کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر قیمت کا حامل ہے۔ کتاب کے نام کے اعتبار سے صرف رومانی شاعری کو زیرِ بحث لانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے شکیل بدایونی کی پوری غزلیہ شاعری پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تضاد بیانی کی تو انتہا ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چند صفحے لکھ کر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن خود بھول گئے کہ وہ پہلے کیا لکھ چکے ہیں۔ نمونہ کے طور پر اُن کی نثر کے چند ٹکڑے پیش کئے جا رہے ہیں۔

"شکیل کی رومانی شاعری جذبے کی شورش اور تشکیک دونوں کو پیش کرتی ہے۔ نغمگی اور غنائیت نے رومانیت دلنشین ہو گئی ہے۔ داخلی شکست و ریخت کی تصویریں اپنی غنائیت سے متاثر کرتی ہیں۔ شکیل کا کلاسیکی ذہن رسم و رواج کے آداب سے واقف ہے۔ اُسے جنونِ وحشت کی عظمت کا گہرا احساس ہے۔ زندگی اور عشق کے رشتے پر شکیل کی گہری نظر ہے۔ ذہنی شکست کی تصویر کہیں نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ زبان میں کھُردرا پن پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایک تو غزل کے مخصوص لہجے کی وجہ سے اور پھر تجربوں کے تنوع کی کمی کے احساس سے جذبات و احساسات کے پیکر مخصوص اشارے بن گئے ہیں۔ جذبہ آمیز تخیل کا سفر ملی ہر جگہ ہے، خود مرکزیت ملتی ہے۔ اسی سے رومانی احساس ابھرتا ہے۔ یہ رومانی خود مرکزیت ذہن کو رجعیانہ خیالات اور جنون و مجبوری سے دور رکھتی ہے۔ ذہنی اعتبار سے شکیل ایک بانکے غزل گو ہیں۔ اُن کی والہانہ سرخوشی اور حسن و جمال کی پرستش متاثر کرتی ہے۔ ہر جگہ متوازن لہجہ، اسلوب صفائی ہے۔ جذبہ آمیز تخیل اور اسلوبی صفائی اِس غزل میں دیکھئے۔"

نغمگی اور غنائیت میں کیا فرق ہے۔ "جنونِ وحشت" اور "رومانی خود مرکزیت" کا مفہوم کیا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ہی جانیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف وہ شکیل بدایونی کے یہاں "تجربوں کے تنوع کی کمی کا احساس" پاتے ہیں اور دوسری طرف "اسلوب کی صفائی" جس غزل میں تلاش کرتے ہیں اُس کا مطلع یہ ہے ؎

دید کے حوصلے ہیں گم، جلوۂ حسنِ ذات میں
دخلِ نگاہ کچھ نہیں دل کے معاملات میں

افسوس کہ ناقد نے غزل کے مصرعے تک غلط نقل کئے ہیں۔

(۱) دل سے قطعِ راہ کر، دل کی طرف نگاہ کر

(۲) ہمیں لاکھ ستم چھپاتے پھرتے ہیں پردۂ التفات میں

غزل کے ختم ہوتے ہی جو جملہ ہے وہ یہ ہے

"جذبہ کی خود شناسی ہے جذبہ کا شکون بھی اتنا ہی ہے آہنگ کا پاس، معلوم ہوتا ہے تجربوں کے قریب جا کے ..."

بات میں کوئی تو تسلسل اور ربط ہوتا یہاں اُنھوں نے شکیل بدایونی کو اقبال سے قریب کر دیا۔ اُردو اور انگریزی زبان کے جتنے مشہور شعراء کے نام نقاد کو یاد تھے وہ کہیں نہ کہیں جگہ ضرور لائے گئے ہیں جملوں کی بے ربطی کا یہ عالم کہ "تجربات کے قریب جانے کا ہے اور اُدھر سے ایک بات شروع ہو جاتی ہے۔

"کتنی سادگی اور کتنی پرکاری ہے اِن کی غزلوں میں معنویت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے شکیل کا مخصوص لہجہ موجود ہے۔ ہم اُن کی انفرادی خصوصیات دیکھ لیتے ہیں۔ جذبات کو الفاظ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور معلوم نہیں کتنی داخلی قدروں کا احساس ایک ساتھ دلایا گیا ہے۔ ذہنی قدرت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

ہر جملہ الگ ہے "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" پھر فوراً ہی دوسرے پیراگراف میں رقم طراز ہیں۔

"اُن کی بے قراری اور بیداری رجحان اور قدروں سے پیدا ہوئی ہے۔ شوق کی بلندی جدید شاعری کی روح ہے۔ شکیل نے اپنے شوق کی بلندی کو ماورائیت سے دور رکھا ہے۔ اقبال، جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی رومانی فکر کی پرچھائیاں ایک پوری نسل کی شاعری پر ہیں۔ شکیل نے اِن پرچھائیوں کو اپنے تغزل کے سانچے سے قریب کیا ہے۔"

یعنی چہ ؟؟!

صفحہ ۹۰ پر ایک جملہ ہے۔

"شکیل بدایونی اپنے مخصوص کلاسیکی رجحان اور کلاسیکی لب و لہجہ غزل کے آداب کی نگہداشت کے قائل ہیں ..... وضعداری سے کلاسیکی ضبط اور آداب فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔"

غرض ۱۳۲ صفحات کی پوری کتاب نہایت بے ربط جملوں اور اُلجھی [illegible] پر مشتمل ہے۔ ایک اچھے اور مشہور شاعر کو ناقد نے اپنی ژولیدہ بیانی، [illegible] شعور کی کمی اور زبان و بیان کی عدم دسترس سے نہ جانے کیا بنا دیا [illegible] اس پر پبلشر نے یہ ستم توڑا کہ نثر کی اس کتاب کو تاج کمپنی لمیٹڈ [illegible] مجموعہ بنا دیا ہے۔ کاش یہ سیدھی سادی اور سنجیدہ نثر کی کتاب ہوتی [illegible] شائع کی جاتی۔ اس میں شکیل بدایونی کی غزلیہ شاعری پر ایک [illegible] ابرو اور نتیجہ خیز تنقید ہوتی۔ کلاسیکی غزل نگاروں میں اُن کے مقام کا تعین کیا جاتا۔ اُن کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کو بتایا جاتا۔ اِس کے بجائے تنقید نگار خود اپنی نثر کی اُلجھی ہوئی گتھیوں میں کھو کر رہ گیا ہے۔

دیدہ زیب کتاب آفسٹ پر نہایت خوبصورت چھپی ہے ہر صفحہ پر چاروں طرف سبز حاشیہ ہے۔ بہترین کتابت ہے۔ اِس انداز سے تو شکیل بدایونی کا مجموعۂ کلام بھی اب تک نہیں چھپا۔!

قیمت تین روپے۔ ناشر: اظہار پبلیکیشنز ۲۰۱۵ دریا گنج دہلی

اُردو تنقید کے معمار

از ——— ایم حبیب خاں

اُردو زبان کے نقادوں نے دوسروں پر تو بہت کچھ لکھا لیکن ایسا کہ خود اُن پر بہت ہی کم لکھا گیا، یا یوں کہیے کہ اُن کی تنقیدات کا کم ہی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب اِس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اِس میں اُردو تنقید کے معماروں پر خود ایم حبیب صاحب نے نہیں لکھا ہے بلکہ مختلف اہل قلم کے مضامین جمع کرتے ہیں اور یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ بیک وقت اُردو کے بہت سے نقادوں کی شخصیت اور اُن کے تنقیدی [illegible] اور رجحانات سے ہمیں آگاہی ہو جاتی ہے۔ جن نقادوں پر یہ مضامین ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں:

محمد حسین آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ مولوی عبدالحق۔ نیاز فتحپوری۔ فراق گورکھپوری۔ مجنوں گورکھپوری۔ اختر انصاری۔ کلیم الدین احمد۔ آل احمد سرور۔ احتشام حسین۔

لکھنے والے ڈاکٹر احسن فاروقی، اختر انصاری۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم۔ ڈاکٹر سید جعفر۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن۔ محمود عظیم۔ خان رشید اور عبدالمغنی ہیں۔ ابتدا میں "تنقید کیا ہے" کے عنوان سے آل احمد سرور اور آخر میں "اُردو تنقید کے مسائل" کے عنوان سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین ہیں۔

خود لکھنے والوں نے تنقید نگاروں پر کیسا لکھا ہے، جن پر لکھا ہے اُن میں صحیح معنوں میں کون کون تنقید نگار ہے۔ دیگر مشہور اور مستند تنقید نگاروں کو کیوں چھوڑ دیا گیا یہ خود ایک طویل بحث طلب بات ہے۔ بہرحال کتاب کام کی ہے۔

حجم ۲۲۸ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ

انڈین بک ہاؤس، محمد علی روڈ، علی گڑھ

علمی - ادبی اور تہذیبی خبریں

کوثر چاند پوری کے دو رپورتاژ

اردو کے مشہور و مقبول ادیب و افسانہ نگار کوثر چاندپوری کے دو رپورتاژ "کارواں ہمارا" اور "سفر ارض غزل کا" جلد شائع ہونے والے ہیں۔ کوثر صاحب کے یہ دونوں رپورتاژ رسائل میں شائع ہو کر بہت پسند کئے گئے تھے۔ اب یہ کتابی شکل میں آرہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم حامد، صدر شعبۂ اردو بنا دیے گئے

بھوپال ۱۶ دسمبر ۔ معلوم ہوا ہے کہ حمیدیہ کالج بھوپال کے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کا تقرر عمل میں آیا ہے اس سے پہلے اس عہدے پر ڈاکٹر گیان چند تھے، جنھیں کشمیر یونیورسٹی نے بلا لیا۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی بھوپال کی ادبی تاریخ کے مصنف بھی ہیں۔

علی گڑھ میں اردو دار الترجمہ

نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انجمن ترقی اردو (مرکز) کا معائنہ کرتے ہوئے، انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ وہ یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانے پر ایک اردو دار الترجمہ قائم کرائیں گے جو اردو زبان و ادب کے خزانے کو بہترین کتابوں سے مالا مال کر سکے۔

آپ نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ اب تک مسلم یونیورسٹی نے خدمت اردو کے لئے کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا۔

نواب علی یاور جنگ کو انجمن کی طرف سے ایک عصرانہ بھی دیا گیا جس میں مقامی عمائدین کے علاوہ دو بیرونی مہمانوں مفتی عتیق الرحمان اور مولانا عبد الماجد دریابادی نے بھی شرکت کی۔

اردو کے لئے آٹھ لاکھ روپے کی امداد

نئی دہلی ۱۳ اور نومبر ۔ مرکزی وزارت تعلیم نے مختلف ریاستی حکومتوں اور اردو کی رضاکار انجمنوں کے توسط سے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے کل آٹھ لاکھ روپیہ سے زیادہ کی گرانٹس دی ہیں۔

ممتاز اردو انجمنوں مثلاً انجمن ترقی اردو ہند اور اسلامک بورڈ کو بھی گرانٹس دی جا رہی ہیں

اردو کی ترویج کا کام کرنے والی انجمنوں کو جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لئے وزارت تعلیم کی اسکیم کے تحت امداد دی جاتی ہے۔ یہ امداد نہ صرف کتابوں کی اشاعت، لغات اور انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب اور مشہور کلاسیکی کتابوں اور جدید ادب کے اردو تراجم کے لئے دی جاتی ہے بلکہ عمارت وغیرہ کی تعمیر کے لئے بھی دی جاتی ہیں۔ علاقائی تصانیف کی اشاعت اور اردو ادب کے انتخاب شائع کرنے کے لئے بھی امداد دی جاتی ہے۔

اب تک سرکار نے اردو سے متعلق جن کاموں پر امداد دی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ تلسی کی رامائن کا اردو ترجمہ تیلگو اردو لغت سہ لسانی، فارسی اور ہندی الفاظ کا اردو انسائیکلوپیڈیا مراٹھی اردو، پنجابی لغت سوامی وویکانند کی تصانیف، اور اردو افسانوں اور نظموں کا انتخاب۔

اردو انجمنوں کو وزارت تعلیم کے ثقافتی پروگرام کے تحت بھی گرانٹس دی جاتی ہیں۔ اب تک پانچ لاکھ روپیہ کے لگ بھگ گرانٹس ان انجمنوں کو دی جا چکی ہیں۔

"شاعر" کے "جرعات" مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں

دالیل (ڈرنگری) یکم دسمبر مشہور شاعر بدیع الزماں خاور کی تحریک پر مقامی اردو دوستوں نے، نومبر ۱۹۶۷ء کے "شاعر" سے جناب اعجاز صدیقی کے "جرعات" کا تراشہ، حکومت مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں روانہ کر دیا ہے۔ اس تراشے کے ساتھ ایک اپیل بھی ہے جس پر متعدد اردو جاننے والوں کے دستخط ہیں۔ اس اپیل میں کہا گیا ہے کہ ہم دستخط کنندگان اردو کے سلسلے میں مدیر "شاعر" کی پیش کردہ تجاویز کی دل کی گہرائیوں کے ساتھ تائید کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حکومت مہاراشٹر ہمدردی اور خلوص کے ساتھ ان تجویزوں پر غور کرے۔
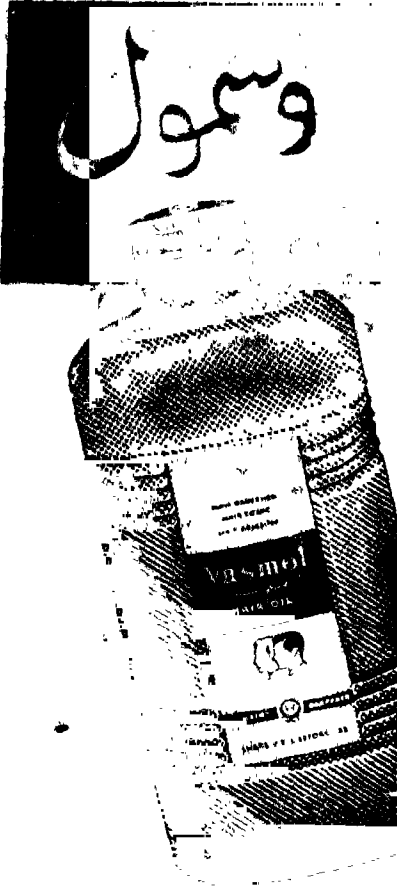
دہلی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے لئے زمین خریدلی گئی

اُردو دوستوں کو اس اطلاع سے خوشی ہوگی کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کو راؤس ایونیو نئی دہلی میں اپنا دفتر بنانے کے لئے زمین مل گئی ہے۔ انجمن دو سال سے اس کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈیڑھ دو سال میں اس زمین پر انجمن کے شایانِ شان عمارت تیار ہو جائے گی۔

"بہار اُردو رائٹرز سرکل" کا قیام

پٹنہ ۲۶ر نومبر۔ آج شام پٹنہ میں صوبہ کے سربرآوردہ قلم کاروں کا ایک جلسہ ہوا جس میں یہ بات متفقہ طور پر طے پائی کہ صوبہ بہار میں ادبی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لئے "بہار اُردو رائٹرز سرکل" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ میٹنگ میں مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ایک منجنگ کمیٹی تشکیل دی گئی۔

ڈاکٹر صدر الدین احمد فضا صدر شعبۂ اُردو پٹنہ کالج۔ پرنسپل [illegible]ت سنگھ۔ گرو گووند سنگھ کالج پٹنہ سٹی۔ ڈاکٹر محمد صدیق اشرف، [illegible]یر فارسی پٹنہ کالج۔ پروفیسر محمد علی خاں کامرس کالج۔ ڈاکٹر کلیم احمد [illegible] شعبۂ اُردو پٹنہ کالج۔ ڈاکٹر خالد رشید صبا۔ مدیر روزنامہ [illegible]اتی۔ ذکی انور۔ کریمیہ کالج جمشید پور۔ ہربنس دوست کلام حیدری [illegible]مورچہ گیا۔ ہارون رشید، مدیر اعلیٰ امروز ہند۔ پٹنہ۔ پروفیسر [illegible]م حسن کامرس کالج۔ خورشید انوار عارفی مدیر ہفت روزہ صدائے ہند [illegible]) حسن نشاط انصاری مدیر معاون صدائے ہند۔

شعراء اور ادیب حضرات سے

حالات حاضرہ کے پیشِ نظر قومی اور وطنی نگارشات کا انتخاب زیرِ ترتیب ہے۔ اہلِ قلم حضرات سے التماس ہے کہ حب الوطنی، اخوت اور قومی یکجہتی سے متعلق اپنی تخلیقات جلد از جلد مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

[illegible]

بارہ چکیا۔ چمپارن (بہار)

ہندوستان کو اپنے کسانوں پر بڑا ناز ہے۔ وہ خون پسینہ ایک کر کے اناج اُگاتے ہیں، جس سے سرحد پر تعینات فوجیوں کو کھانا ملتا ہے، کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کھانا ملتا ہے، ملک کے عوام کو کھانا ملتا ہے۔ وہ دن رات زیادہ سے زیادہ اناج اُگانے میں جُٹے ہوئے ہیں، تاکہ ملک میں سب کے لئے اناج پیدا ہو سکے۔ ہمارے کسان سمجھتے ہیں کہ جتنا کم اناج ہمیں باہری ملکوں سے منگانا پڑے گا، اُتنا ہی زیادہ سرمایہ ہم ملک کی ترقی اور خوشحالی پر خرچ کر سکیں گے۔ سچ ہے ہمارے کسان اپنا فرض پورا پورا ادا کر رہے ہیں۔ ذرا سوچیں تو آپ ملک کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟